سرفروش
2
اظہر
کلیم

میں نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔

گرانجو کی لاش اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے ہونٹوں پر بڑا ہی مکروہ تبسم پھیل گیا۔ وہ کینہ توز نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل اس نے خوفناک قہقہے لگائے تھے، ان کی گونج ابھی تک میرے ذہن میں موجود تھی۔ ڑدوے نے ایک جھٹکا کھایا اور رتھ میں ڈھیر ہوگئی۔

میرے رتھ میں ایک بھالا موجود تھا۔

میں وہ بھالا اُٹھالایا۔

مسٹر فردوس! گرانجو نے ہاتھ اُٹھا کر کہا: میں سنہری گولی کھا چکا ہوں، اس لیے میرے تجربے ختم ہوگئے ہیں۔۔۔ لیکن میں اب تک صرف اس لیے زندہ ہوں کہ مجھے تم سے انتقام لینا ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم کسی اور سرزمین سے یہاں آئے ہو اور تمہیں یہاں سے بُلایا بھی جا سکتا ہے۔۔۔ لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں ایک ایسی جگہ منتقل کر رہا ہوں جہاں تم زندہ رہو گے اور موت کو ترس جاؤ گے۔ اس نے اپنے لبادے میں ہاتھ ڈال کر ایک عجیب سی چیز نکالی اور اُسے میری طرف پھینک دیا۔

اُسی لمحے میں نے بھالا اس کی طرف پھینکا۔

بھالا اُس کے جسم میں یُوں پیوست ہوگیا جیسے وہ گوشت پوست کی بجائے موم کا بنا ہوا نرم نرم سا پُتلا ہو۔ وہ گر گیا۔ اس نے میری طرف جو چیز پھینکی تھی، اس کی وجہ سے ایک زبردست جھماکا ہوا۔ یوں لگا جیسے چاروں طرف سے اندھیروں اور دُھند نے یلغار کر دی ہو۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ڑدوے کی طرف دیکھا لیکن ہر چیز تاریکی اور دُھندکی دبیز تہوں میں چھپتی جا رہی تھی۔

میں رتھ ہی میں گر گیا۔

میرا ذہن ڈوب رہا تھا۔۔۔ اور ڈوبتے ذہن سے مجھے صرف آخری بار گھوڑوں کی ہنہناہٹ سُنائی دی تھی اس کے بعد جیسے ہر چیز پگھل گئی تھی۔ میرا وجود اس پگھلے ہوئے سیال میں تحلیل ہوتا چلا گیا۔

❁

جب مُجھے ہوش آیا تو میں اوندھے مُنہ لیٹا ہوا تھا اور میرے سر میں شدید درد تھا۔ ماضی کے ہر سفر میں جب کمپیوٹر مجھے نئی سرزمین پر منتقل کرتا تھا، میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا تھا۔۔۔ لیکن اس بار مجھے کمپیوٹر نے نہیں بلکہ ایک خبیث شخصیت نے نہ جانے کہاں منتقل کر دیا تھا۔ میں کچھ دیر یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ جب میرے سر کا درد ہلکا ہوا تو میں نے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں کسی پارک نما جگہ پر لیٹا ہوا تھا۔ نیچے سبزہ زار تھا اور ارد گرد جھاڑیاں، پھول، درخت اور روشیں تھیں لیکن ہر طرف ایک

بے کراں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چہار سُو عجیب سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اُسے نہ دن کی روشنی کہا جا سکتا تھا اور نہ ہی یہ چاندنی تھی۔ صبح کاذب تھا اور نہ ہی شام کا جھٹپٹا تھا بلکہ یوں محسوس ہوا جیسے سورج بادلوں کی اوٹ میں چھپ کر پیلی پیلی سی روشنی بکھیر رہا ہو۔

مجھ پر عجیب سی دہشت سوار تھی اور یہ دہشت اُس بے پایاں خاموشی کے باعث تھی جس میں مجھے اپنی دھڑکنیں بھی صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ یہ سناٹا میرے اعصاب پر سوار ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے سبزے پر ہاتھ پھیرا تو دو باتوں نے مجھے بُری طرح چونکا دیا پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ سبزہ مصنوعی تھا بالکل اُسی ٹرف کی مانند جو کھیل کے میدانوں میں بچھایا جاتا ہے اور دوسری بات یہ کہ اُس پر ہاتھ پھیرنے سے ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے کوئی آدمی لمبی لمبی خشک گھاس پر چل رہا ہو۔ شاید یہ اسی بے کراں خاموشی کا کرشمہ تھا جس نے اُس معمولی سی آواز کو کئی گُنا بڑھا دیا تھا۔

کافی دیر تک مجھے کوئی آواز سُنائی نہ دی تو میں اُٹھ کر ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے تمام درخت، پھول اور جھاڑیاں پلاسٹک کی بنی ہوئی ہوں۔

میں نے روشنی کا مخرج تلاش کرنے کے لیے نگاہ اُوپر کی تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ آسمان پر بہت بڑا چاند چمک رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے یہ سرزمین چاند کے بالکل قریب واقع ہو یا چاند اس سرزمین کے اتنے قریب آ گیا ہو کہ اگر میں اُس پر ہوتا تو اس دُنیا کی ہر چیز بآسانی دیکھ لیتا... پھر یہ بھی عجیب سی بات تھی کہ اُس چاند سے کرنیں نہیں بلکہ روشنی کے موٹے موٹے دھارے پھُوٹ رہے تھے۔ جیسے وہاں سے اس سرزمین پر اسپاٹ لائٹ ڈالی جا رہی ہو۔ سب سے پہلے مجھے اپنے لیے لباس، ہتھیار، خوراک اور پانی کی تلاش تھی۔ میں نے ان میں سے کسی ایک کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو میری رگوں میں خون کھولنے لگا۔ ساتھ جھاڑیوں کے جُھنڈ میں ایک نوجوان جوڑا قریب قریب لیٹا ہوا تھا۔ دونوں کھوئے ہوئے تھے کہ انھیں میری موجودگی کا احساس تک نہ ہو سکا۔ میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا جھنڈ کی دُوسری طرف پہنچ گیا اور جھاڑیاں ہٹا کر اُن پر دوبارہ نظر ڈالی تو میری آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں وہ دونوں یوں ساکت و صامت تھے جیسے مر چکے ہوں... پھر میں نے سوچا کہ ممکن ہے، اُنھوں نے مجھے دیکھ لیا ہو اور بے حس اور بے حرکت بن گئے ہوں... چنانچہ میں نے ہاتھ بڑھا کر عورت کی پنڈلی کو ہلایا مگر وہ نہ تو مجھ سے کچھ بولی اور نہ ہی اپنے ساتھی سے کچھ کہا۔

"ڈرو نہیں... میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

میں نے سرگوشی میں کہا۔

اس پر بھی وہ خاموش رہے اور میری سرگوشی مجھے ایک چنگھاڑ سی لگی تو میں نے قریب سے اُن کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا اور جھاڑیاں ہٹا کر اُن کے سَروں پر پہنچ گیا۔

وہ اُسی طرح بے حس، بے حرکت اور ساکت رہے تو میں نے نوجوان کو اپنی طرف کھینچ لیا جب اُس نے کوئی مدافعت اور کوئی حرکت نہ کی تو میں سمجھ گیا کہ وہ واقعی مر چکے ہیں۔ اس امر کی تصدیق کے لیے میں نے باری باری اپنا کان اُن کے مقامِ دل پر لگایا مگر مجھے کوئی دھڑکن سُنائی نہیں دی۔ میں نے غور سے مرد کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بلاشبہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اگرچہ قد و قامت کے اعتبار سے وہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اُس کے اعضا متناسب اور نین نقش حسین تھے۔ اس طرح عورت بھی بڑے دل کش خد و خال کی مالک تھی لیکن سوال یہ تھا کہ ان کی ہلاکت کی وجہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے میں نے انھیں اُلٹا پلٹا تو مجھے مرد کے جیکٹ کے نیچے ایک اُبھار سا نظر آیا۔ میں نے اس کا جیکٹ اُتارا تو پتہ چلا کہ اس کی پیٹھ پر شانے کے پاس ایک پٹی بندھی ہوئی ہے۔ میں نے پٹی کھول دی۔ اس کے شانے پر ہلکا سا زخم دکھائی دیا جس پر کھرنڈ آ چکا تھا... مگر عورت کے جسم پر کوئی زخم دکھائی نہیں دیا۔

اُن دونوں کے لباس ایک ہی جیسے پلاسٹک سے بنے ہوئے تھے اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آ گیا کہ جھاڑیاں اور پھول وغیرہ بھی پلاسٹک کے تھے میرے لیے یہ سب کچھ عجوبہ تھا۔ اچانک مجھے مرد کے دائیں کان کی لَو میں کوئی چیز چمکتی نظر آئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو ٹاپ جیسی ایک چیز تھی۔ میں نے لاشعوری طور پر عورت کی طرف دیکھا تو مجھے اُس کے کان میں ویسی ہی چیز نظر آ گئی میں نے دونوں کے ٹاپس اُتار لیے اور جھاڑیوں سے نکل کر، روشنی میں اُن کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ وہ بیٹری یا ریسیور قسم کی چیزیں ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ انھیں توانائی کی ترسیل بند کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔ مگر انسانوں کو تو اس قسم کی توانائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر کیا یہ روبوٹ ہیں؟... اگر یہ روبوٹ ہیں تو مرد کے شانے پر زخم کیسا ہے، کیا کسی روبوٹ کو زخم لگتے اور بھر سکتے ہیں؟ گویا نہ تو یہ انسان تھے اور نہ ہی انھیں روبوٹ کہا جا سکتا تھا تو پھر یہ کیا ہیں؟

ان سوالوں نے مجھے جکڑ دیا۔

میں نے سوچا اگر یہ روبوٹ ہیں تو پھر یہ مرے نہیں ہیں بلکہ انھیں سُلا دیا گیا ہے۔

میں دوبارہ اُنھی جھاڑیوں میں چھُپ گیا اور انتظار کرنے لگا اس کے سوا فی الحال کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆

میں کافی دیر تک جھاڑیوں میں دُبکا ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ میرے سامنے، ایک جانب جھیل تھی جس کے چاروں طرف بنچ پڑے تھے اور اُن پر اسی طرح کے بہت سے جوڑے بیٹھے یا نیم دراز تھے وہ سب کے سب اُس جوڑے کی طرح بے حس اور بے حرکت تھے ایسا لگتا تھا جیسے اچانک ہی اُن سب کو ترسیلِ توانائی روک دی گئی ہو اور وہ سب مر گئے ہوں یا سو گئے ہوں جھیل کے کنارے کھانے پینے کی اشیا کے متعدد اسٹال تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید... کھانے پینے کا مسئلہ وہاں حل ہو جائے چنانچہ اپنی کمین گاہ سے نکل کر جھیل کی طرف چل پڑا۔

وہاں پہنچ کر لباس اور ہتھیار کا مسئلہ پہلے ہی حل ہو گیا۔ یوں تو یہ سب روبوٹ یا روبوٹ نما انسان چھوٹی قامت کے تھے لیکن اخباروں کے اسٹال پر اِستادہ شخص مجھے اُن سے بلند و بالا دکھائی دیا تو میں نے اُس کا جیکٹ اور نیکر اُتار کر پہن لی۔ یہ کپڑے اگرچہ میری جسامت کے اعتبار سے چھوٹے ہی تھے مگر اُن سے لباس کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا تھا۔ اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو میں نے اشیائے خورد و نوش کے اسٹالوں کا جائزہ لیا۔ ایک اسٹال سے مجھے ایک چھُری اور کچھ خشک غذا مل گئی اگرچہ غذا کا ذائقہ کچھ کسیلا سا تھا مگر میں نے پیٹ کی آگ بجھالی۔ اسی اسٹال سے مجھے مشروب کی چند بوتلیں بھی مل گئیں جو بے حد میٹھی تھیں۔ میں دو بوتلیں پی کر آگے بڑھ گیا۔

پارک سے نکلنے کے بعد درختوں کے سائے سائے چلنے لگا تاکہ کوئی مجھے دیکھ نہ سکے اب میرا وہ خوف دُور ہو چکا تھا، جو ہر نئی سرزمین پر منتقل ہونے کے بعد شروع شروع میں طاری ہوتا ہے۔

وہ بڑا ہی خوبصورت شہر تھا۔ پارکوں میں، دفاتر میں، دُکانوں میں اور ریستورانوں میں ہر جگہ وہ لوگ اُسی حالت میں منجمد ہو گئے تھے جس حالت میں انھیں توانائی سے محروم کیا گیا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ بعض لوگوں نے کچھ کھانے یا بات کرنے کے لیے مُنہ کھولا تھا کہ توانائی کی ترسیل رُک جانے کی وجہ سے وہ اسی حالت میں مر گئے یا سو گئے تھے۔

سڑکوں پر کہیں تو کاریں پارک کی ہوئی تھیں اور کہیں وہ چلتے چلتے ہی منجمد ہو گئی تھیں۔ یہ کاریں جیپ نما تھیں اور ان میں انجن نہیں تھے بلکہ ہر کار میں اینٹینا لگا ہوا تھا جو ایک ڈائینمو کو چلاتا تھا اور یہ ڈائینمو پہیوں کو حرکت میں لاتا تھا۔

اس شہر کی کوئی عمارت چھ منزلوں سے زیادہ نہیں تھی۔۔ عمارتوں میں لفٹیں بھی لگی ہوئی تھیں جو کہیں بیچ میں رُکی ہوئی تھیں اور کہیں لوگ اُن میں سوار ہو رہے تھے یا اُتر رہے تھے۔ یہی حال ریلوے یارڈ کا تھا۔ چلتی گاڑیاں ویسی کی ویسی رُک گئی تھیں اور اُن کے مسافر بے حس اور بے حرکت بیٹھے رہ گئے تھے۔

میں نے اس شہر میں ایک وسیع و عریض عجائب گھر بھی دیکھا لیکن مجھے وہاں کوئی ہتھیار نظر نہیں آیا۔ انتہا تو یہ ہے کہ اُن کے اُس عجائب گھر میں عہدِ قدیم کی بھی کوئی تلوار موجود نہیں تھی۔ یا تو وہ لوگ عدم تشدد کے قائل تھے یا وہاں کسی قسم کا ہتھیار رکھنے پر پابندی تھی۔ پُورے شہر میں مجھے اُن چھُریوں کے علاوہ کچھ نہ ملا.. جنھیں باورچی خانے میں استعمال کیا جاتا ہے اور ان کا سائز بھی عام چاقو سے بڑا نہیں تھا۔

مجھے اس شہر میں کسی جانور کا نشان تک نہیں ملا۔

میں نے ایک اپارٹمنٹ میں جا کر وہاں کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ گھر کے کچھ افراد کھانے کی میز پر بیٹھے تھے، کچھ سو رہے تھے اور کچھ کھیل رہے تھے کہ اُسی عالم میں منجمد ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں دن اور رات کا کوئی تصوّر نہ ہو۔ لوگ کام اور آرام گھڑیوں میں وقت دیکھ کر کرتے ہوں گے۔ مجھے اس شہر میں گھومتے ہوئے کافی وقت گزر گیا تھا مگر چاند وہیں کا وہیں تھا اور اس کی روشنی بھی ویسی کی ویسی ہی تھی۔

گھومتے گھامتے میں ایک اسپتال جا پہنچا۔ زچہ وارڈ میں ابھی ابھی ایک عورت نے ایک لڑکے کو جنم دیا تھا۔ نرس بچّہ اُٹھائے ہوئے تھی مگر وہ ٹاپ یا اینٹینا بچّے کے دائیں کان میں لگا ہوا تھا میں آپریشن تھیٹر گیا تو دیکھا کہ ایک سرجن نے ایک مریض کا سینہ چاک کر رکھا ہے۔ مریض کا دل ایک عام دل جیسا ہی تھا۔ اس نظارے سے مجھ پر واضح ہو گیا کہ یہ لوگ روبوٹ نہیں بلکہ انسان ہی ہیں۔

جب میں چلتے چلتے تھک گیا تو میں نے ایک خالی اپارٹمنٹ تلاش کیا جس میں ڈبوں والی غذا بھی وافر مقدار میں موجود تھی۔ میں نے ڈٹ کر کھایا اور آرام دہ بستر پہ لیٹ کر سو گیا۔

چند گھنٹے سونے کے بعد جب اُٹھا تو بالکل تازہ دم تھا۔

میں نے ایک جماہی لی اور اُٹھ کر کھڑکی کے پاس آگیا۔ باہر وہی منظر تھا... ہر شے اور ہر فرد جیسے طلسمی نیند میں ڈوبا ہُوا تھا۔ میں اپارٹمنٹ سے نکل آیا اور ایک سڑک پر چلنے لگا۔ کئی گھنٹے مسلسل چلنے کے باوجود مجھے پارکوں کے علاوہ کوئی کُھلی جگہ نظر نہ آئی۔ شہر ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ مجھے یُوں لگا جیسے یہ شہر مضافات اور دیہات سے یکسر محروم ہو۔

خاموشی اور تنہائی میرے دل اور رُوح کا بوجھ بن گئی۔ میں انسانی آواز سُننے کے لیے پہلے کبھی اتنا نہیں ترسا تھا۔ یہ مُردوں کا شہر نہیں تھا بلکہ یہ کبھی نہ مرنے والوں کا شہر تھا، شہرِ خوابیدہ تھا جو کسی وقت بھی توانائی کی ترسیل بحال ہونے پر جاگ سکتا تھا۔ ہر شے پھر سے زندہ اور رواں دَواں ہو سکتی تھی۔

ایک مقام پر مجھے حمام دکھائی دیے مگر اُن میں پانی نہیں تھا۔ پھر میں ایک ریستوران میں گُھس گیا وہاں بھی ٹُوکیوں والی غذا اور بوتلوں والے شیریں مشروب سے بھوک پیاس بُجھائی اور اپنے لیے ایک بھالا تیار کرنے لگا۔ میں نے ایک کھڑکی سے پردہ لٹکانے والا ڈنڈا نکالا، ایک چُھری لی اور ایک تار کے ساتھ چُھری ڈنڈے سے باندھ لی۔ میرا بھالا تیار تھا اب مجھے چاہیے تھا کہ میں توانائی کا منبع تلاش کروں لیکن اُسے تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ جب کہ میرا دل اور میری چھٹی حِس بار بار یہ انتباہ کر رہی تھی کہ اگر مجھے کوئی خطرہ پیش آسکتا ہے تو چاند ہی سے آسکتا ہے جو آسمانی آنکھ بن کر مجھے دیکھ رہا تھا۔

ابھی میں نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک ایک آواز میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔ یہ میری نہیں بلکہ کسی اور کی آواز تھی۔ اس آواز نے مجھے بھی اس شہرِ خوابیدہ کے خفتہ لوگوں کی طرح منجمد کر دیا۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا اور میں پسینے سے تر بتر ہو گیا۔ میں خوف زدہ نہیں تھا کیوں کہ میں تو خود ہی کسی آواز کا منتظر تھا... چاہے وہ میرے لیے کسی خطرے کا باعث کیوں نہ بن جائے لیکن جب وہ آواز دوبارہ سُنائی دی تو میرا اضطراب بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ میرے لیے سانس لینا بھی دُشوار ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے گمان گزرا کہ شاید وہ آواز خود میں نے ہی نکالی تھی... لیکن پھر میرا یہ وہم دُور ہو گیا۔ کافی دیر بعد وہ آواز دوبارہ سُنائی دی... میں وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا... دم بخود اور ہمہ تن گوش... نہ جانے وہ کس کی آواز تھی اور کہاں سے آئی تھی؟

وہ ایسی آواز تھی جیسے لوہے سے لوہا ٹکرایا ہو یا جیسے کسی نے لوہے کا بڑا سا ٹکڑا اُٹھا کر پھینک دیا ہو یا اتفاقاً گر پڑا ہو۔

اور یہ آواز دُور سے نہیں بلکہ بہت قریب سے آئی تھی جس نے اُس بے کراں سنّاٹے کا جگر چیر دیا جو میری رُوح کا بوجھ بنا ہُوا تھا۔

میں نے نظر اُٹھا کر سامنے دیکھا تو سڑک کے بیچوں بیچ ایک ڈھکنا نظر آ رہا تھا۔ ایسا ہی ایک ڈھکنا میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور وہ ڈھکنا اتنا وزنی تھا کہ میں اُسے ہلا بھی نہیں سکا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور ڈھکنے کے پاس بیٹھ کر جائزہ لینے لگا۔ اگر ایسا ڈھکنا اُٹھا کر دوبارہ رکھا جائے تو ایسی آواز پیدا ہو سکتی ہے جیسی میں نے سُنی تھی... لیکن یہ آواز اس ڈھکنے کو اُٹھانے سے نہیں آئی تھی بلکہ کہیں نیچے سے آئی تھی۔

میں پھر درختوں کے سائے میں آگیا۔

اب خوف نے میرے وجود کا احاطہ کر لیا لیکن یہ خوف اپنے اندر میرے لیے بقا کا جذبہ رکھتا تھا کیوں کہ اس خوف میں تنہائی کے جاں لیوا عذاب سے نجات مضمر تھی۔ یہ احساس شامل تھا کہ اس شہرِ خوابیدہ میں صرف میں ہی زندہ انسان نہیں ہُوں بلکہ کوئی اور بھی ہے... میں نے فیصلہ کیا کہ جو کوئی بھی ہے... میں اُس کا خیر مقدم کروں گا۔

عام طور پر میں ایسے موقعوں پر للکارتا اور اشتعال انگیز جُملے کستا تھا تاکہ اگر چھُپا ہُوا فرد دُشمن ہو تو وہ خود ہی میری طرف بڑھے مگر یہاں تو موت جیسے سنّاٹے نے مجھے اپنی یہ ترکیب بھی بالائے طاق رکھنے پر مجبور کر دیا... میں للکارنے کی بجائے ایک دُکان میں گُھس گیا جس کے اگلے حِصّے میں دُکاندار اور گاہک خرید و فروخت کی حالت میں منجمد تھے۔ میں اُن کی طرف توجہ دیے بغیر دُکان کے پچھلے حِصّے میں چلا آیا جہاں مجھے مطلوبہ اشیا مل گئیں۔

یہ اشیا، پیلیاں کھولنے والا سبّل اور بند کرنے والا ہتھوڑا تھیں۔ نوک دار سبّل دیکھ کر میں نے اپنے بھالے سے چُھری اُتاری اور اُسے اپنی پیٹی میں اُڑس لیا کہ یہ بھالا، ہتھوڑے اور سبّل سے زیادہ مفید ہتھیار ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یہ دونوں چیزیں لے کر میں دوبارہ اس ڈھکنے کے پاس آیا اور سبّل کی مدد سے ڈھکنا کھولنے اور اُسے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔

ڈھکنا بے حد وزنی تھا وہ سبّل سے اُٹھ تو جاتا تھا مگر بار بار پھسل کر میری محنت ضائع کر دیتا تھا آخر ایک بار میں نے اُسے ایک کونے سے اُٹھا کر دَرز میں ہتھوڑا رکھ دیا اور پھر ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ڈھکنا پرے پھینک دیا۔

گڑھا کافی گہرا نظر آتا تھا۔ میں نے سبّل اندر پھینک کر اُس

کی گہرائی کا اندازہ کرنا چاہا مگر اُس کے گرنے سے دَھپ کی جو آواز پیدا ہُوئی، میں اُس سے گہرائی کا اندازہ نہ کر سکا۔ اب میں نے ہتھوڑا کنارے سے اٹکا دیا اور لٹک کر نیچے کود گیا۔

گڑھا اندر سے خشک تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے مدّتوں سے استعمال نہ کیا گیا ہو۔ وہ کافی اُونچا اور وسیع تھا اگرچہ عام حالات میں میرا اس طرح گڑھے میں کُود جانا حماقت ہوتی مگر مجھے اُس روشن چاند سے دیکھا جانا پسند نہیں تھا اور مجھے بار بار یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی دُوربین سے میری نقل و حرکت کا مشاہدہ کر رہا ہو۔

چونکہ سبّل ایک عمدہ ہتھیار ثابت ہو سکتا تھا اس لیے میں زمین ٹٹول کر اُسے تلاش کرنے لگا۔ جونہی میری انگلیوں نے اُسے چُھوا، مجھے بائیں جانب سے کچھ روشنیاں اپنی طرف بڑھتی دکھائی دیں۔ میں نے پلٹ کر دائیں جانب دیکھا تو ویسی ہی روشنیاں اُدھر سے بھی آتی نظر آئیں۔ گویا میں دونوں طرف سے گھر گیا تھا۔ لیکن بائیں طرف بہ نسبت دائیں جانب کی روشنیاں کچھ زیادہ فاصلے پر تھیں اس لیے میں دائیں طرف بھاگا۔ میری چھٹی حِس بتا رہی تھی کہ بُرا وقت سر پہ آگیا ہے۔

ابھی میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ مجھے گڑھے کی دیوار کے ساتھ ایک ہیولا سا چپکا نظر آیا۔ وہ کسی سائے کی طرح ساکت دکھائی دیا... مگر مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہلا ہے۔ جب میں اُس کی طرف اُچھلا اور اُسے پکڑنے کی کوشش کی تو اُس نے مجھ پر تھوک دیا اور مجھے پنجوں سے نوچنے کی کوشش کرتے ہُوئے، اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

میں نے جسے اندھیرے میں پکڑنے کی کوشش کی تھی، اُس کے جسم کی ساخت اور نرمی نے مجھے بتا یا دیا... کہ وہ کوئی عورت ہے۔ وہ تو میرے نرغے سے نکل گئی مگر میں خود ان لوگوں کے نرغے میں پھنس گیا جو دائیں اور بائیں طرف سے میرے قریب آگئے تھے۔ بہرحال، وہ جو بھی تھے، اُن خوابیدہ لوگوں سے بہتر تھے جن میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

اس وقت جہاں میں کھڑا تھا، شاید وہ زیرِ زمین رہنے والے اُن لوگوں کی قیام گاہ تھی کیوں کہ وہاں گھٹیا قسم کی میزیں، کرسیاں اور دُوسرا سامان پڑا ہُوا تھا۔ گڑھے نے آگے آکر ایک غار کی صُورت اختیار کر لی تھی اور یہاں ایک کمرہ سا بنا ہُوا تھا جس کی چھت سے ایک مٹکا لٹک رہا تھا مٹکے سے پانی کی بوندیں رِس رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑے زور کی پیاس محسوس ہونے لگی لیکن یہ پانی پینے کا موقع نہیں تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ اُن خُوب صورت مگر خوابیدہ لوگوں اور ان زیرِ زمین رہنے والوں کے درمیان کیا رشتہ یا تعلق ہے۔ میں تو اتنا جانتا تھا کہ ماضی کے ہر سفر میں جب تک اقتدار میرے ہاتھوں میں نہیں آیا یا اقتدار میں میری شرکت اہم نہیں سمجھی گئی، میری بقا خطرے میں رہی اس لیے اُن خوابیدہ اور ان زیرِ زمین رہنے والوں کے باہمی تعلقات جو بھی ہوں، مجھے فی الوقت اِن جیتے جاگتے لوگوں پر اپنی دھاک بٹھا کر اقتدار حاصل کر لینا چاہیے۔

اَب وہ لوگ دونوں جانب سے میرے قریب آگئے تھے اور جو شمعیں اُنھوں نے اُٹھا رکھی تھیں، اُن کی روشنی میں اُن کی شکلیں واضح نظر آ رہی تھیں۔ وہ سب کے سب مرد نہیں تھے بلکہ اُن میں کچھ عورتیں بھی شامل تھیں۔ جب وہ اور قریب آئے تو پتہ چلا کہ کچھ بچّے بھی عورتوں کے ساتھ چمٹے ہُوئے ہیں۔

وہ سب حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ تمام مرد گنجے تھے لیکن عورتوں کے گھنے بال اُن کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ عورتوں نے سینہ بند اور مختصر کپڑوں سے سَتر پوشی کر رکھی تھی جب کہ مرد صرف نیکر نما لباس پہنے ہُوئے تھے۔ وہ سب مجھ سے کچھ فاصلے پر رُک کر سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔

میں نے محسوس کیا کہ عورتیں مجھے گھور رہی ہیں اور سرگوشیوں میں بھی حِصّہ لے رہی ہیں۔ میں نے ہتھوڑا دائیں ہاتھ میں اور نیزہ بائیں ہاتھ میں تھام لیا۔ پھر میں نے ہتھوڑے کو گُرز کی طرح گھماتے ہُوئے کہا: "تم سب زبان رکھتے ہو اس لیے مجھ سے بات کرو۔"

مرد جو اپنے ہاتھوں میں تقریباً پانچ فٹ لمبے آہنی ڈنڈے تھامے ہُوئے تھے، میری طرف متوجہ ہو گئے۔

"مجھے تم اپنا دوست سمجھو گے یا دُشمن، اس کا فیصلہ خود تمھیں کرنا ہے۔ ویسے میں ایک دوست کی حیثیت سے یہاں آیا ہوں۔ اب بولو، کیا کہتے ہو؟" میں نے مزید کہا۔

وہ میری بات کا جواب دینے کی بجائے سرگوشیاں کرنے لگے عورتیں بار بار میری طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ آخر ایک آدمی اُن میں سے نکل کر آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہُوا مجھ سے تقریباً بارہ قدم دُور کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی لوہے کا ڈنڈا تھا جس کا ایک سرا نوک دار اور دوسرا سرا چھڑی کی طرح نیم دائرے میں مُڑا ہوا تھا۔ پانچ فٹ لمبا اور تقریباً ایک انچ موٹا دھات کا یہ ڈنڈا غالباً اُن کا ہتھیار تھا۔

میں نے ہتھوڑا گُرز کی طرح گھماتے ہوئے کہا: "جب تک یہ فیصلہ نہیں ہو جاتا کہ تم مجھے دوست سمجھتے ہو یا دُشمن، تب تک مجھ

سے دُور ہی رہو۔"

"میرا نام دارا ہے۔ دوست یا دُشمن کا فیصلہ ہونے سے پہلے یہ بتاؤ، کیا تم اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو؟"

یہ سوال اس آدمی نے اتنی سنجیدگی سے کیا تھا کہ ایک لمحے کو میں چکرا گیا... آخر اس نے یہ سوال کیوں کیا تھا؟

"ہاں... لیکن تمھیں اس سے کیا غرض؟" میں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

دارا پہلی بار مسکرایا اور بولا: "مجھے اس سے کوئی غرض نہیں لیکن یہ بات تمھارے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے اجنبی تمھاری زندگی کا دار و مدار اسی بات پر ہے تمھیں ہمارا غلام بن کر رہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اگر تم اس صلاحیت سے محروم ہوتے تو تمھارے حصّے میں موت کے سوا کچھ نہ آتا۔"

اس دوران اُس کے ساتھی بھی قریب آ گئے تھے۔ "اپنے ساتھیوں سے کہو کہ وہ پیچھے ہٹ جائیں۔" میں نے کہا۔

دارا نے ہاتھ اُٹھایا تو اُس کے ساتھی دو قدم پیچھے ہٹ گئے، پھر وہ بولا: "تمھارا جواب کیا ہے اجنبی؟"

میں اُسے جواب تو دے ہی چکا تھا اور کیا بولتا۔ اس لیے میں خاموش رہا۔

"مجھے آخری فیصلے سے آگاہ کرو اجنبی۔" وہ غرّایا۔

"تم اپنے سوال کا جواب سُن چکے ہو۔ میں اس صلاحیت سے مالا مال ہُوں لیکن تم لوگوں کا غلام بن کر زندہ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ بھی مت سمجھو لو کہ مرنے سے پہلے میں بہت سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار چکا ہوں گا۔"

دارا خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی اور وہ کچھ سوچنے لگا جب کہ ایک آدمی نے ایک نوجوان لڑکی کو کچھ ہدایات دیں۔ لڑکی نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر وہاں سے چلی گئی۔ مجھے میری چھٹی حس نے بتایا کہ یہی وہ لڑکی تھی جسے میں نے اندھیرے میں پکڑنے کی کوشش کی تھی مگر جو میرا مُنہ نوچ کر بھاگ نکلی تھی۔ اتنے میں دارا بولا: "میں اس قبیلے میں تیسرے درجے کا سردار ہوں۔ میں تمھیں قتل کرنا چاہوں تو بھی نہیں کر سکتا۔ البتہ اگر مجھے رُستم اور شیلو حکم دیں تو میں تمھارے پرخچے اُڑا سکتا ہوں۔ اسی لیے میں نے اُن سے ہدایات طلب کی ہیں۔ اگر تم صاحبِ اولاد بننے کے قابل ہُوئے اور میں نے تمھیں مار ڈالا تو مجھے پاتال کی سزا بھگتنا پڑ جائے گی۔ لہٰذا رُستم اور شیلو کا جواب آنے تک ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔"

... لیکن انتظار میرے عزائم اور منصوبے کے خلاف تھا اُس لیے میں نے اُسے لڑنے پر اُکسانے کی خاطر اشتعال دلانا مُناسب سمجھا۔ میں نے کہا: "تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ مجھے ختم کر سکتے ہو؟"

دارا ایک لمحے تک خاموش کھڑا رہا پھر اُس نے ایک ساتھی کو پکارا، اپنا ڈنڈا اُسے دے دیا اور اس کا ڈنڈا لے کر بازو آگے کو پھیلائے اور زور لگا کر اُسے موڑنے لگا۔ جب آہنی ڈنڈے کے سرے ایک دوسرے سے مِل گئے تو اُس نے وہ ڈنڈا میری طرف پھینکتے ہُوئے کہا: "میں تمھیں بھی اسی طرح توڑ مروڑ سکتا ہوں اجنبی۔"

اُس نے جتنی آسانی سے ایک انچ موٹے آہنی ڈنڈے کو موڑ دیا تھا، وہ اس کی بے پناہ طاقت ظاہر کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں اس سے خاصا مرعوب ہُوا لیکن پھر میں نے وہ مُڑا ہُوا ڈنڈا اُٹھایا اور زور لگا کر اُسے سیدھا کرنے لگا۔ مجھے ڈنڈا سیدھا کرنے میں اپنی تمام تر قوت سے کام لینا پڑا۔ جب ڈنڈا سیدھا ہو گیا تو میں نے اُسے دارا کی طرف اُچھال دیا۔

"مجھے اعتراف ہے کہ تم بھی طاقت ور ہو، لہٰذا تمھیں قتل کرنا میرے لیے خوشی اور عزت کا باعث ہوگا لیکن کیا کروں کہ میں تمھیں رستم اور شیلو کے حکم کے بغیر قتل نہیں کر سکتا۔"

"تو تمھارا یہ مسئلہ میں حل کیے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے مُٹھی بھر ریت اُٹھا کر اس کے مُنہ پر دے ماری: "تمھارے ساتھی اس بات کے شاہد ہیں کہ میں نے تمھیں اشتعال دِلایا تھا۔ اپنے دفاع کے لیے تیار ہو جاؤ بُزدل۔ تم چاہے مجھ سے لڑو یا نہ لڑو مگر میں تمھیں ختم کر دوں گا۔"

میرے اس عمل کا مقصد یہ تھا کہ رستم اور شیلو کی آمد سے پہلے پہلے میں کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دے لوں جس سے وہ مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

دارا نے اپنا ڈنڈا سنبھالتے ہُوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "تم سب دیکھ رہے ہو کہ خود اجنبی مجھ سے لڑنا چاہتا ہے، میں نہیں لڑنا چاہتا۔"

اتنے میں مجمعے سے دو آدمی باہر آ گئے۔ ایک دارا کے دائیں اور دوسرا بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ دارا اپنا آہنی ڈنڈا تانے آگے بڑھنے لگا۔

"میرا خیال تھا کہ تم تنہا میرا مقابلہ کرو گے لیکن اگر تم اتنے ہی بزدل ہو تو پھر میں تینوں سے نمٹ لوں گا۔" میں نے کہا۔

دارا نے میری بات اَن سُنی کرتے ہُوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "اسے اُس وقت تک قتل نہ کرنا جب تک کہ اُسے قتل کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے۔ تم دائیں طرف آ جاؤ اور تم بائیں طرف ہو جاؤ۔"

میں نے دارا پر طنز کا جو وار کیا تھا، وہ خالی گیا اور وہ اپنے دونوں ساتھیوں سمیت آگے بڑھنے لگا۔ میں نے ہتھوڑے کو تیزی سے گھمانا شروع کر دیا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ کرتے، میں نے ہتھوڑا دارا پر دے مارا۔ ہتھوڑا کم از کم چار سیر وزنی تھا۔ اس کا لوہے والا حصّہ دارا کے شانے پر اور دستہ بڑے زور سے جبڑے پر لگا۔ وہ اس ضرب سے گر پڑا۔ اُس کے ساتھی اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ اس سے پہلے کہ دارا سنبھلتا، میں نے لپک کر ہتھوڑا دوبارہ اُٹھا لیا اور بڑے زور سے اُس کے پیٹ میں لات ماری۔

دارا تکلیف کی شدّت سے لوٹ پوٹ ہونے لگا... یہ دیکھ کر اس کے ساتھی میری طرف لپکے۔ میں نے اچانک جُھکائی دے کر اُن کے گنجے سر آپس میں ٹکرا دیے۔ سر ٹکرانے سے وہ بُری طرح چکرا گئے۔ میں نے ہتھوڑے کے دستے سے ایک ایک مزید ضرب اُن کے سروں پر لگائی تو وہ اوندھے مُنہ دارا پر جا گرے۔ یہ تماشا دیکھنے والی عورتوں کے مُنہ سے سِسکاریاں نکل گئیں اور انھوں نے اپنے بچّوں کو سینوں سے بھینچ لیا۔

مَردوں میں سے کچھ آگے بڑھے تو میں نے دارا کا آہنی ڈنڈا اُٹھا کر اس کا نوکدار حِصّہ تولتے ہُوئے کہا: "جو بھی آگے بڑھا۔ یہ ڈنڈا اُس کے آر پار ہو جائے گا۔"

دارا کے ساتھیوں کے اُٹھتے قدم رُک گئے۔ میں پھر دھاڑا۔ "پیچھے ہٹ جاؤ۔"

خُدا جانے یہ میری دھاڑ کا اثر تھا یا وہ اپنے ساتھیوں کی درگت سے ڈر گئے تھے کہ فوراً چار پانچ قدم پیچھے ہٹ گئے۔

اتنے میں دارا سنبھل گیا اور اُٹھ بیٹھا۔ میں نے اُسے آہنی ڈنڈے کی زد پر لیتے ہُوئے کہا: "مَرنے کے لیے تیار ہو جاؤ دارا۔"

یہ سُنتے ہی وہ میرے قدموں میں گر گیا اور بولا: "نہیں نہیں، تم جیتے اور میں ہار گیا اجنبی۔ ہمارے رواج کے مطابق اَب تم میرے مالک اور میں تمھارا غلام ہُوں۔"

"لیکن مجھے کسی غلام کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے پیچھے ہٹتے ہُوئے کہا: "تم اَب بھی اُسی طرح آزاد ہو جیسے پہلے تھے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں بتا چُکا ہُوں کہ مجھے اپنا دوست سمجھو اور اَب مَردوں کی طرح کھڑے ہو جاؤ۔"

"مجھے اپنے قدموں سے دُور مت کرو، مالک۔ ڈرو نہیں، میں تم سے کوئی دھوکا نہیں کروں گا۔ مجھے اپنے قدم چُومنے دو تاکہ سب دیکھ لیں کہ میں تمھارا غلام ہُوں۔" دارا نے سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے درخواست کی۔

"میں کہہ چُکا ہوں کہ مجھے غلام کی نہیں بلکہ ایک دوست کی ضرورت ہے۔"

"تم نہیں سمجھتے مالک کہ میں تمھارا غلام کیوں بننا چاہتا ہُوں۔ اب صرف تم ہی مجھے رستم اور شیلو سے بچا سکتے ہو کیوں کہ میں اپنا فرض ادا کرنے میں ناکام ہو گیا ہوں۔ اگر تم مجھے اپنا غلام نہیں بناؤ گے تو وہ مجھے پاتال میں بھیج دیں گے۔ مجھ پر رحم کرو مالک! رستم اور شیلو کے آنے سے پہلے مجھے اپنا غلام بنا لو۔ وہ بڑے بے رحم ہیں۔ اگر تم مجھے پاتال میں جانے سے بچا لو گے تو میں تمھارا غلام ہی نہیں، ایک اچھا دوست بھی ثابت ہوں گا۔"

میں اُس کی باتوں سے متاثر ہو کر خطرہ مول لینے پر تیار ہو گیا اور بولا: "اچھی بات ہے۔ میں تمھیں غلام کے طور پر قبول کرتا ہُوں۔"

یہ سُن کر وہ رینگتے ہُوئے میری طرف بڑھا اور میرے پاؤں چُومنے لگا پھر وہ اپنی باچھ سے بہتا ہُوا خون پونچھتے ہُوئے بولا: "میں ہمیشہ آپ کا وفادار رہوں گا۔" اس کے بعد وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہُوا: "تم سب لوگوں نے دیکھا اور سُن لیا ہے کہ اس اجنبی نے مجھے شکست دی ہے اور مجھے اپنا غلام بنانا قبول کر لیا ہے... اَب میں اس کی پناہ میں ہُوں۔"

مجمعے میں سے ایک آدمی بولا: "ہاں دارا... ہم نے دیکھا بھی ہے اور سُنا بھی ہے لیکن اگر رُستم اور شیلو نے اس اجنبی کے قتل کا حُکم دے دیا، تب تمھارا کیا ہوگا؟"

دارا نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور اُٹھ کر میرے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ میں نے ڈنڈے کی نوک سے اُسے ہٹاتے ہُوئے کہا: "ابھی کچھ وقت مجھ سے دُور ہی رہو، میرے نئے دوست! اور مجھے بتاؤ کہ یہ رستم اور شیلو کون ہیں۔ جلدی بولو تاکہ اُن کے آنے سے پہلے پہلے مجھے اُن کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو جائیں۔"

دارا نے زخمی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولا: "آپ کو مجھ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اَب آپ کی تعظیم و تکریم میرا فرض ہے اور یہ بھی نہ بھولیے کہ دارا جو وعدہ کرتا ہے اُس پر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ جہاں تک رُستم اور شیلو کا تعلق ہے، وہ یہاں کے حُکمراں ہیں۔ میں مزید کچھ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ وہ آ رہے ہیں۔"

اور چند لمحوں بعد وہ واقعی آ گئے۔

وہ ایک مینڈک نُما آدمی تھا۔ اُس کے ساتھ سفید بالوں والی ایک عورت تھی جو اَب بھی کافی خوب صورت نظر آتی تھی۔ اُن کے پیچھے بیسیوں گنجے اپنی لوہے کی لاٹھیاں لیے ہُوئے تھے۔

"میں رُستم ہوں اور یہ لمہ شیلو ہے۔" پھر وہ دارا کے دونوں

بے ہوش ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اچانک وہ پلٹا اور مجھ سے پوچھنے لگا "کیا تم نے انھیں دیانت داری سے شکست دی ہے؟" مینڈک نما آدمی مجھے گھور۔ نے ہوئے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ اور اس کی گواہی خود تمھارے اپنے آدمی بھی دے سکتے ہیں" میں نے جواب دیا۔

دارا میرے قدموں کے پاس سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"کیا تم بچوں کا باپ بننے کی اہلیت رکھتے ہو؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔

میں اس سوال پر جھنجلا گیا۔ ان کم بختوں کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا اور وہ نہ جانے کیوں مجھ سے بار بار یہ سوال کر رہے تھے مگر میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اُس سے غیر ضروری بحث نہ کروں۔

"ہاں۔۔۔ میں بچوں کا باپ بن سکتا ہوں۔"

"اگر یہ درست ہے تو پھر ہمیں تمھاری ضرورت ہے۔ اس لیے کہ یہاں صرف میں ہی بچوں کا باپ بننے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ اس سلسلے میں تمھیں میری مدد کرنا پڑے گی یا مرنا پڑے گا فیصلہ خود کر لو اجنبی۔"

"میرا جواب ہی میرا فیصلہ ہے اور مجھے اجنبی کی بجائے تم سرفروش کے نام سے مخاطب کر سکتے ہو۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تمھارا نام کیا ہے یا تم کہاں سے آئے ہو۔ اگر تمھیں میری شرط منظور ہے تو میرے ساتھ چلو۔" وہ بولا۔

اس دوران سفید بالوں والی شیلو خاموش کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں سبز رنگ کی تھیں۔ اس نے سیاہ لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اُس کے قد و قامت اور خد و خال سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک حسین خاتون ہے۔ صرف اُس کے سفید بال یہ چغلی کھاتے تھے کہ وہ عمر رسیدہ ہے۔ اُس کا انداز بھی یہ بتاتا تھا کہ اقتدار کی اصلی مالک وہی ہے۔

چند لمحے بعد ہی میرے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔

رُستم نے دارا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اسے پاتال میں بھیج دو۔"

یہ سنتے ہی چھ آدمی دارا کی طرف بڑھے لیکن میں نے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے بڑے رُعب اور دبدبے سے کہا "ٹھہرو۔۔۔ اب یہ میرا غلام ہے۔" میرے اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ رُستم سے جو کچھ ہونا ہے، وہ بھی اسی وقت ہو جائے۔

وہ میری بات پر آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس نے اپنی لوہے کی لاٹھی سنبھالی تو میں نے بھی دارا والی لاٹھی پر گرفت مضبوط کر لی اور یہ سوچ لیا کہ مجھے رُستم کو ختم کر دینا ہے مگر اتنے میں شیلو نے اس سے سرگوشی میں کچھ کہا پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی مگر مجھ سے مخاطب نہ ہوئی۔

رُستم نے قہرِ درویش بر جانِ درویش کے مصداق ایک ٹھنڈی سانس لی اور شانے اُچکاتے ہوئے بولا "اچھی بات ہے۔ دارا آج سے تمھارا غلام ہے۔ اس کی ساری ذمے داریاں تم پر عاید ہوں گی۔۔ کیوں کہ ہمارے معاشرے میں غلاموں کے افعال کا ذمے دار مالک کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ اب میرے ساتھ آؤ۔"

مجھے ایک علٰحدہ مقام پر فرض کی ادائیگی کے لیے لگا دیا گیا لیکن میری زندگی کا دار و مدار ان نتائج پر تھا جنھیں رُونما ہونے میں ابھی وقت درکار تھا۔ البتہ مجھے یہ بتا دیا گیا کہ اگر رستم مر گیا تو مجھے اس کی جگہ بادشاہ بنا دیا جائے گا۔ اس غار سے آگے آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہاں پورا ایک شہر آباد ہے۔ مجھے جس زیرِ زمین کمرے میں رکھا گیا، اُس کے لیے ساز و سامان اوپر کے شہرِ خوابیدہ سے لایا گیا تھا۔ میں نے ان کے متعلق دارا سے جو معلومات حاصل کیں، وہ بے حد مختصر تھیں۔ وہ اپنے قبیلے کو نادی کہتے تھے جس کی کوئی تاریخ نہیں تھی۔ وہ اپنے ماضی سے کوئی ربط نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی اُنھیں اپنے مستقبل کی فکر تھی ماسوا اس کے کہ ان کی آبادی کم نہیں ہونی چاہیے۔

دارا میرے لیے ایک نفسیاتی کیس تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ سب کچھ بھول جاتا تھا۔ مستقبل کے سلسلے میں وہ صرف پاتال کی سزا سے ڈرتا تھا اور بس۔۔۔

شہرِ خوابیدہ کے خفتہ لوگوں کے متعلق مجھے اتنا ہی معلوم ہو سکا وہ ہماری دُنیا کی ایک صدی کے لگ بھگ عرصے سے اسی طرح سو رہے ہیں وہ اپنے آپ عرفانی کہتے تھے۔ جب کہ زیرِ زمین رہنے والے نادی کہلاتے تھے۔

ایک روز میں بستر پر دراز سوچوں میں گم تھا۔ دارا دوسرے کمرے میں کھانا تیار کر رہا تھا کہ اچانک اس نے میری خواب گاہ میں جھانکا بولا "وقت ہو گیا ہے جناب۔"

"اچھا!" میں نے کہا "تو پھر بھیج دو اُسے۔"

"بہتر جناب" اس نے جواب دیا اور چلا گیا۔

مجھے گمبھیر سناٹا اور تنہائی یہاں لائی تھی مگر موجودہ صورت حال بھی میرے لیے عذاب بن گئی تھی اس لیے بہتر یہی تھا کہ میں کسی طرح چاند نما روشن حصے تک پہنچ جاؤں یا اگر وہاں کوئی آبادی ہو تو اُس سے رابطہ قائم کروں۔ چاند نما سرزمین کے بارے میں مجھے اب تک اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ وہ شہرِ خوابیدہ کے لوگوں سے زیادہ سائنسی ارتقا حاصل کرنے والوں کی تخلیق ہے اور وہاں کے لوگ قمرانی کہلاتے ہیں۔

نادی لوگ قمرانیوں سے بہت ڈرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ عرفانیوں اور قمرانیوں میں جنگ ہوئی تھی جس میں قمرانی جیت گئے تھے انھوں نے عرفانیوں کو جوہری یا برقی توانائی سے محروم کر دیا۔۔ اور وہ منجمد ہو کر رہ گئے۔۔۔ کیوں، کب، اور کیسے؟۔۔۔ یا تو دارا ان سوالوں کے جواب جانتا ہی نہیں تھا یا پھر بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن قیاس اغلب یہی تھا کہ میرا غلام حقائق سے آگاہ نہیں ہے۔

میرے لیے اب یہاں سے فرار بھی مشکل ہو گیا تھا کیونکہ میرے کمرے کے باہر تقریباً پچاس نادی پہرہ دیتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی میں سوچتا۔۔ کہ انسان بھی کتنا ناشکرا ہے جب مجھے بھرپور تنہائی حاصل تھی تو میں اپنے جیسے کسی انسان کی آواز اور اُس کی رفاقت کے لیے ترسا کرتا تھا۔ لیکن یہ رفاقت میسر آئی تو میں پھر تنہائی کا خواہش مند ہوں۔ میں ان خواتین کے ہجوم سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ جنھوں نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔

غسل کے بعد میں نے کپڑے بدلے، کھانا کھایا اور آرام کرنے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ دارا نے کہا "وقت ہو گیا ہے جناب۔"

"لعنت بھیجو ان پر۔ میں بہت تھک چکا ہوں۔"

"مگر آپ کی زندگی کا دار و مدار۔۔"

"سُنو دارا!" مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی "میری جگہ تم یہ فرض کیوں نہیں سنبھال لیتے۔"

"یہ ناممکن ہے جناب۔ پھر تو ہم دونوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔" وہ گھبرا کر بولا۔

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیونکہ رسم و رواج کے مطابق ہم نادی ایسا نہیں کر سکتے۔ فوراً میری اور آپ کی شکایت ہو جائے گی۔"

"کون کرے گا شکایت اور کس سے کرے گا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ عورتیں رستم اور ملکہ شیلو سے شکایت کریں گی تو وہ آپ کو مروا ڈالیں گے اور مجھے پاتال میں بھیج دیا جائے گا۔"

"اُفوہ۔۔۔ کیا مصیبت ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا "میں کہاں پھنس گیا ہوں، خداوندا!" پھر میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا "اچھی بات ہے۔"

چند لمحوں کے بعد جو لڑکی اندر آئی، میں اُسے فوراً پہچان گیا۔ یہ وہی لڑکی ہے۔ جس نے پہلے دن میرا منہ نوچا تھا اور شاہ رستم اور ملکہ شیلو کو بلانے گئی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا "تمھارا نام کیا ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکائے کھڑی رہی۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟" میں قدرے سختی سے بولا۔

وہ پھر بھی خاموش کھڑی رہی۔

"میری طرف دیکھو" میں نے حکم دیا۔

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر نگاہیں جھکا لیں۔ مگر میں نے ایک نگاہ میں ہی پہچان لیا کہ اس کی بھوری آنکھوں میں ذہانت کی وہ چمک ہے، جو دوسری نادی عورتوں میں مفقود تھی۔

میں نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ میرے قریب بیٹھ گئی تو بھی اس نے سر اوپر نہیں اُٹھایا۔ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کا چہرہ اُوپر اُٹھایا تو اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تیرنے لگیں۔

"اپنا نام بتاؤ؟" میں نے کہا۔

"نورے۔ میرا نام نورے ہے۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم بار بار کیوں آتی ہو؟" میں نے کہا کیونکہ وہ پہلے بھی کئی بار آ چکی تھی۔

یہ سُن کر وہ تیزی سے دروازے کی طرف بھاگی مگر میں نے لپک کر اُسے روک لیا۔ وہ کسی بلی کی طرح مجھے نوچنے کھسوٹنے لگی مگر پھر ایک دم سسکیاں لیتے ہوئے بولی "مجھے تم سے۔۔۔ محبت ہے آقا۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

میں خود بھی یہی سمجھتا تھا مگر میں اُس کے منہ سے اعتراف سُننا چاہتا تھا کیونکہ یہ لڑکی کسی موقعے پر میرے کام آ سکتی تھی، ہر چند کہ وہ بہت خوبصورت تھی مگر قریب آنے پر مجھے اس سے کچھ ناگوار سی بو آئی۔ میں نے دارا کو آواز دے کر کہا "اسے لے جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ اس سے بدبو آئے۔"

"میرے ساتھ آؤ" دارا نے کہا۔ مگر وہ وہیں کھڑی رہی تو دارا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا "آؤ دیر مت کرو۔"

نورے پھر کسی بلی کی طرح بپھر گئی اور اُسے نوچتے ہوئے بولی "چھوڑو میرا ہاتھ۔ تم مجھے نہیں چھو سکتے۔"

دارا نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

میں نے کہا "اس کے ساتھ چلی جاؤ۔"

اس پر وہ بلا چون و چرا اس کے ساتھ چل دی۔

تھوڑی دیر بعد جب نورے واپس آئی تو وہ شبنم میں نہایا ہوا گلاب لگ رہی تھی۔ میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا آقا وہ سب شاہ اور ملکہ سے شکایت

کریں گی کہ آپ نورے پر زیادہ مہربان ہیں۔ پھر وہ اپنے سپاہی بھیج دیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ پر کوئی آنچ آئے۔" دارا نے کہا۔

"تم اپنے کام سے کام رکھو دارا۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے وفادار رہو گے لہٰذا جو میں کہتا ہوں وہی کرو۔ جاؤ۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے نورے کو بٹھایا اور نرمی سے بولا۔

"دیکھو نورے۔ اب میں تمھاری زبان سے صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ تم مجھ سے جھوٹ بالکل نہیں بولو گی۔ تم یہ کہہ کر مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہیں کرو گی کہ مجھ سے محبت کرتی ہو۔"

"سچ تو یہ ہے سرفروش کہ تم بہت چالاک ہو۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تمھیں صرف اپنا دیکھنے کی آرزومند ہوں۔"

"تم پھر جھوٹ کہہ رہی ہو نورے۔ میں جانتا ہوں کہ تم یہاں میری جاسوسی کرنے آتی ہو۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکا لیا۔

"اس بات کا اعتراف کرلو ورنہ مجھے دکھ پہنچے گا کہ جو لڑکی مجھے اچھی لگتی ہے، وہ مجھے دھوکا دے رہی ہے۔"

"نہیں، نہیں۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "میں تمھیں دھوکا نہیں دے سکتی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ملکہ شیلو کی طرف سے جاسوسی کرنے آتی ہوں۔ میں ملکہ کی خاص کنیز ہوں اور وہ تمھارے بارے میں ہر بات جاننا چاہتی ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں جانتی ہوں کہ بار بار یہاں آنا جرم ہے مگر میں مجبور ہوں۔"

"لیکن ملکہ شیلو کو میری جاسوسی کروانے سے کیا دلچسپی ہے؟ وہ میرے بارے میں کیا جاننا چاہتی ہے؟"

"یہ سب تو میں نہیں جانتی سرفروش۔ میرا کام صرف حکم بجالانا ہے، وہ مجھے کچھ نہیں بتاتی۔"

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"تمھارا غلام ٹھیک کہتا تھا، سرفروش۔ اگر میں زیادہ دیر یہاں رکی تو تمھارے لیے خطرہ پیدا ہو جائے گا۔"

"مگر تم نے مجھے ساری بات نہیں بتائی۔ اگر تم مجھے اپنا دوست سمجھتی ہو تو مجھ پر اعتماد بھی کرو۔ ویسا ہی جیسا میں تم پر کرتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ ملکہ شیلو کیا چاہتی ہے؟"

"میں بہت کم جانتی ہوں سرفروش لیکن جب وقت آئے گا تو تمھیں ضرور خبردار کردوں گی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ مجھ پر کوئی مصیبت آنے والی ہے؟" میں نے کہا۔

"تم پر نہیں بلکہ... بلکہ۔ خیر سنو۔ ملکہ شیلو اور شاہ کے درمیان گڑبڑ ہونے والی ہے۔ شیلو چاہتی ہے کہ تم اُس کی طرف داری کرو۔ اس کے عوض وہ تمھیں انعام و اکرام سے نوازے گی لیکن تمھیں انتظار کرنا پڑے گا اور تم کوئی گڑبڑ بھی نہیں کرو گے بلکہ جو حکم دیا جائے اس پر عمل کرو گے۔"

"لیکن میں کیا کرسکتا ہوں۔ میں تو خود ایک قیدی ہوں تمھاری طرح بے بس۔" میں نے کہا۔

"مگر تم ہمیشہ قیدی اور بے بس نہیں رہو گے۔ میں شیلو کی پیاری ہوں، میں بار بار تمھارے پاس آیا کروں گی اور جب مناسب وقت آئے گا تو تمھیں ملکہ کے پاس لے جاؤں گی۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔"

⊡

اُس شب رستم نے بیس محافظوں پر مشتمل ایک دستہ بھیجا مجھے اپنے پاس بلوالیا۔ دارا کو میرے ساتھ چلنے کی اجازت دی گئی مگر خوف اور دہشت سے اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ وہ پسینے میں شرابور اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہم دونوں، محافظ دستے کے نرغے میں گھرے ہوئے زیرِ زمین دنیا کی بھول بھلیوں سے گزرتے آگے بڑھ رہے تھے کہ دارا نے سرگوشی کی۔

"میں نے آپ کو پہلے ہی خبردار کردیا تھا آقا کہ رستم کو نورے کے بارے میں ضرور معلوم ہو جائے گا۔ اب اُسے شک ہوگیا ہے کہ آپ ملکہ شیلو کے ساتھ مل کر اُس کے خلاف سازش کر رہے ہیں وہ آپ کو قتل کرادے گا اور مجھے پاتال میں پھینکوا دے گا۔"

مجھے اس پر غصہ آگیا۔ میں نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا "بکواس بند کرو اور آیندہ اس وقت تک اپنی چونچ مت کھولنا جب تک میں تمھیں بولنے کی اجازت نہ دوں۔"

وہ خاموش ہوگیا مگر اس کے خوف و دہشت میں کوئی کمی نہ آئی۔ محافظ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگے کہ میں ان حالات میں بھی بظاہر بالکل ہراساں نہیں تھا۔

بھول بھلیوں سے نکل کر نسبتاً ایک اونچے اور چوڑے غار میں داخل ہوئے تو کچھ فاصلے سے لوہے پر ہتھوڑے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ کچھ آگے بڑھے تو مجھے اندھیرے میں شعلہ بداماں بھٹیاں بھی نظر آگئیں جن میں لوہا گرم کرکے نوکدار آہنی سلاخیں تیار کی جا رہی تھیں جنھیں نادی لوگ بطور ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک سلاخ پر میں نے پہلے دن قبضہ کیا تھا مگر وہ پہلی ہی رات میری قیام گاہ سے غائب ہوگئی تھی۔ میں نے اس کے لیے کوئی تردد نہیں کیا تھا کہ اُس

وقت مجھے اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔

میں نے دارا سے کہا: "اب تم اپنی چونچ کھول سکتے ہو۔ بتاؤ کہ یہاں کیا بنایا جاتا ہے؟"

"یہاں صرف نوک دار آہنی سلاخیں تیار کی جاتی ہیں۔ میں خود بھی اِن بھٹیوں پر کام کرچکا ہوں۔"

"تم لوگ دوسرے ہتھیار کیوں نہیں بناتے؟"

"دوسرے ہتھیاروں کی ضرورت ہی کیا ہے اور پھر اس ہتھیار سے بہتر کون سا ہتھیار ہوسکتا ہے۔"

مجھے اس سے اسی جواب کی توقع تھی کیونکہ نادی لوگ ذہنی طور پر ابھی بے حد پس ماندہ تھے۔ تاہم میں نے بھٹیوں کا محل وقوع اچھی طرح ذہن نشین کرلیا کہ شاید آیندہ کبھی ان کی ضرورت پڑ جائے۔

کچھ دیر بعد ہم دربار تک پہنچ گئے۔ یہ دربار بھی ایک زیرِ زمین غار میں واقع تھا لیکن بہت بڑا اور نسبتاً صاف ستھرا تھا۔ زمین پر مرمت بھی ہوئی تھی اور غار کو اینٹوں کی دیواریں چن کر کئی حصوں میں منقسم کردیا گیا تھا۔ ایک چبوترے پر شاہ کا تخت رکھا ہوا تھا۔ یہ تخت ایک عام کرسی پر مشتمل تھا جو شہرِ خوابیدہ کے بالائی حصے سے یہاں لائی گئی تھی۔ دربار کے اوپر ایک موکھا تھا جہاں سے چاند نُما سرزمین دکھائی دے رہی تھی۔ وہی چاند جس کے متعلق میرا خیال تھا کہ وہاں سے طاقتور دُوربینوں کے ذریعے میری نقل و حرکت پر نظر رکھی اور جاسوسی کی جا رہی ہے۔

جب ہمیں دربار میں لایا گیا تو شاہ اپنے تخت پر براجمان ہماری راہ دیکھ رہا تھا۔ یہاں لاتے وقت میرے اور دارا کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ دارا تو میرے قدموں میں بیٹھ گیا مگر میں تن کر کھڑا رہا حالانکہ میں بے بس تھا لیکن اپنی کسی ادا یا حرکت سے اپنے آپ کو خوفزدہ یا بزدل ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اتنے میں رستم نے کہا۔ "دونوں آگے بڑھو اور میرے سامنے سیس نواؤ۔"

ہم دونوں آگے بڑھے۔ دارا تو فوراً سجدہ ریز ہوگیا مگر مجھے سینڈک رستم کو آرام کرسی پر اکڑ کر بیٹھے دیکھ کر ہنسی آگئی۔

"سرفروش کسی تخت یا انسان کے آگے اپنا سر نہیں جھکاتا۔ اس سے تمھاری توہین مقصود نہیں میرا مذہب ہی ایسا ہے کہ مجھے انسانوں کے سامنے سر جھکانے کی ممانعت کردی گئی ہے۔"

غصے کے مارے رستم کی بھوری آنکھیں لال انگارہ ہوگئیں۔ "کیا تمھارے اس غلام نے تمھیں پاتال کے متعلق کچھ نہیں بتایا؟"

"اسے تو اس کے ذکر سے ہی غش آنے لگتا ہے اس لیے دارا نے ابھی اس کی وضاحت نہیں کی۔" میں نے جواب دیا۔

"دارا تم سے زیادہ دانشمند ہے، سرفروش۔" وہ بولا۔ "تمھیں اگر یہ معلوم ہوتا کہ پاتال کیسا جہنم زار ہے تو اس کے ذکر سے تمھاری رُوح تک لرز اُٹھتی۔ میں نے خود کچھ دن وہاں گزارے ہیں۔ اُن دنوں کی یاد سے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میری بات غور سے سنو سرفروش۔ اگر میں نے اب تک تمھیں اُس تاریک جہنمی غار میں نہیں پھینکوایا یا قتل نہیں کیا تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں ورنہ اب تک تمھاری ہڈیاں تک گل سڑ چکی ہوتیں۔"

میں نے اس بات پر لاابالی پن سے کہا: "کیا تم سے گفتگو کے دوران میرے ہاتھ بندھے رہیں گے اور میں اسی طرح کھڑا رہوں گا؟ یہ میرے ساتھ زیادتی ہے کیونکہ میں اپنا فرض انجام دے رہا ہوں۔"

وہ مسکرا دیا اور بولا۔ "ہاں۔ چونکہ اب تک میں خود بھی یہ فرض انجام دیتا آیا ہوں اس لیے مجھے تمھاری دُشواری کا احساس ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے تالی بجائی تو ایک اندھیرے گوشے سے ایک لڑکی نمودار ہوئی جو ایک کرسی اُٹھالائی اور اُسے تخت کے سامنے، چبوترے سے نیچے رکھ دیا۔ مجھے اب تک یہ معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ وہ لڑکی یا دوسرے محافظ اندھیرے گوشوں میں کھڑے ہیں اور کسی وقت بھی رستم کے اشارے پر مجھے ختم کرسکتے ہیں۔

لڑکی کی نگاہیں ایک بار بھی میری طرف نہیں اُٹھی تھیں۔ اُس نے کرسی رکھنے کے بعد میرے ہاتھ کھول دیے۔ میں نے دیکھا کہ لڑکی کی عمر بہ مشکل بارہ برس رہی ہوگی۔ وہ بلا کی حسین تھی، اُس کے چہرے پر شبنم سے دُھلے گلابوں کی سی شگفتگی تھی۔ مشعل کی تھرتھراتی روشنی میں اگرچہ اس کے نقوش کہرے میں لپٹے دکھائی دیتے تھے لیکن یہ خدوخال اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتے تھے۔

"یہ میری بیٹی آشی ہے۔" رستم بولا۔ "یوں تو میری بے شمار بیٹیاں ہیں مگر اُن سب میں سے مجھے یہ عزیز تر ہے۔ جب تک یہاں ہو، یہ تمھارے ساتھ رہے گی۔"

میں اس کرم گستری پر ایک لمحے کے لیے گنگ سا رہ گیا اور سوچنے لگا کہ آخر مجھے اتنا حسین تحفہ کیوں دیا جا رہا ہے۔

"میں تمھارا شکرگزار ہوں کہ تم اپنے خزانے کا اتنا قیمتی موتی مجھے دے رہے ہو۔ میں اسے سنبھال کر رکھوں گا؟"

"یہ تمھیں ساری خوشیاں دے گی۔"

"واقعی؟" میں نے آشی سے براہِ راست پوچھا۔

"حکم کی تعمیل کرنا میرا فرض ہے۔" آشی نے جواب دیا۔

"اب تم باہر انتظار کرو آشی۔ جب سرفروش میرے ساتھ بات چیت سے فارغ ہوگا تو تم اس کے ساتھ جاسکو گی۔" رستم نے حکم دیا۔

آ شی چلی گئی۔

دارا میری ٹانگوں کے قریب بیٹھا ابھی تک تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ منہ سے عجیب سی آوازیں نکالتا اور میری ٹانگیں پکڑ لیتا... میں نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا: "کھڑے ہو جاؤ۔"

وہ کھڑا ہو گیا مگر اس کی لرزش ختم نہ ہوئی۔

"اگر تم بے خوف کھڑے نہیں ہو سکتے تو باہر دفع ہو جاؤ۔ میں رستم سے تخلیے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ہانپتا ہوا باہر چلا گیا۔ رستم نے اسے باہر بھیجنے پر اعتراض کرنے کی بجائے کہا: "تمھیں ایک غلام سے دلیری کی توقع نہیں رکھنی چاہیے سرفروش! غلامی آدمی سے اَنا اور خودداری چھین لیتی ہے۔"

رستم کے دوستانہ رویے سے میرا حوصلہ بڑھ گیا تو میں نے کہا۔ "تم نے بتایا تھا کہ کچھ عرصے پاتال میں بھی رہے ہو۔ مجھے اس کے متعلق کچھ بتاؤ۔"

"وہ بڑی کرب انگیز عقوبت گاہ ہے سرفروش۔" رستم نے جھرجھری لیتے ہوئے جواب دیا۔ "وہاں اندھیرے، تنہائی اور بدبو کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہاں چند روز رہنے کے بعد آدمی بینائی سے محروم ہو جاتا ہے اور اپنی موت کی دُعائیں مانگنے لگتا ہے۔"

"تم وہاں کیوں رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"اس جہنم زار میں کوئی بھی اپنی خوشی سے نہیں جاتا۔ مجھے وہاں سزا کے طور پر بھیجا گیا تھا اور یہ سزا مجھے اس لیے دی گئی تھی کہ میں ذہنی طور پر عام نادیوں سے زیادہ صلاحیت رکھتا تھا۔"

"یہ سزا کس نے دی تھی؟"

"جب میں جوان ہوا تو ایک بار یہاں سے نکل کر اوپر اُس شہرِ خوابیدہ میں چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے عرفانیوں کو بہتر زندگی گزارتے دیکھا تو میرے دل میں بھی ویسی ہی زندگی گزارنے کی خواہش مچل اٹھی۔ میں نے اُن سے بحث کی جس نے تکرار اور پھر لڑائی کی صورت اختیار کر لی۔ میں نے اپنی آہنی سلاخ سے کچھ عرفانی مار ڈالے۔ اس جرم کی پاداش میں اُنھوں نے مجھے گرفتار کر کے ایک اندھیری کھوہ میں ڈال دیا۔ تم اُس اندھیرے جہنم کا تصور بھی نہیں کر سکتے سرفروش۔"

"اگر وہ ایسا ہی جہنمی عقوبت خانہ ہے تو پھر وہاں انسان زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتا ہوگا؟"

"عرفانی اپنے فلسفۂ عدم تشدد کے باوجود بڑے ظالم اور سنگدل ہوتے تھے۔ وہ اس عقوبت خانے کے قیدیوں کو نلکیوں کے ذریعے کھانا اور پانی بہم پہنچایا کرتے تھے مگر وہ ایسی غذا ہوتی تھی جو آدمی کی عمر گھٹاتی نہیں بلکہ بڑھا دیا کرتی تھی تاکہ وہ زیادہ عرصے تک زندہ رہ کر سزا کا عذاب بھگتتا رہے۔"

رستم کی اس بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس فضا میں وٹامنز کے ساتھ ساتھ نشہ آور دوائیں بھی شامل کر دی جاتی ہوں گی

"پھر تم اس عقوبت گاہ سے بچ کیسے نکلے؟" میں نے سوال کیا۔

"اُس خوشبودار بم کی بدولت جس نے عرفانیوں کو توانائی کی ترسیل سے محروم کر کے آناً فاناً زندہ موت کی نیند سُلا دیا۔"

"میں سمجھا نہیں کہ خوشبودار بم سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"وہ بم گرنے کے بعد ہر طرف ایک عجیب سی خوشبو پھیل گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی عرفانی، توانائی سے محروم ہو گئے تھے۔ اس بم [نے] عرفانیوں کو اس طرح سُلا دیا کہ وہ جس عالم اور جس بھی حال میں تھے منجمد سے ہو کر رہ گئے۔ اس بم نے زیرِ زمین نادیوں کو بھی متاثر کیا چونکہ وہ زمین کے اندر تھے اس لیے منجمد تو نہ ہو سکے لیکن مرد صاحبِ اولاد بننے کے قابل نہ رہے۔ شاید اس بم کا اثر پاتال تک نہیں [پہنچا] تھا اس لیے میں بچ گیا۔ پھر مجھے نادیوں نے اُس تاریک اور گہرے جہنم سے نکال لیا۔ تب سے اب تک میں افزائشِ نسل کے [لیے] کوشاں ہوں۔ میں نے تمہیں بھی محض اسی لیے قتل نہیں کیا کہ ہماری بہترین نسل اوپر جا کر شہرِ خوابیدہ اور عرفانیوں کا ورثہ اپنا سکے۔ [...] نسل بہتر زندگی کی اہل ہوگی اور عرفانیوں کا طرزِ حیات اپنا سکے گی۔" [...] نے وضاحت کی۔

"بہترین نسل سے تمہاری مراد کیا ہے؟"

"نادی ذہنی طور پر پسماندہ مخلوق ہے اور اُسے ذہنی ارتقا کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہے لیکن ہم دونوں اس عرصے کو مختصر کر سکتے ہیں۔ تم ذہنی طور پر عرفانیوں سے کم نہیں ہو جب کہ میں بھی نصف عرفانی ہوں۔ میری ماں نادی نسل کی تھی مگر میرا باپ عرفانی تھا جسے (کسی جرم کی پاداش میں پاتال بھیج دیا گیا تھا۔ اپنے باپ کی وجہ سے میری ذہنی استعداد نادیوں سے کہیں بہتر ہے۔ یہی حال شیلو کا بھی ہے۔"

"کیا اس کا باپ بھی کوئی عرفانی تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" اس نے جواب دیا۔ "اس کی ماں عرفانی تھی در اصل ایک نادی پاگل ہو کر اوپر چلا گیا۔ وہاں اُسے سب سے پہلے جو عرفانی عورت دکھائی دی، اُس نے اُسے زبردستی اپنی بیوی بنا لیا۔ عرفانیوں نے اُس پاگل کو پکڑ کر پاتال کی کھوہ میں ڈال دیا لیکن جب اُس عورت کے بطن سے لڑکی پیدا ہو گئی تو انھوں نے اُسے نادیوں کے حوالے کر دیا۔ وہی لڑکی شیلو ہے۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور اپنے سر پر انگلی سے گول سا نشان بنانے لگا۔ اس سے قبل میں دارا کو بھی اپنے سر پر انگلی سے یہی نشان بناتے دیکھ چکا تھا۔

"تم اپنے سر پر یہ نشان بنا کر اپنے کسی دیوتا کی خوشنودی حاصل کرتے ہو؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"نہیں۔ ہم نادی سوچ بچار کرتے ہوئے یہ حرکت کرنے لگتے ہیں جب عرفانی زندہ تھے، وہی ہمارے دیوتا تھے مگر اب وہ زندہ موت کی نیند سو چکے ہیں اس لیے ہمارا کوئی دیوتا باقی نہیں رہا۔"

مجھے شہرِ خوابیدہ کے متعلق اب تک کسی سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکی تھیں لیکن رستم وہ باتیں جانتا تھا جن کی مجھے تلاش تھی۔ چنانچہ میں نے بات سے بات کا سرا جوڑتے ہوئے پوچھا "کیا عرفانیوں کا بھی کوئی دیوتا تھا؟"

"وہ قمرانیوں کی پرستش کرتے تھے جو چاند نما سرزمین پر بستے ہیں مگر پھر اُنھوں نے قمرانیوں کی پرستش چھوڑ دی اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا مگر قمرانی، عرفانیوں سے کہیں زیادہ چالاک ہیں۔ اُنھوں نے ایک بم کے ذریعے عرفانیوں کی زندگی منجمد کر دی۔ [وہ] جب چاہیں توانائی کی ترسیل بحال کر کے عرفانیوں کو اس طویل اور اذیت ناک حالت سے بیدار کر سکتے ہیں۔"

میں اُس سے نیا سوال کرنا ہی چاہتا تھا کہ وہ خود ہی بول اٹھا۔ "اب مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ قمرانیوں کا معبود کون ہے اور وہ کن دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ میں تمھیں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں بتا سکوں گا کہ میں خود قمرانیوں کے بارے میں لاعلم ہوں۔"

یہ سُن کر میں خاموش ہو گیا۔ اب اگر میں مزید سوال کرتا تو اُسے غصہ آ جانے کا اندیشہ تھا۔

"میں نے تمھیں اس لیے زندہ رہنے دیا ہے کہ مجھے نئی اور بہتر نسل کی ضرورت ہے۔ اگر مجھے نئی اور بہتر نسل نہ مل سکی تو موت ہمارا مقدر بن جائے گی لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ تمھاری موت ہم سے بہت پہلے واقع ہو سکتی ہے۔" اس نے قدرے توقف سے کہا۔

میں اُس کی اِس دھمکی پر مُسکرا دیا اور بولا: "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو، رستم؟"

"میں تمھیں بتا چکا ہوں تم میرے پانچ نادیوں کے برابر طاقتور ہو۔ تمھاری ذہنی استعداد مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے میں نے تمھاری نگرانی کے لیے بیس محافظ مقرر کیے ہیں۔ پچاس آدمیوں کا ایک دستہ اُن کے علاوہ تم پر نظر رکھتا ہے تاکہ تم کہیں فرار نہ ہو سکو۔" اتنا کہہ کر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں: "تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو اور کیوں آئے ہو... مجھے اسی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم بہتر نسل پیدا کر سکتے ہو اس لیے تمھیں ہر طور میرا ساتھ دینا ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ ہم نہ عرفانیوں کی طرح چالاک ہیں اور نہ ہی خوب صورت ہیں مگر ایک معاملے میں ہمیں اُن پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ لوگ صرف انسان تھے مگر ہم مکمل انسان ہیں۔ ہمیں زندگی بسر کرنے کے لیے کسی برقی توانائی کی ضرورت نہیں، اس لیے ہمیں زندہ موت کی نیند نہیں سُلایا جا سکتا۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے کان میں لگے ٹاپ کو چھوا۔

"اگرچہ میرے اور شیلو کے کان کی لَو میں یہ آلہ لگا ہوا ہے لیکن ہم اس کے محتاج نہیں ہیں۔ تاہم ان کی وجہ سے نادی ہمیں اپنے سے برتر سمجھتے ہیں ویسے ہم ذہنی طور پر نادیوں سے بہت آگے ہیں مگر تم ہم سے بھی آگے ہو، اس لیے مجھے تمھاری ضرورت ہے۔"

اس پر مجھے تورسے کی بات یاد آ گئی۔ اُس نے کہا تھا کہ اُسے میری ضرورت ہے۔ کیا وہ شیلو کے خلاف سازش کرنا چاہتا تھا؟ اچانک میری ذہنی رَو ڈاکٹر فریدون کی طرف چلی گئی جو اب تک مجھے تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"اگر تم جانتے ہو کہ توانائی کا منبع کہاں ہے اور وہ منبع تم مجھے دکھا دو تو اس کی کارکردگی سمجھنے کے بعد میں تمھاری خواہشوں کی تکمیل کے لیے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"نہیں... یہ بات میرے لیے بے حد خطرناک ثابت ہو سکتی ہے سرفروش! توانائی کی ترسیل بحال ہوتے ہی عرفانی اقتدار کے مالک بن جائیں گے اور ہمیں ان سے کبھی نجات نہیں ملے گی۔"

"تمھارا خیال غلط ہے" میں نے اُسے دلیل دی "اگر توانائی کے مخرج پر تمھارا قبضہ ہو جائے تو وہ تمھارے غلام ہی نہیں ہوں گے بلکہ ان کی زندگی بھی تمھارے رحم و کرم پر ہوگی. پھر وہ تمھاری اور تمھارے آدمیوں کی حکم عدولی نہیں کر سکیں گے تب تم اپنی قوم کے ساتھ اُوپر زندگی گزار سکو گے. تمھاری ہر خواہش بآسانی پوری ہو سکے گی."

"اور قمرانیوں کا کیا ہوگا. وہ سب کچھ جان لیتے ہیں اور ہر حرکت پر نظر رکھتے ہیں" رستم نے پُوچھا.

"کیا شہرِ خوابیدہ میں ہونے والی ہر حرکت اور ہر اقدام کا اُنھیں علم ہو جاتا ہے؟"

"ہاں..." رستم نے جواب دیا "جونہی تم نے شہرِ خوابیدہ میں قدم رکھا ہوگا، اُنھیں تمھاری آمد کا علم ہو گیا ہوگا. پھر اُنھوں نے ہماری طرح تمھاری ہر حرکت پر بھی نظر رکھی ہوگی. تمھیں شاید اس بات کا علم نہیں کہ جھیل والے پارک سے لے کر اس زیرِ زمین دُنیا (یر) آنے تک ہر لمحے میرے آدمی تمھاری کڑی نگرانی کرتے رہے (ہیں). تمھارا کوئی اقدام مجھ سے اور شیلو سے مخفی نہیں رہا."

"اوہ" بے اختیار میرے مُنہ سے نکل گیا. "مجھے بھول کر بھی یہ احساس نہ ہو سکا کہ تمھارے آدمی میرا پیچھا کرتے رہے ہیں. (ہاں) ٹھکنے کی آواز سے مجھے اندازہ ہُوا تھا کہ یہاں میرے علاوہ بھی کوئی ذی رُوح موجود ہے."

"جس احمق نے یہ حرکت کی تھی اب وہ پاتال میں اس کی سزا بُھگت رہا ہے."

بات پھر موضوع سے ہٹ گئی تھی اس لیے میں نے کہا "ہم توانائی کے مخرج کی بات کر رہے تھے. اگر قمرانیوں کو یہ پتہ چل گیا کہ ہم نے مخرج پر قبضہ کر لیا ہے تو بھی وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے... کیوں کہ ہم عرفانیوں کی طرح مشینی انسان نہیں ہیں جنھیں زندگی گزارنے کے لیے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر ہم عرفانیوں کی طرح کوئی حماقت نہیں کریں گے بلکہ اُن سے معاہدہ امن کیا جائے گا. ہم ان سے کہیں گے کہ ہمیں، ہمارے حال پر چھوڑ دیا جائے. اگر اُنھوں نے کہا کہ اُنھیں دیوتا سمجھا جائے تو ہم اُنھیں دیوتا سمجھ لیں گے کہ اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا."

"یہ سب کچھ کہنا تو بہت آسان ہے، سرفروش مگر اس کا عمل میں آنا مشکل ہے. ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ قمرانی ہمیں درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھیں وہ لوگ طویل منصوبہ بندی سے کام لیتے ہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ اوّل اوّل ہمارے خلاف کوئی اقدام نہ کریں

آہ... شہرِ خوابیدہ میں عرفانیوں جیسی خوبصورت زندگی گزارنا ہمارے لیے کتنا خوش آیند خواب ہے! لیکن یہ ساری باتیں قبل از وقت ہیں، سرفروش. ابھی میری قوم اور میرا قبیلہ اس قابل نہیں کہ عرفانیوں کا طرزِ حیات اپنا سکے. پھر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا... کہ عرفانی ہمارے ساتھ تعاون کریں گے یا جھگڑا؟ ہو سکتا ہے وہ ہمارے غلام بننے کی بجائے اس زندہ موت کو ترجیح دیں جو اُنھیں مبتلائے خواب رکھتی ہے."

"جب تک توانائی کا مخرج ہمارے قابو میں رہے گا، وہ ہمارے غلام بننے پر مجبور ہوں گے. مجھ پر اعتماد کرو کہ اگر اُنھیں زندگی اور خوابِ مسلسل میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کے لیے کہا جائے تو وہ یقیناً زندگی کو ترجیح دیں گے. میں اس بات کے لیے اپنی زندگی کی شرط لگانے کو بھی تیار ہوں."

رستم خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا تو میں نے پھر کہا "اچھی طرح سوچ لو اس سے زیادہ سنہرا موقع پھر کبھی نہیں مل سکتا. مجھے توانائی کے مخرج پر لے چلو تاکہ میں اُس کی کارکردگی کا جائزہ لے سکوں."

"تم نے مجھے دلیلوں سے قائل کر دیا ہے کہ ہم عرفانیوں کو اپنا غلام بنا کر بہتر زندگی گزار سکتے ہیں، ہمارے تمام حسین خواب تعبیر ہو سکتے ہیں مگر مشکل یہ ہے، سرفروش کہ مجھے توانائی کے مخرج کا علم نہیں ہے."

رستم کی اس بات نے میری ساری اُمنگیں اور اُمیدیں ختم کر دیں مگر پھر بھی میں نے کہا "تم توانائی کے مخرج سے کیسے لاعلم رہ سکتے ہو، رستم! تم بادشاہ ہو اور اپنی قوم کے سربراہ ہو. ایک بادشاہ اور سربراہ اس بات سے کیسے لاعلم ہو سکتا ہے؟"

"مجھے عام نادیوں جیسا احمق مت سمجھو، سرفروش. میرا خیال ہے کہ عرفانیوں کی اکثریت بھی توانائی کے مخرج کا محلِ وقوع نہیں جانتی تھی... پھر میرے آدمی یا میں کیسے جان سکتا ہوں؟ البتہ ایک ہستی ضرور جانتی ہوگی."

"شیلو؟" میں نے اندازہ لگایا.

"ہاں" اس نے جواب دیا "وہ مخرجِ توانائی کا محلِ وقوع جانتی ہے. کیسے؟ یہ مجھے بھی معلوم نہیں. جب میں بادشاہ بن کر منصوبے بنانے لگا تو شیلو نے مجھے اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی. اُس نے مجھ سے ایک وقتِ مقررہ پر شہرِ خوابیدہ پر نظر رکھنے کے لیے کہا اور خود کہیں غائب ہو گئی. جب وقتِ مقررہ پر میں زمینی راستے سے باہر جھانکا تو ایک لمحے کے لیے پورے شہرِ خوابیدہ میں زندگی جاگ اُٹھی مگر دوسرے ہی لمحے شہر اور شہر کے لوگ دو(بارہ)

منجمد ہو گئے. اُنھیں شیلو نے جگایا تھا اُنھیں لمحے بھر کی زندگی شیلو نے عطا کی تھی. توانائی کے مخرج کا راز وہی جانتی ہے اور یہ راز اُس نے اپنے سینے میں دفن کر رکھا ہے اگر یہ راز مجھے معلوم ہو جاتا تو کیا شیلو تمھیں زندہ نظر آ سکتی تھی؟"

اب میری سمجھ میں آیا کہ رستم کتنا گہرا آدمی ہے.

"میں شیلو سے یہ راز اگلوانے کی کوشش کر سکتا ہوں بشرطیکہ وہ مجھ سے نفرت نہ کرتی ہو" میں نے کہا.

"نفرت؟" رستم نے قہقہہ لگایا "وہ تو تمھیں چاہتی ہے، سرفروش، وہ تمھارے ساتھ مل کر میرے خلاف سازش کا منصوبہ بنانے کی فکر میں ہے اُس کا خیال ہے کہ تم اور وہ مل کر مجھ سے بہتر حکمرانی کر سکتے ہو."

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا. میرے پاس کوئی جواب تھا بھی نہیں کہ نورے، شیلو کے ارادوں کی طرف نشاندہی کر گئی تھی. رستم نے بھی جیسے میرے دل کا حال پڑھ لیا.

"وہ جلد ہی تم سے رابطہ قائم کرے گی. تم اپنے آپ کو اُس کا دوست ظاہر کرو گے تاکہ توانائی کے مخرج کا محلِ وقوع معلوم ہو سکے. تمھیں اُس کے ساتھ مل کر میرے خلاف سازش کرنا پڑے گی سرفروش، مگر تم اُس سازش پر عمل نہیں کرو گے. بس میں تم سے یہی چاہتا ہوں."

"کیا تمھیں مجھ پر مکمل اعتماد ہے؟" میں نے پُوچھا.

"مجھے تم پر قطعی اعتماد نہیں... لیکن میرے جاسوس اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں. میرے پاس ایک ہزار جنگجو ہیں جب کہ شیلو کے پاس پچاس بھی نہیں ہوں گے. اگر تم نے مجھے دھوکا دیا تو ہمارے درمیان خون ریز جنگ ہوگی اور وہ جنگ میں ہی جیتوں گا. اس طرح ممکن ہے، میرے تمام منصوبے ناکام ہو جائیں اور موت میری قوم کا مقدر بن جائے لیکن تم اور شیلو بھی زندہ نہیں ہو گے. یہ فیصلہ تمھیں خود ہی کرنا ہے کہ میرا ساتھ دو یا شیلو کا... اور یہ بھی یاد رکھنا کہ تمھاری عمر مجھ سے بہت کم ہے. کیا تمھارے لیے یہ بہتر نہ ہوگا کہ مرنے کی بجائے زندہ رہو اور بڑھاپے میں حاکم بن کر جیو."

میں اُسے جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا.

"اب تم جا سکتے ہو مگر آشی کے ذریعے مجھے ہر بات سے مطلع کرتے رہنا. وہ مجھے بہت عزیز ہے اس لیے اُس کا خیال رکھنا. میرا خیال ہے کہ وہ تمھاری بیٹی کم اور جاسوس زیادہ ہے."

میری اس بات پر رستم نے قہقہہ لگایا اور تخت سے اُٹھ کھڑا ہُوا... میں بھی باہر کو چل دیا جہاں وہ سراپا قیامت میری راہ دیکھ رہی تھی.

میں آشی کو اپنے ساتھ لے تو آیا لیکن جب کبھی میں اُس کی طرف دیکھتا تھا، میری نگاہیں اپنے آپ جھک جاتی تھیں. بارہ سال کی ایک معصوم صُورت کی طرف دیکھنا میرے بس کی بات نہیں تھی. اس لیے میں نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اُن فرائض کی تکمیل میں مصروف رہا جو شاہ رستم نے میرے ذمے لگائے تھے.

اس دوران نورے میرے پاس آتی رہی اُس کی زبانی مجھے ملکہ شیلو کے بارے میں جو معلومات حاصل ہُوئیں، اُن کا لُبِ لباب یہ ہے کہ شیلو اپنے آپ کو نادیوں میں رہنے اور پروان چڑھنے کے باوجود عرفانیوں سے زیادہ قریب سمجھتی ہے اور اُس نے عادات و خصائل بھی اُنھی کے اپنا رکھے تھے. وہ عرفانی عورتوں جیسا مختصر لباس پہنتی تھی مگر اس لباس پر ایک سیاہ لبادہ بھی اوڑھ لیا کرتی تھی جس سے اُس کی شخصیت میں چار چاند لگ جاتے تھے..

شیلو کی قیام گاہ میں ہر چیز شہرِ خوابیدہ سے لائی گئی تھی اور وہ غذا بھی عرفانیوں والی ہی پسند کرتی تھی. اُسے پانی کی بجائے وہ شیریں مشروب مرغوب تھا جو میں نے پہلی بار جھیل والے پارک میں پیا تھا.

نورے نے مجھے یہ بتایا تھا کہ اگر شیلو کو ایک خاص راز معلوم نہ ہوتا تو رستم اُسے بہت پہلے اپنے راستے سے ہٹا چکا ہوتا. میں نورے کی اس بات سے سمجھ گیا تھا کہ یہ راز برقی توانائی کے مخرج کا محلِ وقوع ہی ہو سکتا ہے جب کہ نورے اسے شیلو کا دوغلاپن سمجھتی تھی. اُس کا کہنا تھا کہ شیلو، رستم سے نفرت کرنے کے باوجود اُس کی موجودگی میں اپنے ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ چپکائے رکھتی ہے نورے کا کہنا تھا کہ شیلو، رستم سے اتنی خوف زدہ ہے کہ جب وہ نوجوان نادیوں کو تخلیے میں بُلاتی ہے تب بھی اس ڈر کے مارے رستم کے خلاف کچھ نہیں بولتی کہ کہیں وہ رستم کے جاسوس نہ ہوں.

شیلو اپنے فارغ اوقات میں عرفانیوں کی کتابیں پڑھا کرتی تھی اُس نے نورے کو بتایا تھا کہ عرفانی ہر ماہ اپنا خُون بدل لیا کرتے تھے اور ایسی کیمیاوی خوراک استعمال کرتے تھے جو اُنھیں ہمیشہ جوان رکھتی تھی اور اُنھی وجوہ کے باعث اُنھیں موت بھی نہیں آتی تھی.

عرفانی لوگ خاندانی منصوبہ بندی پہ سختی سے عمل پیرا تھے۔ جب اُن کی آبادی مقررہ حد سے تجاوز کر لی تو وہ قرعہ اندازی کے ذریعے زائد لوگ چھانٹ کر سائنسی عمل سے حنوط کر کے رکھ دیتے تھے تاکہ بوقتِ ضرورت اُنھیں دوبارہ جسدِ انسانی میں تبدیل کر سکیں۔

دُرسے نے بتایا تھا کہ شیلو صرف اپنے سفید بالوں کی وجہ سے عمر رسیدہ نظر آتی ہے حالاں کہ جسمی اعتبار سے وہ بے حد جوان ہے اُسے اپنے نصف عرفانی ہونے پہ ناز تھا اور وہ کہا کرتی تھی کہ وہی شہرِ خوابیدہ کے لوگوں پہ حکمرانی کر سکتی ہے... لیکن یہی خواب رستم بھی دیکھ رہا تھا۔

جلد ہی آشی میرے لیے دردِ سر بن گئی۔ جب میں تھک ہار کر آرام کرنے کے لیے لیٹتا، وہ میرے پاس آ جاتی لیکن میں بڑی سختی سے اُسے دھتکار دیا کرتا تھا۔ اس کے سلسلے میں مجھے ایک ایسی بات معلوم ہوئی تھی جس کی وجہ سے مجھے اُس سے گھن سی آنے لگی۔ میں نے اُسے بُری طرح ڈانٹ دیا۔ میرے اس رویے پر وہ مجھے دھمکیاں دینے لگی کہ اپنے باپ سے شکایت کر دے گی۔

مجھے غصہ آ گیا۔

میں نے اُسے پکڑ کر دو گھونسے جڑ دیے۔ وہ شیطان کی خالہ بُری طرح چیخنے چلّانے لگی۔ اس وقت دروازے پر نادی خواتین موجود تھیں۔ آشی کی چیخ پکار سُن کر ایک عورت اندر آ گئی۔

"نکل جاؤ" میں اُسے دیکھ کر دھاڑا تو وہ عورت گھبرا کر باہر چلی گئی اور اُس نے تمام عورتوں کو بتا دیا کہ میں رستم کی بیٹی پہ ہاتھ اُٹھا رہا ہُوں اتنے میں دارا آ گیا اور ہاتھ جوڑ کر، لرزتے ہُوئے بولا "ایسا نہ کیجیے۔ آشی کو مارنا رستم پہ ہاتھ اُٹھانے کے مترادف ہے"

"بکواس مت کرو" میں نے اُسے ڈانٹا "مَیں باہر جا رہا ہُوں۔ اگر میرے بعد یہ کوئی گڑ بڑ کرے تو تم بھی اس کا لحاظ نہ کرنا" یہ کہہ کر میں پاؤں پٹختا ہُوا کمرے سے نکل گیا۔

میری قیام گاہ کے باہر بیس محافظوں کا دستہ متعین تھا۔ وہ لوگ خواتین کی قطار پہ نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ میری بھی کڑی نگرانی کیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے مجھے باہر آتے دیکھا تو فوراً نرغے میں لے لیا اور اُن کا سردار بولا "تمھیں باہر نہیں آنا چاہیے تھا"

"کیوں؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"تمھارے باہر آنے پہ پابندی ہے"

"میں زیادہ دیر تک یہ پابندی برداشت نہیں کر سکتا! رستم کے پاس لے چلو" یہ کہہ کر میں نے قدم اُٹھایا تو محافظوں نے اپنی بھالا نما آہنی سلاخیں مجھ پر تان لیں۔

"اگر تم واپس نہ گئے تو ہم تمھیں قتل کرنے پہ مجبور ہو جائیں گے"

میں نے اس کی سلاخ ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے جواب دیا "اسے ہٹاؤ دوست۔ تم مجھے نہیں مار سکتے۔ اگر تم نے مجھے ذرا سا بھی نقصان پہنچایا تو تمھیں پاتال میں پھینک دیا جائے گا"

"اگر تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو اس سلاخ کی نوک تمھارے دل میں اُتر جائے گی چاہے مجھے پاتال ہی میں کیوں نہ پھینک دیا جائے" محافظوں کے سردار نے پُورے عزم سے مجھے تنبیہ کی۔

میں رُک گیا۔

"اچھا تم یہ تو کر سکتے ہو کہ اپنا ایک آدمی رستم کے پاس بھیج دو اور یہ کہو کہ میں اُس سے ملنا چاہتا ہُوں"

محافظوں کا سردار کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا "ٹھیک ہے میں تمھارا پیغام بھجوا دیتا ہُوں"

اُس نے ایک آدمی بھیج دیا۔

"اب تم واپس چلے جاؤ" اس نے مجھے حکم دیا۔

"میں یہاں عاجز آ گیا ہوں ان بدبختوں نے مجھے پریشان کر دیا ہے" میں نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

"کاش! یہ پریشانی مجھے لاحق ہوتی" ایک محافظ ہنس کر بولا اور باقی سب ہنس دیے۔

میں نے اُن کے سردار سے کہا "دیکھو دوست! کمرے میں پڑے پڑے میرا جسم اینٹھ گیا ہے۔ مجھے اس وقت تک یہاں چہل قدمی کی اجازت دے دو جب تک تمھارا پیام واپس نہیں آ جاتا۔"

وہ کچھ سوچنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ انکار کرتا، میں پھر بول اُٹھا "مجھ سے ڈرتے ہو کیا، تم بیس ہو اور میں اکیلا۔ اُدھر سے نہتا۔ اس لیے میں بھاگنے کی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔ بس تھوڑی دیر کے لیے مجھے ٹہلنے کی اجازت دے دو"

"اچھی بات ہے" وہ بولا اور اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگا۔

اب دس آدمی میرے آگے پیچھے ہو گئے۔

میں اُن کے نرغے میں ٹہلنے لگا۔ میں نے چہل قدمی کے دوران غار کا جائزہ لیا۔ ایک جانب وہ تنگ تر تھا اور دوسری جانب چوڑا ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ فاصلے پہ مجھے پچاس محافظوں کا دستہ بھی نظر آ گیا گویا میرے فرار کے سارے راستے مسدود تھے مگر ایک جگہ غار کی دیوار میں مجھے آہنی سیڑھی بھی دکھائی دے گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ اُوپر ڈھکنا موجود تھا جسے ہٹا کر شہرِ خوابیدہ میں پہنچا یا جا سکتا تھا۔

میں یہ چیزیں اس لیے ذہن نشین کر رہا تھا کہ اگر کبھی فرار کا موقع ملے تو راستے کی تلاش میں مشکل پیش نہ آئے۔ ابھی میں محافظوں کے نرغے میں تھوڑی سی ہی چہل قدمی کر پایا تھا کہ قاصد لوٹ آیا۔

"رستم کا فرمان ہے کہ سرفروش فوراً اپنی قیام گاہ میں لوٹ جائے اور پھر کبھی باہر نکلنے کی جرأت نہ کرے۔ اُسے ملاقات کے لیے پیغام بھیجنے کی جسارت بھی پسند نہیں آئی۔ وہ بادشاہ ہے اور کسی سے بھی اپنی خوشی سے ملاقات کی جا سکتی ہے، دوسرے کی خواہش پر نہیں تاہم آج کسی وقت وہ خود اِدھر آئے گا تاکہ اپنی بیٹی سے ملاقات کر سکے۔ اُس وقت وہ سرفروش کو بھی شرفِ ملاقات بخشے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا ہے کہ آشی کا خاص خیال رکھا جائے اور اُسے ہرگز ہرگز کوئی تکلیف نہ پہنچے" قاصد نے ہانپتے ہُوئے کہا۔

ہر چند کہ رستم نے ملاقات سے انکار کر دیا تھا لیکن میں اُس کے پیغام کو بھی اپنی چھوٹی سی فتح سمجھتا تھا۔ بیٹی سے ملاقات کا مطلب دراصل مجھ سے ہی ملاقات تھا... محافظوں کے سردار نے مجھے فوراً اپنے کمرے میں چلے جانے کا حکم دے دیا۔

"شکریہ دوست! میں تم سے بہت خوش ہُوں اور رستم سے تمھاری سفارش کروں گا"... یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

کمرے میں نہ تو دارا تھا اور نہ ہی آشی موجود تھی۔ میں نے دارا کو پُکارا تو مجھے کوئی جواب نہ مِلا۔ آشی نے بھی میری صدا کا جواب نہ دیا تو میں نے اُنھیں اُن کے کمروں میں تلاش کیا مگر وہ اپنے اپنے کمروں میں بھی نہیں تھے۔ میں سوچنے لگا کہ وہ باہر بھی نہیں نکلے تو کہاں جا سکتے ہیں؟

میری قیام گاہ میں آٹھ نو کمرے تھے۔ میں ایک ایک کمرے میں اُنھیں تلاش کرنے لگا۔ جب میں آخری کمرے میں داخل ہُوا تو وہاں میں نے جو منظر دیکھا، اُس سے میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

دارا کے چہرے اور گردن پر خراشوں سے خون بہہ رہا تھا جیسے کسی نے ہتھوڑے مار مار کر آشی کے جبڑے توڑ ڈالے ہوں اور اس کی گردن مروڑ کر اُسے مار دیا گیا ہو۔ مجھے لاش کی حالت دیکھ کر جھرجھری آ گئی۔

میں نے دارا سے پُوچھا جو دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا کر سسکیاں لینے لگا "یہ سب کیا ہے دارا؟ آشی کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"اسے میں نے قتل کیا ہے آقا" وہ لرزتے ہُوئے بولا۔ "میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس نے مجھے مجبور کر دیا۔ مجھے بُلاتی تھی اور پھر مجھ پہ تھوک دیتی، میرا چہرہ نوچ لیتی تھی۔ آخر مجھے اشتعال آ گیا اور میں نے اسے مار ڈالا"

"اس کا نتیجہ بھی جانتے ہو احمق؟" میں نے اُسے ٹھوکر مارتے ہُوئے کہا۔

"ہاں مالک رستم مجھے پاتال میں ڈال دے گا اور تمھیں قتل کر دیا جائے گا"

"مجھے کیوں قتل کیا جائے گا؟ اسے میں نے تو نہیں مارا"

"مگر میری ہر حرکت کی ذمّے داری آپ پر عاید ہوتی ہے کیوں کہ میں آپ کا غلام ہُوں۔ اس لیے یا تو مجھے پاتال میں جانے سے بچا لیجیے یا مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالیے"

"میں یہ دونوں کام نہیں کر سکتا۔ تمھیں اپنے کیے کی سزا خود ہی بھگتنا ہوگی" یہ کہہ کر میں جانے لگا کہ دارا میری ٹانگوں سے لپٹ گیا اور بولا "سُنیے مالک!"

"نہیں میں محافظوں کو اطلاع دینے جا رہا ہُوں" مَیں نے اُسے ٹھوکر مار کر ہٹاتے ہُوئے کہا۔

"پہلے میری ایک بات سُن لیجیے... پھر جو آپ کی مرضی" وہ بولا تو میں رُک گیا۔

"جب آپ آشی کو مار رہے تھے تو ایک عورت نے دیکھ لیا تھا اور پھر سب کو بتا دیا تھا۔ اس لیے مَیں سب سے یہی کہوں گا کہ آپ نے ہی اسے قتل کر دیا ہے اور سب میری بات کا یقین کر لیں گے۔ اس لیے یا مجھے بچا لیجیے یا پھر مجھے مار ڈالیے"

مَیں دارا سے اس کمینگی کی توقع نہیں رکھتا تھا بلکہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس کے ذہن میں کوئی ایسی چال بھی آ سکتی ہے۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ سب مجھے ہی آشی کا قاتل سمجھتے۔ اب میرے لیے

اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ رستم کی آمد سے پہلے پہلے دارا کے ساتھ فرار ہو کر اپنی اور اس کی جان بچاؤں۔ رہی دارا کی بلیک میلنگ تو اس کا حساب میں بعد میں بھی چکا سکتا تھا۔

میں ذہن پر زور دے کر فرار کی ترکیب سوچنے لگا۔

بظاہر فرار کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کیونکہ میری قیام گاہ کے باہر دائیں جانب تنگ غار میں بیس محافظ اور دائیں جانب کچھ فاصلے پر پچاس محافظ موجود تھے۔ پھر دروازے پر خواتین کا اجتماع تھا۔ اوپر سے ہم دونوں نہتے بھی تھے۔ ابھی میں انھی سوچوں میں گھرا ہوا تھا کہ باہر عورتوں نے واویلا شروع کر دیا۔

اب تک ہر مشکل وقت میں قدرت میری رہنمائی کرتی آئی تھی۔ اب بھی میں نے دل ہی دل میں خدا سے مشکل کشائی کی دعا مانگی تو میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور ایک ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ جب میں نے دارا کو وہ ترکیب بتائی تو وہ بولا: "یہ ناممکن ہے۔ ہم یہاں سے فرار نہیں ہو سکتے۔"

"بکواس مت کرو اور وہی کیے جاؤ، جو میں کہتا ہوں۔" میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے لات مار کر کہا تو وہ بادل ناخواستہ قیام گاہ سے نکل گیا۔

چند لمحے بعد بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپ نے مجھے بتا دیا کہ وہ کچھ محافظوں کے ساتھ آ رہا ہے۔ میں جلدی سے چھٹے کمرے میں چھپ گیا۔ پانچ محافظ دوڑتے ہوئے ساتویں کمرے میں داخل ہو گئے۔

میں نے فوراً کمرے سے نکل کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ دارا پھر باہر کو بھاگا اور اس بار مزید پانچ محافظوں کو یہ کہہ کر پانچویں کمرے میں لے آیا کہ میں پہلے محافظوں سے لڑ رہا ہوں۔ اُدھر ساتویں کمرے میں بند محافظ دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان آوازوں نے بعد میں آنے والے محافظوں کو اس مغالطے میں ڈال دیا کہ واقعی اندر میں ان سے لڑ رہا ہوں۔ اتنے میں ان کا سردار بھی صورت حال معلوم کرنے میرے کمرے میں آیا تو میں نے اسے دبوچ لیا اور اس کی کنپٹی پر کراٹے کا ایک ایسا ہاتھ مارا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اب اس کی آہنی سلاخ میرے قبضے میں آ گئی تھی۔ میں نے دارا کو غار میں لگی ہوئی آہنی سیڑھیوں کی طرف بھگا دیا تاکہ وہ ڈھکنا کھول دے اور خود باقی ماندہ محافظوں کے سامنے ڈٹ گیا۔ پہلے ہی ہلے میں میں نے چار محافظوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ پھر عورتوں میں گھس گیا۔ وہ چیختی چلاتی بھاگیں۔ ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ میں جلدی سے سیڑھی کی طرف لپکا مگر دارا ابھی تک ڈھکنا نہیں کھول پایا تھا۔ میں نے آہنی سلاخ کی نوک سے اسے کھسکایا تو ڈھکنا کھل گیا۔ اتنے میں محافظ بھی سیڑھی تک پہنچ گئے اور اپنی سلاخیں پھینکنے لگے۔ میں تو اوپر نکل گیا لیکن دارا سلاخوں کی زد سے نہ بچ سکا اور زخمی ہو گیا۔ میں نے اسے اوپر کھینچ تو لیا مگر اس کی حالت خراب تھی۔

اتنے میں محافظ بھی اوپر چڑھ آئے مگر میری آہنی سلاخ نے سطح زمین پر سر نکالنے والے دو محافظوں کو ڈھیر کر دیا اور وہ اپنے ساتھیوں پر جا پڑے۔ میں نے جلدی سے ڈھکنا بند کیا اور دارا کو سہارا دیے کر دوڑتا ہوا ایک عمارت میں گھس گیا۔

یہ عمارت کسی ورکشاپ سے مشابہ تھی۔

دارا کی حالت خراب تھی، اس لیے میں نے اسے اسٹور کے کاؤنٹر کی اوٹ میں لٹا دیا اور خود صورت حال کا جائزہ لینے اور سوچنے لگا۔ میرے لیے مشکل یہ تھی کہ میں باہر نہیں نکل سکتا تھا کیونکہ رستم مجھے بتا چکا تھا کہ اس کے آدمی پہلے بھی قدم قدم پر میرا پیچھا کرتے رہے ہیں اس لیے عمارت سے نکلنے کا مطلب ان کی نگاہوں میں آنے کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ چنانچہ میں باہر جانے کی بجائے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگا۔

ابھی میں پہلی ہی منزل پر پہنچا تھا کہ سناٹے میں مجھے ایک آواز نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ آواز باہر سے نہیں آئی تھی بلکہ یوں لگتا تھا جیسے اسی عمارت کی کسی بالائی منزل میں کچھ کھسکایا جا رہا ہو۔

میں تیزی سے مگر بے آواز قدموں کے ساتھ اوپر جانے لگا۔ وہ آواز اب تک آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی میز کھسکائی جا رہی ہو۔

جب میں چھٹی منزل پر پہنچا تو پتہ چلا کہ یہ آواز ایک بند کمرے کے اندر سے آ رہی ہے۔ میں گربہ پا چلتا ہوا دروازے کے قریب آیا اور چابی والے سوراخ سے اندر جھانکنے لگا۔

میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، وہ میرے لیے ناقابل یقین سا تھا لیکن میری آنکھیں اس حقیقت کو جھٹلا بھی نہیں سکتی تھیں۔

کمرے کے بیچوں بیچ ایک ٹیلی ویژن نما سیٹ رکھا ہوا تھا اور اس کے سامنے شیلو بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ وہ ٹیلی ویژن کی اسکرین پر دکھائی دینے والے آدمی سے مخاطب تھی۔ اس آدمی کا سر بڑا، گردن پتلی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔

"میں نے تونے کو اس کے پاس کئی بار بھیجا ہے اور مجھے امید ہے کہ میں اسے اپنے ساتھ ملا لوں گی مگر مشکل یہ ہے کہ رستم نے اسے قید کر رکھا ہے۔" شیلو کہہ رہی تھی۔

اس کی بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرے ہی بارے میں بات کر رہی تھی مگر کس سے؟ اور یہ ٹیلی ویژن نما چیز کیا ہے؟ میں نے وقتی طور پر ان سوالوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"میں نے اب تک اسے صرف ایک بار دیکھا ہے، وہ بھی اس وقت جب رستم میرے ساتھ تھا۔ اگر وہ اس کی .... قید میں نہ ہوتا تو میں اس سے مل چکی ہوتی۔ تم رستم پر حملہ کیوں نہیں کر دیتے جمشید؟ آخر میں کب تک تمھارے وعدوں پر زندہ رہوں گی؟"

"سنو شیلو!" اسکرین پر دکھائی دینے والے جمشید نے کہا: "ہمارے سائنس داں اجنبی کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں اس لیے اسے ہر قیمت پر محفوظ رکھنا تمھاری ذمے داری ہے۔"

"لیکن میں اسے کب تک اور کیسے بچا سکتی ہوں۔ میرے پاس صرف پچاس محافظوں کا دستہ ہے جن کی اکثریت رستم کی جاسوس ہے جبکہ رستم کے پاس ایک ہزار سے زیادہ جنگجو موجود ہیں۔ اس لیے اگر تمھیں اجنبی کی ضرورت ہے تو رستم پر بلا تاخیر حملہ کر دو۔"

"نہیں شیلو، ہم قمرانی ایک سو سال کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں مگر تم صرف ایک دن آگے کی سوچتی ہو۔ تمھیں صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ جہاں تک تم سے ہمارے وعدوں کا تعلق ہے، ہم انھیں ضرور پورا کریں گے مگر مناسب وقت آنے پر۔۔ جو اب زیادہ دور نہیں ہے۔ میری ہدایت ہے کہ تم کسی طرح اجنبی کو رستم کی قید سے رہائی دلا کر اپنے قابو میں رکھو کیونکہ ہمارے سائنس داں اس میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھیں شبہ ہے کہ یہ شخص ماضی کے کسی دور سے یہاں آیا ہے۔ ہمیں وقتاً فوقتاً صورت حال سے بھی آگاہ کرتی رہنا۔" یہ کہنے کے بعد اس آدمی کا عکس دھندلا پڑ گیا اور پھر بالکل ہی غائب ہو گیا۔

شیلو اٹھ کر سیٹ سے وہ اینٹینا اتارنے لگی جو کھڑکی تک چلا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بھی ایک اتفاق تھا لیکن اس اتفاق نے مجھ پر بہت سی باتیں منکشف کر دیں۔ پہلی تو یہ کہ شیلو ملکہ ہونے کے باوجود نادیوں کے خلاف قمرانیوں کی جاسوس تھی۔ دوسری یہ کہ انھوں نے اس جاسوسی کے عوض کچھ وعدے کر رکھے تھے۔ اور ان میں سے ایک وعدہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے اس شہر خوابیدہ اور اس کے باشندوں کی ملکہ بنا دیا جائے گا۔۔۔ اور تیسری اہم بات یہ کہ وہ لوگ میری ذات سے دلچسپی رکھتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ مجھے کوئی نقصان پہنچے۔ اس کا مطلب تھا کہ فی الوقت مجھے شیلو سے کسی خطرے کا اندیشہ نہیں تھا بلکہ ایک طرح سے وہ میری حفاظت کی ذمے دار تھی۔

میری ان سوچوں کے دوران شیلو نے وہ عجیب سی ٹی۔ وی سیٹ گھسیٹ کر ایک الماری میں رکھ دیا اور ایک ڈبہ کھول کر کوئی مشروب پینے لگی۔ اتنے میں میں نے دروازے پر دستک دی تو وہ اچھل گئی اور بے ساختہ بولی: "کون ہے؟"

"سرفروش!" میں نے جواب دیا۔

"سرفروش!" اس نے بے یقینی سے دہرایا: "نہیں تم سرفروش نہیں ہو سکتے۔"

"تم چابی کے سوراخ سے جھانک کر اپنا اطمینان کر سکتی ہو۔" میں نے چند قدم پیچھے ہٹتے ہوئے جواب دیا۔

چند ہی لمحے بعد دروازہ کھل گیا۔

"مگر تم۔۔۔ تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

میں نے اسے تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

"دارا کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں یہاں ہوں۔" نچلی منزل سے دارا کی آواز آئی اور پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا دکھائی دیا: "رستم کے آدمی ہماری تلاش میں ہیں۔ میں نے ان کی آوازیں سنی ہیں۔"

دارا کی حالت مزید خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اگرچہ مجھے بھی کچھ زخم آئے تھے مگر وہ کاری نہیں تھے لیکن دارا کے زخم کاری ہو سکتے تھے اس لیے میں نے شیلو سے کہا: "یہاں مرہم پٹی کا کوئی سامان ہے؟ اگر ہو تو سب سے پہلے اس کی مرہم پٹی کی جائے۔"

"مجھے مار ڈالو مالک۔" دارا بولا: "ہم دونوں رستم کے آدمیوں سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔"

"نہیں دارا! تم زندہ رہو گے۔ مجھے تمھاری ضرورت ہے۔" میں نے جواب دیا۔

شیلو نے اسے کوئی ٹانک پلایا پھر پلاسٹک نما کپڑا پھاڑ کر اسے پٹیاں باندھنے لگی مگر اس کے تاثرات سے صاف پتہ چلتا تھا جیسے اسے گھن آ رہی ہو۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہو گئی تو میں نے دارا سے کہا: "تم یہیں لیٹ کر آرام کرو۔ ابھی رستم کے آدمیوں کو یہاں تک پہنچنے میں وقت لگے گا۔ تب تک میں شیلو سے کچھ باتیں کر لوں۔"

یہ کہہ کر میں شیلو کو دوسرے کمرے میں لے آیا۔

"میں خود بھی تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی تھی۔" وہ بولی۔

"وہ بعد میں کرنا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ عرفانیوں کو اس زندہ موت سے نجات دینے والی توانائی کا مخرج کہاں ہے۔ تم اس توانائی کا سرچشمہ جانتی ہو اور اس بات کا مجھے علم ہے لہٰذا مجھے جھوٹ سے بہلانے کی کوشش نہ کرنا۔"

"لیکن وہ یہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔ وہاں جاتے ہوئے ہم نہ صرف رستم کے آدمیوں کی نظر میں آ جائیں گے بلکہ قمرانی بھی ہمیں

دیکھ لیں گے۔"

"وہ کیسے دیکھ لیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"چاند سے جو شعاعیں نکل رہی ہیں، وہ ہمارے عکس وہاں منتقل کر دیں گی۔" شیلو نے بتایا۔

"اگر وہ دیکھ لیں تو کیا اقدام کریں گے اور کب تک کریں گے؟"

"کیا کریں گے، یہ تو میں نہیں کہہ سکتی البتہ وہ کوئی قدم جلدی نہیں اُٹھائیں گے۔ وہ کوئی کام بھی طویل منصوبہ بندی کے بغیر نہیں کرتے۔"

"بہرکیف وہ جو اقدام کریں اور جب بھی کریں، مجھے اس کی پروا نہیں، تم مجھے وہ مخرج دکھا دو۔" میں نے فیصلہ سُنا دیا۔

"کیا تمھارا غلام بھی ساتھ چلے گا؟" اُس نے پُوچھا۔

"ہاں۔۔" میں نے جواب دیا۔

ہم کمرے سے نکل آئے۔ مرہم پٹی سے دارا کی حالت قدرے بہتر ہو گئی تھی اور وہ چلنے کے قابل ہو گیا تھا۔

شیلو ہمیں نیچے لانے کی بجائے عمارت کی چھت پر لے گئی اور پھر ہم ان عمارتوں کی چھتوں پر آگے بڑھنے لگے۔ شہر کی طرح عمارتوں کی چھتوں کا یہ سلسلہ بھی لامتناہی معلوم ہوتا تھا۔ تاحدِ نظر چھتیں ہی چھتیں دکھائی دے رہی تھیں ہم کودتے پھاندتے مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ اچانک ایک مقام پر مجھے کچھ نادیوں کی آواز سُنائی دی۔ میں نے جھانک کر دیکھا، رستم کے آدمی ہمارے ساتھ ساتھ اُسی سمت میں آگے بڑھ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ بالآخر اُنھوں نے ہمیں ڈھونڈ نکالا ہے اور اب سائے کی طرح ہمارے ساتھ لگے رہیں گے۔

چلتے چلتے ہم ایک ایسی عمارت کے قریب پہنچے جس کے بیچوں بیچ ایک گنبد تھا۔ میں نے شیلو سے پُوچھا "یہ کون سی عمارت ہے؟"

"بلدیہ۔ جہاں شہر کے سارے کرتا دھرتا اس وقت محوِ خواب ہیں۔ آہ۔ اس زندہ موت میں مبتلا ہونے سے پہلے وہ بس شدومد سے ایک دُوسرے کے ساتھ مباحثے میں لگے ہُوئے تھے۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہے؟"

"میں نے اُنھیں دیکھا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تمھی نے اُنھیں توانائی سے محروم کیا تھا۔"

"بے شک، مجھے اس کا اعتراف ہے۔ اُنھوں نے بھی تو مجھے پاتال میں رہنے والے نادیوں کے حوالے کر دیا تھا حالانکہ اپنی پیدائش میں میرا کوئی دخل نہیں تھا اور میں نصف عرفانی بھی تھی۔"

ہم گنبد کے چھجے پر سے کھسکتے ہُوئے دُوسری جانب پہنچے تو سامنے ایک بند دروازہ تھا اور شاید یہ اس شہر کا پہلا دروازہ تھا جس پر میں نے ایک بڑا سا قفل لگا دیکھا۔

شیلو آگے بڑھ کر قفل کھولنے کی بجائے کُنڈی کا قبضہ کھولنے لگی۔ اس کام میں میں نے بھی اس کا ہاتھ بٹایا کیونکہ اب رستم کے آدمیوں کی آوازیں قریب تر آنے لگی تھیں۔ وہ بھی غالباً چھتوں پر سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے مگر درمیانی گنبد کی وجہ سے ہم اُنھیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

جب کُنڈی کے پیچ کھل گئے اور کواڑ کُھلا تو میں نے اندر کا نظارا کرتے ہُوئے غصّے سے پُوچھا "یہ کیا ہے شیلو؟ تم ہمارے ساتھ کون سی چال چلنا چاہتی ہو؟"

وہ مسکرا کر بولی "اس میں کوئی چال نہیں ہے سرفروش! یہاں سیڑھیوں کی بجائے ایک پھسلواں راستہ بنا ہُوا ہے۔ جو میلوں گہرائی میں چلا جاتا ہے۔ کیا تم اس کے ذریعے اُترتے ہُوئے ڈرتے ہو؟"

"میں پھسلتے ہُوئے اُترنے سے نہیں ڈرتا لیکن اتنا احمق بھی نہیں کہ میلوں تک پھسلنے سے پیدا ہونے والی رفتار کا اندازہ نہ کر سکوں۔" میں نے کہا "اس وقت پینتالیس درجے کی یہ ڈھلان ہماری رفتار کو طوفانی بنا دے گی۔"

"پھسلنے کی رفتار بلاشبہ تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے سرفروش!" وہ بولی "لیکن آخری حصّے میں رفتار کم کرنے کے لیے چڑھائیاں بنا دی گئی ہیں۔ تمھارے اطمینان کی خاطر پہلے میں پھسلوں گی۔"

ابھی وہ اپنی بات بمشکل ختم کر پائی تھی کہ عمارت کا دروازہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔

رستم کے آدمی تیزی سے قریب آتے جا رہے تھے۔

"کیا وہ اس گہرائی میں بھی ہمارا تعاقب جاری رکھیں گے؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہنس کر بولی "نادی گہرائی سے گھبراتے ہیں۔ وہ اس پھسلواں راستے پر قدم رکھنے کی بجائے مر جانے کو ترجیح دیں گے اُنھیں تنہا شعور ہی نہیں کہ وہ اس پر پھسلنے کی سوچ سکیں۔ چلو اب دیر مت کرو۔"

"تو پھر پہلے تم جاؤ۔" میں نے کہا۔

شیلو ڈھلان پر پشت کے بل لیٹ کر پھسلنے لگی۔

رستم کے آدمیوں کی آوازیں قریب تر آتی جا رہی تھیں۔

میں نے لپک کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور دارا سے کہا "چلو

تم بھی وہی کرو جو شیلو نے کیا ہے۔"

"نہیں نہیں آقا۔ مجھے مار ڈالو مگر پاتال میں مت بھیجو۔"

وہ گڑگڑانے لگا۔

میں نے اُسے کوئی جواب دینے کی بجائے دبوچ لیا اور پیٹھ کے بل لٹا کر نیچے دھکیل دیا۔ عین اُسی وقت دروازے پر سلاخوں کے دھماکے ہونے لگے۔ میں نے بآوازِ بلند کہا "پہلے میری بات سن لو نادیو۔ رُک جاؤ۔ میں سرفروش تم سے مخاطب ہُوں۔"

دروازے پر سلاخوں کی ضربیں بند ہو گئیں اور ایک آواز آئی "بولو۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"میں صلح کی گفتگو کرنا اور رستم کو ایک پیغام بھیجنا چاہتا ہُوں۔"

"تم تو ایک مُردے کی مثال ہو سرفروش اور مُردوں سے صلح کی بات چیت نہیں کی جا سکتی۔" باہر سے آواز آئی "اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم تمھیں کوئی ضرر نہیں پہنچائیں گے اور رستم کے پاس لے جائیں گے۔ جو کہنا ہو اُسی سے کہنا۔"

"اس دعوت کا شکریہ۔ پہلے یہ بتاؤ کہ کیا رستم کو آشتی کی موت کا علم ہو چکا ہے یا نہیں۔"

"ہاں، اور اُس نے قسم کھائی ہے کہ وہ تمھاری بوٹی بوٹی کر ڈالے گا۔"

"رستم کو بتا دینا کہ آشتی کو میں نے نہیں بلکہ دارا نے قتل کیا تھا۔ اس کا مجرم دارا ہے، میں نہیں۔"

"مگر تم نے اُسے بچایا ہے۔ وہ تمھارا غلام ہے اور اُس کے ہر فعل کے ذمّے دار تم ہو۔۔۔ یہ بات تم خود بھی اچھی طرح جانتے ہو۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن میں اُسے بچانے پر مجبور تھا۔ خیر بعد میں یہ تفصیل رستم کو خود ہی بتا دُوں گا۔ فی الوقت اُسے میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ میں توانائی کے مخرج کی کھوج میں ہُوں اور اس کا پتہ چلانا خود رستم کے مفاد میں ہے۔ اُسے کہہ دینا کہ ہم ایک دوسرے کے کام آ سکتے ہیں اور اُسے سب سے زیادہ خطرہ قمرانیوں سے ہے۔ بچاس محافظوں والی شیلو سے نہیں۔ جب میں توانائی کا مخرج ڈھونڈ لُوں گا تو اُسے قمرانیوں پر غالب آنے کا طریقہ بھی بتا دوں گا۔"

"یہ تو ہم اُسے بتا دیں گے۔" دوسری آواز آئی "لیکن تم بھی اس کا ایک پیغام سن لو۔ اُس نے کہا ہے کہ تمھاری محبوبہ نورسے اس کی قید میں ہے اگر تمھارے دل میں اُس کا ذرا سا بھی پیار ہے تو تم اپنے آپ کو اور شیلو کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ نورسے کے ساتھ عبرت ناک سلوک کیا جائے گا۔"

"نورسے میری محبوبہ نہیں ہے۔ رستم جو چاہے کرے مگر اُسے اتنا اور بتا دینا کہ مجھے دوست بنا کر وہ فائدے میں رہے گا اور دشمن بنا کر اُسے گھاٹے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔" میں نے جواب دیا۔

یکایک دروازے پر پھر سلاخوں کی ضربیں لگیں۔ میں ڈھلان پر پھسلنے کے لیے لیٹا تو دروازہ ٹوٹ گیا۔

میں نہیں جانتا کہ اُنھوں نے مجھے اس ڈھلوانی راستے پر پھسلتے ہُوئے دیکھا یا نہیں البتہ پھسلنے کی تیز رفتاری کے باعث ان کی آوازیں فوراً ہی معدوم ہو گئیں۔

میں نے آہنی سلاخ سینے پر رکھ کر اُس کا گول سرا اپنی ٹانگوں میں اڑس لیا تھا اور دونوں ہاتھ اس ڈھلان کے کناروں پر رکھ لیے تھے۔ یہ ڈھلان پینتالیس کے زاویے سے نیچے جا رہی تھی اس لیے میری رفتار سیکنڈوں میں طوفانی ہو گئی۔ میرے ہاتھوں اور پیٹھ میں پلاسٹک کی رگڑ سے تپش کا احساس ہونے لگا۔ سر بھی بُری طرح چکرا گیا اور جی متلانے لگا۔

شیلو نے بتایا تھا کہ یہ ڈھلان تقریباً پانچ میل لمبی ہے یہ فاصلہ اگرچہ منٹوں میں طے ہوتا تھا مگر یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے ہَوا میں معلق ہُوئے کئی گھنٹے گزر چکے ہوں اور اب میں لامتناہی خلا میں گر رہا ہُوں۔۔ پھر اچانک ہی راستے میں چڑھائیاں آنے لگیں جنھوں نے رفتار کم کر دی آخر میں یہ راستہ مسطح ہو گیا اور میں رُک گیا لیکن وہاں اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہیں دیتا تھا۔

مجھے رستم کی وہ بات یاد آ گئی جو اس نے پاتال کے متعلق بتائی تھی کہ وہاں جا کر انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ شاید میں اندھا ہو گیا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں اپنی آنکھیں مَلنے لگا اور اُٹھ بیٹھا۔

کچھ دیر بعد کچھ فاصلے پر، اُوپر روشنی کے نقطے سے دکھائی دینے لگے جو ستاروں کی طرح ٹمٹما رہے تھے لیکن یہ ستارے نہیں ہو سکتے تھے۔۔۔ تو پھر یہ ٹمٹماتی روشنیاں کیسی تھیں؟ تھیں بھی یا میرا وہم ہی تھا؟ مجھے ایک عجیب اور انجانے سے خوف کے باعث جھرجھری آ گئی۔

میں نے بے ساختہ آواز دی "شیلو! تم کہاں ہو؟"

اُوپر سے آواز آئی "میں یہاں ہُوں سرفروش۔ اُوپر دیکھو۔"

میں نے اُوپر دیکھا۔ تقریباً چالیس فٹ اُوپر ایک روشنی دائیں بائیں ہلنے لگی۔ ساتھ ہی شیلو کی آواز آئی "ڈھلانی راستے کے چند قدموں پر ایک سیڑھی ہے اس سیڑھی سے اُوپر آ جاؤ۔"

میں نے ٹٹول کر سیڑھی تلاش کی اور اُوپر چڑھنے لگا۔ وہ پوری چالیس سیڑھیاں تھیں۔ پھر ایک پلیٹ فارم۔۔۔ اور اُسی پلیٹ فارم

پر شیلو مشعل لیے کھڑی تھی۔

"دارا کہاں ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"میں یہاں ہُوں" ایک تاریک گوشے سے اُس کی آواز آئی۔

"جاؤ سامنے سے اپنے اور سرفروش کے لیے مشعلیں لے آؤ" شیلو نے اُسے حُکم دیا۔

"یہ مشعلیں یہاں کیسے آگئیں اور کس نے جلائی ہیں؟" میں نے پُوچھا۔

"میں نے جلائی ہیں" شیلو نے کہا "یہ مشعلیں نہیں بلکہ ایک قسم کی لکڑی ہے جب دو لکڑیاں آپس میں رگڑی جاتی ہیں تو جل اُٹھتی ہیں اور مشعل کا کام دیتی ہیں۔"

اتنے میں دارا دو مشعلیں لے آیا۔

میں نے ایک مشعل سنبھالتے ہُوئے شیلو سے کہا "دیر مت کرو شیلو۔ جلدی سے مجھے توانائی کا مخرج دِکھا دو کیوں کہ ابھی ہمیں کافی کام کرنے ہیں۔"

"وہ تو یہاں سے کافی دُور ہے۔"

"کتنی دُور؟" میں نے بے چینی سے پُوچھا۔

"تقریباً ایک میل... لیکن مشکل یہ ہے کہ راستے میں ہمیں جنگلی چوہوں سے پالا پڑ سکتا ہے۔"

چوہوں کا نام سُنتے ہی دارا میری ٹانگوں سے لپٹ گیا اور گڑگڑاتے ہُوئے بولا "مجھے یہیں چھوڑ دیں میں ان قاتل چوہوں کا لقمہ نہیں بننا چاہتا۔"

مجھے غصہ آگیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جنگلی بھینسے کی سی طاقت رکھنے والا یہ شخص غلام بن کر اتنا بُزدل کیوں ہو گیا ہے۔ میں نے اُسے ٹھوکر مارتے ہُوئے کہا "کھڑے ہو جاؤ، بُزدل! تمھیں چوہوں سے ڈرتے ہُوئے شرم نہیں آتی؟"

"یہ چوہوں سے ڈرنے میں حق بجانب ہے، سرفروش!" شیلو نے کہا "وہ قاتل چوہے بھیڑ کے برابر اور بھوک کے بھیڑیوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ بھوک میں وہ ایک دوسرے کو بھی چٹ کر جاتے ہیں۔ اِدھر دیکھو۔"

یہ کہہ کر وہ ایک گوشے کی طرف بڑھی اور اس نے اپنی مشعل بُلند کی تو میں نے دیکھا کہ ہڈیوں کے ایک پنجر نے ڈنگری نما لباس پہن رکھا تھا۔

"یہ ٹیکنیشن بھی انھی خفتہ لوگوں میں سے ہے مگر بھوک کے چُوہے اُسے چٹ کر گئے ہیں" شیلو نے وضاحت کی۔

"یہ غریب زندہ موت کی وجہ سے اپنی حفاظت نہیں کر سکتا تھا لیکن ہم کر سکتے ہیں" میں نے جواب دیا "چلو اب دیر مت کرو۔"

شیلو ہمارے آگے آگے چلنے لگی۔

اس راستے پر بھی نقلی سبزہ تھا۔

"ہم اس وقت کتنی گہرائی میں ہیں؟" میں نے پُوچھا۔

"سطحِ زمین سے تقریباً چھ میل نیچے۔"

"شاید اسی لیے مجھے سخت گرمی محسوس ہو رہی ہے اور پسینے کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے۔ کیا عرفانیوں نے یہاں ہَوا کی آمد و رفت کے لیے متبادل انتظام نہیں کیے تھے؟"

"متبادل انتظام کی بدولت ہی تو ہم یہاں سانس لے رہے ہیں ورنہ ہمارا دم نہ گھٹ جاتا... لیکن تعجب ہے کہ تمھیں گرمی کیوں محسوس ہو رہی ہے۔"

ہماری رفتار کافی تیز تھی۔

کچھ دیر ہم چپ چاپ چلتے رہے۔

اچانک پیچھے سے بڑی خوف ناک غراہٹیں سنائی دینے لگیں۔ دارا اُچک کر میرے اور شیلو کے درمیان آگیا اور لرزتے ہُوئے بولا "چوہے آ رہے ہیں۔"

"بھاگ جائیں گے۔ ڈرو مت" میں نے کہا۔

"یہ بھاگنے والے چوہے نہیں ہیں، سرفروش! یہ ہمارا پیچھا کرتے رہیں گے اور موقع ملتے ہی ہم پر ٹوٹ پڑیں گے" شیلو نے بتایا "اس لیے جتنا تیز چل سکتے ہو، چلتے رہو۔"

ہم نے رفتار بڑھا دی مگر چوہوں کی آوازیں قریب تر آتی چلی گئیں۔

"اُنھیں روکنے کا کوئی طریقہ؟" میں نے سوال کیا۔

"اگر اُنھیں کچھ کھانے کو مل جائے تو یہ ہمارا پیچھا چھوڑ دیں گے" شیلو نے جواب دیا۔

"میں اپنے وجود سے ان کی ضیافت نہیں کر سکتا۔"

"اگر انھی میں سے ایک دو چوہے مار دیے جائیں تو وہ انھیں کھانے میں جُت جائیں گے اور جب تک اُنھیں چٹ نہیں کر لیں گے آگے نہیں بڑھیں گے۔"

"تو پھر رُک جاؤ" میں نے کہا اور مشعل بُلند کر کے چُوہوں کی طرف دیکھنے لگا وہ ہم سے تقریباً بیس فٹ دُور تھے اور واقعی چھوٹی بھیڑوں کے برابر لگتے تھے "یہ تو پُورا گلہ ہے ایک کو ماروں گا تو دوسرے مجھ پر حملہ کر دیں گے۔"

"یہ چوہے اندھے ہیں سرفروش۔ صرف آواز پا کر ہی حملہ کرتے ہیں" شیلو نے بتایا اور میں نے آہنی سلاخ سنبھالتے ہُوئے

مشعل دارا کو پکڑا دی۔ پھر میں نے ایک جانب ہٹ کر سلاخ فرش پر ماری تو چوہے اُدھر مُڑ گئے۔ میں آہستہ سے کھسک کر دوسری جانب ہو گیا۔

چوہے آگے بڑھے تو میں نے سب سے پیچھے آنے والے چُوہے کی گردن میں سلاخ بھونک دی۔ وہ چیخا تو چُوہے پلٹ پڑے اس سے پہلے کہ میں اُن کے نرغے میں آتا میں لپک کر ہٹ گیا۔

چوہوں نے شاید اپنے زخمی ساتھی کے خون کی بُو سونگھ لی تھی اس لیے وہ اُس پر پل پڑے۔ مجھے یہ منظر دیکھ کر جھرجھری سی آگئی۔

اب ہم تیز تیز چلنے کی بجائے دوڑنے لگے اور چند منٹوں میں پاور چیمبر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہ پلاسٹک کا بنا ہُوا ایک کمرہ تھا جس کی چاروں دیواروں پر مختلف اقسام کے پینل اور سوئچ بورڈ لگے ہُوئے تھے۔

اس وقت کمرے میں چار ٹیکنیشن مختلف حالتوں میں موجود تھے۔ ایک ٹیکنیشن سوئچ بورڈ کے پاس کھڑا تھا۔ دُوسرا کُرسی پر بیٹھا میز پر سر رکھے سو رہا تھا۔ تیسرا ایک بنچ پر اوندھے مُنہ لیٹا ہُوا تھا اور چوتھا ملحق کمرے کے دروازے کے ساتھ کھڑا تھا۔

شیلو نے سوئچ بورڈز کی طرف اشارا کرتے ہوتے بتایا "یہ کنٹرول رُوم ہے اور اس سے ملحق کمرہ توانائی کا مخرج ہے۔"

"پہلے ایک بات تو بتاؤ شیلو۔ تمھیں یہ معلومات کیسے حاصل ہوئیں اور تم یہاں تک کیسے پہنچی تھیں؟ میرا مطلب ہے کہ یہاں سیکورٹی بھی ہوگی پھر تمھیں یہاں آنے اور توانائی روکنے کا موقع کیسے مل گیا؟"

شیلو نے ایک قہقہہ لگایا اور بولی "عورت، مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے، سرفروش اور جب کسی چیز پر کسی قسم کی پابندی لگ جائے تو اس کے حصُول کا شوق فزوں تر ہو جاتا ہے۔ جس طرح کوئی نادی کسی عرفانی خاتون کو نہیں چھُو سکتا اسی طرح کسی عرفانی کا کسی نادی عورت کی طرف متوجہ ہونا بہت بڑا جُرم تھا اور یہی پابندی اِن ٹیکنیشنز کے لیے ایک سُلگتی ہُوئی تمنا بن گئی تھی۔ میں نے قمرانیوں کی ہدایت پر اِن چاروں سے مہربانی کا سلوک کیا اور چونکہ یہ آپس میں بے تکلف دوست تھے اس لیے یہ مجھے ٹیکنیشن کی وردی پہنا کر اپنے ساتھ یہاں لے آئے اور پھر ایک روز میں نے اُس بنچ پر لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر سوئچ بند کر دیا اور عرفانیوں کی زندگی منجمد ہو کر رہ گئی۔"

"اوہ... کیا تم یہ بھی جانتی ہو کہ توانائی کیسے اور کس چیز سے پیدا کی جاتی ہے؟" میں نے ڈاکٹر فردیدیں کی دل چسپی کا سوال کیا۔

"ہاں..." شیلو نے جواب دیا "توانائی عام پتھروں سے حاصل کی جاتی ہے۔ ایک چھوٹا سا پتھر اس شہر کی گیارہ روزہ ضروریاتِ توانائی کے لیے کافی ہوتا ہے۔ آؤ میں تمھیں وہ کمرہ دکھاؤں جہاں پتھروں کے سفوف سے توانائی حاصل کی جاتی ہے" یہ کہہ کر وہ مجھے ملحق کمرے میں لے گئی۔

یہ ایک چھوٹا سا مدور کمرہ تھا جس کے بیچوں بیچ ایک بڑا سا مقناطیس رکھا ہُوا تھا اور اُس کے چاروں طرف دائرے کی صُورت میں پتھروں کے سفوف سے بھرے ہُوئے تھیلے لٹک رہے تھے۔ وہاں کوئی تار نہیں تھی۔

میرے لیے یہ بات انتہائی تعجب انگیز تھی کہ عرفانیوں کے اس شہرِ خوابیدہ کو بغیر کسی تار اور سلسلے کے فقط ہَوا کی لہروں کے ذریعے توانائی فراہم کی جاتی تھی۔

مجھے اس بات پر یقین نہیں آیا.. کہ توانائی پتھروں کے سفوف سے حاصل کی جاتی ہے اس لیے میں نے ایک تھیلے میں آہنی سلاخ چبھو کر تھوڑا سا سفوف نکالا اور اُسے بغور دیکھا تو وہ سیمنٹ جیسا نظر آیا۔

میں کچھ دیر تک توانائی کے اس مخرج میں کھڑا سوچتا رہا پھر میں نے شیلو سے کہا "اب میں جو کچھ تم سے کہوں گا تم بلا چُون و چرا اُس پر عمل کرو گی۔"

"مگر مجھے کیا کرنا ہوگا؟" وہ تجسّس اور حیرت سے بولی۔

"پہلے تو یہ بتاؤ کہ توانائی کیسے پیدا کی جاتی ہے اور اُسے بند کیسے کیا جاتا ہے؟"

وہ مجھے پہلے کمرے میں لے آئی اور دو سوئچ دِکھاتے ہُوئے بولی "اگر یہ سوئچ دبا دیا جائے تو توانائی کا اخراج شروع ہو جائے گا اور اگر اس سوئچ کو بند کر دیا جائے تو توانائی کی ترسیل رُک جائے گی۔"

میں توانائی کے اخراج والے سوئچ کے قریب جا کھڑا ہُوا۔ "میں توانائی پیدا کرنے والا سوئچ دبا کر دس تک گنتی کروں گا جب میں یہ گنتی پُوری کر دوں تو تم اخراج بند کرنے والا سوئچ دبا دینا" میں نے کہا۔

"مگر کیوں؟" شیلو نے پُوچھا۔

"میں دیکھنا چاہتا ہُوں کہ توانائی کی ترسیل بحال ہونے پر ان لوگوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ مدتِ مدید تک سوتے رہے ہیں یا اُنھیں معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ اتنا عرصہ ان پر کیا گزری ہے؟"

میں نے وضاحت کی "اس لیے تم اس وقت وہی کردگی جو اس وقت کر رہی تھیں جب تم نے سوئچ بند کیا تھا"

"لیکن وہ سب کچھ میں تمھارے سامنے . . ."

"کیوں ؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اس لیے کہ شاید پھر تم مجھ سے نفرت کرنے لگو اور..."

"اوہ" میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا "نہیں شیلو میں تم سے نفرت نہیں کروں گا"

اتنے میں دروازے پر کھڑا دارا بھاگتا ہُوا اندر آگیا اور بولا "چوہے پھر غرّا رہے ہیں۔ مجھے دروازے کے پاس کھڑا ہونے سے ڈر لگتا ہے"

"بکواس مت کرو" میں نے اُسے ڈانٹا "اگر تم نے بزدلی دکھائی تو میں خود تمھیں چوہوں کے سامنے پھینک دوں گا۔ یہ لو سلاخ اور دروازے پر نگرانی کرتے رہو"

وہ بادلِ ناخواستہ دروازے پر چلا گیا۔

شیلو اُس عرفانی کے قریب جُھک گئی جو بینچ پر اُوندھے مُنہ پڑا نہ جانے کب سے عارضی موت کا شکار تھا۔ میں توانائی پیدا کرنے والے سوئچ کے پاس چلا گیا۔

"کیا تم تیار ہو شیلو" میں نے بُلند آواز میں پُوچھا۔

شیلو نے ہاتھ بڑھا کر توانائی بند کرنے والے سوئچ کو چُھوا اور بولی "ہاں۔ میرا ہاتھ سوئچ تک پہنچ سکتا ہے"

میں نے توانائی پیدا کرنے والا سوئچ دبا دیا اور گنتی کرنے لگا۔ ابھی میں صرف تین تک گن پایا تھا کہ ہر طرف روشنی پھیل گئی اور زندہ موت میں مبتلا ٹیکنیشن جاگ اُٹھے۔ تین تو وہی کام انجام دینے لگے جو وہ اس وقت کر رہے تھے، جب توانائی بند ہُوئی تھی مگر چوتھا اُسی طرح میز پر سر ٹکائے سوتا رہا۔ شاید وہ اسی حالتِ خواب میں منجمد ہُوا تھا۔

"چار... پانچ..." میں گنتی میں مصروف تھا مگر اُن کی توجہ میری بجائے شیلو اور اس کے ساتھی کی طرف تھی۔ وہ اُن دونوں کو دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔

میں آٹھ کی گنتی پر پہنچا تو شیلو نے اپنا ہاتھ سوئچ کی طرف بڑھانا شروع کر دیا مگر عین اُسی وقت دیوار کے ساتھ کھڑے ٹیکنیشن کی نگاہ اُس پر پڑ گئی اور وہ چلّایا "او بدبخت عورت۔ ہاتھ ہٹاؤ اُدھر سے"

... مگر شیلو نے ہاتھ نہ ہٹایا اور میرے دس کہنے پر سوئچ دبانا ہی چاہتی تھی... کہ اُس کے ساتھی نے اُس کا ہاتھ ہٹا دیا اور تینوں شیلو پر ٹوٹ پڑے۔ یہ دیکھ کر میں اُچھلا اور اُن پر جا گرا۔

اُن کا چوتھا ساتھی بھی جاگ اُٹھا اور اس نے خطرے کا الارم بجا دیا۔ مختلف کمروں سے لوگوں کے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں لیکن اس سے پہلے کہ کوئی اُن کی مدد کو آتا میں اُنھیں ڈھیر کر کے توانائی بند کرنے والا سوئچ دبانے میں کامیاب ہو گیا اور کمرے میں ایک بار پھر اندھیرے بکھر گئے۔

شیلو بُری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی۔

"ڈرو نہیں ان کی زندگی ایک بار پھر منجمد ہو گئی ہے" میں نے کہا۔

عین اُسی وقت باہر سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے با آوازِ بُلند پُوچھا "کیا ہُوا دارا؟... کیا چُوہے آ گئے؟"

"نہیں چوہے تو روشنی ہوتے ہی بھاگ گئے تھے۔ یہ کوئی نادی معلوم ہوتا ہے"

"نادی!" شیلو نے دُہرایا "میرے سوا کوئی نادی نہ تو اس مقام کو جانتا ہے اور نہ ہی یہاں آسکتا ہے"

"ممکن ہے رستم یا اس کا کوئی آدمی ہو" میں نے کہا۔

"یہ ناممکن ہے، سرفروش" وہ اصرار کرنے لگی۔

اتنے میں پھر کسی کے کراہنے اور مدد کے لیے پُکارنے کی آواز آئی تو میں اپنی مشعل اُٹھا کر باہر بھاگا۔ شیلو بھی میرے پیچھے پیچھے لپکی۔

کمرے سے پچیس تیس قدموں کے فاصلے پر کوئی گھسٹتا ہُوا اِدھر آ رہا تھا۔ جب میں نے قریب پہنچ کر مشعل کی روشنی اُس پر ڈالی تو شیلو "رومی... میرا بیٹا" کہتے ہُوئے اُس سے لپٹ گئی۔ رُومی کی ٹانگیں بُری طرح زخمی ہو چکی تھیں۔ ہم اُسے اُٹھا کر کمرے میں لے آئے اور بینچ پر لٹا دیا "یہ تمھیں کیا ہُوا بیٹے...؟ کس نے زخمی کیا ہے تمھیں؟" شیلو نے بے چینی سے پُوچھا۔

"چوہوں نے... اگر عین وقت پر توانائی بحال نہ ہو جاتی تو وہ میری بوٹیاں نوچ کھاتے"

اس پر غشی طاری ہونے لگی۔ شیلو لپک کر فرسٹ ایڈ کا بکس اُٹھا لائی اور اس کی مرہم پٹی کرنے لگی۔ چونکہ وہ پہلے بھی یہاں آتی رہی تھی اس لیے اُسے معلوم تھا کہ وہاں کیا کیا موجود ہے وہ کہیں سے خوراک اور الکحل کے ٹوبتے بھی اُٹھا لائی۔ جب اُس نے اپنے بیٹے کو الکحل دی تو اُس نے پینے سے انکار کر دیا اور بے ہوش ہو گیا لیکن میں بھانپ گیا کہ وہ بے ہوشی کی اداکاری کر رہا ہے... لیکن کیوں؟

یہ جواب تو وہ خُود ہی دے سکتا تھا۔

"یہ تمھارا بیٹا ہے؟" میں نے شیلو سے پُوچھا۔

"ہاں... بہت سے بیٹوں میں سے ایک... مگر اسے میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ پسند کرتی ہوں"

"مگر یہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"میں خود اس بات پر متعجب ہُوں۔ یہ ہوش میں آئے تو کچھ پتہ چلے"

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے شیلو کی بجائے رومی سے کہا "مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو، رومی! میں جانتا ہوں کہ تم پورے ہوش و حواس میں ہو۔ آنکھیں کھولو اور بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

...اور رومی نے آنکھیں کھول دیں مگر شیلو کی طرف دیکھ کر خاموش ہی رہا۔

"کیا تم پھسلنے والے راستے سے آئے ہو؟" شیلو نے پُوچھا۔

"نہیں..." وہ بولا "حالاں کہ میں وہ راستہ بھی جانتا ہُوں"

یہ سُن کر شیلو دنگ رہ گئی "یہاں آنے کا کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟"

"ہاں... اور تم بھی وہ راستے جانتی ہو" رومی نے طنز بھری نگاہوں سے شیلو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جیسے اُسے سمجھانا چاہتا ہو کہ ہوشیار رہو۔ ساتھ ہی اُس نے مجھے بھی آنکھ سے اشارہ کیا۔

"تم اس سلسلے میں کیا کچھ اور کتنا کچھ جانتے ہو؟" شیلو نے بیٹے سے نظریں ملائے بغیر پُوچھا۔

"تم جانتی ہو کہ رستم نے مجھے عرفانیوں کی کتابیں پڑھنے کا فرض سونپا ہُوا ہے۔ میں اُن کی کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ شہرِ خوابیدہ کا جائزہ بھی لیتا رہا ہُوں۔ میں نے کئی بار تمھارا تعاقب بھی کیا۔ میں یہ بھی جانتا ہُوں کہ تم قمرانیوں کی جاسوس ہی نہیں بلکہ ایک مہرہ بھی ہو۔ میں نے دُور بینوں کے ذریعے چاند کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ وہ کچھ کرنے والے ہیں مگر کیا، یہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا" رومی نے دادطلب نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہُوئے وضاحت کی۔

"تم، میرے بیٹے ہو کر میری جاسوسی کرتے رہے ہو... تم نے اب تک یہ ساری باتیں مجھے کیوں نہیں بتائی تھیں؟" شیلو کو غصّہ آگیا۔

"اس لیے کہ تم مجھے ایک چوتھائی عرفانی اور کم عقل سمجھتی ہو۔ میں یہ باتیں اب بھی تمھیں نہ بتاتا مگر سرفروش کی وجہ سے بتانا پڑ رہی ہیں۔ شاید یہ میرے علم اور مشاہدے سے کوئی فائدہ اُٹھا سکے"

میں رومی کی اس بات سے ٹھٹک گیا۔ کیا وہ کوئی نئی چال چل رہا ہے؟ آخر اُسے میرے کام آنے کی کیا ضرورت پڑ گئی...؟ میں نے اُسے آج پہلی بار دیکھا تھا اور یہ بھی نہیں جانتا... کہ وہ کون ہے۔

"تم میرے کام کیوں آنا چاہتے ہو؟" میں نے پُوچھا۔

"میں تمھاری بہادری اور دانائی سے مرعوب ہُوں، سرفروش۔ سچ تو یہ ہے کہ میں تمھیں دیوتا سمجھتا ہُوں۔ بس اسی لیے تمھارے کام آنا چاہتا ہُوں"

"تم جھوٹے ہو" شیلو بول اُٹھی "دراصل تم بھی اقتدار کے بھوکے ہو، تم بھی سرفروش کی مدد سے اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہو"

"چلو یوں ہی سہی۔ اگر تم اور رستم اپنی خواہشوں کی خاطر سرفروش سے مدد لینا چاہتے ہو تو میں کیوں نہ لوں۔ بہرصورت یہ فیصلہ سرفروش کو کرنا پڑے گا کہ کون کتنا مخلص اور کتنا لالچی ہے"

میں نے ماں بیٹے کی بحث میں دخل دیتے ہُوئے رومی سے پوچھا "اگر تم ڈھلانی راستے سے نہیں آئے تو پھر کہاں سے آئے ہو؟"

"پہاڑی کانوں والی فائل کا مطالعہ کرتے ہُوئے مجھے ایک نقشہ ملا تھا۔ اس میں ایک راستہ پاتال نامی جہنم کے قریب سے گزرتے ہُوئے دکھایا گیا ہے۔ میں اُسی نقشے کی مدد سے یہاں آیا تھا اور پاتال میں بھی گیا تھا"

یہ سُن کر دارا بڑبڑا اُٹھا "اوہ۔ پاتال کا ذکر نہ کرو رومی! اس کے ذکر سے میرے زخم خون اُگلنے لگتے ہیں"

"اپنی زبان بند رکھو" میں نے اُسے ڈانٹا اور رومی سے پوچھا "وہاں تم نے کیا دیکھا؟"

"وہاں ہڈیوں کے پنجروں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہیں سے ایک راستہ اِدھر آتا ہے۔ پہلے تو کبھی مجھے چوہے نہیں ملے تھے مگر آج اُنھوں نے مجھے گھیر لیا تھا اگر روشنی نہ پھیلتی تو وہ مجھے ہڑپ کر گئے ہوتے"

"کیا وہ نقشہ تمھیں زبانی یاد ہو گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ بڑا ہی پُرپیچ راستہ ہے اس لیے میں جب بھی یہاں آیا، نقشے کی مدد سے آیا" رومی نے جواب دیا۔

"مگر تم یہاں کیوں آتے رہے؟" شیلو نے سوال کیا۔

"اپنا علم بڑھانے کے لیے... یہ سیکھنے اور جاننے کے لیے کہ توانائی کیسے حاصل کی جاتی ہے، اس کی ترسیل اور فراہمی کا طریقہ کیا ہے"

"کیا وہ نقشہ تمھارے پاس موجود ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں..." یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے پلاسٹک کا نقشہ نکال کر مجھے دے دیا "اس میں راستے پر نشانات لگے ہُوئے ہیں"

میں نے نقشہ کھولے بغیر شیلو سے پوچھا "ڈھلانی راستے سے اوپر تو نہیں پہنچا جا سکتا۔ ہم اوپر کیسے جا سکتے ہیں؟"

"اوپر جانے کے دو ہی طریقے ہیں۔ اگر توانائی ہو تو لفٹ کے ذریعے ورنہ ہنگامی سیڑھیاں بنی ہُوئی ہیں۔ یہ سیڑھیاں بلدیہ کی عمارت تک لے جاتی ہیں۔"

"لیکن اب تک رستم کے آدمی اس عمارت پر قابض ہو چکے ہوں گے۔" میں نے اُسے جواب دیا اور رومی سے پوچھا۔ "کیا تمھیں رستم کی کارروائیوں کا علم ہے کہ وہ کیا اقدامات کر رہا ہے؟"

"ہاں۔ وہ عورتوں اور بچّوں کو گہرے غاروں میں بھیج رہا ہے اور خود اپنے جنگ جُو سپاہیوں کے ساتھ شہر پر قبضہ کر رہا ہے۔ اس نے قرانیوں کا خوف بھی اپنے دل سے نکال پھینکا ہے۔ میں کچھ اور بھی تمھیں بتانا چاہتا ہُوں مگر بالکل تنہائی میں بتاؤں گا۔"

"تم دارا کے پاس چلی جاؤ شیلو۔" میں نے حکم دیا۔

وہ اکڑ گئی اور بولی۔ "نہیں۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ میرا بیٹا تم سے مل کر میرے خلاف سازش کرنا چاہتا ہے۔ تم رومی کی شہہ پر میرے ساتھ غداری کرو گے۔"

"بکو مت۔" میں نے اُسے ڈانٹ دیا۔ "اگر ہمارے درمیان کسی نے غداری کی تو وہ تم ہی کرو گی۔ چلو اب جاؤ۔"

یہ سُن کر وہ خونخوار نظروں سے ہمیں دیکھتی ہُوئی دارا کے پاس چلی گئی اور رومی مجھے سرگوشی میں بتانے لگا۔ "رستم کو معلوم ہو چکا ہے کہ آشی کو تم نے نہیں بلکہ دارا نے قتل کیا ہے ایک محافظ اور دروازے پر کھڑی عورتوں نے اُسے بتایا تھا کہ جب تم باہر چہل قدمی کر رہے تھے تو انھوں نے اندر سے آشی کی چیخیں سُنی تھیں۔ اس لیے اگر تم دارا کو اس کے حوالے کر دو تو وہ تم سے صلح کر لے گا۔"

"مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

"رستم تم سے صرف دارا کا ہی نہیں بلکہ شیلو کا بھی طلب گار ہے۔" اس نے مزید انکشاف کیا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو، تم تو شیلو کے بیٹے ہو؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ بولا۔ "اُس نے کب مجھے اپنا پیار اور اپنی ممتا دی ہے... اور پھر یہ میری نہیں رستم کی خواہش ہے... وہ تو تمھیں بھی نہ بخشتا مگر تمھاری کارگزاری نے اُسے رعایت برتنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"کون سی کارگزاری؟" میں نے پوچھا۔

وہ مسکرانے لگا تو میں سمجھ گیا۔

رومی کے اس انکشاف نے میری ہمت بندھا دی۔ اب میں رستم سے سودے بازی کر سکتا تھا لیکن یہ اُسی صورت میں ممکن تھا، جب میری اس کی ملاقات ہوتی... اور اس ملاقات میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے تھی۔ چنانچہ میں نے شیلو اور دارا کو بُلوایا اور رومی سمیت انھیں ہدایات دے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اگرچہ روانگی سے پہلے میں نے ڈبّوں والے شیریں مشروب سے پیاس بجھائی تھی مگر پاتال کی چڑھائی چڑھتے ہُوئے میں پھر بے پناہ گرمی محسوس کرنے اور ہانپنے لگا تھا۔ میرے پاس دو مشعلیں تھیں تاکہ نقشے کا بآسانی مطالعہ کر سکوں۔ چوہے بھی شروع سے ہی میرے پیچھے لگے ہُوئے تھے اور راستے میں جگہ جگہ ان مُردہ چوہوں کی ہڈیاں بھی بکھری ہُوئی دکھائی دے رہی تھیں جنھیں خود ان کے بھائی بند چٹ کر چکے تھے۔

پاتال کا چڑھائی والا زینہ اچانک ہی ایک آہنی گیٹ پر ختم ہو گیا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے اُسے کھولا اور کمرے میں داخل ہوا جہاں کچھ انسانی پنجر میرے استقبال کو موجود تھے۔ کچھ پنجر خاکستر ہو چکے تھے اور کچھ ابھی صحیح حالت میں تھے۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ مجھے وہ نلکیاں بھی نظر آ گئیں جن سے پاتال کے قیدیوں کو کھانا پانی فراہم کیا جاتا تھا۔

مجھے اس کال کوٹھری کا نظارا کر کے رستم کی حیرت انگیز قوتِ ارادی پر رشک آنے لگا جو نہ صرف یہاں کافی عرصے تک زندہ رہا تھا بلکہ یہاں سے نکلنے کے بعد بھی اُس کا دماغی توازن خراب نہیں ہو سکا تھا اور اس کی عقل و دانش بھی متاثر نہیں ہُوئی تھی۔

میں سستانے کے لیے وہیں ایک پنجر کے قریب بیٹھ گیا اور مشعل کی روشنی میں نقشے کا جائزہ لینے لگا۔ رومی نے کوئلے سے نقشے پر راستے کی نشاندہی کر رکھی تھی۔ یہ راستہ ان غاروں تک جاتا تھا جن میں نادی لوگ آباد نہیں تھے۔

کچھ دیر سستانے کے بعد میں نقشے کے مطابق آگے بڑھنے لگا۔ یہ راستہ اُن سُرنگوں پر مشتمل تھا جنھیں عرصۂ دراز سے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ ایک سُرنگ ختم ہوتی تو دوسری شروع ہو جاتی۔ راستے میں جگہ جگہ مجھے اُن سُرنگوں میں آہنی سیڑھیاں بھی چڑھنا پڑیں جنھوں نے مجھے بُری طرح تھکا دیا لیکن میں وہاں رُک نہیں سکتا تھا۔

ایک بار میرے جی میں آئی کہ میں کوئی مختصر راستہ تلاش کرنے کی کوشش کروں مگر پھر میں نے یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ اگر میں بھٹک گیا تو ان سرنگوں کے جال سے کبھی نہیں نکل سکوں گا۔ تاوقتیکہ کمپیوٹر مجھے نہ بُلا لے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ اب ڈاکٹر فریدوں کا کمپیوٹر مجھے واپس بُلانے میں کبھی کامیاب بھی ہو سکے گا کیونکہ گراہنوں نے مجھے نہ جانے کس جگہ پھینک دیا تھا۔ ممکن ہے یہاں تک ڈاکٹر فریدوں کا کمپیوٹر رسائی ہی حاصل نہ کر سکے۔

میں نے کوئی خطرہ مول لینے کی بجائے اُسی نشان زدہ راستے پر سفر جاری رکھا اور بالآخر ایک غیرآباد سُرنگ میں پہنچ گیا۔

ابھی میں سُرنگ سے تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ مجھے بہت سی عورتوں کے قہقہے لگانے اور گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے بدری سے مشعلیں بُجھا دیں اور بے آواز قدموں سے دوڑتا ہُوا دوسری سُرنگ میں آ گیا۔

عورتوں کے گانے اور قہقہوں کی آواز قریب تر آ گئی تو میں فرش پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میرے سامنے سے عورتوں کا ایک جلوس سا گزرنے لگا جس کے ساتھ بہت سے محافظ بھی مشعلیں اور سلاخیں اُٹھائے چل رہے تھے۔ عورتیں بے حد خوش نظر آتی تھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ چہلیں کرتی جا رہی تھیں جب یہ جلوس گزر گیا تو مجھے ان کے پیچھے کافی فاصلے پر ایک مشعل کی جھلملاتی روشنی دکھائی دینے لگی۔

یہ مشعل کسی محافظ نے اُٹھا رکھی تھی جو تھکے تھکے قدموں سے تنہا چلا آ رہا تھا۔ میں سانپ کی طرح رینگتا ہُوا سُرنگ کے دہانے پر آ گیا اور جونہی وہ محافظ دہانے کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھا، میں نے جست لگائی اور پیچھے سے اُسے دبوچتے ہُوئے اس کا مُنہ بند کر دیا۔

"اگر تم نے شور مچایا تو میں یہ سلاخ تمھارے نرخرے میں گھونپ دوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے اُس کے مُنہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

وہ چُپ چاپ میری طرف دیکھنے لگا۔

"جانتے ہو، میں کون ہوں؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"ہاں۔ تم سرفروش ہو۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تمھیں اپنی زندگی عزیز ہے یا مرنا [illegible]؟"

"جب تک موت ٹل سکے بہتر ہی ہوتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"موت ٹل سکتی ہے بشرطیکہ تم میرے سوالوں کے صحیح صحیح جواب دو۔"

"پوچھنا چاہتے ہو؟"

"یہ عورتیں کون تھیں اور انھیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟"

وہ بے اختیار ہنس پڑا اور بولا۔ "تم نے انھیں نہیں پہچانا سرفروش؟"

"مجھے اپنے سوال کا جواب اب تک نہیں ملا۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"یہ خواتین کچھ عرصے بعد مائیں بننے والی ہیں اور انھیں رستم کے ایما پر سُرنگوں میں لے جایا جا رہا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"تاکہ یہ محفوظ رہیں۔"

"کس سے؟" میں نے پوچھا۔

"قرانیوں سے۔"

"قرانیوں سے انھیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟"

"رستم نے شہرِ خوابیدہ پر حملہ کر دیا ہے۔ ہمارے جنگجو خفتہ عرفانیوں کے ساتھ وہی سلوک کر رہے ہیں، جو فاتح اپنے مغلوبوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ رستم کو خدشہ ہے کہ کہیں قرانی اُس کا یہ اقدام پسند نہ کرتے ہُوئے حملہ آور نہ ہو جائیں اور پھر خوشبودار بم نہ پھینک دیں۔ اس لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر اُس نے ماں بننے والی خواتین کو سُرنگوں میں منتقل کروا دیا ہے تاکہ نادیوں کی نسل معدوم نہ ہونے پائے۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ رستم کا یہ خدشہ بے بنیاد نکلے اور قرانی کوئی اقدام نہ کریں۔" محافظ نے وضاحت کی۔

"رستم اس وقت کہاں ہے؟"

"اوپر شہرِ خوابیدہ میں۔" پھر اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہُوئے بات جاری رکھی۔ "اس نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔"

"کیا زیادتی کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے عورتوں کی حفاظت کے لیے یہاں چھوڑ دیا گیا ہے جبکہ میرے بیشتر ساتھی اُوپر لُوٹ مار کر رہے ہیں۔ میں اپنے ساتھیوں سے کم بہادر نہیں ہُوں سرفروش کیا یہ میرے ساتھ زیادتی نہیں ہے؟"

"کیا رُستم نے عرفانی خواتین کی بے حُرمتی کی بھی اجازت دی ہے؟"

"اگر اس نے اجازت نہ دی ہو تو بھی وہ ہر جگہ تو موجود نہیں ہو سکتا۔ زندہ موت کی نیند میں مبتلا خواتین چیخ و پکار یا اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتیں۔"

میں نے سوچا کہ وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔ زندہ موت کی نیند میں مبتلا عورتیں نہ اپنا دفاع کر سکتی ہیں اور نہ ہی ان کے احتجاج کی آواز رستم کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے اور یہ وحشی ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک سے باز نہیں آئیں گے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے لاشعوری طور پر سلاخ محافظ کو چبھو دی۔

"کیا تم مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو؟" وہ چونک کر بولا۔

"شاید... یا شاید نہیں۔" میں نے کچھ سوچتے ہُوئے کہا۔ "کیا تم نورے کو جانتے ہو؟"

"ہاں۔" وہ بولا۔ "اگر تم اُسے چاہتے ہو تو مجھے تمھارے ساتھ اظہارِ افسوس کرنا چاہیے۔"

"کیوں؟" میں چونک پڑا۔

"اگر میں تمھیں سچ سچ بتا دوں تو کیا تم میری جان بخشی کر دو گے؟"

میں نے اُسے طمانچہ مارتے ہوئے کہا۔ "تم مجھ سے سودے بازی کر رہے ہو۔ سچ سچ بتاؤ، وہ کہاں ہے ورنہ میں تمھارا سر توڑ دوں گا۔"

"وہ شہر میں ہے"۔ وہ کانپ کر بولا۔ "تفریح گاہ کے اندر اُسے جنگلی چوہوں کے بڑے بل پر لٹکا دیا گیا ہے۔ میں بھی اس کا تماشا دیکھنا چاہتا تھا مگر نہیں دیکھ سکوں گا۔ سُنا ہے کہ عرفانی اُس بڑے بل یا گڑھے میں ایک سو چوہے رکھا کرتے تھے وہ اُنھیں بھوکا رکھتے اور پھر جب وہ بھوک کا شکار ہو کر ایک دوسرے کو کھانے لگتے تو عرفانی اُن کا تماشا دیکھا کرتے تھے"۔

"کیا رستم یہ سمجھتا ہے کہ میں اُسے بچانے آؤں گا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں، میں تو ایک معمولی سا محافظ ہوں"۔

"شہر جا کر لوٹ مار میں حصّہ لینے کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟"

"یہ تو میری دلی تمنا ہے، سرفروش... مگر میرے دستے کے سردار نے مجھے یہاں رہنے کا حکم دیا تھا۔ اگر وہ مجھے وہاں دیکھ لے گا تو جان سے مار ڈالے گا"۔

"یہ تمھارے اپنے اوپر ہے۔ اگر تم میرے ساتھ اوپر شہرِ خوابیدہ میں نہیں جانا چاہتے تو میں تمھیں یہیں ختم کیے دیتا ہوں"۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اُسے پھر سلاخ چبھوئی۔

"نہیں نہیں۔ میں تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں"۔ وہ گھبرا کر بولا۔

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"فیروز..."۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"اب غور سے سُنو فیروز! تم مجھے مختصر ترین راستے سے شہر لے چلو گے مگر کسی ایسے غار سے نہیں گزرو گے جہاں محافظ موجود ہوں۔ تم مجھ سے دو قدم آگے آگے رہو گے کہ اس سے زیادہ اور نہ ہی اس سے کم... اگر تم نے گھومنے، بھاگنے یا مشعل پھینکنے اور شور مچانے کی کوشش کی تو میں پیچھے سے یہ سلاخ تمھارے جسم میں گھونپ دوں گا"۔

"اگر میں یہ سب کچھ فرماں برداری سے کروں تو؟" اس نے پوچھا۔

"تو پھر شہر جا کر میں تمھیں آزاد کر دوں گا۔ اس کے بعد تم جو چاہے کر سکتے ہو"۔ میں نے کہا۔

"مجھے منظور ہے۔ اوّل تو میرے دستے کا سالار مجھے نہیں دیکھ پائے گا اور اگر اس نے دیکھ بھی لیا تو دیکھا جائے گا"۔

"تو پھر آگے بڑھو"۔ میں نے اسے حکم دیا۔ "مگر یاد رکھو مجھ سے غدّاری تمھاری موت بن جائے گی"۔

"میں غدّاری نہیں کروں گا، سرفروش۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ میں مرنا نہیں چاہتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ رستم اور میرے سالار نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اُنھوں نے مجھے لُوٹ کے مال اور عرفانی خواتین سے محروم کیا ہے"۔

"کیا تم مختصر ترین راستے جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں میں اُسی راستے سے جا رہا ہوں۔ میری ساری زندگی انھی غاروں میں گزری ہے۔ سنبھل کے آنا، آگے موڑ ہے"۔

ہم مختلف غاروں سے آگے اور اوپر کی جانب بڑھتے رہے۔ فیروز مجھے ایک عمارت کے تہ خانے میں لے آیا۔ جہاں کچھ کار[illegible] کی نیند سو رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ رستم کے خونخوار محافظ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

ہم تہ خانے سے نچلی منزل تک پہنچ گئے۔ میں نے فیروز [illegible] پر لیٹ جانے کا حکم دیا اور خود چھپ کر باہر کا جائزہ لینے لگا۔

آج اس شہرِ خموشاں میں مختلف اطراف سے شور سنا[ئی دے] رہا تھا رستم کے جنگجو غل مچا رہے تھے اور فتح کے نعرے لگا رہے [تھے]۔ ڈیوڑھی میں بہت سے عرفانی ایک ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔ اُنھیں رستم کے سپاہیوں نے حقیقی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مرنے والوں کے جسموں سے بہت کم خون [بہا] ہوا تھا کچھ لاشوں کے کانوں سے توانائی والے ٹاپس نوچ لیے گ[ئے]۔ لاشوں کے اس انبار میں کسی عورت کی لاش شامل نہیں تھی۔

جب میں نے فیروز کو بتایا کہ میں نے کیا دیکھا ہے تو وہ [بولا]۔ "اس کے علاوہ تم دیکھ بھی کیا سکتے ہو، سرفروش! اب ہم نادیوں کا [وقت] آیا ہے اور ہاں، میں نے اپنا فرض دیانت داری سے انجام [دیا ہے]۔ تم نے مجھے شہر پہنچ کر آزاد کر دینے کا وعدہ کیا تھا کیا اب میں [جا سکتا] ہوں یا تم بھی مجھے عرفانی خواتین سے محروم رکھنا چاہتے ہو؟"

"کچھ دیر صبر کرو۔ پھر میں تمھیں آزاد کر دوں گا۔ میرے ساتھ [آؤ]"۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگے۔ استنے میں باہر رستم [کے] سپاہیوں کے بھاگنے اور نعرے لگانے کی آواز آئی تو فیروز کھول[نے لگا]۔ گیا اور بولا "یہ سب عیش کر رہے ہیں سرفروش"۔

"میں نے کہا تھا۔ تھوڑی دیر صبر کرو"۔ میں اُسے ٹھوکے د[یتا ہوا] چھٹی منزل پر لے آیا۔ یہاں میں نے رومی کا دیا ہوا نقشہ نکالا اور [ایک] کھڑکی میں کھڑا کر کے شہر کے بارے میں تفصیل پوچھنے لگا تاکہ نق[شے سے] مطابقت کے بعد مجھے کسی رہنما کی ضرورت نہ پڑے۔

فیروز جلدی جلدی میرے سوالوں کے جواب دینے لگا۔ اس نے بلدیہ کی عمارت کی طرف اشارہ کیا تو دور ایک سرے پر [روشنی] دے رہی تھی۔

"رستم اس عمارت کو اپنا صدر مقام بنائے گا۔ وہ بہت [چالاک] ہے۔ سب سے پہلے شہر کے صاحبانِ اقتدار کے کانوں سے توا[نائی کے] ٹاپس اتارے گا تاکہ اگر فرازی توانائی کی ترسیل بحال کر دیں تو بھ[ی وہ اس] کا کچھ نہ بگاڑ سکیں"۔

فیروز ٹھیک کہہ رہا تھا۔ رستم کو یہی کرنا بھی چاہیے تھا۔ [وہ]

تک یقیناً یہ کام کر چکا ہوگا اور اس وقت بھی وہیں موجود ہوگا۔ مگر میرا بھی وہاں جانا ضروری تھا کیونکہ توانائی کے مخزن تک پہنچانے والا راستہ اس عمارت میں واقع تھا، جس کے ذریعے مجھے شیلو سے رابطہ قائم کرنا تھا۔

"تفریح گاہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سامنے۔ بائیں جانب جو چوکور عمارت نظر آ رہی ہے، وہی تفریح گاہ ہے لیکن اگر تم نورسے کو بچانا چاہتے ہو تو میری بات سن لو۔ چونکہ تم نے اپنا وعدہ وفا کیا ہے اور مجھے قتل نہیں کیا اس لیے میں تمھیں بتا رہا ہوں کہ تمھارا وہاں جانا بے حد خطرناک ہوگا کیونکہ وہاں محافظ بھی بڑی تعداد میں موجود ہوں گے"۔

میں نے ایک بار پھر دور سے تفریح گاہ کا جائزہ لیا اور پوچھا۔ "اس عمارت میں چوہوں کا گڑھا کس حصّے میں ہے؟"

"میں وہاں کبھی نہیں گیا اس لیے مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس حصّے میں ہے دوسرے مجھے وہ خونخوار چوہے دیکھنے کا کوئی شوق بھی نہیں۔ دیکھو سرفروش! جو کچھ میں جانتا تھا تمھیں بتا چکا ہوں۔ کیا اب میں جا سکتا ہوں؟"

"جانے سے پہلے میری ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ میرے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہنا۔ اگر تم نے کسی کو بتایا اور میں پکڑا گیا تو میں بھی رستم کو بتا دوں گا کہ تم نے کس طرح اس کی حکم عدولی کی ہے"۔

"نہیں نہیں سرفروش۔ میں نے تو تمھیں دیکھا تک نہیں، پھر میں کسی کو کیسے بتا سکتا ہوں"۔ وہ جلدی سے بولا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے گڑگڑا رہا ہو۔

"بس تو پھر تم جا سکتے ہو"۔ میں نے کہا تو وہ نیچے جانے کی بجائے باورچی خانے میں گھس گیا اور وہاں سے الکحل کے ڈبّے نکال لایا جن میں سے دو اس نے میرے سامنے غٹاغٹ چڑھا لیے۔ پھر جھومتے ہوئے بولا۔ "واہ مزا آ گیا۔ میں نے زندگی میں دوسری بار یہ مشروب پیا ہے ایک بار مجھے شیلو نے اپنے کمرے میں پلایا تھا۔ دوسری مرتبہ آج پی رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں عرفانی لوگوں کا طرزِ حیات پسند کروں گا"۔

"اب احتیاط سے جانا ورنہ سیڑھیوں میں ڈھیر ہو جاؤ گے"۔ میں نے اسے تنبیہ کی۔ "اور میری بات یاد رکھنا"۔

"ہاں ہاں ورنہ میں خود مارا جاؤں گا"۔ وہ بولا اور لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیاں اُتر گیا۔

میں نے کھڑکی کے نیچے دیکھا تو بلدیہ کی جانب مجھے کچھ نادی سپاہی لڑکھڑاتے اور شور مچاتے نظر آئے۔ اُن کا انداز بدمست فاتحین جیسا تھا۔ پھر اچانک میری نگاہ چاندنا سرزمین پر جا پڑی اور میں یہ دیکھ کر متعجب رہ گیا کہ وہاں کائی گھاس بھی ہے وہاں سے بڑے بڑے سرچ [لائٹ] نیس سے روشنی کے دھارے شہرِ خوابیدہ پر ڈالے جا رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے وہاں چند طیارہ نما چیزیں بھی ایک جگہ مصروفِ پرواز نظر آ گئیں۔

جانے وہ لوگ کیا سوچ رہے تھے اور کیا کرنے والے تھے بہرصورت، مجھے اتنا معلوم تھا کہ وہ لوگ میری ذات میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور ان کے سائنس داں میرا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں اس لیے مجھے اُن سے اب کسی نقصان کی توقع نہیں تھی البتہ میں اُن تک یا وہ مجھ تک کیسے پہنچ سکتے تھے، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔

میرے ذہن میں فرازیوں، عرفانیوں اور نادیوں کے لیے ایک منصوبہ تھا لیکن اُسے بھی پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوئی ترکیب میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ سب سے پہلے تو موجودہ صورتِ حال سے نمٹنے کا سوال تھا۔ اچانک میری نگاہ پھر تفریح گاہ والی عمارت پر جا پڑی اور مجھے نورسے کا خیال آ گیا۔

میں نورسے کے متعلق کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس سے محبت نہیں تھی مگر انسانی ہمدردی کی جبلت بار بار میرے ذہن کا دھارا اُس کی طرف موڑ دیتی تھی۔ میں بلدیہ کی طرف جا کر رستم سے صلح صفائی کی بات چیت کرنا چاہتا تھا مگر نورسے کا خیال بار بار میرا راستہ روک دیتا تھا...

میں اس عمارت کے مختلف حصوں کی تلاشی لینے لگا۔

ایک اپارٹمنٹ میں مجھے ایک عرفانی کی لاش دکھائی دی جس کے قریب کسی نادی کا لباس پڑا ہوا تھا۔ وہ نادی اس لاش کا لباس اُتار لے جا چکا تھا۔ نادی کی اُترن دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ موجودہ حلیے میں باہر نکلنا خطرناک ہے اس لیے مجھے بھی کسی نادی کا حلیہ اپنا لینا چاہیے چنانچہ میں نے اپنا لباس اُتار کر اس نادی کا لباس پہن لیا اب چہرے کو نادیوں جیسا بنانے کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا سو اس اپارٹمنٹ میں مجھے قینچی مل گئی میں نے جلدی جلدی اپنے سر کے بال کاٹ دیے۔ ہر چند کہ یہ ایک تکلیف دہ کام تھا مگر بال کاٹنے ضروری تھے کیونکہ نادی سر پہ بال نہیں رکھتے تھے لیکن ایسا کرنے کے باوجود ایک مسئلہ باقی رہ گیا تھا۔۔۔ اور وہ تھا چہرے کی رنگت کا۔۔۔ اپنے چہرے کو سیاہی مائل بنانے کے لیے مجھے کسی رنگ کی تلاش تھی۔ اس تلاش میں مجھے ایک کمرہ مقفل نظر آیا۔ یہ کمرہ اندر سے بند تھا۔ میں نے کندھے کی دو تین ضربوں سے کواڑ توڑ دیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

یہ کمرہ غالباً ڈسپنسری تھی کیونکہ مریضوں والی میز پر ایک عورت لیٹی ہوئی تھی اور اس کے بازوؤں سے دو نلکیاں لگی ہوئی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے توانائی ختم ہوتے وقت وہ اپنا خون تبدیل کروا رہی تھی۔ یہ بات تو مجھے پہلے ہی سے معلوم ہو چکی تھی کہ عرفانی اپنا حسن اور جوانی قائم رکھنے کے لیے ہر ماہ اپنا خون بدل لیا کرتے تھے۔ اس وقت میرے سامنے وہ بڑی شیشی بھی موجود تھی، جس میں خون دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے عورت کے بازو سے نلکی نکالی تو اس میں سے خون رسنے لگا۔ میں نے تھوڑا سا خون چُلو میں لے کر اپنے چہرے اور سر کے بالوں کی رنگت تبدیل کر لی۔ حلیہ بدلنے کے لیے اس وقت اور کوئی رنگ دستیاب نہیں تھا۔ دوسرے میرا خون آلود چہرہ اور سر دیکھ کر نادی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے تھے کہ یہ سب خون ریزی اور غارت گری کا نتیجہ ہے اس حُلیے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے میں نے کچھ خون اپنے سینے پر بھی مل لیا اور سلاخ پر بھی۔۔۔ اور پھر اس عمارت سے نکل گیا۔

سڑک پر چلتے ہوئے مجھے یہ خیال ستانے لگا کہ میں نے حُلیہ تو بدل لیا ہے لیکن قد کا خیال نہیں رکھا چنانچہ میں اپنی ٹانگوں کو کمان کی طرح خم دے کر چلنے لگا تاکہ کم از کم دُور سے دیکھنے والے تو مجھے نادی ہی سمجھیں۔

اب میں تفریح گاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

راستے میں مجھے ایک پارک ملا جس میں بہت سے عرفانی درختوں کی اوٹ میں زندہ موت کی نیند سو رہے تھے۔ شاید نادیوں کی نظر ان پر نہیں پڑی تھی ایسا لگتا تھا جیسے نادیوں نے ساری توجہ عمارتوں کی طرف ہی مرکوز رکھی ہے ورنہ پارک میں تقریباً پانچ سو عرفانی صحیح سلامت نہ پڑے ہوتے۔ شاید کثرتِ تعداد ہی کے باعث عرفانی، نادیوں پر غالب آئے ہوں گے ورنہ رستم کے وحشیوں کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔

میں نے سوچا کہ کیا عرفانی اور نادی امن و اماں کے ساتھ نہیں رہ سکتے؟ لیکن امن و اماں تو دونوں کے درمیاں اُس وقت قائم رہ سکتا تھا جب دونوں کے مابین مساوات اور ایک دوسرے کے جذبات کا احترام ہوتا جب کہ عرفانی نادیوں کو کمتر اور اچھوت سمجھتے تھے اور ان سے گھٹیا سلوک کرتے تھے۔

میں سرچ لائٹس سے بچتا بچاتا اور سائے سائے چلتا ہوا نصف راستہ طے کر گیا۔ راستے میں کئی مقامات پر مجھے خفتہ عرفانیوں کی لاشیں دکھائی دیں اور ان میں کچھ عورتیں بھی نظر آئیں جن کے ساتھ نہایت وحشیانہ سلوک کیا گیا تھا۔ اس بربریت پر میرا خون کھول اُٹھا لیکن میں تنہا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رستم کے بدمست سپاہی مختلف عمارتوں میں گھُسے، چیخ چیخ کر نعرے لگا رہے تھے اور کہیں کہیں تو وہ خود ایک دوسرے سے بھی لڑ مر رہے تھے۔ یہ اُن کی فتح کا نہیں بلکہ الکحل کے ڈبوں کا نشہ تھا۔ جس نے اُنھیں بے قابو اور اندھا کر دیا تھا۔ میں نے ایک مُردہ نادی کے گلے سے زنجیر نکال کر خود پہن لی۔

جب میں تفریح گاہ کے قریب پہنچا تو میں نے ایک نادی محافظ کو دیکھا وہ ایک عرفانی عورت کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا۔ اس مکروہ نظارے سے میری قوت برداشت جواب دے گئی۔

میں نے اُسے للکارتے ہوئے کہا "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ اور تمھارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟"

"تم یہ پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟" اس نے عورت کے بال نہیں چھوڑے اور سلاخ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"میں عقرب ہوں" میں نے زنجیر سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "ذرا میرے عُہدے کی زنجیر دیکھو، میں رستم کے حکم سے گشت پر نکلا ہوں تاکہ احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں سے باز پُرس کر سکوں۔ نام کیا ہے تمھارا؟"

"میرا نام عاتک ہے اور مجھے دُوسہ کے غاروں سے بُلایا گیا ہے میرے ساتھی بلدیہ کی عمارت میں گئے ہیں" اُس نے مرعوب ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"تم اُن کے ساتھ کیوں نہیں گئے اور اس عورت کو کیوں گھسیٹے پھرتے ہو؟"

اُس نے عورت کے بال چھوڑ دیے اور دانت نکالتے ہوئے بولا: "بات دراصل یہ ہے جناب کہ یہ لڑکی مجھے پسند آ گئی ہے"۔

"بکواس مت کرو اور اپنے ساتھیوں کے پاس جاؤ۔ آئندہ فرض سے غفلت برتی تو میں رستم کو بتا دوں گا"۔

عاتک نے کوئی جواب نہ دیا اور بلدیہ کی طرف چل پڑا مگر چند قدم آگے جا کر اپنے کسی ساتھی کو پکارنے لگا، "گونا۔۔۔ او گونا، جلدی آؤ ایک افسر آیا ہے"۔

چند لمحوں کے بعد، جسے گونا کے نام سے پکارا گیا تھا وہ عمارت سے نکلا تو پسینے میں شرابور اور تھکا تھکا سا تھا، اُس نے ایک نظر مجھے اور میرے گلے میں پڑی زنجیر کو دیکھا اور بولا "کیا حکم ہے جناب؟"

"بلدیہ کی عمارت میں جاؤ جہاں تمھارے ساتھی پہنچ چکے ہیں" میں تحکمانہ لہجے میں بولا تو وہ بلا چون و چرا چل دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دونوں مجھے کوئی اجنبی نہیں بلکہ ایک نادی ہی سمجھے تھے اس بات سے مجھے یک گونہ اطمینان سا محسوس ہوا اور میں بے دھڑک تفریح گاہ کی طرف بڑھنے لگا۔

ابھی میں تفریح گاہ سے ایک فرلانگ کے فاصلے پہ تھا کہ ناگاہ مجھ پر سر درد کا شدید دورہ پڑا۔۔۔ اور کنپٹیاں پھٹنے لگیں۔ اسی قسم کا درد مجھے اُس وقت ہُوا کرتا تھا جب کمپیوٹر مجھے واپسی کے لیے

تلاش کرتا تھا گویا کمپیوٹر نے میری تلاش شروع کر دی تھی اور مجھے کبھی بھی مجھے اپنے دَور اور اپنی دُنیا میں واپس بلایا جا سکتا تھا مارے خوشی کے میرا رُواں رُواں رقص کرا ٹھا۔

ابھی یہاں بہت سے کام ادھورے تھے۔ مجھے عام پتھروں سے توانائی حاصل کرنے کا طریقہ معلوم کرنا تھا، چاندنما سرزمین کا اسرار حل کرنا تھا، عرفانیوں اور نادیلوں کے مابین صلح کی کوئی سبیل نکالنی تھی اور ان سب سے پہلے نورے کو جنگلی چوہوں کا تر نوالہ بننے سے بچانا تھا جو محض میری محبت کے جُرم میں اس بھیانک سزا کی مستوجب ٹھہرائی گئی تھی۔ سر درد کی شدید ٹیسوں کے دوران میرا جی چاہا کہ میں نورے کی جگہ ڈاکٹر فریدون کو چوہوں کے بل پر لٹکا دوں جو ہر بار مجھے نئی مصیبتوں اور نئے جھمیلوں میں اُلجھا دیتا ہے اور اَب تو اُسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ میں ماضی کے سفر پر گیا ہُوں یا کمپیوٹر نے مجھے مستقبل میں منتقل کر دیا ہے؟ یہ شہرِ خوابیدہ اور قمرائینوں کی چاندنما سرزمین ماضی کی نہیں بلکہ مستقبل کی نشاندہی کرتی تھی۔

جب تکلیف کا دورہ ختم ہُوا تو میں بھاگ کر تفریح گاہ میں داخل ہو گیا تفریح گاہ کی ڈیوڑھی میں چھ سپاہی اور اُن کا سالار موجود تھے مگر اُن کے اندازِ نشست سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ لُوٹ مار اور عرفانی خواتین سے محروم رہ جانے پر ناخوش ہیں۔ چار سپاہی فرش پہ بیٹھے کوئی کھیل کھیل رہے تھے اور باقی تین جماہیاں لیے جا رہے تھے۔ اُنھوں نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی مگر جب میں ایک راہداری میں مُڑنے لگا تو اُن کا سالار بولا: "اے.. کون ہو تم؟"

میں رُک گیا اور کچھ بولنے کی بجائے اپنی گلے کی زنجیر سے کھیلنے لگا میرے اس عمل سے نہ جانے وہ کیا سمجھا کہ کہنے لگا: "اوہ. شاید ہماری جگہ تمھارا دستہ آیا ہے۔ مگر تمھارے سپاہی کہاں ہیں؟"

"وہ کچھ پیچھے رہ گئے ہیں" میں نے بے پروائی سے جواب دیا اور پُوچھا: "وہ لڑکی نورے کیسی ہے؟"

"وہ اگرچہ جوان اور خوب صورت ہے مگر عرفانی خواتین جیسی نہیں ہے" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا" میں نے کہا: "اب وہ کس حال میں ہے؟"

"اب اُس نے چیخنا چلّانا بند کر دیا ہے۔ رستم کا کوئی نیا حکم ہے کیا؟"

"نیا حکم یہ ہے کہ تم اور تمھارے ساتھی اب لُوٹ مار کر سکتے ہیں یہاں میں نگہبانی کروں گا" میں نے جواب دیا۔

"تم اکیلے یہاں نگرانی کرو گے؟" اس نے تعجب سے پُوچھا

"کیسی احمقانہ بات کرتے ہو تم۔ میں نے بتایا ہے کہ میرے آدمی آ رہے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ عرفانی خواتین حُسن میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔"

ایک سپاہی بولا: "اب ہم یہاں کیا کر رہے ہیں.. ہمیں چلنا چاہیے"

سردار نے تائید میں گردن ہلا دی۔ سپاہیوں کے لٹکے ہُوئے چہرے خوشی سے کِھل اُٹھے اور وہ جانے لگے تو میں نے کہا: "رُک جاؤ..."

وہ رُک گئے اور چودہ سوالیہ نگاہیں میری جانب اُٹھ گئیں "رستم نے کہا تھا کہ کسی عرفانی مرد و زن کو بخشا نہ جائے۔"

"ہاں ہاں۔ ہم پورا پورا انصاف کریں گے" اُن کے سالار نے کہا اور سب تیزی سے باہر چلے گئے۔

میں نے ڈیوڑھی کا جائزہ لیا۔

اس میں نو دروازے تھے میں نے وسطی دروازے کا انتخاب کیا اور اُسے پاؤں کی ٹھوکر سے کھول کر اندر چلا گیا۔

یہ ایک بہت بڑا ہال نما کمرہ تھا جس کی چھت شفاف پلاسٹک سے بنی ہُوئی تھی جس سے چاند کی روشنی اور سرچ لائٹ کا دھارا اندر آ رہا تھا اور ہر چیز واضح دکھائی دے رہی تھی۔ کمرے کی نشستیں اُوپر سے نیچے تک بھری ہُوئی تھیں جن پر عرفانی مرد و زن منجمد بیٹھے اسٹیج پر ہونے والا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اسٹیج پر ہیرو، ہیروئن کے سامنے گھٹنوں کے بل جُھکا کچھ کہنے کے پوز میں تھا۔ اسٹیج اور تماشائیوں کی کُرسیوں کے درمیان خونخوار چوہوں کا بل تھا جس پر نورے زنجیروں سے بندھی لٹک رہی تھی۔ یہ زنجیریں اسٹیج کے پیچھے چلی گئی تھیں۔ یہ زنجیریں آہستہ آہستہ ڈھیلی ہوتیں تو نورے بل کے نزدیک پہنچ جاتی جس میں خوں خوار بھوکے چوہے چیخ چیخ کر اُچھل رہے تھے مگر اُس تک پہنچ نہیں پاتے تھے۔ پھر زنجیر کھینچ کر اُسے اُونچا کر لیا جاتا تھا۔

یہ دیکھ کر مجھے جھرجھری آ گئی اور میں نے سوچا کہ یہ بھی اچھا ہے، نورے بے ہوش ہو گئی ہے ورنہ بار بار موت کے مُنہ میں جاتے رہنے کا نظارا خود موت سے زیادہ دہشت ناک ہے۔ غریب نہ جانے کتنے گھنٹوں سے خوف و دہشت کا یہ عذاب بھگت رہی تھی۔ یُوں لگتا تھا جیسے نشستوں پہ بیٹھے خوابیدہ عرفانی اسٹیج پر اداکاروں کا نہیں بلکہ نورے کی سسکتی اور پل پل رینگتی ہوئی موت

کا نظارا کر کے قہقہے لگا رہے ہوں۔ مَیں نشستوں کے درمیان سے سیڑھیاں اُتر کر گڑھے کے قریب آ گیا اور بولا: "نورے! مَیں آ گیا ہُوں نورے" مگر نورے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بے ہوش تھی۔ مَیں نے ہاتھ بڑھا کر زنجیریں پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ میری دسترس سے دُور تھیں کیوں کہ اسٹیج اُونچا تھا۔ مَیں نے ایک عرفانی تماشائی کو حالتِ خواب میں کُرسی سے اُٹھا کر اُس کے ساتھ بیٹھے تماشائی کی گود میں بٹھا دیا، نشست اکھیڑی اور اُسے اسٹیج کے قریب لا کر اس پہ کھڑا ہو گیا اب میرا ہاتھ آسانی سے اُن زنجیروں تک پہنچ سکتا تھا جن سے نورے جکڑی ہُوئی تھی۔ میں نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

ابھی میں اُسے زنجیروں سے چُھڑا ہی رہا تھا کہ وہ ہوش میں آ گئی۔ چند لمحوں کے لیے تو اس سے بولا ہی نہ گیا پھر اُس نے کہا: "تُک. کون ہو تم؟"

"میں سرفروش ہُوں نورے اور تمھیں بچانے آیا ہُوں"

"نہیں نہیں۔ تم سرفروش نہیں ہو سکتے" اُس نے مجھے دیکھتے ہُوئے کہا۔ شاید وہ مجھے اس حُلیے میں پہچان نہیں سکی تھی۔ میں نے کہا: "غور سے دیکھو نورے... میں سرفروش ہی ہوں"

"آہ... ہاں... مگر یہاں کیوں آئے سرفروش۔ مجھے مر جانے دیتے اب تم بھی پکڑے جاؤ گے۔ تمھیں پکڑنے کے لیے ہی تو رستم نے مجھے یہاں لٹکا رکھا تھا"

"میں جانتا ہُوں نورے۔ وہ کسی بھی لمحے یہاں پہنچنے والا ہے مگر تم ڈرو نہیں... وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا کیوں کہ ابھی ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے"

جب میں نے اُسے زنجیروں کی جکڑ بندی سے آزاد کر کے اسٹیج پہ کھڑا کر دیا تو اس نے کہا: "میرا خیال تھا کہ تم نہیں آؤ گے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ تمھیں مجھ سے اتنا پیار ہو سکتا ہے۔ اب اگر میں مر جاؤں یا رستم میری بوٹی بوٹی اُڑا دے تب بھی مجھے کوئی افسوس نہیں ہو گا۔ میں اس اطمینان کے ساتھ دم توڑ دوں گی کہ میرا محبوب بھی مجھے چاہتا تھا"

نورے مجھ سے محبت بھری باتیں کر رہی تھی مگر میں سوچ رہا تھا کہ میرے پاس بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ مجھے عرفانیوں اور نادیلوں کے درمیان دوستانہ مراسم کی داغ بیل رکھنی ہے اور اس کا طریقہ میں نے یہ سوچا تھا کہ پہلے رستم سے لُوٹ مار اور غارت گری رکواؤں پھر عرفانیوں کے صاحبانِ اقتدار پر قابو پا کر توانائی کی ترسیل بحال کرا دوں تاکہ ان سے معاہدۂ امن کیا جا سکے۔ مگر رستم ابھی تک یہاں نہیں آیا تھا حالاں کہ میرا خیال تھا اُس کے جاسوس اُسے آگاہ کر چکے ہوں گے کہ میں نورے کو بچانے آ گیا ہُوں... اس خیال کے ساتھ ہی میں نے نورے کی طرف دیکھا اور اُس سے پُوچھا: "کیا تم چل سکتی ہو؟"

"نہیں سرفروش، میری ٹانگیں اکڑ گئی ہیں اور میں بھوکی پیاسی بھی ہُوں لیکن چلنے کی کوشش کر دیکھتی ہُوں" یہ کہہ کر اُس نے چلنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کر گرنے لگی تو میں نے اُسے سنبھال لیا اور کہا: "ٹھہرو میں تمھیں اُٹھا کر لے چلتا ہُوں" میں نے اُسے کندھے پر اُٹھا لیا اور چلنے لگا تو اس نے پُوچھا: "کہاں جا رہے ہو تم؟"

"رستم کی تلاش میں" میں نے جواب دیا۔

"اب اس کی ضرورت نہیں رہی" وہ کانپ کر بولی اور اُس نے ہال کے دروازوں کی طرف اشارہ کیا، جو ایک ساتھ کُھل رہے تھے میں نے دیکھا کہ تمام دروازے دھیرے دھیرے کُھل رہے ہیں ہر دروازے سے ایک تنومند آدمی نمودار ہو رہا تھا... پھر وہ وسیع و عریض کمرہ اَن گنت قہقہوں سے گونج اُٹھا اور میرے جسم میں ایک سرد سی لہر رُوح کی گہرائی تک اُتر گئی۔

میرے قریب کھڑی لڑکی نازک پتے کی مانند کانپ رہی تھی اور اس کی پیشانی پر شفاف پسینے کے موتیوں جیسے قطرے چمک اُٹھے تھے۔ جو کچھ ہُوا تھا، مجھے اس کی توقع نہیں تھی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شاہ رستم مجھے اس انداز میں اپنے جال میں پھانس سکتا ہے اگرچہ نادیوں کے پاس آہنی سلاخ کے علاوہ کوئی ایسا ہتھیار نہیں تھا جس سے وہ مجھے دُور ہی سے نشانہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے اس کے باوجود اَن گنت ایسے آدمیوں سے بِھڑ جانا کوئی دانش مندانہ فعل نہیں تھا جن کے ہاتھوں میں آہنی سلاخیں دبی ہُوئی ہوں۔

میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا جبکہ میری ٹکراتی ہوئی نظریں اُن کے سالار پر تھم کر رہ گئیں۔ وہ مجھ سے چھ قدم کے فاصلے پر سلاخ تھامے کھڑا تھا۔ میں نے اپنے اوسان بحال رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور بے خوفی سے کہا۔ "شاید تم مجھے نہیں جانتے۔ میرا نام سرفروش ہے۔ شاہ رُستم مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔ اُسے بتاؤ کہ میں بھی اس سے ملاقات کے لیے بے چین ہوں۔"

سالار میری بات پر سکرانے لگا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ تب اُس نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ میری نگاہ اُس کے اشارے کے تعاقب میں اُٹھ گئی تو میں نے دیکھا کہ شاہ رُستم بھی وہاں موجود تھا۔

وہ ہال میں نشستوں کے درمیانی راستے سے اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں مجھ پر اور نورے پر جمی ہوئی تھیں... پھر وہ خوفناک آدم خور چوہوں کے بل کے قریب رُک گیا اور بلند آواز میں مجھ سے پوچھا۔ "شیلو کہاں ہے؟"

میں جانتا تھا کہ اگر میں نے جھوٹ بولنے یا اُسے ٹالنے کی کوشش کی تو اُس کا ایک ہی اشارہ مجھے اور نورے کو چوہوں کی خوراک بنا دے گا۔ اس لیے میں نے کہا۔ "وہ توانائی کے مخزن میں ہے۔"

"میرے احمق آدمیوں نے یہاں وہ کچھ کر ڈالا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بہرحال، بتاؤ کہ تم شیلو تک پیغام کیسے بھیج سکتے ہو؟" رُستم نے سوال کیا۔

"بلدیہ کی عمارت میں ایک پھسلواں راستہ ہے جو مخزن تک جاتا ہے۔ میں کسی بھاری چیز کے ساتھ پیغام وہاں تک پہنچا سکتا ہوں۔"

رُستم میری اس بات پر مسکرایا اور بولا۔ "بھاری چیز نہیں بلکہ کسی بھاری جسم کے ساتھ... اور وہ جسم تمھارا بھی ہو سکتا ہے مگر ایک لاش کی صورت میں..."

"ہاں، یہ ممکن ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں شیلو کو تم سے ملے اور بات چیت کیے بغیر کوئی پیغام نہیں بھیج سکتا اور نہ ہی بھیجنا چاہتا ہوں۔"

"مگر پیغام کا مقصد؟ کیا میں چاہوں گا کہ وہ توانائی کی ترسیل بحال کر دے۔ اگر میں ایسا چاہوں تو مجھ سے بڑا احمق اور کون ہو سکتا ہے؟" پھر اُس نے ہال میں خوابیدہ عرفانی تماشائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "کیا میں ان بدبختوں کو جگا دوں جو تعداد میں ہم سے بہت زیادہ ہی نہیں بلکہ بے حد خطرناک ہتھیار بھی رکھتے ہیں جبکہ ہمارے پاس صرف یہ سلاخیں ہیں یا تم خود احمق اور پاگل ہو۔ اگر توانائی بحال کی گئی تو یہ عرفانی ہمارے ساتھ ساتھ تمھیں بھی مار ڈالیں گے اور تم نے شیلو پر اعتماد کر کے دُہری حماقت کا ثبوت دیا ہے کیونکہ وہ غدار

ہے اور مجھے شک ہے کہ وہ قمرانیوں سے ملی ہوئی ہے۔"

"تمھارا شک صدفی صد دُرست ہے۔ وہ قمرانیوں کی جاسوس ہے مگر ابھی تک اس نے ہم سے غداری نہیں کی... وہ مجھے اپنے ساتھ ملا کر عرفانیوں پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہی ہے۔ وہ قمرانیوں کے ساتھ بھی معاہدۂ امن کرنا چاہتی ہے جنھوں نے شیلو کے ساتھ بڑے بڑے وعدے کر رکھے ہیں لیکن رُستم اگر تم صبر و تحمل سے کام لو اور مجھے موقع دو تو میں شیلو سے نمٹ سکتا ہوں۔"

"یہ تمھاری غلط فہمی ہے، سرفروش! وہ ان آدم خور چوہوں سے بھی زیادہ خونخوار اور خطرناک ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمھیں ختم کر دوں یا تمھاری باتیں سُن کر وقت ضائع کرتا رہوں۔"

"پہلے میری بات سُن لو رستم... پھر جب چاہو مجھے ختم کر دینا۔ یہ تو تمھیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ آشی کو میں نے قتل نہیں کیا تھا؟"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں کہ اُسے دارا نے قتل کیا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے فرار ہوتے وقت میرے آدمیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا... لیکن یہ قدرتی بات تھی اس لیے میں تمھیں اس اقدام کے لیے کسی سزا کا مستحق قرار نہیں دیتا... مگر میں دارا کو معاف نہیں کر سکتا، تمھیں اس کو میرے حوالے کرنا پڑے گا۔"

"وہ تو زخموں کی تاب نہ لا کر مر چکا ہے رُستم!" میں نے بے ساختہ جھوٹ بول دیا۔ "شیلو کے ساتھ اُس کا بیٹا رُومی بھی توانائی کے مخزن میں موجود ہے۔"

"مجھے اس پلّے کی کوئی پروا نہیں۔" وہ نفرت سے بولا جبکہ میرا خیال تھا کہ حیرت سے اس کا چہرہ بگڑ جائے گا۔

"میری مانو تو ہم دونوں بلدیہ کی عمارت میں چل کر عرفانیوں کے سربراہوں کو گرفتار کر لیتے ہیں... پھر توانائی کے مخزن پر قابض ہو کر من مانی شرائط طے کریں گے۔" میں نے تجویز پیش کی۔

"تمھاری تجویز سمجھ میں تو آتی ہے لیکن اب اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ میں نے عرفانیوں کے سربراہوں کو قتل کر دیا ہے اور اگر شیلو نے توانائی بحال کر دی تو یہ لوگ ہم نادیوں کو نیست و نابود کر دیں گے اس لیے سب سے پہلے ہمیں شیلو اور رومی کو ختم کرنا ہو گا۔"

"لیکن یہ کیوں بھولتے ہو کہ یہ شہر خوابیدہ لامحدود وسعت میں پھیلا ہوا ہے۔ تم کب تک اور کتنے عرفانیوں کو قتل کرو گے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی دُوسرا توانائی کی ترسیل بحال کر دے۔ ممکن ہے، قمرانی یہ کام کر ڈالیں۔"

"دیکھو سرفروش! اب ہم پستیوں سے باہر آ چکے ہیں اس لیے دوبارہ اُس ذلت کو نہیں اپنائیں گے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" رُستم نے دو ٹوک اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

"اچھا میری ایک اور تجویز پر غور کرو۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "اگر کسی طرح قمرانیوں سے میرا رابطہ قائم ہو جائے تو میں تمھارے اور قمرانیوں کے درمیان معاہدۂ امن کرا دوں گا اور قمرانی عرفانیوں کو خود ہی سنبھال لیں گے۔"

"تم نے احمقانہ بات کی ہے۔ قمرانیوں کو نہ تو عرفانیوں کی کوئی پروا ہے اور نہ ہی ہم نادیوں کی... ہم تو اُن کے نزدیک چوہوں سے بھی بدتر ہیں۔"

"لیکن چاند نما سرزمین پر ہونے والی سرگرمیاں تو اس اَمر کا اظہار کرتی ہیں کہ قمرانی یہاں کی صورتِ حال سے خاصے متاثر ہو چکے ہیں اور شاید تمھیں یہ معلوم نہ ہو کہ عرفانیوں کو توانائی کی ترسیل شیلو نے قمرانیوں کے ایما پر ہی روکی تھی۔ کیا یہ راز تمھیں معلوم تھا؟"

"نہیں۔ میں قمرانیوں جتنی بلند سوچ کا مالک نہیں ہوں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں اور ہم ان کے سامنے بے بس ہیں۔"

"اچھا ایک بات اور... قمرانی میری ذات میں بے حد دلچسپی رکھتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ مجھے کوئی نقصان پہنچے۔ میں تمھاری خاطر اُن سے اپنی ذات کی سودے بازی کر سکتا ہوں۔ سب سے پہلے ہمیں بلدیہ کی عمارت میں چل کر ایک دستہ توانائی کے مخزن کی طرف بھیجنا چاہیے تاکہ وہ اس پر قبضہ کر لے کیونکہ خود مجھے بھی شیلو پر اعتماد نہیں ہے۔"

میں نے بات ختم کی ہی تھی کہ ہال میں روشنی تیز ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اسٹیج پر "منجمد اداکاروں" میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مکالمے بولنے لگے۔ ساتھ ہی تماشائی بھی "زندہ موت" کی نیند سے جاگ اُٹھے۔ یہ دیکھ کر رُستم چیخ پڑا۔

"غداری ہو گئی۔ شیلو نے توانائی کی ترسیل بحال کر دی ہے۔"

تماشائیوں میں سے کئی آوازیں بیک وقت بلند ہوئیں۔ "ارے اسٹیج پر نادی کہاں سے آ گئے۔ مارو۔ نادیوں کو قتل کر دو۔"

تماشائی عورتیں بھی چیخنے چلّانے لگیں۔

ایک اداکار رُستم کی طرف جھپٹا مگر میں نے اُسے چوہوں کے گڑھے میں پھینک دیا اور رُستم جو مجھے اپنی آہنی سلاخ مارنے ہی والا تھا، مفلوج سا ہو کر رہ گیا۔

"یہ غداری میں نے نہیں، شیلو نے کی ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔" میں نے کہا اور اُسے اپنی جانب گھسیٹ لیا۔ اتنے میں عرفانی نادیوں سے لڑنے لگے۔ عورتوں کی چیخ و پکار کے ساتھ ہال میں بھگدڑ مچ گئی۔ رُستم کے سپاہی ابھی تک صحیح صورتِ حال نہیں سمجھ سکے تھے۔

"بدبختو! دیکھتے کیا ہو۔ نکلو یہاں سے" میں نے چیخ کر کہا اور نورے کی طرف متوجہ ہوا جو میرے قریب کھڑی تھی: "تم میرے ساتھ رہنا ورنہ ماری جاؤ گی۔"

نادیوں نے بھی اپنی آہنی سلاخوں سے کام لینا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر عرفانی چلّانے لگے: "پولیس کو اطلاع دو۔ پولیس کو بلاؤ۔"

میں رستم اور اُس کے چند سپاہی لڑتے بھڑتے اسٹیج کے پیچھے آ کر تہ خانے میں اُتر گئے اور اُس کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

اتنے میں باہر سے سائرن کی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے تہ خانے کے روشن دان سے جھانک کر باہر دیکھا ابھی اس سڑک پر پولیس ۔۔۔یں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔

ہم جلدی سے دُوسرے دروازے سے نکل کر بلدیہ کی عمارت کی طرف بھاگنے لگے۔ ابھی ہم تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ سڑکوں پر افراتفری کے آثار دکھائی دینے لگے اور پولیس کی گاڑیاں بھی ادھر سے اُدھر دوڑتی نظر آئیں۔ ان گاڑیوں میں چھ چھ آدمی سوار تھے جنھوں نے اپنے چہرے ماسک سے چھپا رکھے تھے۔

"اُنھوں نے ماسک کیوں لگا رکھے ہیں؟" میں نے رستم سے پوچھا۔

"ہنسنے والی موت سے بچنے کے لیے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" میرے لہجے میں حیرت تھی۔

"وہ ایک سفوف پھینکتے ہیں جس کی خوشبو سے آدمی ہنستے ہنستے مر جاتا ہے۔"

"تو پھر بہتر یہ ہوگا کہ ہم کسی تہ خانے میں چلے جائیں اور تہ خانوں کے راستے بلدیہ کی عمارت کی طرف بڑھیں۔" میں نے مشورہ دیا اور ہم ایک عمارت کے تہ خانے میں گھس گئے۔

"وہ ہمیں ڈھونڈ نکالیں گے سرفروش، ہم چھپ نہیں سکتے۔" رستم بولا۔

"اُس کی بھی ایک ترکیب ہے۔" میں نے کہا: "مگر تمھارے کچھ آدمیوں کو جان کی بازی لگانا پڑے گی۔ ہو سکتا ہے انھیں اپنی جانوں کی قربانی بھی دینا پڑے۔ کیا تمھارے پاس ایسے جانباز موجود ہیں؟"

"میرے محافظ میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔" اُس نے فخر سے بتایا۔

"تو پھر اپنے تیس آدمیوں کو حکم دو کہ وہ چھتوں پر چلے جائیں اور پولیس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیں۔ عرفانی سمجھیں گے کہ ہم انھی میں شامل ہیں۔ یہ لوگ بلدیہ کی مخالف چھتوں پر سفر جاری رکھیں، ہم تہ خانوں کی دیواریں توڑ کر نیچے ہی نیچے بلدیہ کی طرف بڑھتے رہیں گے۔"

رستم نے میری تجویز پر تیس آدمی منتخب کیے اور اُنھیں سمجھا دیا کہ وہ کیا کریں گے۔ ہر عمارت کے تہ خانے کی دیوار سا جھی تھی۔ یہ عمارتیں اور دیواریں بھی پلاسٹک کی بنی ہوئی تھیں جو آسانی سے ٹوٹ جاتی تھیں۔ ہم نے متعدد گروہ بنا لیے۔ ہر گروہ باری باری دیوار توڑتا تھا تاکہ دوبارہ اپنی باری آنے تک تازہ دم ہو جائے۔ اِس طرح ہم تیزی سے منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے لگے۔ اچانک ایک مقام پر رستم نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

"ہم بلدیہ کیوں جا رہے ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"تاکہ وہاں سے توانائی کے مخزن تک پہنچ سکیں۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن ہم سے پہلے وہاں تک پولیس پہنچ چکی ہو گی۔" وہ بولا: "اور اپنے سربراہوں کا حال دیکھ کر ہمارے پرخچے اُڑا دے گی۔"

"پہلے میں سمجھتا تھا کہ تم نے عرفانی سربراہوں کو مار کر بہت بڑی غلطی کی ہے لیکن اب میرا خیال بدل گیا ہے۔ تم نے عرفانیوں کو سربراہوں سے محروم کر دیا ہے۔ اس لیے اُن کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ اب وہ کیا کریں... پھر اُنھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ ایک طویل نیند سے جاگے ہیں۔ اُوپر سے تمھارے حملے نے اُنھیں ہراساں کر دیا ہے۔ یہ ساری باتیں اُنھیں بُری طرح پریشان کر دیں گی۔ ہم اُن کی اس پریشانی سے فائدہ اُٹھا کر توانائی کے مخزن تک پہنچ سکتے ہیں۔"

یہ بات رستم کی سمجھ میں آ گئی۔

میں نے ایک تہ خانے کے روشندان سے جھانک کر دیکھا۔ پولیس کی گاڑیوں کا رُخ متضاد سمت میں تھا۔ وہ رستم کے تیس آدمیوں کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ وہ تتر بتر ہو کر اُنھیں گمراہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

تہ خانوں کی دیواریں توڑتے ہوئے جب ہم بلدیہ کے زیرِ زمین حصے میں پہنچے تو باہر سے پولیس والوں کی آوازیں آ رہی تھیں کسی نے بآوازِ بلند پُوچھا: "کیا تم صدرِ بلدیہ سے مل کر آئے ہو؟"

اُسے جواب دیا گیا: "نہیں۔ جب تک میں ہنسنے والے سفوف کی توپیں عمارت کے چاروں طرف نصب نہ کروا لوں، صدر سے نہیں ملوں گا۔ ورنہ اُنھوں نے انتظامات کے بارے میں پُوچھا تو کیا جواب دُوں گا؟"

پولیس افسر کا یہ جواب میرے لیے خاصا حوصلہ افزا تھا۔ میں نے رستم سے کہا کہ وہ اپنے کچھ آدمی باہر بھیج کر پولیس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا دیں تاکہ ہم آسانی اُوپر پہنچ سکیں۔ رستم نے میرا یہ مشورہ بھی قبول کر لیا اور ہم باآسانی اس کمرے تک جا پہنچے جہاں عمائدینِ شہر کی لاشیں پڑی تھیں لیکن ہم یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے

رصدِ بلدیہ کی کُرسی پر شیلو براجمان تھی اور اُس کے سامنے وہی ٹی وی نما سیٹ دھرا تھا جیسا کہ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میں نے رستم اور نورے کو چھپنے کا اشارہ کیا اور ہم لاشوں کے درمیان لیٹ کر شیلو کی گفتگو سُننے لگے۔

وہ کہہ رہی تھی...

"میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ رستم نے بغاوت کر دی ہے اُس کے سپاہیوں نے لُوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اس لیے میں نے توانائی بحال کر دی۔ اب عرفانیوں اور نادیوں کے درمیان جنگ جاری ہے اور..."

دفعتاً قمرانی نے اُس کی بات کاٹ دی: "تمھاری دیرینہ آرزو پوری ہو گئی ہے اور اب تم صدرِ بلدیہ کی کُرسی پر بیٹھ کر مجھ سے گفتگو کر رہی ہو۔ یہی کہنا چاہتی ہو نا، تم؟"

"یہ وقت طنز کرنے کا نہیں جمشید،" شیلو نے جواب دیا: "مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں تمھاری طرف سے عملی اقدام چاہتی ہوں۔"

"ہمیں کسی اقدام کی ضرورت نہیں۔" جمشید کی آواز آئی: "انھیں آپس میں لڑنے دو تاکہ سب تو دہی تباہ ہو جائیں۔"

"اگر سب تباہ ہو گئے تو میں حکمرانی کس پر کروں گی؟"

جمشید کے قہقہے کی آواز اُبھری۔ پھر اُس نے کہا: "تم اب تک حکمرانی کے خواب دیکھنے سے باز نہیں آئیں شیلو؟"

"خواب؟... لیکن تم نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمھاری آلۂ کار بن جاؤں تو تم مجھے اس شہر کی حتیٰ کہ عرفانیوں کی ملکہ بنا دو گے۔"

"ہاں میں نے وعدہ کیا تھا... اور تم نے بھی تو وعدہ کیا تھا کہ سرفروش کو بغیر کوئی ضرر پہنچائے ہمارے حوالے کر دو گی لیکن تم نے اپنا وعدہ پُورا کرنے کی بجائے توانائی بحال کر کے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا جس میں سرفروش کا ہلاک ہو جانا یقینی ہے۔ اس لیے اب میں کسی وعدے کا پابند نہیں رہا۔"

"لیکن میں توانائی بحال کرنے پر مجبور تھی۔ دُوسرے یہ بھی ضروری نہیں کہ سرفروش مر چکا ہو... تم جانتے ہو کہ وہ بہت بہادر اور جنگجو ہے۔"

"بہادر بھی موت سے نہیں بچ سکتے شیلو۔ وہ ہمیں شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں دکھائی نہیں دے رہا اور تہ خانوں میں ہم دیکھ نہیں سکتے۔ کیا معلوم اُسے کسی تہ خانے میں قتل کر دیا گیا ہو۔"

"اُسے یہاں اس عمارت میں آنا تھا۔ اگر وہ زندہ ہو اور یہاں آ جائے تو؟" شیلو نے پُوچھا۔

"تو پھر میں تمھاری مدد کرنے اور تمھیں ملکہ بنانے کا وعدہ پُورا کر دُوں گا۔ جیسے ہی میں دیکھوں گا کہ اُسے کوئی ضرر نہیں پہنچی اور ہمارے سائنس داں اس کا معائنہ کر سکتے ہیں، میں عرفانیوں اور نادیوں کے درمیان یہ معرکہ آرائی ختم کرا دُوں گا۔"

"تم اپنے وعدے سے منحرف تو نہیں ہو جاؤ گے؟" شیلو نے پوچھا

"میں پہلے کبھی اپنے وعدے سے منحرف نہیں ہُوا۔ میں نے تم سے موزوں وقت تک انتظار کرنے کو کہا تھا مگر تم نے جلد بازی سے کام لیا اور سرفروش کو بھی ہمارے حوالے نہیں کیا۔"

اتنے میں باہر چوراہے سے نادیوں اور عرفانیوں کے جوابی نعروں اور چیخ و پُکار کی آوازیں سُنائی دیں۔

"چوراہوں پر لڑائی ہو رہی ہے۔ شاید سرفروش اس لڑائی میں شامل ہو۔" شیلو نے کہا۔

"نہیں۔ میں دیکھ رہا ہُوں کہ وہ ان لوگوں میں شامل نہیں ہے اور عرفانیوں نے ہنستی موت کی توپ چلا کر نادیوں کو ختم کر دیا ہے۔" جمشید نے اسے بتایا۔

"میں تم سے التجا کرتی ہُوں کہ یہ لڑائی بند کرا دو اور فرض کرو کہ سرفروش زندہ ہے تو لڑائی بند ہونے پر وہ عرفانیوں کے ہاتھوں مرنے سے بچ جائے گا ورنہ وہ اُسے بھی نادی سمجھ کر مار ڈالیں گے۔"

"تمھاری بات سمجھ میں آتی ہے شیلو، اسپیکرز کے سوئچ آن کر دو، میں عرفانیوں سے بات کروں گا۔"

شیلو نے ایک بٹن دبایا تو ٹی وی سیٹ سے ایک مائیکروفون نکل کر اسکرین کے سامنے آ گیا۔

جمشید مائیک پر بولنے لگا۔

"عرفانیو اور نادیو سُنو۔ میں چاند سے جمشید قمرانی بول رہا ہُوں۔ یہ معرکہ آرائی فوراً بند کر دو۔ بچے کھچے نادی زیرِ زمین واپس چلے جائیں اور عرفانی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ شہر کی عمل داری پولیس اور فوج سنبھال لے گی۔ کسی عرفانی یا نادی نے میرے اس حکم کی خلاف ورزی کی تو اسے عبرتناک سزا دے کر نیست و نابود کر دیا جائے گا... اور سرفروش نامی اجنبی کے لیے میرا یہ پیغام ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو، بلدیہ کی عمارت میں پہنچ جائے۔"

خدا معلوم جمشید قمرانی کی آواز میں کیا تاثیر تھی کہ باہر سے جنگ و جدل کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ شیلو نے اُٹھ کر کھڑکی سے جھانکا اور واپس آ کر جمشید سے بولی: "اُنھوں نے لڑائی بند کر دی ہے۔ اب سرفروش یہاں پہنچ جائے گا۔"

"اگر وہ پہنچ جائے تو مجھے بتا دینا۔" جمشید نے جواب دیا اور اس کی شبیہ اسکرین سے غائب ہو گئی۔

اس دوران شیلو کی تمام تر توجہ جمشید قمرانی کی جانب مبذول

رہی تھی اور اُسے ہماری موجودگی کا نہ تو علم ہوا اور نہ ہی احساس ہوا جب جمشید سے اس کا رابطہ ختم ہو گیا تو رستم ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ شیلو اُسے دیکھ کر یوں اُچھلی جیسے اُسے بجلی کا ننگا تار چھو گیا ہو مگر جلد ہی سنبھل گئی اور اُس نے رستم کے احترام میں اپنا ایک ہاتھ بلند کر دیا۔

رستم نے آہنی سلاخ اُس پر تولی تو وہ بولی: "رُک جاؤ رستم! جنگ ختم ہو گئی ہے اور تم مجھ سے جیت گئے ہو بلکہ یوں کہنا درست ہو گا کہ میں تم سے ہار گئی ہوں مگر ہم دونوں نے عرفانیوں پر فتح پائی ہے۔ میں نے جمشید قمرانی سے کہہ کر عرفانیوں کو نادیوں کی خونریزی سے رکوا دیا ہے۔ آج میں تمھارے سامنے یہ اعتراف بھی کرتی ہوں کہ میں قمرانیوں کی آلۂ کار تھی۔ اب ہم دونوں اس شہر میں اُسی طرح حکمرانی کریں گے جیسے زیرِ زمین کیا کرتے تھے۔ آیندہ نادیوں اور عرفانیوں کے حقوق شہریت یکساں ہوں گے۔"

رستم مسکرانے لگا۔ اُس نے اپنا خون آلود ہاتھ سر پر پھیرا اور مخصوص نشان بناتے ہوئے بولا: "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، کچھ دیر پہلے تم کچھ اور کہہ رہی تھیں۔"

شیلو نے اُسے جواب دینے کی بجائے ٹی۔ وی اسکرین کی جانب دیکھا مگر وہ خالی تھی۔ تاہم اُس نے پُرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "تم جانتے ہو کہ قمرانی کتنے چالاک ہیں۔ مجھے اُن سے ایسی ہی بات کرنی چاہیے تھی ورنہ وہ اعتراض کر سکتے تھے کہ تمھیں کس بنیاد پر اقتدار میں شریک کرنا ضروری ہے۔"

"میں قمرانیوں کو تم سے زیادہ سمجھتا ہوں غدار عورت۔ وہ جھوٹے وعدے کرتے ہیں اور کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ اُنھوں نے یہ ہنگامہ آرائی اس لیے ختم کروائی ہے کہ اُنھیں سرفروش کی ضرورت ہے۔ میں تمھاری اور جمشید قمرانی کی ساری گفتگو سُن چکا ہوں مگر اس کے باوجود تم مجھے... بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اب تمھارا کوئی مکر اور کوئی فریب مجھے تمھارے قتل سے نہیں روک سکتا۔"

یہ کہہ کر اُس نے آہنی سلاخ تولی مگر میں نے اُسے پکڑتے ہوئے کہا: "شیلو کی جلد بازی کا نتیجہ دیکھ لینے کے باوجود تم بھی وہی حرکت کرنا چاہتے ہو۔ اب کوئی قتل و غارت گری نہیں ہو گی۔ قمرانیوں کو اگر میری ذات سے دلچسپی ہے تو اُنھیں بھی عرفانیوں اور تمھارے ساتھ معاہدے کا ایک فریق بننا پڑے گا۔"

میں یہ کہتے ہوئے رستم کی طرف متوجہ تھا کہ اتنے میں مجھے شیلو کی چیخ سُنائی دی۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا۔ لوزے نے آہنی سلاخ اُس کے سینے میں اُتار دی تھی اور اب بھی بار بار گھونپے جا رہی تھی۔ میں نے جلدی سے لوزے کی کلائی تھام لی۔

"یہ تم نے کیا کر دیا، بے وقوف لڑکی؟ تم نے شیلو کو کیوں مار ڈالا؟"

"میں تم سے محبت کرتی ہوں سرفروش۔ یہ عورت اپنا مقصد پورا ہونے کے بعد تمھیں قتل کر دینا چاہتی تھی اور اب بھی یہی کرتی۔ اس لیے میں نے اسے قتل کر دیا۔"

رستم اس بات پر مسکراتے ہوئے بولا: "نادی عورت اپنی محبت کے تحفظ کے لیے ایسا ہی کیا کرتی ہے سرفروش۔"

شیلو کھانستے اور خون تھوکتے ہوئے اُکھڑے اُکھڑے سے لہجے میں بولی: "میں... تمھیں... قتل نہیں... کر سکتی تھی... مجھے بھی... تم سے..." اُس کی گردن ڈھلک گئی۔

یکایک ٹی۔ وی اسکرین سے جمشید قمرانی کی آواز سُنائی دینے لگی۔

"شیلو کو شروع ہی سے خواب دیکھنے کی عادت تھی سرفروش۔ اب وہ مر چکی ہے اور اگر تم نے میرا حکم نہ مانا تو تم سب بھی جلد ہی اُس سے جا ملو گے۔"

جمشید کا عکس دیکھتے ہی رستم اور لوزے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے جبکہ میں نے جمشید سے کہا: "تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"ہمیں تمھاری ضرورت ہے۔ کیوں؟ یہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم دائیں جانب والا آخری بٹن دبا دو۔"

میں نے آخری بٹن دبایا تو کمرے کی چھت کا گنبد کھل گیا اور چاند نما سرزمین سے کوئی چیز نیچے پرواز کرتی نظر آئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ ایک بم ہے۔ میں نے پہلے کبھی اتنا بڑا بم نہیں دیکھا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ قریب آتا اور بڑا ہوتا جا رہا تھا۔

جمشید پھر بولنے لگا...

"میں جمشید قمرانی ہوں اور میں صرف تم سے مخاطب ہوں سرفروش۔ اس وقت تک تیس کی گنتی پوری ہو چکی ہے۔ سو کی گنتی پوری ہونے سے پہلے میں یہ بم روک سکتا ہوں۔ بولو اب کیا کہتے ہو؟"

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"ہم تم سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں اور ہمارے سائنسدان تمھارا معائنہ کرنے کے آرزومند ہیں جس سے تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"اگر میں تمھاری بات مان لوں تو تم بم واقعی روک لو گے؟"

"ہاں۔ پچاس کی گنتی پوری ہو چکی ہے۔ یہ خواب آور بم نہیں بلکہ آتشیں بم ہے۔ یہ ہر چیز کو ہمیشہ کے لیے بھسم کر دے گا۔"

"تو پھر یہ بم روک لو۔ میں تمھارا مطالبہ پورا کرنے پر آمادہ ہوں۔"

یہ سُنتے ہی رستم اظہارِ تشکر میں میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ میں نے اُسے ہٹا کر بم کی طرف دیکھا جو اب بھی تیزی سے نیچے آ رہا تھا۔

میں چیخ پڑا: "بم روک لو جمشید۔ میں تیار ہوں۔"

"اب صرف چالیس کی گنتی باقی رہ گئی ہے مگر ہمارے درمیان معاہدہ ہونا تھا، ہو چکا۔ ہم قمرانی ان عرفانیوں اور نادیوں سے عاجز آ چکے ہیں۔ میرا جی تو چاہتا ہے کہ اُنھیں بم کا شکار بنا دوں مگر افسرانِ بالا کی وجہ سے مجبور ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب پچیس کی گنتی باقی رہ گئی ہے۔"

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، بم قریب تر آتا جا رہا تھا اور میرے اضطراب میں بھی شدت آتی جا رہی تھی۔ میرا دل بھی بُری طرح دھڑکنے لگا تھا لیکن وہ بدبخت بم رُکنے یا اُس کا رُخ موڑنے کی بجائے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اتنے میں مجھ پر پھر کمپیوٹر والے سر درد کا دورہ پڑ گیا لیکن اب بم اتنا قریب آ چکا تھا کہ کمپیوٹر بھی مجھے اُس سے نہیں بچا سکتا تھا۔ میں نے اسکرین کو مُکا دکھاتے ہوئے کہا...

"جب میں نے تمھاری بات مان لی ہے تو بم کو کیوں نہیں روکتے؟"

جمشید نے قہقہہ لگایا اور بولا: "ابھی تو تقریباً پندرہ کی گنتی باقی ہے۔ میں اسے چودھویں گنتی تک روک سکتا ہوں۔"

میں نے بم کی طرف دیکھا۔

وہ نیچے آ رہا تھا اور اب بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ پھر اچانک ہی ایک دائرے میں گھومنے لگا اور مزید نیچے آنا بند ہو گیا۔

یہ دیکھ کر میری جان میں جان آئی اور میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا: "اب مجھے کیا کرنا ہے؟"

"چھت پر جاؤ اور انتظار کرو۔ پھسلواں راستے کے قریب تمھیں ایک ہیلی پیڈ نظر آئے گا۔ ہماری میگنا کار وہیں اُترے گی۔ اُس میں داخل ہو کر اوندھے منہ ساکت لیٹ جانا۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"بس تو پھر اُوپر جاؤ۔"

میں اُوپر جانے لگا تو لوزے مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ میں نے رستم سے کہا کہ وہ اُسے پکڑ لے۔ اُس نے روتی ہوئی لوزے کو پکڑ لیا اور متفکر نگاہوں سے اس وقت تک میری طرف دیکھتا رہا جب تک کہ میں سیڑھیاں چڑھ کر گنبد والے شگاف سے اُوپر نہیں نکل گیا۔

پھسلواں راستے کے قریب واقعی ایک چھوٹا سا ہیلی پیڈ بنا ہوا تھا اور وہاں تابوت نما میگنا کار میری منتظر تھی۔ میں قریب پہنچا تو اُس کا دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔

میں کار میں داخل ہو کر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ مجھے یہ احساس تک نہ ہوا کہ وہ اُڑنے لگی ہے۔ بس اتنا پتہ چلا کہ اُس کے شفاف فرش سے شہرِ خوابیدہ کی جو عمارات دکھائی دے رہی تھیں، وہ ہر لمحے چھوٹی ہوتی جا رہی تھیں۔

اچانک ہی مجھے شہر میں تاحدِ نظر شعلے اُٹھتے دکھائی دینے لگے۔ جمشید نے وہ آتشیں بم گرا دیا تھا۔

میں نے دُکھ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

❁

میگنا کار کا دروازہ کھلا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ رُک چکی ہے اور میں اس چاند نما سرزمین پر پہنچ گیا ہوں جس سے شہرِ خوابیدہ پر دشمنوں کے دھاوے ڈالے جاتے تھے۔

میں کار سے باہر نکلا تو اپنے استقبال کو جمشید قمرانی کی بجائے ایک اُدھیڑ عمر کے آدمی کو اپنا منتظر پایا۔ اُس نے بڑی خندہ پیشانی سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "خسرو قمرانی آپ کو خوش آمدید کہتا ہے جناب۔"

میں نے اُس سے ہاتھ ملایا اور سوچنے لگا کہ اگر خسرو کی بجائے جمشید آیا ہوتا تو میں اُس کی بدعہدی پر اُس کا ہاتھ ضرور توڑ دیتا۔ اُس نے شہرِ خوابیدہ پر بم گرا کر ان گنت انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ پوری ایک تہذیب نیست و نابود کر دی تھی۔

"ہم آپ کے لیے بے حد متفکر تھے جناب۔ آپ نے وہاں بڑے عذاب میں وقت گزارا ہو گا؟" خسرو بڑی لگاوٹ سے بول رہا تھا۔

"اُس سے بہت کم جو اب شہرِ خوابیدہ کے لوگوں پر گزر رہا ہے۔" میں نے تلخی سے جواب دیا مگر اُس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ کھیلتی رہی۔

وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں لے آیا جہاں دو آرام کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ایک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا: "تشریف رکھیے۔"

جب ہم بیٹھ گئے تو اُس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہنا شروع کیا: "ہم آپ کا معائنہ کرنا چاہتے تھے جناب۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"اگر ہوتا تو کیا تم اپنا ارادہ ملتوی کر دیتے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب۔" وہ اُسی طرح مسکراتے ہوئے بولا: "آپ کا معائنہ ہر حال میں کیا جائے گا اور یہ سرسری نہیں ہو گا بلکہ آپ کے متعدد ٹیسٹ لیے جائیں گے۔"

میں نے اُس کی اَن سُنی کرتے ہوئے پوچھا: "جمشید نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں اپنے آپ کو قمرانیوں کے حوالے کر دوں تو وہ بم نہیں گرائے گا۔ پھر یہ وعدہ خلافی کیوں کی گئی ہے؟"

"یہ وعدہ جمشید نے کیا تھا جناب، میں نے نہیں اور پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں بھی وہی کرتا جو جمشید نے کیا ہے۔ وعدہ صرف الفاظ کا کھیل ہوتا ہے اور یہ الفاظ اُس وقت تک بامعنی ہوتے

ہیں جب تک کہ ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ یہی ہماری سیاست کی بنیاد ہے اور پھر وقت آگیا تھا کہ زاریوں اور عرفانیوں کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل کردیا جائے۔ ہم تو کافی دنوں پہلے ہم گرا چکے ہوتے مگر اتفاق سے آپ وہاں پہنچ گئے۔ ہم آپ کی وجہ سے متفکر تھے کہ کہیں عرفانی یا زاری آپ کو قتل نہ کردیں اور یوں ہماری جستجو نے تحقیق ادھوری نہ رہ جائے۔"

"ایک طرف تو تم ذوق اور جستجوئے علم کی بات کرتے ہو اور دوسری طرف جذبۂ انسانیت کی پروا بھی نہیں کرتے۔ تم لوگوں سے تو زاری بہتر تھے جو اپنے قول پر تو قائم رہتے تھے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ تم لوگ اوّل درجے کے جھوٹے ہو۔" میں نے دل کی بھڑاس نکال ہی دی۔

"جھوٹے!" وہ بولا۔ "یہ لفظ میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ ہم نے اپنا ایک آدمی دوسرے سیارے پر بھیجا تھا جو صحیح و سلامت واپس آگیا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں یہ لفظ استعمال کیا تھا۔"

"کیا تم نے اپنا کوئی آدمی کسی دوسرے سیارے پر بھی بھیجا تھا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں، ہمارے تقریباً ایک سو آدمی دوسرے سیاروں میں بھٹک رہے ہیں۔ شاید ان میں سے کوئی واپس نہ آسکے۔ ویسے آپ کس سیارے سے تشریف لائے ہیں جناب؟"

"زمین سے لیکن دور مختلف ہے۔"

"آپ کو کیسے بھیجا گیا ہے اور کیسے واپس بلایا جائے گا؟"

میں نے اُسے ڈاکٹر فریدوں کے کمپیوٹر کے بارے میں بتا دیا۔

"میرے ساتھ تشریف لائیے۔" وہ بولا۔

وہ مجھے ایک کمپیوٹر چیمبر میں لے گیا جہاں سینکڑوں کی تعداد میں کمپیوٹر رکھے ہوئے تھے مگر مجھے کسی میں بھی کوئی تار دکھائی نہیں دیا۔ وہ کسی تار کے وسیلے کے بغیر ہی مصروفِ کار تھے۔ خسرو بولا۔ "ہم بھی اپنے آدمی کمپیوٹروں کے ذریعے ہی دوسرے سیاروں پر بھیجتے ہیں اور انھیں کمپیوٹروں کے ذریعے ہی توانائی فراہم کرتے ہیں۔"

"کیا تم سائنس داں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب۔ میں تو صرف ایک افسرِ مہمانداری ہوں۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ میں تمھارے سائنس دانوں سے کچھ سوال کرسکتا ہوں اور کیا وہ ایمان داری سے اُن کے جواب دیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر سوالات سیاسی نوعیت کے نہ ہوں تو انھیں صحیح صحیح جواب دینے چاہییں۔ ویسے آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"عرفانی معمولی پتھر سے توانائی کیسے حاصل کرتے تھے؟"

"اوہ!" وہ بولا۔ "یہ تو بہت آسان سا سوال ہے۔ اس کا جواب تو میں بھی دے سکتا ہوں اور ہمارے ہاں کا ایک بچہ بھی جانتا ہے۔ دراصل پتھر سے توانائی حاصل کرنے کا طریقہ ہم لوگ دو سو سال پہلے معلوم کر چکے تھے مگر جب ہمارے ہاں چٹانیں ختم ہوگئیں تو ہم نے روشنی اور ہوا سے توانائی حاصل کرنے کا طریقہ معلوم کرلیا۔"

"کیا تم مجھے پتھر سے توانائی حاصل کرنے کا فارمولا بتا سکتے ہو؟"

"ہاں ہاں!" وہ بولا اور فارمولا بتلانے لگا۔ مگر وہ میری سمجھ میں نہ آسکا تو میں نے کہا۔ "براہِ کرم اسے کسی کاغذ پر لکھ دیجیے۔"

اُس نے وہ فارمولا لکھ دیا جسے میں نے اپنے لبادے میں اُڑس لیا۔ میں اُس وقت سائنس دانوں کی ٹیم وہاں آ پہنچی لیکن اس سے پہلے کہ اُن سے میرا تعارف کرایا جاتا، میرے سر میں شدید درد ہونے لگا اور بڑھتا ہی چلا گیا۔

بس مجھے اتنا یاد ہے کہ اُن لوگوں نے مجھے پکڑ کر میز پر لٹا دیا تھا اور میرے اردگرد کھڑے ہوگئے تھے۔ پھر اُن کے چہرے تبدیل ہونے لگے۔ خسرو نوبرے بن گیا تھا اور جمشید کی شبیہہ ملکہ شیلو نظر آنے لگی تھی ... پھر یہ چہرے آپس میں گڈمڈ ہوکر رستم بن گئے۔ رستم دارا سے لڑنے لگا۔ دارا نے آتشی کی شکل اختیار کرلی اور آتشی چیخنے چلّانے لگی ... اور میرا جسم تحلیل ہونے لگا۔

... پھر کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں۔

جب میں ہوش میں آیا تو رضا ہمدانی نے سب سے پہلے مجھے جو خبر سنائی وہ یہ تھی کہ معمولی پتھر سے توانائی حاصل کرنے کا جو فارمولا میں ساتھ لایا تھا وہ ڈاکٹر فریدوں کے پلّے نہیں پڑا اور وہ سخت جھنجلایا ہوا ہے۔

مجھے غصہ آگیا کہ اُسے اس بات پر جھنجلاہٹ کیوں نہیں ہوئی کہ اس کی معمولی سی کوتاہی سے اس بار میں تحلیل ہوکر نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔

اپنی سرزمین اور اپنے لوگوں میں واپسی پر اس بار میرے تاثرات بڑے ہی عجیب تھے۔ میں نے اس مرتبہ دوسرے اَدوار میں طویل ترین وقفہ گزارا تھا اور چونکہ کمپیوٹر کی خرابی یا ڈاکٹر فریدوں کی کوتاہی کے باعث میں ماضی سے حال میں منتقل ہونے کی بجائے مستقبل میں نکل گیا تھا اس لیے ڈاکٹر فریدوں کو مجھے تلاش کرنے میں بے پناہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ واپسی پر میں نے پہلی دفعہ اس کے چہرے پر زردی اور آنکھوں میں تشویش کے منجمد سائے دیکھے تھے۔ غالباً وہ میری واپسی کے سلسلے میں بالکل ہی مایوس ہوگیا تھا۔

"بہتر ہوگا کہ اس بار سرفروش کو زیادہ عرصے تک آرام کرنے کی مہلت دے دو۔" رضا ہمدانی نے کہا تھا اور ڈاکٹر فریدوں نے اس سلسلے میں فوراً ہی رضامندی ظاہر کردی تھی۔

مجھے ایک نجی نوعیت کے ساحل پر بھیج دیا گیا۔

اس ساحل پر عام لوگوں کا داخلہ ممنوع تھا اس لیے مجھے تنہائی کے باعث بے پناہ سکون ملا اور جب میرے اعصاب نارمل ہوگئے تو میں نے فون پر ڈاکٹر فریدوں سے درخواست کی کہ مجھے شہر جانے کی اجازت دی جائے۔ دراصل میں لالہ رُخ سے ملنا چاہتا تھا لیکن میری یہ خواہش رد کردی گئی کیوں کہ تقریباً بیس روز گزر چکے تھے اور میری چھٹیاں ختم ہوگئی تھیں۔ ڈاکٹر فریدوں نے ماسٹر کمپیوٹر پر میری روانگی کی تیاریاں مکمل کرلی تھیں اور ایک روز بعد مجھے ماضی یا مستقبل کے نئے سفر پر جانا تھا۔

وہ جون کی پہلی تاریخ تھی اور دن بے حد خوب صورت تھا۔

میرے سر پہ نیلے آسمان کی چھتری تھی اور سامنے نیل سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ باہر کا موسم حسین ہو تو آدمی کے اندر کا موسم بھی خوش گوار ہوجاتا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ شاعری کی جائے لیکن مجھے شاعری کرنی نہیں آتی بلکہ میں تو وہ شاعری اور خوب صورت شعر بھی بھول چکا تھا جو میں نے دورانِ تعلیم پڑھے تھے۔ تانی کے وہ ترنم ریز قصائد جو کبھی میرے وردِ زبان رہا کرتے تھے، میرے ذہن سے یوں مٹ چکے تھے جیسے تیز ہوائیں ریت پر ثبت ہونے والے نقوشِ پا مٹا دیتی ہیں۔

میں نے سمندر کی جانب دیکھا جس کے سینے پر کوئی کشتی نہیں تھی۔ ہواؤں نے بھی چپ سادھ لی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹا تھا۔ میں ساحل پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے کروٹ لی اور پیٹ کے بل لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ میرے لیے آج کے دور اور اپنی دنیا کا یہ آخری دن تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ سفر میرا آخری سفر ثابت ہوگا یا میں صحیح و سلامت واپس آؤں گا۔ میں نہ جانے کب تک ان خیالات کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہتا کہ اچانک کسی کی موجودگی کے احساس نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کردیا۔

جب میری آنکھیں وا ہوئیں تو مجھے اپنے سامنے ہی دو خوب صورت، سپید اور نرم و نازک پیر دکھائی دیے۔ میری نگاہ اُن پیروں سے اوپر کو سرکنے لگی۔ میری نگاہوں کا سفر جاری رہا، انھوں نے ایک نہایت حسین و جمیل چہرے پر سجی ہوئی دو سبز آنکھوں پر پڑاؤ ڈال دیا جن میں قطبِ شمالی کے گلیشیئر جیسی خنکی تھی اور ... سلسل مجھے گھورے جارہی تھیں۔

نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اس خوب صورت چہرے سے آشنا ہوں۔ یہ سبز آنکھیں میری دیکھی بھالی ہیں۔ ان یاقوتی لبوں پر اُبھرنے والے الفاظ کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں میری سماعت سے ضرور ٹکرا چکے ہیں ... مگر کب اور کہاں؟ ... یہ سب مجھے یاد نہیں آرہا تھا۔ اتنے میں وہ شعلۂ جوالا بول اُٹھی۔ "گاؤں کے لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ اس وقت اس ساحل پر کوئی نہیں ہوتا۔ یہاں مکمل تنہائی ہوتی ہے۔ میں مکمل تنہائی چاہتی تھی مگر یہاں آکر یوں لگ رہا ہے جیسے تمھارے لمبے چوڑے وجود نے پورے ساحل پر قبضہ کر رکھا ہے۔"

"گاؤں والوں نے غلط نہیں بتایا تھا۔ عام طور پر اس وقت میں یہاں نہیں آیا کرتا اور اس نجی ساحل پر ... تنہائی رہتی ہے لیکن آج میں بے وقت آگیا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی نگاہیں جھکا لیں مگر اتنی بھی نہیں کہ وہ صرف اُس کے پیروں اور ٹخنوں تک ہی محدود رہتیں۔

وہ میری گستاخ نگاہیں تاڑ گئی تو کچھ دیر بعد بولی۔ "میں مردوں کی عادتوں سے اچھی طرح واقف ہوں مسٹر۔" اس کے انداز میں بے تکلفی تھی۔ "میں نے کئی سال یورپ میں گزارے ہیں لہٰذا مردوں کی سوچ کا اندازہ لگانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ ویسے یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں سے جانے کا ارادہ رکھتے ہو یا نہیں؟"

"میں کیوں جاؤں؟" یہ کہہ کر میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

"کیوں کہ مجھے تھوڑی دیر مکمل تنہائی درکار ہے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تمھاری یہ خواہش پوری نہیں ہوسکے گی۔" میں نے دو ٹوک کہہ دیا۔

"کیا تم اپنے اس رویے کو شریفانہ کہہ سکتے ہو؟"

"کبھی کبھی آدمی کو یہ رویہ اختیار کرنا ہی پڑ جاتا ہے۔ اس کا دارومدار حالات، موقع و محل اور موڈ پر ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت تم نے یہاں آکر دخل در معقولات کی ہے۔"

"مجھے تمھاری اس ... گوئی پر خوشی ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سمندر میں ... کے لیے اس ساحل پر کوئی نہیں آسکتا ... مگر گاؤں والوں نے بتایا تھا کہ اس وقت یہاں کوئی بھی نہیں ہوتا۔"

"گاؤں والے شاید یہ نہیں جانتے کہ اپنے ہٹ کے سامنے والے اس ٹکڑے کے حقوقِ استعمال میں نے حکومت سے خرید رکھے ہیں"۔ میں نے انکشاف کیا۔

"اوہ... اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں ہرگز یہاں نہ آتی... ویسے تم اپنی آنکھیں کھول سکتے ہو۔ مجھے اُن لوگوں سے اُلجھن ہونے لگتی ہے جو مجھ سے بات کرتے وقت نگاہیں چُرانے کی کوشش کریں"۔

میں نے آنکھیں کھول دیں اور اُس کے گلاب گالوں سے کھیلتی ہُوئی سُنہری لٹوں پر رشک کرنے لگا۔

"اس قدر جسیم ہونے کے باوجود آدمی تو تم شریف ہی لگتے ہو"۔ اُس نے ایک ادا سے کہا۔

"میں نے کسی بزرگ سے یہ کبھی نہیں سُنا کہ لمبا چوڑا آدمی شریف نہیں ہو سکتا"۔

"ہاں، یہ کوئی قاعدہ یا کُلیہ نہیں ہے۔ کیا تم کوئی ایتھلیٹ یا پہلوان وغیرہ ہو؟"

"پہلوان تو نہیں مگر ایتھلیٹ ضرور رہا ہوں۔ وغیرہ البتہ کبھی نہیں رہا اور نہ ہی کبھی بنوں گا"۔

وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی اور بولی"۔ اچھا میں تسلیم کیے لیتی ہوں کہ تم بہت شریف آدمی ہو۔ میں یہاں کچھ دیر پیراکی کرنا چاہتی ہوں مگر میرے پاس غسل کا لباس نہیں ہے۔ دراصل یہاں سے گزرتے ہُوئے مجھے پیراکی کی خواہش ہوئی، ورنہ میں لباسِ غسل ضرور ساتھ لے آتی"۔

"تو کیا تم چاہتی ہو کہ میں اپنا لباسِ غسل تمھیں مستعار دے دوں"۔ میں نے شرارت سے پُوچھا۔

اُس نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور بولی"۔ تمھارا لباس میرے کس کام کا، میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں سے تشریف لے جاؤ تو میں تنہائی میں اپنا شوق پُورا کروں"۔

"دیکھیے خاتون! آپ بڑے شوق سے اپنا شوق پُورا کر سکتی ہیں لیکن میں یہاں سے نہیں جاؤں گا، البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ میں ابھی سے مُنہ پھیر لیتا ہوں"۔ یہ کہہ کر میں نے اپنا رُخ سمندر کی بجائے چٹانوں کی طرف کر لیا۔

"ایک بات تو بتاؤ"۔ اس کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مُسکرا رہی ہے۔

"کیا؟" میں نے بدستور مُنہ پھیرے ہُوئے پُوچھا۔

"تم نے واقعی مجھے نہیں پہچانا؟"

میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور کہا"۔ نہیں خاتون میں واقعی نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں؟ کیا آپ کوئی ایسی اہم شخصیت ہیں جسے ہر شخص جانتا ہے؟"

"ایک طرح سے ہوں بھی... بہرحال، اگر تم مجھے نہیں پہچانتے اور میرے بارے میں جاننا بھی نہیں چاہتے تو آؤ پھر ایک دلچسپ کھیل کا آغاز کرتے ہیں"۔

"شوق سے... وہ کھیل کیسا ہوگا؟" میں نے پُوچھا۔

"ہم اجنبی اجنبی کھیلیں گے اور ایک دوسرے کو اپنا نام تک نہیں بتائیں گے۔ ایک دوسرے کا پتہ بھی نہیں پوچھیں گے اور پھر کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ اگر زندگی کے کسی موڑ پر آمنے سامنے آ گئے تو اجنبی بن کر گزر جائیں گے۔ آج بھی ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں اور کل بھی اجنبی رہیں گے۔ آج جو باتیں کریں گے، انھیں ہمیشہ کے لیے بھُول جائیں گے یوں جیسے نہ تو ہم کبھی ملے تھے اور نہ ہی ہمارے درمیان کوئی تعلق تھا۔ بولو تمھیں یہ سب کچھ منظور ہے؟"

"پہلے ذرا اس بات کی تشریح کر دو کہ تم درحقیقت چاہتی کیا ہو؟"

"یہ تو فی الحال میں بھی نہیں جانتی۔ ویسے اجنبی اجنبی نام کے اس کھیل کا سب سے دلچسپ حصّہ یہی ہے"۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے"۔

"لیکن پہلے فرضی نام رکھ لیے جائیں تاکہ ایک دوسرے کو ان ناموں سے مخاطب کر سکیں۔ ٹھہرو، میں سوچتی ہوں کہ ہمارے نام کیا ہونے چاہئیں"۔ اتنا کہہ کر وہ سوچنے اور میرا جائزہ لینے لگی"۔ آ گیا... تمھارا نام میری سمجھ میں آ گیا۔ اتنے شاندار جسم کے ساتھ تمھارا نام ہرکولیس ہونا چاہیے۔ منظور ہے، تمھیں؟"

"بشرطیکہ ہرکولیس کی طرح مجھے اصطبل صاف نہ کرنا پڑے"۔

"تم سچ مچ کے ہرکولیس نہیں ہو"۔ وہ ہنس کر بولی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ میں ہرکولیس ہُوں۔ تم اپنے لیے کوئی کلاسیکی نام پسند کرو گی یا دیومالائی؟"

"دیومالائی... میں ڈائنا ہوں"۔

"بہت خوب... چاند کی دیوی کا یہ نام تم پر جچتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم پیراکی کرنا چاہتی ہو یا... میرا مطلب ہے میرے کیبن میں کچھ مشروبات اور چکن وغیرہ موجود ہیں۔ اگر تم کچھ کھانا پینا پسند کرو تو..."

"یقیناً... مگر پہلے میں کچھ سوئمنگ کرنا چاہتی ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ ساحلی چٹانوں کا جائزہ لینے لگی"۔ کیا یہاں ہمیں کوئی دیکھ سکتا ہے؟"

"گاؤں کے لوگ احمق اور اسمگلر تو ہیں لیکن اُن میں تاک جھانک کی عادت نہیں ہے۔ میرے ہٹ کے قریب ایک ہٹ میں بوڑھا پروفیسر شیرازی رہتا ہے مگر اُسے اپنی ناک سے آگے کچھ دکھائی نہیں دیتا"۔

"اگر وہ بوڑھا ہے تو مجھے اس کی پروا نہیں لیکن میں نہیں چاہتی کہ کوئی چھُپ کر میری تصویریں بنا لے"۔

"میرا خیال ہے گاؤں میں کسی کے پاس کیمرہ یا دُوربین جیسی چیزیں نہیں ہیں"۔ میں نے اُسے اطمینان دِلایا اور سوچنے لگا کہ یہ کوئی اداکارہ ہو سکتی ہے یا پھر کسی دولت مند بوڑھے کی بیوی، ورنہ اُسے دیکھے جانے سے اتنا خوف نہ آتا"۔ ویسے تم نے اپنے لیے بالکل صحیح نام منتخب کیا ہے، ڈائنا۔ تم واقعی چاند کی دیوی لگتی ہو"۔

وہ میری مشتاق نِگاہوں کا مفہوم سمجھ گئی اور بولی"۔ جب تم اپنی نِگاہوں کو بھٹکنے سے روک لو تو بتا دینا تاکہ کھیل آگے بڑھایا جائے"۔

میں جھینپ کر سمندر کی جانب دیکھنے لگا۔

"ہر کھیل کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اس کھیل کے بھی ہیں۔ میں چاہتی ہُوں کہ تم اس کے ایک اصول پر سختی سے کاربند رہو۔ کھیل کے دوران تم مجھے چھُو نہیں سکتے۔ اگر تمھیں یہ اصول پسند نہ آیا ہو تو ہم کھیل یہیں ختم کر دیں گے"۔

میں نے مُسکرا کر کہا"۔ مجھے یہ اصول پسند آیا ہے۔ آگے بولو"۔

"تو پھر چلو، پہلے پیراکی سے لُطف اندوز ہو لیں۔ دراصل پیراکی میری کمزوری ہے"۔

ہم دونوں سمندر کی طرف چلے گئے۔ جب لہریں ہمارے جسم چھُونے لگیں تو اُس نے مجھ سے کہا"۔ اب تم آگے چلے جاؤ، تاکہ مجھے اندازہ ہو سکے کہ گہرا پانی کتنی دُور ہے"۔

"ٹھیک..."۔ میں نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ چند ہی قدموں کے فاصلے پر پانی گہرا تھا۔ میں نے گہرے پانی میں جا کر غوطہ لگایا تو اُس نے بھی خود کو لہروں کے سُپرد کر دیا۔ ہم تیرتے تیرتے ساحل سے تقریباً سو گز دُور نکل آئے تو وہ بولی"۔ فرانس واپسی پر آج سے پہلے میں نے سمندر میں پیراکی نہیں کی۔ اس لیے آج یہاں سے گزری تو یہ خواہش نہ روک سکی۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے کہ میں جل پریوں کی طرح ہر وقت پانی میں ڈبکیاں لگاتی رہوں"۔

"لیکن تم ڈائنا ہی بہتر ہو... جل پریاں تو آدھی عورتیں ہوتی ہیں"۔

وہ کھِل کھِلا اُٹھی اور بولی"۔ میں نے تمھیں دیکھ کر یہ سوچا تھا کہ تم نِرے خوب صورت سراپا والے آدمی ثابت ہو گے مگر تمھاری کھوپڑی بھی خالی نہیں اور تم حسِ لطیف بھی رکھتے ہو... اب میں سوچ رہی ہوں کہ ہمیں اجنبی اجنبی کا کھیل شروع نہیں کرنا چاہیے تھا تاکہ ہم ایک دوسرے کے اصلی ناموں سے متعارف ہو سکتے اور یہ تعارف دوستی میں بدل سکتا"۔

"لمحوں کا کھیل بڑا عجیب ہوتا ہے ڈائنا۔ بعض لمحے ملن کی گھڑیاں بن جاتے ہیں اور بعض جُدائی کی"۔

"کیا مطلب، اگر میں تم سے رسم و راہ بڑھانا چاہوں تو کیا تم اسے پسند نہیں کرو گے؟" اس نے پوچھا۔

"یقیناً پسند کروں گا لیکن وقت مجھے اس کی مہلت دے گا یا نہیں، یہ نہ تو میں کہہ سکتا ہوں اور نہ ہی تم کہہ سکتی ہو"۔ میں نے اُسے یہ جواب اس لیے دیا تھا کہ کل مجھے ماضی کے سفر پر جانا تھا۔ میں ماضی کے اندھے اور اندھیرے زمانے سے لوٹ بھی سکوں گا یا نہیں، مجھے معلوم نہیں تھا۔ وہ کچھ کہنے کی بجائے میری طرف دیکھتی رہی تو میں نے کہا"۔ اگر تم چاہو تو ہم ایک دوسرے سے متعارف ہو سکتے ہیں"۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی"۔ نہیں ہرکولیس! میں لمحوں کے دھارے میں بہہ گئی تھی۔ ہمیں ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہونا چاہیے۔ بعض اوقات دوستیاں دِلوں کا روگ بن جاتی ہیں۔ میں کوئی روگ نہیں پالنا چاہتی لیکن زندگی کے مہربان لمحوں سے اپنے حِصّے کی خوشیاں ضرور وصول کر لینا چاہتی ہوں"۔

"تو پھر آؤ چلیں۔ کچھ دیر ہٹ میں بیٹھیں گے"۔

"نہیں..." اس نے مُسکراتے ہُوئے انکار کر دیا۔

"میں نے دیومالا میں ڈائنا کے متعلق کہیں بھی یہ نہیں پڑھا کہ وہ اس قسم کے ستم بھی کیا کرتی تھی"۔

"اوہ..." اُس نے قہقہہ لگاتے ہُوئے کہا"۔ مگر ڈائنا بڑے غضب کی عورت تھی۔ کبھی کبھی وہ بے حد ظالم بھی ثابت ہوتی تھی۔ تم نے اُس کے بارے میں یہ کہانی ضرور پڑھی ہوگی کہ ایک بار ایک شخص چھُپ کر اُسے دیکھ رہا تھا تو اُسے اتنا غصّہ آیا کہ اُس نے اُس گستاخ کو تھیلے میں بند کروا کے اُس پہ بھُوکے کتے چھوڑ دیے تھے"۔

"میں نے یہ کہانی نہیں پڑھی اور نہ ایسی کہانیاں سُننا پسند کرتا ہوں۔" میں نے قدرے غصّے سے کہا۔

"اوہ . . . ہرکولیس کو غصّہ آگیا۔" اس نے کہا اور ڈبکی لگا کر مجھے بھی گہرے پانیوں میں لے گئی۔

*

جب وہ میرے ہٹ سے رُخصت ہُوئی تو مجھے اُس کی اسپورٹس کار کی آواز سُنائی دی جو تیزی سے دُور ہوتی چلی گئی اور میں سوچتا ہی رہ گیا کہ وہ کسی اجنبی کی طرح آئی تھی اور کسی اجنبی کی طرح ہی چلی گئی۔ اچھا ہی ہُوا ورنہ لالہ رُخ بھی تو ایک دن میرے لیے اجنبی ہی تھی کہ ہمارا تعارف ہُوا جو دوستی اور پھر محبت میں بدل گیا اور محبت میرے لیے روگ بن گئی۔ یہ سوچیں مجھے نہ جانے کن کرب آمیز یادوں کے جنگل میں لے جاتیں کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

چیف سکیورٹی آفیسر کا فون تھا۔

اُس نے ڈاکٹر فریدوں کا پیغام دیا کہ کل صبح آٹھ بجے میری روانگی ہے لہٰذا میں وقت پہ پہنچ جاؤں۔ وقت پر پہنچنے کا مطلب تھا کہ میں رات ہی کو چل پڑوں۔ علی الصباح گھر پہنچوں، اپنی کار وہیں چھوڑوں اور ٹیکسی پکڑ کر ڈاکٹر فریدوں کے پاس پہنچ جاؤں۔

پہلے جب کبھی میں کسی سفر پہ جایا کرتا تھا تو سکیورٹی کا سربراہ رضا ہمدانی، جو مجھے اپنے بیٹے کی طرح چاہتا تھا، مجھ کو ڈاکٹر فریدوں کے پاس چھوڑنے جایا کرتا تھا مگر اب وہ اتنا جذباتی ہوگیا تھا کہ اُس نے میرے ساتھ کمپیوٹر ٹاور تک جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میرے خیر مقدم کے لیے تو آ سکتا ہے، لیکن ہر بار جب مجھے الوداع کہتا ہے تو اُسے شدید رُوحانی کرب سے گزرنا پڑتا ہے پھر میرے جانے کے بعد وہ ڈاکٹر فریدوں سے لڑتا رہتا ہے کہ آخر ہر بار مجھے ہی ماضی کے سفر پہ کیوں بھیجا جاتا ہے۔ وہ کسی دوسرے آدمی کو کیوں منتخب نہیں کرتا . . . لیکن فریدوں کے پہلو میں دِل نہیں بلکہ کمپیوٹر دھڑکتا ہے۔ اس گنجے اور لنگڑے سائنس داں کو انسانوں سے زیادہ اپنے تجربات عزیز ہیں۔ پہلے میں اپنی کار اور کاغذات وغیرہ رضا ہمدانی کے پاس ہی چھوڑ جایا کرتا تھا مگر اب میں نے کار اپنے گیراج میں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری چیزیں رضا ہمدانی کو میری یاد دلاتی رہتی ہیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اپنے پیاروں سے بچھڑنے کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ سڑکیں، وہ راہیں، وہ گلیاں اور وہ مقام جہاں سے کبھی میں اور لالہ رُخ گزرا کرتے تھے، پُرانی یادوں کو اُچھال کر میرے سامنے پھینک دیا کرتے تھے میرے دل میں اُداسیاں بھر جاتی تھیں۔

میرا خیال ہے کہ ان دِنوں میں خود بھی کچھ زیادہ ہی ... ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی تو سوچتا تھا کہ ماضی کا یہ سفر زندگی کا آخری سفر بن جائے تو اچھا ہی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی نے بہت تھکا دیا ہو۔

*

میں نے کار گیراج میں بند کی۔ سُوٹ کیس الماری میں ... ایک نظر لالہ رُخ کی تصویر پر ڈال اور اپارٹمنٹ سے باہر آگیا۔ مجھے چوراہے سے ٹیکسی پکڑنا تھی لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا آج کل لوگ صبح سویرے اُٹھنے اور اپنے اپنے کام پر جانے لگے ... میں نے دو ٹیکسیوں کو رُکنے کا اشارہ کیا مگر وہ بھری ہُوئی نکلیں ... میں خالی ٹیکسی کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک اخبار فروش "ڈائنا ... ہو گئی . . . ڈائنا نے شہریار کو چھوڑ دیا" کی آوازیں لگاتا ہُوا ... قریب سے گزرا تو مجھے وہ لڑکی یاد آگئی جس نے کل میرے ... 'اجنبی اجنبی' کھیلا تھا۔ میں مُسکرا دیا اور میری ٹیکسی کو رُکنے ... کیا مگر وہ بھی نہ رُکی، حالانکہ وہ خالی ہی تھی۔

وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا۔ مجھے کمپیوٹر ٹاور ... مگر ٹیکسی نہیں مل رہی تھی۔ چوتھی اور پانچویں ٹیکسی بھی خالی ... گئی تو مجھے یاد [illegible] یہ لوگ مُنہ مانگے کرائے وصول کرنے ... فاصلے کی سو[illegible]ں اُٹھانے کے لیے مضافات کی طرف ... ہیں اس لیے شہر کی سواریوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے ... میں نے نہ صرف ہاتھ اُٹھا کر ٹیکسی روکنے کا اشارہ کیا بلکہ ... اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ناچار ٹیکسی کو رُکنا پڑا اور اس ... کہ ڈرائیور مجھ سے کچھ کہتا، میں ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔

ٹیکسی ایک جھٹکے سے چل پڑی۔

ابھی نصف فاصلہ بھی طے نہیں ہُوا تھا کہ ٹیکسی ... ہجوم میں پھنس گئی۔ میری نگاہیں بار بار گھڑی کی طرف ... تھیں کیوں کہ ڈاکٹر فریدوں وقت کی کڑی پابندی کیا کرتا ... نے جھنجلا کر ٹیکسی ڈرائیور سے کہا: "میں سرکاری افسر ہوں ... ایک بے حد اہم سرکاری کام ہے اس لیے کسی طرح ... یہ ٹیکسی تو صرف اُسی صورت نِکل سکتی ہے جناب ... اس میں پَر لگا دیئے جائیں۔"

مجھے ٹیکسی ڈرائیور کی بات پر غُصّہ تو بہت آیا ... تو نہیں سکتا تھا۔ اتنے میں ایک اخبار فروش پھر آواز لگاتا ہُوا گزرا۔

"ڈائنا فرار ہو گئی۔"

میں نے محض ڈائنا کے نام کی وجہ سے اخبار لے لیا۔

. . . اور جب اخبار کھولا تو اس سُرخی کے ساتھ ہی ڈائنا کی ایک بہت بڑی تصویر بھی نظر آگئی۔ بلاشُبہ یہ وہی ڈائنا تھی جس نے کل میرے ساتھ "اجنبی اجنبی" کھیلا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ اُس نے مجھے اپنا اصلی نام ہی بتایا تھا۔ تصویر کے نیچے یہ الفاظ تھے:

"اداکارہ ڈائنا جو پچھلے دِنوں اپنی فلم 'اجنبی اجنبی' کی شوٹنگ کے لیے فرانس گئی تھی۔"

مجھے یاد آگیا، اس نے کہا تھا کہ جب سے فرانس سے واپس آئی ہوں، میں نے سیر ہی نہیں کی اور یہاں سے گزری تو میرا جی پیراکی کو للچا گیا . . . پھر وہ مجھے اس وقت صورت آشنا بھی لگی تھی۔ میں فلمیں نہیں دیکھتا لیکن شاید اخباروں ہی میں اُس کی تصاویر دیکھ چکا تھا اور غالباً وہ بار بار اسی لیے پوچھ رہی تھی کہ اُسے کوئی دیکھ تو نہیں لے گا یا کوئی اس کی تصویر تو نہیں بنا لے گا۔ اُس وقت تو وہ اسکینڈل سے ڈر رہی تھی مگر فرار کی خبر تو کسی اسکینڈل سے بھی بڑی ہوتی ہے۔

معاً ٹیکسی، منجمد ٹریفک میں راستہ پا کر رینگنے لگی۔ میں اخبار دیکھنے لگا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ ڈائنا ایک آرمینی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ یورپ میں تعلیم حاصل کر چکی ہے بلکہ اُس کی زندگی کا بیشتر وقت یورپ ہی میں گزرا ہے۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد جب وہ واپس آئی تو اُس نے فلموں میں کام شروع کر دیا۔ پہلی فلم کی ریلیز کے بعد ہی شاہ کا ایک عزیز شہریار اس کی زلفوں کا اسیر ہو گیا اور اُس نے ڈائنا سے شادی کر لی۔ شہریار ایک جج کے عہدے پر فائز تھا اور عرفِ عام میں لوگ اُسے "جلاد" کے نام سے پکارتے تھے کیوں کہ اُس کی عدالت میں پیش کیے جانے والے نوّے فی صد ملزم پھانسی کی سزا پاتے تھے۔ یہ بات بھی قابلِ غور تھی کہ جج شہریار کی عدالت میں سیاسی ملزم پیش کیے جاتے تھے اور فیصلہ سُناتے وقت وہ ہمیشہ ایک سیاہ رُومال سے کھیلتا رہتا تھا۔ جب وہ پھانسی کا حُکم سُناتا تو رُومال کو ایک جھٹکے سے گانٹھ لگا لیا کرتا تھا اور غالباً اسی بنا پر "جلاد جج" کہلاتا تھا۔ یہ ساری باتیں آف دی ریکارڈ تھیں اور غیر ملکی اخبارات کے ذریعے منظرِ عام پر آئی تھیں۔ ان اخبارات کو ہمارے ہاں ضبط کر لیا گیا تھا۔

ڈائنا کے متعلق اس خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہ ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور اُس نے دولت کمانے کے لیے فلم انڈسٹری میں شمولیت اختیار نہیں کی بلکہ یہ اُس کا شوق تھا۔ ڈائنا کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس سال تھی جب کہ اُس کا شوہر شہریار پچاس سال سے زیادہ کا تھا۔ جب کبھی ڈائنا کا جی چاہتا، وہ چُپکے سے اپنی چیک بُک اور پاسپورٹ اُٹھاتی اور ملک سے باہر چلی جاتی تھی۔ کچھ دِنوں بعد ہی پتہ چلتا کہ وہ رُوم، ہانگ کانگ، سنگاپور یا نیویارک پہنچ گئی ہے۔

مجھے اس بات پر بے حد تعجب ہُوا کہ آخر ڈائنا نے اُس جلاد جج سے شادی ہی کیوں کی تھی، تب مجھے خیال آیا کہ اُس نے یہ شادی اپنی خوشی سے نہیں کی ہو گی بلکہ اس پر اور اُس کے خاندان پر دباؤ ڈالا گیا ہو گا۔

اخبار میں جلاد جج کی تصویر بھی شائع ہُوئی تھی۔ عقابی ناک اور چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں والا شہریار صُورت سے ہی بے حد ظالم معلوم ہوتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میں پابہ زنجیر اُس کی عدالت میں کھڑا ہُوں اور وہ سیاہ رُومال ہاتھ میں لیے اپنا فیصلہ سُنا رہا ہے:

"تم نے میری بیوی کو اپنی وجاہت کے ذریعے ورغلایا اور اُسے مجھ سے بے وفائی پر اُکسایا۔ یہ جھوٹ ہے کہ اُس نے تم سے 'اجنبی اجنبی' کھیلنے کی فرمائش کی تھی۔ یہ بھی جھوٹ ہے کہ تم میری بیوی کو نہیں پہچانتے تھے۔ وہ ایک مشہور اداکارہ ہے، اور لوگ اُسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیتے ہیں۔ تم بھی اُسے پہچان گئے تھے مگر انجان اور اجنبی بنے رہے۔ چونکہ تم پر سارے الزامات ثابت ہو چکے ہیں اور تم نے یہ جرائم عمداً کیے تھے اس لیے میں تمھیں پھانسی کی سزا دیتا ہُوں۔"

یہ کہتے ہُوئے اُس نے رُومال کو گانٹھ لگائی اور اس کے ساتھ ہی ٹیکسی ڈرائیور نے میرا شانہ ہلا کر مجھے خیالوں کی دُنیا سے چونکا دیا۔

"آپ کی منزل تو کب کی آ چکی ہے، جناب . . . مگر آپ پُورے پانچ منٹ سے خیالوں کی دُنیا میں سرکاری کام انجام دیئے جا رہے ہیں۔"

میں نے ڈرائیور کا طنز نظر انداز کرتے ہُوئے کرایہ ادا کیا اور کمپیوٹر ٹاور کی طرف چل دیا جو بظاہر ایک چار دیواری میں گھرا ہُوا احاطہ ہی نظر آتا تھا۔

میں آپ کو یہ بتانا تو بھُول ہی گیا کہ ڈاکٹر فریدوں نے اپنی لیبارٹریز اور کمپیوٹر چیمبرز نئے مقام پر منتقل کر دیئے تھے . . .

اور اَب اس کا ماسٹر کمپیوٹر دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے کمپیوٹرز سے بقول اس کے گیارہ پشتیں آگے تھا۔

کمپیوٹر ٹاور کے گیٹ پر گارڈز نے مجھے اپنے نرغے میں لے لیا اور شناخت کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ گیٹ پر صرف شناختی کارڈ چیک کیا جاتا تھا اور صرف اسی کارڈ کے ذریعے گیٹ میں داخل ہونے کی اجازت تھی۔ یہاں سے گارڈز نے مجھے ایک جیپ میں بٹھایا اور دو فرلانگ دُور دوسری چیک پوسٹ پر متعین گارڈز کے حوالے کر دیا۔

اس مرحلے پر مجھ سے کچھ کوڈ ورڈز بھی پُوچھے گئے جن میں میرا اپنا خصوصی کوڈ نمبر بھی شامل تھا جسے میں نے بُوتھ میں ایک ٹیلی فون پر دُہرایا تھا۔ کمپیوٹر نے میری آواز کی لہروں سے تصدیق کر کے آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ اسی قسم کے تین مزید مرحلوں سے گزرنے کے بعد میں لفٹ تک پہنچ گیا لیکن اب جو میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو پتہ چلا کہ میں نصف گھنٹے کی تاخیر سے یہاں پہنچا ہوں۔

لفٹ تیزی سے زمین دوز سُرنگ میں اُترتی چلی گئی... اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ مجھے اُبکائیاں آنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ ڈاکٹر فریدوں مجھے تاخیر سے آنے کی سزا دے رہا ہے۔ جب خُدا خُدا کر کے لفٹ رُکی، دروازہ کُھلا اور میں باہر آیا تو ڈاکٹر فریدوں کا خشمگیں چہرہ میرے سامنے تھا۔ میں نے جلدی جلدی تاخیر کی وجہ بتا دی کہ قصور میرا نہیں کیوں کہ ٹریفک جام ہو گیا تھا۔

"یہ ساری باتیں تمھیں پہلے سے مدِنظر رکھنی چاہیے تھیں، برخوردار... میں کمپیوٹر سیٹ کر چُکا تھا مگر چونکہ تم اس کے طریقۂ کار سے واقف نہیں، اس لیے میری اُلجھنیں نہیں سمجھ سکتے۔ اَب روانگی کے سائیکل پر آنے کے لیے ہمیں تقریباً نصف گھنٹہ مزید انتظار کرنا پڑے گا اور مجھے سیٹنگ بھی نئے سرے سے کرنا پڑے گی۔ خیر... آؤ میرے ساتھ۔"

زرد رُو، گنجا اور پولیو کا مارا ڈاکٹر فریدوں کسی کیکڑے کی طرح میرے آگے آگے چلنے لگا۔

ہم ایک طویل راہ داری طے کر کے ہینڈل کے بند دروازے پر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر فریدوں نے اپنا دایاں ہاتھ اُس دروازے پر رکھ دیا اور مجھے بھی دایاں ہاتھ اُس پر رکھنے کی ہدایت کی۔

چند لمحوں بعد ہم نے ہاتھ ہٹا لیے تو ڈاکٹر فریدوں بولا۔ "کمپیوٹر ہمارے ہاتھوں کی لکیریں چیک کرے گا تب یہ دروازہ کُھلے گا۔ سکیورٹی کا یہ نیا نظام اس لیے تیار کیا گیا ہے تاکہ پھر کوئی ڈپلی کیٹ ہمیں دھوکا دے کر کمپیوٹر چیمبر میں داخل نہ ہو سکے۔"

کمپیوٹر نے شاید ہمارے ہاتھوں کی لکیریں چیک کر لی تھیں اس لیے خفیہ اسپیکر پر ایک مشینی آواز آئی۔ "لکیریں ٹھیک ہیں۔"

یہ سُن کر ڈاکٹر فریدوں نے دروازے کے گول ہینڈل سے نمبر سیٹ کیے تو دروازہ کُھل گیا۔

اَب ہم ایک اور راہ داری سے گزر رہے تھے، جس کے اختتام پر بند دروازے میں ایک کیمرہ نصب تھا۔ ہمیں باری باری اس کیمرے کے سامنے کھڑا ہونا پڑا۔ ڈاکٹر فریدوں بولا۔ "کمپیوٹر ہمارے دماغوں کے ایکسرے چیک کرے گا۔ کیا خیال ہے، سرفروش! ا... اس حفاظتی نظام کے باوجود کوئی ہمیں دھوکا دے سکتا ہے! ا... کوئی دوسرا ڈپلی کیٹ کمپیوٹر چیمبر تک پہنچ سکتا ہے؟"

"بظاہر تو ایسا معلوم نہیں ہوتا جناب۔" میں نے جواب دیا۔ اتنے میں کمپیوٹر نے ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔ دروازہ کُھلا اور ہم کمپیوٹر چیمبر کی انیکسی میں داخل ہو گئے جس میں لاتعداد چھوٹے چھوٹے کمپیوٹر کام کر رہے تھے اور ہال میں شہد کی مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ گونج رہی تھی۔

ہم ماسٹر کمپیوٹر والے کمرے میں آ گئے، جہاں ڈاکٹر فریدوں نے میرے پُورے جسم پر مرہم جیسی کوئی دوا مل دی اور پھر کمپیوٹر سیٹ کرنے لگا جس کے پورٹ ہولز سے لال، پیلی، ہری، اور نہ جانے کتنے رنگوں کی تاریں جھانک رہی تھیں۔

میں کمپیوٹر چیمبر کی ربر مولڈ والی کُرسی پر بیٹھ گیا جو مجھے موت کی سزا والی الیکٹرک چیئر کی یاد دِلایا کرتی تھی۔

"اس بار میں نے کمپیوٹر میں بڑی اہم تبدیلیاں کی ہیں، سرفروش! اس لیے تمھیں تیس کی بجائے چالیس الیکٹروڈ لگانے پڑیں گے۔ کیا تم رضا ہمدانی سے ملے تھے؟" ڈاکٹر فریدوں نے پُوچھا۔

"نہیں جناب۔" میں نے بتایا۔ "البتہ فون پر ضرور بات ہُوئی تھی۔"

"کیا اُس نے تمھیں بتایا ہے کہ ہم کسی اور آدمی کی تلاش میں ہیں جو تمھاری جگہ لے سکے؟"

"انھوں نے ذکر تو کیا تھا مگر تفصیل نہیں بتائی تھی۔"

"کمپیوٹر نے ہزارہا کارڈز میں سے بیس کارڈ منتخب کیے ہیں، اَب دیکھنا یہ ہے کہ ان بیس آدمیوں میں سے کوئی تم جیسی ذہنی اور جسمانی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں۔ رضا کا اصرار ہے کہ تمھاری جگہ کوئی دوسرا آدمی لایا جائے حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ تم ہی اس کام کے لیے بہترین آدمی ہو۔ تمھارا کافی تجربہ بھی ہو چُکا ہے اور تمھاری صحت پر بھی کوئی اثر نہیں پڑا۔"

میں نے ڈاکٹر فریدوں کو کوئی جواب نہیں دیا۔ بقول رضا ہمدانی اُس کے پہلو میں دل نہیں بلکہ کمپیوٹر دھڑکتا تھا۔ وہ کمپیوٹر سیٹ کرنے کے بعد میرے اعضا کے ساتھ الیکٹروڈز باندھنے لگا۔ جب وہ سارے الیکٹروڈز باندھ چُکا تو بولا۔ "میں نے اپنی تیاریاں مکمل کر لی ہیں، تمھیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

"نہیں جناب!" میں نے بے خوفی سے کہا۔ "اوکھلی میں سَر دے کر مُوسلوں سے ڈرنا بے معنی ہوتا ہے۔"

یہ سُن کر وہ سُوئچ بورڈ کے قریب چلا گیا۔ کمپیوٹر نے روانگی کے سگنل دینا شروع کر دیے اور بالآخر ڈاکٹر فریدوں نے سُرخ رنگ کا ایک سُوئچ دبا دیا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میرا پُورا وجود جھٹک سے اُڑ گیا ہو۔ اُس کے پرخچے اُڑ گئے ہوں۔ یہ ٹکڑے آگ، دُھوئیں اور شعلوں کے ایک سمندر میں چکرا رہے ہوں۔ ہر طرف بادلوں کی سی گرج اور بجلی کے کڑاکوں کا شور برپا ہے اور میرے ذہن میں انگارے ہی انگارے بھر گئے ہیں... پھر مجھے ہوش نہ رہا جیسے میں مر گیا...

*

...لیکن میں مرا نہیں تھا بلکہ بے سُدھ اور بے ہوش ہو گیا تھا۔ مگر جب ہوش آیا تو بھی میں نے اپنے آپ کو بھڑکتے ہُوئے شعلوں اور دُھوئیں کے بادلوں ہی میں گھرے پایا... اور دُھوئیں کے اس پار نہ جانے کہاں سے شور و غوغا، کڑاکوں، چیخوں، نعروں، قہقہوں اور دھماکوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ میں سوچا کہ کیا میں ابھی تک کمپیوٹر کے مرحلے سے گزر رہا ہوں، کیا ابھی اُس نے مجھے ماضی کے اندھے زمانوں میں منتقل نہیں کیا ہے۔ کیا میرے سالمے یکجا نہیں ہو پائے؟ لیکن جب میں نے اپنا جسم ٹٹولا تو پتہ چلا کہ میرا ذرہ ذرہ ہو جانے والا وجود دوبارہ تجسیم اختیار کر چکا ہے... مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ میں تجسیم اختیار کر چکا ہوں تو میرے ہر طرف آگ اور دُھواں کیوں پھیلا ہُوا ہے؟ انگارے کیوں برس رہے ہیں؟ یہ شور و غوغا کی آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔

میں جہاں لیٹا ہُوا تھا، وہ زمین بُری طرح تپ رہی تھی۔ میں نے زمین چھُو کر دیکھی وہ زمین نہیں بلکہ پتھر کا فرش تھا... میں نے سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا تو مجھے ایک گنبد سا دکھائی دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ کوئی معبد ہے... لیکن یہ آگ اور دُھواں کیسا تھا؟ کیا کمپیوٹر نے اس بار مجھے کسی جلتے ہُوئے معبد میں منتقل کر دیا ہے؟

میں نے ایک بار پھر اُوپر نگاہ ڈالی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ گنبد چوبی تھا اور اب اُس کے شہتیروں اور تختوں نے آگ پکڑ لی تھی۔

دُھوئیں سے میرا دم گُھٹنے لگا۔ مجھے کوئی راہِ فرار دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اتنے میں ایک کڑاکا ہُوا اور چوبی گنبد کا ایک حصّہ ٹوٹ گیا... کسی بھی لمحے اُس کے جلتے ہُوئے تختے اور شہتیر بھی گرنے والے تھے میں لوٹیں لگاتا ہُوا ایک طرف ہٹنے لگا۔ اچانک میں کسی انسانی جسم سے ٹکرایا۔

وہ کون تھا... یا تھی، مجھے فوراً ہی معلوم نہ ہو سکا کیونکہ اب تختے گرنے شروع ہو گئے تھے۔ میں نے دوسری اور پھر تیسری لوٹ لگائی تو مزید دو لاشوں کے اُوپر سے گزر گیا۔

عین اُس وقت ایک دھماکے کے ساتھ گنبد کا شہتیر نیچے آ رہا۔

اُس کے گرنے سے دُھوئیں میں شعلوں کی زبانیں لپکنے لگیں اور ہر طرف انگارے ہی انگارے پھیل گئے... مگر میں اُن لاشوں کی وجہ سے بچ گیا۔ دُھوئیں میں لپکنے والے شعلوں کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ وہ دو مردوں اور ایک عورت کی لاشیں تھیں۔

ابھی میں اس دہکتے ہُوئے جہنم سے نکلنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے کسی عورت کی چیخ سُنائی دی۔ مگر میرے چاروں طرف تو دُھواں ہی دُھواں پھیلا ہُوا تھا اور باہر سے بھی چیخنے چلّانے، بین کرنے اور قہقہوں کے ساتھ ساتھ تلواریں ٹکرانے کی ہلکی ہلکی جھنکاریں بھی سُنائی دے رہی تھیں اس لیے میں اُس چیخ کی سمت کا تعین نہ کر سکا۔ اتنے میں میری سماعت سے پھر اسی عورت کی چیخ ٹکرائی۔

یہ آواز بائیں طرف سے آئی تھی... مگر بیچ میں دُھوئیں کی گہری چادر حائل تھی۔ اس لیے اُس کے پار کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا البتہ مجھے ایک مرد کی لاش کے پاس اُس کی تلوار ضرور نظر آ گئی۔

میں نے لپک کر وہ تلوار اُٹھا لی کہ ذاتی تحفّظ کے لیے مجھے کسی ہتھیار کی ضرورت تھی۔

عورت کی چیخ تیسری بار اُبھری اور اُس کے ساتھ ہی یہ الفاظ بھی سُنائی دیے۔ "المدد اے مُونا... المدد... مجھے

بچالو دیوی ... مجھے بچالو"

اس بار میں نے آواز کی صحیح سمت کا تعین کر لیا تھا۔

چنانچہ میں بے دھڑک دھوئیں کی چادر چیرتا ہوا اُدھر لپکا اور جو منظر میں نے دیکھا، اُس نے میری رگ رگ میں چنگاریاں سی بھر دیں... ایک ہٹا کٹا سپاہی ایک نازک اندام لڑکی کو اپنے ستم کا نشانہ بنانے والا تھا... لڑکی اب تک مزاحمت کیے جا رہی تھی مگر اس مزاحمت میں نہ صرف اُس کا لباس تار تار ہو چکا تھا بلکہ وہ زخمی بھی ہو گئی تھی۔

جونہی اُس بدبخت سپاہی نے لڑکی کو فرش پر گرایا میں نے فرطِ غیظ میں اتنے زور سے اُس کی پُشت میں تلوار گھونپی کہ وہ آر پار ہو گئی... میں نے ایک ٹھوکر مار کر اُسے فرش پر گرایا اور تلوار نکال کر لڑکی کی طرف پلٹا... مگر اتنی دیر میں لڑکی اپنے دل میں خنجر اُتار چکی تھی۔

"یہ تم نے کیا کیا لڑکی؟" میں نے بے ساختہ کہا۔

وہ مُنہ سے خون اُگلتے ہوئے بولی: "مجھے... ایسا ہی... کرنا چاہیے تھا... جب... جب مونا نے مجھ سے مُنہ موڑ لیا... تو میں کیا کرتی؟... پھر... بوتھان میں... موت کے سوا... رہ ہی کیا گیا ہے؟" اتنا کہہ کر لڑکی نے آخری ہچکی لی اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

یہ میری بدقسمتی تھی کہ وہ جو میرے کام آتی، مجھے اس جگہ کے متعلق معلومات فراہم کرتی اپنے سینے میں خنجر اُتار کر مر گئی بہرحال مجھے یہاں اس نئی سرزمین پر کسی نہ کسی طرح حالات کا مقابلہ تو کرنا ہی تھا اس لیے میں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے میں نے اُس ہٹے کٹے سپاہی کی وردی خود پہن لی جو ایک اُونی پتلون اور چمڑے کی جیکٹ پر مشتمل تھی اس کا خود سُرخ رنگ کا تھا۔ وردی یا خود پر اُس کا عہدہ ظاہر کرنے والا کوئی نشان نہیں تھا۔ شاید وہ عام سپاہی تھا۔ اس کی وردی اگرچہ میری جسامت سے بہت چھوٹی تھی مگر ستر پوشی کا کچھ سامان تو ہو ہی گیا تھا۔

ابھی میں وردی پہن کر فارغ ہوا ہی تھا کہ گنبد کا ایک اور حصّہ گرا۔ ہر طرف آگ اور انگارے پھیل گئے۔

میں نے اُوپر دیکھا۔

جن دیواروں پر وہ چوبی گنبد تعمیر کیا گیا تھا، اُن میں سے ایک اندر کو جُھک گئی تھی اور کسی بھی لمحے گرنے والی تھی یہ دیکھ کر میں ناک کی سیدھ میں بھاگتا چلا گیا۔ مجھے دھوئیں میں بھی گھسنا

پڑا اور شعلے بھی پھلانگنا پڑے مگر میں نے معبد سے نکلنے میں دیر نہیں کی اور جونہی باہر پہنچا، ایک زبردست دھماکے نے مجھے بتا دیا کہ وہ دیوار گر چکی ہے اور دوسری دیواریں بھی گرنے ہی والی ہیں۔

اسے کہتے ہیں آسمان سے گِرا کھجور میں اٹکا۔ میں نے ڈاکٹر فریدوں کو وہی میٹھی سی بددعا دی کہ خدا کرے وہ کسی حسینہ کے عشق میں مبتلا ہو جائے جس نے مجھے اس میدان میں منتقل کرایا تھا۔ اب مجھے تلواروں اور ڈھالوں کے ٹکرانے کی آوازیں واضح سُنائی دے رہی تھیں۔ زخمیوں کی چیخ و پکار اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ صاف بتا رہی تھی کہ معرکۂ جنگ وہیں کہیں قریب ہی جاری ہے۔

اُس لڑکی نے سچ ہی کہا تھا کہ بوتھان مر رہا ہے بوتھان شہر تھا، صوبہ یا ملک... جو بھی اس کی حیثیت تھی اُس سے تو میں اب تک واقف نہیں تھا لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہو چکا تھا کہ یہاں چپے چپے پر موت رقص کر رہی ہے۔ ہر طرف آہ و بکا کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں اور ہنستے بستے گھروں سے دُھواں اُٹھ رہا ہے۔ نہ عفتوں کی تقدیس باقی رہی ہے اور نہ معبدوں کی حُرمت کا احساس باقی رہا ہے۔

ایک دھماکا اور ہوا۔

معبد کی کچھ اور دیواریں گر گئی تھیں... یا کسی دوسرے حصّے کی چھت گر پڑی تھی۔ میں نے وہاں سے بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی اور ایک گلی میں گھس گیا۔

گلی میں بھی جگہ جگہ لاشیں پڑی تھیں۔ میں نے ایک لاش کے پاس پڑی چھوٹی سی ڈھال اُٹھائی اور اُسے بائیں بازو سے لٹکا لیا۔ اس ڈھال پر ایک ایسے سانپ کی تصویر کندہ تھی جو اپنی دُم اپنے مُنہ میں دبا رکھی تھی جیسے وہ اپنے آپ کو کھا رہا ہو۔

یہ گلی آگے جا کر تنگ تر اور پُرپیچ ہوتی چلی گئی۔ اس کے دونوں جانب بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانات کی چھتیں گھاس پھونس کی بنی ہوئی تھیں اور بعض چھتیں جلنے بھی لگی تھیں... لیکن اُن کی آگ بجھانے کو وہاں کوئی بھی نہیں تھا... یا تو اُن کے مکین موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے تھے یا پھر وہ وہاں سے فرار ہو چکے تھے۔

اس گلی سے گزرتے ہوئے اچانک مجھے شدت سے پیاس محسوس ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ میں بھوکا پیٹ بھی ہوں۔ میں تیز تیز چلنے لگا تاکہ کسی طرح، کہیں سے اپنے لیے کھانے پینے کا بندوبست کر سکوں۔

یہ گلی مجھے ایک چوراہے پر لے آئی۔

چوراہا بالکل خالی پڑا تھا۔ اس کے ارد گرد مکان... اور دُکانیں تھیں اور مرکز میں ایک چھوٹا سا فوارہ چل رہا تھا۔ میں نے اپنی توجہ اس فوارے پر مرکوز کر دی کہ مجھے اپنی زبان خشک چمڑے کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ معبد کی آگ نے میرے ہونٹوں پر پپڑیاں سی جما دی تھیں۔

میں فوارے کے قریب پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ ایک حسین و جمیل عورت کا مجسمہ ہے جس نے ایک صراحی اُٹھا رکھی تھی اور پانی کی دھار اُسی صراحی سے اُبل رہی ہے۔

فوارے کا پانی بے حد خنک اور شیریں تھا۔ میں نے پیاس بجھائی اور پھر تلوار سے اس خاتونِ سنگ کو سلام کیا جس نے میری تشنگی دُور کی تھی۔ میں نے ایک بار پھر سر سے پاؤں تک اُس خوب صورت مجسمے کا جائزہ لیا تو بُری طرح چونک گیا۔ مجسمے کے چبوترے پر لفظ "مونا" کندہ تھا۔

اس لفظ "مونا" کے ساتھ ہی مجھے وہ لڑکی اور اُس کے آخری الفاظ یاد آ گئے کہ مونا نے مجھ سے مُنہ موڑ لیا ہے... تو مونا اس شہر یا ملک بوتھان کی دیوی تھی۔

ابھی میں دیوی کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ مجھے ہتھیاروں اور عسکریوں کے چلنے کی آواز سُنائی دی۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ آواز زمین کے اندر سے آ رہی تھی۔ عین اس جگہ کے نیچے سے جہاں میں کھڑا تھا۔

خداوندا!... یہ کیا ماجرا ہے؟

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے فوارے کی دوسری جانب گلی کے فرش میں ایک بڑا سا سُوراخ دکھائی دیا یا تو یہ کسی گٹر نما چشمے کا سُوراخ تھا یا پھر زیرِ زمین راستے کا دہانہ... اب آواز اُسی سُوراخ سے آنے لگی تھی۔

میں فوراً وہاں سے ہٹ کر ایک اندھیرے گوشے میں چھپ گیا اور سوچنے لگا کہ آنے والے میرے دوست ہو سکتے ہیں یا دُشمن...؟ مجھے اپنی اس سوچ پر ہنسی آ گئی۔ اس وقت تو اس شہر یا ملک کا ہر آدمی میرا دُشمن ہی ہو سکتا تھا۔

چند لمحوں کے بعد اُس سُوراخ سے سپاہی باہر آنے لگے۔ اُن کی وردیاں اور خُود ویسے ہی تھے جیسا میں نے پہن رکھا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ میرے دوست ہو سکتے تھے... پھر بھی میں اُن پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔

سُوراخ سے برآمد ہونے والا پہلا آدمی شاید کوئی عہدے دار تھا کیوں کہ اُس کا خود دوسروں سے مختلف تھا۔ چاندنی میں اُس کی ڈھال پر بنی ہوئی مونا دیوی کی شبیہ صاف نظر آ رہی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بوتھان کے سپاہی ہیں اور اپنے دُشمنوں سے شکست کھا چکے ہیں۔ اُن کا تین چوتھائی شہر اس وقت جل رہا تھا جب کہ دُوسرے حصّوں کی بہ نسبت یہ علاقہ اب تک محفوظ تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے سپاہی باہر آ گئے۔ ان میں کچھ شمشیر زن تھے، کچھ نیزہ باز اور کچھ تیر انداز تھے۔ وہ افسر اُنھیں صف آرا کرنے لگا۔ ان سپاہیوں کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ مزید لڑ سکتے ان میں سے بیشتر زخمی تھے اور کئی ایک کے پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اُنھیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اُنھوں نے بڑی خوں ریز جنگ لڑی تھی۔

جب آخری سپاہی بھی صف آرا ہو گیا تو افسر نے اپنی تلوار بُلند کرتے ہوئے اُنھیں مخاطب کیا۔

"بوتھان کے جانبازو! میں تمھاری عظمت اور بہادری کو سلام کرتا ہوں۔ تم نے جس پامردی سے دُشمنوں کا مقابلہ کیا ہے، وہ قابلِ داد ہی نہیں بلکہ حیرت انگیز بھی ہے کیوں کہ دُشمن تم سے تعداد میں کئی گنا زیادہ تھے۔ اب تم آرام کے حق دار ہو۔"

یکایک ایک سپاہی بول پڑا: "پھر تم ہمیں آرام کیوں نہیں کرنے دیتے کماندار ہاشم! ہمیں آرام کی نہیں، زندگی کی بھی ضرورت ہے۔ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اس لیے ہمیں یہ مُردہ شہر چھوڑ کر دلدلی راستے سے ساحل پر پہنچنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے، اس طرح ہم میں سے کچھ لوگ رودموہ پہنچ جائیں۔ تب ہم دوبارہ شبستانیوں سے لڑ سکیں گے۔ اب ہمیں جنگ کا ایندھن نہ بناؤ کیوں کہ ہم بوتھان ہار چکے ہیں۔ بوتھان مر چکا ہے۔"

سپاہی کی بات ختم ہونے کے بعد بھی چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔

یہ خاموشی اتنی گمبھیر تھی کہ ہوا کی سنسناہٹ بھی صاف سُنائی دے رہی تھی۔

کماندار نے تلوار سے اس سپاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیزہ بازوں سے کہا: "اس آدمی کو میرے پاس لے آؤ۔"

نیزہ باز اُس کے حکم کی تعمیل کرنے میں ہچکچائے تو وہ ہوا میں تلوار چلاتے ہوئے گرج اُٹھا: "اُسے فوراً پکڑ کر میرے سامنے لاؤ، ورنہ تمھارے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے گا جو..."

نیزہ باز آگے بڑھے اور اُس سپاہی کو پکڑ کر کماندار کے سامنے لے گئے۔

اُس سپاہی نے اب بھی ہمت نہ ہاری اور کماندار کو مخاطب کرتے ہوئے بولا: "کماندار ہاشم! تم احمق ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم بوتھان میں جنگ ہار چکے ہیں۔ شہر ہمارے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ مُونا کو ہماری کوئی پروا نہیں۔ وہ اب بھی اپنے پجاریوں کے ساتھ ہے اور یہاں سے ساحل کو فرار ہونے کی تیاریاں کر رہی ہے تو پھر ہم یہاں کیوں ٹھہریں۔ یہاں کیوں مریں؟... اب ہماری موت بے مقصد اور بے جواز ہوگی۔"

کماندار نے غصّے میں اُسے اُلٹا طمانچہ مارتے ہوئے جواب دیا۔ "تمھاری بکواس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم بزدل غدّار اور دُشمنوں کے جاسوس ہو۔ تمھیں دفاعِ وطن سے کوئی دل چسپی نہیں اور تم طراق کے تنخواہ دار ہو... یہ تم یا تم جیسے غدّار ہی تھے جنھوں نے شبستانیوں پر گندے پانی کی نکاسی والے دروازے کھول کر اُنھیں اس وقت شہر میں بُلا لیا تھا، جب ہم سو رہے تھے۔ تم جیسے غدّاروں کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔"

"یہ جھوٹ ہے، بہتان ہے مجھ پر... میرے ساتھیوں سے پوچھو کماندار کہ میں اوّل تا آخر اُن کے ساتھ تھا یا نہیں۔ میں دفاعِ وطن کے لیے کیسا جی جان سے لڑا ہوں، میرے دوست اس کے عینی شاہد ہیں لیکن تم ہمیں ہاری ہوئی جنگ میں خواہ مخواہ ایندھن بنانا چاہتے ہو جو حماقت نہیں بلکہ پاگل پن ہے۔ شکست کے بعد ہزیمت خوردہ سپاہیوں کی جانیں بچانا اور کامیابی سے پیچھے ہٹ جانا بھی جنگی حکمتِ عملی ہوتی ہے جس سے تم ناواقف ہو۔" سپاہی نے شدید احتجاج کیا۔

چونکہ میں فوج میں رہ چکا تھا اور جانتا تھا کہ یہ آدمی اگرچہ سچ بول رہا ہے مگر ضابطے کی خلاف ورزی کر رہا ہے اس لیے فوجی قواعد کے تحت سزا کا مستوجب ٹھہرے گا۔ چنانچہ یہی ہُوا۔ کماندار نے نیزہ بازوں کو حکم دیا: "اس کی مُشکیں کس کر اسے گھٹنوں کے بل بٹھا دو۔"

کماندار کے حکم کی فوری تعمیل کی گئی... اُس کی تلوار چاندنی میں چمکی اور دوسرے ہی لمحے اُس بہادر سپاہی کا سر تن سے جُدا ہو گیا۔

"ہر غدّار کے ساتھ یہی سلوک کیا جائے گا۔ یہ بزدل جھوٹ کہتا تھا کہ بوتھان مر چکا ہے... بوتھان مرا نہیں بلکہ صرف زخمی ہُوا ہے۔ دُشمن نے وقتی طور پر اُسے تباہ کیا ہے اور آگ لگائی ہے لیکن بوتھان اسی جگہ، اپنے کھنڈروں پر نئی شان و شوکت سے اُبھرے گا... یہ تخریب اس کی تعمیرِ نو ثابت ہوگی۔" کماندار دوسرے سپاہیوں سے بولا۔

کماندار کے ان الفاظ میں آواز تو تھی لیکن وہ الفاظ بے رُوح اور بے معنی لگتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سپاہیوں ہی کو نہیں بلکہ خود کو بھی جھوٹی تسلی دے رہا ہو۔

سپاہیوں میں کانا پھوسی شروع ہو گئی۔

میں نے سوچا کہ مجھے بھی چپکے سے اِن سپاہیوں میں شامل ہو جانا چاہیے۔ یوں تنہا اور الگ تھلگ رہنے میں خطرہ بھی ہے اور مجھے اس نئی سرزمین کے بارے میں معلومات بھی حاصل نہیں ہو سکیں گی لیکن میں ان سپاہیوں کے ساتھ بوتھان میں مرنا نہیں چاہتا تھا جو اُن کے کمان دار کی خواہش تھی۔

یکایک ایک گلی سے گھوڑے کی ٹاپیں اُبھریں۔

سب کی نگاہیں اُس طرف اُٹھ گئیں۔

آنے والا ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کے سر پر خود نہیں تھا اور چاندی جیسے سفید بال چاندنی میں چمک رہے تھے۔ اُس کی وردی خون آلود تھی۔ اُسے دیکھتے ہی کمان دار اور سپاہی چوکنّا ہو گئے۔ کمان دار نے سپاہیوں کو چوکس ہونے کا حکم دیا اور آنے والے کو سلام کرنے کے بعد بولا: "جنگ کا کیا حال ہے جناب؟"

"دُشمنوں کا پلّہ بھاری رہا، ہاشم! ہم ہر محاذ پر جنگ ہار چکے ہیں اور اس وقت طراق اپنے محل میں بیٹھا ہماری دوشیزاؤں کو رقص پر مجبور کر رہا ہے... وہ عورتیں جن کے دل اپنے وطن اور اپنے پیاروں کی موت پر ماتم کر رہے ہیں، طراق کے فاتح پیاروں

کے لیے گیت گا رہی ہیں۔ اُن کی عصمتیں اور مال و متاع لُوٹا جا رہا ہے... یہ بتاؤ کہ اس وقت تمھارے پاس کتنی نفری ہے؟"

یہ باتیں بتانے والا کوئی بڑا افسر یا جرنیل تھا اور اُس کا ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا ہُوا تھا۔

"میرے پاس تقریباً تین سو کی نفری ہے، جناب۔" کمان دار نے جواب دیا: "آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ میرے جوان کتنی بے جگری سے لڑے ہیں اور اب بھی لڑنے مرنے کے لیے تیار ہیں۔"

بوڑھے افسر نے ایک نظر سپاہیوں کی صفوں پر ڈالی اور پھر اُس کی نگاہ اُس سر بریدہ سپاہی کی لاش پر ٹک گئی جس کا دھڑ صفوں کے سامنے پڑا تھا۔

"یہ کس کی لاش ہے؟ اور اس کا قصور کیا تھا؟" اس نے سوال کیا۔

کمان دار نے اُس کے بارے میں وضاحت کی تو مجھے بوڑھے افسر کے چہرے پر ترحم اور افسوس کے تاثرات اُبھرتے نظر آئے۔

"میرا خیال ہے کہ تم غلطی پر تھے کمان دار۔ مرنے والا غدّار یا جاسوس نہیں تھا۔ بوتھان کے ساتھ غدّاری ضرور کی گئی ہے مگر غدّاری کرنے والے نچلے طبقے کے لوگ نہیں۔ یہ غدّاری تو محلاتی سازش کا نتیجہ ہے... اس شہر میں اب صرف ہم لوگ ہی بچ گئے ہیں باقی ساری نفری تہ تیغ یا قید ہو چکی ہے اس لیے ہم جتنی جلدی شہر چھوڑ دیں، بہتر ہوگا۔ شہر کا صرف یہی علاقہ دُشمنوں کی زد سے کچھ محفوظ رہا ہے اور اس لیے محفوظ رہا ہے کہ یہ غریبوں اور مزدوروں کا علاقہ ہے جہاں سے دُشمن کو مال و متاع نہیں مل سکتا۔ وہ تو اُمرا کے علاقے میں لُوٹ مار کرنا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔" عسکری افسر دَم لینے کے لیے رُک گیا۔

مجھے کمان دار ہاشم کے چہرے پر اختلاف کا رنگ جھلکتا دکھائی دے رہا تھا جب کہ سپاہی ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے۔

افسر دوبارہ کہنے لگا: "میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ پسپا ہوتے ہوئے شمالی دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کرو۔ وہاں سے بھی فرار کے مواقع بہت کم رہ گئے ہیں لیکن کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔ طراق نے اپنی سپاہ کو شہر کے محاصرے کا حکم دے رکھا ہے تاکہ کوئی یہاں سے بچ کر نہ نکلنے پائے... لیکن یہی غنیمت ہے کہ وہ ابھی شمالی دروازے سے شہر میں داخل نہیں ہوئے اور ہمارے بچ نکلنے کا تھوڑا سا امکان موجود ہے۔ اگر ہم دلدلی جھاڑیوں کے راستے ساحل تک سے رومو پہنچ جائیں تو شبستانیوں سے دوبارہ لڑنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

"لیکن مُونا اور اس کے پجاریوں کا کیا ہوگا، جناب؟" کمان دار نے پُوچھا: "کیا ہم اُنھیں طراق کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔"

"نہیں، جناب والا۔ میں چوراہے کو پتھروں اور لاشوں سے پاٹ دوں گا مگر شبستانیوں کو یہاں سے نہیں گزرنے دُوں گا۔ کم از کم اس وقت تک اُنھیں ضرور روکے رکھوں گا جب تک کہ مُونا اور پجاریوں کو فرار کا موقع نہ مل جائے۔"

جرنیل اور کمان دار کی اس تقریر کے دوران میں چھپتا چھپاتا سپاہیوں کی آخری صف کے پیچھے آ گیا تھا اور اب کسی بھی وقت ان میں شامل ہو سکتا تھا۔

کمان دار کی بات پر اس کے افسر نے کہا: "اگر اس سپاہی نے تمھیں احمق کہا تھا تو ٹھیک ہی کہا تھا... تم ایک بہادر احمق ہو۔ یہ مُونا اور اس کے پجاری ہیں جنھوں نے اپنے اغراض و مقاصد کے لیے اپنے طور طریقوں سے ہمارے ساتھ غدّاری کی ہے۔ اُنھیں میری اور تمھاری اور تمھارے جوانوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اب مجھ سے کوئی بحث مت کرو اور میرے پیچھے آؤ... یہ میرا... تمھارے جرنیل کا حکم ہے۔ ہم فوری طور پر شمالی دروازے کی طرف بڑھیں گے۔"

کمان دار خاموش کھڑا رہا۔

جرنیل نے تلوار بلند کر کے اور سر بریدہ لاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "حکم کی تعمیل کرو یا اسی حشر کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

کمان دار اپنے جوانوں کو ہدایات دینے لگا۔

خستہ حال سپاہی بچ نکلنے کی آس میں جلدی جلدی چار چار کی قطار بنانے لگے۔ میری طرف کسی نے بھی توجہ نہیں دی کیوں کہ پہلے وہ کمان دار اور جرنیل کی طرف متوجہ تھے اور اب فرار کے خیالوں میں غرق تھے۔ میں نے اپنے کندھے سکیڑ لیے اور آخری سپاہیوں کے ساتھ چلنے لگا۔

قطار کے اگلے حصّے میں کچھ سپاہیوں نے پُرسوز آواز میں مُونا دیوی کا کوئی "بھجن" گانا شروع کر دیا... لیکن پچھلے حصّے میں، بالخصوص میرے ساتھی اس بھجن سے بے نیاز اپنے ڈھرّے رونے اور سر جھکائے چلتے رہے۔

چلتے چلتے ایک سپاہی بولا: "جرنیل جمشید نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ ہمارا کمان دار تو واقعی احمق ہے۔ اُس نے بے چارے فیرانگن کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ وہ میرا دوست، ساتھی اور

ندر سپاہی تھا وہ کمان دار کی طرح دلیری سے لڑا اور اس پر غداری کا الزام سراسر جھوٹ تھا۔“

”کمان دار بھی بُرا آدمی نہیں... بس اُس میں اتنی خرابی ضرور ہے کہ وہ بہت جلد غصّے میں آجاتا ہے ورنہ وہ بہادری میں جواب نہیں رکھتا۔“ دُوسرا سپاہی بولا۔

”ہاں“ پہلے نے جواب دیا۔ ”وہ ایسا بہادر ہے کہ ہمیں مروائے بغیر نہ رہتا۔“

”اُس کی بھی ایک وجہ ہے۔“ دُوسرا بولا۔ ”وہ مُونا کی... خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ اُس کے حِصّے میں بھی مُونا کی کچھ رفاقت آجائے... تم تو جانتے ہو کہ مُونا بڑے بڑے بہادروں کو کبھی کبھی اپنا مہمان بنا لیا کرتی ہے۔“

ان دو سپاہیوں کی باتوں سے مجھے اندازہ ہُوا کہ مُونا ایک گوشت پوست کی عورت ہونے کے ساتھ ساتھ دیوی کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ ہمارے دَور اور ہماری سرزمین پر کچھ مذاہب ایسے ہیں جن میں انسانوں کو اوتار کا درجہ دیا جاتا ہے۔ بدھمت کے ماننے والے دلائی لامہ کو امتیابھ بُدھ کا اوتار سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مُونا کو بھی دیوی کا دوسرا رُوپ سمجھا جاتا ہوگا۔ میں نے مُونا کا فوارے والا جو مجسّمہ دیکھا تھا، اس میں وہ بے حد خُوبصورت نظر آتی تھی۔ ممکن ہے پجاریوں نے کوئی خوب صورت لڑکی تلاش کرکے اُسے بچپن ہی سے دیوی کا رُوپ دھارنے کی تربیت دے رکھی ہو... اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل میں پجاریوں کے خلاف نفرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ یہ لوگ مذہب کے نام پر لوگوں کی ضعیف الاعتقادی سے کتنا غلط فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اُنھیں دیویوں اور دیوتاؤں سے ڈرا کر خود اقتدار پر قابض رہتے ہیں۔ اُنھوں نے یہاں بھی مُونا کو دکھاوے کا ایک مہرہ بنا رکھا تھا۔

میں انھی خیالوں میں گم تھا کہ اچانک میری پنڈلیوں پر ایک زوردار ضرب لگی۔ یہ ضرب ایک موٹے تازے عسکری عہدے دار نے تلوار کی نیام سے لگائی تھی جسے پچھلی صفوں کی ترتیب درست کرنے اور رفتار بڑھانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

”صف سیدھی رکھو اور رفتار بڑھاؤ مُردارو... چال میں جان پیدا کرو۔ میں کہتا ہُوں مَردوں کی طرح سینہ تان کے چلو۔“ وہ چیخ کر بولا اور اس نے پھر مجھے ضرب لگائی کیونکہ میں اپنے کندھے سیکڑ کر چل رہا تھا۔

اُس کی اس حرکت نے مجھے بُری طرح مشتعل کر دیا اور مجھ سے ایک ایسی غلطی سرزد ہوگئی جو جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں ایک دم پلٹا اور اپنی پُوری طاقت سے عسکری عہدے دار کی دونوں آنکھوں کے درمیان، ناک پر ایک گھونسہ جڑ دیا۔ وہ مُکّے کی تاب نہ لاتے ہُوئے چکرایا اور دھم سے گر پڑا۔

میرے ساتھ چلنے والے سپاہیوں کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں اور وہ رُک گئے۔ اُن سے آگے جانے والے سپاہیوں کو پتہ بھی نہ چلا کہ آخری صف میں کیسی بغاوت ہو چکی ہے۔ وہ اُسی طرح آگے بڑھتے رہے۔

میرے ساتھ رُکنے والے سپاہیوں میں سے ایک نے کہا۔ ”یہ تو مر چکا ہے۔ اسے مرنا ہی چاہیے تھا دوست کو اتنا زوردار گھونسا تو کسی سانڈ کو بھی ختم کر سکتا تھا۔“

اتنے میں ایک ہٹا کٹا سپاہی میری طرف بڑھا اور میرا شانہ تھپکتے ہُوئے بولا۔ ”تم نے بالکل ٹھیک کیا جانِ من!... اس مردود نے ایک بار مجھے بھی کوڑے مارے تھے۔ تم اسے سر کی طرف سے پکڑو اور میں اسے ٹانگوں سے ڈنڈا ڈولی کرتا ہُوں۔“ یہ کہہ کر اُس نے عہدے دار کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ میں نے اُسے بازوؤں سے اُٹھا لیا۔

”اسے جھلاؤ جانِ من تاکہ ہم اسے سامنے والے گھر میں پھینک دیں۔ یہ وہاں اطمینان سے استراحت فرماتا رہے گا ورنہ اگر یہ یہاں پڑا رہا اور بارش آگئی تو بھیگ جائے گا۔“ ہٹا کٹا سپاہی بولا۔

ہم نے اُسے تین بار جُھلایا اور سامنے والے مکان میں پھینک دیا۔

اب تک میں نے اُس ہٹے کٹے سپاہی کا پُوری طرح جائزہ نہیں لیا تھا۔ اب جو میں نے اُس کی طرف غور سے دیکھا تو مجھے اس کی آنکھ پر پٹّی بندھی نظر آئی... وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا مگر دوبارہ کچھ نہیں بولا۔ شاید اُسے بھی میری طرح کسی ساتھی کی تلاش تھی... مگر وہ مجھ سے میل جول کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔

ہم دونوں زخمیوں کے گروہ میں شامل ہوگئے۔

کچھ دیر ہم چپ چاپ چلتے رہے۔ میں نے کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا اور اُس نے میری جانب دیکھا۔ گویا ہم دونوں ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس آدمی کے سامنے والے دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور صورت شکل سے وہ چھٹا ہُوا بدمعاش لگتا تھا... لیکن مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس قسم کے لوگ بُری خصوصیات رکھنے کے باوجود بوقتِ ضرورت اچھے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

میں نے بات چیت کے لیے اس کی ہمت بندھانے کی خاطر مُسکراتے ہُوئے اس کی جانب دیکھا تو اُس نے میری طرف دیکھے بغیر سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ”آپ کون ہیں جناب اور یہاں بوتھان میں کیا کرنے آئے ہیں۔ آپ بوتھان کے سپاہی تو ہو نہیں سکتے ذرا اپنی وردی ملاحظہ فرمایئے۔ یُوں لگتا ہے جیسے آپ نے میرے بیٹے کا لباس پہن لیا ہو، اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو... میرا مطلب ہے کہ آپ کا جسم وردی سے بہت بڑا ہے۔ میں نے اُس وقت کسی خیال کے تحت آپ کی مدد کی تھی مگر اب میں نے وہ خیال بدل دیا ہے۔ کیا آپ شبستانی ہیں؟ دیکھیے اس بڈھے ساحر سے جھُوٹ بولنے کی کوشش ہرگز نہ کیجیے گا کیونکہ ساحر خود بہت بڑا جھُوٹا ہے اور جھُوٹ کو صاف پہچان لیتا ہے۔“

مجھے اس کی خوش مزاجی اچھی لگی لیکن میں یہ بھی جان گیا کہ وہ بِل کاٹ چکا ہے کیوں کہ بات کرتے وقت اُس کے ہونٹ نہیں ہلتے تھے اور یہ مہارت جیل کے قیدیوں ہی کو حاصل ہو سکتی ہے جو اپنے نگرانوں کو متوجہ کیے اور ہونٹ ہلائے بغیر باتیں کر سکتے ہیں۔

”میں مناسب وقت آنے پر تمھارے ہر سوال کا جواب دُوں گا لیکن اس وقت تم مجھے صرف ایک سوال کا جواب دے دو... یہ تم مجھے ”آپ“ اور ”جناب“ سے کیوں مخاطب کر رہے ہو؟“

”اس لیے کہ آپ کوئی معمولی سپاہی نہیں ہو سکتے جناب۔ میرا ... میری ایک آنکھ زخمی ہے مگر میں نے اپنی اکلوتی صحت مند آنکھ سے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا کہ آپ معمولی آدمی نہیں ہیں۔ جس طرح عہدے دار کی زیادتی کا حساب آپ نے اُسی وقت کھڑے کھڑے چکا دیا، اس طرح کوئی عام سپاہی نہیں کر سکتا... ایک عام سپاہی انتظامی کارروائی کے تحت کسی اندھیری جگہ موقع پاکر اس کے سینے میں خنجر تو گھونپ سکتا ہے مگر فوری طور پر اپنی توہین کا بدلہ نہیں لے سکتا۔ یہ کام تو کوئی غیر معمولی آدمی ہی کر سکتا ہے، جناب۔“

مجھے اُس یک چشم کے مشاہدے پر تعجب ہُوا۔

”تم نے کسی حد تک ٹھیک ہی اندازہ لگایا ہے دوست۔ میں نہ تو بوتھانی ہُوں اور نہ ہی شبستانی ہُوں۔ میں تو ایک اجنبی ہوں اور حادثاتی طور پر اس صورتِ حال میں پھنس گیا ہُوں۔ مجھے مجبوراً اس شکست خوردہ دستے کا ساتھ دینا پڑ رہا ہے۔ اگر تم اس وقت میرے کام آئے تو گھاٹے میں نہیں رہو گے۔ اس وقت میں تم سے صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہُوں۔“

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور ہم چپ چاپ اس دستے کے پیچھے چلتے رہے۔ ایک مقام پر مجھے بدبُو آئی تو میں نے ناک سکیڑ لی۔

”آپ کا یُوں ناک سکیڑنا بھی میرے اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ آپ اُونچے طبقے کے آدمی ہیں۔ مجھے یہ بدبُو اس لیے محسوس نہیں ہوتی کہ میں اسی گھٹیا اور غلیظ علاقے کی پیداوار ہُوں۔“ ساحر نے کہا۔

”تم یہیں کہیں پیدا ہوئے اور یہیں جوان چڑھے ہو؟“ میں نے محض بات بڑھانے کے لیے پُوچھا۔

”جی ہاں... انھی گلیوں میں ذرا ہٹ کے میرا گھر واقع ہے۔“

”تمھارے خاندان کے ساتھ کیا بیتی ہوگی؟ وہ گھر پر ہے یا...“

وہ میری پُوری بات سُنے بغیر ہی بے ساختہ ہنس پڑا اور بولا۔ ”خاندان کی بھی خُوب کہی۔ مجھے میری ماں نے جنم دے کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا۔ ایک کبی مجھے اُٹھا لے گئی اور پالنے پوسنے لگی مگر ابھی میں نے ہوش ہی نہیں سنبھالا تھا کہ وہ طاعون کا شکار ہو کر چل بسی... پھر میں کسی آوارہ کُتّے کی طرح بھٹکتا اور بھیک پر گزارا کرتا رہا۔ مجھے یہ سب کچھ بتاتے ہُوئے بالکل شرم نہیں آتی جناب خود ہی سوچیے کہ ایسی زندگی اور موت میں کیا فرق ہے؟... بلکہ موت اس سے اچھی ہے... مگر میں فی الحال مرنا بھی نہیں چاہتا شاید جرنیل ہمیں شمالی دروازے سے بچا کر لے جانے میں کامیاب ہو جائے۔“

اب ہم ایک بڑے چوراہے میں پہنچ گئے تھے جس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی دُکانیں تھیں۔ جو مجھے چور بازار کی یاد دلا رہی تھیں۔ اتنے میں جرنیل اور کمان دار نے سپاہیوں کی ازسرِ نو صف بندی شروع کر دی۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو چوراہے کی دُکانوں کے پیچھے ایک سنگی دیوار اور اس کا بڑا چوبی دروازہ دکھائی دے گیا۔ شاید یہی وہ شمالی دروازہ تھا جس کے ذریعے ہم ساحل تک پہنچ سکتے تھے لیکن میری چھٹی حِس مجھے بتا رہی تھی کہ ہم اس دروازے سے باہر نہیں جا سکیں گے۔ میں اپنے آپ کو کچھ مضطرب محسوس کرنے لگا۔

ابھی میں اس اندرونی اضطراب کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ایک لمبا تڑنگا عہدے دار ہمارے قریب آیا اور زخمیوں میں سے ایسے سپاہی چھانٹنے لگا جو لڑنے کے قابل تھے۔

اچانک اُس نے میرے ساتھی ساحر سے پُوچھا۔ ”تمھاری آنکھ پہ یہ زخم کیسے لگا؟ نیزے یا تلوار سے؟“

"میری آنکھ تیر سے زخمی ہوئی ہے۔ مگر تیر چھیلتا ہوا نکل گیا تھا" ساحر نے جواب دیا۔

"اوہ... پھر بھی معاملہ آنکھ کا ہے۔ مجھے زخم کا معائنہ کرنا پڑے گا"

"نہیں نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ بس ہلکی سی خراش ہے جو جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی"

... مگر عہدے دار نے ہاتھ مار کر اُس کی آنکھ پر بندھی ہوئی پٹی نوچ لی اور اس پٹی سے بہت سارے سکے، انگوٹھیاں اور بالیاں وغیرہ زمین پر گر کر پھیل گئیں۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم جنگ میں صرف لوٹ مار کے لیے شریک ہوئے ہو" عہدے دار بولا "عقرب نے بھی اسی شک کا اظہار کیا تھا... مگر وہ ہے کہاں؟... وہ تم لوگوں کی طرف ہی آیا تھا۔ بولتا کیوں نہیں... عقرب کہاں چلا گیا؟"

"اگر تمہیں عقرب کی تلاش ہے تو بہت پیچھے جانا پڑے گا۔ مجھے اُس گھر کا پتہ یاد نہیں رہا جہاں وہ آرام فرما رہا ہو گا"

"کیا بک رہے ہو تم؟ صاف صاف بتاؤ، یہ مذاق کا وقت نہیں ہے" عہدے دار غصے سے بولا۔

عین اُسی لمحے نہ جانے کہاں سے ایک خنجر آیا جو عہدے دار کے دل میں پیوست ہو گیا۔ ساحر نے جلدی سے خنجر نکال کر اپنے کپڑوں میں چھپا لیا اور ساتھ ہی گرتے ہوئے عہدے دار کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگا "کسی نے بڑے غلط وقت پر بیچارے عہدے دار سے اپنی توہین کا بدلہ لیا ہے جناب اور خنجر میں نے یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھ لیا ہے"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں ہنسوں یا عہدے دار کی موت پر اظہارِ افسوس کروں۔ اتنے میں ساحر نے عہدے دار کو زمین پر لٹا دیا اور سکے چننے لگا۔

میں نے جھک کر دیکھا۔ عہدے دار دم توڑ چکا تھا۔

اچانک اُسی وقت ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی شمالی دروازہ کھلتا نظر آیا۔

"شبستانی سپاہ آ گئی۔ اُدھر دکانوں کی طرف بھاگیے جناب" ساحر چیخ پڑا۔

میدانِ جنگ سے بھاگنا میری فطرت کے خلاف تھا... مگر یہ صورت حال ایسی تھی کہ مجھے ساحر کے مشورے پر عمل کرنا پڑا... وہ مجھے اپنے ساتھ لیے چوراہے کے ایک کنارے بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی دکانوں کے بیچ میں لے آیا۔

"جان بچانے کا صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے جناب اور وہ ہے زمین دوز غلیظ راستہ... مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہاں کہیں اس گٹر نما کا ایک ڈھکنا ہوا کرتا تھا۔ وہ اسی سنگی فرش کی سلوں جیسی ایک سل ہے" یہ کہہ کر وہ اُسے تلاش کرنے لگا اور میں چوراہے کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو گیا جہاں اب زوروں کی جنگ چھڑ چکی تھی۔

سپاہیوں کا دستہ جرنیل اور کمان دار کی نگرانی میں یلغار کرنے والے شبستانیوں کا راستہ روکنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن شبستانی سپاہ تازہ دم تھی، تعداد میں زیادہ تھی اور اُس کے سپاہی بوتھانیوں سے بہتر جنگجو تھے۔

پہلے شبستانی نیزے بازوں نے نیزے پھینکے پھر تیر اندازوں نے تیر برسائے اور اس کے بعد گھڑسوار آگے بڑھ آئے تھے۔

بوتھانی سپاہی گاجر مولی کی طرح کٹ کر گرنے لگے لیکن اُن کے لیے نہ آگے بڑھنے کا راستہ تھا اور نہ ہی فرار کی کوئی صورت تھی اس لیے وہ بھی بڑی بے جگری سے لڑ رہے تھے۔

اِدھر ساحر نے گٹر نما حصے کے ڈھکنے والی سل تلاش کر لی تھی مگر وہ اُس سے اُٹھ نہیں رہی تھی۔

"خدا کے لیے میری مدد کیجیے جناب" اُس نے ہانپ کر کہا۔

میں نے ایک جھٹکے سے وہ سل ہٹا دی۔ بدبو کا ایک تیز جھونکا اُٹھا تو میں فوراً پیچھے ہٹ گیا اور ناک پر ہاتھ رکھ کر لڑائی کا تماشا دیکھنے لگا۔ بوتھانیوں اور شبستانیوں کو لڑتے دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی اس جنگ میں شریک ہو جاؤں لیکن میں نہ تو بوتھانیوں کا ساتھ دے سکتا تھا اور نہ ہی شبستانیوں کا دم بھر سکتا تھا۔ وہ دونوں ہی مجھے اپنا دشمن تصور کرتے... اور اگر بوتھانی مجھے دشمن نہ سمجھتے تو بھی اُن کا ساتھ دینے میں اب کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ تقریباً سب ہی مارے جا چکے تھے اور جو بچ گئے تھے وہ بھی مرنے ہی والے تھے۔ کپتان ہاشم اور جرنیل جمشید تو پہلے ہی کام آ چکے تھے۔

میں نے پلٹ کر ساحر کی طرف دیکھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ شاید وہ نیچے اُتر گیا تھا۔ اس دوران شبستانی فوجی دکانوں کی طرف بڑھنے لگے۔ اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ میں بھی زمین دوز حصے میں اُتر جاؤں۔

... اور میں بھی نیچے اُتر گیا۔

*

مَیں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ زمین دوز حصہ اتنا گہرا ہوگا۔ وہ غلاظت اور گندے پانی سے لبریز تھا میرے لیے گندے پانی سے سر باہر رکھنا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ پانی کا ریلا بھی خاصا طاقتور تھا اس لیے میرے پاؤں بھی نہیں جم رہے تھے۔ اُوپر سے سخت اندھیرا تھا۔ مجھے اُبکائیاں آنے لگیں اور پھر مَیں قے نہ روک سکا جس نے میری آنتیں تک اُلٹ کر رکھ دیں۔ اب مَیں واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔ مَیں نے اپنے آپ کو زمین دوز گندے پانی کے ریلے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

مَیں تقریباً ایک گھنٹے تک اس غلاظت میں آگے بڑھتا رہا۔ راستے میں نہ جانے کتنے موڑ آئے اور مَیں نہ جانے کتنی لاشوں سے بھی ٹکرایا... مگر مجھے کہیں بھی موکھا نظر نہ آیا۔ کہیں کہیں مجھے اُوپر سے گھوڑوں کی ٹاپوں اور لوگوں کی آہ و بکا کی آوازیں البتہ سُنائی دے جاتی تھیں۔ یُوں لگتا تھا جیسے شبستانی سپاہ نے شہریوں کا قتلِ عام شروع کر دیا ہو۔

مَیں جانتا تھا کہ اگر مَیں بچ گیا اور کمپیوٹر نے مجھے اپنی دُنیا اور اپنے دَور میں منتقل کر دیا تو ڈاکٹر فریدوں میرے حافظے سے یہاں کی ہر یاد اور ہر بات ٹیپ کر کے سُنے گا اور بار بار سُنے گا۔ ۔ مگر اس کے باوجود مَیں اُسے کوسنے سے باز نہ رہ سکا جس نے مجھے اس جلتے ہُوئے اور مرتے ہُوئے شہر کی غلاظت میں پھنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔

خُدا خُدا کر کے مَیں ایک ایسی جگہ جا پہنچا جہاں نسبتاً چھوٹی نالی سے صاف پانی بڑے زمین دوز حصّے میں گر رہا تھا شاید اس چھوٹی نالی کا رابطہ سمندر یا دریا سے تھا اور یہ پانی وہیں سے آ رہا تھا۔

مَیں جلدی سے اس صاف پانی کی نالی میں داخل ہوگیا۔ جس کا دھارا زیادہ تیز نہیں تھا اور مَیں اُس کی مخالف سمت میں بھی جا سکتا تھا۔ اس طرح اگرچہ مجھے سر جُھکا کر چلنا پڑ رہا تھا مگر میرے تن اور کپڑوں پر لگی غلاظت صاف ہوگئی۔

کچھ دُور جانے کے بعد مجھے اُوپر سے روشنی کی ایک لکیر آتی دکھائی دی تو میری جان میں جان آئی۔ مَیں وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ روشنی ڈھکنے والی سِل کی درز سے آ رہی ہے۔ مَیں نے نیچے سے زور لگا کر وہ سِل ہٹا دی۔ اگر اس سِل کے عین نیچے ایک چبوترہ سا نہ بنا ہوتا تو شاید مَیں اُسے ہرگز نہ ہٹا پاتا۔ مَیں نے دونوں ہاتھ بالائی حصّے کے کناروں پر رکھ کر زور لگایا اور سر اُونچا کیا تو پتہ چلا کہ مَیں ایک خلا میں ہُوں اور زمین دوز حصّے کا یہ ڈھکنا یا راستہ کسی چوراہے، سڑک یا گلی میں نہیں کھلا تھا بلکہ ایک بہت بڑے مجسّمے کے تلوے میں کھلا تھا اور یہ خلا اسی مجسّمے کی کھوکھلی ٹانگ کا تھا مگر مجسّمے کے ساتھ ایک سلاخ دار چھوٹی سی کھڑکی بنی ہُوئی تھی۔ مَیں نے بہ مشکل تمام اپنا بایاں بازو اس کھڑکی کی سلاخوں میں اٹکا لیا اور سر نکال کر اُوپر دیکھا تو حیرت سے گُنگ ہو گیا۔

یہ مجسّمہ مُونا کا تھا اور کم از کم دو سو فٹ اُونچا تھا۔

اس وقت باہر چاندنی چِٹکی ہُوئی تھی اور میرے لیے یہ پہچاننا مُشکل نہیں تھا کہ مجسّمہ خالص سونے کا بنا ہُوا ہے۔

اُف خداوند... اتنا سونا!... نہ جانے اس مجسّمے کی تعمیر میں کتنا سونا صرف ہُوا ہوگا جب کہ ہمارے دَور اور دُنیا میں سونا تولوں میں بِکتا ہے۔ اگر اتنا سونا ہمارے مُلک کے پاس آ جائے تو وہ دُنیا کا امیر ترین مُلک شمار ہونے لگے ... پھر مجھے خیال آیا کہ اس وقت سوال یہ سونا منتقل کرنے کا نہیں بلکہ یہاں سے نکلنے اور زندہ رہنے کا ہے۔

اُوپر سے نکلنے کا راستہ نہ پا کر مَیں نیچے اُترنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک مجھے زمین دوز حصّے میں کچھ لوگوں کے چلنے اور باتیں کرنے کی آوازیں سُنائی دیں۔ مَیں اپنے بائیں بازو کے سہارے کھڑکی کی سلاخوں سے لٹکا رہ گیا اور جھانک کر نیچے دیکھنے لگا۔

وہ تعداد میں دو تھے، اُنھوں نے سیاہ لبادے اوڑھ رکھے تھے اور سونے کے ایسے خود پہنے ہُوئے تھے جنھوں نے اُن کے سر ہی نہیں بلکہ چہرے بھی چُھپا رکھے تھے۔ دیکھنے کے لیے آنکھوں اور سانس لینے یا بات کرنے کے لیے نقاب نُما خودوں میں تین تین سوراخ بنے ہُوئے تھے۔ مَیں نے دل ہی دل میں دُعا مانگی کہ خدا کرے یہ لوگ مجھے دیکھ نہ پائیں ورنہ کہیں کوئی اور مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔ مَیں نہیں چاہتا تھا کہ وہ دُوسروں کو بُلا کر میری ناکہ بندی کر دیں۔ دُوسرے مَیں یہ جاننے کا بھی متمنّی تھا کہ وہ کون لوگ ہیں اور نیچے کیا کر رہے ہیں۔ اگر وہ اس جلتے اور مرتے ہُوئے شہر سے فرار ہو رہے ہیں تو پھر مَیں بھی اُن کے پیچھے پیچھے جا کر ساحل تک پہنچ سکتا تھا اس لیے بازو میں تکلیف ہونے کے باوجود مَیں کھڑکی سے لٹکا رہا اور اُنھیں دیکھتا رہا۔

وہ دونوں سِل کے نیچے، چبوترے پر بیٹھ کر دم لینے اور باتیں کرنے لگے۔

"یہ تو مَیں سمجھتا ہُوں کہ زندہ مُونا ہمیں طراق کے حوالے کر دینی چاہیے کیونکہ وہ فاتح ہے... لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ مُونا کا چہرہ جُھلسا کر اُس کی صُورت کیوں مسخ کی جائے؟ یہ مَیں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ مَیں بُزدل ہُوں اور کسی پر تشدد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ نہیں... تم تو جانتے ہو کہ مَیں خُود لوگوں پر کتنا تشدد کرتا ہُوں مگر مونا کی صُورت مسخ کرنے والی بات مجھے فضول معلوم ہوتی ہے۔" ایک بولا۔

"تو تم بھی جانتے ہو کہ طراق نے ہم پُجاریوں کو ہر قسم کے ظلم اور سزا [illegible]ری قرار دیا ہے... یا یہ بھی نہیں جانتے؟" دُوسرا بولا۔ وہ ایک [illegible]ستہ قد آدمی تھا۔

"جانتا ہُوں ٹالپ۔" پہلے نے جواب دیا جو دُوسرے کی بہ نسبت [illegible]راز قد اور دُبلا تھا۔ "اور یہ بھی مانتا ہُوں کہ اُس نے ہمیں تمھاری بدولت [illegible]اف کیا ہے۔ اگر ہم اُس سے نہ ملتے تو شاید وہ ہم پُجاریوں کو بھی نہ [illegible]شا... مگر اس بات کا لُوتھان کے عوام پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔ جب [illegible]لات معمول پر آ جائیں گے تو وہ سوچیں گے کہ ساری مُصیبتیں اُنھوں [illegible]نے برداشت کی ہیں اور ہم کاہن مزے اُڑاتے رہے ہیں۔ عوام احمق ہوتے [illegible]ں وہ بھُول جاتے ہیں کہ ہم پُجاری اور کاہن ہی اسرار کے محافظ ہوتے ہیں۔"

ٹالپ نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "تم تو عوام سے دُگنے بلکہ چار گُنا [illegible]وہ احمق ہو راغو۔ میری بات غور سے سُنو مَیں اسے دُہراؤں گا نہیں۔ [illegible]ہم پُجاری لُوتھان کے مذہبی رہنما ہیں۔ ہم، ہاں کرتا دھرتا ہیں۔ [illegible]م زندہ مُونا دیوی کے لیے لڑکی کا انتخاب کرتے ہیں۔ ہم اُسے تربیت [illegible]تے ہیں، ہم اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور ہم ہی وقت آنے پر اُسے ٹھکانے [illegible]ں لگا دیتے ہیں۔ ہم قانون بناتے اور اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں مگر [illegible]ن ساری باتوں کے باوجود ہم فانی انسان ہیں راغو۔ ہم پر بھی تشدد [illegible]کیا جا سکتا ہے، ہم موت کے گھاٹ بھی اُتارے جا سکتے ہیں اور ہم [illegible]ب لوگوں کی طرح ذلت کی زندگی گزارنے پر بھی مجبور ہو سکتے ہیں۔ [illegible]ق ہمارے ساتھ یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ احمق نہیں ہے۔ وہ [illegible]تھان پر حکمرانی کے لیے ہمیں استعمال کرنا چاہتا ہے اور ہم بھی یہی چاہتے [illegible]ں کہ وہ ہمیں استعمال کرے اور کسی حد تک ہمارا محتاج رہے۔ اُس نے [illegible]ں صرف آٹھ گھنٹوں کی مہلت دی ہے۔ ان آٹھ گھنٹوں کے اندر اندر [illegible]ں سارے معاملات طے کر کے اُس کا ہاتھ بٹانا ہے، اُس کے ہر حکم [illegible]کی تعمیل کرنی ہے۔ ورنہ وہ ہمارے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا جو [illegible]سرے لوگوں سے کر رہا ہے۔ اب ذرا سوچو کہ تم نے ایک پُجاری کی [illegible]ت سے ہمیشہ عیش و آرام کی زندگی بسر کی ہے۔ ہاتھ پاؤں ہلائے [illegible]تمھیں زندگی کی ساری آسائشیں میسّر رہی ہیں؟ یا تمھیں کوئی کام [illegible]وئی ہُنر آتا ہے؟ نہیں... تم بھیک مانگنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔"

پستہ قد ٹالپ کی اس تقریر پر پُجاری راغو اثبات میں سر [illegible]ارہا۔

کھڑکی سے لٹکے لٹکے میرا بُرا حال ہوگیا تھا۔

"یہ سب تو تم ٹھیک ہی کہتے ہو ٹالپ۔ مجھے لڑکی پر تشدد کرنے [illegible]کوئی اعتراض نہیں... مگر اُس کی وجہ جاننا چاہتا ہُوں۔ مجھے معلوم [illegible]کہ ہمیں اُس کا چہرہ بگاڑنے سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"کیا تم نے کبھی زندہ مُونا کے ساتھ وقت گزارا ہے؟" ٹالپ نے پُوچھا۔

"نہیں... مَیں نے یہ معاملہ اُس وقت کے لیے ملتوی کر رکھا تھا جب تک نئی پُجارنیں ختم نہ ہو جائیں۔"

"بس تو پھر تم نہیں جانتے کہ مُونا کیسی عورت ہے۔" ٹالپ بولا۔ "چونکہ ہمیں مُونا کو طراق کے حوالے کرنا ہے اس لیے وہ پہلے تو اُس کے حُسن کا اسیر ہو جائے گا اور پھر تجربہ اُسے بتا دے گا کہ مُونا کتنی مختلف ہے۔ تب وہ طراق کے دل پر ہی نہیں بلکہ دماغ پر بھی چھا جائے گی اور تم جانتے ہی ہو کہ مُونا، دل میں ہم کاہنوں اور پُجاریوں سے کتنی نفرت کرتی ہے۔ وہ طراق کو بھڑکا کر ہمیں زندہ درگور کروا دے گی۔ اس لیے مَیں چاہتا ہُوں کہ اُس کا چہرہ مسخ کر دیا جائے تاکہ اُس کی مکروہ صُورت دیکھ کر طراق اُسے قتل کروا دے... پھر اُس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ نئی زندہ مُونا کا انتخاب ہم طراق سے کروائیں گے اور یہ بلاواسطہ خوشامد ہوگی جس کا اُسے اندازہ بھی نہیں ہو پائے گا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بڑے عقل مند اور چالاک ہو ٹالپ لیکن طراق نے اگر پُوچھ لیا کہ مُونا کا چہرہ کیوں مسخ کیا گیا ہے اور کس نے کیا ہے تو ہم کیا جواب دیں گے؟"

اس پر ٹالپ نے پھر قہقہہ لگایا اور بولا: "ہم مُونا کے خلاف یہ الزام لگائیں گے کہ اُس نے طراق کے خلاف اپنے عسکری کمان داروں کا اجلاس طلب کیا تھا اور اُس کی مزاحمت کی تھی۔ وہ خود بھی اس الزام سے انکار نہیں کر سکے گی۔ اس طرح طراق ہم سے بازپُرس کرنے کی بجائے ہمیں اپنا وفادار سمجھنے لگے گا۔"

"مَیں تمھاری دُور اندیشی کی داد دیتا ہُوں۔" راغو نے جواب دیا

اور اُس کا شانہ تھپ تھپایا۔

مجھے اپنے بائیں شانے میں درد کی ٹیسیں زیادہ شدت سے محسوس ہونے لگیں۔ میرا جی چاہا کہ میں کودتے ہوئے پہلے ثالپ کا کام تمام کر دوں اور پھر راغو کی گردن اُڑا دوں۔

اچانک ثالپ اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "آؤ چلیں۔ وہ لوگ میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔"

جب وہ منحوس کُتے چلے گئے اور اُن کی کائیں کائیں ختم ہو گئی تو میں نیچے اُتر آیا۔ میرا بایاں بازو اور شانہ شل ہو گیا تھا میں اُسے سہلاتا رہا اور سوچتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہ میری مردانگی کے خلاف تھا کہ وہ میرے سامنے ایک مجبور اور کمزور لڑکی کا چہرہ جھلسانے کے منصوبے بناتے رہیں اور میں اس بے بس لڑکی کی کوئی مدد نہ کر سکوں۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اُسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا اور اگر اس کوشش میں کامیاب رہا تو وہ میری ممنونِ احسان ہو گی اور ہو سکتا ہے اِس زندہ مُونا یا اُس کے دوست میرے کام آ سکیں... یا اگر کام نہ آ سکیں تب بھی ایک بے بس لڑکی کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔

یہ سوچ کر میں خاموشی سے اُن پجاریوں کا پیچھا کرنے لگا۔

دونوں پجاری اُس زیرِ زمین راستے سے ایک اور راستے میں مُڑ گئے۔ جب میں اُن کے پیچھے مُڑا تو پتہ چلا کہ وہ ایک آبی سُرنگ تھی اور اُس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مشعلیں جل رہی تھیں۔ میں نے کافی فاصلہ رکھ کر پجاریوں کا تعاقب جاری رکھا۔

وہ متعدد زمین دوز راستوں سے گزرتے ہوئے ایک طویل و عریض تہ خانے میں جا پہنچے جہاں بہت سی مشعلیں جل رہی تھیں اور زندہ مونا سے پہلے کی دیویوں کے بہت سے مجسّمے بھی رکھے ہوئے تھے۔

میں اُن مجسّموں کے پیچھے چھُپ کر دیکھنے لگا:

یہ تہ خانہ ایک بہت بڑے ہال کے برابر تھا جس کے بیچوں بیچ سونے کا ایک مرصّع تخت رکھا تھا اور اُس پر زندہ مُونا اس عالم میں براجمان تھی کہ اُس کے نازک ہاتھ پاؤں اور کمر میں طلائی زنجیریں ڈال دی گئی تھیں۔ وہ بے پناہ پُرکشش اور حسین تھی لیکن اُس کی ساحر آنکھوں میں خوف و دہشت کی بجائے غم و غصّے کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

اُس وقت تقریباً ایک درجن سیاہ پوش پجاری سونے کے نقاب نُما خود پہنے مُونا کے اردگرد یُوں کھڑے تھے جیسے گدھ دم توڑنے والے کسی جانور کے آس پاس اُس کی موت کے منتظر رہتے ہیں۔ ثالپ اور راغو وہاں پہنچے تو تمام گرگس آپس میں کانا پھُوسی کرنے لگے۔

میں ماضی کی مُونا دیویوں کے مجسّموں کے درمیان لیٹ کر ہوا آگے بڑھنے لگا۔ بظاہر سارے پجاری مسلّح نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اُن کے ڈھیلے ڈھالے سیاہ لبادوں میں کیا کچھ چھُپا تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا۔

فی الوقت زندہ مُونا بھی فوری خطرے سے ہمکنار نظر نہیں آتی تھی۔ ثالپ کی باتوں اور موجودہ ماحول سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اُس پر جرح کی جائے گی اور پھر اُسے مجرم ٹھہرا کر سزا کا اعلان کیا جائے گا اس کے بعد سزا پر عمل کرنے کی باری آئے گی۔

میں نے جائزہ لیا تو وہ جگہ مجھے اپنے ہاں کی فلموں میں دکھائے جانے والے عقوبت خانوں کی مانند نظر آئی۔ وہاں ... کے لیے رسّیاں اور چرخیاں تک موجود تھیں، کوڑے اور کیلوں وال... بھی تھا۔ ایک طرف بہت بڑی انگیٹھی رکھی تھی جس میں کوئلے دہک رہے تھے، دو سلاخیں اُس کے قریب ہی رکھی ہوئی تھیں مگر ... کی بجائے لوہے کا ایک بہت بڑا خود انگاروں پر تپ رہا تھا۔ شاید تھوڑی دیر قبل ہی وہاں رکھا گیا ہو گا کیونکہ اب وہ سُرخ ہونا شروع ہو گیا تھا۔

یہ انگیٹھی اور خود دیکھ کر میرا خون کھول اُٹھا۔

ایک پجاری نے انگیٹھی کے قریب آ کر پنکھا جھلتے ہوئے تیزی کی تو مُونا یہ دیکھ کر لرز گئی۔ وہ لوگ یہ خود اُس مجسّمۂ حسن کے سر پر رکھ کر بال جلانے کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی مسخ کرنا چاہتے تھے تو وہ پھُول سی نازک لڑکی اتنی کڑی سزا کے بعد زندہ ہی نہ رہ سکتی تھی اور اگر بچ بھی جاتی تو اُسے دیکھ کر آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

زندہ مُونا کی آنکھوں میں خوف و دہشت کے سائے لہرانے لگے اور میری رگوں میں خون کی بجائے چنگاریاں سی دوڑنے لگیں۔

جب مجھ پر اس قسم کا جنون طاری ہوتا ہے تو میں نہ ... کی پروا کرتا ہوں اور نہ ہی اپنی جان کی... اور اب مجھ پر وہی جنون طاری ہو رہا تھا۔ اتنے میں ثالپ نے اپنے لبادے سے ایک خریطہ نکالا اور تخت کے سامنے کھڑا ہو کر پڑھنے لگا... لیکن اُس کی نگاہیں دستاویز کی بجائے لڑکی کے حسین سراپا پر مرکوز تھیں اور وہ یُوں بولے جا رہا تھا جیسے خریطے کا مضمون اُسے زبانی یاد ہو۔

تمام سیاہ پوش پجاری سر جھُکائے کھڑے تھے۔

"اب تم مُونا دیوی کا اوتار نہیں رہی ہو۔ اب تم زندہ مُونا نہیں ہو۔ اب تم ایک عام سی لڑکی ہو جسے یہاں اُسکے جرائم کی فہرست سُنانے کے لیے لایا گیا ہے۔ ان جرائم سے انکار بھی تمھیں اُس سزا سے نہیں بچا سکے گا جو تمھارا مقدر بن چکی ہے۔" اتنا کہہ کر ثالپ دم لینے کو رُک گیا۔

میں نے سوچا، اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ لڑکی اپنے دفاع میں کچھ بھی نہیں بول سکتی۔

ثالپ پھر بولنے لگا۔

"تم پر یہ جُرم ثابت ہو چکا ہے کہ جب طراق نے بوتھان کے ساتھ اس شہر پر صُلح کرنا چاہی کہ بوتھانی رعایا پر چڑھائی کے لیے شبستانیوں کا ساتھ دیں تو تم نے محض دکھاوے کے لیے ہم کاہنوں اور عسکری عہدے داروں کا اجلاس طلب کیا مگر ہم پر اپنی مرضی مسلط کرتے ہوئے بہادر طراق کی وہ فیاضانہ پیش کش ٹھکرا دی۔ تمھاری وجہ سے بوتھان کا شہر ملبے کا ڈھیر بن گیا ہے، سپاہ برباد ہو گئی ہے اور لاتعداد شہری موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے ہیں۔ تم ان جرائم سے منکر نہیں ہو سکتیں اے نادان عورت!"

مُونا نے اس سے مرعُوب ہوئے بغیر گمبھیر لہجے میں کہا۔ "مجھے اجلاس بلانے کی کوئی دستاویز نہیں دکھائی گئی تھی، پجاریو!"

"زبان سنبھال کر بات کرو عورت۔ ورنہ تمھارا چہرہ مسخ کرنے سے پہلے تمھاری زبان کاٹ دی جائے گی!" ثالپ مکروہ آواز میں ... "ہم کاہنوں کا ادب ملحوظِ خاطر رکھو کہ اب تم دیوی نہیں رہی ہو۔"

"دوغلے پجاری کسی احترام کے مستحق نہیں ہوتے۔ میں بزدل ... کی فرزندوں کی تکریم نہیں کر سکتی۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ موت کا خوف مجھے خاموش کر دے گا تو یہ تمھاری بھُول ہے۔ اگر میرے پاس ہزار زندگیاں بھی ہوتیں تو میں اپنی ہر زندگی وطن کے دفاع کے لیے قربان کر دیتی مگر تمھاری طرح چاپلوس غلام ہرگز نہ بنتی۔"

"بکواس بند کر، عورت!" ثالپ دھاڑا۔ "میں تم سب کو یاد دلانا چاہتا ہُوں کہ زندہ مُونا دیوی کی غیر موجودگی میں میں ہی اُس کے تمام اختیارات کا مالک ہُوں۔ ہر وہ آواز، وہ لفظ اور وہ بات جو کسی زبان پر آتا ہے، وہ اُس آدمی کے ذہن اور دل کا ترجمان ہوتا ہے۔ میری یادداشت بہت عُمدہ ہے۔ ماضی کی ہر بات میری لوحِ ذہن پر محفوظ ہے، اس لیے..." اتنا کہہ کر اُس نے انگیٹھی اور خود کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ مت بھُولو کہ یہ خود صرف اس عورت کے لیے ہی نہیں کسی اور کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔"

اگرچہ مُونا کی آنکھوں میں دہشت کے سائے تھے... مگر اُس نے ہنستے ہوئے ثالپ سے پوچھا۔ "کیا تمھیں اپنے ان گرگوں سے بھی ڈر ہے ثالپ جو حرام کی کھاتے اور عیش کرنے کے لیے پالتو کتّوں کی طرح ہمیشہ تمھارے آگے دُم ہلاتے رہتے ہیں۔ جہاں تک اقتدار کا تعلق ہے تو وہ ہمیشہ تمھیں حاصل رہا ہے۔ مُونا... ہر زندہ مُونا دیوی تو ایک مہرے سے زیادہ نہیں رہی۔ ہر زندہ مُونا تمھارے اشاروں پر ناچتی رہی ہے۔ وہ عوام کے لیے قابلِ پرستش ہوتی ہے... مگر تم اُسے ایک قالین کی طرح اپنے گندے قدموں اور ناپاک وجود سے روندتے رہے ہو۔ نہ جانے تم نے مجھ سے کتنے جنگجو لوگوں کا ساتھی بنایا اور مجھے اپنے جسم و رُوح کی بھینٹ چڑھانے پر مجبور کیا۔ جب بھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ تمھارے مکروہ ہاتھ میرے سراپا سے..."

"چُپ ہو جا بدبخت!" ثالپ گرجا۔ "تم جتنی بکواس کر سکتی تھیں کر چکیں۔ اب اس خریطے پر دستخط کر دو!"

"جب تم نے پہلے سے مجھے مجرم قرار دے دیا ہے اور سزا بھی تجویز کر چکے ہو تو میرے دستخطوں کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟" مُونا بولی۔ "تم میرے دستخط صرف اس لیے چاہتے ہو کہ اسے میرے اعتراف نامے کے طور پر طراق کو پیش کر سکو!"

"اے بدزبان عورت! تم ان الفاظ سے کاہنِ اعظم کے خلاف گستاخی کی مرتکب ہو رہی ہو۔ یہ میری نہیں بلکہ مذہب کی حکم عدُولی کے مترادف ہے۔ کیا تم نے اجلاس بلا کر یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ بوتھان کے لوگ دمِ آخر تک شبستانیوں کے خلاف لڑیں گے؟ کیا تم نے یہ فیصلہ کر کے طراقِ اعظم کی فیاضانہ پیش کش نہیں ٹھکرائی تھی؟"

"ہاں۔ میں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کیا تھا۔ موت کو طوقِ غلامی پر ترجیح دی تھی۔ میں بوتھانیوں کو شبستانیوں کا غلام بنانا نہیں چاہتی تھی۔ اگر ہمارے اپنے ہی ہم سے غدّاری کرتے ہوئے زمین دوز راستے اُن پر نہ کھولتے اور اُن کی رہبری نہ کرتے تو وہ ہم پر ہرگز ہرگز غالب نہیں آ سکتے تھے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ ہمارے ہاں کچھ ایسے وطن فروش بھی موجود ہیں جو دشمنوں کی خوشنودی اور ذاتی مفاد پر قوم و ملک سے غدّاری کر سکتے ہیں۔"

مُونا کی آواز میں اتنا جوش و جذبہ تھا کہ پجاری خاموش کھڑے اُس کا مُنہ تکتے رہ گئے۔

www.pdfbooksfree.pk

اچانک راغو اچھل کر انگیٹھی کے قریب گیا اور چمٹا اُٹھا کر انگاروں کی طرح سُرخ ہو جانے والا خود کھٹ کھٹانے لگا۔

مُونا نے ایک بار خود کی طرف دیکھا پھر ثالپ پر نگاہیں گاڑتے ہُوئے بولی۔ "رات بھر تم کہاں رہے ہو ثالپ؟"

اُس کے اس سوال پر کچھ پُجاریوں کے مُنہ سے سسکاری نکل گئی... مگر یہ پتہ نہ چل سکا کہ سسکاری کس کس نے لی تھی کیونکہ اُن کے چہرے خودوں سے چھپے ہُوئے تھے۔

مُونا کی پُرجوش باتوں نے میرے اندر بھی جوش و خروش پیدا کر دیا تھا اور میں اپنی جگہ حملہ کرنے کے لیے تیار تھا۔

ثالپ نے خریطہ اور قلم دوات مُونا کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا۔

"اب تم دستخط کرتی ہو یا تمھاری طرف سے میں خود ہی دستخط کر دوں؟"

"نہیں... میرے اعتراف کا مطلب قوم کے لیے طوقِ غلامی ہوگا۔"

مُونا نے صاف انکار کر دیا۔

"دیکھو۔ اگر تم دستخط کر دو تو میں تمھیں ایسی دوا پلا دُوں گا جس سے تم بے ہوش ہو جاؤ گی اور تمھیں اُس کرب کا احساس نہیں ہوگا جو بصورتِ دیگر یہ خود پہنانے سے ہوگا۔"

مُونا نے ثالپ کے چہرے پر تھوک دیا۔

"نہیں نہیں نہیں۔" وہ چیخ کر بولی۔

ثالپ نے فرطِ غضب سے اُسے ایک طمانچہ مارا اور پُجاریوں سے بولا۔ "تم سب گواہ ہو کہ اُس نے اپنے جُرم کا اعتراف کر لیا ہے۔ اسی نے شبستانیوں پر شہر کے دروازے کھولے تھے۔"

مُونا یُوں اُٹھی جیسے زنجیریں تُڑا کر ثالپ کی گردن میں اپنے خوبصورت دانت گاڑ دے گی مگر زنجیروں نے اُسے بے بس کر رکھا تھا۔

"تم اپنے جرائم مجھ سے منسوب کر رہے ہو غدارِ وطن۔" وہ غرّا کر بولی۔

ثالپ اُسے کوئی جواب دینے کی بجائے ایک پُجاری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"خود لے آؤ تاکہ آگ اس کا چہرہ مسخ کر کے اس کے گناہوں کو راکھ کر دے۔"

ایک پُجاری نے دو چمٹوں کی مدد سے وہ لال انگارہ خود اُٹھا لیا۔ دو پُجاریوں نے مُونا کی گردن میں پٹا ڈال کر اُس کا سر دیوار سے ٹکا دیا تاکہ وہ حرکت نہ کر سکے۔

مُونا بے بس ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے خود کی طرف دیکھنے لگی جو قدم قدم اُس کے قریب لایا جا رہا تھا۔

وہ وقت آ گیا تھا جب مجھے اس مجبور و بے بس لڑکی کو خونخوار گِدھوں سے بچانے کے لیے میدان میں کُود جانا چاہیے تھا۔

میں بڑی آہستگی سے اُٹھا۔ تلوار کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کی اور پُجاریوں کی تعداد گننے لگا۔

وہ تعداد میں چودہ تھے۔

جب مجھ پر کچھ کر گزرنے کا جنُون طاری ہوتا ہے تو مجھے تعداد یا اسلحہ خوفزدہ نہیں کر سکتا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ میری آمد سے وہ پہلے بوکھلا اُٹھیں گے اور بوکھلاہٹ کا یہ وقفہ کئی کی موت بن جائے گا۔

خود والا پُجاری اب مُونا کے مقابل پہنچ چکا تھا۔

وہ ثالپ کے اشارے کا منتظر تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی اشارہ کرتا، میں نے ایک خوفناک نعرہ لگایا اور اچھل کر سب کی نگاہیں مجھ پر مرتکز ہو گئیں۔ بھیگنے کے باعث اُس حلیہ یقیناً بڑا خوفناک ہو رہا تھا۔ میں نے کسی جن کی طرح قہقہہ پھر تلوار لہرانے لگا۔

"مُونا... اے عظیم دیوی! میں تمھاری حفاظت کے مُونا کو کوئی نہیں مار سکتا۔ اُسے کوئی سزا نہیں دے سکتا۔ یہ رہے گی۔" میں نے کہا۔

میری شکل و صُورت اور اداکاری دیکھ کر تین پُجاری ہو گئے اور فرش پر گر پڑے۔ ثالپ نے ایک ہاتھ راغو کی ڈال کر اُسے اپنی ڈھال بنا لیا اور دُوسرے ہاتھ سے خنجر گردن پر رکھ دیا۔

"تم جو کوئی بھی ہو، پیچھے ہٹ جاؤ۔" وہ مجھ سے بولا۔ مُونا کی شہہ رگ کاٹ ڈالوں گا۔ چاہے میں خود مر جاؤں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

میں وہیں رُک گیا۔

"آگے بڑھو اور اُسے قتل کر دو۔ میری پروا نہ کرو۔ مُونا دیوی کا حُکم ہے۔ اس خبیث کو مار ڈالو۔" مُونا تڑپ

... لیکن میں مُونا کی موت نہیں چاہتا تھا۔ میں ایک طرح سے یرغمال بنانے کی سوچ رہا تھا۔ میں نے تلـ اور ثالپ کی طرف دیکھنے لگا۔

یکایک وہ تمام پُجاری بھاگ نکلے جو بے ہوش نہ اُس پُجاری نے خود وہیں پھینک دیا... جو اُسے اُٹھا خود لڑھکتا ہُوا میرے قریب آ گرا....

"میں جانتا ہوں کہ تمھارے ساتھی اپنے مددگار گئے ہیں... اور یہ مددگار پُجاری نہیں بلکہ سپاہی ہو

کے سپاہی... مگر میں اُن سے نہیں ڈرتا۔" یہ کہنے کے ساتھ میں آہستہ آہستہ اپنی تلوار کی نوک بھی خود کی طرف کھسکا رہا تھا۔

عین اُسی وقت میرے پیچھے گرا ہُوا پُجاری ہوش میں آ کر کسمسایا تو میں نے پیچھے ہٹ کر اُس کے سر پر زوردار ٹھوکر لگائی۔ وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا اور میں اپنی جگہ لوٹ آیا۔ بظاہر میں نے پُجاری کو ٹھوکر مارنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا تھا مگر ثالپ نہیں جانتا تھا کہ اب میری تلوار کی نوک فرش پر اُس خود سے صرف چھ انچ دُور رہ گئی ہے۔

"تم اب تک مجھے نہیں پہچان سکے ثالپ! میں بتاتا ہُوں کہ میں کون ہُوں۔ میں طراق کا ایک کمان دار ہُوں اور اُس کا دستِ راست ہُوں۔ تم رات طراق سے ملے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارا ایک دستہ قریب ہی چھُپا ہُوا ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ لڑکی مجھے اپنے لیے چاہیے۔ طراق نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مُونا مجھے دے دی جائے گی۔ میں ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ مسخ شدہ چہرے والی مُونا میرے حصے میں آئے۔ ہاں میری رفاقت کے بعد تم اس کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہو، کرتے رہنا مگر اس وقت اسے میرے حوالے کر دو۔" یہ کہتے کہتے میں نے اپنی تلوار کی نوک خود تک کھسکا دی۔

"میرا خیال ہے تم جھُوٹے ہو اجنبی۔ اگر تم طراق کے دستِ راست اور کمان دار ہو تو بتاؤ کہ ڈھال پر "اوناغنتر" کے جو الفاظ کندہ ہیں ان کا کیا مطلب ہے؟"

"میں ایک جنگجو ضرور ہُوں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں نے مدرسے میں کبھی تعلیم حاصل نہیں کی۔ میرے دل میں کئی بار یہ خیال آیا کہ کسی عالم سے ان کا مطلب پُوچھوں۔ تم بھی تو ایک عالم ہو، کیا تم مجھے ان الفاظ کے معنی بتا سکتے ہو؟ یا تم بھی میری طرح جاہل ہو اور عالم کا روپ دھارے پھرتے ہو۔"

"نہیں...!" وہ بولا۔ "میں عالم ہُوں اور یہ الفاظ..."

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ میں نے خود تلوار کی نوک سے ثالپ کی طرف اُچھالتے ہُوئے مُونا سے کہا۔ "سر جھُکا لو مُونا!"

ثالپ نے اگرچہ راغو کو اپنی ڈھال بنا رکھا تھا مگر وہ لاشعوری طور پر پیچھے ہٹا، اُدھر مُونا جھُکی اور ایک طرف ہٹ گئی۔ خود دیوار سے ٹکرایا اور لڑھکتا ہُوا تخت سے نیچے گر گیا... مگر اس دوران میں میں ایک ہی جست میں دس قدم کا فاصلہ طے کر کے ثالپ کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

ثالپ نے راغو کو مجھ پر دھکیل دیا اور خود جان بچانے کے لیے بھاگا۔ راغو کے ٹکرانے سے گرتے گرتے بچا، سنبھلا اور پھر میں نے ثالپ کو مُونا پر خنجر پھینکنے کی مہلت نہیں دی۔

اُس نے میرا وار ہاتھوں پر روکا اور ڈھیر ہو گیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ راغو کا کیا حشر ہُوا ہے۔ وہ مُنہ کے بل گرا ہُوا تھا۔ میں سیدھا تخت کی طرف آیا اور مُونا کو زنجیروں سے آزاد کرنا چاہا... مگر زنجیروں کو تخت کے ساتھ لگے ہُوئے کنڈوں میں ڈال کر اُنھیں تالے لگا دیے گئے تھے۔ میں نے لپک کر انگیٹھی کے پاس رکھی ہُوئی سلاخیں اُٹھائیں اور تالوں کے کڑوں میں ڈال کر اُنھیں توڑنے کی کوشش کی... مگر وہ بے حد مضبُوط تھے۔

سلاخیں مُڑ گئیں۔

مجھے اپنے آپ پر غصّہ آنے لگا کیونکہ اب کہیں سے سپاہیوں کے قدموں کی چاپ سُنائی دینے لگی تھی۔

میں نے مُڑی ہُوئی سلاخیں مروڑ کر تالے توڑ دیے اور مُونا زنجیروں سے آزاد ہو گئی۔ وہ تعجب، نفرت اور غصّے سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"میری طرف یُوں کیا دیکھ رہی ہو؟ میں اس جگہ کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا کیونکہ میں اجنبی ہُوں۔ تمھیں میری رہبری کرنی ہے تاکہ ہم یہاں سے نکل سکیں۔"

... مگر وہ اُسی طرح کھڑی رہی۔

سپاہیوں کے قدموں کی چاپ اور قریب آ گئی تھی۔

"وقت ضائع مت کرو لڑکی۔ ورنہ ہم دونوں ہی مارے جائیں گے۔ مجھے راستہ دکھاؤ تاکہ ہم شہر سے نکل کر ساحل تک پہنچ سکیں۔ جلدی کرو۔ وہ آنے ہی والے ہیں۔"

"میں تمھیں راستہ دکھا سکتی ہُوں۔ وہاں میرے وفادار میری راہ دیکھ رہے ہوں گے... مگر پہلے وعدہ کرو کہ تم مجھے نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔"

"یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے لڑکی۔ مجھ پر اعتماد کرو۔ میں تمھارا دُشمن نہیں بلکہ دوست ہُوں۔"

"مگر میں تم پر کیسے یقین کر لُوں؟" وہ ضدی لہجے میں بولی۔

سپاہیوں کے قدموں کی چاپ قریب تر آ گئی تھی اور اب وہ کسی بھی لمحے اس جگہ داخل ہو سکتے تھے۔

مجھے غصّہ آ گیا۔

میں نے تلوار چپٹی کر کے اُس کی ٹانگ پر ہلکے سے مارتے ہُوئے کہا۔ "مجھے راستہ بتاؤ اور فالتو باتیں مت کرو۔ چلو!"

وہ میرے تیور دیکھ کر وہاں سے چل پڑی... مگر اُس کے تیور بھی اچھے نہیں تھے، اس لیے میں نے اُسے اُٹھا کر کندھے پر ڈال لیا اور یُوں ہم ایک سُرنگ میں داخل ہو گئے۔

وہ ایک مشعل کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بولی۔ "احتیاط سے قدم رکھنا۔ ایک موڑ کے بعد خُفیہ زینہ آئے گا۔"

اتنے میں مجھے پیچھے سے شور و غل سُنائی دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔

بہت سے سپاہی ہال میں داخل ہو رہے تھے۔

ہم اندھیرے میں تھے اس لیے میں اُنھیں بخُوبی دیکھ سکتا تھا۔ اُن کی ڈھالوں پر سانپ کی شبیہ کندہ تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ثالب سپاہیوں کی آمد پر اُٹھ کھڑا ہُوا تھا اور زخمی ہاتھوں سے سُرنگ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: "وہ اُدھر گئے ہیں۔ جو اُنھیں پکڑے گا اُسے سونے سے بھرا ہُوا ٹوکرا ملے گا۔"

میں یہ سُن کر دوڑنے لگا۔

مجھے خود پر افسوس ہو رہا تھا اور غصّہ بھی آ رہا تھا کہ میں نے اُس وقت ثالب کی گردن تن سے کیوں جُدا نہیں کر دی۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ وہ زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے گا... مگر وہ مردُود نہ صرف زندہ رہا تھا بلکہ اب ہمارے تعاقب میں آنے والے سپاہیوں کی رہنمائی بھی کر رہا تھا۔

جب ہم کچھ آگے نکل گئے تو مُونا نے سرگوشی میں کہا: "آگے راستہ دائیں جانب مُڑے گا۔ وہاں ایک مصنُوعی دیوار ہے جو بظاہر راستہ روک لیتی ہے، لیکن اُس کے بائیں طرف سے راستہ اندر جاتا ہے اور اُس کے آگے سیڑھیاں ہیں... مگر سیڑھیوں سے پہلے ایک گڑھا ہے۔ اُس سے ہوشیار رہنا۔"

میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔

مُونا کا بوجھ اب مجھے زیادہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

یہ ہمارے سفر کا چوتھا روز تھا۔

ہم دلدلی علاقے کے جنگل سے نکل کر ساحل کے قریب "نغمہ سرا" پہاڑیوں تک پہنچ گئے تھے اور یہاں پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ مُونا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اُس کے وفادار اُس کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ واقعی مُونا کے منتظر تھے... مگر اُس کی آمد سے مایُوس ہو چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ثالب اُس کے ساتھ کیا سلُوک کرنے والا ہے؟... مگر جب میں مُونا کو لیے اُن تک پہنچا تو اُن دل گرفتہ لوگوں کے مُنہ سے خوشی کی چیخیں نکل گئی تھیں اور وہ مجھے اپنے دیو ہیکل وجُود کی بنا پر ہی نہیں بلکہ اُن کی زندہ دیوی کو پُجاریوں کے چنگل سے چھُڑا لانے کے باعث عظیم سمجھنے لگے تھے۔

... مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مونا کے یہ وفادار نہ تو سپاہی تھے اور نہ ہی اہلِ حکُومت... یہ لوگ مُونا کے ذاتی خادموں اور داسیوں پر مشتمل تھے۔ ان میں اکثریت خواجہ سراؤں کی تھی۔ ان کے علاوہ بہت سی عورتیں، بچے، بوڑھے اور صرف چند ایک نوجوان تھے۔

میں ان ہزیمت خوردہ لوگوں سے کوئی کام نہیں لے سکتا تھا، جنگ لڑنا تو کُجا، اگر طراق کا ایک دستہ ہی ہمارے تعاقب میں آ جاتا تو یہ لوگ اُس کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے باوجُود میں اُن سب کا خود ساختہ کمان دار بن گیا اور دلدلی علاقے کے جنگل میں سانپوں اور دُوسرے جانوروں سے لڑتا بھڑتا اور اُنھیں فنا کرتا ہُوا "نغمہ سرا" پہاڑیوں تک لے آیا تھا۔

اپنے وفاداروں میں پہنچتے ہی مُونا کا رویّہ یکسر بدل گیا تھا۔ وہ اپنی داسیوں اور خواجہ سراؤں کے ہجوم میں گھری رہتی تھی۔ مجھ سے ملنے کتراتی تھی لیکن اگر کوئی کام لینا یا مشورہ دینا لینا ہوتا تو مجھے اپنے پاس بُلوا لیتی تھی۔ اُس کی ہر ادا اور لہجے میں تحکّم شامل ہو گیا تھا اور وہ مجھے بھی اپنے ان معتقدین میں شمار کرنے لگی تھی جو اُسے سچ مچ کی دیوی سمجھتے اور اُس کی پرستش کرتے تھے۔

یہ ساری باتیں مجھے اندر ہی اندر کھولا رہی تھیں اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔

"نغمہ سرا" پہاڑیاں ساحلِ سمندر پر واقع تھیں۔ ان کے ارد گرد دلدلی جھاڑیوں کا جنگل پھیلا ہُوا تھا جس میں زہریلے سانپوں کی بہتات تھی۔ یہاں تک پہنچتے ہُوئے ہمارے قافلے کے چار افراد سانپوں کے ڈسنے سے لقمۂ اجل بن گئے تھے۔

ہم نغمہ سرا پہاڑیوں پر اس اُمید میں آئے تھے کہ ہمیں جزیرۂ ردمو سے کمک مل جائے گی اور وہ لوگ ہماری مدد کو آ جائیں گے... مگر کافی دن گزرنے کے بعد بھی جب نہ تو کمک آئی اور نہ ہی کوئی پیغام مِلا تو مجھے وحشت ہونے لگی۔

طراق نے غالباً اس لیے ہمارا پیچھا نہیں کیا کہ وہ جانتا تھا کہ رسد ختم ہوتے ہی ہم سب ہلاک ہو جائیں گے یا مجبوراً خود ہی لوتھان واپس آ کر اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دیں گے۔ اس خیال کی تائید طراق کے اس بحری بیڑے سے بھی ہوتی تھی جو ساحل سے دُور بیچ سمندر گشت کیا کرتا تھا تاکہ جزیرۂ ردمو سے آنے والوں کو روکا جا سکے۔ اس بیڑے کے محافظوں کو اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ہم نغمہ سرا پہاڑیوں میں پناہ لے چکے ہیں ورنہ شاید وہ ساحل کے قریب آنے کی کوشش ضرور کرتے۔

ان پہاڑیوں کو نغمہ سرا پہاڑیاں اس لیے کہا جاتا تھا کہ مسلسل چلنے والی سمندر کی کھاری ہوا نے چٹانوں میں لاتعداد چھوٹے بڑے سوراخ کر دیے تھے اور جب ہوا اُن سوراخوں سے گزرتی تھی تو ہر طرف سیٹیاں گونجنے لگتی تھیں اور یُوں لگتا تھا جیسے چٹانیں کوئی الوہی گیت گا رہی ہوں۔ ہوا کی بدلتی رفتار کے ساتھ کبھی کبھی یہ سیٹیاں وحشی رُوحوں کے نغموں کا رُوپ بھی دھار لیتیں اور کبھی یُوں محسوس ہوتا جیسے کائنات ہماری بے بسی پر بین کر رہی ہو۔

مُونا کے وفاداروں میں کچھ بوڑھی جادوگرنیاں بھی تھیں جنھوں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ ان سیٹیوں سے اُنھیں غیب سے پیغام ملتے ہیں۔ مجھے اُن بے وقوف بوڑھیوں پر ہنسی آتی تھی اور رحم بھی آتا تھا مگر میں بیشتر وقت اِن بوڑھیوں یا بچوں کے ساتھ گزارا کرتا تھا۔ بچوں سے تو میں طرح طرح کے کھیل کھیلتا اور بوڑھیوں کی داستانوں سے مجھے لوتھانیوں اور شبستانیوں کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔

ان بوڑھیوں میں ایک جس کا نام کوری تھا، سب سے بڑی جادُوگرنی سمجھی جاتی تھی اور وہی لوگوں کو بتایا کرتی تھی کہ ابھی غیب سے کوئی پیغام نہیں مِلا ہے۔

مجھے خواجہ سراؤں یا داسیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جو ہر وقت مُونا کو اپنے گھیرے میں لیے رہتی تھیں۔ میں نے برگا نامی ایک نوخیز لڑکے کو اپنا نائب مقرر کر لیا تھا۔ وہ تلوار چلانے اور نیزہ بازی کے فن سے واقف تھا۔ اُس کی آنکھیں نیلی اور بال سنہرے تھے اور مُونا کی بہت سی داسیاں اُسے محبت کی نگاہ سے دیکھا کرتی تھیں... مگر وہ اُن کی طرف توجہ دینے کی بجائے میرے ساتھ رہنا، مجھ سے کچھ سیکھنا اور میری خدمت کرنا زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔

جب بہت دنوں تک نہ تو کمک آئی اور نہ ہی "غیب کا پیغام" مِلا تو میں بُری طرح جھنا گیا کیونکہ ہم جو سامان رسد لائے تھے وہ ختم ہونے والا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ابھی سے کسی طرح مچھلیوں کا شکار شروع کر دیا جائے لیکن نیزے کی نوک سے اتنی مچھلیاں شکار نہیں کی جا سکتی تھیں۔ ضرورت کے مُطابق مچھلیاں پکڑنے کے لیے مجھے ایک جال کی ضرورت تھی۔

کبھی کبھی تو میں سوچتا تھا کہ مجھے ان سب کو وہیں چھوڑ چھاڑ کر نکل جانا چاہیے۔ مجھ پر بوریت کے دورے پڑنے لگے تھے مگر کہیں جا بھی تو نہیں سکتا تھا۔ اس بوریت کے عالم میں میں تنہا بیٹھا گھنٹوں سوچتا اور دُعا مانگا کرتا کہ میرے سر میں درد ہی شروع ہو جائے۔ وہی درد جو اشارہ نُمائی کرتا تھا کہ کمپیوٹر میری تلاش میں ہے... لیکن ایسا لگتا تھا کہ اس بار ڈاکٹر فریڈل مجھے بھُول ہی گیا ہے۔

ایک روز میں ایک چٹان کے سائے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مجھے بوڑھی جادُوگرنی کوری آتی دکھائی دی۔ وہ گھنٹوں میرا دماغ چاٹا کرتی تھی اس لیے میں اُس سے کچھ چڑ سا گیا تھا۔

جب میں نے اُسے اپنی سمت آتے دیکھا تو برگا سے کہا: "اسے وہیں روک دو برگا۔ میرے پاس مت آنے دو۔ میں کچھ سوچنے میں معرُوف ہوں۔" برگا دوڑ کر بڑھیا کے پاس گیا... مگر اُلٹے قدموں واپس آ گیا اور بولا: "وہ کہتی ہے کہ اسے غیب سے پیغام مِل گیا ہے اور وہ پیغام تم تک پہنچانا ضروری ہے کیونکہ اُس کا تعلق تم سے ہے۔"

"اُسے کہو کہ وہ پیغام تمھیں دے دے اور تم مجھے بتا دینا۔"

برگا میرے تیور بھانپ کر چلا گیا اور اُس نے بڑھیا کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ "غیب کا پیغام" اُسے بتا دے۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور اُس نے وہ پیغام مجھے سُنایا جو بڑھیا نے نغمہ سرا چٹانوں سے وصُول کیا تھا۔

اُس پیغام کا مفہوم یہ تھا۔

"گاتی چٹانوں نے آج ایک نیا گیت گایا ہے اور ہوائیں غیب سے یہ پیغام لائی ہیں کہ وہ جسے بھیجا گیا تھا اور جو واپس نہیں آیا اُسے صحرا میں تلاش کرو جہاں ایک بہت بڑا مکان ہے اور اس مکان میں تمھارے لیے ایک پیغام ہے اور وہ مکان یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ جب تم اس مکان تک پہنچو گے تو تمھاری مصیبتیں اور مُشکلیں حل ہو جائیں گی۔"

میں نے برگا سے تین بار یہ پیغام سُنا مگر اُس کا مفہوم میری سمجھ میں نہ آ سکا۔

"مجھے اُس کا مطلب سمجھ میں نہیں آ سکا۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"سمجھا تو میں بھی نہیں لیکن اس میں معنے ضرور پوشیدہ ہوں گے کیونکہ یہ کوری نے وصُول کیا ہے اور کوری کبھی جھُوٹ نہیں بولتی۔ وہ مُونا دیوی کی سب سے بڑی جادُوگرنی ہے جو مستقبل بینی کرتی ہے اور یہ کام وہ اُس وقت سے کر رہی ہے جب لوتھان بڑا شہر نہیں بلکہ ایک بستی تھی۔ آپ مجھ سے بہت عقل مند ہیں۔ اُس کے پیغام میں خود ہی معنے تلاش کیجیے۔"

میں بھلا اس بے معنی سی بات کو کون سے معنے پہناتا؟

"جاؤ مُونا کو یہاں بُلا لاؤ۔ اُس سے کہنا کہ بہت ضرُوری کام ہے۔"

برگا گیا اور چند لمحے بعد تنہا ہی واپس آ گیا۔

"دیوی نے آپ کو سلام کہا ہے اور...!"

"میں نے تمھیں اُس کا سلام لانے کے لیے نہیں کہا تھا۔" میں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا: "میں نے اُسے بُلایا تھا۔"

"مگر دیوی کہتی ہے کہ وہ نہیں آ سکتی اور آپ اُسے آنے کا حکم بھی نہیں دے سکتے۔ حکم دینے کی مجاز وہ خود ہے اور کوئی نہیں۔ اگر آپ کو کسی اہم معاملے پر بات چیت کرنی ہے تو آپ خود اُس کے پاس آئیں۔"

میں یہ سُن کر کھَول کر رہ گیا۔

"وہ کیا کر رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"داسیوں سے سنگار کروا رہی ہے۔"

"تو جاؤ اور اُسے میرے ان الفاظ میں کہو کر فوراً میرے پاس آجاؤ۔ اگر تم نہیں آؤگی تو مجھے تمھارے پاس آنا پڑے گا اور تم میرے آنے کا مطلب خوب سمجھتی ہو۔"

برگا چلا گیا۔

میں ایک بار پھر بوڑھی جادوگرنی کے بے معنی الفاظ میں مفہوم تلاش کرنے لگا: وہ جو تمھارے پاس بھیجا گیا ہے اور جسے واپس نہیں بلایا گیا... میں نے سوچا کہ بڑھیا کی بات میں کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیے کیونکہ وہ خواہ مخواہ کی پیش گوئی کر کے اپنی شہرت کو داغدار نہیں کرے گی... یا ہو سکتا ہے کہ اُس نے رومو سے آنے والا کوئی جہاز دیکھ لیا ہو۔

میں نے سمندر کی جانب نگاہ ڈالی مگر اُس کا وسیع دامن اپنے اندر صرف نیلا پانی اور لہریں ہی رکھتا تھا۔ اُفق پر تو کیا اُفق کے اُس پار بھی کوئی کشتی یا کوئی جہاز نظر نہ آیا۔

اتنے میں مُونا میرے پاس آگئی۔

اُس کے ساتھ نہ تو داسیاں تھیں اور نہ ہی خواجہ سرا تھے البتہ برگا ضرور ساتھ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ مُونا واقعی ابھی ابھی سنگار کر کے آرہی ہو۔ وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی۔ اپنے مختصر لباس میں وہ یوں لگتی تھی جیسے کوزے میں دریا بند کر دیا گیا ہو۔ آج اُس کے چہرے پر نہ تو خوف و دہشت کے آثار تھے اور نہ ہی نیم باز آنکھوں میں کوئی اوبی کیفیت تھی۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی اور یہاں آگئیں۔"

وہ نچلا لب دانتوں تلے دبا کر عجیب نگاہوں سے مجھے گھورنے لگی۔

اس سے پہلے کہ وہ بولتی میں نے برگا سے کہا۔ "تم دیوی کے خواجہ سراؤں اور خُدام کو لے کر جنگل چلے جاؤ اور سُوکھی بیلیں کاٹ کر لے آؤ... مگر بیلیں زیادہ موٹی نہ ہوں۔ پھر دیوی کی داسیوں اور دُوسری عورتوں سے کہو کہ وہ اُن کا جال بُنیں تاکہ مچھلی شکار کی جا سکے۔ تم سارے کام کی نگرانی کرتے رہنا۔ جاؤ۔"

"نہیں۔ تم یہیں رُکو۔" مُونا نے اُسے حکم دیا پھر مجھ سے بولی۔ "میں چاہتی ہُوں کہ برگا یہیں موجود رہے کیونکہ ایک دیوی کو کسی اجنبی سے تنہائی میں نہیں ملنا چاہیے۔"

میں نے مُونا کو جواب دینے کی بجائے برگا سے کہا۔ "تم وہی کرو جو میں نے تم سے کہا ہے۔"

وہ میرے لہجے کی درشتی کا اندازہ کرتے ہُوئے فوراً وہاں سے چلا گیا۔

مُونا نے خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"تم نے مجھے بلایا اور میں اُصول کی خلاف ورزی کرتے ہُوئے آگئی ہُوں۔ بولو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"میں تم سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہُوں مُونا!" میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہُوئے کہا۔ "اُن میں پہلی اور سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تمھاری یادداشت بہت کمزور ہے۔ تم بُھول گئی ہو کہ اگر میں اپنی جان خطرے میں نہ ڈالتا تو اس وقت یا تو تم آنجہانی ہو چکی ہوتیں یا پھر اپنی مسخ شدہ صُورت کی بنا پر مرنے کی دُعائیں مانگا کرتیں۔ میں تم سے اس احسان کا کوئی صلہ نہیں مانگتا صرف اتنا چاہتا ہُوں کہ تم میرے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤ اور تعاون کرتی رہو۔"

"مجھے موت کے مُنہ سے بچا کر خُود تم نے بھی اپنی جان بچائی ہے سرفروش۔ تمھاری زندگی بھی اتنی ہی خطرے میں تھی جتنی کہ میری۔ بالیہ صرف میرا ہی دُشمن نہیں، تمھارا بھی تھا۔ تم نہ تو بوتھانی ہو اور نہ ہی شبتانی اور نہ ہی رومو کے باشندے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں تم پر کیسے اعتماد کرلوں؟ اگر میں نے تم سے کوئی فائدہ اٹھایا ہے تو تم بھی مجھ سے کوئی فائدہ اُٹھانے کے متمنی ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میری غرض سامنے آچکی ہے مگر تمھارے مقاصد ابھی پوشیدہ ہیں۔ میرا مقصد رومو پہنچنا ہے اور میری مدد کرنے سے تمھارا کون سے مقصد وابستہ ہے، میں نہیں جانتی۔"

اس وقت وہ کوئی دُوسری ہی مُونا تھی جس نے اپنے رقیے پر بڑا موزوں حجاب اور جواز پیش کیا تھا۔ وہ اس مُونا سے یکسر مختلف تھی جس کے رُوپ میں اُس عقوبت خانے میں دیکھ چکا تھا جہاں اُس کا چہرہ مسخ کیا جانے والا تھا۔

"تمھیں میرے رقیے سے شکایت ہے اور تم نے مجھے کمزور حافظے کا طعنہ دیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ تمھارا اپنا حافظہ کمزور ہے۔ تم بُھول گئے ہو کہ میں بوتھان کی ازلی اور ابدی دیوی مُونا کا جیتا جاگتا رُوپ ہُوں۔ ایسی اوتار ہُوں جس کی یہاں کے لوگ پرستش کرتے ہیں... مگر تم میرے معتقدین کے سامنے کبھی میرے ساتھ عزت و تکریم سے پیش نہیں آئے۔ تم نے ہمیشہ میرے ساتھ اُس لہجے میں بات کی ہے جس لب و لہجے میں کنیزوں اور داسیوں سے کی جاتی ہے جبکہ میں اپنے ماننے والوں کے سامنے کوئی غلط مثال قائم نہیں کرنا چاہتی۔ اگر تمھارا رویہ میرے ساتھ ایسا ہوتا جیسا کہ دیویوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے تو ہم ایک دُوسرے کے بہترین دوست بن سکتے تھے۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنا ایک ہاتھ میری طرف بڑھایا اور بات جاری رکھتے ہُوئے بولی...

"وہ لوگ دُور کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ اگر تم گھٹنے ٹیک کر میرا ہاتھ چُوم لو تو اُن پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔"

مجھے اُس پر بہت غصہ آیا اور میرا جی چاہا کہ اُسے تھپڑ مار دُوں مگر میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہُوئے کہا۔ "تمھیں مجھ سے ایسی توقعات ہرگز نہیں رکھنی چاہئیں جھُوٹی دیوی۔ مجھے تمھاری اداکاری پر ہنسی آتی ہے جسے روکنا میرے بس میں نہیں۔ اب تم میرے ساتھ ساحل پر چہل قدمی کرنے چلو ورنہ میں تمھیں تمھارے پرستاروں کے سامنے گھسیٹتا ہُوا لے جاؤں گا۔"

اس نے نہ صرف اپنا بڑھا ہُوا ہاتھ کھینچ لیا بلکہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور میری طرف دیکھنے لگی۔ اب اُس کی آنکھوں میں غصّے کے ساتھ ساتھ شرارت بھی تھی۔

"مجھے تمھارا حکم ماننا ہی پڑے گا۔ میرے پاس نہ تو مسلح نفری ہے اور نہ ہی محافظ ہیں۔ تم ہمارے درمیان واحد جنگجو ہو۔ اور میری حفاظت کر سکتے ہو۔ اسی لیے دیوی تمھارے ساتھ رعایت برتنے پر مجبور ہے۔"

"بہتر یہ ہوگا کہ تم میرے سامنے نہ تو خود کو دیوی کہا کرو اور نہ ہی دیوی جیسا انداز اختیار کیا کرو۔"

"مگر کیوں۔ جب میں دیوی ہُوں تو ایسا کیوں نہ کرو؟"

"تم دیوی نہیں بلکہ ایک بیسوا ہو!" میں نے غصّے سے جواب دیا۔ "کیا تمھارے دروازے بوتھان کے بہادروں کے لیے کھُلے نہیں رہتے تھے؟"

"دیوی کا ایک فرض یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ وطن کے بہادروں کی حوصلہ افزائی کرے۔ بہادر صرف چڑھاوے چڑھانے کے لیے نہیں ہوتے، اُنھیں دیوی اپنی خوشنودی کا نذرانہ بھی دیا کرتی ہے۔"

"لیکن وہ موٹا کاہن ثالپ نہ تو جنگجو تھا اور نہ ہی بہادر تھا۔ پھر تم نے اس کی حوصلہ افزائی کیوں کی؟"

میری اس بات پر وہ بھونچکا سی رہ گئی۔

"تم یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو؟ کہیں تم سچ مچ کے شیطان تو نہیں ہو؟" وہ بے ساختہ بولی۔

"بکواس مت کرو۔" میں نے اُس کا ایک بازو پکڑتے ہُوئے کہا۔ "کیا تم مجھے ثالپ سے بھی گیا گزرا سمجھتی ہو...؟"

"اوہ تو یہ بات ہے۔"

"نہیں۔" میں نے اُسے ہلکے سے جھنجوڑتے ہُوئے اُس کی بات کاٹ دی۔ "میں کسی بیسوا کی خوشنودی کا طلب گار نہیں ہو سکتا۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں تاکہ تم میرے سامنے دیویوں کے تقدس کا ڈھونگ نہ رچایا کرو۔"

وہ خاموش ہوگئی اور اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر سر جھکا لیا۔

میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں نمی اُترنے لگی ہے مگر میں انجان بن گیا۔

اُس نے اپنے آنسو پونچھتے ہُوئے کہا۔ "تم مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتے تھے؟"

"میں تم سے ایک پہیلی بُجھوانا چاہتا ہُوں۔"

"پہیلی... کیسی پہیلی؟" وہ چونک پڑی۔

میں نے اُسے کوری کی پیش گوئی بتا دی اور پوچھا۔ "ان باتوں کا کیا مطلب ہے؟"

"میں نہیں جانتی لیکن اگر کوری نے یہ پیش گوئی کی ہے تو اس کے معنے ضرور ہوں گے کیونکہ نغمہ سرا چٹانوں کے گیت اور ہواؤں کے پیغام صرف وہی سمجھ سکتی ہے۔"

"میں اس بکواس پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ مجھے یہ مہا جادُوگرنی بھی کوئی گشتی ہی لگتی ہے۔"

"نہیں نہیں۔ ایسا نہ کہو۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "اب تک اُس نے جتنی بھی پیش گوئیاں کی ہیں، وہ ہمیشہ سچ ثابت ہوئی ہیں۔"

"یہ سب ڈھکوسلے ہوتے ہیں۔ میں اس بڑھیا کو ہمیشہ ادھر اُدھر جاتے دیکھتا ہُوں۔ اُس نے قریب ہی کہیں کوئی ایسا مکان یا کھنڈر دیکھ لیے ہوں گے اور وہ چاہتی ہوگی کہ ہم اُنھیں تلاش کرلیں۔"

"مگر اس سے ہمیں کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟"

"یہ تو بعد کی بات ہے۔ آؤ پہلے وہ مکان یا کھنڈر تلاش کریں۔"

مُونا بلا چون و چرا میرے ساتھ چلنے لگی۔

کچھ دُور جانے کے بعد ہمیں چٹانوں کے درمیان ایک پُرانے قلعے کے بُرج نظر آئے۔

"وہ دیکھ رہی ہو۔ شاید کوری کا اشارہ اسی طرف تھا۔ آؤ قریب چل کر دیکھیں۔"

"اُسے دیکھ کر کیا کریں گے؟" اُس نے پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ یہ بعد میں سوچیں گے۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم نے اپنا ایک پیام بر رومو بھیجا تھا؟"

"ہاں۔"... وہ بولی۔ "میں نے فیڈو کو اُس وقت روانہ کر دیا تھا جب شبتانیوں نے شب خون مارا تھا اور ثالپ مجھے گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے فیڈو کے ذریعے رومو سے کمک منگوائی تھی تاکہ وہاں سے جہاز آئیں اور ہمیں یہاں سے لے جائیں۔"

"فیڈو کون ہے اور کیسا آدمی ہے؟ کیا وہ جنگجو ہے؟"

میں نے پوچھا۔

"غلط مت سمجھو، وہ میرا انتہائی قابلِ اعتماد خواجہ سرا ہے"

"کیا تم نے پہلے کبھی اُسے رومو بھیجا تھا؟"

"ہاں۔ وہ کئی بار وہاں جا چکا ہے، مگر اس بار ایسا گیا ہے کہ واپس ہی نہیں آیا"

اُس کی اس بات سے اچانک مجھے کوری کی پیشین گوئی کے الفاظ یاد آ گئے۔

گاتی چٹانوں نے آج پھر ایک نیا گیت گایا ہے اور ہوائیں غیب کا پیغام لائی ہیں کہ وہ جسے بھیجا گیا تھا اور جو واپس نہیں آیا، اسے صحرا میں تلاش کرو جہاں ایک بہت بڑا مکان ہے اور اُس مکان میں تمہارے لیے ایک پیغام ہے اور وہ مکان یہاں سے دُور نہیں ہے جب تم اس مکان تک پہنچو گے تو تمہاری مصیبتیں اور مشکلیں حل ہو جائیں گی"

میں نے کوری کی پیشین گوئی مُونا کے سامنے دُہراتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ وہاں یہ پہیلی حل ہو جائے گی۔ اگر چٹانوں کے گیتوں اور ہواؤں نے کوری کو یہ پیغام دیا ہے تو تمہارا پیامبر ہمیں وہاں مل جائے گا جو رومو نہیں پہنچ سکا"

"لیکن میرا پیامبر یہاں کیوں آتا؟"

"ہو سکتا ہے اُس نے اپنی کشتی اُن چٹانوں کے پیچھے چھپا رکھی ہو جو سمندر میں چلی گئی ہو۔ اگر ہم وہاں چل کر کوری کی پیشین گوئی کی تصدیق کریں تو اس میں حرج ہی کیا ہے!"

"مجھے یقین نہیں آتا کہ کوری وہاں تک گئی ہو گی"

"مگر مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں آئی ہے"

ہم تیزی سے اُن چٹانوں کی طرف بڑھنے لگے۔

ہم اُن کے قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ چٹانیں قدرتی نہیں بلکہ بڑے بڑے پتھروں کو کاٹ کر اہرام کی طرح سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ البتہ ان سیڑھیوں تک پہنچنے سے پہلے ہمیں کچھ چٹانوں پر ضرور چڑھنا پڑا تھا اور وہاں سے میں نے جو منظر دیکھا، وہ بڑا ہی عجیب تھا۔

اہرام کی طرح بنی ہوئی یہ سیڑھیاں ایک چھوٹے سے معبد تک جاتی تھیں جس کے چاروں طرف یہ چٹانیں ایک پیالے کی شکل میں اُسے گھیرے ہوئے تھیں۔ معبد سنگِ سفید سے تعمیر کیا گیا تھا اُس کی چھت بلند اور کسی پگوڈا جیسی تھی مگر اُوپر سے اُسے جان بُوجھ کر نہیں ڈھانپا گیا تھا یا پھر سب سے اُوپر والے تختے یا پتھر استدادِ زمانہ سے ختم ہو گئے تھے اس لیے معبد پہلی نظر میں ایک مُردہ آتش فشاں ہی دکھائی دیتا تھا۔

آخری سیڑھی سے معبد کے دروازے تک بجری بچھی ہُوئی تھی۔

مُونا یہ نظارا دیکھ کر کچھ خوف زدہ ہو گئی۔

"نہیں سرفرِدش! آگے مت بڑھو، مجھے ڈر لگ رہا ہے، آؤ یہیں سے لوٹ چلیں" وہ کانپ کر بولی۔

"دیویاں خوف زدہ نہیں ہُوا کرتیں" میں نے مسکراتے ہُوئے کہا "پھر میں تمہارے ساتھ ہُوں تو ڈر کیسا؟"

میں اُسے بازو سے تھام کر سیڑھیاں اُترنے لگا۔

ہر طرف سناٹا چھایا ہُوا تھا۔

ہم آگے بڑھ کر معبد کے بیرونی کمرے میں داخل ہُوئے تو صرف مُونا ہی نہیں، خود میں بھی ٹھٹک کر رہ گیا۔

اس کمرے کے چاروں کونوں میں کسی کی لاش کے چار ٹکڑے پڑے ہوئے تھے اور مقتول کا سر کمرے کے بیچوں بیچ رکھا ہُوا تھا۔ کیکڑوں یا چوہوں نے اگرچہ لاش کا بیشتر گوشت نوچ کھایا تھا مگر لباس اور خود کی وجہ سے کچھ حصے بچ گئے تھے اور لاش قابلِ شناخت حالت میں تھی۔ مُونا اسے دیکھتے ہی چیخ اُٹھی "یہ میرے پیامبر فیڈو کی لاش ہے۔"

ایک لمحے تک وہ خوف و دہشت سے تھرتھراتی رہی پھر اچانک میرے قریب سمٹ آئی۔

"کوری کی پیشن گوئی پُوری ہو چکی ہے۔ آؤ اب یہاں سے نکل چلیں" وہ کانپ کر بولی۔

"لیکن ابھی تو پیشن گوئی کا صرف پہلا حصہ ہی پُورا ہُوا ہے۔ مشکلیں اور مصیبتیں تو حل نہیں ہُوئیں بلکہ یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ تمہارے پیامبر کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"یہ باتیں رہنے دو... میں جس بات سے اب تک ڈر رہی تھی، وہ ضرور پُوری ہو گئی ہے"

"وہ کیا...؟" میں نے پُوچھا۔

"تم نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے... سچ تو یہ ہے کہ میں دیوانہ وار تمہیں چاہتی رہی ہُوں مگر مجھے تم سے ڈر بھی لگتا رہا ہے۔ میرا دل اور سراپا تمہارے لیے تڑپتا رہا مگر... مگر اب میں تم سے دُور نہیں رہ سکتی"

میں اُس کے رویے کی اس اچانک تبدیلی پہ حیران ہوئے

بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے سوچا کہ ایک لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر اظہارِ محبت کا یہ کونسا موقع ہے؟... کیا ایسے مواقع پر بھی محبت کے جذبات جاگ سکتے ہیں؟ نہیں کوئی عورت اتنی شقی القلب نہیں ہو سکتی... مگر وہ اپنے پیامبر کی موت پہ دل گرفتہ ہونے کی بجائے میرے ساتھ قول و قرار میں مصروف تھی۔

"یہاں سے چلو سرفرِدش۔ اب میں کبھی تمہارے سامنے دیوی بن کر نہیں آؤں گی۔ تم ہمیشہ اپنی داسی پاؤ گے" وہ کہہ رہی تھی۔

اُس کے اِس رویے کے باعث میری نگاہیں لاش کے ٹکڑوں کا جائزہ لے رہی تھیں اور بالآخر مجھے وہ چیز نظر آ ہی گئی جس سے وہ میری توجہ ہٹانا چاہتی تھی۔

فیڈو کے ایک ہاتھ کے پاس ایسی نلکی سی پڑی تھی جس میں خریطے بھیجے جاتے ہیں۔

"کیا سوچ رہے ہو سرفرِدش... چلو نا" وہ بولی اور پھر اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ شاید وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ میں کیا دیکھ رہا ہُوں۔

میں نے جلدی سے اپنی نگاہیں اُس پر مرکوز کر دیں۔

"کیا تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آیا؟... اگر تمہیں شک ہے کہ میں نے جھوٹ بولا ہے... تو تم اسی وقت میرا گلا گھونٹ دو تمہاری بدگمانی کے ساتھ میرا جینا بیکار ہے"

"نہیں نہیں مونا... میں بھی تمہیں چاہتا ہُوں۔ میں تمہیں ویسی دیوی نہیں سمجھا جیسی کہ تمہارے دیگر پرستار سمجھتے ہیں لیکن تھوڑی دیر صبر کر لو تو بہتر ہے"

"نہیں... اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا" وہ بولی "آؤ چٹانوں کے اُس پار ساحل ریت پر بیٹھ کر باتیں کریں گے"

"اُن باتوں سے پہلے مجھے ایک دو سوالوں کے جواب دے دو"

"وہ کیا؟" مُونا یکایک چونک پڑی۔

"تم نے اپنا یہ پیامبر رومو کی طرف کب روانہ کیا تھا؟ حملے والی رات کو تو اس کے وہاں سے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا؟"

"میں نے اُسے حملے سے دو روز پہلے ہی روانہ کر دیا تھا" وہ بولی "آؤ باقی باتیں اُدھر چل کر کر لینا"

"مگر میرے ذہن سے اُس کے ایک ہی جواب نے اسرار کے سارے پردے ہٹا دیے تھے۔ میں نے مُونا کو بازوؤں سے تھام کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

"تم نے فیڈو کو شبستانوں کے حملے سے دو روز پہلے رومو روانہ کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ تم دو روز پہلے سے جانتی تھیں کہ طراق کب شب خون مارے گا... تم جانتی تھیں کہ ٹالپ زمینی سُرنگ کے راستے اس کے لشکر کی رہنمائی کرے گا اور ٹالپ تمہیں محض اس لیے ختم کرنا چاہتا تھا کہ تم جانتی تھیں کہ وہ غدار ہے۔ اس کے باوجود تم نے بوتھان کے کمان دارِ اعلیٰ کو حقیقتِ حال سے آگاہ نہیں کیا۔ تم معقوبت خانے میں وطن پرستی کے موضوع پر جو پُرجوش تقریر کر رہی تھیں، وہ سب کچھ جھوٹ تھا۔ تم نے اپنے جلتے اور مرتے ہُوئے شہر کی مدد کے لیے نہیں بلکہ اپنی مدد کے لیے فیڈو کو رومو روانہ کیا تھا"

پہلے تو وہ غصّے اور نفرت سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی "یہ جھوٹ ہے تم نے مجھ پر اتنا بڑا بہتان لگانے کی جرأت کیسے کی؟... اور یہ الزام اُس وقت کیوں عاید کیا جب میں نے اپنا دل کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیا..."

وہ بلا کی اداکارہ تھی... مگر اب میں نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی اور کہا "میرا خیال ہے دیوی کہ تم اور ٹالپ ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہو لیکن ٹالپ تم سے زیادہ تیز اور زیادہ چالاک ثابت ہُوا۔ اس کے آدمیوں نے تمہارے پیامبر کو ختم کر دیا کہ اگر تم کسی طرح یہاں تک پہنچ جاؤ تو اس کا حشر ضرور دیکھ لو۔ ویسے ٹالپ کو یہ توقع نہیں تھی کہ تم یہاں تک پہنچ جاؤ گی۔ اس صورتِ حال میں رومو کی طرف سے کسی مدد اور کسی کمک کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے اب تمہیں مجھ پر انحصار کرنا پڑے گا... اور ہاں اب مجھ سے کبھی جھوٹ مت بولنا، کوئی فریب مت کرنا"

وہ خاموش رہی۔

"کیا اب بھی تمہیں مجھ سے محبت ہے دیوی؟" میں نے کہا۔

وہ شکست خوردہ معلوم ہو رہی تھی... مگر اس نے زور لگا کر اپنی کلائی میرے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی تو میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی کہ دیکھوں وہ کیا کرتی ہے... مگر وہ وہاں سے بھاگنے یا مجھ پر حملہ کرنے کے بجائے دوسرے ہاتھ سے کلائی مسلنے لگی۔

"تم نے مجھے بڑی تکلیف پہنچائی ہے اور تمہیں اس کی پوری پُوری قیمت چُکانی پڑے گی۔ تمہیں ان معاملات میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا خیال ہے تم واقعی شیطان ہو اور اپنے اندر پُراسرار قوتیں رکھتے ہو۔ تم انہیں استعمال کر کے پھر سے وہاں کیوں نہیں چلے جاتے جہاں سے آئے ہو"

میں نے دوبارہ اس کی کلائی پکڑنا چاہی تو وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔

"اب مجھے چھونے کی جرأت بھی نہ کرنا" وہ غرائی۔
"تمہارا یہ انداز مجھے بے حد پسند آیا ہے" یہ کہہ کر میں آگے بڑھا اور وہ نلکی اٹھالی۔

مُونا خونخوار انداز سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے نلکی کھول کر عریضہ نکالا اور بآواز بلند پڑھنے لگا۔

وَزِ شہوار ولیشا کی خدمت میں عرض گزار ہوں کہ بوتھان میں مجھے جو فرض سونپا گیا تھا، وہ میں نے ادا کر دیا ہے۔ اب مجھے اور مجھ سے وابستہ افراد کو تحفظ کی ضرورت لاحق ہے۔ اس لیے میرا یہ پیام، فیڈو جہاں کہے، وہاں جہاز بھیج دیا جائے۔ براہِ کرم میری اس درخواست پر فوری عمل فرمایا جائے کیونکہ یہاں حالات ناگفتہ بہ ہو چکے ہیں اور ہم سب کو اپنی جان کا خطرہ ہے جیسے ہمارا منصوبہ پوری طرح کامیاب ثابت ہوا۔ شبستانیوں اور بوتھانیوں کے درمیان جنگ ناگزیر ہو گئی ہے۔ اس جنگ سے دونوں فریقوں بالخصوص طمراق کو کافی نقصان پہنچے گا اور رومو کو جنگی تیاریوں کے لیے خاصا وقت مل جائے گا۔ چونکہ طمراق اس جنگ سے کمزور ہو جائے گا اس لیے شبستانیوں پر ہمارا حملہ کامیاب رہے گا۔

ثالپ مجھ سے مشکوک ہو گیا ہے اور اس کا خیال درست ہے کہ بوتھان اس جنگ میں تباہ ہو جائے گا اس لیے اس نے پہلے سے طمراق کی خوشنودی حاصل کر لی ہے اور وہی اس کی سپاہ کی رہبری کرے گا۔ مگر میں اس کی غداری کا پول نہیں کھول سکتی کیونکہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ باقی باتیں زبانی عرض کروں گی بہرحال میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے اور اب آپ کی مدد کی طالب اور جہاز کی منتظر ہوں۔

آپ کی کنیز۔ مُونا۔

میں نے یہ خط پڑھ کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا۔
"ثالپ بھی تمہیں غدار کہنے اور گمراہ کن اجلاس بُلانے پر ملزم ٹھہرانے میں حق بجانب تھا۔ جتنی غداری اس نے بوتھان کے ساتھ کی ہے اتنی ہی تم نے بھی کی ہے"۔
"نہیں...." وہ بولی "میں نے بُوتھانیوں سے کوئی غداری نہیں کی کیونکہ میں بُوتھانی نہیں ہوں۔ میں رومو کی رہنے والی ہوں۔ میرا وطن رومو ہے اور میں نے رومو کی ہر ممکن خدمت کی ہے۔ میں وَزِ شہوار رومو کی ملکہ ولیشا کی نواسی ہوں"۔

یہ جان کر ساری صورتِ حال میری سمجھ میں آگئی۔

جنگ وجدل کے اس پورے کھیل میں رومو نے وہی کردار ادا کیا تھا جو ہمارے دور اور دُنیا میں عظیم طاقتیں ادا کر رہی ہیں۔ رومو نے اپنی گندی اور گھناؤنی حکمتِ عملی سے بوتھان اور شبستان کے درمیان انتہائی خونریز جنگ کرا دی تھی۔

دو آدمیوں، دو قوموں اور دو ملکوں کو لڑا کر اپنی مقصد براری کرنا صدیوں تک انگریز کا بھی وطیرہ رہا ہے۔ اس نے بھی ہمیشہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی حکمتِ عملی پر عمل کیا ہے اور یہی حربہ ماضی کے اس اندھے زمانے میں بھی استعمال کیا جا رہا تھا۔ رومو اُن دو سلطنتوں، بوتھان اور شبستان کو آپس میں لڑا کر کمزور کر دینا اور اُن پر غالب آنا چاہتا تھا... اور اس سلسلے میں مونا ایک انتہائی اہم اور خطرناک جاسوس کا کردار ادا کر رہی تھی۔

"اوہ، تو تم نے جاسوسی کے لیے دیوی کا روپ اپنایا!" میں نے مُونا کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

مُونا کچھ کہے بغیر میری طرف دیکھتی رہی۔ وہ دراصل میرے تاثرات و جذبات کا جائزہ لینا چاہتی تھی کہ اس صورتِ حال سے آگاہ ہو جانے کے بعد میرا رویہ کیا رہتا ہے؟ اب وہ پوری طرح میرے رحم و کرم پر تھی کیونکہ اُسے رومو سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی اور شبستانی کسی وقت بھی یہاں آسکتے تھے۔ وہ تو دراصل ڈھیل دے کر بلی چوہے والا کھیل، کھیل رہے تھے اور انھیں یقین تھا کہ مُونا خود ہی لوٹ آئے گی۔ مُونا کو بھی اب اس بات کا پورا پورا احساس ہو گیا تھا۔ ادھر میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے اپنے اعتماد میں لے کر وہ میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے تو میرے حق میں بہتر ہو گا۔ اس کے دشمنانہ رویے سے مجھے نقصان ہی پہنچ سکتا تھا کیونکہ اس کے ساتھ ساتھ میں خود بھی غلط حالات کا شکار ہو گیا تھا۔

"اچھی طرح سوچ لو مُونا۔ ان حالات میں صرف میں تمہارے لیے امید و کامرانی کی آخری کرن ہوں" میں نے کہا۔

اس نے جو کچھ سوچنا تھا، اب تک سوچ چکی تھی۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا اور بولی "آؤ۔ معبد کے اندر چلیں۔ میں تمہارے سوال کا جواب وہیں دوں گی"۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔
"اگر مجھے زندہ رہنا اور رومو واپس پہنچنا ہے تو مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ وَزِ شہوار رومو ولیشا کو میرا پیغام نہیں پہنچ سکا لہٰذا اس کی طرف سے مجھے کوئی مدد نہیں مل سکے گی۔ تم یہاں اجنبی ہو اور میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ اگر تم شیطان نہیں، شیطانی قوتوں کے مالک ضرور ہو مگر چونکہ یہاں کے حالات سے تم آگاہی نہیں رکھتے، اس لیے تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑے گی اور جس طرح تم میری مدد کرو گے، اسی طرح میں بھی تمہارے کام آؤں گی"۔

مجھے اس کے خیالات سے متفق ہونا پڑا۔

ہم معبد میں، قربان گاہ والے کمرے میں آگئے مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ معبد تعمیر نہیں کیا گیا تھا بلکہ اُسے ایک مُردہ آتش فشاں پہاڑی میں تراشا گیا تھا۔ اسی لیے سیڑھیوں سے اس کا بالائی حصہ آتش فشاں کا دہانہ دکھائی دیا تھا۔

معبد میں دو قربان گاہیں بنی ہوئی تھیں اور اُن کے سامنے کسی دَور کی مُونا دیوی کا مجسمہ استادہ تھا۔ سامنے والی دیوار میں ایک تنگ سا دروازہ تھا جو دوسرے کمرے میں کھلتا تھا اور روشنی کی کمی کے باعث صاف نظر نہیں آتا تھا کہ وہ کیسا ہے تاہم میں نے یہ اندازہ ضرور کر لیا تھا کہ اس کمرے میں کیا ہونا چاہیئے اور کیا ہوگا۔

"اب میں تمہیں مُونا کہا کروں یا...؟" میں نے مسکرا کر کہا۔
"نرگس میرا اصلی نام ہے۔ میں اپنی نانی وَزِ شہوار رومو کی چوتھی نواسی ہوں۔ جو نام تمہیں پسند ہو، تم مجھے اسی سے پکار سکتے ہو"۔
"میں تمہیں مُونا ہی کہا کروں گا۔ یہ نام مجھے پسند ہے کیونکہ میں تم سے اسی نام کے ساتھ آشنا ہوا تھا لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم مُونا کیسے بن گئیں۔ رومو سے بوتھان کیسے اور کب پہنچیں؟"
"مجھے بڑی دُور رس منصوبہ بندی کے نتیجے میں رومو سے یہاں بھیجا گیا تھا" وہ انگلیوں پر کچھ گنتے ہوئے بولی "میں نے موسمِ گرما دیکھے ہیں مگر جب میں پندرھویں موسمِ گرما میں تھی مجھے خفیہ طور پر بوتھان کے ایک دُور دراز گاؤں بھیج دیا گیا جہاں ایک ضعیف العمر پُجاری پارسس نے مجھے دیکھا اور اعلان کیا کہ میرے اندر مُونا دیوی کی رُوح ہے۔ چنانچہ مجھے بوتھان لایا گیا اور بڑے معبد کے پجاری مجھے تربیت دینے لگے"۔
"میرا خیال ہے، پجاری پارسس بھی جاسوس اور تمہاری نانی وَزِ شہوار ولیشا کا تنخواہ دار ملازم ہوگا" میں نے کہا۔
"تم ٹھیک سمجھے۔ میں نے تمہیں اُس کا نام اس لیے بتا دیا ہے کہ وہ مر چکا ہے اور اپنی خدمات کے سلسلے میں وہ جو سونا وصول کرتا رہا تھا، وہ حاصل کر کے رومو پہنچا دیا گیا ہے"۔ اتنا کہہ کر اس نے مجھے چھوٹی قربان گاہ پر بٹھا دیا۔
"میں یہاں تمہیں صرف باتیں کرنے کے لیے نہیں لائی"۔
"تو پھر کیوں لائی ہو؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔
"میں نے تم سے بہت جھوٹ بولے ہیں... مگر میری اس بات اور اس اعتراف میں حقیقت تھی کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے اور میرا جسم و جان تمہارے لیے تڑپتے رہے ہیں۔ مانا کہ میں تمہاری نظر میں ایک کسبی سے بھی بدتر ہوں لیکن بیسوا بھی اپنے پہلو میں دل رکھتی ہے اور اپنے ہزاروں چاہنے والوں میں سے کسی ایک کو ہی چاہتی ہے۔ اگر تم مجھے کوئی سزا دینا چاہتے ہو تو بعد میں دے لینا۔ اس وقت تو میری ہر خطا معاف کر کے محبت سے میرا ہاتھ تھام لو"۔

سچ بات تو یہ ہے کہ اس وقت خود میری بھی یہی خواہش تھی۔ چنانچہ میں نے اُسے مایوس نہیں کیا۔

کافی دیر بعد میں اٹھ کر اس نیم تاریک کمرے میں چلا گیا جو

قربان گاہ سے ملحق تھا۔ . . اور جیسا کہ میں نے سوچا تھا، اس میں وہی کچھ پایا۔

اس کمرے میں ایک ایسی کشتی کے حصّے رکھے ہُوئے تھے جنھیں باہر کسی جگہ یا سمندر کے کنارے لے جا کر جوڑا جا سکتا تھا اور وہ ایک مکمل کشتی بن سکتی تھی۔ میں نے اُن حصّوں کا جائزہ لیا اور قربان گاہ میں واپس آ گیا جہاں مُونا اب تک قربان گاہ پر بیٹھی ہُوئی تھی۔

وہ بے حد مطمئن اور خوش نظر آ تی تھی۔ اُس نے آنکھیں مُوند رکھی تھیں اور یوں مُسکرا رہی تھی جیسے کوئی خوبصورت خواب دیکھ رہی ہو۔

"اب جلدی سے اُٹھ جاؤ مُونا" میں نے کہا۔

مُونا نے آنکھیں کھول دیں: "تھوڑی دیر پہلے تم کتنے مہربان بنے ہُوئے تھے مگر اب کتنے بدل گئے ہو" اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا "میرے قریب آؤ . . ."

"نہیں مُونا" میں نے رُوکھے لہجے میں کہا "اب ہر لمحہ بے حد قیمتی ہو گیا ہے۔ تمھارا پیامبر مر چکا ہے۔ تمھارا پیغام تمھاری قوم غمخوار تک نہیں پہنچ سکا۔ وہاں سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ ثالب اور طراق تمھاری واپسی کے منتظر ہیں اور شاید وہ انتظار سے مایوس ہو کر چل پڑے ہیں یا ممکن ہے تعاقب میں روانہ بھی ہو چکے ہوں، اس لیے ہمیں جلد از جلد ردمو پہنچنا ہے۔"

"مگر ہم وہاں کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ ہمارے درمیان تیس میل تک سمندر حائل ہے۔ شاید تم تیر کر جزیرۂ ردمو تک پہنچ جاؤ لیکن میں اور میرے ساتھی تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"ہم کشتیوں میں وہاں جائیں گے" میں نے اُسے بتایا۔

"کشتیاں کہاں سے آئیں گی؟"

اس پر میں اُسے دوسرے کمرے میں لے گیا اور کشتی کے حصّے دکھلاتے ہُوئے کہا "ہم ایسی کشتیاں بنائیں گے۔"

"لیکن ہمارے پاس کشتیاں بنانے کا ساز و سامان کہاں ہے؟" مُونا نے کہا۔

"میرے پاس تلوار ہے جو کلہاڑے کا کام دے گی۔ برگا کے پاس نیزہ ہے جس سے برمے کا کام لیا جائے گا۔ تم چلو تو سہی۔ اب مجھے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جال کی ضرورت نہیں بلکہ کشتیوں کی ضرورت ہے۔"

"ایک بات مانو گے، سرفروش؟"

"کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"تخلیے میں، میں تمھاری داسی ہُوں مگر میرے لوگوں کے سامنے مجھے دیوی ہی رہنے دینا۔ اس میں تمھارا بھی فائدہ ہے۔ میں دیوی بن کر اُن سے تمھارے لیے بہت زیادہ کام لے سکتی ہُوں۔"

"مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ تم مجھے ان کی طرح احمق نہ سمجھو اور بے وقوف نہ بناؤ۔ دوسرے میرے خلاف کوئی سازش نہ کرو۔"

"میں تمھارے خلاف سازش کیوں کرنے لگی، سرفروش! میں نے تو تمھیں اپنے جسم و روح کا مالک تسلیم کر لیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ مجھے آج تک تم جیسا ساتھی نہیں ملا . . . اگر تم واقعی شیطان ہو تو میں انسانوں کی بجائے شیطانوں کو زیادہ پسند کروں گی۔ میرا خیال ہے کہ تم جیسا دوسرا شیطان بھی کہیں نہیں ملے گا۔"

تجربے نے مجھے بتایا ہے کہ جب عورت ایسی باتیں کرتی ہے تو اس کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا "اے نقلی دیوی! میں بھی تمھیں پسند کرتا ہُوں لیکن مت بھُولنا کہ تمھاری طرف سے ذرا بھی شبہے میں پڑا تو میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا کہ تمھارے اس حسین چہرے کو تمھارے اس پُرکشش جسم سے الگ کر دوں۔"

"نہیں، سرفروش! جب میں نے تمھیں اپنا اور اپنے ساتھیوں کا نجات دہندہ مان لیا ہے تو تمھیں میرے بارے میں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔"

اس وقت تو مُونا نے مجھے اپنی محبت اور تعاون کا یقین دلا دیا مگر میں نہیں جانتا تھا کہ آنے والا وقت انھیں سچ ثابت کرتا ہے یا جھُوٹ . . .

ہم نے جو کشتیاں تیار کیں، وہ کشتیاں کم اور ٹوکریاں زیادہ لگتی تھیں کیونکہ دلدلی جھاڑیوں سے ہمیں ایسی لکڑی تو نہیں مل سکتی تھی جس سے تختے بنائے جاتے اور اگر موٹے تنے کے درخت مل بھی جاتے تو ہمارے پاس ایسا ساز و سامان کہاں تھا کہ لکڑیاں چیرتے . . . بس میری سمجھ میں اتنا ہی آیا کہ جھاڑیوں کی پتلی پتلی شاخوں سے ٹوکریاں یا ٹوکرے بنا لیے جائیں۔ وہ اتنے مضبوط اور گٹھے ہُوئے ضرور ہوں کہ ٹوٹنے نہ پائیں اور ان میں اتنا گھاس پھُونس بھر دیا جائے کہ پانی اندر نہ آ سکے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں کپڑے بھی استعمال کرنے پڑے۔

یہ ٹوکرے اتنے بڑے تھے کہ ان میں تین سے زیادہ افراد نہیں سما سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے تین تین کی ٹولیاں بنا دیں۔ میرے ساتھ ایک المیہ یہ بھی تھا کہ مُونا کے وفاداروں کا سارا عملہ کنیزوں، بوڑھیوں اور خواجہ سراؤں پر مشتمل تھا۔ البتہ صرف برگا ایک ایسا لڑکا تھا جسے میں مردوں میں شمار کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے ساتھ کچھ بچّے بھی تھے۔

جب ہم فرار کے لیے ٹوکرے بنا رہے تھے، ادھر سمندر میں شبستانیوں کے جہاز گشت کرنے لگے تھے۔ شاید ثالب اور طراق، مُونا کی واپسی سے مایوس ہو چکے تھے اور اب کھُلے سمندر میں گشت کرنے والے جہاز اُسے اور اُس کے حامیوں کو تلاش کر رہے تھے۔ اُن کا دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ ردمو سے کوئی جہاز ہماری مدد کو نہ آ سکے یا مُونا اور اس کے حامی فرار نہ ہو سکیں۔ چنانچہ دن بھر وہ سامنے سمندر میں گشت کرتے رہتے اور رات کو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لنگر ڈال دیتے۔

ہم دن بھر تو چٹانوں، ریت کے ٹیلوں اور جھاڑیوں میں چھُپے ٹوکرے بناتے رہتے . . . مگر شام کو جب اندھیرا پھیل جاتا تو میں ساحل پر آ کر اُن جہازوں کا جائزہ لیا کرتا۔ وہ ایک دوسرے سے تقریباً نصف میل پر لنگر انداز ہوتے تھے۔ یہ اندازہ میں نے اُن پر جلنے والی شمعوں سے لگایا تھا۔

جب ٹوکرے تیار ہو گئے تو موسم خراب ہو گیا۔ نہ جانے قدرت کو کیا منظور تھا کہ ہر قدم پر نئی مشکلیں سامنے آ رہی تھیں۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ اگر موسم کی خرابی نے طول پکڑ لیا تو چاندنی راتیں شروع ہو جائیں گی جو ہمارے فرار کو ناممکن بنا دیں گی . . . پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ طراق کے آدمی ساحل پر آ جاتے اور ہم سب کو گرفتار کر لیا جاتا۔

دو روز بعد موسم ٹھیک ہو گیا اور ابھی نیا چاند چڑھنے میں بھی دو روز باقی تھے لہٰذا میں نے اُسی رات فرار کا ارادہ کر لیا اور شام کا اندھیرا گہرا ہوتے ہی ٹوکروں سمیت سب کو ساحل پر لے آیا۔ ہر ٹوکرے کے ساتھ میں نے ایک ایک خواجہ سرا مقرر کر دیا اور اُن کے ساتھ عورتوں کو بھی ہدایت کر دی کہ وہ بوقتِ ضرورت چپّو چلانے میں ان کی مدد کرتی رہیں۔ میں نے اُن سب کو یہ بھی سمجھا دیا کہ اُن کے یہ کشتی نما ٹوکرے جہازوں کے درمیان برابر فاصلہ دے کر آگے بڑھیں گے۔ میں نے اُنھیں ایک ہی جگہ سے نہیں بلکہ مختلف جہازوں کے درمیان سے گزرنے کی تاکید کی اور انھیں ساحل سے الگ الگ مقامات سے روانہ کرنے لگا۔

ہر ناخدا کو یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ ذرا سی آواز جہازیوں کو چوکنا کر کے ہم سب کی موت کا باعث بن سکتی ہے اس لیے اگر کسی نے اُس وقت تک کوئی بات کی یا آواز نکالی جب تک کہ جہاز نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتے تو ناخدا کو اختیار ہوگا کہ وہ بولنے یا بات کرنے والے کو اُٹھا کر سمندر میں پھینک دے۔

جب میں سوائے دو کشتیوں کے باقی سب کو رخصت کر چکا تو مُونا کی طرف آیا جسے میرے ساتھ جانا تھا۔ اب صرف میں، مُونا، برگا اور دو عورتیں باقی رہ گئے تھے۔

میں نے دیکھا کہ مُونا، برگا سے سرگوشیوں میں کچھ کہہ رہی تھی . . . مگر جب میں قریب پہنچا تو وہ مسکرا کر خاموش ہو گئی۔ برگا نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور نظریں چُرا لیں۔ میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ ماجرا کیا ہے اور پھر میرے پاس غور کرنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے برگا کو بھی وہی ہدایات دیں۔ بوڑھی کوری اور دوسری عورت کو سوار کرایا جس کے ساتھ ایک دُودھ پیتی بچّی بھی تھی اور پھر اُنھیں بھی روانہ کر دیا۔

اب میں اور مُونا باقی رہ گئے تو میں نے اس سے پوچھا۔ "برگا سے کیا سرگوشیاں ہو رہی تھیں؟"

اُس نے قہقہہ لگایا اور بولی: "بس جل گئے۔ ایسی کوئی بات نہیں، سرفروش! دیوی ہونے کے ناتے مجھے ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔ بس اُس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔"

"میں جانتا ہُوں کہ تم اکثر اسی طرح حوصلہ بڑھایا کرتی ہو۔ یہ تمھاری عادتِ ثانیہ ہے۔"

"خواہ مخواہ خون مت جلاؤ، سرفروش۔ ابھی تو برگا کی مسیں بھی نہیں بھیگیں اور تم اُسے اپنا رقیب سمجھنے لگے ہو۔ یہ باتیں چھوڑو اور چلو۔"

میں نے تلوار کشتی میں رکھی، مُونا کو سوار کیا اور سمندر میں اُتر گیا۔

اس وقت سمندر اُتار پر تھا۔ ہَوا بہت ہلکی تھی اور چاند چڑھنے میں بہت دیر تھی، اس لیے چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہُوا تھا۔

میں اُس وقت تک کشتی کو ہاتھوں سے دھکیلتا رہا جب تک کہ پانی میری گردن تک نہ آ گیا پھر میں بھی کشتی میں سوار ہو کر اُسے کھینے لگا۔

سمندر کی چمکتی لہروں پر مجھے کچھ آگے، برگا کی کشتی کا مختصر سا ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارے درمیان اب بمشکل بیس پچیس گز کا فاصلہ رہ گیا تھا اور میرا خیال تھا کہ دو جہازوں کے بیچ سے گزرتے ہُوئے میں اُس سے آگے نکل جاؤں گا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں اُس سے زیادہ مضبوط اور طاقتور تھا، دوسرے

اس کی کشتی میں ایک عورت زیادہ تھی۔

جب ہم دو جہازوں کے درمیان سے گزرنے لگے تو اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

یہ بچّی کے رونے کی آواز تھی۔

"بیڑا غرق ہوگیا۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "اب ہم سب مارے جائیں گے۔"

میں نے برگا کی کشتی کی جانب دیکھا تو چکرا گیا۔ اس کی کشتی اُلٹ گئی تھی اس نے بچّی یا اس کی ماں کے خلاف کوئی قدم اُٹھایا ہوگا جس سے کشتی کا توازن بگڑ گیا اور وہ اُلٹ گئی۔

یہ صورتِ حال بھی بے حد خطرناک تھی کیونکہ وہ عورت بھی لہروں سے اُبھر کر مدد کے لیے چیخ و پکار کر سکتی تھی۔ میں فوراً اپنی کشتی سے کودا اور تیزی سے اگلی کشتی کی طرف تیرنے لگا جو چند گز دُور تھی۔ میں نے کشتی سیدھی کی۔ اتنے میں برگا بھی پانی کی سطح سے اُبھرا اور کشتی میں سوار ہوگیا۔

"وقت ضائع نہ کرو۔" میں نے دھیمی آواز میں لیکن تحکمانہ لہجے میں کہا۔

برگا تیزی سے کشتی کھینے لگا۔ میں نے عورتوں کی تلاش میں غوطہ لگایا تو ننھی بچّی میرے ہاتھ میں آگئی... مگر عورتوں کا پتہ نہ چلا۔ میں اُسے لے کر اپنی کشتی میں آگیا۔ بچّی ابھی زندہ تھی... مگر اس کے پیٹ میں پانی بھر گیا تھا۔

مُونا نے اُسے اوندھا کیا تو اس نے قے کرنے کے ساتھ ہی ایک چیخ ماری اور میرا دل اُچھل کر حلق میں اٹک گیا۔

ہم اس وقت دو جہازوں کے درمیان گزر رہے تھے اور ہمیں دونوں طرف کے جہازیوں کی آوازیں بھی سُنائی دے رہی تھیں۔ جب اُن کی آواز ہم تک پہنچ سکتی تھی تو بچّی کی چیخ بھی یقیناً ان تک پہنچی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر چیختی، میں نے اُسے چھیننا چاہا تاکہ اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر آواز نہ نکلنے دوں... مگر مُونا نے اُسے میرے ہاتھوں کی پہنچ سے دُور کر دیا۔

بچّی ایک بار پھر چیخی... مگر اس بار مُونا نے جلدی سے اُسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ بچّی بہل گئی یا اُس کا مُنہ بند ہوگیا اور اُس نے چلاّنا بند کر دیا اتنے میں ایک جہاز سے کسی نے دوسرے جہاز کے ملاّحوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کیا زیادہ پی گئے ہو جو بچّوں کی طرح رو رہے ہو؟"

"پینے کے بعد تو تم لوگوں کو اپنا بچپن یاد آجاتا ہے۔ ہم تو بھینسے ہیں بھینسے۔ مٹکے پی جائیں اور ڈکار نہ لیں۔" پھر قہقہوں کی آواز آنے لگی۔ انھوں نے نیچے سمندر کی لہروں کو دیکھنے کی بجائے اپنی نگاہیں ایک دوسرے کے جہازوں پر ہی رکھی ہوں گی یا اس کی بھی زحمت نہیں کی ہوگی اور کھانے پینے میں مشغول رہے ہوں گے ورنہ ہماری کشتی کا بچ نکلنا ناممکن تھا جسے میں تیرتے ہوئے کھینتا جا رہا تھا کیونکہ چپّو چلانے کی آواز بھی انھیں ہماری طرف متوجہ کر سکتی تھی۔

جب ہم تقریباً آدھ میل دُور نکل آئے تو میں کشتی میں سوار ہو کر دم لینے لگا۔ مُونا بولی۔ "تم اس بچّی کو مارنا چاہتے تھے؟"

"نہیں۔ میں اسے چُپ کرانا چاہتا تھا۔"

"مگر تمھاری آنکھوں میں تو کچھ اور ہی تھا۔ میں نے تمھاری آنکھیں پڑھ کر اسے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ یہ میری سب سے عزیز کنیز کی بیٹی ہے۔ میں اسے پالوں گی۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور کشتی کھینے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر بولی۔ "کیا کوری اور میری کنیز ڈوب گئی؟"

"ڈوب ہی گئیں ہوں تو بہتر ہے ورنہ وہ ایک طرف تو ہماری موت بن جائیں گی اور دوسری طرف جہازی تمھاری کنیز کا کیا حشر کریں گے، تم بہتر جانتی ہو۔" یہ کہتے ہوئے میں نے پلٹ کر جہازوں کی طرف دیکھا۔ ان کی روشنیاں بتا رہی تھیں کہ وہ اُسی طرح لنگر انداز ہیں۔

اگر کوری یا مُونا کی کنیز نے اُبھر کر مدد کے لیے پکارا ہوتا تو اب تک ہلچل مچ چکی ہوتی۔ اب اگر اُن کی لاشیں اُبھریں بھی تو جہازی یہی سمجھیں گے کہ لہریں انھیں ساحل سے بہا لائی ہیں۔

میں مسلسل پانچ گھنٹوں تک کشتی کھینتا رہا۔ کبھی تیر کر اور کبھی چپّو سے۔ اس دوران چاند طلوع ہُوا مگر آخری دنوں کے باعث جلد ہی غروب ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے ہَوا میں صندل اور گلاب کی سی خوشبو رچی ہُوئی ہو۔ پہلے مجھے یہ اپنا واہمہ محسوس ہُوا مگر جب مُونا اس ہَوا میں تیز تیز سانسیں لینے لگی تو میں نے پوچھا۔ "ہوا میں صندل اور گلاب کی خوشبو ہے نا؟"

"ہاں۔ اور یہ خوشبو بتا رہی ہے کہ ہم ساحل کے قریب پہنچ گئے ہیں۔"

"کیا؟ - کیا کہا ساحل قریب ہے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"اگر ساحل قریب نہ ہوتا تو ان ہَواؤں میں میرے دیس کے صندل، گلابوں اور دوسرے پھولوں کی خوشبو کیسے رچی ہوتی۔ میرا دیس پھولوں اور خوشبوؤں کا دیس ہے سرفروش!"

"میرا خیال ہے کہ مجھے تمھارا دیس ضرور پسند آئے گا۔ بوتھان بدبُو کا شہر تھا۔"

میری نگاہ نے ساحل پر جلنے والا ایک الاؤ دیکھ لیا۔

"یہ آگ کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شاید انھیں ہماری آمد کی اطلاع مل چکی ہے، سرفروش۔" وہ خوشی سے بولی۔ "یہ آگ انھوں نے ہماری رہنمائی کے لیے جلائی ہے اور جانتے ہو یہ کون سی جگہ ہے؟"

"نہیں۔" میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"یہ ہمارا صدر مقام فیونا ہے۔ وہ ہماری راہ دیکھ رہے ہیں۔"

"مگر تمھارا پیامبر تو یہاں تک پہنچ ہی نہیں پایا تھا، پھر انھیں تمھاری آمد کی اطلاع کیسے ملی ہوگی؟"

مُونا نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔ "میری نانی درِ شہوار روموولیشا بے وقوف نہیں ہے، سرفروش۔ اس نے بوتھان میں جاسوسوں کا جال پھیلا رکھا ہے۔ اُسے اپنے ذرائع سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ وہاں کیا بیتی ہے۔ یوں تو اس ساحلی حصّے کی حفاظت کی جاتی ہے... مگر آج اس کی حفاظت اور دفاع پر خاصی توجہ دی جا رہی ہوگی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ طراق، بوتھان پر قابض ہو چکا ہے اور اس کے جاسوس بھی یہاں اپنا کام کر رہے ہوں گے۔"

"مجھے توقع ہے کہ تمھاری نانی میرے ساتھ دوستانہ سلوک کرے گی جس کا میں حق دار ہوں۔ اور وقت آنے پر تم بھی میری ہر ممکن مدد اور حمایت کرو گی۔" میں نے کشتی کھینا بند کرتے ہوئے کہا۔

"کشتی کھینا جاری رکھو سرفروش۔ یہ باتیں ہم ساحل پر پہنچ کے بعد بھی جاری رکھ سکتے ہیں۔ دیکھو نا ہمارے پاس ایسے بڑے جہاز نہیں ہیں جیسے طراق کے پاس ہیں اور وہ کسی وقت بھی ہماری طرف آسکتے ہیں۔"

میں نے ساحل کی طرف دیکھا۔

ابھی ساحل کافی دُور تھا اور صرف الاؤ کی آگ اندھیرے میں کسی مشعل کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔

میں پانی میں اُتر کر کشتی دھکیلنے لگا۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد میرے قدم ریت کو چھونے لگے۔ اب میں بڑی تیزی اور آسانی سے کشتی ساحل کی طرف بڑھانے لگا۔

جب کشتی ساحل سے کوئی دو سو ہاتھ دُور رہ گئی تو مجھے صبح کاذب کی روشنی میں الاؤ کے گرد کھڑے لوگ بھی وہاں دکھائی دینے لگے۔ کچھ اور آگے بڑھا تو پتہ چلا کہ وہ تقریباً درجن بھر آدمی ہیں انھوں نے نیزے اُٹھا رکھے تھے اور وہ سب کے سب باوردی تھے اس لیے مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ وہ سپاہی ہیں۔

وہ الاؤ سے کچھ ہٹ کے ایک کھمبے کے پاس کھڑے تھے۔

میں نے کشتی روک کر تلوار اُٹھانے کے لیے اس میں ہاتھ ڈالا تو ہکا بکا رہ گیا۔

میری تلوار وہاں موجود نہیں تھی۔

"میری تلوار کہاں ہے دیوی؟" میں نے پوچھا۔

"تمھاری تلوار سے تو اب سمندر کی تہ میں تیرنے والی چھوٹی چھوٹی سنہری مچھلیاں آنکھ مچولی کھیل رہی ہوں گی سرفروش۔ کچھ دیر پہلے میں نے چپکے سے اُسے سمندر کی نذر کر دیا تھا۔"

"مگر کیوں؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟ میں تمھارا غلام نہیں بلکہ ایک جنگجو ہُوں اور مجھے ہر وقت تلوار کی ضرورت رہتی ہے۔ بتاؤ تم نے تلوار سمندر میں کیوں پھینکی؟"

"غصّے میں مت آؤ سرفروش۔ اسی میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔"

"اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں نہتا ہو کر تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو یہ تمھاری بھُول ہے، مُونا۔ میں اب بھی تمھارے دوستوں اور حامیوں کے یہاں تک پہنچنے سے پہلے تمھاری گردن مروڑ سکتا ہُوں۔"

مُونا نے قہقہہ لگایا اور جواب دیا۔ "تم ایسا کر سکتے ہو مگر میں جانتی ہُوں کہ تم ایسا نہیں کرو گے۔ اب میری بات غور سے سنو۔ میں نے برگا کے ذریعے پیغام بھجوایا تھا... اپنی نانی اور نانا کو کہلوایا تھا کہ..."

"تو یہ تھیں وہ سرگوشیاں جو تم بوتھان کے ساحل پر برگا سے کر رہی تھیں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی ساحل پر کھڑا کوئی آدمی چلاّیا۔

"بوتھان کی دیوی مُونا۔ ہم تمھیں درِ شہوار روموولیشا اور ان کے برادرِ محترم کوتار کی طرف سے خوش آمدید کہتے ہیں۔"

مُونا نے اُسے کوئی جواب نہ دیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

"اب وضاحت کا وقت نہیں رہا سرفروش۔ کوتار یہاں کا بادشاہ اور سمری اس کی ملکہ ہے۔ برگا اُن سے مل کر سارے حالات بتا چکا ہے۔ یہ بے حد ضروری تھا۔ ورنہ تمھاری جان کو خطرہ

لاحق ہوتا کیونکہ یہاں کے عسکری بڑے آشفتہ سر اور اکھڑ مزاج کے مالک ہوتے ہیں۔ مجھے اب بھی اُن سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے کیونکہ یہ مقام نہ تو بوتھان ہے اور نہ ہی رومو ہے۔"

"اور یہ خطرہ محسوس کرنے کے باوجود تم نے میری تلوار سمندر میں پھینک دی۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ میں نہتا زیادہ محفوظ رہوں گا؟" میں نے اُن سپاہیوں پر نظر ڈال کر کہا۔ "لیکن تم جنھیں خونخوار اور اکھڑ کہہ رہی ہو، ان بونوں سے تو تلوار کے بغیر ہی نمٹ لوں گا۔ ان کے لیے میرے مُکّے ہی کافی ہوں گے۔"

مُونا میرے قریب آگئی اور میرے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ "بس! میں اسی بات سے ڈرتی تھی، تم میری بات سنو گے یا نہیں؟ میں جانتی ہوں کہ تم بہت غصّہ ور اور توانا ہو... مگر میں تمھیں تنبیہہ کر رہی ہوں کہ اپنی طاقت کے بھروسے میں مت رہنا۔ یہ مملکتِ رومو ہے۔ یہاں طاقت نہیں بلکہ سازش چلتی ہے۔ یہاں کے بچّے بھی تم جیسے دیو ہیکل آدمی کو سیاست اور سازش سے پچھاڑ سکتے ہیں۔ مجھ پر اعتماد کرو سرفروش۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ اپنے غصّے پر اس وقت تک قابو رکھو جب تک کہ تم خود حالات کو پوری طرح سمجھنے اور پرکھنے کے قابل نہیں ہو جاتے۔"

"اور اگر میں تمھارے کہنے پر یہ سب کروں اور بالکل ہی بودا بن جاؤں تو تمھارے اور تمھارے اس بادشاہ اور ملکہ کے پاس میرے لیے کیا ہے؟ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

"اچھا ہی کریں گے سرفروش۔ بس تم تھوڑے عرصے اپنے آپ پر جبر کر لو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جنگ ناگزیر ہے تب میں صرف تمھارے ساتھ ہی خوش رہ سکوں گی۔ وہ لوگ ہمیں لینے آ رہے ہیں مجھ سے وعدہ کرو کہ تم میرے کہنے پر عمل کرو گے۔"

"اچھی بات ہے۔ یہ بھی کر کے دیکھ لیتا ہوں۔" میں نے اُسے مختصر سا جواب دیا کہ اس وقت میں خود بھی اپنے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی نہیں کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی نہیں جانتا کہ مجھے کب تک یہاں رہنا ہے اور ڈاکٹر فریدوں کب مجھے واپس بلائے گا۔

سب سے پہلے جو عہدے دار کشتی کے قریب آیا، اس نے سر خم کر کے مُونا کو تعظیم دی اور میری جانب دیکھا تک نہیں... مگر میں اس عہدے دار کو دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ مجھے نزاکت کا پُتلا دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے چاندی کا خود پہن رکھا تھا اور اس کی وردی کیا تھی، زرق برق قسم کا لباس تھا۔ مجھے یہ سوچ کر دُکھ ہوا کہ یہ لوگ طراق کے خونخوار سپاہیوں کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ تو بس کسی محل کے نمائشی حفاظتی دستے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے

مُونا کہہ رہی ہے کہ یہ بڑے آشفتہ سر اور اکھڑ قسم کے سپاہی ہیں۔

... پھر میں نے سوچا کہ اگر یہاں جنگ ناگزیر ہے تو میرے لیے اہم شخصیت بننے کے امکانات روشن ہیں۔ مُونا سپاہیوں کے جلو میں ساحل کی طرف چلی گئی۔

عہدے دار نے نرمی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "کرم آپ میرے ساتھ آیئے کہ بوتھان کی دیوی مُونا، شہنشاہ اور ملکہ عالیہ کی بھی یہی خواہش ہے۔"

میں نے ایک نظر پھر اس عہدے دار پر ڈالی۔ اس کے بال میرے دَور اور میری سرزمین کے نوجوانوں کی طرح تک آ رہے تھے۔ اس کی مونچھیں زردی مائل تھیں اور اس بہت سی خوشبو لگا رکھی تھی۔ اس کا قد بمشکل میرے شانے تک وہ اور اس کے ساتھی کچھ بیزار سے لگ رہے تھے۔ اُنھوں نیزوں اور بھالوں کے ساتھ اپنی رنگین وردیوں کی طرح رنگین باندھ رکھی تھیں۔

میں نے عہدے دار کے جواب میں سر ہلا کر اثبات کا اور ساحل کی طرف بڑھنے لگا۔

ساحل پر ایک جانب دو پہیوں والی ایک بگھی کھڑی جس میں مُونا کو تکریم کے ساتھ سوار کیا جا رہا تھا لیکن میں یہ د حیران رہ گیا کہ بگھی میں گھوڑے نہیں جوتے گئے تھے بلکہ گھوڑا جگہ بارہ آدمیوں نے سنبھال رکھی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ رومو کے معاشرے میں بھی از سے جانوروں کا سا کام لیا جاتا تھا اور ان سے سلوک بھی جانوروں ہی روا رکھا جاتا ہوگا۔

"میں مُونا سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے سے کہا۔

"شوق سے جناب۔" اس نے کہا۔ "لیکن زیادہ دیر نہ گا کیونکہ قید خانہ کافی فاصلے پر واقع ہے اور اوّلین موسیقی کا و ہونے والا ہے۔"

میں نے "اوّلین موسیقی" کے مفہوم پر غور ہی نہیں کیا کیونکہ میرے ذہن میں تو "قید خانے" کے ایک لفظ نے ہلچل سی مچا دی میں تیزی سے مُونا کی بگھی کی طرف بڑھا اور اس کے کو جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ "قید خانے کا کیا چکّر ہے؟"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ "مگر وہاں تم ز

نہیں رہو گے۔ مجھ پر اعتماد رکھو۔"

"اب بھی تم پر اعتماد کروں تو مجھ سے زیادہ احمق کون ہوگا؟"

"اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، ایک محافظ بول اُٹھا اوّلین موسیقی چھوٹ جائے گی۔"

مُونا نے اُسے اُنگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یقین کرو سرفروش۔ وہاں جا کر تم بُرا محسوس نہیں کرو گے۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھنا مگر مُنہ بند رہنا چاہیے۔ اس طرح تمھیں بہت سے سوالوں کا جواب خود بخود مل جائے گا۔ اور جہاں تک یقین و اعتماد کا تعلق ہے تو اب تم اس کے سوا کر ہی کیا سکتے ہو؟"

حقیقت یہ ہے کہ میرے لیے اور کوئی چارہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔

نے گھوڑوں کی جگہ جُتے ہوئے آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے نے پوچھا۔ "یہ کون لوگ ہیں؟"

"کون؟... یہ زرد لوگ؟ ان کی طرف کوئی توجہ نہ دو۔ ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ یہ حقیر لوگ ہیں۔" یہ کہہ کر اس گاڑی کی روانگی کا اشارہ کیا... پھر مجھ سے بولی۔ "الوداع سرفروش۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی میں تم سے ملنے کی کوشش کروں گی۔ تک میری ہدایات پر عمل کرنا اور غصّے پر قابو رکھنا۔"

جب مُونا کی بگھی ٹیلوں کی اوٹ میں اوجھل ہوگئی تو عہدے دار نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم بھی دیں جناب۔ اوّلین موسیقی تو ہم سے چھوٹ ہی گئی... مگر میری ہش ہے کہ ہم دوسری موسیقی سے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔"

اس نے ایک اور بگھی کی طرف میری رہنمائی کی جو پہلی بگھی قدرے چھوٹی تھی اور اس میں چھ زرد آدمی جُتے ہوئے تھے۔

میرے ساتھ بگھی میں وہ عہدے دار اور دو سپاہی بھی سوار گئے تو زرد آدمی بگھی کھینچنے لگے۔

میں نے دیکھا کہ وہ زرد آدمی بھی کچھ بیزار سے لگتے ہیں اور بار جماہیاں لے رہے ہیں۔ سپاہیوں کی طرح اُن کی آنکھیں بھی بر شب بیداری کے باعث بمشکل کھل رہی تھیں ورنہ اُن کا چلتا تو وہ کھڑے کھڑے یا گاڑی کھینچتے ہوئے ہی سو جاتے۔

مجھے ایک بار پھر سپاہیوں پر تعجب ہوا اور رحم بھی آیا کہ یہ بچارے طراق کے جنگجو سپاہیوں کا مقابلہ کیسے کر سکیں گے؟

میں نے اُن زرد آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عہدے دار پوچھا۔ "کیا یہ غلام ہیں؟"

"نہیں جناب۔" وہ بھی جماہی لیتے ہوئے بولا۔ "یہ زرد لوگ افیون کھاتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ پینک میں رہتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں سُدھر سکتے۔"

اتنے میں ہماری بگھی کچے راستے سے نکل کر لال پتھروں والے ایک تنگ راستے پر آگئی... جس کے دونوں طرف سرسبز کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ان کھیتوں سے بھی وہی صندل اور گلاب کی ملی جُلی مہک آ رہی تھی۔

میں نے غور سے کھیتوں کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ طلوعِ آفتاب کی اوّلین کرنوں میں لال، پیلے، نیلے، سبز اور نارنجی پھولوں والے یہ کھیت بڑا مسحور کُن نظارا پیش کر رہے تھے ہر پھول پیالہ نُما تھا اور یہ خوشبو غالباً انہی پھولوں سے نکل رہی تھی۔ اس خوشبو میں سانس لینے سے مجھے کچھ خمار سا محسوس ہونے لگا۔

کھیتوں میں کچھ عورتیں بھی کام کر رہی تھیں۔ عہدے دار نے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی زرد لوگوں کی عورتیں ہیں مگر کھیتوں میں صرف غیر شادی شدہ لڑکیوں ہی کو کام کرنے کی اجازت دی جاتی ہے، وہی پھول اور ڈوڈے جمع کرتی ہیں جن سے افیون تیار ہوتی ہے۔"

عہدے دار کی اس بات سے مجھے شک گزرا کہ کہیں یہ پوست کے کھیت نہ ہوں، شاید اسی لیے مجھ پر خمار طاری ہو رہا ہے۔ میں نے زور زور سے سانس لینا بند کر دیے اور سوچنے لگا کہ ان زرد لوگوں کو شاید افیون کی لت لگا دی گئی ہے یا اس بُرائی نے ان کے معاشرے میں اتنی گہرائی تک جڑ پکڑ لی ہے کہ اب وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اتنے میں بگھی رُک گئی۔

میں نے دیکھا کہ عہدے دار جس نے اپنا نام برگوش بتایا تھا، بار بار میری طرف دیکھ رہا ہے۔

اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ میرے دِلی تاثرات کا اندازہ لگا رہا ہو۔ میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور میں نے سوچا شاید اُسے میری تمام کیفیات کا جائزہ لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے میں نے سوچنا ترک کر دیا اور یوں جماہیاں لینے لگا جیسے مجھ پر بھی نشے کی کیفیت طاری ہو چکی ہو۔

"بگھی کیوں روک دی گئی ہے؟" میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہ موسیقیِ اوّل اور موسیقیِ دوم کا درمیانی وقفہ ہے۔ اس وقفے میں زرد لوگ افیون کھاتے ہیں۔" وہ بولا اور اُس نے گاڑی کھینچنے والوں کی طرف اشارہ کیا۔

"اور یہ موسیقیِ اوّل و دوم سے کیا مُراد ہے؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے دُور اُفق کی طرف اشارہ کیا۔
میں نے اُدھر دیکھا تو مجھے ایک پہاڑ کی برف پوش چوٹی سے دُھواں اُٹھتا دِکھائی دیا۔ وہ بلاشبہ زندہ آتش فشاں تھا اور اُس کی پہلی اور دُوسری گڑگڑاہٹ کو موسیقی اوّل و دوم کا نام دیا گیا تھا۔
"لہٰذا۔۔۔ تو موسیقی کی یہ آواز وہاں سے آتی ہے؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔
"ہاں۔ کیسے اور کیوں؟ یہ راز سوائے ڈیرِ شہوار رومو وشینا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" اُس نے اپنی مُونچھیں مروڑتے ہوئے جواب دیا۔ "کہا جاتا ہے کہ جس روز یہ موسیقی ختم ہُوئی اُسی دن رومو تباہ ہو جائے گا۔"
مَیں نے کان لگا کر سُنا تو جوالا مُکھی کی ہلکی ہلکی گڑگڑاہٹ درختوں، کھیتوں اور میدانوں سے گزرتے ہوئے موسیقی جیسی ہی لگ رہی تھی۔۔۔ پھر میں نے اُن زرد لوگوں کی طرف نگاہ ڈالی جن میں ایک سپاہی افیون تقسیم کر رہا تھا اور وہ جلدی جلدی اُسے جھپٹ رہے تھے۔
جونہی وہ افیون کی گولی چمڑے کے تھیلے سے نکالتا، کئی ہاتھ اُسی کی طرف بڑھ جاتے مگر وہ سب کو باری باری ایک ایک گولی دیتا رہا۔
وہ لوگ جلدی جلدی گولیاں چبانے لگے۔
جب سپاہی دوبارہ بگھی پر سوار ہُوا تو میں نے بھی اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے برگوش کی طرف دیکھا۔
"گوبھان کی دیوی کا حکم ہے کہ معزز مہمان کی ہر خواہش کا احترام کیا جائے۔" برگوش بولا۔
سپاہی نے یہ سُن کر چمڑے کا تھیلا میرے سامنے کر دیا۔ میں نے افیون کی ایک گولی نکال کر اُسے سُونگھا تو اُس سے ویسی ہی خوشبو آرہی تھی جیسی کہ اس وقت پوری فضا میں رچی ہُوئی تھی۔ میں نے اُس کا ذرا سا ٹکڑا توڑ کر چکھا تو وہ مجھے بے ذائقہ محسوس ہوا۔۔۔ میں نے اُسے تھوک دیا اور گولی واپس دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے اچھی نہیں لگی۔"
برگوش نے زرد آدمیوں کو اشارہ کیا۔
وہ پھر گاڑی کھینچنے لگے۔
ایک گھنٹے بعد جب ہماری گاڑی فیر تا میں داخل ہُوئی تو میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ یہ شہر بڑی خوبصورتی اور منصوبہ بندی کے تحت بسایا گیا تھا۔ سڑکیں کشادہ تھیں، جگہ جگہ چوراہے اور باغیچے بنے ہُوئے تھے جن میں رنگ برنگے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ باغیچوں میں ننھے مُنّے بچے کھیل رہے تھے۔ فوارے پانی کی رِم جھم دکھا

الف لیلہ ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

انسان اور شیطان

مصنف محمد فراز

امیر علی خان کی خوفناک آپ بیتی

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

فون 7668958

رہے تھے اور سب سے بڑھ کر ہر طرف سے ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔
برگوش نے ایک مرتبان نما چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ آواز اسی میں سے آرہی ہے۔ ایسے مرتبان جگہ جگہ لگے ہُوئے تھے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ موسیقی اسی جوالا مکھی کی ہے جس کا ڈیرِ شہوار دیشتا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔
مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔
میں نے چُپکے سے اپنے گندے ناخن اپنے بازوؤں میں گاڑ دیے تاکہ تکلیف سے ذہن اور آنکھوں میں آنے والے خمار کو دُور کر سکوں۔۔ پھر میں نے برگوش سے کہا۔ "اس وقت میری حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ ساری رات سمندر کے کھاری پانی میں تیرنے کے باعث میرے جسم میں کھجلی اُٹھ رہی ہے۔ مجھے سخت بھوک اور شدید پیاس بھی لگ رہی ہے۔ اگر میرا نیا لباس نہ ملا تو میرا بدن غرق ہو جائے گا۔ یہ بتاؤ کہ ہم قید خانے کب پہنچیں گے۔ اگر وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر ہے تو میں وہاں جانے سے انکار کر دُوں گا اور سب چیزیں طلب کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"
برگوش مسکرانے لگا۔
وہ جانتا تھا کہ مجھ پر بھی نشے کی سی کیفیت طاری ہے اور اسی کے زیرِ اثر اس قسم کی گیدڑ بھبکی دے رہا ہُوں۔ تاہم اُس نے خوش اخلاقی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور ایک عظیم عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بولا۔ "ذرا اُدھر تو دیکھیے جناب۔"
میں نے اُس عظیم الشان عمارت کی طرف دیکھا جو سنگِ مرمر سے تعمیر کی گئی تھی اور سُورج کی شعاعوں میں یوں جگر جگر کر رہی تھی جیسے ہیرے کی کنی پر روشنی کی کرن پڑ رہی ہو۔ اس عمارت کے بالائی حصے پر ایک قرمزی پرچم لہرا رہا تھا جس پر پوست کا پھول کڑھا ہُوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے طراق شبستانی کا اژدہے والا نشان یاد آگیا

جس میں اژدہا اپنی دُم خود ہی کھا رہا تھا۔
"یہ ہمارے شہنشاہ و نامدار کوتار اور ملکۂ عالیہ سمری کا محل ہے۔ اگرچہ میں کسی قسم کی پیش گوئی کا اہل ہُوں اور نہ ہی مجاز ہُوں۔ پھر بھی ممکن ہے کہ کسی روز آپ اس محل میں بُلائے جائیں اور شاہ و ملکہ کی مُلاقات سے نوازے جائیں۔"
۔۔۔ مگر اُس وقت میری ذہنی کیفیت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں برگوش سے لڑ پڑوں۔
"تم پیش گوئی کرنے کے مجاز نہیں مگر اس کے باوجود تم نے پیش گوئی کی ہے۔ اب مجھے اس بات میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں رہا کہ یہ بات رومو میں قابلِ تعزیر ہے کیونکہ کسی پیش گوئی کے لیے سوچ اور غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے اور جو کچھ میں نے اس مختصر سے وقت میں دیکھا یا سُنا ہے اُس کے تحت سوچ اور غور و فکر کو ایک بہت بڑا جُرم ہونا چاہیئے۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ تمھارے ہاں سوچ اور غور و فکر کی سزا کیا ہے؟ اپنا دماغ استعمال کرنا کتنا بڑا جرم ہے؟ اس قسم کے مجرموں کو پھانسی دی جاتی ہے۔ قید میں ڈالا جاتا ہے یا افیون اور اس مسلسل موسیقی سے محروم کر دیا جاتا ہے؟"
اگرچہ برگوش میری باتوں سے جھنجھلا گیا لیکن وہ مُسکرانے لگا۔ اُس نے سر خم کیا اور مُونچھیں مروڑنے لگا اور مجھے جواب دینے سے پہلے اُس کا ایک ہاتھ تلوار کے دستے تک پہنچ گیا۔
"مُونا نے مجھے بتا دیا تھا جناب کہ آپ میرے لیے کچھ مشکلیں پیدا کر سکتے ہیں لہٰذا مجھے اُن کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ میں اپنے فرض سے غافل نہیں ہُوں۔ مجھے یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ میں آپ کے استفسارات کا جواب بھی دُوں چنانچہ میں اس ہدایت پر بھی ضرور عمل کروں گا۔ ہمارے ہاں سوچ اور غور و فکر پر نہ تو کوئی پابندی ہے اور نہ ہی کوئی سزا ہے۔ ۔۔۔ برتھان اور شبستان کی طرح ہمارے ہاں بھی جرم ہوتے ضرور ہیں لیکن ہم اُن لوگوں جیسی سزائیں نہیں دیتے۔ ہم جرم کی سزا جرم سے نہیں دیتے۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔"
"لیکن تمھارے ہاں قید خانوں کا وجود تو تمھارے اس جواب کی نفی کرتا ہے۔ آخر مجھے بھی تو قید خانے ہی لے جایا جا رہا ہے لہٰذا کہو کہ یہ جھوٹ ہے۔"
برگوش مُسکرا کر بولا۔ "جھوٹ رومو میں بھی بولا جاتا ہے جناب۔ خاص طور پر اُونچے طبقے میں تو کچھ زیادہ ہی بولا جاتا ہے۔ یہ ہماری زندگی کا طریق ہی نہیں بلکہ اس میں ہماری بقا بھی مضمر ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے پھر مُونچھوں کو تاؤ دیا اور بات جاری رکھی۔ "کون کہہ سکتا ہے کہ کون سی بات جھُوٹی ہے اور کون سی سچی ہے۔ آج جو جھُوٹ ہے کل سچ بن جاتا ہے اور آج جو سچ ہے کل اُسے جھُٹلا دیا جاتا ہے۔"
میں اُسے کہنے ہی والا تھا کہ اپنا یہ جھوٹ سچ والا فلسفہ بند کرے کہ اچانک اُس نے ایک سمت اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔ "لیجیے۔ آپ کا قید خانہ بھی آگیا۔ اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا جناب۔"
میں نے ادھر دیکھتے ہُوئے تعجب سے پُوچھا۔ "یہ قید خانہ ہے؟"
"جی ہاں۔ رومو کی ایک اور عجیب روایت۔ ہم لوگوں کو قید خانے میں مقید نہیں رکھتے بلکہ آزادی دیتے ہیں۔ جب وہ یہاں تھوڑا سا عرصہ گزار لیتے ہیں تو خود بخود اپنے آپ کو قید خانے تک محدود کر لیتے ہیں۔ اگر آپ سوچیں، غور و فکر سے کام لیں اور مُشاہدہ فرمائیں تو آپ کو ہمارا یہ انتظام ناقص معلوم نہیں ہوگا۔"
وہ مجھے جس قید خانے میں لایا تھا، وہ ایک نہایت وسیع و عریض احاطہ تھا جس میں ہر طرف درخت تھے، پھول تھے، چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں، فوارے تھے۔ ہر سایہ دار شجر کے نیچے سنگِ سفید کی سفید بنچ نما سلیں رکھی ہوئی تھیں اور ہر جگہ وہی میٹھی مگر پُرسوز موسیقی بھی سُنائی دے رہی تھی۔
اس احاطے میں بڑے بڑے میدان بھی تھے جہاں کچھ لوگ کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔
اگرچہ وہاں مجھے بہت سے زرد لوگ بھی باغبانی اور صفائی کرتے دکھائی دیئے مگر مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ قیدی ہیں یا قید خانے کے عملے کے لوگ ہیں۔ وہاں میں نے کوئی نگراں یا کوئی پہرے دار بھی نہیں دیکھا۔
ہماری بگھی احاطے سے گزرتی ہُوئی دُوسرے کنارے پر جا پہنچی جہاں بڑے بڑے درختوں کے عقب میں ایک منزلہ چھوٹی چھوٹی بہت سی عمارتیں بنی ہُوئی تھیں۔
برگوش بگھی سے اُترا اور ادب سے مجھے بھی اُترنے کا اشارہ کیا پھر وہ ایک عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔
"شاید آپ ایسا نہ سمجھتے ہوں مگر میں آپ کا دوست ہُوں۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ اس مُونا کے دوست ہیں جن کی میں پرستش کرتا ہُوں اور یہ بھی کبھی فراموش نہ کیجیے گا جناب کہ وہ بھی آپ کی دوست ہے۔ اب میں چلتے چلتے آپ کو صرف اتنا اور بتا دینا چاہتا ہُوں کہ مُونا کی ہدایت پر آپ کو آپ کی اپنی حفاظت کے پیشِ نظر یہاں لایا گیا ہے۔ یہ نہ سمجھیے گا کہ وہ آپ سے پیچھا چھڑانا یا آپ کو کسی تکلیف و مصیبت میں مُبتلا کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت

تک صبر سے کام لیجیے گا جب تک وہ اپنی حسبِ منشا معاملات نہ سلجھا لے۔ یہ آپ ہی کے فائدے کی بات ہے اور ہاں۔ مُونا پہ مکمل اعتماد رکھیے۔"

اُس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی اور مطمئن ہو کر کہ کہیں کوئی نہیں دیکھ رہا، ایک قدم میری طرف بڑھایا اور سرگوشیاں کرنے لگا۔ "ماضی میں مُونا نے مجھ سے بھی محبت کی ہے۔۔۔ لیکن یہ تب کی بات ہے، جب میں ذرّہ شہوار و یشتا کا پیغام لے کر بوتھان گیا تھا۔ اب وہ محبت اور رفاقت دَم توڑ چکی ہے لیکن مجھے اس کا کوئی گلہ، کوئی شکوہ اور کوئی پچھتاوا نہیں۔ اب مُونا صرف آپ کو چاہتی ہے، اور اس معاملے میں، مَیں اُس کی ہر ممکن مدد کروں گا اگرچہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے!"

مجھے نہ تو مُونا پر اعتماد تھا اور نہ ہی برگوش پر۔۔ مگر حالات کے پیشِ نظر میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "مُونا کے سابق محبوب کی حیثیت سے تم کیسی مدد کرو گے، میں خوب جانتا ہوں!"

اُس نے قہقہہ لگایا اور بولا "میں آپ کا طنز سمجھتا ہوں جناب۔ مگر آپ، رد موکی روائتیں نہیں جانتے، ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے کہ مرگِ محبت، آغازِ دوستی ہوتی ہے۔ اچھا جناب اب مجھے اجازت دیجیے۔ ابھی مجھے قید خانے کے ناظم سے آپ کی حوالگی کے دستخط بھی لینے ہیں۔ ویسے آپ جب چاہیں اور جہاں آنا جانا پسند فرمائیں، یہاں آپ پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی!"

میں نے سوچا کہ یہ بعد کی بات ہے، ابھی تو مجھے بہت کچھ سوچنا اور ان حالات میں اپنی بقا اور تحفظ کے لیے غور کرنا ہے۔

جب برگوش چلا گیا تو میں درختوں کے جھنڈ کے نیچے پڑی ہوئی دبیز سنا سل پر بیٹھ گیا۔

قریب ہی کچھ لوگ شطرنج جیسا کوئی کھیل کھیلنے میں معروف تھے۔ مگر اُس کے مہرے یک رنگ تھے۔ البتہ وہ شاہ فرزیں اور پیادوں کی بجائے مختلف قسم کے پھولوں سے مشابہت رکھتے تھے۔ میں کافی دیر تک یہ کھیل دیکھتا رہا۔۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آ سکا اور نہ اُن لوگوں نے میری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا ہی گوارا کیا۔

میں نے اُن کا جائزہ لیا۔

اُن میں ہر عمر کے لوگ شامل تھے مگر کسی کے چہرے اور آنکھوں سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ مجرم بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ وہ یا تو سیاسی "قیدی" ہو سکتے تھے یا پھر بے ضرر سے نیم دیوانے تھے۔

اس احاطے میں بیشتر لوگ مجھے اپنے آپ میں مگن دکھائی دیے۔ شاید افیون کے نشے نے اُنھیں ایسا بنا دیا تھا۔ میں اب تک یہ بھی نہ جان سکا تھا کہ اُنھیں اس نشے کا عادی بنایا گیا ہے یا وہ خود ہی اس عادتِ بد میں مُبتلا ہوئے ہیں۔ بہر صورت، اگر یہاں لوگوں کو منشیات کا عادی بنا کر اُن سے فہم و ادراک کی قوت چھین لی جاتی ہے تو میں اس سلسلے میں بے حد محتاط رہوں گا۔

میں بڑی دیر تک وہاں بیٹھا سوچتا رہا۔

مجھے خیال آیا کہ مونا کوئی نیا کھیل کھیل رہی ہے اور برگوش اُس کا مُہرہ ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے، اُس نے میرے اور اپنے تعلقات کا ذکر محض برگوش کے دل میں جذبۂ رقابت اُجاگر کرنے کے لیے کیا ہو، کافی غور و خوض کے بعد بھی میں اس نتیجے پر نہ پہنچ سکا کہ مُونا دراصل میرے لیے کیا ہے۔ تاہم میرے لیے یہ اَمر ضروری ہو گیا تھا میں ذرّہ شہوار رد مو و یشتا سے کسی نہ کسی طرح ملاقات کروں۔

وہاں کے اقتدار کی مالک وہی تھی۔

میں انھی سوچوں کے گرداب میں گھرا ہوا تھا کہ ایک زرد آدمی، زرد لباس میں میرے پاس آیا۔ میں آپ کو بتانا بھول گیا تھا، زرد لوگ، زرد رنگ کا لباس پہنا کرتے تھے اور یہ اُن کا مخصوص لباس تھا۔۔۔

وہ ایک فربہ اندام آدمی تھا۔ اُس نے میرے سامنے سر خم کرتے ہوئے کہا "خوش آمدید جناب! میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہُوں۔ میرا نام کُن خوش ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ تشریف لائیں تو میں آپ کے لباس اور غسل کا بندوبست کر دوں۔ اس کے بعد کھانا اور آپ چاہیں تو خوش وقتی کے لیے کوئی ساتھی بھی لے آؤں گا۔ آج ہمارے پاس دیہات سے نئی خواتین تشریف لائی ہیں!"

میں اُٹھ کر اُس کے ساتھ چل دیا۔

"مجھے کسی عورت کی ضرورت نہیں!"

وہ مسکراتے ہوئے بولا "بہر حال، غسل خانے اس طرف ہیں جناب!"

میں نے سوچا کہ شاید اس سرزمین پر زرد رُو لوگوں کو حسبِ ضرورت جنم دیا جاتا اور اُن کی ذہنی اِستعداد کے مطابق اُن سے کام لیا جاتا ہوگا۔ یہاں کا حکمراں طبقہ بھی بہار سے دُور اور دُنیا کی طرح پھولوں اور حسنِ موسیقی سے لطف اندوز ہونے میں معروف رہتا لیکن جب ایسے طبقے کی عیاشی اور بے اعتدالیاں حد سے بڑھ جائیں تو بغاوت کی چنگاری بھڑک کر محلوں اور تاج و تخت پر جا پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ طراق بھی اُن لوگوں کی دہلیز تک آ پہنچا ہے۔

مجھے ایک گرم اور خوشبودار حمام میں نہلایا گیا اور پھر قیدیوں کی وردی دی گئی جو بڑی مشکل سے دستیاب ہوئی تھی۔

اب مجھے طعام گاہ کی طرف لے جایا گیا۔

طعام گاہ وسیع اور خنک تھی مگر جب کھانا میرے سامنے لایا گیا تو میں نے کھانے سے انکار کر دیا اور کُن خوش کو بلا کر ڈانٹنے لگا کہ کھانا اتنا شاندار اور پُر تکلف ہونے کے باوجود افیون سے آلودہ کیوں ہے مجھے قیدیوں جیسا کھانا دیا جائے۔

"جناب! جب قیدی پہلی بار یہاں آتا ہے تو اُسے ایسا ہی کھانا دیا جاتا ہے!" اس نے دست بستہ جواب دیا۔

"دیکھو۔۔۔ تم قید خانے کے ناظم ہو تو تمھارے پاس پہرے دار بھی ہوں گے۔ اُنھیں بُلاؤ تا کہ وہ مجھے مار مار کر افیون ملا ہُوا یہ کھانا کھانے پر مجبور کر دیں ورنہ مجھے بھی وہی کھانا دو جو دُوسروں کو دیا جاتا ہے"

"مگر جناب یہاں کسی پر ہاتھ اُٹھانا جُرم ہے۔ میں نہ تو خود کسی پر تشدد کر سکتا ہُوں اور نہ ہی کسی کو ایسا کرنے کا حکم دے سکتا ہُوں"

میں یہ سب کچھ صرف ہنگامہ آرائی کے لیے کر رہا تھا کہ بات آگے بڑھے تو میں شاید ذرّہ شہوار و یشتا تک جا پہنچوں لیکن معلوم ہوتا تھا کہ مجھے ناکامی ہی ہو گی۔

"دیکھو اپنے بارہ آدمی بُلا لو کہ تمھیں اُن کی ضرورت پڑنے ہی والی ہے!"

۔۔ وہ تب بھی نہ مانا تو میں اُٹھ کر ایک طرف چل دیا۔

وہ بھی میرے پیچھے پیچھے بھاگا آیا تا کہ مجھے میرا کمرہ دکھا سکے۔

میں نے پلٹ کر کُن خوش کی طرف دیکھا اور کہا "تمھیں مجھ کو کمرہ دکھانے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے لیے خود ہی کمرہ تلاش کروں گا۔ میں بہت تھکا ہُوا ہُوں اور آرام کرنا چاہتا ہُوں۔ جب میں خوب سو کر اُٹھوں تو مجھے اُسترا اور قینچی درکار ہو گی تا کہ میں اپنے بال اور داڑھی تراش سکوں!"

"اُسترے اور قینچی کی ضرورت ہے جناب۔ ہمارے ہاں آج ہی ایک ایسی لڑکی آئی ہے جو بہترین حجام ہے!"

"مجھے حجام لڑکی کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی وقت بھی میرے لیے بے حد خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ بس اب میرا پیچھا چھوڑو اور مجھے آرام کرنے دو!"

"مگر آپ تنہا کمرے میں نہیں رہ سکتے جناب!" وہ گڑگڑایا۔ "قانون کے مطابق ہر کمرے میں دو قیدی رہنے چاہئیں اس لیے آپ۔۔!"

"مگر میں یہاں راہ داری میں تو تنہا سو سکتا ہُوں نا؟۔۔ یا یہاں بھی تم کسی دوسرے قیدی کو سُلانا ضروری سمجھتے ہو؟"

"نہیں جناب!" وہ بولا "آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ کمرے کے باہر جہاں آپ کا جی چاہے بیٹھیں یا لیٹیں۔ آپ یہاں سو بھی سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ کو آرام دہ بستر اور تکیے وغیرہ کی ضرورت نہ ہو اور آنے جانے والوں کی وجہ سے آپ کی نیند میں خلل نہ پڑے!"

چونکہ میں آرام کرنا اور پھر مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا اس لیے میں نے کہا "اچھا میں تمھارے لیے مزید کوئی مسئلہ نہیں بننا چاہتا۔ مجھے کمرہ دکھاؤ!"

وہ میری اس بات سے خوش ہو گیا اور بولا "بہت بہت شکریہ حضور۔ مجھے پہلے ہی سے بتا دیا گیا تھا کہ آپ مسائل کھڑے کر سکتے ہیں مگر آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ ورنہ میں زرد آدمی ہُوں۔ خواہ مخواہ مارا جاتا اور جہاں تک کھانے کا معاملہ ہے تو جب آپ کو بھوک لگے، آپ خود ہی کھا لیں گے!"

میں اُس کی بات کا جواب دیے بغیر اُس کے پیچھے پیچھے چلتا اور سوچتا رہا کہ جب سو کر اُٹھوں گا تو باہر چلا جاؤں گا۔ اور کوئی پھل وغیرہ توڑ کر کھا لوں گا تا کہ نشہ آلود غذا سے محفوظ رہ سکوں۔

اتنے میں زرد آدمی نے ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

میں اس چھوٹے سے دروازے پر رُک کر سوچنے لگا کہ اس کوٹھری میں دو آدمی کیسے رہ سکتے ہوں گے۔۔۔ مگر جب اندر قدم رکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ایک اچھا خاصا کمرہ تھا اور اس میں دو بڑے بڑے پلنگ بچھے ہوئے تھے جن میں سے ایک پر وہ دراز تھا۔

اُسے دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

میرے نزدیک یہ ناممکن تھا۔

وہ تن و توش میں میرے برابر ہی تھا اُس نے مجھ جیسی ہی وردی پہن رکھی تھی مگر اس کے بال ترشے ہوئے تھے اور داڑھی مونچھ صاف تھی چہرے سے داڑھی اور دھول مٹی صاف ہونے کے باوجود میں اُسے پہچان گیا کیونکہ رخسار اور آنکھ پر زخم کے نشان اُس کی سب سے بڑی پہچان تھے۔

وہ بھی بغور مجھے دیکھتا رہا۔

"اوہ۔۔۔ تو یہ آپ ہیں۔ مُونا کی ناک کی قسم میں نے تو یہ سوچ لیا تھا کہ آپ بوتھان کی غلاظتوں میں غرق ہو گئے ہوں گے!"

میں غلاظتوں کے فرزند ساحر کو دیکھ کر ہنس پڑا۔

میں تمھارے بارے میں یہ سمجھا تھا کہ تم زیرِ زمین سُرنگ

میں جاں بحق ہو گئے ہو گے۔ تم سے زیادہ فکر مجھے تمھارے اس خزانے کی تھی جو تم نے اپنی آنکھ کا زخم بنا کر چھپا رکھا تھا۔ بہر صورت تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر جب میں اُس سے ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھا تو اچانک میری نگاہ زرد آدمی پر پڑی جو میرے پیچھے کھڑا ساحر کو کچھ اشارے کر رہا تھا۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ میری اور ساحر کی ملاقات محض اتفاق نہیں ہے بلکہ جان بوجھ کر اس کا انتظام کیا گیا ہے... لیکن یہ اہتمام کس نے اور کیوں کیا ہے؟

"ایسا صرف مُونا ہی کر سکتی ہے" میرے ذہن نے میرے سوال کا جواب دیا۔

میں نے ساحر سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کا ہاتھ دبایا تو اُس نے بھی زور آزمائی دکھانا چاہی مگر جلد ہی بول اُٹھا۔

"بس بس جناب! اتنا ہی کافی ہے اگر آپ نے میرا پنجہ توڑ ڈالا تو میں آپ کی خدمت کیا خاک کر سکوں گا؟"

اِتنے میں مجھے اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی... آواز آئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

زرد آدمی جا چکا تھا۔

ساحر میری طرف بڑھا اور کمرے کی ایک دیوار میں لگے موسیقی والے مرتبان نما کھوکھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں کہنے لگا "اس سے ہوشیار رہیے گا۔ مجھے ظن سے بھی لگاؤ ہے اور اپنی زندگی بھی عزیز ہے... میرا مطلب ہے کہ میں موسیقی پسند کرتا ہوں... مگر یہ لوگ اس آلے سے صرف موسیقی ہی نہیں سنواتے بلکہ خود بھی دوسروں کی باتیں سنتے ہیں۔"

"اچھا!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں... میں یہ تو نہیں جانتا کہ کیسے؟ شاید ہوا کی لہروں سے آواز دوسری طرف پہنچ جاتی ہوگی۔ لیکن اگر بات سرگوشی میں کی جائے تو کوئی خطرہ نہیں۔"

میں نے یک چشم ساحر کی صحیح آنکھ میں دیکھا۔

اُس میں دھوکا یا فریب نہیں بلکہ صرف شرارت تھی۔ گویا وہ ابھی اُن کی سازش کا شکار نہیں ہوا تھا۔ شاید اسے افیون استعمال نہیں کرائی گئی تھی۔

شاید ساحر نے میری سوچ بھانپ لی اُس نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "کیا آپ کھانے کو کچھ لائے ہیں جناب۔ مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تب تو مُونا کے گلاب لبوں کی قسم۔ مجھے وہ نشہ آور کھانا ہی کھا لینا چاہیے تھا۔ اب پیٹ میں چوہے نہیں بلکہ بلیاں بھی دوڑنے لگی ہیں۔"

❊

میری خواہش پر اس کمرے میں ایک میز، کرسی اور کاغذ کے ایک ڈھیر کے ساتھ قلم اور دوات بھی لا کر رکھ دی گئی۔ یہ چیزیں میں نے اس لیے منگوائی تھیں کہ بولنے کی بجائے ہم لکھ کر ایک دوسرے سے بات چیت کر لیا کریں کیوں کہ مسلسل سرگوشیوں کے باعث بھی اُن لوگوں کا مشکوک ہو جانا یقینی تھا۔

مگر جب یہ چیزیں آگئیں اور میں نے ساحر سے لکھ کر بات کرنا چاہی تو وہ بولا "مُونا کی مست انکھڑیوں کی قسم۔ آپ کے اس غلام نے بچپن میں لکھنے پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ مجھے تو ہر وقت پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا اُن دنوں چھوٹی موٹی چوری چکاری سے کام نہیں چلتا تھا اس لیے لکھنے پڑھنے کا وقت ہی نہیں مل سکا۔"

میں اس کے یہاں تک پہنچنے اور حقیقتِ حال جاننے کے لیے بے تاب تھا۔ اس لیے مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو میں نے کہا "آؤ۔ باہر چل کر ہوا خوری کریں۔"

ہم کمرے سے نکل کر میدان کے پاس سبزہ زار میں آگئے۔

جب میں نے اچھی طرح جائزہ لے لیا کہ ہمارے آس پاس نہ تو موسیقی کا کوئی کھوکھا ہے اور نہ ہی کوئی آدمی موجود ہے تو میں نے ساحر سے پوچھا "تم وہاں سے کہاں غائب ہو گئے تھے اور یہاں تک کیسے پہنچ گئے؟"

"میں سُرنگ میں کودا تو ضرور تھا... مگر اس وقت پانی اتنا اونچا تھا کہ ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہو گیا اس لیے واپس نکل آیا تھا جب اس چوراہے پر پہنچا تو دیکھا کہ سارے لوتھانی سپاہی ہلاک ہو چکے ہیں۔ لہٰذا موقع غنیمت جان کر میں نے مرنے والوں کی جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیں۔ جب کبھی شبستانی اُدھر سے گزرتے، میں کسی لاش کی طرح لیٹ جاتا تھا۔ مُردوں کی تلاشی لینے پر پتہ چلا کہ اُن میں سے بیشتر کی جیبیں پہلے ہی سے صاف ہو چکی ہیں اور کچھ دیر بعد یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جیبیں صاف کرنے والے اُنھی لاشوں میں سے تین آدمی تھے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ بُزدل زخمی ہونے اور مرنے سے

پہلے ہی یوں ڈھیر ہو گئے تھے۔ جیسے شبستانیوں نے اُنھیں تہِ تیغ کر دیا ہو۔ چنانچہ میں نے رنگے ہاتھوں اُن بدمعاشوں کو پکڑ لیا... پھر ہم نے آپس میں فیصلہ کیا کہ فی الوقت وہاں سے فرار ہو جانا چاہیے ساحل پر پہنچ کر لوٹ کا مال برابر بانٹ لیں گے۔"

اِتنے میں کچھ قیدی گزرے تو ساحر چُپ ہو گیا۔ جب وہ قیدی عمارت میں داخل ہو گئے تو اُس نے پھر بولنا شروع کر دیا "ساحل پر پہنچنے کے بعد میں نے پہلے تو اُن سے یہ دریافت کیا کہ ردمو کیسے پہنچیں گے۔ اُن میں سے ایک نے کہیں کشتی چھپا رکھی تھی۔ مگر وہ مال کے بٹوارے سے پہلے وہ جگہ بتانے پر آمادہ نہیں تھا اور جب بٹوارے کی نوبت آئی تو اس نے زیادہ حصّہ طلب کیا میں راضی ہو گیا کہ پہلے وہ کشتی والی جگہ بتا دے پھر میں دیکھوں گا کہ وہ اپنا حصّہ کیسے لے جاتا ہے... مگر ہمارے دو ساتھی زیادہ حصّہ دینے پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے جھگڑا ختم کرنے کے لیے اُنھیں ختم کر دیا۔ پھر میں نے کشتی والے سے پوچھا "بول اب کیا کہتا ہے؟ یہ بتاتا ہے کہ کشتی کہاں ہے یا نہیں۔" اُس نے وہ جگہ تو بتا دی مگر اُن مرنے والوں کے مال سے اپنا حصّہ طلب کرنے لگا۔ آپ خود ہی سوچیے کہ بغیر محنت کے کوئی چیز لینا یا مانگنا کتنی خراب بات ہے۔ پہلے تو میں نے اُسے سمجھانا چاہا کہ میری طرح قناعت پسند ہو اور جو مل گیا ہے اُسے غنیمت سمجھو مگر وہ بے حد لالچی نکلا اور اپنی بات پر اَڑ گیا۔ مجبوراً مجھے اس کو بھی مارنا پڑا۔ مگر جناب! مُونا کی قسم، میں نے اپنے دوستوں کو بڑے احترام سے ریت میں دفن کیا، مال منال سمیٹا، کشتی نکالی اور اِدھر کو چل پڑا۔"

"مگر تم یہاں قید خانے میں کیسے پہنچ گئے؟" میں نے پوچھا۔

"پہنچا کہاں جناب، پہنچا دیا گیا۔ جب میری کشتی ردمو کے ساحل پر لگی تو وہاں دوسرے لوگ ہی نہیں، سپاہی بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے مجھ سے سوالات کیے اور پھر مجھے گرفتار کر لیا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں خود سپاہی ہوں اور کیسا سپاہی ہوں میں چاہتا تو ردمو کے چار چھ فوجی ناشتے کے طور پر چٹ کر جاتا مگر میں نے سوچا کہ میزبانوں سے لڑنا جھگڑنا بد اخلاقی ہے چنانچہ یہاں تشریف لے آیا اور اب مجھ سے بھوک کے مارے بولا بھی نہیں جا رہا۔"

ہم فوارے سے اُٹھ کر عمارت کی طرف چل دیے۔

"تم نے یہاں کھانا کیوں نہیں کھایا؟" میں نے پوچھا۔

"اُسی وجہ سے جس کی بنا پر آپ نے نہیں کھایا۔ یہاں یہ لوگ کھانے میں افیون ملا دیتے ہیں تاکہ لوگ اپنے آپ میں مگن رہیں اور کچھ سوچ ہی نہ سکیں۔ جبھی تو آپ نے دیکھا کہ یہاں قید خانے میں زندگی کی رفتار کتنی سست ہے۔ وہ کھیلتے بھی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے رقص فرما رہے ہوں... مگر میں اپنے آپ کو افیون سے محفوظ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔"

مجھے ساحر کی صورت میں ایک اچھا ساتھی اور جانثار مل گیا تھا وہ جنگجو اور بہادر بھی تھا۔ گھٹیا حرکتوں کے باوجود اُس میں خوبیاں بھی تھیں۔

"تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ کھانے میں افیون ملاتے ہیں؟ کیا تم پہلے بھی ردمو آ چکے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

وہ میرے اس سوال پر خاموش رہا اور کچھ سوچنے لگا۔ میں سمجھا وہ اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا... مگر اُس نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "ہم لوتھان میں اتفاقاً ملے تھے، پھر بچھڑ گئے اور اب تقدیر نے ہمیں دوبارہ ملا دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ستارے ایک دوسرے سے ملتے جُلتے ہیں اور مستقبل کی جھولی میں اچھائی یا بُرائی جو کچھ بھی ہے، سانجھی ہے، اس لیے میں آپ پر اعتماد کرتا ہوں۔"

"میں تمھارے اعتماد کو کبھی دھوکا نہیں دوں گا لیکن تم جو کچھ بھی بتاؤ، اس میں تمھاری اپنی خواہش اور مرضی شامل ہونی چاہیے۔ میرا مطلب ہے کسی کا یا میرا دباؤ نہیں... اور ہاں... مجھے تمھارے ماضی سے کوئی سروکار نہیں کہ تم کیا تھے اور کیا کرتے رہے ہو لیکن جیسا کہ تم نے کہا ہے کہ ہم مستقبل کے ساجھی بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے میں صرف مستقبل میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ اب تمھاری مرضی ہے کہ مجھے اپنے ماضی کے بارے میں بتاؤ یا نہ بتاؤ۔"

"میں اپنے ماضی کے کچھ ڈھکے چُھپے گوشے آپ کو ضرور دکھاؤں گا۔" وہ بولا "میں یہاں پہلی بار نہیں آیا بلکہ میں تو یہاں کافی عرصے تک رہ چکا ہوں۔ میں یہاں فوج میں ملازم تھا، اس لیے جانتا ہوں کہ یہاں کی فوج کتنی کمزور ہے۔ میں پہلے اس لیے خاموش ہو گیا تھا کہ اگر ان لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں ان کا سابق فوجی ہوں تو یہ فوراً مجھ پر بھگوڑے کا الزام لگا دیں گے۔"

"بھگوڑوں کو یہاں کیا سزا دی جاتی ہے؟ میرا خیال ہے، فوجی بھگوڑوں پر بھی تشدد نہیں کیا جاتا ہوگا۔"

"نہیں جناب۔ اُن پر تو ایسا ظلم کیا جاتا ہے کہ تصوّر سے میری رُوح تک کانپ جاتی ہے، فوجی بھگوڑے کو یہ لوگ پہلے منشیات کا عادی بناتے ہیں اور پھر ایک دُور دراز جزیرے پر عمر قید کی سزا بھگتنے بھیج دیتے ہیں۔" وہ ذرا سی دیر کے لیے رُکا پھر مجھے اپنی

اکلوتی آنکھ مارتے ہوئے بولا "ایک ایسے جزیرے پر جہاں خواتین کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔"

"یہ تو بڑی سخت سزا ہوئی" میں نے کہا۔

"اور کیا جناب۔ اسے غیر انسانی بلکہ غیر فطری سزا کہا جا سکتا ہے۔"

ہم ایک ایسی جگہ کے قریب سے گزرے جہاں کچھ عمر رسیدہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہماری جانب نگاہ تک نہیں اٹھائی ہم آگے بڑھ گئے۔

"آپ نے دیکھا جناب کہ یہ کتنا ذلیل نشہ ہے۔ زندگی بھر کے لیے آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتا" ساحر نے کہا۔

"سچ کہتے ہو، ساحر۔ یہ تو زندہ رہنے کے باوجود مر جانے کے برابر ہے" میں نے کہا۔

"بالکل جناب۔ بلکہ ایسی زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے۔ اور ہاں حضور، میں کوئی کام ادھورا نہیں کرتا۔ جو اقدام کرتا ہوں اُسے پایۂ تکمیل تک ضرور پہنچاتا ہوں۔ میں صرف ردمو کا فوجی بھگوڑا نہیں بلکہ شبستانی بھگوڑا بھی ہوں اور بوہتان کی وردی تو آپ میرے تن پر ملاحظہ فرما ہی چکے ہیں۔"

میں اُس کی بات پر ہنس پڑا "میں نے تمھارے جسم پر وردی ہی نہیں دیکھی، جنگ لڑتے اور لوگوں کو مارتے بھی دیکھا ہے!"

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں آقا۔ آپ اُس کمان دار کی بات کر رہے ہیں۔ جسے میں نے خنجر سے مارا تھا۔ دراصل چکر یہ ہے جناب کہ مجھے اپنی زندگی سے کبھی پیار نہیں رہا۔ میں نے ہمیشہ مرنے کی کوشش کی ہے مگر ہمیشہ اس تن دتوش کے باوجود بزدل نکلا ہوں یا قدرت نے مجھے موت کے مُنہ میں جانے سے بچا دیا ہے۔ اس لیے میں ردِ عمل کے طور پر دوسروں کو مار ڈالتا ہوں اسی بنا پر شبستان کے بہت سے فوجی افسر مجھے جانتے ہیں اور وہاں کے فوجی بھگوڑوں کی سزا یہ ہے کہ اُنھیں ایک پہیے کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور پھر ایک ایک کر کے اس کی ہڈیاں توڑ دی جاتی ہیں۔"

میں اس اطلاع پر چونک کر رُک گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے ساحر سے شبستانی فوجوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔۔۔ مگر اُس وقت میں نے اس سلسلے میں خاموش ہی رہنا مناسب سمجھا۔

"تو اس وقت تم دو ملکوں کی فوجوں کو مطلوب ہو" میں نے کچھ دیر بعد تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

"میں اپنے آپ کو بوہتانی فوج کا حقیقی بھگوڑا نہیں سمجھتا... کیونکہ مجھے بوہتان میں زبردستی بھرتی کیا گیا تھا اس میں میری اپنی خواہش اور مرضی کو قطعی دخل نہیں تھا۔"

"مگر تم تو پیدائشی بوہتانی ہو۔"

"جی ہاں۔۔۔ ایک کوڑے کا ڈھیر مری جائے پیدائش تھی۔"

ہم دونوں پھر ایک مقام پر ٹھہر گئے جہاں موسیقی کا کھوکھا اور زرد آدمی نہیں تھے۔

"دیکھو ساحر! میں پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے تمھارے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں۔۔۔ البتہ مستقبل سے ضرور ہے۔ میں تم سے وفاداری کی توقع رکھتا ہوں اور جو لوگ مجھ سے دھوکا کرتے ہیں، میں اُنھیں کبھی نہیں بخشا کرتا، یہاں جنگ ہونے والی ہے اور مجھے ردمو کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ اس لیے مجھ سے بہت سی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں۔۔۔ مگر تم تینوں ملکوں اور ان کی فوجوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو اور میری مدد کر سکتے ہو۔ اس کے صلے میں تمھیں نہ صرف تحفظ دوں گا۔ بلکہ ہر ممکن فائدہ بھی پہنچاؤں گا۔ کیا تم بوہتان کے کاہن ٹالپ کو جانتے ہو؟"

"تھو۔۔۔" ساحر نے تھوک کتے ہوئے کہا "کس غلیظ آدمی کا نام لے لیا آپ نے!"

"میں نے اُسے اتنی بڑی زک پہنچائی ہے کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گا اور زندگی کے ہر لمحے انتقام کی آگ میں سلگتا رہے گا۔ میں نے اُس سے نہ صرف مُونا چھین لی بلکہ اُسے دونوں ہاتھوں سے بھی محروم و معذور کر دیا ہے۔ وہ طراق سے سمجھوتا کر چکا ہے اور شبستانی فوجیں کسی بھی لمحے یہاں پہنچ سکتی ہیں۔ لہٰذا جس طرح تم فوجی بھگوڑے کی حیثیت سے خطرے سے دوچار ہو، اُسی طرح میں بھی ہوں۔ ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔۔۔ اور ہاں! کشتی کے ذکر پر یاد آیا کہ جب تم کشتی پر یہاں پہنچے اور گرفتار کیے گئے تو تمھیں بھی اسی جیل میں کیوں لایا گیا جہاں مجھے لایا گیا ہے؟ میرا خیال ہے، ایسا جان بوجھ کر کیا گیا ہے۔"

ساحر کچھ دیر سوچتا رہا۔۔۔ پھر بولا "میں نہیں جانتا جناب۔ آپ مجھ سے بہتر اور تیز سوچنے والے آدمی ہیں میں تو یہی سمجھا تھا کہ اتفاق نے ہمیں پھر ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔

جن دنوں ہم دلدلی جھاڑیوں میں روپوش تھے اور مُونا مجھ سے دُور دُور رہتی تھی، میں برگا سے باتیں کیا کرتا تھا اور میں نے اُسے ساحر کا قصہ بھی کئی بار سنایا تھا۔ تب میں نہیں جانتا تھا کہ برگا دراصل مُونا کا جاسوس ہے۔ اس کا انکشاف تو مجھ پر

فرار کے بعد ہوا تھا۔ چنانچہ یہ عین ممکن تھا کہ وہ اس معاملے میں شامل ہو۔ لہٰذا میں نے ساحر کو برگا کا حلیہ بتاتے ہوئے پوچھا "کیا یہاں پہنچنے کے بعد تم نے کسی ایسے نوجوان کو دیکھا ہے؟"

"ہاں، نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والا ایک نوخیز افسر تو مجھے ملا تھا اور اُس نے مجھ سے باتیں بھی کی تھیں۔"

"کیا وہ فوجی وردی میں تھا؟ اُس کا عہدہ کیا تھا؟"

"وہ ساحلی دستے کا کمان دار تھا جناب۔ اس کے پیچھے متعدد فوجی کھڑے تھے۔"

"اُس نے تم سے کیا کیا پوچھا تھا۔ اس کے بارے میں وہ... سب کچھ بتاؤ جو تم جانتے ہو۔"

"اوہ۔۔۔" ساحر نے ہتھیلی پر مُکا مارتے ہوئے کہا "تعجب کی بات تو یہ ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی تو مجھے یہاں کے مریل سپاہی لگے ہی نہیں تھے۔۔۔ وہ سچ مچ کے عسکری نظر آتے تھے۔ یہ بات میرے ذہن سے کیوں نکل گئی؟"

"کیا تمھیں ساحل سے سیدھے یہیں لایا گیا تھا؟" میں نے پوچھا

"جی ہاں۔۔۔ اور انھوں نے مجھ سے راستے میں کوئی بات بھی نہیں کی کیونکہ اُنھیں بولنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔"

"اُس نوجوان افسر نے تم سے میرے بارے میں کچھ کہا تھا، مثلاً یہ کہ میں بھی اسی جگہ آؤں گا؟"

"نہیں آقا۔۔۔ انھوں نے آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا تھا" پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا "مگر اُس نے تو جنگی لباس پہن رکھا تھا اور اُس کے شانے پر دُرِ شہوار ولیشتا کا نشان لگا ہوا تھا جو آتش فشاں میں رہتی ہے۔"

ہم اس وقت عمارت سے پہلے، ایک آخری بنچ کے پاس سے گزر رہے تھے جو سہ پہر کی ڈھلتی دھوپ میں چمک رہی تھی ساحر اس پر بیٹھنا چاہتا تھا۔۔۔ مگر میں نے اُسے روک دیا "کمرے میں چل کر تھوڑی دیر سو لیتے ہیں۔ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی ہے کہ ہمیں آرام کر لینا چاہیے۔ کچھ ہونے والا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ جو ہونا ہے، ہوتا رہے گا۔۔۔ مگر یہ پاپی پیٹ کچھ کھانے کو مانگ رہا ہے۔"

"بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے مگر اندھیرا ہو جانے دو پھر باہر جا کر دیکھیں گے۔ فی الوقت تو میں سونے سے پہلے تم سے دُرِ شہوار ردمو کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ واقعی آتش فشاں میں رہتی ہے؟۔۔۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ میں نے تو جوالا مُکھی سے دُھواں نکلتے دیکھا ہے۔"

"ہم نے دُرِ شہوار کو نہیں دیکھا۔ ویسے، وہ سیاہ موتی بھی کہلاتی ہے" ساحر نے بتایا۔

ہم کمرے میں آ گئے جہاں اُس دیواری کھوکھے سے موسیقی مسلسل جاری تھی۔ ساحر نے اس کی طرف اشارہ کیا تو میں نے سرگوشی کی۔ "میں گاتا رہوں گا، تم میرے کان میں بولتے رہنا۔ تم اُس بڑھیا کے بارے میں کیا جانتے ہو جسے دُرِ شہوار کہا جاتا ہے؟"۔

یہ کہہ کر میں گانے لگا۔ یہ گانا نہیں بلکہ وہ لوری تھی جو میری ماں مجھے سُلانے کے لیے گایا کرتی تھی اور اس کے بول کچھ یوں تھے "میں نے خوابوں میں دیکھا، میرا مُنّا محلوں میں رہتا ہے!"

میں اپنی بھونڈی آواز میں بار بار یہی بول دُہراتا اور ساحر میرے کانوں میں وہ معلومات انڈیلتا رہا جو اُسے حاصل تھیں

"آپ اُسے بڑھیا سمجھتے ہیں آقا؟ مونا کی مست اداؤں کی قسم! اگر کسی نے آپ کو یہ بتایا ہے کہ وہ بڑھیا ہے تو وہ اوّل درجے کا دروغ گو ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نانی یا دادی ہو۔۔۔ مگر وہ ایسی نانی یا دادی ہے جس پر سو جوانیاں نثار کی جا سکتی ہیں۔ میں تو اس کا ذکر سُن کر دل ہار بیٹھا تھا۔۔۔ مگر مجھ جیسا عاشق نامراد ایسی محبوبہ سے صرف خوابوں اور خیالوں ہی میں باتیں کر سکتا ہے خیر۔۔۔ اگر مُونا نے آپ کو بتایا ہے کہ وہ اُس کی نانی یا دادی ہے تو ٹھیک ہی بتایا ہو گا کیونکہ ولیشتا پر عمر اور زمانے نے کوئی نقش پا نہیں چھوڑا۔ اُسے دیکھ کر تو یوں لگتا ہے جیسے اُس نے ابھی ابھی نوعمری کی دہلیز پر قدم رکھا ہو۔ سیاہ موتی اُسے اُس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ نہ تو سفید فام ہے اور نہ ہی سُرخ۔۔۔ یا سیاہ رنگ کی۔۔۔ وہ گندمی رنگت رکھتی ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ گرگٹ کی طرح اُس کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے آقا؟ گرگٹ کیا ہوتا ہے؟"

"گرگٹ ایک چھپکلی نما جانور ہوتا ہے جو خطرے کی بُو سُونگھ کر اپنا رنگ بدل لیتا ہے۔"

"میں نے تو ایسا جانور کبھی نہیں دیکھا۔"

"لعنت بھیجو گرگٹ پر، تم ولیشتا کی بات کرو" میں نے سرگوشی کی اور پھر گانے لگا۔

"میرا خیال ہے اُسے سیاہ موتی اُسی کہانی کی وجہ سے کہا جاتا ہے جو یہاں زبان زدِ عام ہے اور کہانی یہ ہے کہ جوالا مُکھی کی تہ میں گوبھی کے پھول جتنا ایک سیاہ موتی اور اُس بادشاہ کی تلوار رکھی ہوئی ہے جس نے اپنے دور میں یہ جزیرہ دریافت کیا تھا اور

اس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ ۔ ۔ مگر اس قسم کی کہانیوں پر تو بچے یا احمق لوگ ہی یقین کر سکتے ہیں، آپ اور مجھ جیسے عقل مند نہیں۔ ۔ ۔ اور ہاں مُونا کی من موہنی مسکراہٹ کا واسطہ، اب گانا بند کر دیجیے کہ بھوکے پیٹ اسے برداشت کرنا میرے بس سے باہر ہے۔"

میں نے گانا بند کرتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔ "اچھا یہ بتاؤ کیا واقعی اس عورت کا کوئی وجود ہے۔ میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کیوں کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہی اقتدار کی مالک ہے اور اگر یہ سچ ہے تو ہمیں بہرصورت اس تک پہنچنا پڑے گا۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے تمام تر حسن و دانائی کے ساتھ وجود رکھتی ہے مگر جو الاکھی سے باہر آتی اور جو اُس کی تنہائی میں مخل ہونا چاہتا ہے، ویشتا کے محافظ اُسے قتل کر دیتے ہیں۔ مُونا کے پیکر کی قسم، کوئی اسے اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک کہ۔ ۔ ۔" ابھی ساحر اتنا ہی بتا پایا تھا کہ راہ داری میں کچھ لوگوں کے بھاگنے دوڑنے اور تلواروں سے تلواریں ٹکرانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ۔ ۔ پھر ان میں چیخ و پکار کا شور بھی شامل ہو گیا۔

میں نے دروازے کی جانب دیکھا۔

اُسے مقفّل تو کیا ہی نہیں جا سکتا تھا مگر اس وقت وہ بند ضرور تھا اور لڑائی جھگڑے کی آوازیں دم بہ دم قریب آتی جا رہی تھیں۔ اتنے میں مجھے ایک جانی پہچانی آواز۔ ۔ ۔ سنائی دی۔

"بس اب قتل و غارت گری ختم کر دو۔ جو بچ گئے ہیں انھیں کسی کمرے میں بند کر دو اور دروازے پر اُس وقت تک تالا لگا رہنے دو۔ جب تک کہ ہم کافی دُور نہ نکل جائیں۔"

میں نے ساحر کی طرف پلٹتے ہوئے سرگوشی کی۔ "ہاں تو تم کہہ رہے تھے کہ اس سے کوئی نہیں مل سکتا جب تک کہ۔ ۔ ۔"

"وہ خود کسی سے نہ ملنا چاہے اور خود ہی کسی کو نہ بلوائے۔"

"میرا خیال ہے کہ پھر تو وہ وقت آگیا ہے ساحر۔ بس ایک لمحے میں معلوم ہو جائے گا۔"

اتنے میں دروازہ پاٹوں پاٹ کھُلا اور برگا عسکری وردی میں تلوار تھامے اندر آ گیا۔ اس کے شانے پر واقعی ویشتا کے محافظ دستے والا نشان تھا اور وردی خون آلود ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "مجھے آپ سے دوبارہ ملنے اور خیر و عافیت سے دیکھنے پر بے پناہ خوشی ہوئی ہے۔ جناب۔ بہرحال، مجھے آپ کو لانے کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے اگر آپ تیار ہوں تو دیر نہ کیجیے کیونکہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر سر خم کیا اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے ایک نظر اُسے دیکھا تو مجھے اپنی غلطی یاد آگئی کہ میں تو اسے ایک عام سا نوخیز لڑکا سمجھتا تھا۔ حالاں کہ اب وہ ایک عسکری عہدے دار اور جنگ جو لگ رہا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بولا۔

"ہمیں دُرِ شہوار و لیشتا کے ہاں جانا ہے۔ جناب اور سفر کافی طویل ہے۔ معاملات ہماری توقع کے خلاف بہت تیزی سے آگے بڑھے ہیں۔ ردمو بہت بڑے خطرے سے دوچار ہو گیا ہے۔ ہمارے جاسوسوں کی اطلاع کے مطابق اگرچہ طمراق حملے کی تیاریاں مکمل نہیں کر پایا۔ مگر اس نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا ہے۔ ۔ ۔ کچھ ہی دیر قبل شبستانیوں کا ایک دستہ ہمارے ساحل پر اُترا ہے اور ہمیں اس کی بھی خبر لینی ہے۔"

میں برگا کی یہ باتیں سن کر باہر آیا تو ساحر کسی خادم کی طرح میرے پیچھے پیچھے آگیا۔ برگا اور اُس کے سپاہیوں نے ہمیں اپنی حفاظت میں لے لیا میں نے راہ داری اور عمارت کے باہر کچھ لاشیں پڑی دیکھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ مرنے والوں میں وہ کمان دار بھی شامل تھا جو صبح مجھے اس قید خانے میں چھوڑ گیا تھا۔

برگا نے اپنی تلوار سے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کبھی یہ میرا دوست ہوا کرتا تھا۔ اچھا آدمی تھا۔ مگر اس نے مختلف راستہ اختیار کر لیا۔ یہ بھی آپ کو لینے آیا تھا کہ اتنے میں، میں یہاں پہنچ گیا۔"

"یہ تو مُونا کا آدمی تھا۔ کیا اُسی نے اُسے بھیجا تھا؟" میں نے پُوچھا۔

"نہیں جناب۔ اسے مُونا نے نہیں بھیجا تھا۔ یہ کسی زمانے میں مُونا دیوی سے محبت کرتا تھا لیکن آج وہ آپ کو شاہ کوتار اور ملکہ سمری کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ آپ خوش بخت ہیں کہ میں عین وقت پر پہنچ گیا اور میرے ساتھی بزدل نہیں بلکہ سچ مچ کے سپاہی ثابت ہوئے۔"

میرا سر چکرا رہا تھا اور مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی لیکن میں نے برگا سے کچھ نہیں کہا۔ برگا نے مجھے ایک تلوار اور پیٹی دی یہ تلوار اُس تلوار سے بہت عمدہ تھی جو دلدلی علاقے میں میرے زیرِ استعمال رہ چکی اور جسے مُونا نے سمندر میں پھینک دیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے حالات میرے حق میں پلٹا کھا رہے ہوں۔

"ہم آپ کو مکمل ساز و سامان بعد میں دیں گے اب ہمیں

جلد از جلد مضافات میں پہنچنا ہے۔ میرے پاس آدمی کم ہیں اور مقابلہ بہت سخت ہے۔ میں محل کے محافظوں سے مزید کوئی جھڑپ مول لینا نہیں چاہتا۔ اگر آپ میری بات کا مطلب نہ سمجھے ہوں تو یہ بتا تا چلوں کہ ہمارے ہاں خانہ جنگی کا آغاز ہونے والا ہے۔"

"خانہ جنگی؟ وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"شاہ کوتار اور ملکہ، ردمو پر مکمل اقتدار کے طالب ہیں، انھوں نے دُرِ شہوار کے خلاف شورش برپا کر دی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ دُرِ شہوار کے پاس ذاتی محافظ دستہ ہے جس پر وہ آسانی سے قابو پالیں گے اور پورے اقتدار کے مالک بن جائیں گے۔ ۔ ۔ مگر اس شورش کے لیے انھوں نے بڑے غلط وقت کا انتخاب کیا ہے کیونکہ اس وقت طمراق نے ہمارے ساحل پر ہراول دستہ اُتار دیا ہے۔"

"کیا تم اسے اتفاق سمجھتے ہو برگا؟" میں نے کہا۔ "کیا یہ وقت شاہ کوتار اور اس کی ملکہ کے لیے بھی کڑا نہیں ہے؟۔ ۔ ۔ یا وہ ردمو کے ساتھ غداری پر تُل گئے ہیں؟ اس سلسلے میں مُونا کا کردار کیا ہے؟ تم نے اب تک اُس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ آخر کیوں؟" میں نے برگا پر سوالوں کی بوچھار کر دی۔ "کیا اُسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟"

اس وقت تک ہم قید خانے کے احاطے سے کافی دُور زرد پوست کے کھیتوں کے درمیان آ چکے تھے۔ میں نے ایک بار پیچھے دیکھا تو مجھے سورج کی الوداعی کرنوں میں شاہ کوتار کا اونچا محل، جگر مگر کرتا دکھائی دیا۔ کھیتوں میں کام کرنے والی زرد لڑکیاں بھی اب کھیتوں سے اپنے گھروں کو واپس جا رہی تھیں۔

میرے سوالوں پر برگا نے اپنے آدمیوں کو رُکنے اور ذرا آرام کرنے کا حکم دیا۔ ساحر نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ ۔ پھر وہ بھی سپاہیوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔

میں اور برگا اُن سے کچھ فاصلے پر چلے گئے۔

"میں بہت سے معاملات سے ناواقف ہوں جناب اور اگر مجھے اُن کے بارے میں علم ہوتا تو بھی شاید بہت کچھ نہ بتاتا۔ یہ جو کچھ بھی ہُوا ہے، اچانک اور غیر متوقع طور پر ہُوا ہے۔" ایک لمحے کے لیے وہ رُکا پھر کہنے لگا۔ "جہاں تک میں جانتا ہُوں، مُونا محل میں حفاظت سے ہے۔ تاہم اُسے زیرِ حراست رکھا گیا ہے۔ یہ ایک سیاسی اقدام ہے جس کے متعلق میں فی الوقت اتنا ہی بتا سکتا ہوں۔"

"مجھے تم سے اتفاق ہے۔ باقی ساری باتیں بھول جاؤ۔ ۔ مگر یہ بتاؤ کہ شبستانی کہاں اُترے ہیں اور اُن کی نفری کیا ہے؟ اُن کا سردار کون ہے اور اس کے ارادے کیا ہیں؟ کیا ہمارے پاس بھی اتنی نفری ہے کہ ہم اُن کا مقابلہ کر سکیں؟"

برگا مسکراتے ہوئے بولا۔ "آپ کے کچھ سوالوں کے جواب تو دے سکتا ہُوں، کچھ کے نہیں دے سکتا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خوش بختی سے ہم نے شبستانیوں کا ایک آدمی گرفتار کر لیا ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ اُس سے مل کر بے حد خوش ہوں گے، مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ اس سے خود ہی پوچھ گچھ کرنا پسند کریں گے۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ برگا۔ اُس قیدی سے پوچھ گچھ کرنے میں مجھے کون سی خاص دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

برگا نے ایک قہقہہ لگایا اور اپنے آدمیوں کو اُٹھنے کا حکم دیتے ہوئے بولا۔ "اُس قیدی کا نام ثالپ ہے جناب۔ ہم نے جب اُسے گرفتار کیا تو وہ زرد آدمی کے بھیس میں تھا۔"

"اوہ۔ تو وہ سیدھا محل تک پہنچنا چاہتا تھا۔" میں نے سوچا۔ "ایک اور سازش۔ ہاں ثالپ کے اس اقدام سے سازش کی بو آتی ہے۔ اسے کیسے روکا جا سکتا ہے۔ ہم طمراق کے آدمیوں کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ کتنے بہادر اور جنگجو ہیں، یہ میں۔ ۔ لوبغان میں دیکھ ہی چکا ہُوں۔ شاہ کوتار نے شاید اُس وحشی طمراق سے خفیہ معاہدہ کر لیا ہے کہ ردمو کی شکست کے بعد مکمل اقتدار اُنھیں دے دیا جائے گا۔ وہ نہیں جانتا کہ بعد میں طمراق اپنے معاہدے سے منکر بھی ہو سکتا ہے اور مُونا کا کیا ہوگا؟ مگر میں اس کے بارے میں کیوں سوچوں؟" ان خیالات نے میرے ذہن میں کھلبلی سی مچا دی۔

"ثالپ کہاں ہے؟" میں نے برگا سے پوچھا۔

"یہاں سے ایک میل دُور جہاں ہماری نگہبانی کی چوکی ہے۔ کیا ہم وہاں چلیں؟"

"مجھے اُس کا شوقِ دیدار تو نہیں ہے برگا لیکن میں اُس کے مُنہ سے حقیقتِ حال سُننا یا اُگلوانا ضرور چاہتا ہُوں۔ ۔ ۔ وہ ہمیں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔"

ہم پھر آگے چل پڑے۔

"میں نے اُس سے پوچھ گچھ کی کوشش کی تھی مگر اُس نے کہا کہ وہ مجھے نہیں بلکہ بڑے افسروں کو بتائے گا دراصل اُس کا مقصد اپنے کسی جاننے والے افسر سے ملنا ہے۔" برگا نے جواب دیا۔

"اگر وہ اب بھی یہی اصرار کرتا ہے تو کیا تم اس کی یہ۔ ۔ ۔ خواہش پوری نہیں کر سکتے؟"

"میں اپنے کمان دار سے کہہ سکتا ہُوں جناب۔"

"تو پھر ضرور کہو اور اُس وقت مجھے سامنے آنے کے لیے مت کہنا!"

برگا نے میری تجویز مان لی۔

میں جانتا تھا کہ وہ وقت آگیا ہے جب حالات سے نمٹنے کے لیے مجھ سے کہا جائے گا۔ تب سربراہی میرے حصے میں آئے گی۔ میں رُک کر اُس تلوار کا جائزہ لینے لگا جو برگا نے مجھے دی تھی یہ ایک عمدہ تلوار تھی۔

خوں ریزی کا وقت آگیا تھا مگر اُس کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

❀

میں اپنے ساحلی جھونپڑے کے ایک کمرے میں آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ آتش داں میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ کمرے میں ہلکی ہلکی اور میٹھی میٹھی تمازت پھیلی ہوئی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کل مجھے ماضی کے سفر پہ جانا ہو گا۔ اس لیے میں... رضا ہمدانی کے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔ ابھی فون کی گھنٹی بجے گی۔ اور وہ کہے گا "آج رات یہاں سے روانہ ہو جانا میرے بیٹے کل صبح تمھاری روانگی ہے اور ہاں یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ڈاکٹر فریدوں... وقت کا کتنا پابند ہے!"

جب بہت دیر تک فون کی گھنٹی نہ بجی تو میں اُسی طرح آنکھیں موندے موندے پھر نیند کے جزیرے میں اُتر گیا اور خواب دیکھنے لگا تھا۔ وہ بڑا ہی عجیب سا خواب تھا!

میں نے دیکھا کہ ایک غار میں لیٹا ہوا ہوں۔ مجھ پہ میٹھی میٹھی سی غنودگی طاری ہے اور میں آنکھیں کھولنا چاہتا ہوں مگر وہ نیم وا ہو کر رہ جاتی ہیں اور اِن آدھ کھلے جھروکوں سے جھانکتا ہوں تو" وہ" مجھے غار کے تپتے اور دھڑکتے فرش پر اپنی طرف آتی دکھائی دیتی ہے۔ غار کے فرش کو چھو کر دیکھتا ہوں... تو وہ واقعی دھڑک رہا ہے، لرز رہا ہے اور کہیں سے مسلسل ایک گڑگڑاہٹ کی صدا سنائی دے رہی ہے۔ جب یہ گڑگڑاہٹ بڑھتی ہے تو اُس غار اور اُس دھرتی کے دل کی دھڑکن بھی بڑھ جاتی ہے... اور ان دھڑکنوں کے درمیان وہ آہستہ آہستہ میری جانب بڑھ رہی ہے اور اُسے دیکھ کر میری دھڑکنیں بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔

وہ تھی ہی ایسی کہ اُسے دیکھ کر یا تو دلوں کی دھڑکنیں ایک دم تیز ہو جاتیں یا پھر دل دھڑکنا ہی بھول جاتا۔

میں نے ایسا ملکوتی حُسن اور ایسا شاداب سراپا، ایسی باوقار چال، ایسی شبنمی آنکھیں اور ایسے یاقوتی لب نہ تو پہلے کبھی دیکھے تھے اور نہ ہی شاید اب کہیں دیکھ سکوں گا۔ اُس کا قد میرے ہی جتنا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم رکھ رہی تھی اور قدم کے ساتھ اُس کے چہرے کے رنگ قوسِ قزح کے رنگوں میں ڈھلتے جا رہے تھے۔ کبھی اس کے چہرے پر گلاب کھل اُٹھتے تھے اور کبھی وہ طلائی رنگ کے دکھائی دینے لگتے تھے۔

وہ میرے قریب آکر رُک گئی۔

چند لمحے اپنی شبنمی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر میری آنکھوں کے پٹ اپنے آپ بند ہو گئے لیکن میرے حواس جاگتے رہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہیولہ مجھ میں سما گیا ہو اُس نے مجھے اپنی ہستی میں سمو لیا ہو۔ وہ کیفیت بڑی لطف آمیز تھی جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔

کچھ دیر بعد مجھے ایسا لگا۔ جیسے میرا جسم ہلکا پھلکا ہو گیا ہو تب مجھے اُس کی آواز سنائی دی "آہ... بے ہوشی میں بھی تم کتنے اچھے ہو سرفروش" اور اُس کی اِس بات پر میں نے سوچا کہ کیا میں واقعی بے ہوش ہوں؟ اگر میں بے ہوش ہوں تو پھر یہ خواب کیسے دیکھ رہا ہوں؟... یا بے ہوشی میں بھی خواب نظر آتے ہیں؟

میں نے آنکھیں کھولنا چاہیں مگر وہ نہ کھل سکیں

اتنے میں پھر اُس کی آواز سنائی دی "وِلیشتا تمھیں سدا بے ہوش نہیں رکھے گی، سرفروش... وہ اتنی خود غرض اور دھوکے باز نہیں ہو سکتی۔ اب وہ تمھیں آپ خود جگائے گی!"

چند لمحوں کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میرے ہونٹوں سے ایک پیالہ لگا دیا گیا ہے میں نے وہ پیالہ پی لیا اور تھوڑی دیر بعد میرے بھاری پپوٹے ہلکے ہوتے چلے گئے۔ ذہن پہ چھائی ہوئی دُھند میں بھی شگاف پڑنے لگے اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔

میرا خواب ٹوٹ چکا تھا... مگر وہ اب تک میرے سامنے کھڑی تھی اور میں اپنے ساحلی جھونپڑے کے کمرے میں نہیں بلکہ ایک غار کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ جیسے سنگِ سُرخ کی سِلوں سے بنایا گیا تھا۔

وہ بھی میرے پاس بیٹھ گئی۔

پہلے تو وہ مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی "کیا اب بھی تمھارا سر چکرا رہا ہے؟ چوٹ کا کیا حال ہے؟"

"چوٹ؟!... کیسی چوٹ؟" میں نے پوچھا۔

"تمھیں سر پہ جو چوٹ لگی تھی اب اُس کا کیا حال ہے؟"

میں نے جلدی سے اپنے سر پہ ہاتھ پھیرا تو مجھے اپنی کھوپڑی

پہ ایک بڑا سا گومڑا محسوس ہوا اور میرے منہ سے بے ساختہ ایک "آہ" نکل گئی۔ اُس نے میرا سر ایک مہرباں ماں کی طرح اپنے سینے پہ رکھ لیا اور اپنی اُنگلیوں سے میرے بال سہلانے لگی۔

"تم ولیشتا... نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... اپنے کچھ دوستوں کے لیے میں ولیشتا ہوں۔ عوام کے لیے دیوی کی وِرثہ دار ہوں اور کچھ لوگ مجھے سیاہ موتی کے نام سے بھی پکارتے ہیں... لیکن اصلی سیاہ موتی اور تلوار کے متعلق ہم بعد میں بات کریں گے اور اگر ہماری مذہبی روایت کے مطابق تم ہی وہ شخص ہو جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا ہے تو تم آتش فشاں کی تہ سے وہ تلوار اور موتی میرے پاس لے آؤ گے... لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تمھیں چوٹ سے تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ یا ختم ہو گئی ہے؟"

"ابھی تو صرف ہاتھ لگانے سے ٹیس اُٹھتی ہے۔" میں نے گومڑے کو ہاتھ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ میرے ہاتھوں میں شفا بخش تاثیر ہے۔ لاؤ مجھے دیکھنے دو۔" اس نے کہا اور اپنی نرم و نازک اُنگلیاں گومڑے پر پھیرنے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پھر نیند کی وادی میں ڈوبنے اور ساکھرنے لگا ہوں اور میری سوچنے سمجھنے کی... صلاحیت ہی ختم ہوتی جا رہی ہو۔

میں نے اپنی غنودگی دُور کرنے کے لیے پوچھا۔ "میں کب سے بے ہوش پڑا تھا؟"

"آج سورج جب تیسری بار اُبھرا ہے تو تم ہوش میں آئے ہو۔"

میں نے اپنے ذہن پر زور دیا کہ مجھے سر پہ چوٹ کیسے آئی۔ مگر مجھے کچھ بھی یاد نہ آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں بہت کچھ بھول چکا تھا۔ اگر میری یادداشت یکسر خراب ہو جاتی تو مجھے اپنا ساحلی جھونپڑا اور رضا ہمدانی یا ڈاکٹر فریدوں بھی یاد نہ آتے مگر وہ تو یاد آئے تھے! پھر یہ کیوں یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں اس غار میں کیسے پہنچا اور مجھے سر پہ چوٹ کیسے آئی؟ یہ تو ولیشتا ہی بتا سکتی تھی۔

"مجھے یہ چوٹ کیسے آئی؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے تمھارے آدمیوں برگا اور ساحر نے بتایا تھا کہ تمھارے سر پہ بڑے زور سے ضرب لگائی گئی تھی۔ تب وہ تمھیں یہاں اُٹھا لائے تھے۔ تم اِس عرصے میں بڑی عجیب سی باتیں بڑبڑاتے رہے ہو۔ کبھی تم کسی رضا کو پکارتے تھے اور کبھی فریدوں کو کوستے تھے اور یہ کہتے تھے کہ وہ تمھیں واپس کیوں نہیں بُلاتا... خیر چھوڑو، اس قصے کو۔ اگر تم میدانِ جنگ میں خود نہ پھنسے ہوتے تو تمھاری کھوپڑی پاش پاش ہو جاتی!"

اس کی اس بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ چوٹ مجھے میدانِ کارزار میں آئی ہے مگر میں کس سے برسرِ پیکار تھا؟ اتنے میں ولیشتا نے خود ہی یہ گتھی بھی سلجھا دی۔

"شبستانی جہاز اپنے بھگوڑے اور بُزدل سپاہیوں کو لے کر فرار ہو گیا۔ تم نے اُن سے زبردست جانی قیمت وصول کی ہے، سرفروش، تمھارے کہنے کے مطابق ٹالپ پر تشدد جاری ہے۔ بھگوڑے شبستانی تمھارا پیغام طراق کو پہنچا دیں گے۔ مگر ٹالپ کا فیصلہ تمھیں خود ہی کرنا پڑے گا۔"

ولیشتا کی باتوں سے پتہ چلا کہ ٹالپ پر تشدد کا حکم میں نے دیا تھا۔ میں تشدد پسند نہیں اور کسی کو درد یا کرب میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔ اگر میں نے تشدد کا حکم دیا ہو گا تو اس کی کوئی وجہ بھی ضرور رہی ہو گی جو اِس وقت مجھے یاد نہیں آ رہی تھی۔

میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ جیسے بھی ہو آگے بڑھوں اور معاملات پر حاوی رہوں کہ یہی میری بقا کے لیے ضروری تھا۔ پھر میں نے ذہن سے یہ سارے خیالات جھٹک دیے اور اُٹھ کھڑا ہوا لیکن میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

ولیشتا یہ دیکھ کر مسکرانے لگی۔

"تین روز تک میں نے کچھ نہیں کھایا پیا۔ شاید اسی لیے میرے اندر نقاہت آگئی ہے۔" میں نے کہا۔

ولیشتا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی "اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو ایسا ہی ہو گا!"

میں اُس کے قہقہے اور اس بات کا مطلب نہ سمجھ سکا اور یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے مجھ پر طنز کیا ہو۔ "یہ حقیقت ہے ولیشتا کہ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے لیکن کھانے سے پہلے میں نہانا چاہتا ہوں، مجھے نئے لباس کی بھی ضرورت ہے۔ پھر میں پہلے اپنے خادم ساحر اور اُس کے بعد برگا سے ملاقات کرنا چاہوں گا۔ برائے مہربانی یہ سب انتظام کروا دو۔"

ولیشتا نے جو آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی، قریب رکھی ایک تھالی پر چوبی ہتھوڑی سے ضرب لگائی تو ایک زرد لڑکی نظریں جھکائے وہاں آگئی۔ ولیشتا نے اُسے حکم دینے سے پہلے مجھ سے کہا "اپنے خادم کو سمجھا دینا کہ وہ میری کنیزوں پر نظر نہ رکھے۔ وہ تمھاری خیر و عافیت پوچھنے کے بہانے میری کنیزوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا ہے۔ اُسے بتا دینا کہ زرد لڑکیوں سے میل جول کی سختی سے ممانعت ہے!"... پھر اُس نے اپنی کنیز کو ہدایات دیں اور مجھے اُس کے ساتھ جانے کا اشارہ کر دیا۔

کنیز اُسی طرح ادب سے نگاہیں جھکائے اور ہاتھ باندھے میری رہبری کرتی ہوئی متعدد دُہرنگوں سے گزرتی ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں ایک خوبصورت پردہ آویزاں تھا۔ میں نے پردہ ہٹا کر دیکھا تو وہاں سیاہ پتھر کا ایک بہت بڑا ٹب نما برتن رکھا ہُوا تھا اور کہیں سے اس میں گرم گرم بھاپ اُٹھاتا پانی گر رہا تھا۔ میں نے غسل خانے کی دیوار کو چھُو کر دیکھا۔ وہ اتنی گرم تھی کہ میں نے جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا اور ٹب نما برتن میں اُتر گیا۔

ابھی میں غسل کر رہا تھا کہ پردہ ہٹا اور ساحر وہاں آگیا... مگر اس کا حُلیہ بدلا ہُوا تھا اُس کی ایک آنکھ تو پہلے ہی ضائع ہو چکی تھی مگر اُس کے سامنے والے دانت بھی غائب تھے۔ جب وہ مُسکرایا تو مجھے اُس کے خالی مسوڑھے دیکھ کر ہنسی آگئی۔

"مُونا دیوی کے شوخ قہقہوں کی قسم! آپ کو تندرست دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہُوئی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ وہ بڑے زور کی جھڑپ تھی مالک۔ اُس بدبخت نے پیچھے سے آپ پر پوری قوت سے ضرب لگائی تھی مگر میں نے اُسے دُوسری ضرب لگانے کا موقع نہیں دیا اور اپنی شمشیرِ آب دار اُس کی پُشت میں گھونپ دی... مگر یہ تو بتایئے جناب والا کہ جو لڑکی آپ کو یہاں تک چھوڑنے آئی تھی وہ حِنا تو نہیں تھی؟" اُس نے ٹب نما برتن میں کوئی سفوف گراتے ہُوئے پُوچھا۔

اُس کے سوال پر مجھے ویشتا کی بات یاد آگئی۔

"ویشتا نے مجھے ہدایت کی ہے کہ زرد لڑکیوں بالخصوص اُس کی کنیزوں سے میل جول کی سخت ممانعت ہے اور ہاں تم نے اس برتن میں کون سا سفوف ملایا ہے؟"

"یہ خوشبُودار سفوف ہے جناب۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے آپ کی مردانہ وجاہت پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے بے ہوشی کی کوئی دوا ملائی ہے؟"

"وہ تو مجھے اس کی خوشبُو سے ہی معلوم ہو گیا تھا مگر یہ ہے کیا چیز؟"

"یہ ایک معدنی نمک ہے۔"

"اچھا!... مگر میں نے تمھیں جو ہدایت کی ہے، اُس پر عمل کرنا۔ سمجھ گئے؟"

"میں آپ کا حکم کیسے ٹال سکتا ہُوں، حضور۔ وہ تو... دراصل حِنا مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ میں سمجھا کہ شاید ہنسنے کے بعد کے مراحل بھی...!"

"خاموش رہو اور میری بات غور سے سُنو۔ جب میں کوئی سوال کروں، تب اپنا مُنہ کھولنا ورنہ خاموش رہنا۔"

"... پھر میں نے اُسے بتایا کہ میری یادداشت کھو گئی ہے اس لیے وہ مجھے جُملہ حالات سے باخبر کرے۔

"میں تو اسی وقت سے بتا سکتا ہُوں جب بوتھان میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔" اس نے کہا۔

"یہ بوتھان کیا ہے؟"

"ارے!" وہ حیرت سے بولا۔ "اگر آپ بوتھان بھول گئے ہیں تو پھر مُونا بھی آپ کو یاد نہیں ہوگی۔"

"یہ مونا کیا چیز ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہائے ہائے۔ قسم مُونا دیوی کے جاہ و جلال کی۔ اس ظالم نے بڑی ظالم چوٹ ماری ہے آپ کو۔ ایسی ظالم کہ آپ سب کچھ بھُول گئے۔ آپ کو وہ خود بھی یاد نہیں ہوگی جس کی وجہ سے آپ بچ گئے۔"

"کون سی خود؟ بکے ہی جاؤ گے یا کچھ بتاؤ گے بھی؟"

"بتاتا ہُوں آقا۔" ساحر بولا۔ "شبستانیوں سے جھڑپ کے دوران آپ خود کے بغیر لڑ رہے تھے کیونکہ آپ کے ناپ کی خود ان لوگوں کے پاس نہیں تھی۔ چنانچہ جب میں نے ایک مُردہ شبستانی کی تلاشی لی تو مجھے یہ بات بھی یاد آگئی اور میں نے اُس کی خود اُتار کر زبردستی آپ کو پہنادی تھی۔ یہ ایک شبستانی خود تھی جو ٹیڑھی ہو گئی مگر کٹ نہیں پائی۔ ملاحظہ فرمایئے۔" اُس نے اپنا خود اُتار کر میرے سامنے کر دیا۔

اُس میں تلوار کا نشان تھا اور ایک گڑھا بھی پڑا ہُوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اژدہے کے مُنہ اور دُم کے نیچے یہ الفاظ بھی کندہ نظر آگئے۔ "ہاسترا اودا"۔ میں نے ساحر سے پُوچھا۔ "ہاسترا اودا" کا کیا مطلب ہے؟"

"میں دیوتا کے لیے کام کرتا ہوں۔"

"اوہ۔ میں طمراق سے مِلنا پسند کروں گا۔ ذرا وہ تولیہ تو اُٹھا دینا۔"

ساحر نے مجھے تولیہ دیتے ہُوئے کہا۔ "اگر آپ اُس سے مِلیں گے تو میں بھی اُسے شرفِ ملاقات بخشوں گا۔ ہم نے اُس کے ہراول دستے کی جس طرح پٹائی اور توہین کی ہے۔ پھر جس طرح اُس کے چہیتے ثالپ کو پکڑا اور آپ نے اُسے جو پیغام بھیجا ہے، یہ ساری باتیں اُس کے تن بدن میں آگ لگا دیں گی اور وہ خود ہی ہماری ملاقات کو دوڑا آئے گا۔"

"میرے پلّے کچھ بھی نہیں پڑا نہ جانے تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ اب مزید وقت ضائع کیے بغیر اس وقت سے لے کر جب ہماری ملاقات ہوئی تھی، ساری اہم باتیں مختصراً بتا دو۔" میں نے ساحر کو حکم دیا۔

اُس نے مختصراً وہ باتیں بتادیں جنھیں وہ خود جانتا تھا اور

...س نے مجھ سے سنی تھیں۔

تب میں نے اُسے حکم دیا۔ "جاؤ برگا کو تلاش کرو اور اُسے لے کر وہ مجھ سے وہاں ملے جہاں ثالپ قید ہے... پھر ویشتا کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ مجھے جیسے ہی فرصت مِل گئی، اس سے ملنے آؤں گا۔ ہاں۔ ذرا دُہرانا تو میں نے کیا کہا ہے؟"

ساحر نے میری ہدایات دُہرا دیں۔

"قدرت نے غالباً ہمیں ایک دُوسرے کی مدد کے لیے مِلایا ہے۔ شاید ہم ایک ساتھ جئیں اور ایک ساتھ مریں گے۔ اس لیے میں تم پر اعتماد کرتا ہُوں مگر چونکہ تم بے حد جھُوٹے ہو لہٰذا مجھے ڈر ہے کہ تم نے مجھے جو باتیں بتائی ہیں کہیں اُن میں جھُوٹ کی ملاوٹ نہ ہو۔"

"مُونا کی قسم آقا! میں نے ایک لفظ بھی جھُوٹ نہیں کہا۔"

"بس تو پھر دیر نہ کرو اور جاکر برگا کو تلاش کرو۔"

"ایک بات بتانا البتہ بھُول گیا تھا۔"

"وہ کیا؟"

"آپ نے زرد لوگوں کے ناموں کے اندراج اور افیون پر پابندی کے جو احکام جاری کیے ہیں وہ مجھے پسند نہیں آئے۔"

"جاؤ... فوراً دفع ہو جاؤ..." میں نے دھاڑ کر کہا۔

وہ بھاگتا ہُوا چلا گیا مگر چند لمحوں بعد پھر لوٹ آیا اور پردہ ہٹا کر جھانکتے ہُوئے بولا۔ "اگر آپ ثالپ کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اُس کے پاس جانے میں دیر نہ کیجیے۔ وہ لاکھ موٹا سہی مگر ایک وقت آتا ہے جب موٹے آدمیوں میں بھی خون باقی نہیں رہتا۔"

❋

ثالپ کو دیکھنے کے بعد میں نے سوچا کہ اپنے دَور اور دُنیا میں میں کبھی اتنا ظالم اور تشدد پسند نہیں تھا۔ نہ جانے میں نے کیا سوچ کر اس پر تشدد کا حکم دے دیا تھا۔ وہ لوگ اُسے چرکے لگاتے اور پھر زخموں کو داغ کر ثالپ کی چیخوں سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔

میں اُس وقت چمڑے کی شاندار وردی اور اسلحے سے لیس تھا۔ میں نے ثالپ کو غور سے دیکھا۔ اُس وقت مجھے اُس کے بارے میں صرف اتنا ہی یاد تھا جتنا ساحر نے بتایا تھا۔ میں نے تلوار سے اُس کے کٹے ہُوئے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے پُوچھا۔ "تمھارے اس کو کیا ہُوا ہے پُجاری؟"

ثالپ نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "خُوب لاہی کاٹا اور خود ہی پُوچھ رہے ہو کہ میرے ہاتھ کو کیا ہُوا ہے؟"

"اگر میں نے تمھارا ایک ہاتھ کاٹ دیا ہے تو دُوسرا بھی کاٹ سکتا ہوں اور گردن بھی اُڑا سکتا ہُوں کیا خیال ہے تمھارا؟"

"تو دیر مت کرو اور میری گردن اُڑا دو۔ اس عذاب سے تو بہتر ہے کہ میں مر جاؤں اور یاد رکھو، مُونا دیوی تم سے میری موت کا انتقام لے گی۔"

"اگر تم نے مجھے یہ نہ بتایا کہ طمراق کے پاس کتنی فوج اور کتنے جہاز ہیں، وہ اپنی فوجیں کہاں کہاں اُتارے گا اور اُس کا منصُوبہ کیا ہے... اور تم کس سازش کے تحت یہاں بھیجے گئے ہو تو تمھاری یہ گردن اُڑانے والی آرزو ضرور پُوری کی جائے گی پُجاری۔"

... لیکن ثالپ نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔

"میں تمھیں صرف پانچ ساعتوں کی مُہلت دیتا ہُوں۔ سوچ لو۔ اگر تم نے اپنی زبان نہ کھولی تو تمھارے لیے بہت بُرا ہوگا۔" یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا گیا۔

مجھے ضروری انتظامات کرنے میں کچھ دیر لگ گئی جب میں دوبارہ ثالپ کے پاس آیا تو وہ بولا۔ "میں سب کے سامنے بات نہیں کر سکتا۔"

میں نے سب کو وہاں سے ہٹا دیا۔ ثالپ نے کہا۔ "طمراق نے دراصل مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے۔ وہ تمھاری بہادری کے قصّے سُن چکا ہے اور تم سے دوستی کا آرزومند ہے۔ اگر تم ہمارے دوست بن جاؤ تو میں اپنے ساتھ تمھارا یہ سلوک بھی بھُول جاؤں گا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ رومو تباہی سے نہیں بچ سکتا۔ شاہ کوتار اور ملکہ سمرا بھی یہاں سے بھاگ کر بوتھان جا چکے ہیں اور اُنھوں نے شاہ طمراق کی اطاعت قبول کر لی ہے... اس صورت میں تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ ہماری دوستانہ پیش کش قبول کر لو۔"

ان باتوں کے دوران میرے ذہن میں ایک بات بجلی کی طرح کوند گئی۔

"مُونا کے بارے میں کیا کہتے ہو پُجاری؟"

وہ مسکرایا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی یہ مُسکراہٹ بڑی ذُومعانی تھی۔ "یہ شاہ کوتار اُسے ایک یرغمال کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے گیا ہے!"

"لیکن ایک یرغمال کی حیثیت سے اُس کی اہمیت ہی کیا ہے؟"

ثالپ پھر ذُومعانی انداز سے مُسکرایا اور بولا۔ "یہاں اب بوتھان میں چپّے چپّے پر ہمارے جاسوس پھیلے ہُوئے ہیں۔ جن دنوں تم دلدلی علاقے میں چھُپے ہُوئے تھے، تمھارے آدمیوں میں ہمارا ایک جاسوس بھی شامل تھا۔ اُس کی زبانی ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ تم اور مُونا دیوی ایک دُوسرے سے محبت کرتے ہو۔ بس یہی بات اُسے اہمیت بخش دینے کے لیے کافی ہے۔"

"تمھارا جاسوس جھوٹا تھا۔" میں نے اُسے جواب دیا اور سوچنے لگا کہ اگر میں مُونا سے محبت کرتا تو میں نے ساحر کو یہ بات ضرور بتائی ہوتی اور وہ، مجھے نسیان میں مُبتلا ہونے کی وجہ سے یہ بات بھی ضرور بتاتا مگر اُس نے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔

"ہمارا جاسوس جھوٹا نہیں ہو سکتا... اور اگر فرض کر لیا جائے کہ اُس نے جھوٹ بولا ہے تو بھی مُونا کی اہمیت اس لیے ہے کہ وہ دلیشنا کی نواسی ہے۔ کیا وہ یہ چاہے گی کہ مُونا کی بوٹیاں، کُتّے نوچ کھائیں؟"

"تم دلیشنا کو نہیں جانتے بچاری کہ وہ کیسی عورت ہے۔ اُسے ان باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں۔ خیر چھوڑو۔ تم نے میری مُہلت سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔" یہ کہہ کر میں نے محافظوں کو بُلایا اور اُنھیں حکم دیا کہ ٹالپ کو لے چلیں۔

محافظ ٹالپ کو جوالا مُکھی کے دہانے پر لے گئے جہاں دو شہتیروں کے ساتھ ایک جھُولا باندھ دیا گیا تھا۔

"اسے جوالا مُکھی میں اُلٹا لٹکا دو۔" میں نے مُحافظوں کو حکم دیا۔

محافظوں نے رسّے سے اُس کے پاؤں باندھے اور اُسے اُلٹا لٹکا دیا۔ جوالا مُکھی سے تھوڑی دیر بعد دُھواں اور گرم بُخارات اُٹھنے لگے۔ چند لمحے بعد جب اُسے نکالا گیا تو وہ بے سُدھ تھا۔ میں ڈر گیا کہ کہیں وہ مر نہ گیا ہو۔ مگر جب میں نے اُس کے دل پر ہاتھ رکھا تو وہ ابھی تک دھڑک رہا تھا۔ میں نے محافظوں سے کہا کہ وہ اُس کے مُنہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ماریں۔

جب وہ ہوش میں آیا تو میں نے کہا "تم لوگوں کو دوزخ سے ڈرایا کرتے تھے... مگر تم کو پتہ نہیں تھا کہ دوزخ کیا ہوتی ہے۔ اب تم نے اُس کی ایک جھلک دیکھ لی ہے۔ صاف صاف بتاتے ہو یا دُوسری جھلک بھی دکھاؤں؟"

"نہیں نہیں۔ میں سب کچھ بتاتا ہُوں۔ سب کچھ بتا دُوں گا۔" وہ کانپ کر بولا۔

"اور یہ بھی یاد رکھو کہ اگر ایک بات بھی جھُوٹ ثابت ہُوئی تو تمھیں اس دوزخ کا ایندھن بنا دیا جائے گا۔" پھر میں نے اُسے سوچنے سمجھنے کا موقع دیے بغیر حکم دیا "چلو اب شروع ہو جاؤ۔ اپنی داستان سُنا ڈالو۔" اس وقت افسروں کا ایک گروہ بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے دلیشنا کو بھی بلوایا تھا لیکن وہ وہاں نہیں آئی تھی۔

ٹالپ سے سب کچھ اُگلوانے کے بعد کوئی ایک گھنٹے تک مجلسِ مشاورت جاری رہی اور میں افسروں کو مختلف ہدایات

دیتا رہا۔۔ پھر میں نے اُنھیں رُخصت کر دیا۔ ساحر میرے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا "دلیشنا چاہتی ہے کہ آپ آج شام اُس کے پاس ضرور آئیں۔ وہ محلِ موسیقی میں آپ کی منتظر رہے گی۔ اُس کی ہدایت ہے کہ آپ وہاں تنہا آئیں۔"

"یہ محلِ موسیقی کہاں ہے اور میں اُسے کیسے یا کہاں تلاش کروں گا؟"

"میری محبوبہ۔۔ ارے نہیں، جناب! میری خیالی محبوبہ آپ کو وہاں لے جائے گی۔ میں نے سارا انتظام کر دیا ہے۔"

"دیکھو یہ خواتین کے چکر چھوڑ دو ورنہ کسی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔" میں نے اُسے پیار سے ڈانٹا۔ "اور سنو۔ میں نے تمھیں فقیروں اور اُٹھائی گیروں کا سربراہ اس لیے بنایا ہے کہ تم اُن سے کام لو گے۔ اگر اُن سے خاطر خواہ کام نہ لیا گیا اور وہ اپنا فرض پُورا نہ کر سکے تو میں سمجھوں گا کہ تم نے خواتین کی وجہ سے غفلت شعاری کی۔ پھر مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔"

"میں اپنا فرض خُوب جانتا ہُوں مالک۔ آپ کا خادم ہمیشہ فرض کو محبت پر ترجیح دیتا آیا ہے۔"

"تو پھر اب یہاں وقت برباد نہ کرو۔ تمھارے بھکاری اور اُٹھائی گیرے ہی میری خفیہ فوج ہے اور میں انھی پر انحصار کر رہا ہوں۔"

ساحر جانے لگا تو برگا ایک ٹوکری میں بہت سے کاغذات لیے وہاں آ گیا اور بولا "اگر آپ تیار ہوں تو میں آپ کو وہ سب دکھاؤں جس کا آپ نے حکم دیا تھا۔"

"میں تیار ہُوں برگا۔"

"تو پھر تشریف لایے۔" وہ بولا "کام بہت ہے اور وقت

بہت کم رہ گیا ہے۔"

*

ہم اس وقت ایک ایسی پگڈنڈی پر چل رہے تھے جس پر راکھ سی بکھری پڑی ہُوئی تھی۔ اچانک میری نگاہ دو پہاڑیوں کے درمیان سے ایک انسانی ہیولے پر جا پڑی جس کے چاروں طرف شعلے لپک رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے دلیشنا آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہو اور اُس کے اردگرد شعلے لپک رہے ہوں... مگر اُس کو احساس تک نہ ہو۔

میں دم بخود وہیں رُک گیا۔

"آپ رُک کیوں گئے جناب؟" برگا نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ دلیشنا ہے۔"

"ہاں جناب! وہ درِ شہوارِ ردمو ہی ہے۔ وہ میری نانی ہے اور اس کی ساحرانہ قوتوں کا راز انھی شعلوں میں مضمر ہے۔"

میرے ذہن میں پھر ایک بار جھماکا ہُوا۔

"وہ مُونا کی بھی نانی ہے۔ اُس کا مطلب ہُوا کہ تم مُونا کے بھائی ہو؟"

"جی ہاں۔۔ لیکن ہم سوتیلے بہن بھائی ہیں۔ اُس کا باپ آپ ہی کی طرح بہادر تھا اور میرا پردیسی باپ بھی جنگجو تھا۔ وہ بھی اسی طرح نہ جانے کہاں سے آئے تھے اور نہ جانے کہاں چلے گئے۔ اسی طرح ایک روز آپ بھی چلے جائیں گے۔ اب آیے دیر ہو رہی ہے۔"

... پھر جب ہم پوست کے کھیتوں سے گزر رہے تھے تو برگا نے بتایا "آپ کے حکم پر افیون کا سارا ذخیرہ جلا دیا گیا ہے۔ تمام زرد لوگ زمین کھودنے اور ناکہ بندی کے کام پر لگا دیے گئے ہیں۔"

"افیون کی بندش کا کیا اثر پڑا ہے؟"

"شروع شروع میں تو اُس کا بہت بُرا اثر پڑا تھا، جناب۔ لوگوں نے لُوٹ مار کی، احتجاج کیا اور پھر فیونا کو جلا ڈالا۔"

"جلا ڈالا؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "وہ تو بہت ہی خوبصورت تھا۔"

برگا نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور کہا "لیکن خود آپ ہی نے تو یہ حکم دیا تھا کہ افیون کو خاکستر بنا دیا جائے۔"

مجھے یہ سُن کر ایک بار پھر ساحر پر غصّہ آ گیا۔ اُس کم بخت نے اس سلسلے میں بھی مجھے کچھ نہیں بتایا تھا مگر میں نے سوچا کہ اس بے چارے ساحر کا کوئی قصور نہیں۔ نسیان میں تو میں خود ہی مبتلا ہو گیا ہُوں۔ میں نے اُسے ہر بات تو بتا نہیں رکھی تھی اور نہ وہ ہر بات دُہرا سکتا تھا۔

اتنے میں ہم ایک گُنبد کے قریب پہنچ گئے۔ یہ گُنبد شہتیروں سے بنایا گیا تھا اور کوئی تین سو ہاتھ بُلند تھا۔ وہاں کچھ زرد لوگ ہمارے منتظر تھے۔ اُنھوں نے گُنبد کے بالائی حصّے کی چرخی کے ساتھ لمبا رسّہ لٹکا رکھا تھا۔ جونہی ہم چوکی پر سوار ہُوئے، وہ رسّہ کھینچنے لگے اور چوکی اُوپر اُٹھنے لگی۔

"ہمیں گھوڑوں کی بھی شدید ضرورت پڑے گی برگا۔" میں نے کہا۔

"ردمو میں گھوڑے نہیں ہوتے جناب۔ ہم نے کبھی ان کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔"

"لیکن اب ردمو کو گھوڑوں کی ضرورت ہے۔"

"طمراق کے پاس ہزاروں گھوڑے ہیں، جناب۔ گھوڑوں سے بھرے ہوئے کئی جہاز ہمارے ساحل سے کچھ فاصلے پر لنگر انداز ہیں۔"

اتنے میں ہم گُنبد کے بالائی حصّے پر پہنچ گئے۔

یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس کے چاروں طرف شفّاف شیشے لگے ہُوئے تھے۔ کمرے میں متعدد میزیں اور متعدد کُرسیاں پڑی ہُوئی تھیں۔ برگا ایک بڑی میز کے قریب رُک گیا اور ٹوکری سے کاغذ اور نقشے نکال کر میز پر پھیلانے لگا۔

میں نے کمرے کے ایک جانب نیچے دیکھا۔

سارا جزیرہ میرے سامنے تھا۔

میں نے اُسے اتنا چھوٹا جزیرہ نہیں سمجھا تھا۔ میری دائیں جانب جوالا مُکھی والی پہاڑیاں تھیں۔ میری نگاہیں پہاڑیوں کے درمیان پتھر کے ایک مُسطّح چبوترے پر مُرتکز ہو کر رہ گئیں۔ جس کے اردگرد دُھوئیں میں لپٹے ہوئے شعلے بھڑک رہے تھے۔

"اس کی ساحرانہ قوتوں کا راز اسی آگ میں مضمر ہے۔"

مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے برگا نے یہ الفاظ دوبارہ کہے ہوں۔

میں نے پلٹ کر برگا کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اُسی طرح میز پر مختلف کاغذات رکھنے میں مصروف تھا۔ میں نے اُس کے قریب جا کر پوچھا "تمھارے پاس نمائشی نہیں بلکہ سچ مچ کے کتنے جنگجو سپاہی ہیں؟"

"شاہ گوتار کے کٹھ پتلی سپاہیوں کی بڑی تعداد تو جزیرہ چھوڑ کر فرار ہو چکی ہے۔ میرے پاس صرف درِ شہوار کے ایک ہزار سپاہی ہیں۔"

یہ سُن کر میں وہاں سے ہٹ گیا۔ صرف ایک ہزار سپاہی طمراق کے لشکرِ جرّار کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے! میں طمراق کے جنگ آزماؤں کو لڑتے دیکھ چکا تھا۔ اس کی فوج میں نیزہ باز اور تیر انداز بھی تھے۔ شمشیر زن تھے اور گھُڑ سوار بھی تھے۔ یہ ایک ہزار سپاہی تو پہلے ہی

ریلے میں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیے جائیں گے۔ اس صورتِ حال میں رومو کی تباہی یقینی نظر آ رہی تھی۔ بچنے کی اگر کوئی صورت تھی تو صرف یہ تھی کہ سپاہ کو لڑانے کی بجائے طمراق کا اور میرا مقابلہ ہو جائے۔

اگر مجھے اس سلسلے میں کوئی سہولت حاصل تھی تو صرف اتنی کہ مجھے شبستانیوں کے منصوبے کا علم ہو چکا تھا وہ بھی اگر ثالپ نے جھوٹ نہ بولا ہو لیکن میرا خیال تھا کہ ثالپ کی جو دُرگت بنی تھی اس کے تحت اس نے جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کی ہوگی۔ اب صرف ایک ہی امکان باقی رہ جاتا تھا کہ کسی طرح طمراق کو یوں گھیر لیا جائے کہ وہ باعزت طریقے سے نہ نکل پائے اور میری دعوتِ مقابلہ قبول کرنے پر تیار ہو جائے۔

اتنے میں برگا میرے قریب آ گیا اور بولا: "آپ کے احکام کی تعمیل ہو چکی ہے جناب۔ زرد اور دُوسرے لوگ قلعہ بندی اور ناکہ بندی میں لگا دیے گئے ہیں۔ جہاں جہاں آپ نے جال بچھانے کو کہا تھا۔ وہاں جال بھی بچھا دیے گئے ہیں۔ وہ زرد لوگ جو جنگ نہیں لڑ سکتے، اُنھیں بھی بھرتی کر لیا گیا ہے اور اُنھیں مصنوعی تلواریں اور نیزے فراہم کر دیے گئے ہیں۔ ہم اُنھیں مسلسل گشت کرواتے اور دُشمن کو یہ تاثر دیتے رہیں گے کہ ہمارے پاس افرادی قوت کی کمی نہیں ہے۔ ہم اُنھیں ایک پہاڑی سے دُوسری تک لاتے اور پھر اوٹ میں واپس بھیج کر واپس منگواتے رہیں گے۔ ہم دُشمن کے جاسوس پر بھی نظر رکھیں گے اور اُنھیں قتل کرنے کی بجائے اُن سے معلومات حاصل کریں گے۔ ہم اپنے حسنِ سلوک سے اُنھیں اپنا ساتھی بنانے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے اور ہمیں اُمید ہے کہ اس میں کامیاب رہیں گے کیونکہ لوگ طمراق کو دل سے پسند نہیں کرتے۔ میں نے ساحل پر کچھ دستے متعین کر دیے ہیں مگر سپاہ کا بیشتر حصّہ آتش فشاں کے پاس ہی رہنے دیا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک جانب اشارہ کیا جہاں فوج کے خیمے نصب تھے اور رُومی اکھاڑوں کی یاد دلا رہے تھے۔

برگا تو مجھے اُن احکام کی تفصیل بتا رہا تھا جو میں چوٹ کے باعث پیدا ہونے والے نسیان کی وجہ سے بھول چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس بار اپنے دَور اور دُنیا میں واپسی تقریباً ناممکن ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر میں پکڑا گیا یا مارا گیا تو ڈاکٹر فرید وِل کو اپنے تجربے سے کیا فائدہ پہنچے گا۔ البتہ میرے گرفتار ہونے یا مارے جانے پر ثالپ کو دِلی خوشی ہوگی۔

وہ انگیٹھی پر سُرخ کی ہُوئی خود مجھے ضرور پہنا دے گا۔

یہ سوچ کر مجھے ہنسی آ گئی۔

"آپ ہنس رہے ہیں جناب تو ضرور کوئی خوشی کی بات ہوگی مجھے بھی اُس خوشی میں شریک کر لیجیے" برگا نے کہا۔

میں اُس کی بات پر قہقہے لگائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ مجھ سے ثالپ کے انتقام میں شریک ہونے کی درخواست کر رہا تھا۔

"کاش میں تمھیں بتا سکتا کہ مجھے کس بات پر ہنسی آئی تھی۔ باتیں چھوڑو۔ تھوڑی دیر پہلے تم میری دانشمندی کی تعریف کر رہے تھے تو بتاؤ کہ میری وہ دانشمندی کیا تھی۔ میں اپنی تعریف سُن کر خوش ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں وہ تحریر پڑھے دیتا ہوں جو آپ نے مجھ سے لکھوائی۔"

برگا وہ تحریر پڑھ کر سُنانے لگا اور مجھے حیرت ہونے لگی۔ ہر بار ماضی کے سفر پر آ کر خود بھی ماضی کا کردار بن جاتا ہوں۔ میرے اندر بھی وہی خامیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو اُس دور کے اِنسانوں میں پائی جاتی تھیں بلکہ میں اُن سے کہیں زیادہ چالاک اور مکّار بن جاتا ہوں۔ برگا پڑھ رہا تھا۔

"تم نے دعوا کیا ہے کہ تم رومو کے خوبصورت شہر پر قبضہ کر لو گے مگر وہاں تمھیں راکھ کے ڈھیروں اور ملبے کے سوا کچھ نہ ملے گا۔" تو جناب یہ تھا آپ کا پیغام طمراق کے نام اور بھی کچھ بھی ہے؟"

"تمھارے پاس اس خط کا جواب بھی ہوگا؟"

"ہاں جناب۔ اُس نے لکھا ہے کہ چاہے رومو خاک اور راکھ کا ڈھیر ہی کیوں نہ بن جائے مگر وہ انتقام لینے ضرور آئے گا کیونکہ وہ ہمیشہ رومو میں آباد ہونے کا خواب دیکھتا رہا ہے۔ اُس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اُس نے پُجاریوں کی ایک جماعت کو تشدد کے نئے طریقے دریافت کرنے پر مامور کر دیا ہے تاکہ وہ طریقے آپ پر آزمائے جا سکیں۔"

میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا: "پھر تو ہمیں اُس کا انتظار کرنا چاہیے برگا۔ زیادہ سے زیادہ مجھے مرنا ہی تو پڑے گا۔۔ مگر یہ تو معلوم ہو جائے گا اُس نے میرے لیے تشدد کے کون سے نئے طریقے ایجاد کروائے ہیں۔"

"مگر جناب میں تو اپنے سپاہیوں کو یہ ہدایت کر چکا ہوں کہ اگر ہم جنگ ہار جائیں تو گرفتار ہونے کی بجائے خود ہی ایک دُوسرے کا کام تمام کر دیں۔ دُرِ شہوار دشتا بھی یہی کرے گی اُسے اور مجھے فکر ہے تو صرف ٹونا کی جسے طمراق نے قید کر لیا ہے۔ وہ اُسے یہاں ضرور لائے گا اور اس کے عوض سودے بازی کرنا چاہے گا لیکن یہ بے حد ضروری ہے کہ ٹونا رومو کے لیے زندہ رہے۔ میرا خیال ہے کہ دُرِ شہوار دشتا نے اِس سلسلے میں آپ سے بات کی ہوگی۔ اگر نہیں کی تو ضرور کرے گی۔"

میں نے سوچا کہ اُس نے مجھے بُلوایا ہے تو شاید آج رات وہ یہی بات کرے۔ مجھے حیرت تھی کہ ٹونا شاہ گوتار کے قبضے سے طمراق کے پاس پہنچ کر کیسا محسوس کر رہی ہوگی۔

برگا پھر بڑی میز پر پہنچ کر کہنے لگا: "اب تک تو آپ کا منصوبہ کامیاب رہا ہے جناب۔ ہم نے دفاعی انتظامات اس طرح کیے ہیں کہ جزیرے کا شمالی حصّہ دفاعی اعتبار سے طمراق کو کمزور ترین محسوس ہو جب کہ وہی حصّے ہیں جہاں ہمارا دفاع مضبوط تر ہے۔ وہ اپنا سارا زور شمالی حصّے پر ہی ڈالے گا۔ مگر جزیرے کے دُوسرے حصّوں پر بھی حملہ کرے گا۔"

میں نے ایک نظر پھر جزیرے پر ڈالی۔

ہر طرف روشنیاں جھلملانے لگی تھیں اور مغربی جانب شعلے نکلتے دکھائی دے رہے تھے۔

فیونا اب تک جل رہا تھا۔

جوالا مُکھی سے بھی شعلوں کی زبانیں لپکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ برگا نے نقشے سے نظر ہٹا کر شمالی بندرگاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "طمراق کے ہراول دستے ادھر بڑھ رہے ہیں۔ صبح ازب تک اُس کے جہاز پہنچ جائیں گے اور وہ حملے کا آغاز کر دے گا۔ ہم جو کچھ کر سکتے تھے، کر چکے، اب اور کیا حکم ہے؟"

میں نے برگا کو کچھ ہدایات دیں اور واپسی کے لیے تیار ہو گیا کہ اب ہر طرف اندھیرا پھیل رہا تھا اور مجھے دُرِ شہوار دشتا سے ملنا تھا۔

٭

ساحر نے ٹب میں خوشبو ملاتے ہوئے کہا: "شبستانی صبحِ کاذب کے وقت حملہ کریں گے جناب۔"

"یہ خبر پرانی ہو چکی ہے۔" میں نے جواب دیا: "کوئی نئی خبر سناؤ۔"

"طمراق کے ایک سو گھڑسوار ساحل پر پہنچ گئے ہیں اور اِسی جانب بڑھ رہے ہیں۔"

"ہاں۔ یہ اطلاع البتہ نئی ہے۔ تم اُن سے نمٹو گے۔ تمھیں یہاں سے سیدھے برگا کے پاس جانا ہے۔ میں اُسے ہدایت کر چکا ہوں کہ وہ محافظوں کا ایک دستہ تمھاری کمان میں دے دے۔ اب میری باتیں ذرا غور سے سنو۔۔۔"

۔۔۔ پھر میں نے اُسے بھی کچھ ہدایات دیں اور غسل میں مصروف ہو گیا۔

٭

جِنّا مختلف سُرنگوں میں میری رہبری کرتی ہوئی سر جُھکائے آگے آگے چل رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ہر سُرنگ گہرائی میں جا رہی ہے اور اُس کے ساتھ ہی خُنکی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ مجھے کپکپی محسوس ہونے لگی۔

وہ مجھے ایک بڑی کھوہ کے دہانے پر چھوڑ کر واپس چلی گئی۔

اس کھوہ میں اُسی پُراسرار موسیقی کی آواز گونج رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں اُس موسیقی کے مرکز یا مخرج پر کھڑا ہوں۔ میں نے کھوہ کی دیواروں پر نظر ڈالی تو مجھے ہر طرف دَراڑیں ہی دَراڑیں دِکھائی دیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں مکڑی کے کسی بہت بڑے جالے کے درمیان کھڑا ہوں۔

ہر دراڑ سے موسیقی کی آواز آ رہی تھی اور یہ ساری آوازیں مل کر ایک عجیب سی گونج اور عجیب سا تاثر پیدا کر رہی تھیں جس میں صدائے بازگشت کی ڈوبتی آواز بھی شامل تھی اور اُونچے سُروں کے تیز جھناکوں کی آمیزش بھی تھی۔

میں نے کھوہ کی چھت پر نظر ڈالی تو مجھے اُس میں لاتعداد سُوراخ نظر آئے جیسے وہ شہد کا چھتہ ہو۔

اگرچہ یہ کھوہ پہاڑی کی گہرائی میں واقع تھی مگر نہ معلوم کہاں سے تازہ ہوا بھی مسلسل آ رہی تھی۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو فیونا میں جگہ جگہ موسیقی کے کھوکھوں کا راز مجھ پر عیاں ہو گیا۔ یہ پُورے کا پُورا جزیرہ ہی آتش فشاں تھا اور اُس میں لاتعداد سُرنگیں پھیلی ہُوئی تھیں اور یہ موسیقی اُنھی کے ذریعے ہر جگہ منتقل ہو رہی تھی۔ ابھی میں اِنھی خیالوں

میں کھویا ہوا تھا کہ مجھے ویشتا کی آواز آئی۔

"سرفروش ۔۔" اس نے پکار کر کہا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہ اس کمرہ میں موجود نہیں تھی۔ آواز دوبارہ آئی تو میں نے اندازہ کر لیا کہ آواز میرے سامنے والی کسی دراڑ سے آئی ہے۔

"سرفروش"!۔ تیسری پکار پر مجھے پتہ چل گیا کہ آواز کس دراڑ سے آئی ہے۔

میں بے دھڑک اس دراڑ میں چلا گیا۔

کچھ فاصلے پر مجھے روشنی کی جھلک دکھائی دی۔

میں اس کی طرف بڑھنے لگا اور ایک چھوٹی سی کھوہ میں آ گیا جس کے درمیان ایک چھپر کھٹ تھی اور اس کے گرد سیاہ پردے آویزاں تھے۔

"سرفروش!" پردوں کے اندر سے ویشتا کی مدھم آواز سنائی دی تو میں نے آگے بڑھ کر چھپر کھٹ کا سامنے والا پردہ ہٹا دیا۔ اس پر ویشتا ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے پیٹ پر دوائیں گھوٹنے والی ایک کھرل دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کا رنگ کبھی گلابی ہو جاتا تھا، کبھی سفید، کبھی کیسری، کبھی گندمی اور کبھی تپے ہوئے تانبے جیسا۔۔۔ میں اس حسنِ خوابیدہ سے مسحور ہو کر رہ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی ماہر صنم تراش نے دنیا کی سب سے حسین عورت کا مجسمہ بنا کر چھپر کھٹ پر رکھ دیا ہو۔

"سرفروش!" اس کے نیم وا لبوں نے پھر میرا نام لیا۔

"روسو کی دُرِ شہوار، ویشتا۔ میں آ گیا ہوں۔"

اس کے کنول کٹوروں کے پٹ ہلکے سے کھل گئے۔ لیکن اس وقت ان کی آنکھوں میں پیار کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ کسی بھکاری کی جھولی کی طرح بالکل خالی تھیں۔ ان میں سمندر کا سا سکوت تھا جب کہ وہ ٹھہرا ہوا ہو۔ مگر اس کی کوکھ میں طوفان پل رہے ہوں۔

وہ کچھ بھی نہیں بولی، بس خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں ڈول رہا ہوں اور ڈوب رہا ہوں۔

میں نے اپنے آپ کو ان آنکھوں کے سحر کی گرفت سے بچانے کے لیے کہا: "کیا تم نے مجھے ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے بلایا ہے ویشتا؟ یہ وقت اس آنکھ مچولی کا نہیں دُرِ سیاہ۔ میں تمہیں کچھ تلخ حقائق سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میں طمراق کو اپنے ساتھ تنہا مقابلے پر نہ کسا سکا تو یہی تمہارے اس جزیرے کا مقدر بن جائے گی۔"

اس نے ایک ہاتھ بلند کرتے ہوئے جواب دیا: "میں نے تمہیں ان باتوں کے لیے نہیں بلایا سرفروش! اب اس معاملے سے میرا کوئی سروکار نہیں ہے۔"

"کیا۔۔۔!" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "تو پھر کس کا سروکار ہے؟"

"تمہارا۔۔۔" اس نے نگاہیں مجھ پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ "یہ معاملہ تمہارے ہاتھوں میں ہے یا مُونا کے سراپا میں۔۔۔ تم اُسے بچا کر یہاں تک لے آؤ تاکہ وہ اپنی میراث سے محروم نہ رہے۔"

مجھے اُس کی اس بے نیازی پر تاؤ آ گیا۔

"تمہارے پاس ان پہیلیوں کے لیے وقت ہو گا لیکن میرے پاس نہیں ہے، چند گھنٹے بعد پو پھٹنے والی ہے اور اُس وقت مجھے طمراق سے مقابلے کے لیے شمالی بندرگاہ پر ہونا چاہیے۔ اگر اجازت ہو" یہ کہہ کر میں نے اپنا سر خم کر دیا۔

ویشتا اُٹھ کر کُہنی کے بل لیٹ گئی۔ لیکن مجھے اس کا انداز بھی نہ سمجھا سکا۔

وہ بڑی گھمبیر آواز میں بولی: "تم نہیں جاؤ گے۔ تم یہیں رکو، میری بات سنو گے اور کوئی سوال کیے بغیر اُس پر عمل کرو گے۔"

نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اس حکم کی تعمیل کرنا ہی پڑے گی۔

"سامنے الماری میں ایک مقدس ساغر اور مشروب صراحی رکھی ہے۔ انہیں وہاں سے اُٹھا لاؤ۔" جب میں صراحی ساغر اُٹھا لایا تو وہ اُٹھ بیٹھی تھی اور وہ کھرل جو پہلے اُس کے پیٹ پر رکھی ہوئی تھی، اُسے اُس نے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا تو میں اُس کے حُسن بے پناہ سے مبہوت ہو کر رہ گیا۔

اُس نے میری آنکھیں پڑھ لیں اور بولی: "نہیں سرفروش اب یہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اب ایک اسرار ختم ہو گیا ہے اور شروع ہونے والا ہے۔ میں یہ دُنیا چھوڑنے والی ہوں اور میری تم دوسری عورت کو لانے والے ہو۔"

دوسری عورت سے اس کی مراد غالباً مُونا تھی لیکن مُونا کو طمراق کے پنجے سے کیسے نکال کر یہاں لا سکتا تھا۔

ویشتا اب کھرل میں کوئی چیز گھوٹنے لگی تھی پھر اُس نے ایک ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "مشروب۔"

میں نے مشروب کی صراحی اور مقدس ساغر اُسے دے دیا۔ اُس نے ساغر بھرا اور کھرل والا سفوف اُس میں ڈالا تو سا

بلبلے اُٹھنے لگے۔ ویشتا نے جام میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پیو۔۔۔!"

میں نے بغیر کسی احتجاج کے وہ جام اپنے لبوں سے لگا لیا۔

"آؤ۔۔۔ اب میرے ساتھ بیٹھو۔" ویشتا نے نیا حکم دیا اور میں اُس کے ساتھ چھپر کھٹ پر بیٹھ گیا۔ اگرچہ چند لمحے پہلے میں اُس کی رفاقت کے لیے ترس رہا تھا۔۔ مگر وہ مشروب پینے کے بعد میری اُس آنند کا شعلہ بجھ سا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے جو کچھ بھی ہو رہا ہے، خواب میں ہو رہا ہو۔ مجھے ویشتا کے حسین سراپا سے اُٹھنے والی خوشبو تو آ رہی تھی مگر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ خوشبو اور یہ مہک کہیں دُور سے آ رہی ہو۔ ہر طرف عود و عنبر کے مرغولے اُٹھ رہے ہیں اور ان مرغولوں میں ویشتا کا چاند سا چہرہ چمک رہا ہے۔۔۔ مگر میری نگاہ کسی ایک چیز پر زیادہ دیر نہیں ٹِک رہی تھی۔ میری حالت اس مے خوار جیسی ہو گئی تھی جسے سرور میں ہر شے دُھندلی دُھندلی دِکھائی دینے لگتی ہے مگر اس کیفیت کے باوجود میں مکمل ہوش و حواس میں تھا۔

۔۔۔ اور پھر یکایک ویشتا کے ہاتھ میری گردن تک پہنچ گئے۔ اُن میں زندگی کی کوئی گرمی اور کوئی حرارت نہیں تھی بلکہ اُس کے ہاتھ برف کی مانند یخ ہو رہے تھے جیسے وہ ایک جیتی جاگتی عورت کے نہیں بلکہ کسی لاش کے ہاتھ ہوں۔۔۔ پھر اُس نے مامتا کی ماری ماں کی طرح مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تب وہ سرگوشیوں میں مجھے ہدایات دینے لگی۔۔۔ اور اُس کا ہر لفظ میرے ذہن کی لوح پر نقش ہوتا چلا گیا۔

جب وہ سب کچھ کہہ چکی تو آخر میں بولی: "آؤ، ستارے اپنے اپنے بروج میں آ چکے ہیں۔ وہ وقت بھی آ گیا ہے جس کی میں صدیوں سے منتظر تھی۔"

اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے ایک ایسی کھوہ میں لے گئی جس کے بیچوں بیچ ایک حوض تھا جس کی شکل آنکھ جیسی تھی اور وہ حوض اس نیم روشن کھوہ میں کسی حسینہ کی چشمِ مست ہی لگ رہا تھا۔ اس کا پانی سیاہ اور بے حد ٹھنڈا تھا۔

ویشتا نے مجھے اشارہ کیا اور میں اپنی زرہ اُتارنے لگا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ میرے ہاتھوں میں شفا بخش تاثیر ہے۔ ان کا لمس آفات سے محفوظ رکھتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ میرے کندھوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ "میں وہیں تمہاری راہ دیکھوں گی مگر یاد رکھو، سرفروش۔۔۔ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب تمہارے لیے زندگی اور موت میں سے صرف ایک ہی چیز باقی رہ گئی ہے۔ وہ زندگی بھی ہو سکتی ہے اور موت بھی۔۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل گئی۔

میں نے زرہ اُتاری اور اُس سیاہ حوض میں سر کے بل کود گیا۔

پانی یخ تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں مگر وہاں اندھیروں کے ڈیرے تھے۔ حوض ایک کنویں سے قدرے چوڑا تھا مگر میرے بازو بار بار اُس کے دیواری پتھروں سے جا لگتے تھے اور اُس کی تہ نہ جانے کتنی گہرائی میں تھی کہ آ ہی نہیں پاتی تھی۔

میرا دم گھٹنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ پانی کے دباؤ سے میرے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ میرا جی چاہا کہ مزید نیچے جانے کی بجائے دوبارہ سطح پر آ جاؤں۔۔۔ مگر میں نے جی کڑا کیا اور گہرائی میں اُترتا چلا گیا۔۔۔ اور میرے ہاتھوں نے بالآخر تہ کو چھو ہی لیا۔

جیسا کہ ویشتا نے کہا تھا، تہ میں ایک بڑی تلوار اور گیند کے برابر ایک موتی موجود تھا۔ میں نے ایک ہاتھ میں موتی اور دوسرے میں تلوار پکڑی اور اُوپر آنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ سطحِ آب پر جانے سے پہلے ہی میرا دم ٹوٹ جائے گا۔

ابھی میں درمیان ہی میں تھا کہ کسی لجلجی سی چیز نے میرے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس کی لپیٹ اتنی تیز تھی کہ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی اُس نے میرے دونوں بازو میرے جسم کے ساتھ جکڑ دیئے۔ میں نہ تو ہاتھ چلا سکتا تھا اور نہ ہی کسی اور طریقے سے اُس موذی اژدھے کا مقابلہ کر سکتا تھا جس کی گرفت لمحہ بہ لمحہ میرے جسم کے گرد تنگ ہوتی جا رہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ میری ہڈیاں چٹخ جائیں گی۔

ویشتا نے مجھے اس بَلا کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا ورنہ میں اپنا خنجر لے کر پانی میں اُترتا۔ میں اتنا بے بس ہو چکا تھا کہ مجھے اپنی موت یقینی معلوم ہونے لگی۔

اژدھے کا کساؤ دم بہ دم بڑھ رہا تھا۔

اچانک اُس کی دُم میرے مُنہ پر آ گئی۔

مجھے اور کچھ نہ سُوجھا تو میں نے اس کی دُم میں اپنے دانت گاڑ دیئے اور اُسے بُری طرح چبانے لگا۔

اچانک اژدھے کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ اپنی دُم چھڑانے کے لیے تیزی سے اُوپر جانے لگا مگر میں نے اُس کی دُم نہ چھوڑی۔

سطحِ آب کے قریب پہنچ کر اُس نے ڈبکی لگائی اور نیچے جانے لگا تو میں نے دُم چھوڑ دی اور اُوپر آ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہو، میں کنارے پر پہنچ چکا تھا اور میں نے وہ بڑی تلوار نیام سے نکال لی تھی۔۔۔ مگر وہ حوض سے باہر نہ آ سکا۔

تلوار اتنی چمک دار اور تیز تھی کہ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی

اسے آب دی گئی ہو۔ اُس کے دستے پر لعل و جواہر لگے ہُوئے تھے اور سیاہ موتی سے قوسِ قزح کے رنگوں کا دھوکا ہو رہا تھا۔ مَیں نے جلدی جلدی لباس پہنا اور دونوں چیزیں لے کر اُسی کھوہ میں آگیا، جہاں دیشتا چھپر کھٹ پر لیٹی ہُوئی تھی۔

مَیں نے تلوار اس کے پہلو میں رکھ دی۔ صراحی اور ساغر اُٹھائے اور اُن کے ساتھ ہی سیاہ موتی بھی الماری میں رکھ دیا۔۔ پھر میں دیشتا کے قریب آیا۔ ایک نظر اُس حُسنِ خوابیدہ پر ڈالی تو بے اختیار مجھے جھرجھری سی آگئی۔

مَیں نے ایسا مکمل سراپا اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ حُسنِ مکمل کا بہترین نمونہ تھی۔۔ لیکن مجھے اس کی ہدایات پر عمل کرنا تھا۔ اس لیے مَیں چند لمحوں تک اُسے دیکھتا رہا۔ وہ اُسی طرح آنکھیں موندے تیز تیز سانسیں لیتی رہی۔۔ پھر مَیں نے تلوار نیام سے نکالی اور اُس کی نوک دیشتا کے دِل پر رکھ کر پُوری قوت سے اس پر دباؤ ڈالا تو تلوار اُس مرمریں پیکر کے آر پار ہوگئی۔

دیشتا کے مُنہ سے صرف ایک چیخ نکلی۔

وہ ایک بار سکڑی سمٹی اور ڈھیلی پڑ گئی۔

اَب جو مَیں نے اُس کے چہرے پر نظر ڈالی تو دہشت سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میرے سامنے حُسنِ مجسم دیشتا کی بجائے ایک ایسی بڑھیا کی لاش پڑی تھی جس کے چہرے پر جھُریوں نے جال بُن رکھا تھا۔

مَیں نے دیشتا کی ہدایت کے مطابق لاش اُٹھائی اور کھوہ کے اُس دہانے کی طرف بڑھ گیا جس کی وہ نشاندہی کر چُکی تھی۔ یہ دہانہ مجھے ایک طویل سُرنگ میں لے آیا۔۔ اور یہ سُرنگ اُس چبوترے کے قریب ختم ہُوئی جہاں آج شام مَیں نے دیشتا کو شعلوں کے درمیان کھڑے دیکھا تھا۔

اگر اس وقت دِن کی روشنی ہوتی تو مجھے وہاں سے وہ مینار بھی دِکھائی دے جاتا جہاں برگا مجھے لے گیا تھا اور جہاں سے مَیں نے پُورے جزیرے کا معائنہ کیا تھا۔

مَیں نے دیشتا کی لاش، جو اَب بے حد ہلکی پُھلکی لگ رہی تھی، اپنے سر سے اُوپر اُٹھائی اور اُسے آتش فشاں کے شعلوں میں پھینک دیا۔ ایک لمحے کے لیے شعلے اور دُھواں گڈمڈ ہوگئے۔ مَیں نے ہاتھ اُٹھا کر دیشتا کو آخری سلام کیا اور وہاں سے واپس چل دیا۔

جب مَیں حجلۂ موسیقی سے باہر آیا تو مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میں یکسر بدل چُکا ہُوں اور پہلے والا سرفروش بن چُکا ہُوں۔ اَب مجھے اپنے ماضی کی ہر بات یاد آرہی تھی اور میرا مرضِ نسیان بالکل ختم ہو گیا تھا۔ مَیں اس قسم کی باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتا اور اپنی یادداشت کی خرابی کو سَر پر آنے والی چوٹ کا نتیجہ سمجھتا تھا۔۔ مگر اس طرح یادداشت کا ایک دم ٹھیک ہو جانا، میرے لیے حیرت انگیز تھا۔

مَیں اپنی کھوہ میں آکر بستر پر ڈھیر ہوگیا۔

نیند نے فوراً ہی مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

پو پھٹنے سے نصف گھنٹہ پیشتر جب ساحر نے مجھے جگایا تو میں بالکل تازہ دم تھا۔

"ہم نے پچاس شبستانیوں کو تہِ تیغ کر دیا ہے۔ سو سے زیادہ قیدی بنا لیے ہیں اور اُن کے گھوڑوں پر قبضہ کر لیا ہے مگر اس جھڑپ میں ہمارے بھی بیس سپاہی ہلاک ہو گئے ہیں۔ مَیں نے قیدیوں کو آپ کا پیغام دے کر آزاد کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھیوں تک ضرور پہنچا دیں گے۔" ساحر نے بتایا۔

"بہت خوب۔۔ مگر یہ بات ناکافی ہے۔ مَیں چاہتا ہُوں طمراق کے سارے فوجیوں کو میرے چیلنج کا علم ہو جائے۔ کیا تمھارے ہرکارے اور گماشتے تمھاری ہدایات پر عمل کر رہے ہیں؟"

"ہاں۔۔ مَیں نے اُسی مقصد کے لیے اشتہار بھی لکھوا کر انھیں دے دیے ہیں تاکہ وہ انھیں ساحل پر پہنچنے والے شبستانیوں میں تقسیم کر دیں۔"۔۔ پھر اُس نے قہقہہ لگایا اور بولا "مَیں نے پہلے کبھی کوئی جنگ محض الفاظ سے جیتتے ہُوئے نہیں دیکھی۔۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ترکیب کارگر ثابت ہوگی۔ مَیں خود بھی سپاہی ہوں اور جانتا ہوں کہ کوئی سپاہی خواہ مخواہ اور بلا مقصد اپنی جان دینا پسند نہیں کرتا۔ وہ آسان ترین فتح کا خواہش مند ہوتا ہے۔ آپ نے اُن کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔"

"یہ تو وقت آنے پر ہی معلوم ہو سکے گا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔" مَیں نے جواب دیا اور غسل کرنے چلا گیا۔

⚙

کچھ دیر بعد میرے دائیں جانب ساحر اور بائیں جانب برگا گھوڑوں پر سوار شمالی بندرگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ ہمارے پیچھے چند عسکری افسر تھے۔ ساحر نے میرے لیے بطورِ خاص ایک سیاہ گھوڑا منتخب کیا تھا اور اس کی خاطر اُس کے سوار کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ برگا کا گھوڑا نقرہ تھا اور ساحر بھورے رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا۔

راستہ چلتے ہوئے ساحر نے اپنی واحد ٹھیک آنکھ سے مشرقی اُفق کی جانب دیکھا اور بولا "موسم بتا رہا ہے کہ آج شام سے پہلے پہلے سمندر میں سخت طوفان آئے گا جو اس جزیرے کو بھی زد میں لے لے گا۔"

مَیں نے سوالیہ نگاہوں سے برگا کی طرف دیکھا کہ اس سلسلے میں اس کی کیا رائے ہے۔ اُس نے بھی ساحر کی تائید کی اور کہا: "اگر طوفان سمندر میں موجود طمراق کے جہازوں سے ٹکرا جائے تو جہاز پاش پاش ہو کر ریلے میں ساحل سے آ ٹکرائیں گے تب ہم شبستانیوں سے بآسانی نمٹ سکیں گے۔"

اگرچہ طوفان ہمارے حق میں تھا لیکن میرا منصوبہ طمراق سے شمالی بندرگاہ میں مقابلہ کرنے اور اُسے گھیرنے کا تھا۔ اب اس صورت میں بندرگاہ اُس کے جہازوں کے لیے مفید پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی۔ تاہم میرے پاس نہ تو اتنا وقت تھا اور نہ ہی اتنی نفری کہ مَیں اپنے منصوبے میں کوئی تبدیلی کر سکتا۔

مَیں نے اس معاملے کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

ہمارے ایک جانب زمین بتدریج ڈھلان کی شکل میں، سمندر سے جا ملی تھی اور اس میں نرم ریت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ہمیں اس حِصّے میں ایک جگہ گرد اُڑتی دِکھائی دی۔ ساحر کی تجربہ کار آنکھوں بلکہ اکلوتی آنکھ نے فوراً پہچان لیا کہ وہ شبستانیوں کا ایک اور ہراول دستہ ہے۔

"کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس دستے میں کتنے سپاہی ہوں گے؟" مَیں نے پوچھا۔

ساحر کی بجائے برگا بول اُٹھا: "اس دستے میں تقریباً ایک سو آدمی ہیں جناب! اور انھوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے اس لیے اُن کا رُخ ہماری طرف ہو گیا ہے۔"

مَیں نے فوراً چار عسکری عہدے داروں کو حکم دیا کہ وہ اپنے دستے کو ترتیب دیں پھر مَیں نے ساحر سے کہا: "تم شمالی بندرگاہ چلے جاؤ اور حالات معلوم کرو۔"

"اس طرح تو مَیں اس معرکے میں حِصّہ لینے سے محروم رہ جاؤں گا۔"

"ابھی ایسے بہت سے موقعے آئیں گے ساحر۔ وہاں کے حالات معلوم ہونا بہت ضروری ہیں۔ جاؤ۔"

وہ بادلِ نخواستہ اُدھر چل دیا۔

افسروں نے دستے کو ترتیب دے دیا۔ انھوں نے تین صفوں میں ایک مربع بنا لیا۔ اگلی صف میں سپاہی نیزے لے کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ اُن کے پیچھے تیر انداز اور نیزہ باز تھے۔۔۔ بیچ میں، مَیں، برگا اور دوسرے افسر۔۔ اُدھر شبستانیوں کے دستے نے ایک نیم دائرے کی صورت اختیار کر لی تھی۔

"اَب تک انھیں حملہ کر دینا چاہیے تھا مگر ایسا لگتا ہے کہ وہ ہم سے صُلح کی بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔" برگا نے کہا۔

میں نے دیکھا کہ اُن کا ایک کمان دار صف سے آگے بڑھ رہا تھا۔ برگا اُسے دیکھ کر بولا "مَیں اسے جانتا ہوں۔ یہ کمان دار بہزاد ہے۔ بڑا تجربہ کار، جنگجو اور ظالم ہے۔ شاید وہ بات چیت کرنے کے لیے آئے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس وقت صُلح کر لینی چاہیے تاکہ جانی نقصان سے بچ جائیں۔"

"نہیں برگا!" مَیں نے اُسے ٹوک دیا "جنگ ہونی چاہیے۔ تاکہ مَیں تمھارے سپاہیوں کے لڑنے کی استعداد کا اندازہ کر سکوں۔"

کمان دار بہزاد نے صف سے نکل کر اپنے ہاتھ بلند کر لیے جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ پُرامن طور پر بات کرنا چاہتا ہے۔۔۔ پھر وہ اپنا گھوڑا ہماری طرف بڑھانے لگا۔ میں نے بھی اپنا گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

"مجھے تیر چلانے کی اجازت دیجئے جناب! میں ابھی اس کے دِل میں تیر پیوست کر دوں گا۔ اگر نہ کر دوں تو میری گردن اُڑا دیجئے گا۔" ایک تیر انداز بولا۔

"اتنی جلد بازی کی ضرورت نہیں، جوان۔ پہلے بات کر لینے دو۔" مَیں نے اُسے جواب دیا اور اپنا گھوڑا بہزاد کے سامنے لے آیا۔

"کیا تم ہی وہ اجنبی ہو جس کا نام سرفروش ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن تم لڑنے کی بجائے بات چیت کیوں کرنا چاہتے ہو؟" مَیں نے جواباً کہا۔

"فکر نہ کرو۔ مَیں تم سے ضرور لڑوں گا لیکن پہلے وہ پیغام سُن لو جو مَیں طمراق کی طرف سے تمھارے لیے لایا ہُوں۔"

"بتاؤ، کیا پیغام ہے؟"

"میرے مالک نے کہا ہے کہ وہ ایک بہادر جنگجو کی حیثیت سے تمھاری قدر کرتا ہے مگر وہ تمھارا دوست نہیں ہے۔ ہر وہ آدمی جو تمھاری طرح اُسے گیدڑ بھبکیاں دیتا ہے، اس کے لیے دِلچسپی کا باعث بن جاتا ہے۔ بہرصُورت وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"مَیں بھی اُس سے ملنے کا مشتاق ہوں۔" مَیں نے کہا۔

"تو پھر بہت آسانی سے یہ معاملہ طے ہو سکتا ہے۔ اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ ہمارے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔ اُن کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا جائے گا۔ تم نے جو جنگی تیاریاں کی ہیں، انھیں ختم کر دو کیوں کہ یہ باتیں میرے آقا کے لیے اشتعال انگیز ہیں۔۔۔ وہ کسی تباہ حال ملک کا فاتح نہیں بننا چاہتا۔ تمھارے ساتھ ایک معزز مہمان

جیسا سلوک کیا جائے گا۔ تم جب تک چاہو، یہاں رہ سکتے ہو۔ اگر تم پسند کرو تو تمھیں تمھارے شایانِ شان عُہدہ بھی مل سکتا ہے۔ میرے مالک کا کہنا ہے کہ دُر سیاہ و لیشا حسبِ معمول یہاں کی رُوحانی پیشوا رہے گی اور اُسے بالکل نہیں چھیڑا جائے گا؛

"ردمو پر کس کی حکمرانی ہوگی؟ غدار شاہ کوتار اور ملکہ سمری کی یا مُونا کی؟" مَیں نے سوال کیا۔

"کوتار اور اُس کی ملکہ کو قتل کر دیا گیا ہے کیوں کہ انھوں نے ردمو سے غداری اور ردفیشا سے بغاوت کی تھی۔ وہ تمھیں بھی قیدی بنانا چاہتے تھے اور میرا آقا طراق سازشیوں کو پسند نہیں کرتا؛"

"اور مُونا کا کیا بنا جسے کوتار اور سمری اپنے ساتھ تمھارے آقا کی حفاظت میں لے گئے تھے۔ کیا اُسے بھی قتل کر دیا گیا ہے؟"

میرے اس سوال پر کمان دار بہزاد نے بڑے زور سے ایک ہاتھ اپنی ران پر مارا اور قہقہہ لگاتے ہُوئے بولا: "اس کا مطلب ہے کہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ تمھیں مُونا کا التفات حاصل ہو چُکا ہے اور تم اَب بھی اُس کی رفاقت کے متمنی ہو۔"

مجھے یہ سُن کر غصّہ آگیا۔

"فضول باتوں کی ضرورت نہیں۔ میرے سوال کا جواب دو۔"

بہزاد کی آنکھیں بھی غصّے سے سکڑ گئیں۔

"تمھارا یہ لب ولہجہ میری شان کے خلاف ہے۔ مَیں شبستانی سپاہ کا کمان دار ہوں؛"

"اچھی بات ہے، بہزاد۔ مَیں معذرت خواہ ہُوں لیکن مجھے اپنے سوال کا جواب ابھی تک نہیں مِلا؛"

"مُونا میرے آقا کے ساتھ اس کے جہاز پر ہے۔ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جا رہا ہے مگر دیویوں جیسا نہیں۔ اگر تم ہتھیار ڈال دو تو میرا خیال ہے کہ میرا آقا فراخ دِلی کا ثبوت دیتے ہُوئے مونا بھی تمھیں لوٹا دے گا۔"

صُلح کی یہ پیش کش متوقع تھی کیوں کہ ٹاپ مجھے بتا چُکا تھا کہ طراق کے فوجی بھی مسلسل جنگوں سے اُکتا اور تھک چکے ہیں... دوسرے سپاہ کا ایک بڑا حصّہ بھی ختم ہو چُکا ہے۔

مَیں نے اپنا لب ولہجہ نرم کرتے ہوئے پوچھا: "کیا تمھارے آقا کو میرا پیغام مل چُکا ہے اور اُسے میرا تقاضا منظور ہے؟"

"ہاں، اُسے تمھارا وہ پیغام مل چُکا ہے جو تمھارے ہرکارے ساحل پہ کھڑے ہو کر زور زور سے سُناتے ہیں، جسے ہماری سپاہ میں بددلی پھیلانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ میرا آقا وہ پیغام سُن چُکا ہے اور اُس نے اُس پیغام پر کوئی توجہ نہیں دی؛"

"اس نے کوئی توجہ نہیں دی؛" مَیں نے تعجب سے دُہر

"مَیں نے تو سُنا تھا کہ وہ بہادر ہے... مگر وہ بزدل نکلا اور میرے ساتھ مقابلہ کرنے سے ڈر گیا ہے؛"

"طراق کسی سے نہیں ڈرتا سرفروش؛"

مَیں نے قہقہہ لگایا اور کہا: "ہاں... وہ اس دیوتا سے نہیں ڈرتا جس کے لیے وہ کام کرنے کا دعوا کرتا ہے؛"

"ہاں... لیکن وہ تم سے تنہا مقابلہ کیوں کرے؟ اس سے اُسے کیا فائدہ ہوگا؟"

"بے شک اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا؛" مَیں نے بہزاد کو جواب دیا: "ہم دونوں کے تنہا مقابلے کا فائدہ تو تمھیں اور تمھا سپاہ کے ہر آدمی کو پہنچ سکتا ہے لیکن اُسے نہیں پہنچے گا۔ وہ گزش بیس سالوں سے اَن گنت سپاہیوں کو جنگ کا ایندھن بناتا آ رہا ہے۔ ہر سپاہی کو اپنی جان اتنی ہی عزیز ہوتی ہے جتنی کہ ایک جرنیل کو... مگر جرنیل تو اس دوران گنتی کے مرے ہوں گے جب ہزاروں سپاہی موت کے گھاٹ اُتر گئے اور تاج بدوش طراق سر پر رہا... اگر تم نے یہ جنگ جیت لی تو تمھیں کھنڈروں اور لاشوں کے سوا یہاں کچھ نہیں ملے گا... پھر یہ جنگ بھی تم آسانی سے نہیں جیت سکو گے۔ ہم سے زیادہ جانی نقصان تمھارا ہوگا۔ اگر تمھیں میری باتوں پر یقین نہیں تو جاؤ اور اپنے سپاہیوں سے پوچھ لو کہ وہ مرنا چاہتے ہیں یا زندہ رہنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ بھی انسان ہیں۔ جانور نہیں ہیں۔ وہ کب تک اپنی خوشیاں اپنے ہاتھوں قتل کرتے رہیں گے اور کب تک اپنی جانوں کی قربانی دیتے رہیں گے؛"

بہزاد نے میری اس تقریر کے بعد پہلے تو زمین پر تھوک دیا پھر بولا: "میں یہ ساری باتیں سُن چُکا ہوں سرفروش۔ یہ سب تمھاری افواہیں ہیں لیکن ان سے تمھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا کیوں کہ طراق تم سے تنہا مقابلہ کر کے جنگ کا فیصلہ کرنے کے حق میں نہیں ہے؛"

"مگر میرا خیال ہے کہ اُسے میری یہ دعوتِ مبارزت قبول کرنا پڑے گی؛" مَیں نے اعتماد اور یقین سے کہا: "کوئی آدمی خود اُن خطرات سے مُنہ نہیں موڑ سکتا جن سے وہ اپنی فوج کو دوچار کرنا چاہتا ہو۔ مَیں نہیں سمجھتا، تمھارا آقا اتنا احمق ہوگا کہ خود تو موت سے ڈرے مگر اپنے سپاہیوں سے یہ توقع رکھے کہ وہ موت سے نہ ڈریں۔ بالآخر اُسے مجھ سے مقابلہ کرنا ہی ہوگا۔ مَیں ساحل کی طرف جا رہا ہوں اور چلّا چلّا کر کہوں گا کہ وہ بزدل ہے... اور مجھ تنِ تنہا کے مقابلے میں خود تنِ تنہا نہیں آنا چاہتا۔ مَیں اُس سے ایسی سودے بازی کرد

وہ اِس سے انکار نہیں کر سکے گا اور اگر اُس نے انکار کر دیا تو اپنے جرنیلوں اور سپاہ کے سامنے اُس کی عزت و حیثیت دو کوڑی کی بھی نہیں رہے گی اور اُس کے افسر ایک ہفتے کے اندر اندر ہی سازشوں اور بغاوت پر اُتر آئیں گے؛"

"تم ساحل پر نہیں جاؤ گے؛" بہزاد بولا: "تمھیں ساحل تک پہنچنے ہی نہیں دیا جائے گا۔ مجھے اسی مقصد کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے؛" یہ کہہ کر اُس نے گھوڑا موڑا اور اپنی صفوں کی طرف دوڑاتا چلا گیا۔

مَیں بھی اپنا گھوڑا اپنی صفوں کے درمیان لے آیا۔

برگا اور میرے کمان دار میرے دلائل سے خوش نظر آتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اُن سے متوقع نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔

اتنے میں بہزاد کے سپاہیوں کا پہلا دستہ گھوڑے دوڑاتا ہُوا ہماری طرف بڑھنے لگا۔ مَیں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا: "سپاہیوں کو نہیں بلکہ پہلے اُن کے گھوڑوں کو نشانہ بناؤ۔ تیر انداز، نیزہ باز اور بھالے پھینکنے والے سب کے سب یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ گھوڑوں کے مقابلے میں ہم پیدل سپاہیوں سے بآسانی نمٹ سکتے ہیں؛"

جُونہی گھڑ سوار زد میں آئے، پہلے تیر اندازوں اور پھر نیزہ بازوں نے گھوڑوں کو نشانے پر رکھ لیا۔ گھوڑے گرنے لڑکھڑانے اور پلٹنے لگے تو اُن کے سوار اُترنے پر مجبور ہو گئے۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اُن کو تیروں اور بھالوں نے ڈھیر کر دیا۔ بہزاد کی دوسری اور تیسری ٹکڑی کا بھی یہی حشر ہُوا تو آخری چالیس آدمیوں کے ساتھ اُس نے پیدل ہی ہم پر حملہ کر دیا۔

وہ غصّے سے اندھا ہو رہا تھا اور جنگی چالوں سے بھی انحراف کر رہا تھا ورنہ یہ حماقت ہرگز نہ کرتا کہ ہم تو چاہتے بھی یہی تھے۔

مَیں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ بہزاد کے ریلے کو روکنے کے بجائے درمیان سے ہٹ جائیں اور انھیں اندر آنے دیں جب وہ اندر آجائیں تو اُن کی واپسی کا راستہ بند کر دیا جائے۔

میرے سپاہیوں نے ایسا ہی کیا۔

بہزاد اور اُس کے سپاہی جُونہی یلغار کرتے ہُوئے آگے بڑھے، میرے سپاہی پیچھے ہٹنے لگے۔ بہزاد اسے اپنی کامیابی سمجھتے ہُوئے ہمارے حصار میں آگیا اور جب اُسے یہ احساس ہُوا کہ وہ بُری طرح پھنس گیا ہے تو اس وقت تک واپسی کا راستہ بھی مسدود ہو چُکا تھا۔

وہ ہر طرف سے گھر گئے تو مَیں نے بآوازِ بلند اپنے آدمیوں کو کہا: "بس... اَب انھیں قتل نہ کرو؛"

یہ سُن کر بہزاد اور بچے کھچے سپاہی تعجب سے میری طرف دیکھتے رہ گئے۔ خود برگا اور میرے دوسرے ساتھی بھی اس حکم پر حیران تھے مگر ہمارے سپاہیوں نے قتلِ عام سے ہاتھ روک لیا تھا۔

"مَیں نے سنا تھا کہ تم شیطان ہو۔ یہ بات مجھے درست معلوم ہوتی ہے۔ میرے نصف سے زیادہ آدمی مارے جا چکے ہیں۔ تم لوگ باقیوں کو بھی بآسانی ٹھکانے لگا سکتے تھے۔ تم نے اپنے آدمیوں کو روک کیوں دیا ہے؟" بہزاد اُلجھن سے بولا۔

مَیں اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرا دیا اور اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتا، وہ پھر بول اُٹھا۔

"مَیں یہ مقابلہ ہار چُکا ہوں لیکن مَیں اس توہین پر موت کو ترجیح دوں گا اور ہتھیار نہیں ڈالوں گا؛"

مَیں نے اُسے جواب دینے کی بجائے اپنے کمان داروں سے کہا: "یہ لوگ ہمارے قیدی ہیں۔ ان سے کوئی بُرا سلوک نہ کیا جائے اور نہ ہی ان پر اَب کوئی سپاہی حملہ کرے، تاوقتیکہ مَیں ان کے بارے میں کوئی دوسرا حکم نہ دوں؛"

یہ حکم دے کر مَیں بہزاد کی طرف پلٹا اور بولا: "آگے آؤ بہزاد... میں تم سے دو دو باتیں کرنا چاہتا ہوں؛"

"تم ہمیں اپنے پھندے میں لے کر بات کرنا چاہتے ہو، مَیں تمھیں غلط سمجھا تھا۔ تم شیطان نہیں بلکہ احمق ہو۔ اتنے احمق کہ جنگ کا پہلا اصول بھی نہیں جانتے ورنہ اَب تک تم ہمارے پرخچے اُڑا چکے ہوتے؛"

مَیں نے اس کی بات اَن سُنی کر دی اور شبستانی سپاہیوں سے بولا: "شبستانی دلاورو! مَیں سرفروش ہوں۔ تم نے میرا نام سُنا ہوگا اور یہ بھی جانتے ہو گے کہ مَیں نے تمھارے جرنیل کو مقابلے کی دعوت دی ہے لیکن جن لوگوں کو اس دعوت کا علم نہیں ہے، مَیں اُن کے لیے دُہرا رہا ہوں۔ غور سے سُنو اور یاد رکھو کہ میں تمھیں تمھارے ہتھیاروں سمیت باعزت طور پر رہا کرنا چاہتا ہوں تاکہ تم واپس جا کر طراق کو میری باتوں کی یاد دہانی کرا دو اور یہ ہے میری دعوتِ مبارزت...

"مَیں لبِ ساحل طراق سے تنِ تنہا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں... اُسے بھی تنہا ہونا چاہیے۔ مَیں اس مقابلے میں صرف تلوار اور ڈھال استعمال کروں گا لیکن وہ اپنی مرضی کے مطابق جتنے ہتھیار استعمال کرنا چاہے، کر سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ چاہے تو مقابلے میں گھوڑا اور نیزہ بھی استعمال کر سکتا ہے۔ مَیں اُسے یہ رعایت اس لیے دے رہا ہوں کہ وہ بُزدل ہے اور مجھ سے مقابلہ کرنے سے ہچکچا رہا ہے مگر مجھے اپنے زورِ بازو پر بھروسا ہے۔ مَیں یقیناً اُسے شکست دوں گا اور اگر ایسا نہ ہُوا تو بھی تم لوگ موت کے مُنہ سے بچ جاؤ گے کہ اِس

مقابلے کے بعد جنگ نہیں ہوگی۔ اگر میں جیتا تو بھی جنگ نہیں ہوگی اور تم سب زندہ رہو گے۔ مجھے سپاہیوں یا کمان داروں سے کوئی دُشمنی نہیں۔ کمان دار اور سپاہی تو اوپر سے دیئے جانے والے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ تم طراق کی خاطر کیوں جان دو۔ جب مَیں اُسے مقابلے کی اتنی سہولتیں دے رہا ہوں تو پھر اُسے بھی اپنے سپاہیوں کو جنگ کا ایندھن نہیں بنانا چاہیے۔ اگر وہ مقابلے سے گریز کرتا ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ بُزدل ہے اور اُسے تمھاری جانوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ . . پھر ایک بزدل بادشاہ کیوں زندہ رہے؟"

جُونہی مَیں نے یہ تقریر ختم کی، بہزاد بول اُٹھا: "یہ ہمارے آقا کو پھانسنے کی ایک چال ہے جسے وہ خوب سمجھتا ہے۔" پھر وہ اپنے سپاہیوں سے بولا: "اگر کسی نے اس جھوٹے شیطان کی بات پر کان دھرے اور یہ بات اُن لوگوں تک پہنچائی جو یہاں موجود نہیں ہیں تو انھیں عبرت ناک سزا دی جائے گی۔"

مجھے اس ضدی شخص کی بات پر تاؤ تو بہت آیا . . مگر مَیں اپنا غصّہ پی گیا۔

"یہ تمھارا جھگڑا نہیں ہے۔ اس لیے تم اس میں نہ پڑو۔ مَیں نے تم سے باعزت رہائی کا جو وعدہ کیا ہے اُسے ضرور پُورا کروں گا لیکن اگر تم بہزاد کی باتوں میں آئے تو میرے ایک اشارے سے تم سب یہیں ڈھیر ہو جاؤ گے۔ تم بہادری سے لڑے ہو مگر یہ ضروری نہیں کہ تم اپنی جان ہی دے کر بہادر کہلاؤ . . . کیا طراق نے تمھارے عزیزوں، تمھارے پیاروں اور تمھارے بال بچّوں کا کوئی خیال کیا ہے؟ وہ تمھارے بچّے یتیم کرتا، تمھاری ماؤں سے بیٹے، بیویوں سے اُن کے سہاگ اور بہنوں سے بھائی چھینتا آیا ہے محض اس لیے کہ اُس کی برتری برقرار رہے۔ وہ اپنی برتری برقرار رکھنے کے لیے خود مجھ سے مقابلہ کیوں نہیں کر لیتا؟" مَیں نے سپاہیوں سے کہا۔

میری اس بات پر بہت سے سپاہیوں کے سر اثبات میں ہلے تو بہزاد چیخ اُٹھا: "تمھاری زبان کی کاٹ ہتھیار سے کم نہیں ہے سرفروش۔ دیکھنا یہ ہے کہ تمھاری تلوار بھی تمھاری زبان کی طرح کاٹ رکھتی ہے یا نہیں؟ . . . مرد ہو تو آؤ پہلے میرے ساتھ ہی مقابلہ کر کے دیکھ لو۔"

وہ ہر حال میں لڑنے مرنے پر تُلا ہُوا تھا۔ اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ اُسے ٹھکانے لگا دوں . . . مگر میں چاہتا تھا کہ سپاہی میری شمشیر زنی کا اندازہ نہ لگا سکیں تو بہتر ہے اس لیے مَیں نے اس سے کہا: "تم پہلے ہی لڑائی میں تھک چکے ہو اور زخمی بھی ہو، اس لیے مَیں تم سے نہیں لڑنا چاہتا۔"

اُس نے قہقہہ لگایا اور بولا: "یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس طرح تم اپنی بُزدلی پر پردہ ڈالنا چاہتے ہو۔ کیا اسی برتے پر میرے آقا سے مقابلہ کرو گے؟"

مجھے غصّہ آگیا اور مَیں نے کہا: "کیا تم میرے ہی ہاتھوں مرنا چاہتے ہو؟"

"مرنے سے پہلے مَیں تمھیں بھی اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ تم میرے آقا کو للکار سکو۔" یہ کہہ کر وہ میرے سامنے آگیا۔

مَیں سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح مجھے مارنا یا زخمی کر دینا چاہتا ہے تاکہ مقابلے کی نوبت ہی نہ آسکے۔ مَیں نے مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہُوئے اُسے جلد از جلد ختم کرنے کا ارادہ کر لیا تاکہ اُس کے آدمی مجھ سے مرعوب ہو جائیں۔ .

چند لمحے بہزاد سے کھیلنے کے بعد مَیں نے ایک بھر پور تُلے وار سے اُس کی گردن اُڑا دی اور اس کا سَر نیزے کی اَنی پر بلند کر کے ایک سپاہی کو دیتے ہُوئے کہا: "جاؤ دوستو . . . اپنے آقا کو میرا پیغام اور دعوتِ مبارزت دینے کے ساتھ ساتھ بہزاد کا سَر بھی تحفے میں دے دینا۔ اگر وہ کسی گیدڑ کی طرح بُزدل نہیں ہے تو چند گھنٹے بعد جب مَیں بندرگاہ کے ساحل پر پہنچوں گا تو اُسے اپنا منتظر پاؤں گا۔ اگر جنگ کے متعلق میری باتیں تمھاری سمجھ میں آگئی ہوں تو اپنے دوستوں کو بھی بتا دینا۔ طراق سے یہ بھی کہہ دینا کہ ایک بار وہ اپنی زندگی بھی خطرے میں ڈال کر دیکھے . . . اور ہاں مجھے طراق کے ساتھ ساتھ یُونا کا بھی انتظار رہے گا۔"

جب بہزاد کے باقی ماندہ چالیس شبستانی سپاہی رُخصت ہو گئے تو مَیں نے برگا سے زخمیوں کی تفصیل طلب کی اور کہا کہ جو سپاہی مرہم پٹّی کے بعد چلنے کے قابل ہوں، انھیں ساتھ لیا جائے اور باقی زخمیوں کی دیکھ بھال کی جائے۔

برگا نے بتایا: "ہمارے ہاں جنگ کے زخمیوں کی مرہم پٹّی اور دیکھ بھال نہیں کی جاتی بلکہ انھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے تاکہ وہ زخموں کے کرب اور باقی زندگی معذوروں کی طرح گزارنے سے بچ جائیں۔"

"نہیں برگا . . . بہت سے زخمی ٹھیک ٹھاک ہو جاتے ہیں اس لیے تم انھیں ختم نہیں کرو گے۔ انھیں زندہ رہنے کا موقع دینا چاہیے۔"

اتنے میں ایک عُہدے دار نے بتایا کہ میرا خادم بندرگاہ سے واپس آرہا ہے۔ مَیں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو واقعی ساحر گھوڑا دوڑاتا چلا آرہا تھا۔

اُس نے آتے ہی مُنہ لٹکا کر کہا: "مَیں جانتا ہوں کہ کیا ہوا ہوگا۔ آپ نے مجھے اس دلچسپ کھیل سے محروم کر دیا۔"

"پہلے مجھے بندرگاہ کے بارے میں بتاؤ۔" مَیں نے قدرے سختی سے کہا۔

"طراق کے جہاز بندرگاہ کے باہر لنگر انداز ہو چکے ہیں مگر ابھی تک اُن میں سے ساحل پر کوئی نہیں آیا۔ ہوا یہاں کی نسبت وہاں کافی تیز ہے اور سمندر میں بڑی بڑی لہریں اُٹھنا شروع ہو گئی ہیں۔ مَیں نے اپنے بھکاریوں اور اُٹھائی گیروں کو چلّا چلّا کر پیغام دینے سے روک دیا ہے کیوں کہ ہوا کے شور سے اُن کی آواز جہازوں تک نہیں جا سکتی۔"

"کیا چھوٹی کشتیاں بھی طوفان کی وجہ سے ساحل پر نہیں آسکتیں؟" مَیں نے پوچھا۔

"نہیں . . . ابھی طوفان میں اتنا زور پیدا نہیں ہوا کہ چھوٹی کشتیاں ساحل پر نہ آسکیں . . . مگر میرا خیال ہے کہ شبستانی آج حملہ نہیں کرنا چاہتے ورنہ اُن کے جہازوں پر تیاریوں کی ہلچل مچی ہوئی ہوتی۔ آج وہ ساحل پر نہیں اُتریں گے۔"

"اور میرا خیال یہ ہے کہ ان جہازوں سے ایک مرد، ایک عورت اور ایک گھوڑا ساحل پر ضرور آئے گا۔" میں نے ساحر کو جواب دیا۔

"طراق بُزدل نہیں اور وہ بے وقوف بھی نہیں ہے اس لیے شاید وہ نہ آئے۔"

"یہ باتیں تمھاری سمجھ سے باہر ہیں۔ اب دستے کو حکم دو کہ تیز رفتاری سے بندرگاہ کی طرف روانہ ہو جائے۔"

میں اور ساحر سب سے آگے آگے تھے۔

جب ہم بندرگاہ کے قریب پہنچے تو میں نے برگا کو حکم دیا کہ دستے کو وہیں روک دے تاکہ جہازوں سے اُسے دیکھا نہ جا سکے۔ پھر میں نے ساحر کو ایک قرنا دلوایا اور کہا: "اگر قرنا چار مرتبہ پھونکا جائے تو اپنے سپاہی لے کر آگے بڑھنا اور لڑنے مرنے کے لیے تیار رہنا لیکن مجھے اُمید ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔"

برگا چند لمحے مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا: "دیشتا کی رُوح آپ کی مددگار رہے۔"

اس کا مطلب تھا کہ اُسے دیشتا کی موت کا علم ہو چکا تھا مگر اُس نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔

میں ساحر کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

کچھ دُور جانے کے بعد ساحر نے کہا: "آپ کی ترکیب کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ طراق آپ کا منتظر ہے۔ آپ نے آنا تھا مگر اُسے آنا ہی پڑ گیا۔" اُس نے یہ کہتے ہُوئے ساحل کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اُس جانب دیکھا۔

ساحل پر سمندر سے کچھ دُور ایک سیاہ خیمہ نصب تھا۔ خیمے کے باہر متعدد نیزے گڑے ہُوئے تھے۔ ایک نیزے کے ساتھ اژدہا چھاپ ڈھال لٹک رہی تھی اور ایک سیاہ گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ خیمے کے دروازے پر ایک شبستانی محافظ کھڑا تھا اور دروازے پر پردہ جھُول رہا تھا۔

"وہ خیمے میں ہوگا۔" ساحر نے کہا: "میں اچھی طرح جانتا ہُوں کہ یہ خیمہ اور گھوڑا طراق کا ہے۔ میں یہ دونوں چیزیں پہلے بھی دیکھ چکا ہُوں۔"

میں نے اچھی طرح ساحل کا جائزہ لیا۔

وہاں کوئی اوٹ نہیں تھی جس کے پیچھے سپاہی چھُپ سکتے البتہ دُور سمندر میں لنگر انداز جہاز ضرور دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ساحر کو جہاز گننے کا حکم دیا اور خود بھی سرسری طور پر شمار کرنے لگا۔

میرے اندازے کے مطابق وہ تین سو تھے مگر ساحر نے اپنے نیزے سے ریت پر لکیریں لگا کر گنا تو وہ تین سو چھ نکلے۔

"میرے خیال میں دو سو جہازوں پر سپاہی ہیں اور ایک سو پر گھوڑے اور سامانِ رسد ہے۔"

"ہر جہاز پر کتنے سپاہی ہوں گے؟"

"ایک جہاز پر دو سو سپاہی ہُوا کرتے ہیں جناب . . ." وہ بولا۔

اس کا مطلب تھا کہ طراق اپنے ساتھ چالیس ہزار جنگجو لایا تھا جب کہ ہماری نفری ایک ہزار سے بھی کم رہ گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ چالیس کا مقابلہ ایک آدمی کیسے کر سکتا ہے۔ جنگ کی صورت میں وہ ہمارے سپاہیوں کو ایک گھنٹے کے اندر اندر فنا کر سکتے تھے۔

"اب تو آپ کو اس سے تنہا ہی مقابلہ کرنا پڑے گا۔" ساحر بولا: "لیکن آپ اس سے کیسے جیتیں گے؟"

"تم دیکھتے جاؤ۔" میں نے جواب دیا: "آؤ چلیں . . . تم ایک مرتبہ قرنا پھونک کر برگا کو خبردار کر دو کہ طراق ساحل پر پہنچ چکا ہے۔"

ساحر نے قرنا پھونک کر میرے حکم کی تعمیل کر دی . . . پھر

رازدارانہ لہجے میں بولا۔ اب ہم بالکل تنہا ہیں یہ تو بتاؤ کہ آپ طراق کو ٹھکانے لگانے کے لیے کیا چکر چلائیں گے؟"

"چونکہ تم خود چکر باز آدمی ہو اس لیے سب کو چکر باز ہی سمجھتے ہو... میں اُسے شکست دینے کے لیے طاقت اور جہارت سے کام لوں گا۔"

"مگر آپ نے تو اُسے بہت سی سہولتیں دینے کا اعلان کیا ہے۔ وہ ہر قسم کا ہتھیار استعمال کر سکتا ہے جب کہ آپ کے پاس صرف تلوار اور ڈھال ہے۔"

"جنگیں اور مقابلے ہتھیاروں یا سپاہیوں کی تعداد سے نہیں بلکہ جذبے سے جیتے جاتے ہیں۔"

جب ہم خیمے سے سو قدم دُور رہ گئے تو ساحر نے کہا۔ "کہیں خیمے میں شبستانی سپاہی نہ چھپے ہوئے ہوں، آپ اکیلے ہی اس تنہا آگے نہ جائیں۔"

"تم فکر نہ کرو اور یہیں کھڑے رہو۔" یہ کہہ کر میں گھوڑے سے اُتر گیا اور اس کی لگام ساحر کو تھما دی۔

یکایک خیمے سے ایک دراز قد شخص اور مُونا باہر آگئے۔

"یہی ہے... طراق یہی ہے۔" ساحر بولا۔

طراق قد میں میرے برابر مگر جسامت میں مجھ سے دُبلا تھا۔ وہ زرہ بکتر میں بھی بے حد پھرتیلا لگ رہا تھا۔ مُونا سفید لباس میں بے حد حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے ایک بار چنچل سمندر آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور نظریں جُھکا لیں۔

طراق مسلسل میری طرف دیکھتا رہا۔

"کیا تم وہی آدمی ہو جسے سرفروش کہتے ہیں؟" اس نے گرجدار آواز میں پوچھا۔

"ہاں... کیا میں طراق سے مخاطب ہوں؟"

"تم شاہ شبستان، شاہ برتھان اور شاہ رومو سے ہی مخاطب ہو۔"

"شاہ شبستان و برتھان تک تو درست ہے مگر رومو کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔" میں نے اختلاف کیا۔

"مجھے تم سے ملاقات کرنے کے لیے بہت انتظار کرنا پڑا ہے۔" وہ بولا۔ "مگر میں اس قسم کی ملاقات نہیں چاہتا تھا کیوں کہ میں تمھیں قتل کرنے کا خواہش مند نہیں ہوں۔"

"میں آپ کی تائید کرتا ہوں کیوں کہ مجھے بھی قتل ہونے کا شوق نہیں ہے۔"

"لیکن اس مقابلے کی دعوت تمھی نے دی ہے۔ کیا تم اپنی شرائط پر قائم ہو؟ میں گھوڑے پر سوار رہوں گا اور تم پیدل رہو گے۔"

"میں اپنی شرائط کے ایک ایک لفظ کا پابند ہوں۔"

اُس نے ایک نظر مُونا پر ڈالی اور بولا۔ "اگر تم جیت گئے تو مُونا تمھیں مل جائے گی لیکن اگر تم ہتھیار ڈال دو اور میرے پاس آ جاؤ تو بھی مُونا تمھیں مل جائے گی۔ تم جانتے ہو اور ہم بھی جانتے ہیں کہ یہ دیوی نہیں بلکہ ایک حسین لڑکی ہے لیکن دُنیا میں اس سے بھی زیادہ حسین لڑکیاں موجود ہیں اور ایسی لڑکیوں کی میرے پاس کوئی کمی نہیں۔"

"میں جانتا ہوں کہ مُونا کیا ہے اور دُنیا میں اس سے زیادہ حسین لڑکیاں بھی موجود ہیں مگر میرے لیے اس کے حصول کی وجہ دریِ شہوار ہے۔"

"ہاں... میں اس وجہ سے بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اگر تم جیت گئے تو یہ تمھاری ہو گی... پھر تم اسے اپنے پاس رکھو یا دریا کے حوالے کر دو، یہ تمھاری مرضی ہو گی۔"

"اگر میں جیت گیا تو صرف مُونا ہی مجھے نہیں ملے گی بلکہ تم رومو پر حملہ بھی نہیں کرو گے۔" میں نے کہا۔

"اس معاملے میں کچھ مشکلات درپیش آ سکتی ہیں۔" وہ بولا۔ "اور اس کے ذمّے دار بھی تم خود ہی ہو۔ تم نے بڑی چالاکی سے میرے ساتھ مقابلے کی چال چلی ہے اور تمھاری یہ چال کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ اگر میں مقابلے پر نہ آتا تو میری حیثیت دو کوڑی کی رہ جاتی اور میرے سپاہی مجھ سے باغی ہو جاتے۔ اگر میں مقابلے میں ہار جاؤں تو میرے بعد کیا ہو گا... میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ظاہر ہے کہ اپنی موت کے بعد میں کوئی وعدہ نہیں نبھا سکوں گا اور اس کا انحصار میرے کمان داروں پر ہو گا کہ وہ رومو اور رومو کے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔"

طراق کی یہ دلیل معقول تھی۔

وہ صاف ستھرا کھیل کھیل رہا تھا۔

"تمھارے ساتھ یہی ایک آدمی ہے یا کوئی اور بھی ہے؟" اُس نے ساحر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"صرف یہی ایک ہے۔" میں نے جواب دیا اور اُس کے پر نگاہ ڈالی۔

وہ میرا مقصد سمجھ گیا اور اُس نے اپنے سپاہی کو اشارہ کیا۔ سپاہی نے خیمے کی طناب کھول دی۔

خیمہ گر پڑا۔

اُس میں کوئی بھی نہیں تھا۔

"کیا تم ڈر رہے تھے کہ کہیں اس میں میرے سپاہی نہ چھپے ہوئے ہوں؟"

"میرے ذہن میں یہ خیال ضرور آیا تھا۔" میں نے اعتراف کیا۔ "لیکن میں خوف زدہ نہیں ہوں۔"

"تم بہت چالاک ہو سرفروش۔ میں ایک عظیم سربراہ ہوں مگر تم نے میری دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر مجھے بے بس کر دیا۔ اب مجھے تمھیں قتل کرنے میں لطف آئے گا۔"

"تو پھر اس معاملے میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ مُونا میرے اور تمھارے آدمی کی مشترکہ حفاظت میں رہے گی۔ اگر میں جیت گیا تو یہ میرے ساتھ جائے گی ورنہ تمھارے پاس رہے گی۔ ہمارے ان آدمیوں کو تو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا؟"

"قبول... تم کہاں مقابلہ کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے ساحل کا جائزہ لیا اور کہا۔ "یہی جگہ مناسب ہے۔ میں وہاں کھڑا رہوں گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے سمندر کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے وہ سمت اس لیے پسند کی تھی کہ کم از کم وہ پشت کی طرف سے مجھ پر حملہ نہ کر سکے اور صرف سامنے یا دائیں بائیں سے ہی حملہ آور ہو۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "تیار رہو اور مجھ سے رحم کی توقع ہرگز نہ رکھنا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے سپاہی کو اشارہ کیا جو اُس کا گھوڑا لے آیا اور اُسے سوار ہونے میں مدد کرنے لگا۔

میں نے ایک نظر مُونا پر ڈالی جو طراق کے سپاہی اور ساحر کے درمیان کھڑی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہوں۔

میں اپنی ڈھال اور تلوار تولتا ہُوا اپنے منتخب مقام پر جا کھڑا ہُوا۔ میرے پیچھے کچھ فاصلے پر سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور کافی فاصلے پر طراق کے جہاز کھڑے تھے۔

ہوا کچھ اور تیز ہو گئی تھی اور لہریں اُونچی ہوتی جا رہی تھیں۔

طراق نے بائیں ہاتھ میں ڈھال اور دائیں ہاتھ میں نیزہ سنبھالا اور گھوڑے کو میری طرف بڑھا دیا۔ میرا خیال تھا کہ نرم اور گیلی ریت کی وجہ سے گھوڑا رفتار نہیں پکڑ سکے گا مگر وہ میدانِ جنگ کا تربیت یافتہ گھوڑا تھا۔ ہر قدم پر اُس کی رفتار بڑھتی ہی چلی گئی۔

طراق کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور وہ دائیں بغل میں نیزہ دبائے میری طرف اُڑتا چلا آ رہا تھا۔

ایسے موقعوں پر میرا ذہن کمپیوٹر کی طرح کام کرتا ہے۔ اگر میں اپنی جگہ سے ہلنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر کرتا تو اس کا نیزہ میری ڈھال بھیدنے کی بجائے میرے سینے میں پیوست ہو گیا ہوتا۔

میں نے سوچا تھا کہ جب گھوڑا میرے قریب سے گزر کر آگے جائے گا تو میں اس کی پچھلی ٹانگوں پر تلوار کی ضرب لگاؤں گا۔ مگر گھوڑے کی ٹانگوں پر چمڑا باندھ کر انھیں ضرب لگنے سے محفوظ کر دیا گیا تھا۔ اس طرح میرے لیے مقابلے کی ایک چال بے کار ہو کر رہ گئی تھی۔

جب طراق نے دوسری مرتبہ مجھ پر نیزے سے حملہ کیا تو میں نے اپنا رُخ اس طرح بدل لیا کہ اُس کا گھوڑا ساحل کی بجائے سمندر کی طرف نکل جائے اور اُس کی ٹانگیں ریت میں دھنس جائیں... مگر میری یہ ترکیب بھی ناکام رہی۔

گھوڑا گیلی ریت اور لہروں تک پہنچا ضرور تھا مگر طراق بھی بلا کا شہسوار تھا وہ کنی کاٹ کر اُسے دھنسنے سے بچا لے گیا۔

اب وہ میری اس چال سے بھی محتاط ہو چکا تھا اس لیے اُس نے سامنے سے حملہ کرنے کی بجائے دائیں جانب گھوڑا موڑ دیا اور جب پلٹا تو اس کے بائیں ہاتھ میں نیزہ تھا۔ ڈھال شانے سے لٹک رہی تھی اور دائیں ہاتھ سے وہ زنجیر سے بندھا ہوا چھوٹا سا خاردار گُرز گھما رہا تھا۔

اب میں اُس کے دُہرے حملے کی زد میں تھا۔

عین اُسی وقت مجھے سر میں شدید ٹیس محسوس ہوئی۔ یہ ٹیس اس بات کی علامت تھی کہ کمپیوٹر مجھے تلاش کر رہا ہے۔ میں نے ڈاکٹر فریدون کو کرسا کر مچاتے آ پہنچا... مگر مجھے اتنی مہلت ضرور مل گئی کہ میں اُچھل کر دُور جا گروں۔

میرے گرتے ہی تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

جہاز پر طراق کے سپاہیوں نے نعرہ لگایا۔ میری توجہ ابھی اُدھر ہی تھی کہ طراق پھر میرے سر پر پہنچ گیا۔

میں نے اُلٹی قلابازی لگائی اور پھر اُس کے دونوں ہتھیاروں کی زد سے بچ گیا۔ لیکن اُس کے نیزے نے میری ڈھال ٹیڑھی کر دی۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں نے ڈھال کے ذریعے اُس کا نیزہ چھیننے کی بھی ایک ترکیب پر عمل کیا تھا۔ میں نے طراق کی طرف دیکھا اُس کے نیزے کی اَنی ٹیڑھی ہو گئی ہے اس لیے وہ دُوسرا نیزہ منتخب کر رہا تھا۔

میرے لیے یہ مہلت کافی تھی۔ میں نے اپنی ڈھال میں اُوپر نیچے دو سوراخ کر کے ایک زنجیر ڈھیلی کر دی اس طرح ڈھال کے اگلے حصّے میں زنجیر سے ایک کڑا سا بن گیا۔

اگر طراق کے نیزے کی اَنی اس زنجیر کے حلقے میں اٹک جائے تو میں آسانی سے اُسے نیزے سے محروم کر سکتا ہوں اور اگر ایک بار نیزہ میرے ہاتھ آ گیا تو پھر میری جیت یقینی بن سکتی تھی۔

اتنے میں طراق پھر تلوار لہراتا اور نیزہ تھماتا ہُوا میری طرف لپکا۔

میرا خیال تھا کہ وہ بیک وقت دونوں ہتھیاروں سے حملہ آور ہو گا... مگر اُس نے صرف تلوار سے ہی حملہ کیا اور تلوار نشانے سے میری زِرہ کا ٹکڑا اُڑاتی گئی۔

جہازوں سے پھر نعرہ ہائے تحسین گونجنے لگے۔

ابھی میں سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ طراق پلٹ آیا۔ وہ پھر تیزی سے تلوار لہراتا ہُوا آ رہا تھا... مگر جب قریب آیا تو اُس نے تلوار کی بجائے نیزے سے حملہ کیا جسے میں نے ڈھال پر روکا اور خلافِ توقع اُس کی اَنی زنجیر میں اٹک گئی... مگر اس کم بخت نے نیزہ اتنے زور سے بغل میں دبا رکھا تھا کہ وہ اُس سے نکل نہ سکا اور مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میرا بازو کسی نے کھینچ کر جسم سے الگ کر دیا ہو۔

میں نے بھی ڈھال نہیں چھوڑی اور نیزے کو جھٹکا دیا تو طراق گھوڑے سے گر پڑا۔

قدرت شاید مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گئی تھی، لیکن طراق نے مجھے نیزہ نکالنے کی مہلت نہیں دی اور پلٹ کر تلوار سے مجھ پر حملہ کر دیا۔

میں پیچھے ہٹنے کی بجائے ایک دم جھکائی دے کر اُس سے ٹکرا گیا... اُس کے ہاتھ سے بھی تلوار چھوٹ گئی اور میں نے بھی ڈھال پھینک دی۔

ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور لڑھکیاں کھانے لگے۔ لڑھکیاں کھاتے ہُوئے ہم ڈھلان کے باعث پانی کی طرف جا رہے تھے۔

نہ تو مجھے خنجر نکالنے کا موقع مل رہا تھا اور نہ ہی وہ اس مقصد میں کامیاب ہو رہا تھا۔

اچانک پانی کی ایک لہر ہم دونوں کے اُوپر سے گزر گئی۔ اتفاق سے اُس وقت میں اُوپر تھا۔ اس لیے میں نہ صرف تھپیڑے سے محفوظ رہا بلکہ میری آنکھیں بھی نمکین پانی میں بھیگنے سے بچ گئیں۔ جب کہ طراق محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ ایک ہاتھ سے آنکھیں ملنے لگا۔

یہی موقع میرے لیے غنیمت تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ مروڑ کر اُس کا خود اُتارا اور اُسی سے اُس کے سر اور مُنہ پر ضربیں لگانے لگا... اُس نے مُنہ بچانے کے لیے میری طرف پیٹھ کی تو میں نے اُسے دبوچ لیا اور پورا دباؤ ڈالنے لگا۔ پانی کی لہریں اب تیزی سے آنے لگی تھیں۔ میں نے پُوری قوت سے طراق کا مُنہ پانی میں ڈبوئے رکھا حتیٰ کہ اُس کا دم گھٹ گیا اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں نے اُسے ٹانگوں سے پکڑا لیا اور گھسیٹتا ہُوا کنارے پر وہاں لے گیا، جہاں میری ڈھال گری تھی اور نیزہ پڑا ہُوا تھا۔ میں نے نیزہ نکال کر طراق کی گردن میں گاڑ دیا۔ اپنی تلوار اُٹھائی اور اس جگہ چلا گیا جہاں ساحر اور طراق کے سپاہی کے ساتھ مُونا کھڑی تھی۔

اس نے مجھے دیکھ کر اپنے آنسو پونچھ لیے۔

اس نے سپاہی سے کہا: "جاؤ۔ اپنے آقا کی لاش کی حفاظت کرو اور کشتی کے منتظر رہو۔"

سپاہی چُپ چاپ طراق کی لاش کی جانب بڑھ گیا۔

"جاؤ ساحر... مُونا کے لیے طراق کا گھوڑا لے آؤ۔ ہم آتش فشاں کی پہاڑیوں تک پہنچ جائیں گے تو یہ گھوڑا تمھارا ہو جائے گا۔"

ابھی میں نے بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ میرے سر میں پھر ایک شدید ٹیس اُٹھی اور میں بھنا کر رہ گیا۔

ساحر ایک دم میرے قدموں میں بیٹھ گیا اور اکلوتی آنکھ سے آنسو پونچھتے ہُوئے بولا: "میں تو یہ سمجھا تھا کہ آج آپ زندہ نہیں بچیں گے۔ اُس کے پاس گھوڑا تھا، نیزہ تھا، تلوار تھی، گرز تھا، ڈھال تھی، خنجر تھا اور اُس کے سپاہی نعرے لگا کر اُس کی ہمت بھی بڑھا رہے تھے... مگر آپ کے پاس صرف عزم اور جذبہ تھا۔ میرے لیے آپ کا بچ جانا ہی سب سے بڑا انعام ہے... مجھے کوئی اور انعام مت دیجیے۔"

میں نے اس کے شانے تھپ تھپاتے ہُوئے کہا: "کھڑے ہو جاؤ۔ اب تم روم کے ایک محافظ دستے کے کمان دار ہو، اس لیے یہ گھوڑا تمھیں رکھنا ہو گا۔ جاؤ اُسے یہاں لے آؤ۔"

جب ساحر گھوڑا لینے چلا گیا تو مُونا ایک قدم میری طرف بڑھی اور بولی: "تمھیں مجھ سے نفرت ہو گئی ہو گی لیکن ہر گزرتے لمحے کے ساتھ تمھارا پیار میرے دِل میں بڑھتا جا رہا ہے۔ تم نے تین بار مجھے موت کے چنگل سے چھڑایا ہے اور میں نے ہر بار تمھیں زحمت ہی دی ہے لیکن مجھے درِ شہوار وشیتا کی قسم، آئندہ تمھیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"

"مجھے اَب بھی تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں تو تمھارے دیس میں اجنبی ہُوں جو آج نہیں تو کل چلا جائے گا۔"

"نہیں... اَب تم کبھی مجھ سے جدا نہیں ہو گے۔" وہ رونے لگی تھی۔

مجھے سر میں پھر ٹیس محسوس ہُوئی۔

کمپیوٹر نے مجھے ڈھونڈ لیا تھا اور اَب کسی بھی لمحے مجھے اپنے دَور اور اپنی دُنیا میں منتقل کر سکتا تھا اس لیے میں نے مُونا سے کہا: "میں یہاں نہیں رہ سکتا مُونا تمھیں کیا کرنا ہے۔ اس کا فیصلہ تم خود کرو گی۔ کیا تم جانتی ہو وشیتا نے مجھ سے کیا کہا ہے؟"

"ہاں... میں جانتی ہُوں۔ جب میں بچّی تھی، تب سے جانتی ہُوں کہ یہ دن بھی آنا ہی تھا لیکن تم مجھے بچا سکتے ہو سرفروش! مجھے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتا مُونا۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔"

اتنے میں ساحر گھوڑا لے آیا۔

"اگر تم مجھے نہیں لے جا سکتے تو کیا درِ شہوار نے تمھیں بتایا تھا کہ کیا کچھ ہونا ہے اور کیسے ہونا ہے؟"

"ہاں... اُس نے مجھے بتا دیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"سرفروش...!" اچانک مُونا چیخ پڑی۔ اُس کی چیخ بڑی دلدوز تھی۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا لیکن اگلے ہی لمحے چاروں طرف آگ اور شراروں کا رقص محسوس ہونے لگا۔ اِدھر ساحل سے بے پناہ شور بلند ہو رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا تو سینکڑوں سپاہی تلواریں، نیزے اور تیر کمان لیے ہماری طرف دوڑے چلے آ رہے تھے۔ اُسی لمحے میری منتقلی شروع ہو گئی۔ میرا جسم سمٹنے لگا۔ اچانک ایک سرسراتا ہُوا تیر آیا اور میری پسلیوں میں پیوست ہو گیا۔ میرے حلق سے ایک لمبی کراہ نکل گئی۔ میرے مرنے اور اپنے دَور میں واپس جانے کا عمل بیک وقت شروع ہو گیا۔ میں سمٹتا جا رہا تھا اور میری پسلیوں میں پیوست تیر جیسے میرے دِل کی گہرائیوں میں اُترتا جا رہا تھا... میں جانتا تھا کہ اگر میں بے ہوش ہو گیا تو ایسی صورت میں میری اپنے دَور میں منتقلی رک جائے گی اور کمپیوٹر میرے مُردہ جسم کو قبول نہیں کرے گا۔ میرے ذہن میں اندھیرے ہی اندھیرے اُترنے لگے اور میرا جسم ساکت ہو گیا۔

بڑی ہی عجیب صورتِ حال تھی۔

ایک طرف تو میرا جسم تحلیل ہو رہا تھا اور دُوسری طرف موت تیزی سے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ ایک طرح سے مَیں دُہری موت کا شکار ہو رہا تھا۔ ڈُوبتے ہُوئے ذہن کے ساتھ مَیں صرف یہی سوچ رہا تھا کہ اگر میرے دماغ نے، جسم تحلیل ہونے سے پہلے پہلے کام کرنا بند کر دیا تو کمپیوٹر میری ہستی کو فی الفور رَد کر دے گا اور مَیں جہاں ہُوں، وہیں رہ جاؤں گا۔۔۔ گویا کئی صدیوں پہلے کے اس گمنام دَور میں موت سے ہمکنار ہو جاؤں گا۔

ذہن پر تاریکی کا غلبہ بڑھتا جا رہا تھا۔

جسم کے تحلیل ہونے کا عمل بھی بڑی سرعت سے جاری تھا۔

اچانک مجھے یُوں لگا جیسے مَیں زندہ تو ہُوں لیکن میرا نام و نشان تک مِٹ چُکا ہے۔ میری ہستی بکھر گئی ہو اور میرا ذہن موت کی بھاری سِل تلے ناکارہ ہو کر رہ گیا ہو۔۔۔ اور اندھیروں نے مجھے نگل لیا ہو۔

☼

ذہن بیدار ہُوا تو اپنی ہستی اور اپنے وجُود کا احساس ہونے لگا۔ اس کے باوجود یہ ڈر اور یہ خوف بھی لاحق رہا کہ آنکھ کھُلے گی تو مَیں اپنے اعمال کی سزا بھگتنے کے لیے قُدرت کی عدالت میں کھڑا ہُوں گا۔۔۔ لیکن جب چشمِ تصور بند ہُوئی اور ظاہری آنکھیں ماحول کی تصویر میرے ذہن میں منتقل کرنے لگیں تو مجھے سب سے پہلے ڈاکٹر فریدوں کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ بڑے ہی شفیق انداز میں مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"ڈاکٹر۔۔۔" مَیں نے گھُٹی گھُٹی سی آواز میں کہا۔ "مَیں زندہ ہُوں۔۔۔ یا آپ بھی انتقال فرما کر میرے ساتھ جہنم رسید ہو چکے ہیں؟"

"ہم دونوں ہی زندہ ہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔ "اس بار تم بال بال بچے ہو۔ اگر تمھیں یہاں پہنچنے میں صرف بیس سیکنڈ کی دیر ہو جاتی تو تمھاری موت یقینی تھی۔ کمپیوٹر نے جیسے ہی تمھاری تجسیم کی، مَیں نے دیکھ لیا کہ تم قریب المرگ ہو۔ تمھاری واپسی پر مَیں ہمیشہ کسی نہ کسی غیر متوقع صورتِ حال کے لیے تیار رہتا ہُوں۔ میری یہی احتیاط پسندی کام آ گئی اور تمھیں فوری طبی امداد بہم پہنچا دی گئی جس کے نتیجے میں تم نہ صرف زندہ ہو بلکہ مَیں دیکھ رہا ہُوں کہ تمھاری زندہ دلی بھی برقرار ہے۔ تمھاری یہی خوبی تمھیں دُوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔"

مَیں نے ایک طویل سانس لی تو میری پسلی میں خفیف سی ٹیس اُٹھی اور یہ سانس ایک کراہ میں ڈھل کر رہ گئی۔

"اتنی لمبی سانسیں نہ لو، ڈیئر!" ڈاکٹر فریدوں نے بڑے پیار سے کہا۔ "کہیں ٹانکے نہ کھُل جائیں۔ تمھیں اس بستر پر آج تیسرا ہفتہ ہے۔ اُمید ہے کہ آیندہ چند ہفتوں میں تم بالکل تن دُرست ہو جاؤ گے۔ اس وقت تک کے لیے تمھیں مکمل چھُٹی دی جاتی ہے۔ اگلے ہفتے ٹانکے کھُل جائیں تو تمھیں یہاں سے رُخصت کر کے ساحلِ سمندر میں بھیج دیا جائے گا۔"

مَیں نے آنکھیں بند کر لیں۔

۔۔۔ اور گہری نیند میں ڈُوب گیا۔

وسطِ مارچ کے دن تھے۔

مَیں صحت یاب ہونے کے بعد تفریحی چھُٹیاں منا رہا تھا اور اب مجھے اس شعر پر یقین آ چکا تھا کہ۔۔۔

وقت دونوں طلسم رکھتا ہے
آپ ہی زخم اور آپ ہی مرہم

اگر ایسا نہ ہوتا تو مَیں شاید لالہ رُخ کو کبھی نہ بھُول پاتا جو میری زندگی میں بہاریں لائی تھی لیکن مجھے خزاؤں کی تحویل میں دے کر نہ جانے کس کے آنگن میں جا اُتری تھی۔ تب مجھے انگریزی زبان کی یہ مثل بہت یاد آنے لگی۔۔۔ کہ مرد، عورتوں کے لیے تاج و تخت چھوڑ دیتے ہیں لیکن عورتیں اُن کے لیے صرف کانٹے چھوڑ جاتی ہیں۔۔۔ مگر وقت نے میرے دل پر لگنے والا یہ گھاؤ جلد ہی بھر دیا اور میری سوچ کی راہیں بدل گئیں۔ اب مَیں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ مرد کا لگایا ہُوا زخم مرد اور عورت کا لگایا ہُوا گھاؤ عورت ہی بھر سکتی ہے۔

اُن دنوں میرا یہ گھاؤ عینی شیرازی بھر رہی تھی۔ وہ بلاشبہ دلکش و دل آرا لڑکی تھی۔ وہ گھر سے تو تہران یونیورسٹی میں داخلہ لینے آئی تھی لیکن شہرت، دولت اور گلیمر اسے نگار خانے کی چہار دیواری میں گھسیٹ لائے تھے۔ اب وہ اداکارہ بن رہی تھی لیکن اسے فلموں کے ہیروز سے زیادہ مَیں پسند آیا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے کہا کرتی تھی کہ یہ ہیرو جو پردۂ سیمیں پر رستم و سہراب دکھائی دیتے ہیں اور ایک مُکّے سے چھ چھ آدمی گراتے نظر آتے ہیں، چڑیا کا سا دل رکھتے ہیں اور درحقیقت عورتوں سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں جبکہ مرد کو ایک ٹھوس چٹان کی طرح ہونا چاہیے۔۔۔ اور مَیں اس لحاظ سے اس کے معیار پر پُورا اُترتا تھا۔

اُس روز بھی شوٹنگ کے بعد وہ سیدھی میرے اپارٹمنٹ پہنچ گئی تھی اور وہاں سے ہم سمندر کے ساحل پر اسی ہٹ کی جانب چل دیے تھے جو مجھے آرام کرنے کی غرض سے بطورِ خاص دیا گیا تھا۔

عینی تو تھوڑی دیر سمندر میں نہانے کے بعد تولیا لپیٹ کر ریت پر لیٹ گئی۔۔۔ مگر مَیں غروبِ آفتاب تک لہروں سے کھیلتا رہا اور ساحل سے کافی دُور نکل گیا۔ اچانک مَیں نے دیکھا کہ عینی مجھے اشارے سے اپنی طرف بُلا رہی ہے۔

جب مَیں ساحل پر پہنچا تو وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"کیا ہُوا؟" مَیں نے حیرت سے پُوچھا۔

"سردی کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے اور تم پُوچھ رہے ہو کہ کیا ہُوا!"

"ارے!" مَیں نے تعجب سے کہا۔ "تمھیں یہاں ساحل پر سردی لگ رہی ہے اور مجھے نہاتے ہُوئے بھی محسوس نہیں ہُوئی۔"

"مجھے بھی محسوس نہ ہوتی اگر میرے اندر قطبی ریچھوں جیسی خاصیت ہوتی۔" وہ جھلا کر بولی پھر کپڑے، تولیے اور اپنا بیگ سمیٹنے لگی۔

مجھے اُس کی بات پر ہنسی آ گئی۔ "تمھارے خیال میں، مَیں کوئی قطبی ریچھ ہُوں؟" مَیں نے پوچھا۔

"ہو تو نہیں مگر تمھارے اندر اُن کی کم از کم دو خاصیتیں ضرور ہیں۔ اب ہٹ میں چلو، مجھے بھُوک بھی بڑے زور کی لگ رہی ہے۔"

"بھُوک لگ رہی تھی تو کچھ کھا لیتیں یا آدم خور بننا چاہتی ہو؟"

"تم کبھی اپنی زندگی میں سنجیدہ بھی ہُوئے ہو، سرفروش؟" وہ جھینپ کر بولی۔

"مَیں ہمیشہ ہر بات پُوری سنجیدگی سے کرتا ہُوں۔"

"غلط۔۔۔ بالکل غلط۔" وہ بولی۔ "مَیں اتنے دنوں سے تمھیں پڑھ رہی ہُوں۔ مَیں نے تمھاری ایک ایک حرکت کا جائزہ لیا ہے اور تمھارا تجزیہ کیا ہے۔ اب مَیں اس نتیجے پر پہنچی ہُوں کہ تم ایک خُود پسند آدمی ہو جو اپنی خوش وقتی کے لیے تو کسی کو ساتھ رکھ سکتا ہے مگر ہمیشہ کے لیے کسی عورت کا ساتھ نہیں دے سکتا یا دینا ہی نہیں چاہتا۔ کیوں، آخر تم ایسے کیوں ہو، سرفروش؟"

مجھے عینی کی ان باتوں سے صدمہ محسوس ہُوا۔ مَیں نہیں سمجھتا تھا کہ ایک شوخ گرل ایسا بھی سوچ اور سمجھ سکتی ہے۔ دُوسرے اُس کا یُوں سوچنا اور مجھ میں دلچسپی لینا اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ بھی ایک گھر اور ایک مرد کے تحفظ کے خواب دیکھ رہی ہے اور وہ مجھ سے ایسی توقع باندھ رہی ہے۔۔۔ لیکن میرے ساتھ تو اب بھی وہی مجبوریاں تھیں جنھوں نے لالہ رُخ کو مجھ سے برگشتہ کر دیا تھا۔ اس لیے مَیں نے اُسے ٹالنے کے لیے کہا۔ "دیکھو عینی۔ اس وقت میرا مُوڈ کچھ اور ہے جبکہ تم مجھے بحث میں اُلجھانا چاہتی ہو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ باتیں تم کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھو؟"

"نہیں سرفروش۔ مَیں بہت دنوں سے اس موضوع پر تم سے بات کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اب بات چھڑ گئی ہے تو مَیں کسی فیصلے پر پہنچنا بہتر سمجھتی ہُوں۔"

"اچھا تو پھر کھانے کے بعد اس موضوع پر بات کریں گے۔" مَیں نے فی الوقت پہلو بچایا اور ہٹ میں پہنچتے ہی باتھ رُوم میں گھُس گیا۔

جب مَیں نہا کر اور کپڑے بدل کر نکلا تو عینی فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ رہی تھی۔ مَیں نے پُوچھا۔ "کس کی کال تھی؟"

"کوئی مسٹر رضا تم سے بات کرنا چاہتے تھے۔"

"اوہ۔۔۔" میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا اور مَیں فون کی طرف بڑھ گیا۔ شاید مجھے پھر کسی نئے سفر کے لیے بُلایا جا رہا تھا۔ مَیں نے ریسیور

کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے مینی کی طرف دیکھا تو میرا بڑھتا ہوا ہاتھ رُک گیا۔
وہ کچن کی طرف جاتے ہوئے کہہ رہی تھی: "میں کچھ کھانا وانا تیار کرتی ہوں۔ جب تک تم آقائے رضا سے بات کرلو۔"
میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر رضا کا نمبر ملایا۔
دُوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ چند لمحوں بعد آقائے رضا کی آواز سُنائی دی: "ہیلو۔ رضا بول رہا ہوں۔"
"آپ نے مجھے یاد کیا تھا جناب؟"
"ہاں سرفروش۔ میں تمھیں کئی بار رِنگ کرچکا ہوں مگر تم شاید ہٹ میں نہیں تھے۔ خیر... کل صبح کا پروگرام بن چکا ہے مگر ڈاکٹر فریدوں کے پاس جانے سے پہلے مجھ سے ضرور مل لینا۔"
"خیریت تو ہے جناب؟" میں نے پوچھا۔
"ہے بھی اور نہیں بھی۔ جب تم آؤ گے تو بات ہوگی۔"
"آپ نے تو مجھے فکر اور تجسس میں مُبتلا کردیا ہے جناب۔"
"بات ہی کچھ ایسی ہے... مگر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنی مصروفیت جاری رکھو۔" اور اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے فون بند کردیا۔
میں جانتا تھا کہ آقائے رضا مجھ سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ اُن میں اور مجھ میں اگرچہ ایک افسر اور ماتحت کا رشتہ تھا مگر وہ ایک افسر کی بجائے ایک بزرگ کی حیثیت سے میرا زیادہ خیال رکھتے تھے اور میری خاطر ڈاکٹر فریدوں سے بھی اُلجھ جایا کرتے تھے۔ ہرچند کہ اُنھوں نے مجھے پریشان نہ ہونے کی تلقین کی تھی مگر اُن کی اپنی آواز سے پریشانی ہی جھلک رہی تھی۔ اس لیے جب مینی کھانا تیار کرکے لے آئی تو میں نے کہا: "کھانا جلدی سے کھاؤ مینی! مجھے فوری طور پر واپس جانا ہے۔"
"مگر تم نے تو رات بھر یہیں قیام کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔" وہ شکایت آمیز لہجے میں بولی۔
"میں تمھاری رفاقت سے کسی نسبتاً زیادہ اہم کام کی وجہ سے ہی محروم ہو رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔
یہ سُن کر مینی کا چہرہ اُتر گیا۔ خود میرا ارادہ بھی ڈانواں ڈول ہونے لگا مگر پھر تجسس میری سوچوں پر غالب آگیا اور میں اپنا سامان سمیٹنے لگا۔
▲ "میں حیران تھا کہ ڈاکٹر فریدوں کو کمپیوٹر کی بجائے اچانک دماغ کی سرجری سے کیوں عشق ہوگیا ہے۔ وہ سائنس دانوں کی بجائے دماغ کی سرجری کرنے والے ڈاکٹروں سے کیوں ملنے لگا ہے۔ بالآخر آج یہ عقدہ کھُل ہی گیا۔" رضا کہہ رہے تھے اور میں اُن کے سامنے بُت بنا بیٹھا تھا۔
"وہ کیا ہے جناب؟"... میں تجسس پر قابو نہ رکھ سکا تو پُوچھ ہی بیٹھا۔
"وہ تمھارے دماغ کا آپریشن کرنا چاہتا ہے۔"
"وہ کیوں؟" میرے لہجے میں بےپناہ حیرت سِمٹ آئی۔
"اُسے بہت دُور کی سُوجھی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمھارے دماغ کو کمپیوٹر سے مربُوط کردے۔ یعنی جب تم ماضی کے اندھیرے سفر پر جاؤ تمھاری ہر سوچ کمپیوٹر تک پہنچتی رہے اور کمپیوٹر تمھاری ہر سوچ سے اُسے آگاہ کردے۔"
"لیکن وہ تو پہلے بھی میرے دماغ پر قسم قسم کی شعاعیں ڈال اور عجیب سے عمل کرتے رہے ہیں۔" میں نے کہا۔
"وہ سب کچھ تمھاری یادداشت بڑھانے کے سلسلے میں تھا۔ اُس نے اس عمل کے ذریعے تمھاری یادداشتوں کے لیے ایک ذخیرہ گاہ فراہم کردی تھی... مگر اب وہ تمھارے دماغ کو براہِ راست کمپیوٹر سے مربُوط کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے تمھارے دماغ کا نازک ترین آپریشن ضروری ہے جو جان لیوا بھی ہوسکتا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہُوں کہ جب وہ تم سے بات کرے تو تم انکار کردو۔"
"لیکن..."
"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" اُنھوں نے میری بات قطع کرتے ہوئے کہا: "میں نے ڈاکٹر فریدوں کو دو ٹوک جواب دے دیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کا فیصلہ تم خود کرو گے۔ بہرحال تم انکار کردینا۔"
... مگر میں جانتا تھا کہ جب وہ قوم و وطن کے نام پر مجھے آپریشن کروانے کو کہے گا تو میں انکار نہیں کرسکوں گا۔ تاہم میں نے رضا کو خوش کرنے کے لیے کہہ دیا کہ جیسا وہ چاہتے ہیں میں ویسا کروں گا اور آپریشن کے لیے انکار کردوں گا۔

⁂

دُوسری صبح میں لنگوٹ باندھے کمپیوٹر چیمبر کی الیکٹرک کرسی پر بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر فریدوں نے حسبِ معمول میرے جسم پر عجیب سا لیپ دیا تھا اور الیکٹروڈز بھی چسپاں کردیے تھے۔ اب صرف کمپیوٹر کا سوئچ آن کرنے کی دیر تھی لیکن ہمیشہ کے برعکس آج ڈاکٹر فریدوں سوئچ آن کرنے کی بجائے مختلف میٹروں کا جائزہ لینے میں مصروف تھا... پھر اُس نے لیجر جیسا ایک موٹا سا رجسٹر اُٹھایا اور اس میں اندراج کرنے لگا۔ وہ کمپیوٹر کے مختلف میٹر دیکھتا، کچھ حساب کرتا اور رجسٹر میں درج کرتا جاتا۔ میں کافی دیر تک یہ تماشا دیکھتا رہا، آخر بول پڑا:

"یہ سب کیا ہے ڈاکٹر؟ کیا کمپیوٹر میں کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے؟"
ڈاکٹر فریدوں نے کوئی جواب دینے کی بجائے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر اندراجات مکمل کرنے کے بعد رجسٹر ایک جانب رکھتے ہوئے بولا: "گڑبڑ تو کوئی نہیں سرفروش... مگر میں اس بار ایک نیا تجربہ کرنے والا ہُوں۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک بورڈ کی طرف اشارہ کیا جس پر متعدد چھوٹے بڑے میٹر نصب تھے: "میں نے کمپیوٹر میں کچھ نئے آلات کا اضافہ کیا ہے۔ اس لیے چاہتا ہُوں کہ اس نئے تجربے کے متعلق تمھیں بھی پہلے سے آگاہ کردُوں۔"
"کیا آقائے رضا بھی اس نئے تجربے کے متعلق جانتے ہیں؟" میں نے پُوچھا۔
"اُونھوں۔ وہ کچھ نہیں جانتا۔ اگر اُسے معلوم ہوجاتا تو وہ میرے لیے خواہ مخواہ کی مشکلات پیدا کردیتا۔ گھبراؤ نہیں سرفروش۔ اس نئے تجربے میں کوئی خطرہ نہیں اور اگر کوئی ہُوا بھی تو بےحد معمُولی نوعیت کا ہوگا۔"
"پھر بھی آپ مجھے اس نئے تجربے اور معمُول کے خطرات سے آگاہ کردیں تو بہتر ہے۔"
ڈاکٹر فریدوں وہی موٹا رجسٹر اُٹھا لایا اور اُسے کھول کر دکھاتے ہوئے بولا: "یہ دیکھو۔"
میں نے رجسٹر کو غور سے دیکھا۔ اس پر سائنس اور حساب کی نشانیاں بنی ہُوئی تھیں جنھیں سمجھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔
"یہ کیڑوں مکوڑوں کی تصویریں میری سمجھ سے باہر ہیں ڈاکٹر۔" میں نے بےبسی سے کہا۔
"میں سمجھتا ہُوں۔ یہ میرے تجربات کا ریکارڈ ہے۔ میں کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ تمھیں اُسی زمانے میں دوبارہ بھیج دُوں جہاں پہلے بھی جاچکے ہو۔ اسی لیے میں نے کمپیوٹر کی سیٹنگ میں تبدیلی نہیں کی۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ تمھیں دوبارہ اپنی بقا کی جدوجہد نہیں کرنا پڑے گی۔ تم اُس دَور کے لوگوں اور وہاں کے مقامی حالات سے آگاہ ہوچکے ہوگے۔ تمھیں یہ بھی معلوم ہوچکا ہوگا کہ وہاں کن معدنیات کے خزانے موجود ہیں۔ دراصل اس پروجیکٹ پر حکومت کی بہت بڑی رقم خرچ ہوچکی ہے اور وہ اس رقم کا نعم البدل چاہتی ہے۔ اگر دورِ گزشتہ کے خزانے مثلاً ہیرے اور یورانیم وغیرہ دورِ حاضر میں منتقل کیے جاسکیں تو ہماری قوم اور ہمارا ملک دُنیا کا امیر ترین ملک بن سکتا ہے۔ چنانچہ خزانے منتقل کرنے کے لیے ایک علیٰحدہ پروجیکٹ بھی قائم کیا جاچکا ہے۔ تجربات تمھاری ہیں۔ کمپیوٹر کی یہ وہی سیٹنگ ہے جس میں تم تاشیہ سے ملے تھے۔"
میں یہ سُن کر خوش ہوگیا کہ اس طرح تاشیہ سے ایک بار پھر ملاقات ہوجائے گی... پھر مجھے خیال آیا کہ تاشیہ کے دَور میں تو مجھے ایسا کوئی خزانہ دکھائی نہیں دیا تھا جس سے ہمارا ملک دُنیا کا امیر ترین مُلک بن سکے۔ اس لیے میں کہے بغیر نہ رہ سکا:
"مگر ڈاکٹر، مجھے اس دَور میں بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی بجائے مجھے اُس دَور میں منتقل کریں جس میں میں نے سرزمین سراما پر یورانیم کی کانیں دیکھی تھیں۔"
"میں سب سمجھتا ہُوں سرفروش۔" ڈاکٹر بولا: "اس دَور میں تو میں تمھیں صرف تجربے کے طور پر چند گھڑیوں کے لیے بھیجنا چاہتا ہُوں۔ اگر تم اس دَور میں پہنچ گئے تو پھر میں تمھیں سراما والے دَور میں بھی بھیج دُوں گا۔"
"اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اپنے تجربے کی کامیابی کا پُورا پُورا یقین نہیں ہے اور پھر مجھے کمپیوٹر میں کچھ نئی تبدیلیاں بھی نظر آ رہی ہیں۔"
ڈاکٹر فریدوں نے رجسٹر بند کرکے مجھے گھُورتے ہُوئے کہا: "پچھلی مرتبہ تم نے کب سفر کیا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ تمھیں واپس آئے کتنا عرصہ ہوگیا ہے؟"
"تقریباً چھ مہینے۔" میں نے جواب دیا۔
"اور ان چھ ماہ میں میں کمپیوٹر کی کارکردگی بڑھانے کے لیے تقریباً اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتا رہا ہُوں۔ ظاہر ہے کہ یہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ اس میں تبدیلیاں آئی ہیں اور اس کی کارکردگی پہلے سے کہیں بہتر ہوگئی ہے۔"
"اچھی بات ہے جناب۔" میں کچھ لاجواب سا ہوکر بولا: "اس کی بہتر کارکردگی کا بھی پتہ چل جائے گا۔ بھیجیے مجھے تاشیہ کے دَور میں۔"
"خوب۔ یہ ہُوئی نا بات۔" ڈاکٹر مُسکرا کر بولا: "تیار ہوجاؤ۔" اور یہ کہتے ہُوئے اُس نے کمپیوٹر کا سُرخ سوئچ آن کردیا۔
میٹر بورڈ پر بلب جلنے بجھنے لگے۔
سوئیاں حرکت میں آگئیں۔
میرے اعضا سے بندھے ہُوئے الیکٹروڈز میں برقی رَو... دوڑنے لگی۔
میں نے سوچا کہ ابھی درد کی شدید لہر اُٹھے گی اور میرے جسم کا رُواں رُواں تحلیل ہوکر سالموں میں تقسیم ہوجائے گا۔ یہ سالمے ماضی کے کسی دَور میں یکجا ہوں گے اور وہاں میں ایک بار پھر اپنی بقا کی جدوجہد میں مصروف ہوجاؤں گا لیکن جتنی دیر میں میں نے یہ ساری باتیں سوچیں اتنے وقت میں تو مجھے ماضی کے کسی دَور میں پہنچ بھی

جانا چاہیے تھا۔۔ مگر میں اب تک وہیں تھا۔ مجھے اپنے جسم اور سر میں درد محسوس ہوا تھا مگر پہلے جیسا نہیں۔ یہ درد الیکٹروڈز میں برقی لہر دوڑنے کی وجہ سے تھا اور مجھے سالموں میں تقسیم کرنے والا نہیں تھا۔ کوئی گڑبڑ ضرور ہو گئی تھی۔

اتنے میں مجھے کمپیوٹر کی ایک مشین سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا دکھائی دیا اور چیمبر میں کونے سے لپکنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر فریدوں کھانستے ہوئے جلدی جلدی مختلف سوئچ آف کر رہا ہے۔

میں نے اپنی کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن برقی لہروں نے مجھے ہلنے بھی نہیں دیا۔ اتنے میں ڈاکٹر فریدوں نے کمپیوٹر کا مین سوئچ آف کر دیا۔ الیکٹروڈز کی برقی رو ختم ہو گئی۔ میں نے اپنے جسم کے ساتھ چپاں الیکٹروڈز اتار پھینکے اور کمپیوٹر چیمبر سے نکلنے ہی والا تھا کہ وہ نظارا دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

میرے اور ڈاکٹر فریدوں کے درمیان بھورے رنگ کے دھوئیں کا ایک بگولا سا بڑی تیزی سے گردش کر رہا تھا۔۔۔ پھر یہ دھواں ایک ہیولے میں بدلنے لگا اور آخر میں اس نے بالکل واضح شکل بلکہ جسامت اختیار کر لی۔ میں نے ایسی عجیب الخلقت ہستی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس مخلوق کو دیکھ کر دہشت کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

وہ نہ تو آدمی تھا اور نہ ہی کوئی جانور تھا۔

اس کے ہاتھ میں پتھر کا ایک بھدا سا بھاری کلہاڑا تھا۔ وہ ڈاکٹر فریدوں کی طرف دیکھ کر بڑے مکروہ اور خوفناک انداز میں غرایا۔ پھر کلہاڑا سنبھالے اس کی طرف بڑھا تو ڈاکٹر فریدوں چلایا۔

"بچاؤ۔۔۔ مجھے بچاؤ، سرفروش"

ڈاکٹر فریدوں کی پکار پر مجھے جیسے ایک دم ہوش آ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ وحشی ڈاکٹر فریدوں پر کلہاڑے کا وار کرتا، میں اچھلا اور میری فلائنگ کک نے اسے منہ کے بل گرا دیا۔

اگرچہ وہ قد میں مجھ سے نصف تھا مگر اس میں بلا کی طاقت اور پھرتی تھی۔ اس کے جسم پر گھنے بال تھے اور اس سے عجیب سی بدبو آ رہی تھی۔ وہ گرتے ہی فوراً اٹھا اور مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو کلہاڑے کے وار سے بچا سکا۔

دوسرے وار سے پہلے ہی میں نے اس کی کلائی پکڑ کر مروڑی اور جھٹکا دیا تو کلہاڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے کلہاڑا دور پھینک دیا۔ اس نے اپنا خونخوار جبڑا کھولا اور بڑے بڑے نوکیلے دانت میرے نرخرے میں گاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے دائیں ہاتھ سے اس کے جبڑے پر کراٹے کی ضرب لگانا چاہی مگر اس نے سر جھکا لیا۔ تاہم یہ ضرب اس کے سر پر پڑی تو وہ بلبلا اٹھا اور "غرررگ۔۔۔ غررررگ۔۔۔ غررگ گ" کی آوازیں نکالنے لگا۔

معاً کہیں دور سے ڈاکٹر فریدوں کی آواز آتی محسوس ہوئی "خدا کے لیے اسے ختم نہ کر دینا سرفروش۔ اسے جان سے نہ مارنا۔ اسے زندہ رہنے دینا"۔

ڈاکٹر فریدوں کی اس بات سے میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ وحشی مخلوق بار بار میرے نرخرے میں دانت گاڑنے کی کوشش کر رہی تھی اور ڈاکٹر مجھے اس کو زندہ رکھنے کی ہدایات دے رہا تھا۔ میرے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ چکنے سانپ کی طرح بار بار میری گرفت سے نکل جاتا تھا۔۔۔ پھر میں نے وہ کیا جو مجھے بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔

میں اس سے چند قدم دور ہو گیا۔

وہ وہیں کھڑا مجھے نفرت سے گھورتا اور غراتا رہا۔

میں نے اسے غچہ دینے کے لیے اپنا بایاں بازو اٹھایا۔ وہ میرے بازو کو دیکھنے لگا۔ اچانک میں نے اپنے دائیں پاؤں سے اس کے جبڑے پر زوردار ٹھوکر لگائی۔ وہ چکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس وقت تک میرے جسم پر اس کے نوکیلے پنجوں سے کافی خراشیں آ چکی تھیں۔ میں نے لپک کر کلہاڑا اٹھا لیا اور اسے مارنا ہی چاہتا تھا کہ ڈاکٹر فریدوں دوڑ کر بیچ میں آ گیا۔

"ارے ارے کیا غضب کرتے ہو۔ خدا کے لیے اسے مت مارو۔ یہ تو میری محنتوں کا ایسا انعام ہے جو کبھی میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔۔ اوہ۔۔۔ کوئی گڑبڑ تو ضرور ہو گئی تھی مگر۔۔۔ مگر اس گڑبڑ سے قدرت نے کتنا بڑا انعام دے دیا"۔

"انعام؟" میں نے تعجب اور غصے سے دہرایا۔ "مگر یہ آیا کہاں سے ڈاکٹر۔۔۔ اور آپ اس خونخوار وحشی کو بچا کیوں رہے ہیں؟"

ڈاکٹر اس وحشی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بڑے پیار سے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "یہ کہاں سے آیا، میں نہیں جانتا۔۔۔ لیکن یہ ماضی کے اس دور سے آیا ہے جب انسان ارتقا کی ابتدائی منزلوں سے گزر چکا تھا۔ یہ انسانی ارتقا کی درمیانی منزلوں کا مظہر ہے۔ لاکھوں سال پہلے ہم اس جیسے یعنی انسان اسی منزل سے گزر رہا تھا۔ وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا "مگر ہمیں اس کی آمد اور وجود صیغۂ راز میں رکھنا پڑے گا۔ یہ انتہائی اہم راز ہے سرفروش جو کسی قیمت پر بھی کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ تم سمجھ گئے نا؟ یہ میرا حکم ہے"۔

"آقائے رضا کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر چند لمحے سوچتا رہا۔۔۔ پھر بولا "میرا خیال ہے اسے تو بتانا پڑے گا مگر اور کسی کو نہیں۔ اب تم یہیں ٹھہرو اور اس کا خیال رکھو۔ میں بے ہوشی کا انجکشن لے کر آتا ہوں۔ اسے کچھ دیر کے لیے بے ہوش رکھنا پڑے گا ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو خود ہی ختم کر دے۔۔۔ یعنی اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائے۔ میں ابھی آیا"۔

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلا گیا اور میں اس وحشی کو دیکھنے لگا جو میرا خون پینا چاہتا تھا لیکن اب شکست خوردہ پڑا تھا۔

وہ اپنے بڑے بڑے نتھنوں سے سانس لے رہا تھا اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ تاہم وہ ساکت پڑا تھا۔ میں نے جس ہاتھ اور پاؤں سے اسے ضربیں لگائی تھیں اب وہ بری طرح دکھنے لگے تھے۔ کمرے میں کمپیوٹر کی وائرنگ جلنے کے ساتھ ساتھ اس وحشی کی بدبو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے ڈاکٹر فریدوں پر حیرت ہو رہی تھی کہ اسے اپنا کمپیوٹر جل جانے کا ذرا بھی دکھ نہیں ہوا بلکہ وہ اس وحشی کو پا کر بے حد خوش تھا۔

میں نے اسے پاؤں سے چھو کر دیکھا۔

اس کے جسم پر پسینے سے گیلے بال، مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ اتنے میں ڈاکٹر فریدوں ایک ٹرے میں ضروری سامان رکھے آ گیا۔ مجھے ڈاکٹر فریدوں پر ہنسی آ گئی۔

"یہ ہنسی کی بات نہیں، سرفروش بلکہ بڑا اہم معاملہ ہے۔ تمہیں اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں۔ ہم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ماضی کے اندھیرے دور سے زمانہ حال میں اس کی آمد سائنس کی بہت بڑی دریافت ہے"۔

"لیکن اب ہمیں کرنا کیا ہے اور یہاں سے کہاں جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ میں نے اپنے اختیارات سے کام لیتے ہوئے سارے عملے کو یہاں سے بھیج دیا ہے تاکہ کسی کو اس نیم انسان کی آمد اور موجودگی کا علم نہ ہو سکے۔ تم ایسا کرو کہ جا کر رضا کو بلا لاؤ۔ فوراً۔۔۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو پہلے میں اسے ایک گھونسہ اور لگاتا جاؤں"۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس وحشی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر رہا تھا جو سب سے پہلے اسی کو مارنا چاہتا تھا اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ ڈاکٹر فریدوں کا خون پی چکا ہوتا۔

★★

جب میں اور آقائے رضا کمپیوٹر چیمبر میں پہنچے تو ڈاکٹر فریدوں پیمائشی فیتے سے اس وحشی مخلوق کے مختلف اعضا ناپ کر ایک رجسٹر میں لکھتا جا رہا تھا۔ وہ آقائے رضا کو دیکھتے ہی خوشی سے چہک کر بولا۔ "دیکھو رضا۔ قدرت نے ہمیں بن مانگے کتنے بڑے انعام سے نواز دیا ہے"۔

آقائے رضا نے استہزائیہ تبسم سے کہا۔ "یہ انعام کس باغِ حیوانات کی زینت بنایا جائے گا؟"

"باغِ حیوانات!" فریدوں نے حقارت سے جواب دیا۔ "تم چڑیا گھر کی بات کرتے ہو رضا؟ اگر میرا بس چلتا تو میں اسے تم سے بھی چھپا لیتا۔ اب اسے کوئی چوتھا آدمی نہیں دیکھ سکتا"۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں چوتھے آدمی یعنی وزیرِ اعظم کو تو اس کے درشن کروانا ہی پڑیں گے ورنہ تم نہ تو کمپیوٹر کی تباہی کا کوئی جواز بتا سکو گے اور نہ ہی اپنے تجربات کے لیے مزید سرمایہ حاصل کر سکو گے"۔

آقائے رضا کی یہ بات ڈاکٹر فریدوں کی سمجھ میں آ گئی چنانچہ رات کے بارہ بجے جب وزیرِ اعظم تشریف لائے تو وہ انسان نما جانور ایک چھوٹی سی کھاٹ پر بے ہوش پڑا تھا اور لمبے ربڑ کی نلکیوں کے ذریعے غذا دی جا رہی تھی۔

"یہ کیا بلا ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟" وزیرِ اعظم نے پوچھا۔

"یہ ہزاروں سال پہلے کا انسان ہے جنابِ والا اور میں نے وقتی طور پر اس کا نام غرگ تجویز کیا ہے کیونکہ یہ ہر وقت غررررگ ررر غرررگ رر کرتا رہتا ہے۔ غرگ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ذریعے سائنس دانوں کو انسانی ارتقا کی گمشدہ کڑیاں مل جائیں گی۔ اس لیے میں اپنی تحقیق مکمل ہونے تک اسے سب سے چھپا کر رکھنا چاہتا ہوں"۔

۔۔۔ اور اس نے جو کچھ وزیرِ اعظم سے کہا تھا وہی کیا بھی تھا۔

سب سے پہلے مجھے غرگ کو اٹھا کر دوسرے تہ خانے میں لے جانا پڑا کیونکہ وہ اتنا وزنی تھا کہ نہ تو ڈاکٹر اسے اٹھا سکتا تھا اور نہ ہی آقائے رضا۔۔۔ غرگ سے اتنی بدبو خارج ہو رہی تھی کہ میں اسے تہ خانے میں چھوڑنے کے بعد سیدھا باتھ روم میں گیا اور بڑی دیر تک نہاتا رہا۔۔۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی بو میرے مساموں میں رچ گئی ہو۔

ڈاکٹر فریدوں کو غرگ کیا ملا کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ اسے نہ تو اپنے تن من کی پروا رہی اور نہ ہی کمپیوٹر کا کوئی خیال رہا۔ وہ

نرگ کے لیے ایک خصوصی "رہائش گاہ" بنوانے میں مصروف ہو گیا اور جب بڑے تہ خانے میں یہ رہائش گاہ تعمیر ہو گئی تو اُس نے مجھے اور آقائے رضا کو وہاں پہنچنے کا حکم دے دیا۔

نرگ حسبِ معمول اپنی کھاٹ پر بے ہوش پڑا تھا۔

ڈاکٹر فریدوں نے تہ خانے میں بنے ہوئے ایک غار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے نرگ کی اور تمھاری رہائش گاہ۔"

"جی ؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "میری اور نرگ کی رہائش گاہ ؟"

"ہاں... تم بھی نرگ کے ساتھ ہی رہو گے۔"

"مگر میں اس بدبُو دار وحشی کے ساتھ کیوں رہوں؟ ڈاکٹر ؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" میں چیخ پڑا اور آقائے رضا نے بھی میری تائید کر دی۔

"یہ قوم اور وطن کی سربلندی کا سوال ہے، رضا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ علمی تحقیق کا معاملہ ہے سرفروش، ذرا غور سے دیکھو۔ میں نے اس تہ خانے میں یہ غار ہی نہیں بنوایا بلکہ یہاں مصنوعی چٹانیں، جھاڑیاں اور چھوٹی سی دلدل بھی موجود ہے۔ میں نے حتی الوسع ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو نرگ کے لیے نیا اور یکسر اجنبی نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اُس کے رہن سہن، عادات و اطوار اور حرکات و سکنات کا مطالعہ کر سکوں۔ اگرچہ میں نے اس مقصد کے لیے متعدد خفیہ روزن بھی بنوائے ہیں جن سے نرگ پر نظر رکھی جا سکتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ یہ تم سے کیا اثرات قبول کرتا ہے اور اُس کی ذہنی صلاحیت کتنی ہے ؟ ہماری یہ تحقیق سائنس کی دُنیا میں ایک نیا باب کھول دے گی اور ہماری سربلندی کا باعث ہو گی۔"

"مگر میرے لیے اس کے ساتھ رہنا ناقابلِ برداشت ہے ڈاکٹر۔" میں نے احتجاج کیا۔

"قوم و وطن کی سرخروئی اور برتری کے لیے ہر قسم کے مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں برخوردار۔ ہماری زندگی قوم کی امانت ہے اور پھر... یہ تمھارے لیے زندگی یا موت کا کوئی سوال نہیں کیونکہ تم اُس سے زیادہ طاقت ور ہو۔ یہ بہتا ہو گا جب کہ تمھارے پاس ایک مضبوط ڈنڈا ہر وقت موجود رہے گا۔ میں تمھیں پستول رکھنے کی بھی اجازت دیتا مگر خطرہ ہے کہ کہیں تم اشتعال میں آ کر نرگ کو مار نہ ڈالو۔"

اگرچہ میں نے اور آقائے رضا نے کافی احتجاج کیا.. مگر ڈاکٹر فریدوں اپنی بات پر اَڑا رہا۔ دراصل اُس نے بالا ہی بالا وزیرِ اعظم سے اس سلسلے میں منظوری بھی لے لی تھی۔ میں موت سے نہیں ڈرتا کہ موت تو برحق ہے لیکن نرگ کے ساتھ مستقل قیام اور اُس کی ناقابلِ برداشت بدبُو ایک عذاب تھا جو مجھے برداشت کرنا ہی پڑا۔

غار میں ایسے خفیہ روزن بھی بنے ہوئے تھے جن سے تازہ اور سرد ہَوا مسلسل آتی رہتی تھی۔ غار کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا الاؤ روشن کر دیا گیا تھا مگر غار کے باہر بالکل اندھیرا تھا۔ پھر ڈاکٹر فریدوں نے باہر لاؤڈ اسپیکر چھپا کر نصب کروائے تھے جن سے حسبِ ضرورت کام لیا جا سکتا تھا۔ ان اسپیکرز کو مختلف ٹیپ ریکارڈرز سے مربوط کر دیا گیا تھا۔

یہ سارے انتظامات دکھانے کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔ "میں نے متعدد روزنوں میں مووی کیمرے بھی فٹ کر دیے ہیں۔ اُن لمحات کی عکاسی بے حد ضروری ہے جب نرگ ہوش میں آ کر ماحول کا جائزہ لے گا۔ تب میں ٹیپ ریکارڈرز آن کر دوں گا جن سے خوفناک آوازیں آئیں گی۔ بادلوں کی گھن گرج بھی سُنائی دے گی اور درندوں کی دھاڑیں بھی آئیں گی۔ تب یہ وحشی اس غار کو ہی اپنے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ سمجھے گا اور ایک کونے میں دُبک کر بیٹھا رہے گا۔"

"اور اگر وہ دُبک کر نہ بیٹھا رہا تو ؟" میں نے سوال کیا۔ "اُس نے مجھ پر حملہ کر دیا تو ؟"

"تب تم خود ہی اُس سے نمٹ لینا۔ پہلے بھی تو تم اسے ہلاک کیے بغیر نمٹ ہی چکے ہو۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بھوکا ہو گا اور بھوک میں حملہ آور بھی ہو سکتا ہے مگر میں نے اُس کے لیے گوشت کا انتظام کر دیا ہے۔"

"ہاں ڈاکٹر۔" آقائے رضا نے کہا۔ "سرفروش کا گوشت اُس کے لیے خاصا لذیذ ثابت ہو گا۔"

"تم ہمیشہ اُلٹی سیدھی باتیں کرتے ہو رضا۔ میں نے تازہ گوشت منگوا رکھا ہے۔ جب نرگ ہوش میں آئے گا تو سرفروش دوستی اور خیرسگالی کے اظہار کے لیے اُسے وہ گوشت پیش کرے گا۔ چلو اب نرگ کو اُٹھا کر غار میں لِٹا دو سرفروش۔" ڈاکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے نرگ کو غار میں لِٹا دیا اور کھال کا بنا ہُوا وہ لباس پہن لیا جو ڈاکٹر فریدوں نے میرے لیے تیار کروایا تھا۔ اس لباس میں بلاشبہ میں ایک گوریلا ہی نظر آتا تھا۔ غار اور اُس کے باہر کا ماحول مجھے بار بار "دس لاکھ سال پہلے" نامی ایک فلم کی یاد دلا رہا تھا۔

ڈاکٹر فریدوں نے ٹیپ ریکارڈرز ٹیسٹ کیے اور باہر جا کر ایک خفیہ روزن سے جھانکنے لگا۔ آقائے رضا بھی ایک سوراخ سے نرگ اور میری پہلی ملاقات کا منظر دیکھنے کا منتظر تھا مگر نرگ ابھی ہوش میں نہیں آیا تھا۔

میں بھینسے کی تازہ کھال میں گوشت کے بڑے بڑے لوتھڑے

لیے بیٹھا رہا۔ بالآخر ڈیڑھ گھنٹے بعد نرگ کے جسم میں جُنبش ہوئی اور وہ ہلنے جُلنے لگا۔ ڈاکٹر فریدوں نے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیے اور... لاؤڈ اسپیکرز پر جھینگروں اور دُوسرے حشرات الارض کی آوازیں گونجنے لگیں۔ پھر اژدہوں کی پھنکار اور درندوں کی دھاڑیں بلند ہوئیں تو نرگ نے آنکھیں کھول دیں اور غور سے یہ آوازیں سُننے لگا...

پھر اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارے، اپنے بال نوچے اور چاروں ہاتھوں پاؤں سے چلتا ہُوا الاؤ کے قریب آ گیا۔

جُوں جُوں درندوں کے لڑنے کی آوازیں بڑھیں، نرگ کی بے چینی بھی بڑھتی گئی۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا... پھر آہستہ آہستہ غار کے دہانے کے قریب آیا اور کان لگا کر سُنتا رہا۔ اتنے میں اُس کی نگاہ لکڑیوں کے ڈھیر پر جا پڑی۔ اُس نے کچھ لکڑیاں اُٹھائیں اور اُنھیں الاؤ میں جھونک دیا۔ شعلے بڑھے تو وہ اُن کی روشنی میں ادھر اُدھر یُوں دیکھنے لگا جیسے اُسے کسی خاص چیز کی تلاش ہو۔ غالباً وہ اپنا کلہاڑا ڈھونڈ رہا تھا مگر جب کلہاڑا اُسے نہ ملا تو وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارنے اور بال نوچنے لگا۔ اُس کی غراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ جھنجلا رہا ہے۔

میں غار کے باہر اندھیرے میں چھپا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

یکایک ڈاکٹر فریدوں نے سرگوشی کی۔ "جاؤ سرفروش۔ وہ زیادہ جھنجلا گیا تو کہیں کوئی غلط حرکت نہ کر بیٹھے۔"

میں نے نرگ کی طرف دیکھا۔ اُس نے یُوں کان کھڑے کر رکھے تھے جیسے یہ سرگوشی سُن چکا ہو۔ پھر وہ یُوں تن کر کھڑا ہو گیا جیسے کسی اَن دیکھے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

میں ایک ہاتھ میں گوشت اور دُوسرے میں پکڑا ہُوا ڈنڈا فرش پر مارتے ہوئے غار کی طرف بڑھنے لگا۔ نرگ ڈنڈے کی آواز سے چوکنا ہو کر چند قدم پیچھے ہٹا اور غرانے لگا۔ اگرچہ اُس کی یہ حرکت صاف بتاتی تھی کہ وہ خوف زدہ ہے مگر اُس کی تیز ہوتی ہوئی غراہٹ اور بار بار آگے پیچھے ہونے والا سر اُس کے غصّے کا مظہر بھی تھا۔

میں کن انکھیوں سے اُسے دیکھتا ہُوا الاؤ کی طرف بڑھا اور ڈنڈا سیدھے ہاتھ میں تھام کر اس طرح روشنی میں کھڑا ہو گیا کہ وہ ڈنڈے کو بخوبی دیکھ سکے۔

نرگ اپنی چھوٹی چھوٹی سُرخ آنکھوں سے مجھے گھُورتا رہا۔ اُس کا سر مسلسل آگے پیچھے حرکت کر رہا تھا مگر گوشت کی بُو پا کر اُس کی غراہٹ بدل گئی تھی۔

میں نے اُس کی غراہٹ غور سے سُنی اور پھر بالکل اُسی طرح خود بھی غرانے لگا۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ بہت زیادہ ڈر گیا یا اُس نے اپنے آپ کو مجھ سے زیادہ طاقت ور سمجھا تو یقیناً مجھ پر حملہ کر دے گا ورنہ اُسے سُدھانا مشکل نہ ہو گا۔

میں نے اسی طرح اپنا سینہ کھُجاتے ہوئے ڈنڈا پھینک دیا اور آہستہ آہستہ "نمرررگ۔ نمرررگ" کہنے لگا۔

یہ اگرچہ ایک احمقانہ سی حرکت تھی.. مگر اس میں ایک پُکار اور ایک بُلاوا سا تھا جیسے کوئی پچکار پچکار کر کسی بچے کو بُلاتا ہے۔

نرگ نے ایک بار ڈنڈے کو اور پھر میری طرف دیکھا۔

چند لمحے اسی طرح گزر گئے۔

اچانک اُس کی غراہٹ میں نرمی آ گئی۔

میں نے جھولی سے گوشت کا ایک لوتھڑا نکال کر اسے دکھایا اور مسلسل بولتا بھی رہا۔

نرگ کے نتھنے پھڑکنے لگے اور اُس کی باچھوں سے رال ٹپکنے لگی۔ اچانک اُس نے اپنا ہاتھ یُوں بڑھا دیا جیسے گوشت مانگ رہا ہو۔ ساتھ ہی اُس کی غراہٹ ایک مخصوص لفظ میں ڈھل گئی۔ اب وہ نمرررگ نمرررگ کی بجائے "نمرواہ... نمرواہ" کہہ رہا تھا۔

میں نے بھی یہی لفظ دو تین بار دُہرایا اور گوشت کا ٹکڑا اُس کی طرف اُچھال دیا۔ نرگ نے اُسے ہاتھوں میں دبوچا اور لکڑیوں کے ڈھیر کی طرف بڑھا، ایک نوکدار لکڑی منتخب کی، گوشت کا ٹکڑا اُس میں پرویا اور بھوننے کے لیے الاؤ پر رکھ دیا۔

اُس کی یہ حرکت صاف بتاتی تھی کہ وہ جانوروں کی حدود سے نکل کر انسانی حدود میں قدم رکھ چکا تھا۔ میں نے اُس روزن کی طرف دیکھا جس سے ڈاکٹر فریدوں جھانک رہا تھا۔ خوشی کے مارے اُس کی باچھیں کانوں تک کھلی ہوئی تھیں۔

اگرچہ نرگ نے مجھ سے گوشت مانگ لیا تھا مگر ابھی اُسے مجھ پر پُوری طرح اعتماد نہیں ہُوا تھا۔ وہ مسلسل میری طرف دیکھے جا رہا تھا اور اُس نے الاؤ کو حدِ فاصل بنا لیا تھا۔ جب گوشت کا وہ پارچہ بھُن گیا تو اُس نے جلدی سے اُسے لکڑی سے نکالا اور دو ہی لقموں میں چٹ کر گیا۔

میں نے دُوسرا پارچہ اُس کی طرف اُچھال دیا۔

اُس نے بھوننے والا عمل دُہرایا.. مگر اب کے اُس نے پارچے کے تین لقمے کیے پھر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نرمی سے غرایا۔ "نمرررنا۔ نمرررنا۔"

میں نے بھی اُس کی نقل کی تو اُس نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا اور اپنے سینے کے بالوں کو ٹٹولنے لگا۔

اتنے میں غار کے باہر لاؤڈ اسپیکرز پر پھر درندوں کی

دھاڑیں گونجنے لگیں۔ نرگ خوفزدہ ہو گیا۔ اُس نے مجھ سے نگاہیں ہٹا کر باہر کی طرف دیکھا اور پیچھے ہٹنے لگا۔

میں غار کے دہانے کی طرف بڑھ کر ہوا میں مُکا لہراتے ہوئے چلّایا جیسے درندوں کو للکار رہا ہوں۔ مگر جب درندوں کے آنے کی بجائے اُن کی آوازیں بھی معدوم ہو گئیں تو میں نے نرگ کی طرف پلٹ کر دیکھا تاکہ اُس کا ردِّعمل معلوم کر سکوں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اپنے ہاتھ باندھے یوں مُنہ کھولے کھڑا ہے جیسے ہنس رہا ہو۔

اُس کی غراہٹ "ہاہ ہاہ ہاہ" پر مشتمل تھی۔ کبھی کبھی وہ خوشی سے اُچھل بھی پڑتا تھا۔

"مان گئے نا اُستاد۔ اب تمھاری میری خوب نبھے گی مگر تمھیں میرے ساتھ دوستی کرنا پڑے گی نرگ۔" میں نے کہا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کچھ سمجھ بھی رہا ہے یا نہیں مگر میں مُنہ آئی بکتا رہا اور اشاروں سے سمجھاتا رہا کہ کوئی اِدھر آیا تو اُس کی گردن مروڑ دوں گا۔ پھر میں اپنے ڈنڈے کی طرف بڑھا جو تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر نرگ فوراً چوکنا ہو گیا۔ اُس کا قہقہہ غراہٹ میں بدلا اور نگاہیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔

میں بڑی نرمی سے بولتا رہا: "مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ نرگ۔ ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور میں اپنی دوستی کا ثبوت دینا چاہتا ہوں بس تم آرام سے میری طرف دیکھتے رہو۔"

... مگر نرگ اطمینان سے دیکھنے کی بجائے زور زور سے سینہ کوبی کرنے لگا۔

جونہی میں نے ڈنڈا اُٹھایا، وہ الاؤ سے دور ہٹ کر کونے میں جا کھڑا ہوا۔ وہ مجھ سے بُری طرح خوفزدہ تھا۔ مگر میں نے اُس پر توجہ دیے بغیر ڈنڈے کو گھٹنے پر مار کر دو ٹکڑے کیا اور الاؤ میں پھینک دیا۔

نرگ کی غراہٹ اور بے چینی ایک دم دور ہو گئی۔ وہ بڑے تعجب سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے نرگ سے بے نیازی برتتے ہوئے جھولی سے گوشت کا ایک پارچہ نکالا اور اُسی نرگ والی لکڑی میں پرو کر اُسے آگ پر رکھ دیا۔ باہر پھر ویسی ہی خوفناک آوازیں گونجنے لگیں۔

نرگ پہلے تو ڈرا... مگر پھر آہستہ آہستہ الاؤ کے قریب آ گیا۔ اتنے میں وہ پارچہ بھی بھن گیا تھا جسے میں نے الاؤ میں رکھا تھا۔ میں نے اُسے لکڑی سے نکالا اور پھونکیں مار مار کر ٹھنڈا کرتے ہوئے کھانے لگا۔ اس دوران میں نے نرگ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ شاید بھنتے ہوئے گوشت کی خوشبو نے پھر اُس کی اشتہا جگا دی تھی۔ وہ پھر اسی انداز میں غرانے لگا جیسے گوشت طلب کر رہا ہو۔

میں نے جھولی سے گوشت کا ایک پارچہ نکالا مگر اُسے اُچھالنے کی بجائے ہاتھ میں پکڑے پکڑے اُس کی طرف بڑھا دیا۔

نرگ نے جھجکتے ہوئے دو تین بار ہاتھ بڑھایا، کھینچ... پھر اُس نے وہ پارچہ جھپٹ ہی لیا۔

ایک لمحے کے لیے اُس کی انگلیاں میری انگلیوں سے چھو گئیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے سردی میں کسی ٹھٹھرے سانپ کو چھو لیا ہو۔

نرگ وہ پارچہ بھوننے لگا۔

میں کھاتا اور خواہ مخواہ کی بکواس کرتا رہا۔ اس دوران نرگ نے اپنی توجہ مجھ سے ہٹالی اور کچا پکا پارچہ کھانے میں مصروف ہو گیا۔ جب وہ اپنا پیٹ بھرنے سے فارغ ہو گیا تو میں اُٹھا، بڑے زور سے ایک جماہی لی اور جھولی اُٹھا کر غار سے باہر جانے لگا۔

ڈاکٹر فریدوں نے ایک بار پھر حشرات الارض والے ٹیپ چلانے شروع کر دیے تھے۔

نرگ بھی اُٹھ کر میری طرف دیکھنے لگا اور پھر اُس کے حلق سے "عزمرد... عزمرد" قسم کی آوازیں نکالنا شروع کر دیں۔

میں نے غار کے دہانے پر رُک کر اُس کی طرف دیکھا تو وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلانے لگا۔

میں اُس کی طرف بڑھ گیا۔

نرگ جو اَب تک الاؤ کی دوسری جانب ہی رہا تھا، آگے بڑھ کر میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ میں نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ میرے قدموں سے لپٹ گیا۔ اُس نے میرے ساتھ دوستی کر لی تھی۔ میں نے جھولی میں پڑے ہوئے گوشت کے دونوں پارچے اُسے دے دیے۔ وہ خوشی کے مارے اُچھلنے اور "نرہاہاہا۔ نرہاہاہا" کرنے لگا۔

●

آیندہ چند روز میں نرگ کے ساتھ اُسی غار میں گزارے۔ اب وہ میرے اشارے اور میں اُس کی غراہٹیں سمجھنے لگا تھا۔

اس دوران ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اُس میں دماغی صلاحیت برائے نام ہی ہے۔ اُسے اب تک یہی پتہ نہیں چلا تھا کہ آخر اتنے عرصے سے غار کے باہر رات کا اندھیرا کیوں چھایا ہوا ہے۔ اُس پر اس سارے عرصے میں یہی تاثر رہا کہ باہر رات ہے اور رات کو باہر نکلنا خطرناک ہوتا ہے۔ گویا یہ غار ہی اُس کے لیے ایک اچھی پناہ گاہ ہے جہاں ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے۔ جونہی الاؤ مدھم

پڑنے لگتا، وہ اُٹھ کر چند لکڑیاں اُس میں جھونک دیتا۔

جب میں وقتِ مقررہ پر گوشت کی تلاش لینے کے لیے غار سے باہر نکلتا تو وہ غار کے آخری حصے میں ایک جگہ بیٹھ جاتا اور میرا انتظار کرنے لگتا۔

● اس دوران ڈاکٹر فریدوں نے کمپیوٹر کی مرمت کر لی تھی۔

"وہ کمپیوٹر سیٹ کر چکا تھا... مگر وہ تمھیں ماضی کے سفر پر بھیجنے کی بجائے نرگ میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔" آقائے رضا نے ملنے پر مجھے بتایا۔

"اگر آپ نے مجھے اس غار اور نرگ سے نجات نہ دلائی تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"گھبراؤ نہیں برخوردار۔ میں پہلے ہی وزیرِاعظم سے مل چکا ہوں۔ اُنھوں نے ڈاکٹر فریدوں سے کہا ہے کہ وہ بلاتاخیر تمھیں اور نرگ کو ماضی کے اسی دور میں منتقل کر دے کیونکہ مالیاتی مجلس اور شاہ ان تجربات کا نتیجہ دیکھنے کے منتظر ہیں۔ چونکہ نرگ تم سے کافی مانوس ہو گیا ہے اس لیے وہ اپنے دور اور دُنیا میں تمھارا مددمعاون ثابت ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر فریدوں نے پہلے تو ٹال مٹول سے کام لینا چاہا پھر اُسے سرِتسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ بس اب ایک دو روز کے اندر ہی تمھیں نرگ کے دور میں منتقل کر دیا جائے گا۔"

اُسی رات ڈاکٹر فریدوں نے جو گوشت بھجوایا، اس میں نشہ آور دوائیں ملی ہوئی تھیں اور مجھے وہ گوشت کھانے سے منع کر دیا گیا تھا۔ وہ نرگ کو کمپیوٹر چیمبر میں لانے سے پہلے بے ہوش کر دینا چاہتا تھا تاکہ نرگ ڈر کے مارے یا گھبرا کر کوئی توڑ پھوڑ نہ کر بیٹھے۔

دوسری صبح مجھے نرگ کو اُٹھا کر کمپیوٹر چیمبر لے جانا پڑا۔

ڈاکٹر فریدوں بے حد لگوس تھا۔ نرگ کی واپسی پر اُس کی کیفیت ایسی تھی جیسے کسی سے اُس کی محبوبہ ہمیشہ کے لیے چھینی جا رہی ہو۔ وہ بار بار ٹھنڈی سانس لیتا اور کہتا: "ہائے۔ تم نے میرے ساتھ بڑی دشمنی کی ہے، رضا۔ اگر تم وزیرِاعظم سے نہ ملتے تو نرگ نہ جاتا۔ یہ سب تمھاری سازش کی وجہ سے ہوا ہے۔"

"مگر تم جب چاہو نرگ کو واپس بلا سکتے ہو ڈاکٹر۔" آقائے رضا نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں۔ نرگ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ سرفروش کو تو اس لیے واپس بلایا جا سکتا ہے کہ اس کے دماغ پر سائنسی عمل کیے جا چکے ہیں مگر نرگ کا دماغ نہ انسان کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ ہی اس پر سائنسی عمل کیے جا سکتے ہیں۔"

بہرکیف ڈاکٹر فریدوں کو دل پر پتھر رکھنا ہی پڑا اور نرگ کو میرے ساتھ الیکٹرک چیئر پر بٹھا دیا گیا۔ وہی سارے عمل دہرائے گئے جو اس موقعے پر کیے جاتے تھے۔ پھر ڈاکٹر فریدوں نے کمپیوٹر کا سُرخ سوئچ آن کر دیا۔ مجھے اور نرگ کو برقی جھٹکا لگا۔

مجھے درد کی شدت میں اتنا ہی محسوس ہوا کہ میں نرگ بن گیا ہوں اور نرگ ایک گرِیلہ... پھر ہم دونوں پاش پاش ہو کر فضائے بسیط میں تحلیل ہو گئے۔

✸ تجربے نے مجھے یہی سکھایا تھا کہ جب کمپیوٹر ماضی کے کسی دور میں منتقل کرے تو میں کچھ دیر تک ساکت پڑا رہوں اور جب تک ماحول کا اچھی طرح جائزہ نہ لے لوں اپنی جگہ سے خفیف سی حرکت بھی نہ کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو ایک دلدلی قطعے پر جھاڑیوں کے درمیان، زمین پر منہ کے بل لیٹے پایا تو پتہ چلا کہ میرے نیچے اور سامنے گھاس لہلہا رہی ہے مگر اس گھاس کا رنگ سبز نہیں بلکہ سُرخ ہے۔

میں نے آہستہ آہستہ سر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا تو ہر طرف اس عجیب سی گھاس کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے سُرخ گھاس کا ایک سمندر ہے جو چاروں طرف پھیلا ہُوا ہو... پھر یکایک کہیں قریب سے دو مہیب درندوں کی خوفناک آوازیں آنے لگیں جیسے وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر دھاڑ رہے ہوں۔

چند لمحے بعد اُن درندوں میں لڑائی ہونے لگی اور اُن کی خوفناک آوازوں سے غیظ و غضب کی ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

اچانک ایک درندے کی آواز موت کی چیخ بن کر فضا میں گونجی جیسے دوسرے درندے کی فاتحانہ دھاڑ نے نگل لیا پھر ماحول پر ایک عجیب سا پُراسرار سناٹا چھا گیا۔

ان آوازوں نے مجھے ڈاکٹر فریدوں کے ٹیپ ریکارڈرز کی یاد دلا دی اور اس کے ساتھ ہی مجھے نمرگ یاد آ گیا۔ اُسے بھی تو میرے ساتھ ہی ماضی کے اس دَور میں منتقل کیا گیا تھا... مگر وہ اس وقت کہاں ہے؟ کیا وہ کسی دوسرے دَور میں چلا گیا ہے؟ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر کمپیوٹر نے ہمیں، نمرگ کے دَور اور دُنیا کی بجائے ماضی کے کسی دوسرے دَور میں بھیج دیا ہو تو وہ میرے کس کام کا؟ وہ تو اُلٹا میرے لیے مصیبت ہی بن جائے گا۔

میں اُٹھ بیٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

لمبی لمبی گھاس کے اس سمندر میں مجھے نمرگ کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے آفتاب غروب ہونے والا ہو اور شام اُترنے والی ہو۔

معاً مجھے اپنے بائیں جانب دَھپ دَھپ کرتے کسی دوڑتے ہوئے جانور کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے دائیں جانب سے سانپ کی سی تیز پھنکار کی آواز بھی آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زندگی اور موت کا دوسرا کھیل شروع ہونے والا ہو۔

میں مارے خوف کے وہیں منجمد سا ہو کر رہ گیا۔

اگلے ہی لمحے کسی نے میرے بازو پر زور سے لکڑی ماری۔

میں نے جلدی سے لکڑی تھام لی اور پلٹ کر دیکھا۔ لکڑی کا دوسرا سرا نمرگ کے ہاتھ میں تھا وہ خونخوار انداز میں غرّانے لگا۔

میں نے جھٹکے سے لکڑی چھین لی۔

نمرگ مجھ پر جھپٹا اور اپنے نوکیلے دانت میری گردن میں گاڑ دینا چاہے۔ مگر میں نے بڑے زور سے اُس کے ماتھے پر ٹھکا مارا تو وہ چکرا کر گر پڑا۔

میں اُس پر لکڑی سے حملہ کرنے ہی والا تھا، مجھے یاد آ گیا کہ اُس کی دماغی صلاحیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے وہ مجھے اس نئے ماحول اور نئے دَور میں بھول چکا ہو گا۔ لہٰذا اُسے ایک بار پھر "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" والا سبق دینا پڑے گا۔ چنانچہ جونہی نمرگ کے حواس بحال ہوئے اور اس نے آنکھیں کھولیں، میں نے اُسے مارنے کے لیے لکڑی بلند کی۔ وہ فوراً میرے قدموں سے لپٹ گیا۔

اُس نے ایک بار پھر طاقت کے سامنے سر جُھکا دیا تھا۔

میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے ویسی ہی آواز نکالی جیسی کہ نمرگ بھوک کا اظہار کرنے کے لیے غار میں نکالا کرتا تھا وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر ایک طرف اشارہ کرنے لگا۔

میں نے بھی لکڑی سے اُسی جانب اشارہ کرتے ہوئے اُسے اُدھر بڑھنے کے لیے ٹھوکا دیا تو وہ میرے آگے آگے چلنے لگا۔ اس کی حرکتوں سے اندازہ ہوتا تھا جیسے یہ جگہ اس کی دیکھی بھالی ہو... اور اس کا مطلب تھا کہ کمپیوٹر نے ہمیں واقعی اُسی کے دَور میں منتقل کیا ہے۔

نمرگ تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ اُسے تو گھاس میں چلنے سے کوئی تکلیف محسوس نہ ہُوئی جبکہ میرے جسم پر جگہ جگہ خراشیں آ گئیں۔ یہ گھاس درانتی کی مانند کاٹ رکھتی تھی۔ پھر ایک جگہ وہ گھاس زمین پر بچھی دکھائی دینے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس ٹکڑے پر کسی نے گھاس کو روند کر زمین پر بچھا دیا ہو۔ اس قطعے کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا چشمہ اُبل رہا تھا۔ یہ چشمہ دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہاں جانور پانی پینے اور آرام کرنے کے لیے آتے ہوں گے اس لیے گھاس زمین پر بچھ گئی ہے۔

نمرگ چشمے پر پانی پینے لگا اور پھر وہ چشمے میں لیٹ گیا شام سر پر آ رہی تھی اس لیے میں نے اُسے ٹھوکا دیا اور بھوک یاد دلائی تو وہ بادلِ نخواستہ چشمے سے نکلا اور میری رہنمائی کرنے کے بجائے ایک جانب جا کر کچھ دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے مجھے قریب آنے اور دیکھنے کا اشارہ کیا۔

میں اُس کے قریب جا کر اُدھر دیکھنے لگا۔

کچھ فاصلے پر مجھے گھاس کے درمیان ایک راستہ سا دکھائی دیا اور یہ راستہ دُور اُن پہاڑیوں تک چلا گیا تھا جن کی چوٹیوں پر جگہ جگہ دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ پہاڑیاں وہاں سے ایک میل دُور ہوں گی۔ یہ دُھواں آگ کی نشاندہی کرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ آگ، درندوں سے حفاظت کے لیے جلائی گئی ہو گی۔ ممکن ہے وہاں نمرگ کے بھائی بند رہتے ہوں۔ اگر ہم وہاں پہنچ جائیں تو ہمیں خوراک اور پناہ مل جائے گی۔

میں نے مسکراتے ہوئے نمرگ کی طرف دیکھا اور پیٹ پر ہاتھ پھیرا تو نمرگ ہنس پڑا: "نمرا ہا ہا ہا۔ نمرا ہا ہا ہا"۔ اور پہاڑیوں کی طرف اشارہ کر کے اچھلنے لگا پھر وہ میری رہنمائی کے لیے آگے آگے چل دیا۔ مجھے آغائے رضا کی بات یاد آ گئی۔ نمرگ واقعی اپنے دَور اور دُنیا میں میرا مددمعاون ثابت ہو رہا تھا اب وہ تیزی سے اس راستے پر پہاڑیوں کی طرف اُچھلتے ہُوئے بڑھ رہا تھا۔ میں اس سے تقریباً پچاس قدم پیچھے تھا کہ اچانک ایک جگہ زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور میں ریت کی دلدل میں اُترتا چلا گیا۔ صورتِ حال کا احساس ہونے تک میں کمر تک ریت میں دھنس چکا تھا۔

میں نے نمرگ کو آواز دی تو وہ پلٹ کر میرے قریب آ گیا۔

اب مجھے پتہ چلا کہ وہ اُچھل اُچھل کر راستہ کیوں طے کر رہا تھا۔ ... یہ راستہ ریت کی دلدل سے گزرتا تھا۔ اس لیے جہاں دلدل آتی تھی، وہ اُچھل کر اُسے پار کر لیتا تھا۔

میں سخت ترین مشکل حالات میں بھی گھبرایا نہیں کرتا مگر اس طرح ریت میں دھنس کر بے بسی سے جان دینا بھی مجھے منظور نہیں تھا۔ میں نے نمرگ کی طرف دیکھا تو مجھے اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشیانہ چمک ناچتی دکھائی دی۔ میں اپنے آپ کو ریت سے نکالنے کی کوشش بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس طرح اور زیادہ تیزی سے اس میں دفن ہوتا چلا جاتا۔ نمرگ بھی میری بات نہیں سمجھ رہا تھا اور ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔

... پھر ایک ترکیب میری سمجھ میں آ گئی۔

میرے دونوں ہاتھ ابھی تک ریت سے باہر تھے۔ میں نے وہی لکڑی نمرگ کی طرف بڑھائی جو اُس نے میرے بازو پر ماری تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ لکڑی پکڑ کر کھینچے گا تو میں دلدل سے نکل آؤں گا مگر اپنی طرف اُٹھی ہُوئی لکڑی دیکھ کر وہ بُری طرح بدکا اور پیچھے ہٹ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا... پھر اس نے زمین پر پڑے پھر چھوٹے چھوٹے پتھر اُٹھائے اور مجھے مارنے لگا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ نمرگ کے بھائی بند اپنے شکار کو گھیر گھار کر یہاں اپنے پیچھے لگا کر اِدھر ہی لے آتے ہوں گے اور جب وہ اس دلدل میں پھنس جاتا ہو گا تو اُسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے ہوں گے۔

نمرگ کا پھینکا ہُوا پہلا پتھر میرے کندھے پر لگا۔ میں نے اُسے لکڑی سے ڈرایا تو نمرگ دو قدم پیچھے ہٹا اور اس نے دوسرا پتھر کھینچ مارا۔ اگر میں جلدی سے سر نہ جُھکاتا تو میری کھوپڑی پاش پاش ہو جاتی۔ تیسرا پتھر میرے سامنے ریت میں گرا اور اس سے پہلے کہ وہ گہرائی میں اُتر جاتا۔ میں نے ٹٹول کر اُسے نکال لینا چاہا مگر اُسے تلاش نہ کر سکا۔ میں نے نمرگ کی طرف دیکھا، وہ چوتھا پتھر مارنے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں بھی تیار ہو گیا اور جونہی پتھر میرے قریب آیا، میں نے اسے دبوچ لیا۔

نمرگ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اُسے وہ پتھر کھینچ مارا جو اس پیٹ میں جا لگا۔ نمرگ دَرد کے مارے بلبلا اُٹھا اس نے باقی ماندہ پتھر پھینک کر اپنا پیٹ پکڑ لیا اور پیچھے ہٹنے لگا۔

میں نے آخری کوشش کے طور پر لکڑی کا نوک دار سرا راستے کی پکی زمین کی طرف بڑھایا تاکہ اگر وہ وہاں گڑ جائے تو میں اُسے پکڑ کر ریت کی دلدل سے نکل آؤں۔ مگر لکڑی ٹھوس زمین سے چند انچ اِدھر ہی رہ گئی۔ میں نے اِدھر کھسکنے کے لیے زور لگایا تو سینے تک ریت میں دھنس گیا۔

اب موت میری آنکھوں کے سامنے رقص کر رہی تھی اور میں چند گھڑیوں کا مہمان تھا۔ جب مجھے مرنا ہی تھا تو بے بسی سے زندہ دفن ہونے کی بجائے موت سے پنجہ لڑانا زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر لکڑی کا نوک دار حصّہ ٹھوس زمین میں گاڑنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

لکڑی کا نوک دار حصّہ ٹھوس زمین میں گڑ ہی گیا۔

میں آہستہ آہستہ لکڑی پر دباؤ ڈال کر ٹھوس پگڈنڈی کی طرف بڑھنے لگا۔

چند انچ سرکنے کے بعد میں پُوری قوّت سے لکڑی پر دباؤ ڈالتا تاکہ وہ مزید گڑ جائے۔ اس طرح بالآخر میں بھُربھُری موت کے شکنجے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس دوران میں نمرگ غائب ہو چکا تھا۔ شاید وہ اپنے بھائی بندوں کو بلانے گیا تھا کہ شکار پھنس چکا ہے... وہ آئیں اور مجھے ریت سے نکال کر میرے گوشت سے ضیافت اڑائیں۔

میں نے اپنے بدن سے ریت جھاڑی، لکڑی نکالی اور اُس سے راستہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اب اُترتی شام کے ملگجے اندھیرے میں پہاڑیوں پر آگ جلتی دکھائی دینے لگی تھی اور میں جلد از جلد وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔

ابھی میں بمشکل پانچ سو گز ہی گیا تھا کہ مجھے نمرگ کی آواز بلکہ چیخ سنائی دی۔ وہ اپنے بھائی بندوں کو بلانے نہیں گیا تھا بلکہ سامنے والے موڑ کے پیچھے چھپا میری موت و حیات کی کشمکش کا تماشا دیکھ رہا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ موت خود اُسی کی تاک میں ہے۔

میں اُس کی موت کا منظر نہیں دیکھنا چاہتا تھا مگر دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

چیونٹیاں کھانے والے جانور یعنی مور خور جیسے ایک بہت بڑے جانور نے جس کی زبان کم از کم بیس فٹ لمبی تھی، نمرگ کو اپنی زبان میں لپیٹ رکھا تھا اور اس کی گرفت اتنی سخت ہو گئی تھی کہ نمرگ آواز بھی نہیں نکال سکتا تھا، پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہڈیاں کڑکڑائیں اور وہ چُرمرا کر رہ گیا۔ عظیم الجثہ مور خور کی زبان سمٹنے لگی... پھر اس نے جبڑا کھولا اور نمرگ کو نگل گیا۔ وہ خبیث جانور اب مجھ پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ اُس کا منہ اژدہے کا سا اور جسم مگرمچھ جیسا تھا۔ وہ پانچ فٹ اونچا اور تقریباً تیس فٹ لمبا تھا۔ وہ ہلے جلے بغیر ہی میری طرف دیکھے جا رہا تھا کہ کب میں بھاگنے کی کوشش میں آگے بڑھوں اور اس کی زبان اسپرنگ کی طرح اچھل کر مجھے اپنی لپیٹ میں لے لے۔

مجھ پر اس خوفناک بلا نے کپکپی سی طاری کر دی۔ میں نے آج تک اس قسم کی کسی مخلوق کا ذکر کسی کتاب میں نہیں پڑھا تھا۔ اس قسم کے جانوروں کا ذکر تو صرف دیومالائی قصوں اور کہانیوں میں ہی آتا ہے... لیکن اب پتہ چلا کہ ہر خیال کے پیچھے کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہوتی ہے۔

میرے لیے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں اُس کے سامنے سے کیسے گزروں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسی قبیل کی ایک اور بلا گھاس سے برآمد ہوئی۔ دونوں نے اپنی لہراتی ہوئی زبانیں نکالیں اور پھنکارتے ہوئے ایک دوسرے سے معرکہ آرائی میں مصروف ہو گئیں۔ یہ دونوں جانور اپنی زبانوں کے ذریعے ایک دوسرے سے جکڑ گئے تھے پھر وہ لوٹنے لگے اور ان کی اس زور آزمائی سے زمین تھرتھرانے لگی۔

میں موقع غنیمت جان کر وہاں سے بھاگ اُٹھا۔

نمرگ کا دَور عجیب الخلقت بلاؤں کا دَور ثابت ہو رہا تھا جس نے مجھے بُری طرح دہلا کے رکھ دیا تھا۔ نمرگ جس سے مجھے معاونت کی اُمید تھی، وہ بھی دشمن نکلا اور مارا گیا تھا... پھر بھی مجھے اُس کی موت پر دُکھ ہو رہا تھا۔ اس وقت تک میں دو بار موت کو چکمہ دے کر بھاگ نکلا تھا مگر نہیں جانتا تھا کہ آنے والا وقت میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ تاہم میں پہاڑیوں پر جلتی آگ کو منزل بنا کر بھاگتا چلا گیا۔

میرے پیچھے اب مختلف درندوں کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ میں نے کئی جگہ گھاس میں سرسراہٹ اور پھنکاریں بھی سُنیں مگر ہر آواز میری رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ میں گھاس کے سمندر سے نکل آیا۔ اب وہ پہاڑیاں تقریباً پانچ سو گز دُور رہ گئی تھیں جن کے غاروں میں الاؤ جل رہے تھے۔ میں نے اپنی رفتار کم کر دی اور پلٹ کر دیکھا۔ کوئی درندہ یا کوئی بلا اس وقت میرا تعاقب نہیں کر رہی تھی لیکن آگے مجھے کیسے وحشیوں سے پالا پڑنے والا ہے، یہ میں نہیں جانتا تھا۔

میں دم لینے کے لیے رُک گیا۔

ابھی میری سانس بھی درست نہیں ہوئی تھی کہ مجھے اپنے پیچھے کچھ فاصلے پر دھپ دھپ کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ہر چند کہ اب شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا مگر اُفق کے پس منظر میں مجھے اُس خوفناک بلا کا ہیولا صاف دکھائی دے رہا تھا جو ایک اچھے خاصے گھر جتنی بلند تھی۔ اس کے سر پر سینگ تھے اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ ہر قدم پر سونگھنے کے لیے اپنا منہ اوپر اُٹھا لیتی تھی۔ میں نے کسی شکاری کتے کی طرح دوڑ لگا دی اور پہاڑیوں کے قدموں تک بھاگتا چلا گیا پھر میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بلا بھی کچھ فاصلے پر رُک گئی تھی، شاید وہ آگ سے خوفزدہ تھی۔ چند لمحوں کے بعد جب وہ خود ہی پلٹ گئی تو میری جان میں جان آئی اور میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔ اس عمل کے ساتھ ہی میرے نتھنوں میں ویسی ہی بدبو بھی دَر آئی جیسی کہ نمرگ سے آیا کرتی تھی... مگر اس بدبو میں گوبر اور بھنے جانے والے گوشت کی بُو بھی شامل تھی۔

گوشت کی بُو باقی ہر بُو پر غالب آ گئی اور اس نے میری اشتہا بڑھا دی۔ میں ایک غار کی طرف رینگنے لگا۔ چونکہ وہ وحشی اوپر تھے اور ہوا بھی ادھر سے آ رہی تھی اس لیے وہ میری بُو نہ سونگھ سکے اور میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

سب سے پہلے غار کے دہانے کے باہر ایک چھوٹی سی ستون نما چٹان کھڑی تھی۔ میں نے اس کی اوٹ لے کر غار کا جائزہ لیا۔ الاؤ کے اردگرد مجھے دس ہیولے دکھائی دیے۔ ان کے قد تقریباً چار فٹ، ٹانگیں چھوٹی، ہاتھ لمبے اور سر بڑے بڑے تھے۔ ان کی یہ جسمانی ساخت صد فی صد نمرگ سے ملتی جلتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مخلوق نمرگ ہی کی قبیل سے تعلق رکھتی تھی۔ ان دس نمرگوں میں سے چار نر اور چھ مادہ تھیں۔ چاروں نر الاؤ کے اس طرف اور مادہ دوسری طرف تھیں۔ ہر مذکر کے پاس ڈنڈا یا کلہاڑا رکھا ہوا تھا اور ہر چند لمحوں بعد وہ غار کے باہر اندھیرے میں دیکھتے اور سونگھتے تھے جیسے کسی بھی ناگہانی خطرے کے لیے تیار رہنا چاہتے ہوں۔ دو عورتیں لکڑیوں میں گوشت کے پارچے پرو کر انھیں بھون رہی تھیں۔ دو بچوں کو دودھ پلا رہی تھیں اور باقی دو غالباً کھانے کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

میرے پاس حملے یا مدافعت کے لیے صرف وہی لکڑی تھی مگر وہ کلہاڑیوں اور ڈنڈوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ میرے لیے غار میں جانا بھی ناگزیر تھا کیونکہ پیچھے جنگل میں بلائیں موت کا روپ دھارے مجھے لقمہ بنانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ بھونے جانے والے گوشت کی بُو نے میری اشتہا کو بہت بڑھا دیا تھا اور اب مجھے سردی بھی لگ رہی تھی۔ میں نے بلا تاخیر غار میں جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن آگے بڑھنے سے پہلے میں نے وہ لکڑی وہیں پھینک دی کیونکہ وہ ہتھیار ثابت نہیں ہو سکتی تھی دوسرے نمرگ میرے ہاتھ میں لکڑی دیکھ کر فوراً مشتعل ہو جاتے اور خوف یا غصے میں حملہ کر دیتے مگر نہتا ہونے کی صورت میں شاید وہ حملہ کرنے میں عجلت نہ دکھاتے۔

میں آگے بڑھ کر غار میں داخل ہو گیا اور نمرگ کی وہی غراہٹ دُہرانے لگا جو وہ گوشت مانگنے کے لیے حلق سے نکالا کرتا تھا۔ سارے نمرگ میری طرف متوجہ ہو گئے مگر غار میں ایک گمبھیر خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ اپنی جسامت سے دُگنا نمرگ دیکھ کر بھونچکا رہ گئے تھے ورنہ اُن کے ڈنڈے اور کلہاڑے ان کی دسترس سے باہر نہیں تھے۔

میں پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دوبارہ غرایا تو مادہ نمرگوں میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ انھوں نے اپنے بچے اُٹھائے اور بھاگ کھڑی ہوئیں، نر نمرگوں نے بھی اُن کی تقلید کی اور جاتے وقت اپنے ہتھیار اُٹھانا بھی بھول گئے۔ مگر ایک جوان نمرگ جو میرے سامنے تھا وہ نہ بھاگ سکا اور غرانے لگا۔ میں اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اس کی طرف جانے لگا تو دو قدم پیچھے ہٹا اور پھر الاؤ پھلانگتا ہوا وہ بھی بھاگ نکلا۔

اب میں غار میں تنہا کھڑا تھا۔

نمرگ واپس بھی آ سکتے تھے اور اپنے ساتھ بہت سے بھائی بند بھی لا سکتے تھے اس لیے میں نے جلدی سے ایک کلہاڑا اور ڈنڈا منتخب کیا اور الاؤ کے دوسری طرف بیٹھ کر وہ گوشت کھانے لگا جو بھننے کے بعد ہڑبونگ میں الاؤ کے قریب ہی گر پڑا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کس جانور کا گوشت ہے مگر اس وقت وہ مجھے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم محسوس نہ ہوا۔ میں نے ڈٹ کر کھایا، پیٹ بھرا تو میری ہمت و قوت بھی لوٹ آئی۔ اب میں ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔

اس وحشی دَور میں آنے کے بعد اگرچہ بدترین وقت گزر چکا تھا مگر میں جانتا تھا کہ درندے کہیں دُور اندھیرے میں اور نمرگ غار کے باہر کھڑے میری جانب دیکھ رہے ہیں۔ درندے خوفناک آوازوں کے ساتھ دھاڑ رہے تھے جبکہ نمرگ خاموشی سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ درندے آگ کے خوف سے اندر نہیں آ سکتے تھے مگر نمرگ نہ صرف اندر آ سکتے تھے بلکہ باہر سے پتھراؤ بھی کر سکتے تھے لیکن یہ رات تو بہرحال مجھے یہاں گزارنا ہی تھی۔ گوشت کھانے کے بعد میں نے پانی کے لیے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی مگر وہاں کوئی برتن نہیں تھا البتہ مجھے کسی جانور کی کھال کا ایک ٹکڑا اور سوکھی بیلوں کا ایک ڈھیر ضرور دکھائی دے گیا۔ میں نے وہ کھال لنگوٹ کی طرح سوکھی جنگلی بیل سے باندھ لی۔ ہر چند کہ میں وحشی دَور میں تھا مگر تہذیب میرے لاشعور میں اتنی رچ بس چکی تھی کہ میں ایسا کرنے کے لیے مجبور ہو گیا تھا۔

اب مجھے نیند محسوس ہونے لگی مگر یہ نیند مجھے ہمیشہ کے لیے بھی سُلا سکتی تھی اس لیے میں ایک کونے میں بیٹھ کر نیند کو بھگانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں بار بار اپنی آنکھیں ملتا اور رانوں پر زور زور سے چٹکیاں لیتا تھا لیکن نیند جیسے آنکھوں کی منڈیروں پر آ بیٹھی تھی۔ میری آنکھیں اپنے آپ بند ہونے لگتیں مگر میں انھیں زبردستی کھول لیتا اور جماہیاں لینے لگتا تھا۔

ایک بار میں نے آنکھیں کھول کر جماہی لی تو یہ دیکھ کر مجھے جھرجھری آ گئی کہ وہ میرے سامنے کھڑی تھی... اور مجھے گھور رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں غصے کی بجائے خوف کی پرچھائیاں

تیر رہی تھیں۔

وہ ایک جوان نرگ تھی۔ وہ میری طرف دیکھنے کے ساتھ ساتھ پلٹ کر پیچھے اندھیرے میں بھی دیکھ لیتی تھی اور بادلِ نخواستہ کچھ آگے بڑھ آتی تھی پھر وہ مجھے اپنی طرف بُلانے لگی۔

اس کی حرکات دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی اور میں سمجھ گیا کہ نرگوں نے اسے رشوت کے طور پر بھیجا ہے لیکن پھر میں نے خود ہی اپنی یہ سوچ رُد کردی کیونکہ نرگ کی ذہنی استعداد میرے سامنے تھی، یہ وحشی مخلوق ابھی انسانوں کی سوچ، بالخصوص اس گھٹیا سوچ تک نہیں پہنچ سکی تھی جس کے تحت وہ ہمارے دَور اور دُنیا میں اس قسم کی رشوت دیتے لیتے ہیں۔ اس نرگ خاتون کو غالباً پہلی نظر کی محبت کا جذبہ میری طرف کھینچ لایا تھا۔

میں مسکراتا اور اس سے باتیں کرتا رہا۔

وہ میری باتیں تو کیا خاک سمجھتی مگر بڑے پیار سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں کبھی اُس سے پیار بھرے مکالمے بولنے لگتا اور کبھی ڈاکٹر فریدوں کو کوسنا شروع کردیتا جس نے لالہ رُخ کو مجھ سے برگشتہ کرکے اس وحشی مخلوق کو میری محبت میں مبتلا کردیا تھا۔

نرگ خاتون کی آمد سے میری نیند اُڑ گئی اور وقت گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا جب غار کے باہر صبح کاذب کا اُجالا پھیلنے لگا تو وہ اُٹھی اور چپ چاپ غار سے باہر چلی گئی۔

میں کچھ دیر وہیں بیٹھا آگ تاپتا رہا اور جب باہر اچھا خاصا اُجالا پھیل گیا تو میں کلہاڑا اور ڈنڈا لیے غار کے دہانے پر پہنچ گیا۔

میرے سامنے تقریباً نصف میل دُور سُرخ گھاس کا سمندر پھیلا ہُوا تھا۔ پہاڑیوں میں جگہ جگہ بنے ہُوئے غار شہد کے کسی چھتے کی یاد دلا رہے تھے اور ہر طرف قبرستان کی سی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

میں جانتا تھا کہ نرگ اِدھر اُدھر غاروں میں چھپے ہوئے مجھے دیکھ رہے ہوں گے مگر وہ میرے سامنے نہیں آرہے تھے۔ میں وہاں سے چل پڑا۔ میرا جی چاہا کہ کسی غار میں جاکر دیکھوں مگر پھر میں نے یہ ارادہ ملتوی کردیا۔ خواہ مخواہ بھِڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے سے کیا فائدہ تھا۔

ایک غار کے سامنے سے گزرتے ہُوئے میں رُکنے پر مجبور ہوگیا۔

اس غار کے باہر مجھے سُرخ مٹی کی بنی ہُوئی ایک بھدی سی انگیٹھی دکھائی دے گئی۔ اس انگیٹھی کے ساتھ جنگلی بیل کی بٹی ہوئی رسّی بھی بندھی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کانگڑی کی طرح اُٹھایا جاسکتا ہے۔ انگیٹھی کے قریب کچھ بھدے سے آلات بھی رکھے ہوئے دکھائی دیے ان میں کچھ کھُردرے سے پتھر، سوئی کی طرح نوکیلی ہڈیاں، پتھر کی سان اور ہتھوڑے وغیرہ شامل تھے۔ میں نے بیٹھ کر ان اشیا کا جائزہ لیا تو مجھے چقماق کے کچھ ٹکڑے اور چقماق کا بنا ہُوا ایک دو دھاری بھدا سا چاقو بھی نظر آگیا۔

میں نے چاقو اور انگیٹھی اُٹھالی۔

انگیٹھی میں راکھ بھری ہوئی تھی۔ میں نے اُسے اُلٹ دیا۔ راکھ میں کچھ انگارے موجود تھے، میں نے انھیں دوبارہ انگیٹھی میں ڈالا اور کانگڑی کی طرح لٹکا کر چل دیا۔ تاہم میں اس غیر معمولی ذہین نرگ کا شکریہ ادا کرنا نہ بھُولا جو اس وحشی اور غیر مہذب دَور میں شاید لوہار کا کام کرتا تھا اور نرگوں کے لیے ہتھیار بناتا تھا اس کی یہ کانگڑی مجھے سردی سے بچا سکتی تھی اور چاقو بھی بوقتِ ضرورت کام دے سکتا تھا۔

میں نے وہیں کھڑے ہوکر اطراف کا جائزہ لیا۔ جنگل میں واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور نرگوں میں مزید قیام بھی ناممکن تھا اس لیے میں نے پہاڑیوں کے دوسری طرف جانے کا فیصلہ کرلیا اور چڑھائی چڑھنے لگا جو نصف گھنٹے میں مکمل ہوگئی۔

میں نے پہاڑی کی چوٹی سے نیچے دیکھا۔ میرے سامنے ایک وسیع میدانی علاقہ تھا جس میں جا بجا پہاڑی نالوں کی گزرگاہیں دکھائی دے رہی تھیں مگر اُن کے کسی گڑھے میں بھی پانی نظر نہ آیا۔ میں آگے بڑھنے لگا۔

چند گھنٹوں کی مسافت مجھے ایک ایسے جنگل کے کنارے لے آئی جو میرے دائیں بائیں تا حدِ نظر پھیلا ہُوا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہُوئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ شام سے پہلے پہلے بارش شروع ہوجائے گی۔۔۔ مگر اس جنگل میں داخل ہونے سے مجھے ڈر سا لگ رہا تھا کیونکہ وہاں نہ تو پرندوں کی چہکار تھی اور نہ ہی درندوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہر طرف ایک مہیب اور بے کراں سناٹا طاری تھا۔ البتہ جب ہُوا درختوں کے بیچ سے گزرتی تھی تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے عورتیں قبروں کے سرہانے کھڑی اپنے پیاروں کی یاد میں سسکیاں لے رہی ہوں۔

میں چلتے وقت بچا کھُچا گوشت بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ایک جگہ بیٹھ کر میں نے وہ گوشت کھایا اور جنگل کے باہر ہی ایک طرف بڑھنے لگا کیونکہ جنگل میں کسی بھی درخت کی اوٹ میں موت گھات لگا سکتی تھی لیکن پھر میں نے جنگل میں داخل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔۔۔ مگر مشکل یہ تھی کہ جنگل کے کنارے والے درختوں پر عجیب سی گھنی گھنی بیلیں یوں چڑھی ہوئی تھیں جیسے ان کا جال تان دیا گیا ہو۔ سارے درخت اسی جال میں جکڑے دکھائی دے رہے تھے۔ تو خیر ایک جگہ مجھے اندر گھُسنے کے لیے ایک چھوٹا سا موکھا مل گیا۔ میں نے کلہاڑے اور چاقو سے بیلیں کاٹیں اور راستہ بناتا ہُوا آگے بڑھنے لگا۔

یوں تو اس گھنے جنگل میں خاصا اندھیرا تھا مگر جب وہ گہرا ہوگیا تو میں نے اندازہ لگایا کہ شام ہوگئی ہے اور اب مجھے سونے کا ٹھکانہ ڈھونڈ لینا چاہیے۔ تھوڑی دُور آگے بڑھنے پر مجھے ایک چھوٹا سا صاف قطعہ اراضی دکھائی دیا۔ میں نے وہیں رات گزارنے کا ارادہ کرلیا۔

اب میرے پاس نہ تو کھانے کے لیے کچھ تھا اور نہ ہی پینے کو پانی تھا۔۔۔ پھر مجھے رات کو آگ جلانے کے لیے خشک لکڑیاں بھی درکار تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو مجھے کچھ خشک جھاڑیاں اور درخت دکھائی دے گئے۔ میں ان کی ٹہنیاں کاٹنے کے لیے اُدھر گیا تو مجھے قریب ہی کہیں ایک نالہ بہنے کی آواز آئی۔ میں آواز کی سمت بڑھا تو واقعی مجھے ایک چھوٹی سی ندی دکھائی دی جس کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ میں جلدی جلدی نہایا اور پیاس بجھانے کے بعد لکڑیاں جمع کرنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اب میرا رزق کہاں سے اُترے گا۔

جب میں اُس صاف جگہ انگیٹھی جلانے لگا تو مجھے اپنے عقب میں کچھ کھٹکا سا محسوس ہُوا۔ میں نے جلدی سے وہ چقماق والا چاقو نکال لیا مگر اس کا دستہ نہ ہونے کے باعث گرفت مضبوط نہیں کی جاسکتی تھی تاہم میں نے اُسے ممکنہ مضبوطی سے تھام لیا۔ اتنے میں مجھے یوں لگا جیسے کوئی جانور میرے قریب آگیا ہو۔ اس کا اندازہ مجھے اس کی کھال سے خارج ہونے والی بُو سے ہُوا تھا۔ میں ایک دم تیزی سے گھوم گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ نرگ قسم کا کوئی جانور نما آدمی ہوگا مگر وہ ایک خرگوش نکلا تاہم یہ خرگوش بھی جسامت میں چھوٹی سی بھیڑ سے کم نہیں تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر نہ تو خوفزدہ ہُوا اور نہ ہی اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔۔۔ بلکہ اپنی لال لال آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ شاید اس نے پہلے کبھی مجھ جیسا آدمی نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ نتھنے پھڑکاتا اور سونگھتا ہُوا میرے قریب آگیا۔ میں نے ایک دم اُسے دبوچ کر اس کے گلے پر چاقو پھیر دیا۔

میں نے زندگی میں اس سے زیادہ آسان شکار کبھی نہیں کیا تھا۔

خرگوش ذبح کرنے کے بعد میں نے اپنے اِردگرد ایک حلقے میں لکڑیاں پھیلا کر آگ جلادی تاکہ کوئی جانور اندر نہ آسکے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بہت سی فالتو لکڑیاں بھی رکھ لیں تاکہ یہ اَلاؤ رات بھر جلتا رہے۔ پھر میں نے خرگوش کا کچھ گوشت بھُونا اور پیٹ کی آگ بجھانے کے بعد ایک خم دار ٹہنی سے سُوکھی بیل باندھ کر بھدی سی کمان بنائی اور بہت سے تیر بھی تراش لیے۔ ان تیروں کا سرا چاقو سے چیر کر میں نے اُن میں چھوٹے چھوٹے چقماق اَٹکا دیے۔۔۔ پھر الاؤ میں مزید لکڑیاں ڈال کر لیٹ گیا۔ اگرچہ جنگل میں اب بھی گمبھیر خاموشی تھی اور مجھے خرگوش کے سوا کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا تھا، تاہم لیٹتے وقت میں نے ایک ہاتھ میں کلہاڑے کا دستہ اور دوسرے میں ڈنڈا تھام لیا تھا۔

لیٹتے ہی مجھے گہری نیند آگئی۔

۔۔۔ پھر نہ جانے کیا ہُوا کہ مجھے اپنے سارے جسم میں سُوئیاں سی چبھتی ہُوئی محسوس ہُوئیں اور پورا جسم پھوڑے کی طرح دُکھنے اور دَرد کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے شدید کھُجلی بھی ہونے لگی۔ میں نے اپنی پنڈلیاں کھُجانا چاہیں تو مجھے اپنی ٹانگوں سے کچھ لجلجی سی چیزیں چپٹی محسوس ہُوئیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو خوف و دہشت سے میری چیخیں نکل گئیں۔ میرے اَنگ اَنگ سے لمبی لمبی جونکیں چمٹی ہُوئی میرا خون چُوس رہی تھیں۔

میں بڑی تیزی سے انھیں اپنے جسم سے نوچ نوچ کر پھینکنے لگا۔۔۔ مگر یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ پیٹھ سے چمٹی ہُوئی جونکیں نوچنا میرے بس سے باہر تھا اور اب تک وہ میرا اتنا خون پی چکی تھیں کہ مجھے نقاہت کا احساس ہونے لگا تھا۔ اگر میں گزشتہ رات کا جاگا ہُوا اور دن بھر کا تھکا ماندہ نہ ہوتا تو شاید مجھے اتنی گہری نیند نہ آتی۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ درد کی وجہ سے میری آنکھ بروقت کھُل گئی۔

میں نے پیٹھ سے چمٹی ہُوئی جونکوں سے پیچھا چھُڑانے کے لیے اَلاؤ سے جلتی ہُوئی ایک لکڑی اُٹھالی اور اُسے اپنی پیٹھ پر پھیرنے لگا۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہُوئی اور جونکوں سے نجات مل گئی۔

میری پیٹھ پر اتنی جونکیں تھیں کہ جلتی ہُوئی لکڑی سے میری پیٹھ کہیں کہیں سے معمولی طور پر جلی ورنہ جونکیں ہی اس کا شکار ہوتی رہیں۔

مجھے جونکوں پر اتنا زیادہ غصہ تھا کہ اُنھیں اپنے پیروں تلے روندنے لگا مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ بڑی تیزی سے زمین میں سوراخ کرتی ہوئی غائب ہوتی جارہی تھیں۔ اِن اَرضی جونکوں کا ذکر بھی میں نے کسی کتاب میں نہیں پڑھا تھا

اور اب یہ بھی دیو مالائی داستانوں کی مخلوق ہی معلوم ہوتی تھیں۔

میں نے اپنے جسم کا جائزہ لیا تو مجھے اس پر گرمی دانوں کی طرح سینکڑوں نشانات نظر آئے۔ ہر نشان جونکوں کی نشانی تھا۔ میں گرتا پڑتا اس ندی کی طرف بھاگا جہاں میں کل شام نہایا تھا۔ ٹھنڈے پانی نے میرے جسم کی جلن اور خارش تو مٹا دی... مگر نقاہت دُور نہ کر سکا۔ یہ نقاہت صرف خوراک ہی ختم کر سکتی تھی۔ گزشتہ رات میں نے جو خرگوش شکار کیا تھا، ابھی اُس کا تین چوتھائی گوشت باقی تھا۔ میں واپس آیا اور اُسے بھوننے میں مصروف ہو گیا۔

پیٹ بھرنے کے بعد میں نے ایک لمبی سی شاخ کے ساتھ چاقو باندھ کر بھدا سا بھالا بنا لیا اور خشک بیلیں تلاش کرنے لگا تاکہ اُن کا جھولا بنا کر کسی درخت سے باندھ سکوں اور رات کو اُسی جھولے میں سویا کروں۔

اُس رات، دن بھر کے سفر کے بعد میں جھولے میں سویا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ جنگل کسی پہاڑ کی ڈھلان پر واقع ہو۔ اس لیے کہ میرا سفر بتدریج چڑھائی کی طرف جاری تھا۔ گزشتہ تین روز کے دوران اندازاً میں تین ہزار فٹ اونچائی پر پہنچ چکا تھا۔ اس عرصے میں، میں نے نئے سرے سے تیر کمان اور بھالا بنا لیا تھا اور تین خرگوش شکار کیے تھے لیکن اس جنگل میں مجھے کبھی کسی پرندے کی چہکار یا درندے کی دھاڑ سنائی نہیں دی تھی اور قبروں کا سا ہولناک سناٹا میری روح پر بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ مگر چوتھی صبح میری آنکھ کوؤں کی سی کائیں کائیں سے کھلی۔

میں کائیں کائیں کی ان آوازوں سے بھی خوفزدہ ہو گیا۔ کیونکہ یہ کوؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھاری، تیز اور سمع خراش تھیں۔ تاہم میں ان پرندوں کو دیکھنے کے اشتیاق میں آنکھیں ملتا ہوا آگے چل پڑا۔

ابھی میں تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ مجھے وہ پرندے نظر آ گئے، یہ کوّے نہیں بلکہ بڑی بڑی خمدار چونچوں والے آبی پرندے تھے۔ ایک پرندے کی چونچ میں مجھے خاصی بڑی ایک مچھلی بھی دکھائی دی۔ جب میرے جذبۂ تجسس کی تسکین ہو گئی تو میں ٹھہر گیا اور ایک مقام پر اپنا ناشتہ تیار کرنے لگا۔ شاید اُن پرندوں کو بھی میری موجودگی کا احساس ہو گیا تھا اس لیے وہ ایک دائرے میں میرے سر پر اڑنے لگے تھے۔

ان پرندوں کی بڑی تعداد بتاتی تھی کہ کہیں قریب ہی کوئی دریا یا جھیل ضرور ہو گی جس کے آس پاس کسی آبادی کا امکان بھی تھا اور یہ آبادی میرے لیے یقینی خطرہ تھی۔ لہٰذا اس روز میں نے بڑی احتیاط سے سفر کیا۔

تیسرے پہر میں ایک ایسے راستے پر آ نکلا جو شاید کافی عرصے سے زیرِ استعمال نہیں تھا۔ تاہم یہ راستہ مجھے چوکنا کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں تقریباً آدھ گھنٹے تک جھاڑیوں میں چھپا اس کا جائزہ لیتا رہا... پھر اللہ کا نام لے کر اسی پر چل پڑا۔

یہ راستہ آگے جا کر اچانک ایک کھائی میں اُتر گیا۔

جب میں کھائی عبور کر کے دوبارہ اوپر چڑھنے لگا تو دائیں ہاتھ کا موڑ مڑتے ہی جو نظارہ مجھے دکھائی دیا، اُس نے میرے قدم وہیں روک لیے۔

میرے سامنے کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا سنگی بُت ایستادہ تھا۔

اس بُت کی اونچائی کم از کم دو سو ہاتھ تھی۔ اس کی تخلیق انسانی ہاتھوں کی مرہونِ منت تھی اور بنانے والے کوئی معمولی انسان نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ یہ مجسمہ سازی کا ایک اچھوتا نمونہ تھا۔ مجسمے کی ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں اور ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے جہاں سے میں اُسے دیکھ رہا تھا، وہاں سے اس کی پشت دکھائی دیتی تھی۔ اس کا رُخ دوسری جانب تھا۔

میں مجسمے کا چہرہ دیکھنے کے لیے کاٹ کاٹ کر سامنے پہنچا تو دہشت کی ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اُتر گئی مجسمے کا آدھا چہرہ ایک نقاب سے ڈھکا ہوا تھا لیکن آنکھیں اور کھوپڑی دکھائی دے رہی تھی اور یہ دونوں چیزیں کسی مُردے کی کھوپڑی اور آنکھوں سے مشابہت رکھتی تھیں مجسمے کے نقاب پر بھی مُردے کی کھوپڑی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے موت مجسم و منجمد ہو کر اسی چٹان پر کھڑی ہو گئی ہو۔

میں نے اِردگرد دیکھا۔ وہاں میرے سوا کوئی ذی رُوح نہیں تھا۔

ہر طرف گمبھیر سناٹا تھا۔

وہ آبی پرندے اور اُن کی آوازیں بھی جیسے ابدی خاموشی میں معدوم ہو گئی تھیں۔

میں کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا پھر میں نے مجسمے کو قریب سے دیکھنے کا فیصلہ کر لیا اور چٹان پر چڑھنے لگا۔ مجسمے کے ٹخنے میں مجھے ایک دروازہ نظر آیا۔ میں نے ایک ہاتھ میں برچھا اور دوسرے ہاتھ میں چاقو سنبھالا اور اُس دروازے میں داخل ہو گیا۔

اندر خاصا اندھیرا تھا۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا یہاں تک میری آنکھیں اس اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئیں میرے سامنے ایک چکردار تنگ زینہ تھا۔ دیواروں سے ویسی ہی سیلن آ رہی تھی جو طویل عرصے تک بند پڑے رہنے والے مکانوں یا قبروں سے آتی ہے۔

میں زینہ چڑھنے لگا۔ تقریباً بیس سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک چھوٹا سا کمرہ ملا جو غالباً مجسمے کے گھٹنے میں بنایا گیا تھا۔

میرے سامنے ایک مُردے کا پنجر پڑا تھا۔

میں نے اپنے برچھے سے اُسے چھوا تو پنجر کی ہڈیاں خاک کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئیں۔

شاید اُسے مرے ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔

مجسمے کے چہرے تک پہنچتے پہنچتے مجھے دو اور کمرے ملے ہر کمرے سے قدرے کشادہ تھے۔

ہر کمرے میں ویسے ہی پنجر بھی ملے مگر کوئی ہتھیار، کوئی زیور یا کوئی قیمتی چیز نہ ملی۔

چوتھے کمرے میں خاصی روشنی تھی یہ روشنی مجسمے کی آنکھوں سے اندر آ رہی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس کمرے میں قربان گاہیں نظر آئیں۔

ہر قربان گاہ پر ایک ایک بہت بڑی کتاب کھلی رکھی نظر آئی۔ میں نے ایک کتاب کو چھوا تو وہ بھی خاک میں بدل گئی۔ یہ کتابیں تھیں، انھیں کس نے لکھا تھا اور ان میں کیا لکھا گیا تھا ان سوالوں کے جواب مجھے کسی سے نہیں مل سکتے تھے وقت کے طویل سفر نے ہر چیز کو فرسودگی اور اسرار کی دبیز گرد میں دفن کر دیا تھا... سوچوں نے پھر میرے ذہن پر یلغار کر دی۔ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے اس دورِ وحشت میں اتنا بڑا مجسمہ تعمیر کیا؟ ہو سکتا ہے ہم سے پہلے تہذیب، ارتقا کی منزلیں طے کر چکی ہو۔ وہ لوگ پڑھے لکھے ہوں گے، تبھی تو یہ کتابیں یہاں رکھی ہیں۔ وہ کسی کی عبادت بھی کرتے ہوں گے۔ ممکن ہے، یہ مجسمہ اُسی دیوتا کا ہو... مگر ان لوگوں پر کیا بیتی؟ اُن کی نسلیں کیسے معدوم ہوئیں؟

میری سوچوں کا سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہتا کہ آبی پرندوں کی کرخت آوازوں نے مجھے چونکا دیا۔

میں آگے بڑھ کر مجسمے کی آنکھوں سے باہر دیکھنے لگا۔

سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک پیالہ نما جھیل چمک رہی تھی پرندے اُس پر پرواز کرتے ہوئے مچھلیاں پکڑ رہے تھے... مگر میں اُن پر زیادہ دیر توجہ نہ دے سکا۔ میری نگاہیں اُن گھروں کا جائزہ لینے لگیں جو جھیل میں تیرتے ہوئے تختوں پر بنائے گئے تھے۔ کچھ گھروں سے تھوڑا تھوڑا دھواں اُٹھ رہا تھا۔

اچانک میری نگاہ ایک عورت پر پڑی جو مٹی کے ایک بڑے برتن میں مُوسل سے کچھ کُوٹ رہی تھی۔

میں نے غور سے دیکھا تو مجھے وہ عورت نرگ نسل سے کچھ بہتر نسل کی معلوم ہوئی۔ اس نے کھال کے ٹکڑوں سے ستر پوشی کر رکھی تھی۔ تیرتے تختوں پر بنے ہوئے یہ جھونپڑے بھی اس خیال کی تائید کرتے تھے کہ یہ نسل نرگوں سے زیادہ تہذیب و ترقی یافتہ ہے۔ اگر ڈاکٹر فریدوں یہ نسل دیکھتا تو اسے بن مانس سے تعبیر کرتا یا اس کا کوئی ایسا نام بتاتا جسے زبان مشکل ہی سے ادا کر پاتی۔

یہ نسل پتھروں اور لکڑیوں کے ہتھیار استعمال کرتی تھی... کاشت کاری سے بھی آشنا تھی کہ جھیل سے جنگل تک کوئی فصل لہلہاتی دکھائی دے رہی تھی۔ جھیل کے کنارے سے گھروں تک جانے کے لیے چھوٹی چھوٹی گول کشتیاں استعمال کی جا رہی تھیں۔ میں جھیل کی طرف جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ ناگاہ میری نظر کھیتوں میں کام کرنے والے ایک گروہ پر پڑ گئی اور میں نے وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ یہ نسل نرگوں سے کہیں زیادہ ظالم اور خونخوار تھی۔

یہ بن مانس قسم کے لوگ کھیتوں میں غلاموں سے کام لے رہے تھے۔ ان غلاموں میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی سارے غلام ستر پوشی سے محروم تھے۔ عورتوں میں جوان بھی تھیں اور بوڑھی عورتیں بھی تھیں۔ بن مانس نما نگران کھیتوں میں کام کرنے والوں پر کوڑے برسا رہے تھے مگر یہ دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ وہ مرد غلاموں کو تو کبھی کبھار یا ایک آدھ ہی کوڑا مارتے تھے مگر عورتیں مسلسل اُن کے تشدد کا نشانہ بن رہی تھیں... اور پھر اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ غلام عورتیں اور مرد میری طرح مکمل انسان تھے۔ نرگ یا بن مانس نہیں تھے۔

کھیتوں میں پرندوں کو ڈرانے کے لیے انھوں نے ڈنڈے پر ہانڈی نہیں لٹکائی تھی بلکہ مُردہ غلام کھمبوں کے ساتھ باندھ دیے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا خون کھول اُٹھا مگر اس کے ساتھ ہی خوف سے جھرجھری بھی آ گئی۔

اتنے میں کھیتوں میں کام کرنے والی ایک عورت گر پڑی۔ ایک بن مانس نما نگران اس کی طرف لپکا اور اس پر کوڑے

برسانے لگا۔ وہ بے چاری بمشکل تمام اُٹھی اور پھر گر پڑی... اور اس بار ایسی گری کہ دوبارہ نہ اُٹھ سکی۔ نگران نے جھک کر اس کا جائزہ لیا اور ساتھیوں کو بلانے لگا۔ وہ اُدھر گیا تو ایک غلام لڑکی جو کم عمر اور کافی خوبصورت تھی، کھیت سے جنگل کی طرف کھسکنے لگی۔ شاید وہ وہاں سے فرار ہونا چاہتی تھی۔ یہ سوچ کر میرا دل کانپ گیا کہ اگر اُن ظالم نگرانوں نے اُسے بھاگتے دیکھ لیا تو کوڑے مار مار کر اس کے پرخچے اُڑا دیں گے... مگر مجھے یہ دیکھ کر کچھ اطمینان ہو گیا کہ وہ دونوں نگران اس مردہ عورت کو گھسیٹ کر ایک خالی کھمبے کی طرف لے جا رہے تھے تاکہ اُسے باندھ کر پرندوں کو ڈرانے کا کام لے سکیں۔

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اب وہ کھیت سے نکل کر تیزی سے جنگل کی طرف دوڑ رہی تھی۔ اتنے میں بن مانس نما نگران کی نگاہ اُس پر پڑ گئی۔ وہ لاش چھوڑ کر اس کی طرف دوڑے۔ ان کی رفتار لڑکی سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ میں لاشعوری طور پر چیخ اُٹھا: "بھاگو... اور تیزی سے بھاگو، لڑکی!"

...اور پھر مجھے اپنی اس حرکت پر خود ہی ہنسی آ گئی۔

اب لڑکی جنگل سے تقریباً سو گز دُور رہ گئی تھی لیکن بن مانس ہر لمحہ اس کے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ میری دھڑکنیں بھی ہر لمحے بڑھتی جا رہی تھیں۔ اُس وقت تو مجھے اپنا دل مٹھی میں بند ہوتا محسوس ہونے لگا جب بن مانس لڑکی کے بالکل قریب پہنچ گئے اور اُن میں سے ایک نے اُسے بڑے زور سے کوڑا مارا۔

لڑکی گر پڑی۔

دونوں بن مانس بھی خود کو نہ روک سکے، وہ لڑکی سے ٹکرائے اور خود بھی گر پڑے۔ اتنے میں لڑکی اُٹھی اور راستہ بدل کر جنگل کی طرف بھاگنے لگی۔ بن مانس بھی تیزی سے اُٹھے لیکن اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے آپس میں ٹکرا گئے۔ میرا دل یہ منظر دیکھ کر خوشی سے بھر گیا۔ لڑکی کو تھوڑی سی مہلت مل گئی تھی اور وہ نگرانوں کے رفتار پکڑنے سے پہلے ہی جنگل کے کنارے پہنچ گئی تھی۔

"شاباش! نکل جاؤ لڑکی!" میں ایک بار پھر بے ساختہ چیخ پڑا۔ مگر یہ دیکھ کر میرا دل بجھ سا گیا کہ جنگلی بیلوں کی وجہ سے لڑکی کو جنگل میں جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا اور بن مانس پھر اُس کے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔

اب لڑکی کبھی اِدھر بھاگتی تھی اور کبھی اُدھر جاتی تھی یہاں تک کہ اس میں اور نگرانوں میں بمشکل بیس قدم کا فاصلہ رہ گیا۔ نگرانوں نے فاتحانہ نعرہ لگایا۔ لڑکی کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی اور پھر میری حیرت زدہ آنکھوں نے دیکھا کہ لڑکی نے پوری قوت سے زقند بھر کر آگے چھلانگ لگا دی تھی۔

وہ بیلوں کا جال توڑتی ہوئی جنگل میں داخل ہو گئی۔ نگران بھی اب بیلوں تک جا پہنچے تھے۔ میری آنکھیں ایک بار پھر حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بن مانس بیلوں کے اندر جانے کی بجائے وہیں رُک گئے تھے اور آپس میں تبادلۂ خیالات کرنے لگے تھے۔

میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ وہ جنگل میں داخل کیوں نہیں ہوئے اور لوٹ کیوں گئے ہیں؟

غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے بن مانس نگران کھیت میں کام کرنے والے غلاموں کو چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بھر کر جھیل کے کنارے بڑے تختے پر بنے ہوئے ایک کشادہ جھونپڑے میں لے گئے اور کچھ مرد غلام اُن کے لیے کھانا لانے لگے۔

ایک ایسا ہی مرد غلام جب دوسرے جھونپڑے میں داخل ہوا تو بن مانسوں کی قبیل کی دو عورتیں اُس کی طرف یوں لپکیں جیسے وہ اُن کا محبوب رہا ہو۔ تب میں نے اندازہ لگایا کہ اس مخلوق میں غالباً مردوں کی کمی ہے اسی لیے مرد غلاموں کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جاتا ہے۔

وہ رات میں نے مجسمے کے سر والے کمرے میں بسر کی۔ صبح دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ جُوں جُوں میں آگے بڑھ رہا تھا، جنگل دوبارہ گھنا ہوتا گیا۔ دن بھر کے سفر میں مجھے کوئی خرگوش بھی نظر نہیں دیا۔ تاہم ابھی میرے جھولے میں پہلے خرگوشوں کا کافی گوشت موجود تھا جو دو تین روز تک میرے پیٹ کی آگ بجھا سکتا تھا۔

دن کے تیسرے پہر میں ایک چشمے پر پہنچا تو پانی پینے اور سستانے کے لیے رُک گیا۔ چشمے کا پانی نمکین تھا اور بعد میں پانی خشک ہونے کے بعد وہاں نمک جم کر رہ گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہاں کہیں جانور ہوں گے تو پانی پینے ضرور آتے ہوں گے، چنانچہ چھپ کر بیٹھ گیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد چھوٹے قد کا ایک ہرن وہاں آیا اور پانی پینے لگا۔

یہ ہرن جسامت میں سیامی بلی سے کچھ ہی بڑا تھا۔ میں اسے بآسانی شکار کر سکتا تھا مگر میں نے اُسے ہلاک نہیں کیا۔ جب وہ جانے لگا تو کچھ فاصلے سے اس کا پیچھا کرنے لگا۔

تھوڑی دُور جا کر وہ اپنے گلّے میں مل گیا۔

ہرنوں کا گلّہ دیکھ کر میری یہ فکر دُور ہو گئی کہ اب میں بھوکا مروں گا۔ اتنے میں سارے ہرن ایک جانب دیکھنے لگے اور پھر وہاں سے بھاگ نکلے۔ میں نے اُدھر دیکھا لیکن مجھے کوئی ذی رُوح دکھائی نہ دیا۔

میں آگے چل پڑا۔

جنگل میں ہر جگہ ہرنوں کے کھُروں کے نشانات موجود تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں جب چاہوں گا، ضرورت کے مطابق شکار کر لوں گا۔

غروبِ آفتاب سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہو۔ جنگل کے سناٹے میں مجھے اپنے پیچھے کھٹکا سا سنائی دیا تو میں چونک گیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا مگر درختوں کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

اگرچہ دوبارہ مجھے کوئی آواز یا کھٹکا سنائی نہیں دیا تھا مگر میری چھٹی حِس مجھے یقین دلا رہی تھی کہ کوئی میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔

جب شام اُتری تو میں نے ایک مقام پر الاؤ روشن کر لیا اور جنگلی بیلوں سے دو تین پھندے بنا کر راستے میں اس طرح رکھ دیے کہ اگر کوئی انسان میرا تعاقب کر رہا ہو تو وہ یہ پھندے دیکھ نہ سکے۔ جب شام کا اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تو میں الاؤ سے ہٹ کر اندھیرے میں چھپ گیا۔

میں جانتا تھا کہ اگر تعاقب کرنے والا انسان ہے تو وہ پھندوں سے بچ کر وہاں سے گزرے گا جہاں اس وقت میں پہنچ گیا تھا۔ وہاں بھی میں نے دو تین پھندے لگائے اور پھر الاؤ کے پاس آ کر گوشت بھوننے لگا۔

گوشت بھوننے میں، میں نے جان بُوجھ کر زیادہ دیر لگائی کیونکہ اُس کی بُو دُور تک پھیلتی ہے۔ احتیاطاً میں نے جنگل کی طرف اپنا رُخ رکھا تاکہ وہاں سے کوئی مجھ پر حملہ آور نہ ہو سکے۔ میں نے اپنے اِردگرد مزید دو تین الاؤ بھی جلا دیے اور گوشت کھانے کے بعد یوں سر جھکا کر بیٹھ گیا جیسے نیند مجھ پر غالب آ گئی ہو... میرے ہتھیار میری دسترس میں تھے۔

اس حالت میں بیٹھے بیٹھے مجھے تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا اور اب نیند سچ مچ مجھ پر غالب آنے لگی تھی۔ میں سونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اتنے میں پہلے کھٹکا ہوا پھر ایک ہلکی سی چیخ نے مجھے بتا دیا کہ میرا تعاقب کرنے والا اس پھندے میں پھنس گیا ہے جو میں نے اندھیرے میں لگایا تھا۔ میں نے جلدی سے ایک جلتی ہوئی لکڑی اُٹھائی، ایک ہاتھ میں بھالا تھاما اور دوسرے میں چاقو لیے اُس طرف لپکا تاکہ اپنے دُشمن کو پہلے ہی ریلے میں ختم کر دوں مگر جونہی میں نے اپنا بھالا تولا، جلتی ہوئی لکڑی کے لرزتے شعلے میں مجھے اس کی جھلک دکھائی دے گئی۔

یہ وہی لڑکی تھی جو کل کھیت سے فرار ہوئی تھی۔

وہ پھندے میں پھنس کر سر کے بل درخت کی شاخ سے لٹکی ہوئی تھی۔

میں اس کا بھرپور جائزہ لینے کے لیے آگے بڑھا تو اُس نے اپنے ناخنوں سے میرا مُنہ نوچ لینا چاہا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اُس نے مجھے کوستے ہوئے مجھ پر تھوک دیا۔ میں سوچنے لگا کہ اب اس کا کیا کروں؟ اگر وہ بن مانسوں کی قید سے فرار ہو کر جنگل میں سفر کر رہی ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی منزل بھی ضرور ہو گی۔ اگر وہ مجھے اپنا ہمدرد اور دوست سمجھ کر مجھ پر اعتماد کر لے تو فرگ کی طرح میری رہنمائی کر سکتی ہے۔ اس دوران میں لڑکی اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کرتی اور گالیاں بکتی رہی۔ آخر وہ تھک ہار کر چُپ ہو گئی۔

میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ اس کی عمر بمشکل بارہ تیرہ سال تھی اور وہ بلاشبہ بے حد حسین تھی۔ میری نگاہیں اُس پر جم کر رہ گئیں۔

"کون ہو تم اور مجھے کیوں لٹکا رکھا ہے؟ تم اُن وحشیوں میں سے تو نہیں لگتے؟" وہ بولی۔

"وہ کون؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جن کے جسم پر بال ہیں۔ تم نہ تو اُن میں سے ہو اور نہ ہی ہم میں سے ہو۔"

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ جواب دینے کے بجائے کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی: "واقعی تم ہمیں نہیں جانتے؟"

"اگر میں جانتا تو تم سے کیوں پوچھتا۔"

"پہلے مجھے اس مصیبت سے نکالو پھر بتاؤں گی کہ میں کون ہوں۔" وہ تلملا کر بولی۔

میں بیلوں کا پھندا کاٹنے لگا۔

"یہ بڑی عجیب بات ہے کہ تم جمشیدیوں کو نہیں جانتے۔ ہم جمشیدی تو دُور سے جمشیدی نظر آتے ہیں۔ پہلے جمشیدی اسی علاقے میں رہتے تھے۔ ساری دُنیا انھیں جانتی ہے مگر تم کہتے ہو کہ تم جمشیدیوں کو نہیں جانتے۔"

مگر جونہی اس کا ایک پاؤں پھندے سے آزاد ہوا اور میں نے اُسے اُتارا تو وہ ایک دم تیزی سے بھاگی۔ شاید وہ یہ نہیں

جانتی تھی کہ دوسرے پاؤں کے پھندے کا ایک سرا میرے ہاتھ میں ہے۔ وہ چند قدم ہی گئی تھی کہ میں نے وہ سرا کھینچ لیا۔

وہ دھڑام سے گر پڑی۔

میں اُس کے قریب گیا تو وہ بلّی کی طرح میرا سینہ نوچنے لگی۔ میں نے اُس کی کنپٹی پر ہلکا سا ہاتھ مار کر اُسے بے ہوش کر دیا۔ بیلوں سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اُٹھا کر الاؤ کے پاس لے آیا۔ اُسے آرام سے آگ کے قریب لٹانے کے بعد میں دوبارہ گوشت بھوننے لگا۔ اس دوران میں، میں کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتا بھی رہا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور جب حواس میں آئی تو میں نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "پہلے میں بولوں گا اور تم غور سے سنو گی۔ پھر میری بات کا جواب دو گی۔ یاد رکھو اب میں حکم دوں گا اور تم اُس کی تعمیل کرو گی۔ بولو کیا کہتی ہو؟"

"ٹھیک ہے تم جو کہو گے، میں کروں گی۔"

"خوب۔ نام کیا ہے تمھارا؟"

"دیپا۔"

"مجھے جمشیدیوں کے بارے میں بتاؤ۔"

وہ بھونے جانے والے گوشت کی خوشبو سے بے تاب ہوتے اور رال ٹپکاتے ہوئے بولی: "میں بہت بھوکی ہوں۔ ان وحشیوں کی قید میں پچھلے ایک سال سے میں نے گوشت نہیں کھایا پہلے مجھے گوشت کھلاؤ، پھر سب بتا دوں گی۔"

میں گوشت کا پارچہ اُس کے سامنے ہلا کر خود کھانے لگا۔

وہ رال ٹپکاتی اور نفرت سے مجھے دیکھتی رہی۔

"پہلے تم بتاؤ گی اور پھر کھاؤ گی۔ اگر تم نے نہ بتایا تو تمھیں ایک بوٹی بھی نہیں ملے گی، حالانکہ میرے پاس بہت سارا گوشت موجود ہے۔"

وہ بڑے زور سے کسمسائی اور اپنے آپ کو بیلوں کی گرفت سے چھڑانے کی جدوجہد کرنے لگی... مگر جب ناکام ہو گئی تو بولی۔ "ٹھیک ہے۔ میں تمھارا حکم مان رہی ہوں... پھر بھی تم نے مجھے گوشت نہ کھلایا تو جب تم سو جاؤ گے، میں تمھیں قتل کر دوں گی۔"

"میں تمھیں گوشت ضرور کھلاؤں گا۔ مجھے اپنے قبیلے یا قوم کے بارے میں بتاؤ۔" یہ کہہ کر میں گوشت کا ایک بڑا پارچہ بھوننے لگا۔

"میں جمشیدی ہوں جو پہاڑوں پر رہتے ہیں۔ جمشیدیوں کی حکمران ایک عورت ہے جسے ملکۂ جم کہا جاتا ہے۔ وہ بہت بوڑھی اور قریب المرگ ہے۔"

میں نے سوچا کہ دیپا مجھے اس لا انتہا ہی جنگل سے نکا[ل] سکتی ہے۔ اگر جمشیدیوں کی کوئی ملکہ ہے تو وہ لوگ یقیناً تہذی[ب] سے آشنا ہوں گے۔ چنانچہ میں دیپا کا ایک ایک لفظ غو[ر سے] سنتا اور ذہن میں محفوظ کرتا رہا۔ جب وہ میرے تمام سوا[لوں] کے جواب دے چکی تو میں نے اُس کے ہاتھوں کی گرفت ڈ[ھیلی] کر دی اور بُھنا ہوا گوشت اس کی طرف بڑھا دیا۔

وہ بھوکوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی۔

جب وہ شکم سیر ہو چکی تو الاؤ کے قریب لیٹ گئی اور [میری] طرف دیکھتے ہوئے بولی: "میں نے تمھیں اپنے اور اپنی قوم [کے] بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب تم بھی مجھے اپنے بار[ے میں] بتاؤ کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ میرا خیال ہے کہ [تم] دُور دراز علاقے سے آئے ہو گے کیونکہ تم جمشیدیوں سے زیا[دہ] قد آور، توانا اور خوبصورت ہو۔"

"ہاں۔ میں بہت دُور سے آیا ہوں۔ اس جنگل [کے] درختوں کے جتنے پتے ہیں نا، اگر تم اتنے دن سفر کرو تو بھی و[ہاں] نہیں پہنچ سکو گی۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو تم بہت بوڑھے [ہوتے۔]" وہ بولی۔

"میں تو جادو کے ذریعے یہاں آیا ہوں، میرا نام سرفر[وش ہے۔]"

"سرفروش!" اُس نے دُہرایا۔

"ہاں۔ تمھاری زبان سے اچھا لگتا ہے۔" میں نے ک[ہا۔]

"مگر مجھے نہ تو تم اچھے لگتے ہو اور نہ ہی تمھارا نام... [جن] نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہو ان سے مجھے خوف آ[تا ہے۔] میں جانتی ہوں کہ تمھارے دل میں کیا ہے مگر میں اُسے کا[میاب] نہیں ہونے دوں گی۔"

بلاشبہ وہ بڑی تیز و طرار لڑکی تھی۔ بہر حال، میں اُس [پر] کوئی کمزوری عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس [کی] ضرورت تھی۔

"آئندہ مجھ سے اس لہجے میں بات نہ کرنا۔ مجھے ت[مھاری جسم] کی بھی ضرورت نہیں۔ میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہن[چاؤں گا] اور تمھیں اس وقت تک ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا جب [تک] تم خود ایسا نہیں چاہو گی۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ہم دو[ست کی] طرح ایک دوسرے کی مدد کریں تم میرے سوالوں کے جوا[ب دیتی] رہو اور میری رہنمائی کرتی رہو۔ اس کے بدلے میں تمھ[یں اپنی]

[ق]وم اور تمھارے گھر تک پہنچا دوں گا اس لیے کہ تم تنہا اس جنگل [م]یں سفر نہیں کر سکو گی۔ راستے میں پیش آنے والے خطروں کا مقابلہ نہیں کر سکو گی۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی: "تم ٹھیک کہتے ہو سرفروش [ر]استے میں کاشیوں سے سابقہ پڑے گا اگر ہم اُن کے ہتھے چڑھ گئے [تو] وہ تمھیں مار کر تمھارا گوشت کھا جائیں گے اور میرے ساتھ اتنا [ذ]لیل سلوک کریں گے کہ میں جانبر نہ ہو سکوں گی لیکن تمھیں ابھی [اس]سے متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی وہ ہم سے چار یوم کی [م]سافت پر ہیں۔ بہر حال، مجھے تمھاری دوستی کی پیش کش منظور ہے۔"

"تم خاصی سمجھ دار لڑکی ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اب جب ہم دوست بن گئے ہیں تو میرے ہاتھ پاؤں [ب]الکل آزاد کر دو۔ یا تمھارے وطن میں لوگ، دوستوں کے ساتھ [ا]یسا سلوک کرتے ہیں؟"

میں اس کی بات پر ہنس پڑا۔ "نہیں۔ ہمارے ہاں دوست [ا]یک دوسرے پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ مجھے تم پر اعتماد ہے اس [ل]یے میں تمھیں پوری طرح آزاد کیے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اُسے [ب]یلوں کی جکڑ بندی سے آزاد کر دیا۔

اُس نے بازو کے گرد لپٹی ہوئی بیل چھڑائی اور اچانک [ا]تنے زور سے میرے مُنہ پر ماری کہ میں اُلٹ کر گر پڑا اور جب [می]ں نے اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا تو وہ غائب ہو چکی تھی۔

یکایک اندھیرے سے اس کا قہقہہ سُنائی دیا پھر آواز [آئ]ی: "الوداع سرفروش... اور سنو... مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تمھارے [وط]ن میں بھی بے وقوف ہوتے ہیں۔"

اُس کے قہقہے دُور ہوتے چلے گئے۔

پہلے تو میں اُسے کوستا اور اپنی آنکھیں ملتا رہا... پھر مجھے [ا]پنے آپ پر ہنسی آ گئی۔ وہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ میں بے وقوف [ب]نا ہوا اس کی باتوں میں آ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ [جمش]یدی مکر و فریب میں ہم سے کم نہیں ہیں۔ ابھی میں انھی سوچوں [می]ں ڈوبا ہوا تھا کہ ناگاہ جنگل کے گمبھیر سناٹے میں ایک چیخ نما [دھ]اڑ گونج اُٹھی۔ آواز اتنی ہیبت ناک اور دہشت انگیز تھی کہ [میں] نے ڈراکیولا فلموں کی کسی ٹیپ پر بھی نہیں سُنی تھی۔ ہر چند [ی]ہ مہیب آواز میلوں دُور سے آئی تھی... مگر اس نے میرے [رو]نگٹے کھڑے کر دیے تھے اور میں خود بھی بے ساختہ اُٹھ کھڑا [ہو]ا۔ اس آواز میں زندگی اور موت کا تمام تر کرب اور عذاب [ش]امل ہوا تھا۔

میں کچھ دیر گوش بر آواز کھڑا رہا مگر جب وہ شیطانی چیخ دوبارہ سنائی نہ دی تو لیٹ گیا لیکن اب نیند میری آنکھوں سے بہت دُور جا چکی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد مجھے الاؤ کے پار پھیلے ہوئے اندھیرے سے دیپا کی آواز سُنائی دی: "سرفروش..."

آواز اتنی مدھم تھی کہ میں نے اسے اپنے تصور کا کرشمہ ہی سمجھا اور چُپ چاپ لیٹا رہا... مگر چند لمحے بعد پھر دیپا کی آواز آئی: "سرفروش۔ مجھے افسوس ہے۔ میں شرمندہ ہوں میں الاؤ کے پاس آنا چاہتی ہوں۔"

میں نے کروٹ بدل کر جماہی لی اور کہا: "تم واپس آنا چاہتی ہو؟ میرا خیال تھا کہ تم جنگل میں تنہا رہنا زیادہ پسند کرتی ہو۔"

"نہیں... مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"مگر تمھیں تو مجھ سے بھی ڈر لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں... لیکن جنگل میں اور زیادہ ڈر لگتا ہے۔ مجھے اپنے پاس آنے دو آقائے سرفروش۔"

"تم میری دوست نہیں ہو اس لیے میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ شب بخیر دیپا۔" یہ کہہ کر میں پھر سوتا بن گیا... مگر مجھے الاؤ کے باہر اُس کے چلنے اور حرکت کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ کچھ دیر بعد پھر اُس کی آواز آئی۔

"معاف کر دو، نا آقائے سرفروش! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے اور سردی بھی لگ رہی ہے۔ مجھے الاؤ کے پاس آنے دو نا۔"

"آ جاؤ... مگر مجھے پریشان مت کرنا۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔" میں نے بالآخر کہہ دیا۔

وہ آہستہ سے آئی اور پرے الاؤ کے پاس بیٹھ گئی۔ میں نے بظاہر اپنی آنکھوں کو بازو سے چھپا رکھا تھا مگر میں اُسے دیکھتا رہا۔ وہ پہلے آگ تاپتی رہی... پھر اُس نے ہاتھوں سے پورے جسم کی گرد اور بالوں سے پتے وغیرہ جھاڑے۔ اس کے بعد وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی میرے پیچھے آ گئی۔ میرا جی چاہا کہ آنکھوں سے بازو ہٹا کر اور کروٹ لے کر دیکھوں کہ وہ کیا کر رہی ہے مگر پھر میں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ چند لمحوں بعد میں نے اُس کا بازو اپنے بازو پر محسوس کیا۔ ساتھ ہی اُس کی آواز آئی: "آقائے سرفروش! کیا تم سو گئے؟"

"تم واپس کیوں آ گئیں؟" میں نے لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"میں جنگل میں ڈرتی اور سوچتی رہی کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے اور تم سچے ہو۔ اب ہم ایک دُوسرے کے دوست ہیں اور میں تم پر اعتماد کرتی ہوں۔"

"وہ آواز کیسی تھی؟" میں نے پوچھا۔

مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے اس بات سے اس پر کپکپی طاری ہو گئی ہو۔ وہ کسی خوفزدہ بچّے کی طرح میرے قریب آگئی اور بولی: "وہ کاشیوں کا نعرہ تھا۔ وہ رات کو شکار کھیلتے ہیں اور عام طور پر اپنے ٹھکانے سے زیادہ دُور نہیں آتے۔ البتہ جب اُن کے پاس غذا نہیں ہوتی تو وہ اتنی دُور بھی آجاتے ہیں... مگر اب مَیں اُن کا ذکر نہیں کرنا چاہتی مَیں صرف تمھاری بات کرنا چاہتی ہُوں اور تمھاری باتیں سُننا چاہتی ہُوں۔ اگر مَیں یہ کہوں کہ مجھے تم سے محبّت ہوگئی ہے تو تمھارے تاثرات کیا ہوں گے؟"

اُس کی زبان سے یہ بات سُن کر مجھے بے حد تعجب ہُوا کیونکہ وہ بمشکل بارہ تیرہ سال کی لڑکی تھی: "کیا تمھارے ہاں بارہ تیرہ سال کی لڑکیاں جذبۂ محبّت سے آگاہ ہوجاتی ہیں؟" مَیں نے پُوچھا۔

"ہمارے ہاں بارہ سال میں لڑکی شادی کرلیتی ہے۔" وہ بھاری آواز میں بولی اور پھر تاریکی کچھ زیادہ ہی گہری محسوس ہونے لگی۔ یہ ریشمی اندھیرا صبح تک مجھے انوکھے خواب دکھاتا رہا۔

ہمیں سفر کرتے ہُوئے چوتھا روز تھا۔ ہم بتدریج بلندی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان چار دِنوں میں دیپا نے ثابت کردیا تھا کہ عورت چاہے ہمارے دَور اور دُنیا کی ہو یا ماضیٔ بعید سے تعلق رکھتی ہو، اُس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ وہ ہر وقت بولتی ہی رہتی ہے۔ چوتھے روز، راستے میں ہمیں ایک چشمہ مِلا تو ہم نے غسل کیا۔ جب ہم چشمے سے نکلے تو مَیں دیپا کو حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس کا حُسن بے حد نکھر گیا تھا اور وہ پہلے والی دیپا تو معلوم ہی نہیں ہوتی تھی۔

وہ توجہ کا مفہُوم بھانپ گئی اور مسکرا کر بولی: "آفتابی کتابوں میں لکھا ہُوا ہے کہ جب تک ...!"

آفتابی کتابوں کے ذکر پر مجھے وہ بڑی بڑی کتابیں یاد آگئیں جو مجسّمے کی کھوپڑی والے کمرے کی قربان گاہوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ پھر دیپا کی یہ بات بھی ذہن میں اُبھر آئی کہ جمشیدی ایک زمانے میں وہاں آباد تھے۔ مَیں نے دیپا سے اس سلسلے میں پُوچھا تو وہ بولی...

"مَیں مذہب کے بارے میں بہت کم جانتی ہُوں۔ ہمارے بزرگ اکثر راتوں کو آگ کے گرد بیٹھ کر مذہب کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ عجیب سی کہانیاں سُناتے ہیں کہ سب سے پہلے دُنیا کا انڈا پیدا ہُوا۔ اُسی بیضۂ ارض سے بزرگ مہر شناس نے جنم لیا۔ وہ دانائے راز تھا۔ اُس نے مذہبی کتابیں لکھی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جمشیدی اُس کی تعلیمات سے رُوگردانی کرتے چلے گئے اور کتابوں کے اوراق پر لکھی تحریر مدھم پڑتی چلی گئی... پھر ایک ایسا دَور آیا کہ کوئی جمشیدی اُنھیں پڑھنے کے قابل نہ رہا۔ وہ بدی اور گناہوں میں ڈُوب گئے۔ اُنھی گناہوں کی سزا میں اُنھیں جلاوطن ہونا پڑا اور وہ آج تک جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔"

مجھے ایک بار پھر اُن کتابوں کا خیال آگیا جن کی تحریر مدھم ہو چکی تھی اور جو خُود بھی قربان گاہوں پر رکھے رکھے خاک ہوگئی تھیں۔

مجھے سوچ میں ڈُوبے دیکھ کر دیپا بولی: "اب بدی سے مت ڈرو کہ میری طرف توجہ ہی نہ دو۔"

اگلی صبح ہمارا سفر پھر شروع ہوگیا۔

ڈھلان شروع ہوتے ہی دیپا نے بتادیا کہ اب ہم کاشیوں کی حدُود میں داخل ہو رہے ہیں۔

"کاشی کیسے ہوتے ہیں؟" مَیں نے پُوچھا۔

"اُن بالوں والے وحشیوں سے زیادہ وحشی۔ اُن سے کہیں توانا قد آور... بڑے ظالم اور چالاک... اگر اُنھوں نے تمھیں قتل کردیا یا بڑھنے کی اجازت دے دی تو دونوں صورتوں میں مجھے نہیں چھوڑیں گے اور مَیں اُن کا شکار ہونے کی بجائے موت کو ترجیح دیتی ہُوں۔ اپنا یہ چھوٹا سا چاقو دے دو تاکہ مَیں اُن کے جبر کا نشانہ بننے سے پہلے ہی اپنے آپ کو ختم کرسکوں۔"

مجھے اُس کی بات کا اس لیے یقین نہ آیا کہ وہ مبالغہ آرائی سے بہت کام لیتی تھی۔ مَیں نے کہا: "اگر مَیں تمھیں چاقو نہ دُوں تو؟"

"تو پھر مَیں خودکشی کیسے کروں گی؟ کسی ہتھیار کے بغیر کوئی اپنے آپ کو کیسے ختم کرسکتا ہے؟"

"کیا تم یہ سنجیدگی سے کہہ رہی ہو؟"

"ہاں۔ اگر مَیں زندہ اُن کے ہتھے چڑھ گئی تو جب تک میرے اندر زندگی کی رمق باقی رہے گی، وہ مجھے اپنے ستم کا نشانہ بناتے رہیں گے۔"

یہ سُن کر مَیں نے اپنا چاقو اُسے دے دیا کہ وہ چاہے اُس سے خودکشی نہ کرے مگر کسی حد تک مدافعت تو کرہی لے گی۔

دوپہر تک ہم ایک ایسے میدان میں پہنچ گئے جس کے پرے پہاڑ سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ اُس طرف سے آنے والی ہَوا کافی خنک تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ اُن پہاڑوں کی چوٹیوں نے برف کے کلس سجا رکھے ہوں گے۔

دیپا نے وہ پہاڑ دیکھے تو گہری سنجیدگی سے بولی: "ان پہاڑوں کے اُس پار جمشیدیوں کا مسکن ہے۔ وہ اُنھی پہاڑوں کی وادی میں رہتے ہیں جن سے تمھیں ہر قیمت پر فتح حاصل کرنی چاہیے۔ مَیں اپنے اپنے عزیزوں کے علاوہ اپنا شہر، اپنا گھر اور اپنا آنگن دیکھنا چاہتی ہُوں۔ بزرگ مہر شناس تمھیں کاشیوں پر فتح یاب کرے۔"

ایک چھوٹی سی کھائی سے گزرنے کے بعد مجھے میدان میں

تین سو قدم دُور ایک جھونپڑا نظر آیا۔ اس کی چھت مسطح تھی اور اس کے اردگرد چہار دیواری بنی ہوئی تھی جس میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہی ہوسکتی تھی کہ اُسے بارش کا پانی جمع رکھنے کے لیے بنایا گیا ہوگا... پھر اچانک ہی میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

میرے ٹھٹکنے کا باعث وہ کاشی تھا جو پتھروں سے تعمیر کردہ اُس جھونپڑے کی چھت پر بیٹھا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کم از کم آٹھ فٹ لمبا اور بھاری بھرکم تھا۔ وہ بندر اور گوریلے کی دوغلی نسل معلوم ہوتا تھا اور اُس کے جسم پر بڑے بڑے بال تھے۔ اُس کا مُنہ کسی شکاری کتے کے مُنہ کی طرح لمبوترا تھا۔ پھر وہ وہیں بیٹھے بیٹھے اچانک ہی کہیں غائب ہوگیا۔

پہلے تو مَیں اس کے اس طرح غائب ہونے پر سٹپٹا گیا پھر میری سمجھ میں آگیا کہ وہ چھت میں واقع سُوراخ سے اندر اُتر گیا ہوگا۔

مَیں نے دیپا کی طرف دیکھا۔ وہ میرے پیچھے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی اور اُس کی گِھگھی بندھی ہُوئی تھی۔ مَیں اُس کاشی کی کمر سے بندھی تلوار دیکھ چکا تھا۔ اُس کے مقابلے میں میرے پاس ایک خود ساختہ بھدا سا بھالا اور تیر کمان تھے۔ مَیں نے دیپا سے اپنا چاقو واپس لینا چاہا مگر یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کردیا کہ اُس کے بغیر وہ خودکشی نہیں کرسکے گی اور اُس کا خودکشی کرلینا ہی بہتر ہوگا۔ اتنے میں جھونپڑے کی چھت کے سوراخ سے گاڑھا دُھواں بلند ہونے لگا۔

دیپا بمشکل ہکلاتے ہُوئے بولی: "وہ... وہ اس دُھویں کے ذریعے... دُوسری چوکیوں کو... خبردار کررہا ہے... مگر... مگر سب سے زیادہ اہم... یہی چوکی ہے... اگر ہم... یہاں سے نکل گئے تو شاید بچ جائیں۔"

اتنے میں کاشی چھوٹی سی چار دیواری سے کُود کُود کر باہر آنے لگے۔ مَیں اُنھیں شمار کرتا رہا۔ وہ تعداد میں دس تھے۔ ایک اُن کا کمان دار تھا اور نو ماتحت تھے۔ اُنھوں نے سینگوں والے خود پہن رکھے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہُوئی کہ وہ ہمارے دَور اور دُنیا کی طرح عسکری نظم وضبط کا مظاہرہ کررہے تھے۔ جب اُن کے کمان دار نے اُنھیں صف آرا ہونے کا حکم دیا تو مَیں بُری طرح چونک گیا۔ چونکنے کی وجہ آٹھ فٹ کے قوی الجثہ کمان دار کی زنانہ آواز تھی۔ مَیں نے دیپا سے پُوچھا: "کیا یہ عورتیں ہیں؟"

"نہیں..." وہ بولی: "کاشیوں میں کوئی عورت پیدا ہی نہیں ہوتی۔ یہ ہماری عورتوں کو اُٹھا لے جاتے ہیں۔ اُن سے جو اولاد ہوتی ہے، وہ سب کی سب لڑکوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ آؤ واپس بھاگ چلیں۔ یہ جنگل میں ہمارا پیچھا نہیں کریں گے کیونکہ ان کی حد اسی میدان تک ہے۔"

"اب فرار کا وقت نہیں رہا۔ مجھ پر اعتماد رکھو اور وہی کرو جو مَیں کہتا ہُوں۔ میرے پیچھے چھُپ جاؤ اور اب اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالنا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مَیں ان سے نمٹ لُوں گا۔" مَیں نے اُس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا حالانکہ مجھے خُود اپنے زندہ رہنے کی بھی کوئی اُمید نہیں تھی۔

کاشی کمان دار نے اپنے دستے کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور آٹھ فٹ قد والے وہ بندر نُما گوریلے تربیت یافتہ عسکریوں کی طرح میری طرف بڑھنے لگے۔ اُن کا کمان دار اُن سے چار قدم آگے تھا۔ مَیں اپنے برچھے کا سہارا لے کر یُوں کھڑا ہوگیا جیسے میرے لیے اُن کی کوئی وقعت ہی نہ ہو اور وہ میرے لیے کیڑے مکوڑے ہوں۔ مَیں اُنھیں اپنے رویّے سے حیران کرنا چاہتا تھا جبکہ خُود ٹھنڈا اور پُرسکون رہنا چاہتا تھا۔

جب وہ مجھ سے بیس قدم دُور رہ گئے تو کمان دار نے اُنھیں رُکنے کا حُکم دیا۔ سب ایک دم رُک گئے اور اُنھوں نے تلواریں نکال کر کمان دار کو سلامی دی۔ وہ اُنھیں آخری ہدایات دینے لگا: "میرے دُوسرے حکم تک یہیں آرام سے کھڑے رہو۔ مجھے اس معاملے سے نمٹنے میں دیر نہیں لگے گی اور یاد رکھو۔ کمان دار کی حیثیت سے اس لڑکی پر سب سے پہلے میرا حق ہوگا۔"

یہ ہدایات دینے کے بعد وہ میری طرف آیا اور پانچ قدموں کے فاصلے پر رُک گیا۔ اُس نے تلوار بڑی بے پروائی سے پکڑ رکھی تھی۔ وہ مجھ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر دیپا کی طرف متوجہ ہوگیا جو کھائی کے کنارے ایک چٹان کی اوٹ میں چھُپنے کی کوشش کررہی تھی۔

"ادھر کیا دیکھتے ہو؟ مجھ سے بات کرو اور یہ مت بھُولو کہ وہ میری بیوی ہے۔" مَیں نے کہا۔

کاشی کمان دار نے غور سے میری طرف دیکھا بلکہ اپنی نگاہیں مجھ پر مرکوز کردیں۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی زرد آنکھیں موت کی طرح سرد اور بے حس تھیں۔ وہ کافی دیر تک سانپ کی طرح ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا... پھر اُس کے ہونٹ پھڑپھڑائے اور سفید نوکیلے دانت دکھائی دینے لگے۔

"تم کیا چیز ہو، کہاں سے آئے ہو، کیا چاہتے ہو اور تمھیں کہاں جانا ہے؟" اس نے پُوچھا۔

"میرا نام سرفروش ہے۔ مَیں آدم زاد ہُوں۔ مجھے اپنی بیوی کے ساتھ پہاڑوں کے اُس پار جانا ہے۔ اگر ہم تمھاری اجازت کے ساتھ یہاں سے گزر جائیں تو بہتر ہوگا اور ہاں، تم نے میرے اعزاز میں جو

سلامی دی ہے اس کے لیے شکریہ۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی ٹانگیں پھیلا دیں، بھالا بغل میں دبایا اور بے نیازی سے مسکرایا تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اس سے مرعوب یا خوف زدہ ہوں۔

اُس بندر نما گوریلے کی زرد آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اُبھری۔ اُس نے اپنی تلوار میری طرف سیدھی کی۔ اگرچہ یہ دو دھاری تلوار کسی سخت لکڑی کی بنی ہوئی تھی... مگر اسے مہلک بنانے کے لیے پھل میں چقماق جڑے ہوئے تھے اور وہ ایک ایسی ہستی کے ہاتھ میں تھی جو مجھ سے دو فٹ اُونچا اور تین گنا زیادہ وزنی تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ دھونس سے کام چل جائے گا... مگر اس سے کام نہیں چل سکا تھا۔ وہ استہزائیہ انداز سے مسکرانے لگا۔

"تم کہتے ہو کہ تمھارا نام سرفروش ہے مگر مجھے اس سے کیا غرض؟ میرا نام پونگ ہے مگر تمھیں اس سے کیا غرض۔ تم کہتے ہو کہ تمھیں پہاڑ کے اس پار جانا ہے لیکن مجھے جمشیدیوں سے ایسا کوئی پیغام نہیں مِلا کہ اُن کے لیے تمھاری آمد متوقع ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے، آخر؟"

میں اگرچہ ماضی کے متعدد سفر کرچکا تھا لیکن ایک بندر نما گوریلے کو بولتے اور عقل مندی کی باتیں کرتے دیکھ کر خاصا متعجب تھا، تاہم میں نے کہا "جمشیدیوں کو میرا انتظار نہیں ہے۔ وہ مجھے نہیں جانتے اور جان بھی کیسے سکتے ہیں کیونکہ میں ایک بہت دُور دراز علاقے سے آیا ہوں۔ بہرکیف، مجھے اُن کے پاس جانا ہے اور مجھے اُن کے پاس جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

ایک بار پھر اُس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک عود کر آئی اور مجھے دیپا کی بات یاد آگئی کہ وہ بے حد سفاک ہوتے ہیں اور اُنھیں وحشیوں کی یلغار روکنے کے لیے اس سرحد پر مامور کیا گیا ہے چونکہ اُن کی نسل میں عورتیں جنم نہیں لیتیں اس لیے وہ اس خدمت کے عوض جمشیدیوں سے مجرم عورتیں حاصل کرتے ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھار وحشی کچھ غلام عورتیں اُنھیں دے کر جمشیدیوں پر حملہ کراتے ہیں اور بہت سے مرد و زن کو غلام بنا کر لے جاتے ہیں۔ دیپا بھی اسی طرح وحشیوں کے ہتھے چڑھی تھی۔

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ پونگ تمھیں یہاں سے گزرنے دے گا۔ پھر تم جانو اور دُوسری چوکیوں والے جانیں مگر یہ لڑکی تمھیں ہمارے حوالے کرنا ہوگی۔ اِدھر کافی عرصے سے جمشیدیوں نے مجرم عورتیں نہیں بھیجیں اور پھر ہماری چوکی تو ویسے بھی سب سے آخر میں واقع ہے۔"

دیپا مجھے بتا چکی تھی کہ اُن کی قوم کی وہ عورتیں جنھیں بھیانک جرائم کی پاداش میں موت کی سزا دی جاتی ہے، ان کاشوں کے حوالے کر دی جاتی ہیں مگر اُن میں سے بہت سی عورتیں خودکشی کرلیتی ہیں۔

"میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ وہ میری بیوی ہے اس لیے وہ میرے ساتھ ہی جائے گی۔"

"تو پھر نہ تو تم جاؤ گے اور نہ ہی وہ جائے گی۔" وہ ہوا میں تلوار چلاتے ہوئے بولا۔ "میں تمھیں قتل کر کے اُسے حاصل کروں گا مگر جہاں سے بھی تم آئے ہو، وہاں احمق ہی پیدا ہوتے ہیں۔"

میں دو قدم پیچھے ہٹا اور اپنا بھالا تولا جس کا پھل لکڑی کا بنا ہوا تھا، تیر کمان بھی کھلونوں جیسی تھی جبکہ میرے مدِمقابل کے پاس دو دھاری تلوار تھی۔ اُس کا جُثہ دیکھ کر تو یہ اندازہ ہوتا تھا کہ گھنے بالوں کی وجہ سے نہ تو بھالا کارآمد ثابت ہوگا اور نہ ہی تیر اُس کے جسم میں پیوست ہوسکیں گے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنی پیٹھ میں کوئی نوک دار چیز چُبھتی محسوس ہوئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

دستے کے ایک گوریلے نے اپنی تلوار کی نوک میری پیٹھ سے لگادی تھی اور باقی میرے چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ اب مجھ پر بیس زرد آنکھیں بیک وقت جمی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں نفرت اور غصہ ہی نہیں، وحشت بھی لہریں لے رہی تھی۔ میری پیٹھ میں تلوار چبھونے والا برہمی سے بولا۔ "زیادہ بکواس نہ کرو اجنبی۔ کمان دار سے لڑو اور مرجاؤ مگر مرنے میں دیر نہ کرو۔" یہ کہہ کر وہ دیپا کی طرف دیکھنے لگا۔

"بکواس بند کرو۔" کمان دار چلّایا۔ "اس قسم کی باتیں قواعد اور ضوابط کے خلاف ہیں۔ اگر اب کوئی بولا تو شکار پر اُس کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ اب اپنا حلقہ تنگ کرو۔ یہ احمق بہادر لگتا ہے لیکن میں اسے بھاگنے کا موقع نہیں دینا چاہتا۔"

اُنھوں نے میرے گرد اپنا حلقہ تنگ کرلیا مگر پونگ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ وہ شاید میرے حملے کا منتظر تھا جبکہ میں چاہتا تھا کہ وہ میرے قریب آئے اور وار کرے تاکہ مجھے یہ اندازہ ہوسکے کہ اُس کا طریقِ جنگ کیا ہے۔ جب وہ کوئی غلطی کرے تو میں اُسے کاری ضرب لگا سکوں لیکن اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کیونکہ وہ مجھ سے دو ہاتھ زیادہ قدآور تھا۔ اُس کا وزن چھ سو پونڈ تھا جبکہ میرا صرف دو سو پونڈ تھا... پھر اُس کے پاس دو دھاری تلوار بھی تھی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس بار موت میرا مقدر بن ہی چکی ہے تو بہادروں کی طرح مرنا چاہیے۔

"کھڑے کھڑے دیکھ کیا رہے ہو بزدل، حملہ کرو نا۔" میں نے کہا۔

اچانک پونگ مجھ پر جھپٹا اور اس نے تلوار سے میری کھوپڑی دو ٹکڑے کر دینا چاہی... مگر میں عین وقت پر ہٹ گیا۔ وہ غصے کے مارے کھول اُٹھا اور پھر میری طرف بڑھا۔ اس بار میں نے پہل کی اور اپنا بھالا اُس کے سینے پر دے مارا۔ اُس نے بھالا کھینچا تو اُس کا پھل ٹوٹ گیا۔ اُس نے پھل نکال کر میری طرف پھینکا۔ میں نے اُسے ٹوٹے ہوئے بھالے پر روکا اور اُسی سے پھر وار کر دیا۔

پونگ پیچھے ہٹا اور پیٹھ میری طرف موڑلی۔ میں نے ٹوٹے ہوئے بھالے سے اُس کی پیٹھ پر بھی ضرب لگائی۔ اس کی تلوار میرے بھالے سے چھوٹی تھی اس لیے مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی مگر میرا بھالا اُسے مسلسل زخمی کر رہا تھا۔ ہر چند کہ یہ زخم معمولی تھے مگر اُن سے خُون بہنا شروع ہوگیا تھا۔ میں نے سوچا اگر خُون اسی طرح نکلتا رہا تو جلد ہی وہ نقاہت میں مُبتلا ہوجائے گا۔ اُس کے ساتھیوں کا گھیرا ہمارے ہاں کے باکسنگ رِنگ کے برابر تھا چنانچہ میں نے باکسنگ کی طرح ہی اُسے پے در پے بھالے مارنے شروع کر دیے۔

وہ جھنجلا کر اندھا دُھند تلوار چلانے لگا مگر میں تو ایک باکسر کی طرح بجلی کی رفتار سے پھدک رہا تھا۔ اس لیے اُس کا ہر وار خالی جا رہا تھا تاہم ایک بار اس کی تلوار سے میرے بال کٹ ہی گئے۔

اب میں ایسی اداکاری کرنے لگا جیسے بُری طرح تھک گیا ہوں۔ میرا دَم اُکھڑ رہا ہے اور میں کسی بھی لمحے گر پڑوں گا۔ یہ دیکھ کر پونگ کی باچھیں کھِل گئیں۔ اُسے اپنی فتح کا یقین ہوگیا۔

میں جلدی سے پیچھا ہٹا۔

پونگ اس اطمینان کے ساتھ رُک گیا کہ اب تو میں خود ہی تھکن سے چُور ہو کر گرنے والا ہوں مگر میں جونہی اس کی تلوار کی زد سے نکلا، کمان پر تیر چڑھایا اور چلّا کھینچنے لگا۔ پونگ نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور مسکرانے لگا۔

"تم اس کھلونے کے ساتھ پونگ سے لڑنا چاہتے ہو۔ اس رسّی اور لکڑی کے ٹکڑے سے پونگ کو مارو گے؟"

عین اُسی وقت میں نے تیر چھوڑ دیا۔

پونگ نے اُسے بائیں ہاتھ سے روکنا چاہا تو وہ اُس کی ہتھیلی میں گڑ گیا۔ اس نے تلوار پھینک دی اور ہتھیلی سے تیر نکالنے لگا۔ یہی وہ نازک اور فیصلہ کُن لمحہ تھا جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔ اب تک مجھے سستانے اور اپنی قوت بحال کرنے کا وقت بھی مل چکا تھا چنانچہ میں نے زقند بھری اور اُس سے ٹکرا گیا۔

وہ سمجھا کہ اس کا شکار خُود ہی اُس کی گرفت میں آگیا ہے لہٰذا اس نے مجھے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر میری ہڈیاں توڑ دینا چاہیں لیکن اس سے پہلے ہی میرے ہاتھوں کے دونوں انگوٹھے اُس کی آنکھوں میں گڑ گئے تھے۔ میں نے اپنے انگوٹھوں کو گھمایا تو اُس نے ایک چیخ کے ساتھ نہ صرف مجھے چھوڑ دیا بلکہ زور سے ہٹایا تو اُس کی آنکھوں کے ڈیلے بھی باہر آگئے۔

وہ درد کے مارے چیخنے اور دھاڑیں مارنے لگا۔

اس کے ساتھی حیرت سے بُت بنے اپنی اپنی جگہ کھڑے رہ گئے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آسکا کہ ہُوا کیا ہے۔

میں نے لپک کر پونگ کی تلوار اُٹھالی اور دو قدم پیچھے ہٹ کر اُس کے ساتھیوں پر نظر ڈالی۔ وہ ابھی تک دم بخود اپنے سردار کو تڑپتا اور چلّاتا دیکھ رہے تھے۔ میں نے پونگ کو چڑانے کے لیے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔ "اِدھر آؤ پونگ! میری آواز کی سمت بڑھو بزدل۔ اب بتاؤ کہ احمق کون ہے؟ اگر مجھے ختم کرسکتے ہو تو آؤ نا۔"

وہ دھاڑتا ہُوا اُٹھا اور اپنی بانہیں پھیلا کر اس سمت لپکا جدھر میں کھڑا تھا۔ میں نے اپنے پیر مضبوطی سے جمائے، دونوں ہاتھوں سے تلوار سیدھی کی اور اُسے چڑایا۔ "آؤ... اور آگے آؤ بدبخت۔"

اس نے آواز سے میری سمت کا اندازہ لگایا اور پُوری قوت سے جھپٹا تو تلوار کی نوک اُس کے نرخرے میں اُترتی چلی گئی۔ وہ ایک دھاڑ کے ساتھ رُکا اور پیچھے ہٹا۔ ساتھ ہی میں نے تلوار کھینچ کر نکالی تو خُون کا ایک فوارہ سا اُس کی گردن سے اُبلنے لگا۔

میں نے دو مرتبہ تلوار اُس کے سینے میں گھونپی۔ وہ مرتے دم تک تلوار مجھ سے چھیننے کی کوشش کرتا رہا مگر اُس کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ میں نے اپنا پیر اُس کی لاش پر رکھ کر اُس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگے۔ میں نے خُون آلود تلوار بلند کرتے ہوئے کہا۔

"فیصلہ ہوچکا۔ میں نے تمھارے سردار کو مار دیا ہے اس لیے اب میں تمھارا سردار ہوں اور نئے سردار کی حیثیت سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم سب کو ایک ایک بیوی اور نرم فرائض پر مامور کیا جائے گا... یہ میرا... سرفروش کا وعدہ ہے۔ اس پر اعتماد کرو یا مجھ سے لڑو اور پونگ کی طرح مارے جاؤ۔" یہ کہہ کر میں پونگ کی لاش کا جائزہ لینے لگا۔ یہ اُس جُوئے کا آخری مرحلہ تھا جو میں نے کھیلا تھا۔ میں پونگ کا سر کاٹنے لگا مگر میرے کان اُس کے ساتھیوں کی باتوں پر لگے تھے۔

"اُس نے ہمارے سردار کو قتل کیا ہے۔ اسے مار ڈالو۔" ایک نے کہا۔

"تم حکم دینے والے کون ہو؟ اب ہم سب برابر ہیں۔ اُس نے وعدہ کیا ہے کہ سب کو ایک ایک بیوی ملے گی۔" دُوسرا بولا۔

"مجھے اس بات کا یقین نہیں۔ یہ اتنی بیویاں کہاں سے لائے گا؟ اس کے پاس تو ایک ہی عورت ہے اور اس پر بھی اپنا ہی حق جتاتا ہے۔ میری مانو تو اسے مار ڈالو اور لڑکی کو پکڑ لو۔"

"اُس نے پونگ کو مار کر اچھا ہی کیا ہے۔ ورنہ وہ لڑکی کو ہم تک آنے ہی نہ دیتا۔"

"سنو بے وقوفو۔" پانچواں بولا۔ "ہم اسے کسی بھی وقت مار سکتے ہیں مگر پہلے اس سے پوچھ لو کہ یہ عورتیں کہاں سے لائے گا اور ہمیں زم فرائض پر کیسے مامور کرے گا؟"

"اسے مارنا اتنا آسان نہیں۔ یہ مرنے سے پہلے ہم میں سے دو چار کو مار ہی ڈالے گا اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ آؤ اس سے بات کریں۔" چھٹے سیلنے نے فیصلہ دیا تو میری جان میں جان آئی۔

میں پونگ کا سر تلوار کی نوک پر اُٹھاتے ہوئے اُن کی طرف پلٹا اور بولا۔ "تمھارا فیصلہ بڑا دانش مندانہ ہے۔ میں پونگ کا سر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم دُوسری چوکی کو اطلاع کے ساتھ ساتھ یہ خوشخبری بھی سنا دو کہ انھیں بھی بیویاں ملیں گی۔ میں سب کو آسائشیں بھی فراہم کروں گا۔ تم سوچتے ہوگے کہ کیسے؟ دیکھو جس طرح میں یہاں کا سردار بنا ہوں، اسی طرح جمشیدلوں کا بھی سردار بنوں گا اور اپنا وعدہ نبھاؤں گا۔"

میں نے یہ بات اس لیے کی تھی کہ اگر جھوٹ بولنا اور دھونس جمانا پڑے تو پھر بلا جھجک بہت بڑی بات کرنی چاہیے۔ صرف اسی طرح اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں... مگر میں نے دیکھا کہ وہ ابھی تک تذبذب میں مبتلا تھے۔

میں نے اپنے جھوٹ اور دھونس میں وزن پیدا کرنے کے لیے ایک اور چال چلی۔ پونگ کے سر سے تلوار نکالتے ہوئے میں نے ان میں سے ایک سے کہا۔ "اسے لے جاؤ اور کسی تھیلے میں ڈال کر لے آؤ۔ جاؤ۔ دیر مت کرو۔"

اُس نے ایک نظر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جو خاموش کھڑے رہے پھر وہ آگے بڑھا اور پونگ کا سر اُٹھا کر جھونپڑے کی طرف چل دیا۔

اُس کے ساتھی اُسے جاتا دیکھتے رہے۔

میری دھڑکنیں بے ترتیب سی ہوگئیں۔ وہ میری دھونس میں آگئے تھے مگر پوری طرح نہیں۔ میں نے ترپ کا ایک اور پتہ پھینکا اور تلوار زمین پر رگڑ کر صاف کرتے ہوئے بولا...

"سمجھنے کی کوشش کرو کاشیو! ... اگر تم مجھ سے لڑتے ہو تو تم میں سے کچھ میرے ہاتھوں میں ضرور مارے جائیں گے لیکن اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ جمشیدلوں میں پہنچ جاؤں اور اُن کا سردار بن جانے کے بعد اپنا وعدہ نبھاؤں تو تم کتنے فائدے میں رہو گے؟ سب کو ایک ایک بیوی مل جائے گی۔ مجھے آزما کر کیوں نہیں دیکھ لیتے؟"

مجھے جمشیدلوں میں پہنچ کر سردار بننے اور کاشیوں کو بیویاں فراہم کرنے کی کوئی تمنا نہیں تھی۔ یہ میں تو جانتا تھا مگر کاشی نہیں جانتے تھے۔ وہ بار بار بیوی کا تذکرہ سن کر میرے پھندے میں آ ہی گئے۔

انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور بولے۔ "ہم میں سے چھ نے تمھارے حق میں اور تین نے تمھارے خلاف مشورہ دیا ہے، سرفروش۔ اس لیے تم جا سکتے ہو مگر اپنا وعدہ نہ بھول جانا۔"

جب وہ اپنا فیصلہ سنا کر جھونپڑے میں چلے گئے تو میں دیپا کے پاس گیا اور اُسے لے کر جھونپڑے سے دُور ایک لمبا چکر کاٹتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ میں نے اُس وقت تک نہ تو دیپا کے کسی سوال کا جواب دیا اور نہ ہی اپنی رفتار کم کی جب تک کہ وہ جھونپڑا یا چوکی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

پونگ سے میرا مقابلہ دیکھنے کے بعد دیپا مجھ سے بے حد متاثر ہوگئی تھی۔

جب دُوسری چوکی قریب آئی تو اُس نے مجھے پہلے سے بتا دیا۔

"وادی میں جانے کا کوئی دُوسرا راستہ بھی تو ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں... صرف ایک ہی درّہ ہے اور اس پر کاشیوں کی چوکی ہے۔"

"تو پھر ہم اُدھر سے نہیں جائیں گے۔ ورنہ اس بار وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں آقا۔ میں بلا چون و چرا آپ کے حکم کی تعمیل کروں گی۔"

میں نے اُس کے بدلے ہوئے لب و لہجے اور رویّے پر اُسے تیز نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ "یہ طے ہو چکا ہے کہ تم مجھے آقا نہیں بلکہ سرفروش کہہ کر مخاطب کیا کرو گی۔"

دیپا کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں لیکن اُس نے ہونٹوں پر آنے والا تبسم روک لیا... اور پھر ہم دونوں ہی کھل کھلا کر ہنس دیے۔

⧈

دیپا ٹھیک ہی کہتی تھی کہ وادی میں داخل ہونے کا صرف وہی ایک راستہ تھا جس پر کاشیوں کی چوکی تھی لیکن میں نے اپنی کوہ نوردی کے تجربوں سے کام لیتے ہوئے پہاڑ عبور کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ ہر چند کہ یہ ایک حماقت تھی مگر میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں نہ تو واپس جا سکتا تھا اور نہ ہی درّے کی جانب بڑھ سکتا تھا۔

جوں جوں چڑھائی بڑھتی گئی، سردی میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور راستے کی دشواریوں میں بھی زیادتی ہوتی گئی۔ دیپا کی حالت سردی کے مارے غیر ہوتی جا رہی تھی۔ جب اُس سے چلنا دوبھر ہو گیا تو میں

نے اُسے اپنی پیٹھ پر اُٹھا لیا اور اُس وقت تک سفر جاری رکھا جب تک شام کا اندھیرا گہرا نہ ہوگیا۔

اب اندھیرے میں آگے بڑھنا خود موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لیے میں نے رات بسر کرنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنا شروع کر دی تاکہ ٹھنڈی ہوا سے کچھ تو تحفظ حاصل ہو سکے۔ جلد ہی مجھے ایک ایسی جگہ بھی مل گئی۔ یہ دو چٹانوں کے درمیان ایک غار سا تھا۔ میں اس اندھیرے غار میں داخل ہوگیا۔

ابھی میں نے دیپا کو اپنی پیٹھ سے اُتارا ہی تھا کہ اندھیرے میں کسی جانور نے مجھے اتنے زور سے ٹکر ماری کہ میں لڑکھڑاتا ہوا دُور جا گرا اگر فوری طور پر نہ سنبھلتا تو دو قدم دُور رہ جانے والی ڈھلان سے قلابازیاں کھاتا ہوا ہزاروں فٹ گہری کھائی میں جا گرتا۔

اُس جانور کی ٹکر سے مجھے یہ محسوس ہوگیا تھا کہ اُس کا صرف ایک بڑا سا سینگ مجھے اتنے زور سے لگا ہے جس نے مجھے اس بُری طرح اُچھال دیا ہے۔ میں نے کمر کی پیٹی سے چقماق کا چاقو نکالا اور فوراً ایک جانب ہٹ گیا کہ وہ جانور ڈکراتا ہوا پھر میری طرف بڑھ رہا تھا۔

میں نے اپنا ایک بازو اپنے چہرے پر ڈھال بنا لیا تاکہ اس کی سینگ کہیں مجھے اندھا ہی نہ کر دے اور دُوسرے ہاتھ میں چاقو تھام کر انتظار کرنے لگا کہ وہ کب مجھ پر حملہ کرتا ہے۔ میرے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ اندھیرے میں مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنے میں اُس نے پھر مجھے ٹکر ماری جو میرے کندھے پر لگی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے بجلی کی سی پھرتی سے اس کا ایک سینگ پکڑ لیا اور اُچک کر اُس کی گردن پر سوار ہوگیا... پھر میں دیوانہ وار اُس پر چاقو سے حملہ کرنے لگا۔ وہ جانور بھی بہت طاقتور لگتا تھا۔ اس کی گردن پر لمبے لمبے بال تھے، اس لیے چاقو آسانی سے اُس کی گردن میں پیوست نہیں ہوتا تھا۔ میرے اب وہ بُری طرح اُچھل اُچھل کر مجھے گرانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں وہ بدبخت ڈھلان کی طرف نہ مُڑ جائے ورنہ اپنے ساتھ مجھے بھی لے مرے گا... مگر اس کود پھاند کے دوران جانور کی پرواہ کیے بغیر میں اُسے دبوچ کر وحشیوں کی طرح اُس کی گردن پر وار کرنے لگا۔

خون کے فوارے مجھے تر بتر کرنے لگے مگر میں دیوانگی اور جوشِ وحشت میں اُس پر مسلسل وار کرتا رہا۔ وہ ٹھنڈا ہوگیا لیکن میرا چاقو والا ہاتھ پھر بھی نہ رُکا۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

جب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ مر چکا ہے تو میں نے اپنی دیوانگی پر ایک قہقہہ لگایا اور دیپا کے پاس پہنچ گیا۔

وہ اندھیرے میں سردی کے مارے گٹھری بنی ہوئی تھی۔ میں نے ٹٹول کر چھوا تو وہ بولی۔ "میں سردی سے مر رہی ہوں۔ تم بھی صبح تک زندہ نہیں بچو گے۔"

"نہیں دیپا۔ ہم دونوں زندہ رہیں گے۔ میں ابھی تمھیں سردی سے نجات دلاتا ہوں۔" اُسے دلاسا دے کر میں دوبارہ اُس مُردہ جانور کے قریب آیا اور ٹٹول ٹٹول کر اُس کی کھال اُتارنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے نیم بے ہوش دیپا کو اُس خون آلود کھال میں لپیٹ دیا۔ تھوڑی دیر بعد دیپا کو ہوش آگیا۔

"اوہ سرفروش مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اپنی ماں کی آغوش میں ہوں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"سو جاؤ..." میں نے کہا اور خود بھی اُس کھال کے ساتھ پیٹھ لگا کر سو گیا۔

✵

دو روز بعد ہم پہاڑ کی چوٹی عبور کر چکے تھے اور اب ڈھلان کا سفر کر رہے تھے۔ پہاڑی مینڈھے کی وہ کھال ہمارے پاس تھی مگر تیسرے روز وادی میں پہنچنے کے بعد ہم نے اُسے پھینک دیا۔ دیپا نے بتایا کہ ابھی اس کے شہر تک پہنچنے میں کئی دن لگیں گے۔

"وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہمیں نہا دھو لینا چاہیے۔ ورنہ تمھارے قبیلے کے لوگ ہمیں اس حال میں دیکھ کر کوئی شیطانی مخلوق سمجھیں گے اور مار ڈالیں گے یا خود ہی خوف سے مر جائیں گے۔"

... اور میں نے اُسے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ میرے جسم پر اب بھی منجمد خون کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ دیپا بھی لڑکی کی بجائے بھتنی نظر آ رہی تھی۔ ہمارے چہرے خاک آلود تھے اور ہمارے جسموں سے بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ اب ہمیں کسی چشمے یا پہاڑی ندی کی تلاش تھی۔

راستہ چلتے چلتے اچانک ہی مجھے اپنی کنپٹیوں میں درد کی ٹیسیں سی محسوس ہونے لگیں۔ ڈاکٹر فریدوں کا کمپیوٹر مجھے تلاش کر رہا تھا۔ وہ مجھے کسی بھی وقت بلا سکتا تھا۔ کل پرسوں ایک ہفتے یا ایک گھنٹے بعد... میں نے دیپا کی طرف دیکھا اور مجھے اُس بھتنی پر پیار آگیا۔

ٹیسیں تھوڑی دیر بعد ختم ہوگئیں۔

تین روز بعد ہم ایک ایسے شہر میں پہنچے جو شاید صدیوں سے ویران پڑا تھا۔ اس مُردہ شہر میں چھوٹی چھوٹی نہروں کا جال سا بچھا ہوا تھا مگر ان میں پانی کی بجائے گھاس پھونس اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ مکانوں اور معبدوں کے کھنڈر رفتگاں کا ماتم کر رہے تھے۔ کہیں کہیں ایسے مجسمے بھی ایستادہ تھے جیسا میں نے جبل پر دیکھا تھا۔ ان مجسموں کے چبوتروں پر کسی عجیب سی زبان کے الفاظ کندہ تھے۔ جنھیں دیپا بھی نہ پڑھ سکی۔ اُس نے صرف اتنا بتایا کہ کسی زمانے میں اُس کی قوم یہاں آباد تھی مگر چونکہ لوگوں نے آسمانی کتابوں کی تعلیمات سے

رُوگردانی کرلی تھی' اس لیے اُنھیں اپنے اس شہر سے بھی جلاوطن ہونا پڑا۔

ہم کئی گھنٹے اس مُردہ شہر میں گھومتے رہے۔

ہمارے پاس وہ پہاڑی برف بھی ختم ہو چکی تھی جسے چُوس چُوس کر ہم اپنی پیاس بجھاتے آئے تھے۔ اب ہمیں شدت سے پیاس لگ رہی تھی۔۔ مگر وہاں پانی کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چلتے چلتے ہم ایک بڑے معبد کے پاس پہنچے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ ایک چھوٹی سی جھیل کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ مجھے اس بات پر بڑا تعجب تھا کہ جب شہر کی ہر ندی گھاس پھونس سے اَٹ گئی ہے اور باؤلیاں خشک ہو چکی ہیں تو یہاں پانی کہاں سے آگیا؟ پھر خیال آیا کہ غالباً اس ننھی سی جھیل کی تہ میں کوئی چشمہ ہوگا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں پانی لیا تو وہ بہت ٹھنڈا اور میٹھا نکلا۔ ہم نے پہلے تو خوب ڈٹ کر پانی پیا اور پھر نہانے کے لیے اس میں اُتر گئے۔

غسل کے بعد میں جھیل کے کنارے لیٹ گیا۔

دیپا ایک بار پھر حسین سامُری مجسّمہ دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ عبادت کرنا چاہتی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے باری باری مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر کے اور ہاتھ اوپر اُٹھا کر دل ہی دل میں کچھ پڑھا اور مجھے بتایا کہ وہ اُس پہاڑی جانور کی رُوح کے لیے دُعا مانگ رہی تھی جس کی کھال نے اُسے موت کے منہ سے بچایا تھا اور جس کے گوشت سے ہم اب تک پیٹ بھرتے آئے تھے۔

گوشت کا ذکر آتے ہی میری بھوک چمک اُٹھی مگر وہاں اب تک کوئی شکار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"یہاں سے چلو ورنہ بھوکوں مر جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔" وہ بولی۔ "بھوک مجھے بھی لگ رہی ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ کچھ فاصلے پر ایسے درخت ہیں جن کے پھل بہت میٹھے ہوتے ہیں۔"

ہم دونوں تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔

اچانک ایک آواز نے میرے قدم روک لیے۔

مجھے رُکتا دیکھ کر دیپا بھی رُک گئی۔ "رک کیوں گئے؟" اُس نے پوچھا۔ "تمھیں کوئی آواز سنائی دے رہی ہے؟"

"نہیں تو۔۔" وہ حیرت سے بولی۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی' اُسے وہ آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔۔ مگر ڈاکٹر فریدوں نے میرے دماغ پر جو سائنسی عمل کیے تھے' ان سے میری قوتِ سماعت بھی بہت بڑھ گئی تھی اور میں نے کسی کی سرسراہٹ سُن لی تھی۔ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

بالآخر وہ مجھے دکھائی دے گیا۔ ہم سے کوئی پچاس گز دور ایک بہت بڑا اژدہا درخت کے ٹہنے سے لٹکا ہوا تھا۔ اگر میری سماعت تیز نہ ہوتی تو ہم چند منٹوں بعد اُس کے پیٹ میں آ گئے ہوتے۔ میں نے دیپا کو وہ اژدہا دکھایا اور پھر ہم راستہ کاٹ کر بھاگتے چلے گئے۔

چند میل آگے جا کر ہم اُن درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گئے جن پر وہ پھل لگے ہوئے تھے۔ اُن کی شکل تو سیب جیسی تھی مگر وہ جسامت میں تربوز سے کم نہیں تھے۔ میں نے درخت پر چڑھ کر چار پانچ پھل توڑے۔ اُن کا چھلکا بہت سخت مگر گُودا نرم اور شیریں تھا۔ تین پھل کھانے سے ہی ہمارے پیٹ بھر گئے اور ہم آگے بڑھ گئے۔

اب ہمارے سامنے بڑا ہی خوبصورت علاقہ تھا۔

دونوں طرف چھوٹی چھوٹی آبشاریں اور ندیاں تھیں۔ میں نے رات گزارنے کے لیے ایک آبشار کے ساتھ مسطح چٹان منتخب کی اور ہم سرِ شام ہی سو گئے چونکہ ہم بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے لیٹتے ہی ہمیں نیند بھی آ گئی تھی۔

علی الصباح جب میری آنکھ کھلی تو فضا میں ایک عجیب سی بُو رچی ہوئی تھی اور یہ بُو ایسی ہی تھی جیسے کہیں گوشت جل رہا ہو۔ میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر میری نگاہ دھوئیں کی ایک لکیر پر جا پڑی جو وادی سے اوپر اُٹھتی چلی گئی تھی۔

یہ کیسی آگ اور کیسا دھواں تھا؟ یہ جاننے کے لیے میں نے دیپا کو جگانا چاہا مگر اسے نیند میں مسکراتے دیکھ کر رُک گیا۔ شاید وہ کوئی خوبصورت خواب دیکھ رہی تھی اور خود بھی بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ ماضی کے ہر سفر میں مجھے خوبصورت لڑکیاں ملی تھیں اور ہر لڑکی اپنی مثال آپ تھی۔ دیپا کو دیکھ کر مجھے تاشیہ اور لالی یاد آگئیں۔ اُنھوں نے بھی مجھے کیسا ہی کی طرح ٹوٹ کر چاہا تھا۔

اچانک مجھے اپنے سر میں درد کی شدید لہریں اُٹھتی محسوس ہوئیں۔ ڈاکٹر فریدوں اور اُس کا کمپیوٹر میری تلاش میں تھے اور شاید کمپیوٹر نے مجھے تلاش کر لیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سر میں دھوئیں کے بادل سے اُٹھ رہے ہوں اور یہ دھواں کسی شور مچاتے راکٹ سے خارج ہو رہا ہو۔ ڈاکٹر فریدوں شاید مجھے واپس بلانے کی تیاری کر رہا تھا مگر میں ابھی واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور چٹان پر لوٹنے لگا کہ درد میری برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔

دفعتہً مجھے اپنے چہرے اور سر پر برف سی گرتی محسوس ہوئی۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ دیپا میرے منہ پر آبشار کے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار رہی تھی اور دہشت زدہ آواز میں کہہ رہی تھی۔ "کیا ہوا۔۔۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے سرفروش؟"

میں نے سر جھٹکا اور اُٹھ بیٹھا۔ دیپا روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اُس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میں بالکل ٹھیک

ہُوں دیپا۔ تم نے مجھے کیوں جگا دیا اور یہ پانی؟ کیا میں کل نہایا نہیں تھا؟"

"مگر تم نیند میں بڑبڑا رہے تھے، رو رہے تھے، چیخ رہے تھے۔ مجھے یُوں لگا جیسے تمھارا جسم تو یہاں ہے مگر تمھاری رُوح کہیں چلی گئی ہے۔ تم مجھے اکیلا چھوڑ گئے ہو۔ میں بہت ڈر گئی تھی سرفروش۔ مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جانا ورنہ میں مر جاؤں گی۔"

مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ اُسے کیا معلوم کہ میں کسی وقت بھی ذرّوں میں تبدیل ہو سکتا تھا۔

میری سمجھ میں نہ آسکا کہ ڈاکٹر فریدوں آتنی جلد واپسی کے درپے کیوں ہے؟

میں نے دیپا کی توجہ ہٹانے کے لیے دُھویں کی بلند ہوتی لکیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پُوچھا۔ "یہ دُھواں اور بُو کیسی ہے؟"

"شاید وہ مُردے جلا رہے ہیں۔ میں نے کبھی مُردے نذرِ آتش ہوتے تو نہیں دیکھے لیکن اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ ہمارے ہاں کبھی کبھی زرد موت کی وبا آتی ہے جس سے ہزاروں انسان مر جاتے ہیں اور اُنھیں زمین میں دفن کرنے کی بجائے نذرِ آتش کیا جاتا ہے۔"

میں یہ سُن کر کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔ اگر یہاں کوئی وبا پھُوٹی ہوئی ہے تو میں بھی اُس کا شکار ہو سکتا ہُوں۔ میں کچھ دیر تک سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ پھر میں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا اور ہم نے اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔

"یہ زرد موت کی وبا ہے کیا بلا؟" میں نے پُوچھا۔

"میں نے تو کبھی نہیں دیکھی۔" وہ بولی۔ "بڑے کہتے ہیں کہ ہر جمشیدی کو زندگی میں ایک بار اس وبا کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ پہلے اس مرض کا شکار شدید سر درد میں مُبتلا ہوتا ہے، پھر اس کی بغلوں میں گلٹیاں سی پیدا ہو جاتی ہیں، ناک اور کانوں سے خُون رِسنے لگتا ہے، اُس کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے اور آخر میں وہ ہنستے ہنستے مر جاتا ہے۔ کچھ لوگ اسے قہقہوں والی موت کی وبا بھی کہتے ہیں۔"

"قہقہوں والی موت؟" میں نے تعجب سے دُہرایا۔

"ہاں۔ جب مریض کا آخری وقت آتا ہے تو وہ قہقہے لگانے لگتا ہے۔ یہ قہقہے دراصل موت کی چاپ ہوتے ہیں اور سب سمجھ جاتے ہیں کہ اب وہ نہیں بچے گا۔"

"مریض کتنی دیر تک قہقہے لگاتا ہے؟"

"کبھی گھنٹوں اور کبھی چند منٹ۔۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے کوئی ایسا مریض کبھی نہیں دیکھا۔"

اس کے بعد میں نے دیپا سے مزید کوئی سوال نہ کیا۔ ہم چُپ چاپ آگے بڑھتے رہے اور اُس مقام کے قریب تر آ گئے جہاں مُردے جلائے جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر جمشیدی ایسی خطرناک وبا کا شکار ہیں تو یقیناً ان میں افراتفری پھیلی ہوئی ہو گی۔ وہ خوفزدہ ہوں گے اور ایسے حالات میں اُنھیں زیر کرنا مشکل نہیں ہو گا۔

کچھ دیر بعد ہم ایک بستی کے قریب پہنچ گئے۔ جس کے مکانات مٹی اور پتھروں سے بنے ہوئے تھے۔ کچھ مکانوں کے دروازوں پر زرد نشان پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اُن کے بارے میں دیپا سے کوئی سوال نہیں کیا۔

بستی کے بعد مجھے پہلا شمشان دکھائی دیا۔ یہ تقریباً بیس فٹ گہرا اور سو فٹ مربع نما گڑھا تھا جس میں مَردوں، عورتوں اور بچّوں کی لاشوں کے ڈھیر لگے ہُوئے تھے۔

"وہ دیکھو۔ ہمارے شہر کی عمارتیں نظر آ رہی ہیں۔"

میں نے ادھر نگاہ ڈالی تو واقعی شہر کی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے چھکڑوں کی ایک قطار بھی آتی دکھائی دی۔ ان چھکڑوں میں زرد موت کے شکار ہونے والے مُردے بھرے ہوئے تھے۔

ہم تربوزی سیبوں والے درختوں کے ایک جُھنڈ میں چھُپ کر یہ دلخراش منظر دیکھنے لگے۔ مُردے جلانے والے، چھکڑوں سے لاشیں گڑھے میں پھینکتے، اُن پر کوئی تیل چھڑکتے اور آگ لگا دیتے۔ اُنھیں اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ آنکھ اُٹھا کر بھی اِدھر اُدھر دیکھتے۔

میں نے مُردے لانے اور جلانے والوں کو غور سے دیکھا۔ وہ زرد رنگ کپڑے پہنے ہُوئے تھے۔ اُن کے سینے اور بازو کھُلے ہُوئے تھے لیکن اُن کے چہرے زرد رنگ کے لمبے لمبے نقابوں میں چھُپے ہُوئے تھے جن کے زرد سوراخوں سے وہ دیکھ سکتے تھے۔ اُنھیں دیکھ کر میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔۔۔ مگر دیپا نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"آؤ سرفروش۔ میں یہ منظر نہیں دیکھ سکتی۔ یہاں قریب ہی میرے کچھ عزیز رہتے ہیں۔ وہاں ہمیں کھانا اور لباس مل جائے گا۔ چلو۔"

ہم چھُپتے چھُپاتے شہر کے باہر ایک ایسے مکان کے دروازے پر پہنچ گئے جو ایک پہاڑی پر انھی تربوزی سیبوں والے درختوں کے ایک کُنج میں بنا ہُوا تھا۔ یہاں دیپا نے مجھے دو بُوڑھی عورتوں اور ایک لحیم و شحیم آدمی سے متعارف کروایا۔ وہ عورتیں دیپا کی پھوپھیاں تھیں اور موٹا آدمی غالباً اُن کا محبُوب یا شوہر تھا۔ اس کا نام موک تھا۔ اُن لوگوں نے ہماری خاطر و مدارت کی اور ہمیں صاف ستھرے لباس بھی دیے جو سُوت سے کھڈیوں پر بنے ہوئے کپڑے کے تھے۔

دیپا اپنی پھُوپھیوں کے ساتھ دُوسرے کمرے میں چلی گئی۔ موک مشروب کا ایک لوٹا لے کر میرے پاس آ بیٹھا۔ یہ مشروب اُنھی تربوزی سیبوں سے بنایا گیا تھا اور بہت تیز و تلخ تھا۔ چونکہ مجھے مو[illegible]

معلومات حاصل کرنا تھیں، اس لیے میں اُس کی ہاں میں ہاں ملانے اور پینے لگا۔

"بُوڑھی ملکہ جھیل میں تیرتے چبوترے پر اپنے خیمے میں دم توڑ رہی ہے اور سازندے بار بار وہی ایک ہی دُھن بجائے جا رہے ہیں جو بُوڑھی ملکہ کو بہت مرغوب ہے۔ جب بُوڑھی ملکہ مر جائے گی تو ننھی شہزادی دلآرا تاج و تخت سنبھالے گی۔۔۔ مگر یہ تو اسی وقت ممکن ہے جب دلآرا زندہ رہ جائے۔۔۔ اس لیے کہ بزرگِ دانشمند اور کمانداروں کے درمیان اقتدار کے حصُول کی چپقلش جاری ہے۔"

موک پیالے بھر بھر کر خود پیتا، مجھے پلاتا اور مسلسل بولتا جا رہا تھا۔ اگرچہ مجھے سخت متلی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر مجھے مُلک، خاص طور پر راجدھانی میں رُونما ہونے والے تازہ ترین واقعات کی معلومات حاصل ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے دیپا کے اشاروں پر بھی کوئی توجہ نہیں دی جو بار بار دُوسرے کمرے سے سر نکال کر مجھے اپنے پاس بُلا رہی تھی۔

میں نے موک کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ یہاں بھی ہمارے دور اور دُنیا کی طرح حصولِ اقتدار کے لیے سازشوں اور مکر و فریب سے کام لیا جا رہا ہے۔

"مجھے بزرگِ دانشمند کے بارے میں کچھ بتاؤ کہ وہ کون ہے؟ وہ وزیر ہے یا ملکہ کا مشیرِ خاص ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"وہ بڑا عیّار اور مکار آدمی ہے، پردیسی! جتنا میں فربہ ہوں اتنا ہی دُبلا ہے، اس کی کھوپڑی پر ایک بال بھی نہیں مگر اس کا پیٹ بہت بڑا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ساحرانہ قوتیں بھی رکھتا ہے۔ وہ بوڑھی ملکہ کا وزیرِ اعلا، دستِ راست اور مشیرِ خاص ہے بلکہ ملکہ تو برائے نام ہے ورنہ حکومت وہی کرتا ہے۔ اب اگر شہزادی اُس کے قابو میں نہ رہی تو وہ اُسے قتل کروا دے گا۔"

اتنا کہہ کر موک رُکا، اُس نے پیالہ خالی کر کے دوبارہ بھرا اور بولا۔ "مجھے ننھی شہزادی پر ترس آتا ہے میرے دوست! وہ بہت معصوم اور بے حد حسین ہے۔"

میں نے ایک کھُلے ہُوئے دریچے سے باہر دیکھا۔

ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا اور چاند ابھی طلوع نہیں ہُوا تھا۔ ہوا میں مُردے جلنے کی ہلکی ہلکی بساند رچی ہُوئی تھی۔

میں نے موک کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ کچھ کر گزرنے کے لیے اس سے زیادہ موزوں وقت پھر نہیں آ سکتا۔ موک نے یہ بھی بتایا تھا کہ بزرگِ دانشمند کی اپنی خصوصی سپاہ بھی ہے اور خفیہ مخبر بھی جو اُسے پل پل کی خبریں بہم پہنچایا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُسے میرے یہاں آنے کی خبر بھی مل چکی ہو۔

موک مسلسل پیتا اور بولتا رہا مگر میں نے معذرت کر لی۔

اس دوران دیپا بھی شاید مایوس ہو کر سو گئی تھی اور اس کی پھُوپھیاں تو شام سے پھر دِکھائی ہی نہیں دی تھیں۔ بالآخر موک نے بڑے زور سے ایک ڈکار لی اور اُسی چوبی چوکی پر لیٹ گیا جس پر ہم بیٹھے ہُوئے تھے۔ میں اسی وقت کا منتظر تھا۔ جلدی سے اُٹھ کر گھر سے نِکل گیا۔ حلق میں اُنگلی ڈال کر قے کی اور پھر اندر آ کر اُس کمرے میں چلا گیا جس کے دروازے سے دیپا اشارے کر رہی تھی۔

وہ اُس کمرے میں تنہا ایک چٹائی پر پڑی تھی۔ میری راہ دیکھتے دیکھتے اُسے نیند آ گئی تھی۔ میں بڑی آہستگی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ چراغ کی ٹمٹماتی لَو میں وہ مجھے کسی بچّے کی طرح معصوم نظر آئی۔ ویسے بھی وہ بمشکل بارہ تیرہ سال کی تھی اور اس نے بچپن کی دہلیز ابھی ابھی پار کر کے جوانی میں قدم رکھا تھا۔ پہلے تو میں نے اُسے جگانا چاہا مگر یہ سوچ کر رُک گیا کہ میں جس مہم پر جانے والا ہُوں، وہ اس سے بے خبر اور لاتعلق ہی رہے تو بہتر ہے۔ اگر میرا منصوبہ ناکام ہو گیا تو وہ مجھ سے لاتعلق ہونے کی بنا پر محفوظ و مامون رہے گی۔ بصورتِ دیگر اُسے میری وجہ سے سزا بھگتنا پڑ جائے گی۔۔۔ اور اگر میں اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو خود ہی اُسے ڈھونڈ لوں گا یا اُسے اپنے پاس بُلوا لوں گا۔

یہ سوچ کر میں نے اُس پر پیار بھری ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور کمرے سے باہر آ گیا۔ موک چوکی پر لیٹا بڑے زور سے خراٹے لے رہا تھا۔ میں دبے قدموں چلتا ہُوا گھر سے نِکل گیا۔

چاند ابھی طلوع ہو رہا تھا۔ میں اُس کی مدھم روشنی میں پہاڑی سے اُترا اور اُسی راستے پر چل پڑا، جدھر سے دیپا کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ دُور سے شمشان کے شعلے بھی میری رہبری کر رہے تھے۔ میں جلد ہی شمشان کے قریب پہنچ گیا اور تقریباً سو گز کے فاصلے پر چھُپ کر کھڑا ہو گیا اور اُسی لمحے میں نے اپنی زندگی کا وہ حیرت انگیز اور سنسنی خیز منظر دیکھا جس سے میری رُوح تک کانپ گئی۔

شعلے بھڑک رہے تھے اور لاشیں جل رہی تھیں لیکن مجھے یہ دیکھ کر شدید ترین حیرت کا جھٹکا لگا تھا کہ ایک شخص لاشوں کے سر الگ کر رہا تھا۔

میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی اتنی سربریدہ لاشیں نہیں دیکھی تھیں۔

*

اپنی نئی زندگی شروع کرنے کے لیے میرے پاس خنجر کا لمبا پتھر کا ایک چاقو تھا۔ ہتھیار میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا بشرطیکہ

سوچا کہ جب وہ کڑے پہرے کے باوجود مجھے اپنے سامنے دیکھے گا تو مجھ سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا... اور ہماری یہ پہلی ہی ملاقات فیصلہ کن ہوگی۔ یا تو میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا یا پھر موت میرا مقدر بن جائے گی۔

داخلی دروازے والے محافظ عمارت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہل کر پہرہ دینے لگے۔ ابھی پو پھٹنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ ساحل سے شاہی شامیانے کی طرف آنے جانے والے بجروں کے پھیرے ختم ہو گئے تھے مگر دور سے موسیقی کی لہریں اب بھی ہوا کے دوش پر یہاں تک پہنچ رہی تھیں اور اس کا مطلب تھا کہ ملکہ ابھی زندہ ہے۔

خشونی کی رہائش گاہ کے داخلی دروازے پر نصب مشعل کی روشنی میں محافظوں کے سائے کبھی سکڑ سمٹ جاتے اور کبھی طویل ہو جاتے تھے۔

میرے پاس ہتھیار کے نام پر صرف وہی ایک چقماق کا چاقو تھا جب کہ سپاہیوں کے پاس تلواریں خنجر اور بھالے تھے اور میں اُس وقت تک عمارت میں داخل نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ دونوں کو ٹھکانے نہ لگا دوں۔ یوں تو انھیں ختم کر دینا میرے لیے مشکل نہیں تھا لیکن ان کی ہلکی سی آواز بھی دوسرے محافظوں کو ادھر متوجہ کر سکتی تھی۔ جس سے کھیل بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔

جب سپاہی مسلسل چلتے ہوئے تھک گئے اور دم لینے کو رُک کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے تو میں بھاگ کر عمارت کے سرے پر باڑ کی چھاؤں میں لیٹ گیا۔

محافظ کچھ دیر بعد پھر چلتے ہوئے عمارت کے سرے کی طرف بڑھنے لگے۔ اب ایک محافظ میرے قریب تر آ رہا تھا اور دوسرا مخالف سمت میں جا رہا تھا۔

میری طرف آنے والا سپاہی اپنے قومی گیت کی دُھن گنگناتا ہوا جب مجھ سے تین قدم آگے نکل گیا تو میں نے ایک دم اُٹھ کر پیچھے سے اپنا ایک ہاتھ اُس کے منہ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا چاقو اس کے نرخرے پر پھیر دیا۔

اُسے اتنی مہلت بھی نہ مل سکی کہ وہ ذرا سی بھی جدوجہد ہی کر سکتا۔ اس کے گلے سے بہنے والے خون نے نہ صرف اس کی وردی تربتر کر دی بلکہ میرے کپڑے بھی خون آلود ہو گئے... مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی بلکہ ان کا خون آلود ہونا میرے حق میں اچھا ہی تھا۔

میں نے جلدی سے سپاہی کو باڑ کی طرف گھسیٹا اور اُس کی تلوار اپنے قبضے میں کر لی جو چھوٹی مگر چوڑی اور دودھاری تھی۔ میں نے جلدی سے تلوار کی پیٹی اپنی کمر کے گرد باندھی اور لاش باڑ کی جڑوں میں پھینک کر سپاہی کی طرح داخلی دروازے کی طرف بڑھنے کو تیار ہو گیا۔ جونہی دوسرا محافظ عمارت کے سرے سے پلٹا میں نے آگے بڑھنا شروع کر دیا مگر درختوں کی چھاؤں سے گزرتے ہوئے میں نے تلوار پیٹی سے نکال لی اور اسے ٹانگ سے چپکا لیا تاکہ دور سے محافظ کی نظر اس وقت تک اُس پر نہ پڑ سکے جب تک وہ میری زد میں نہ آ جائے۔

...اور جب وہ تلوار کی زد میں آیا تو پہلے اُس کی گھگھی بندھ گئی، کیونکہ میں نہ تو اس کا ساتھی تھا اور نہ ہی جمشیدی جو قد و قامت میں مجھ سے بہت چھوٹے تھے۔ وہ بے چارہ صرف اتنا ہی کہہ سکا ”بڑے شیطان کیسے بن گئے، نادری؟“

دوسرے لمحے اس کا کام تمام ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی لاش مشعل کی روشنی کے دائرے سے گھسیٹ کر اندھیرے میں باڑ کے پیچھے پھینکی اور عمارت میں داخل ہو گیا۔

یہ ایک کشادہ راہداری تھی جس میں چھوٹی سی شمع روشن تھی۔ میں نے تلوار سے لگے خون سے اپنے چہرے اور آنکھوں کے گرد لکیریں کھینچیں تاکہ زیادہ سے زیادہ خوفناک نظر آؤں اور پھر اوپر جانے والا زینہ طے کرنے لگا۔

اوپر کوئی محافظ نہیں تھا۔

وہاں بھی ایک ہی موٹی شمع جل رہی تھی۔

ایک کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ اس طویل و عریض کمرے میں کسی قسم کی تزئین و آرائش نہ تھی۔ ایک کونے میں بہت بڑی میز پر کاغذوں اور کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور دوسرے کونے میں ایک بستر پر بزرگ خشونی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔

میں دبے قدموں اُس کے قریب پہنچا اور اُس کے نوکِ شمشیر چبھوتے ہوئے بولا: ”اُٹھ اے بزرگ دانشمند۔ ہو خشونی اور استقبال کر موت کے فرشتے کا...“

خشونی کے تربوز نما سر سے چادر ہٹی اور اُس کی چھوٹی آنکھیں مجھے گھورنے لگیں۔ میں اُس کے سامنے خون آلود خوفناک چہرہ لیے کھڑا تھا مگر خشونی کی پرسکون اور گمبھیر آواز سُن کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔

”تم بڑے احمق ہو مُردہ بردار... ابھی میں زندہ ہوں کام کرو اور مجھے آرام سے سونے دو۔“ وہ بولا۔

میں نے اپنی خفت چھپانے کے لیے قہقہہ لگایا ”میں مُردہ بردار نہیں ہوں اور یہ حقیقت تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ یہ بننے کی کوشش نہ کرو اور یہ بتاؤ کہ تم پوری طرح بیدار ہو کر میری بات سمجھ رہے ہو یا نہیں؟ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“

خشونی پہلے میری طرف دیکھتا رہا پھر اُسی گمبھیر لہجے میں بولا۔ ”تم ہمارے مُردہ بردار نہیں ہو... مگر تم کون ہو؟ یہاں کیسے پہنچے اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”میں تمہارے محافظوں کو تہ تیغ کرنے کے بعد یہاں پہنچا ہوں اور اسی آسانی سے تمھیں بھی موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں... اگر تم نے بلا چون و چرا میرے احکامات کی تعمیل نہ کی تو یہ تربوز کاٹ کر تمہارے قدموں میں رکھ دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے یوں تلوار بلند کی جیسے اس کا تربوز نما سر کاٹنے کے لیے تیار ہوں۔

خشونی کا گھنٹی والی رسی کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ رُک گیا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“ وہ بولا مگر یہ کہتے ہوئے اس کی پلکوں سے محروم آنکھوں میں خوف کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں تھی۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ میرا مدمقابل میرے جیسا کائیاں تھا اور میں اس پر صرف طاقت سے ہی قابو پا سکتا تھا، فہم و فراست سے نہیں۔ میں نے تلوار پیٹی میں اُڑسی اور کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”سنو خشونی۔ تم مجھ سے کوئی سوال نہیں کرو گے کیونکہ تم میری بات پوری طرح نہیں سمجھ پاؤ گے یا بہت کم سمجھو گے۔“

خشونی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تم میرے چہرے مہرے اور قد و قامت سے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں نہ تو جمشیدی ہوں اور نہ ہی تمہاری دُنیا کا آدمی ہوں۔ میں زمان و مکاں کا سفر کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔ میں نہ تو کوئی دیوتا ہوں اور نہ ہی شیطان یا بھوت پریت ہوں۔ مجھے تمہاری دُور کی دُنیا میں ایک خصوصی مہم پر بھیجا گیا ہے۔ جب میں اپنا کام مکمل کر لوں گا تو مزید کشت و خون کیے بغیر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اگر تم میری یہ باتیں سمجھ گئے ہو تو میری مخالفت کی بجائے میرا ہاتھ بٹاؤ تاکہ میں جلد از جلد یہاں سے واپس جا سکوں۔“

”میں تمہارے ہر لفظ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ اگر ان کے کچھ اور معنی ہیں تو وہ بھی بہت جلد سمجھ جاؤں گا۔ یہ زمان و مکاں کے سفر کا نظریہ میرے لیے... کوئی نئی بات نہیں۔ میں فی الوقت اس بات کا یقین رکھتا ہوں کہ تم جلد چلے جاؤ گے۔ اگر تمہارا مقصد میرے مفادات کے خلاف ہوا تو میں تم سے دشمنی کر سکتا ہوں مگر ایسا سوچنا بھی حماقت ہے... اور سنو: میں تم سے خائف بھی نہیں ہوں... اگر تمھیں مجھ کو قتل کرنا ہوتا تو کر چکے ہوتے۔ اس کا مطلب ہے تمہارا مفاد میری موت سے نہیں بلکہ میری زندگی سے وابستہ ہے۔“

خشونی باشُبہ بے حد ذہین آدمی تھا اور اُس کا دماغ کسی کمپیوٹر کی طرح کام کرتا تھا مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی طور بھی خود کو مجھ سے برتر سمجھے اس لیے میں نے دوبارہ تلوار نکالتے ہوئے کہا: ”یہ تربوز تو میں اب بھی کاٹ سکتا ہوں۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولا: ”جب سودے بازی کرنے آئے ہو تو وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟ صاف صاف کہو کہ تم کیا چاہتے ہو اور میں تمھیں کس نام سے مخاطب کروں؟“

”میرا نام سرفروش ہے۔ میں یہاں تنہا آیا ہوں اور یہاں سے اکیلا ہی واپس جاؤں گا۔ یہ بتاؤ کہ بوڑھی ملکہ کب تک دم توڑ سکتی ہے؟“

”جمشیدی مجھے بزرگ دانشمند کہتے ہیں اور میں واقعی دانشمند بھی ہوں لیکن اس سوال کا جواب دینا میرے بس سے باہر ہے۔“

”مگر تم اندازہ تو لگا سکتے ہو۔“

”وہ ایک پل، ایک گھنٹے، ایک دن یا ایک ماہ بعد مر سکتی ہے۔ یہ میرا اندازہ ہے۔“

”اچھا تو یہ بتاؤ کہ اس کی ذہنی حالت کیسی ہے؟“

”اس کی ذہنی حالت مخدوش ہے۔ وہ ماضی کی سنہری یادوں کی دُھند میں بھٹکتی رہتی ہے۔ یوں تو کوئی بات بمشکل ہی سمجھتی ہے لیکن اگر موسیقی ایک لمحے کے لیے بھی بند ہو تو وہ چیخ اُٹھتی

ہے کہ یہ نفرہ جاری رہے۔"

میں یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔

چند لمحوں بعد خشونی دوبارہ بول اٹھا: "مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم نے کس طرح یونگ کا کام تمام کیا تھا لیکن اس کے بعد تم درتے والی چوکی سے نہیں گزرے تھے بلکہ غائب ہو گئے تھے۔ پھر تم یہاں کیسے پہنچے سرفروش؟"

میں نے دیپا کا تذکرہ کیے بغیر جواب دیا: "پہاڑ عبور کر کے۔"

"یہ ناممکن ہے۔ جمشیدیوں کی تاریخ میں کوئی بھی پہاڑ عبور نہیں کر سکا۔"

"مگر میں جمشیدی نہیں ہوں۔ میں بڑی پُراسرار قوتوں کا مالک ہوں اس لیے میں نے وہ دشوار گزار پہاڑ عبور کر لیا اور اب تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ خیر یہ باتیں چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ ملکہ اپنے مفاد کی کوئی تجویز، مشورہ سمجھنے بوجھنے کی اہلیت رکھتی ہے یا نہیں؟"

"ہاں... بلکہ وہ ان دستاویزوں اور احکامات پر دستخط بھی کر لیتی ہے جو میں اُسے پیش کرتا ہوں۔"

"وہ دستاویز اور احکامات تمہارے حق میں ہوں گے خشونی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "تاکہ بوڑھی ملکہ کی موت کے بعد زیادہ سے زیادہ اقتدار کے مالک تم ہی بنے رہو اور ننھی شہزادی دلآرا تمہارے قابو میں رہے۔"

"تمہاری سوچ میری سوچ سے ہم آہنگ ہے، سرفروش۔" وہ بھی مسکراتے ہوئے بولا: "اس کا مطلب ہے کہ ہم اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں یا کم از کم ایک دوسرے کی مخالفت نہیں کر سکتے تاہم اتنا اور بتا دو کہ تم میرے ذریعے اپنے بارے میں ملکہ کو کیا کہلوانا اور کس قسم کے حکم نامے پر اس کے دستخط کرانا چاہتے ہو؟"

خشونی میرا مقصد سمجھ گیا تھا۔

"تم کسی حد تک میرا مقصد سمجھ گئے ہو۔ تم ملکہ سے تخلیے میں ملو گے اور اس سے کہو گے کہ آج رات تم نے خواب میں دیکھا ہے کہ..."

"اور یہ کوئی جھوٹی بات بھی نہیں۔" وہ میری قطع کلامی کرتے ہوئے بولا: "میں اب تک وہ خواب... بلکہ دہشت ناک خواب دیکھ رہا ہوں۔"

"تم ملکہ سے کہو کہ خواب میں تمہیں ایک اوتار کے آنے کی بشارت دی گئی تھی اور میں وہی اوتار ہوں جو جمشیدیوں کو دُکھوں اور مصیبتوں سے نجات دلانے آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری مذہبی کتابوں میں بھی ایک ایسے اوتار کی بشارت دی گئی ہے جو جمشیدیوں کو مصائب سے نکال کر خوش حال زندگی فراہم کرے گا۔"

اس بات پر پہلی بار مجھے خشونی کی آنکھوں میں حیرت، احترام اور خوف کے ملے جلے تاثرات کی جھلکیاں دکھائی دیں۔ شاید وہ میری ان معلومات پر متعجب تھا جو مجھے دیپا اور موک سے حاصل ہوئی تھیں۔

"جمشیدیوں کے بارے میں مجھے تمہاری معلومات پر حیرت ہے۔" اس نے کہا۔

"پھر کیا میں اوتار نہیں ہو سکتا؟" میں نے پوچھا۔

خشونی نے پہلی بار کھل کر قہقہہ لگایا اور بولا: "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں احمق نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے۔ میں وہی کروں گا جو تم چاہتے ہو اس لیے کہ اگر تم اپنے وعدے پر قائم رہے تو مجھے اس سے فائدہ پہنچے گا۔ میں ایک عملی آدمی ہوں۔ جب تم اپنے کہنے کے مطابق واپس چلے جاؤ گے تو اقتدار مجھے مل جائے گا اس لیے یہ سودا طے ہو گیا۔"

"تم بہت چالاک ہو خشونی۔" میں نے اس کے دل کی بات سمجھتے ہوئے کہا: "تم جانتے ہو کہ اگر مجھے اوتار تسلیم کر لیا گیا تو تمہارے مخالف کمان دار ہاتھ ملتے رہ جائیں گے اور ملکہ کی موت کے بعد بغاوت کرنا چاہتے ہیں، وہ نہیں کر پائیں گے۔"

یہ سن کر اس کی آنکھیں احترام سے جھک گئیں۔ "تم میرے اندازے سے کہیں زیادہ فہم و فراست کے مالک ہو اور تمہارے اندر واقعی اوتاروں والی صفت ہے حالانکہ میں نہ تو جمشیدیوں کی کتابوں پر اعتقاد رکھتا ہوں اور نہ ہی اوتاروں کو مانتا ہوں۔" کہہ کر وہ اٹھا اور جلدی جلدی لباس تبدیل کرنے لگا۔

خشونی کا قد پانچ فٹ سے بھی قدرے کم تھا اور وزن سو پونڈ سے زیادہ رہا ہوگا۔

کپڑے پہننے کے بعد اس نے تکیے کے نیچے سے ایک زنجیر نکالی اور گلے میں ڈالنے لگا کہ میں نے کہا: "ذرا ٹھہرو۔" پھر میں نے اس کے ہاتھ سے زنجیر لے لی اور اس کا جائزہ لینے لگا۔

زنجیر لوہے کی بنی ہوئی تھی اور اسے کاریگری کا ایک نمونہ کہا جا سکتا تھا۔ وہ کافی وزنی بھی تھی۔ خشونی نے زنجیر کی طرف بے تابی سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ پہننے والی ہے۔ اگر تم نے واقعی میرے محافظوں کو قتل کر دیا ہے تو ان کی لاشیں بھی ٹھکانے لگانا پڑیں گی۔"

میں نے زنجیر اسے واپس کر دی۔

اس نے جلدی سے اسے گلے میں ڈالا اور بولا: "اگر جمشیدیوں کی مذہبی کتابوں میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ اوتار شہزادی سے شادی کرے گا... مگر میں سوچ رہا ہوں کہ اس کا جو ہر کوئی غیر معمولی آدمی ہی ہونا چاہیے اور تم ایک غیر معمولی انسان ہو۔"

"ننھی شہزادی کی عمر کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دس سال..."

مجھے یہ سن کر بڑی خجالت محسوس ہوئی۔ وہ ایک دس سالہ بچی سے میری شادی کی سوچ رہا تھا۔ میں نے کہا: "تم بڑے دوراندیش ہو خشونی... مگر یہ باتیں اس وقت سوچنے کی نہیں ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" وہ بولا: "میں نے تمہیں اس لیے بتایا ہے کہ یہ بات بھی تمہارے ذہن میں رہے۔"

میرا دل اس خبیث سے شدید نفرت کا شکار ہو گا۔

• •

اگلے چند گھنٹوں میں مجھے خشونی کی اہمیت و اہلیت کا صحیح اندازہ ہو گیا۔ وہ ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی تھا اور اس کے نوکر، سپاہی اور محافظ اُس کے احکامات کی اندھا دھند تعمیل کرتے تھے۔

اس دوران مجھے ویسا ہی قیمتی لباس دے دیا گیا تھا جیسا خشونی استعمال کرتا تھا اب مجھے تلوار بھی دوسری فراہم کر دی گئی تھی جس کی نیام اور دستے پر یاقوت اور ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ میں نے خشونی سے اُن کے بارے میں پوچھا۔

وہ بے نیازی سے بولا: "یہ پتھر قریبی پہاڑوں کی کانوں سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں بس یونہی زیبائش کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔"

میں نے اُسی وقت سوچ لیا کہ ان کانوں کا معائنہ ضرور کروں گا۔ اس سفر سے پہلے ڈاکٹر فریڈل نے مجھے ارضیات پر بہت سی کتابیں پڑھنے کو دی تھیں اور اب میں اچھا خاصا ماہر ارضیات بن چکا تھا۔ میں خام دھاتوں کو بخوبی پہچان لیتا تھا اور مٹی کی تہ دیکھ کر یہ اندازہ بھی لگا لیتا تھا کہ یہاں سے تیل برآمد ہو سکتا ہے یا نہیں۔ علم الارض کا مطالعہ مجھے اس لیے کروایا گیا تھا کہ کمپنی کے اس پروجیکٹ پر کروڑوں کی رقم خرچ ہو چکی تھی اور حکومت ان اخراجات کا نعم البدل چاہتی تھی۔ چنانچہ معدنی دولت کو اپنی دُنیا اور دَور میں منتقل کرنے کے لیے بھی تجربات جاری تھے۔

میں انھی سوچوں میں ڈوبا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ مجھے کُوڑے ڈھونے والا ایک چھکڑا دکھائی دے گیا۔ وہ ہر گھر کے سامنے رکتا تھا، لوگ اپنے گھروں سے مُردے لاتے تھے اور پہیے سے پڑے مُردوں پہ ڈھیر کر دیتے تھے۔ خشونی نے بتایا تھا کہ اس سے پہلے زرد موت کی وبا کبھی اتنی شدت سے نہیں پھوٹی تھی اور اب تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ ممکن ہے وقت مجھے اس وبا سے بھی کوئی کام لینے کا موقع دے دے۔ چنانچہ میں خشونی کے گھر کی بالائی منزل سے اس چھکڑے اور دُور شمشان سے اٹھنے والے دُھوئیں کی طرف دیکھتا رہا۔ خشونی نے اُن دو محافظوں کی لاشیں بھی اُسی چھکڑے میں پھنکوا دیں اور کسی نے بھی اُس سے کوئی سوال نہ کیا۔

اچانک مجھے دیپا یاد آ گئی۔

میں نے سوچا کہ وہ اپنی بچیوں کے پاس محفوظ ہے۔ وہ وبا کے ڈر سے شہر میں نہیں آئے گی اگر میرا منصوبہ کامیاب رہا تو اسے بلواؤں گا یا خود جا کر مل لوں گا۔ زرد موت کی یہ وبا یوں تو شہر کے باہر بستیوں میں بھی پھیل چکی تھی... مگر شہر میں اس کا زور زیادہ تھا۔

میں دیپا اور موک سے اس وبا کے پھوٹنے کی وجوہ پر بحث کرتا رہا تھا۔ جمشیدیوں کی راجدھانی میں نہ تو جوہڑ تھے اور نہ ہی پسو وغیرہ تھے... پھر کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اچانک میری نگاہ دور ایک مکان پر جا پڑی جس کی بالائی منزل کی کھڑکی سے ایک عورت نے تسلے سے کوئی چیز نیچے گلی میں انڈیلی تو وہاں سے گزرنے والا ایک راہ گیر اُس سے لڑنے جھگڑنے لگا...

پھر یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اس عورت نے غلاظت انڈیلی تھی، وہاں سے آنے والی بدبو نے مجھے کھڑکی بند کرنے پر مجبور کر دیا۔

چھکڑے پر آتے ہوئے بھی مجھے شہر کی گلیوں سے بدبو آ رہی تھی۔ تو دراصل وبا کی باعث یہی گندگی تھی جس کی طرف جمشیدی کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ اتنے میں مجھے باہر سے لگاتار قہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جیسا کہ دیپا نے مجھے بتایا تھا کہ یہ خوفناک قہقہے واقعی موت کی چاپ لگتے تھے۔

موت نے پھر کسی کے دروازے پر دستک دی تھی اور کسی کی جان لیے بغیر وہاں سے ٹلنے والی نہیں تھی۔

اس خیال سے ہی مجھے جھرجھری آ گئی۔

خشونی اب تک واپس کیوں نہیں آیا؟ میں سوچنے لگا۔ ملکہ کے پاس جاتے وقت اُس نے مجھ سے کہا تھا: "اگر میں ملکہ کو یہ یقین دلانے میں ناکام رہا کہ تم ہی وہ اوتار ہو جس کا جمشیدیوں کی مذہبی کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے تو میں مستقبل کے متعلق کوئی خوش آئند وعدہ نہیں کر سکتا۔ محل کا ہر کمان دار اقتدار کا بھوکا ہے اور ایک دوسرے کے خلاف سازش میں مصروف ہے اگر ان

میں اتحادیے تو صرف میرے خلاف ہے۔ اب تک تو میں اُن میں پھوٹ ڈلوا کر اقتدار سنبھالے رہا ہوں مگر ملکہ کی موت کے بعد حالات یکسر بدل جائیں گے۔"

میں کمرے میں ٹہلنے لگا اور سوچنے لگا کہیں خشونی میرے ساتھ دہری چال تو نہیں چل رہا؟ اگر ایسا ہے تو مجھے کیا کرنا چاہیئے اب تو میں یہاں سے فرار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ میرے پاس ایک عمدہ تلوار تھی لیکن مگر سپاہیوں کا ایک دستہ مجھے گھیر لے تو میں کیا کر سکتا تھا؟ چند ایک کو مارنے کے بعد خود میرے مرنے کی باری بھی آ سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد خشونی آ گیا۔

میں اس پہ پھٹ پڑا۔ "کہاں مر گئے تھے؟ میں تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے پاگل ہو گیا ہوں۔"

خشونی نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے ٹھنڈا ہونے کا اشارہ کیا اور اپنی زنجیرے کھیلتے ہوئے بولا۔ "ملکہ کو یقین دلانا کوئی آسان کام نہیں تھا سرفروش۔"

"کیا اُسے یقین آ گیا ہے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں۔ لگتا تو ایسا ہی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک پڑا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ اُس پہ بار بار غشی کے دورے پڑ جاتے ہیں۔ وہ قریب المرگ ہے اور یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ بات پوری طرح سمجھی بھی ہے یا نہیں۔ بہرکیف ہمیں جلدی سے وہاں پہنچنا چاہیے۔ کمان دار گدھوں کی طرح ملکہ کے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔"

"تو پھر دیر کیوں کر رہے ہو۔ چلو۔" میں نے کہا۔

ہم کمرے سے باہر آ گئے۔

جب میں خشونی اور ایک محافظ کے ساتھ گھر سے نکلا تو سوچ رہا تھا کہ مجھے خشونی کی بجائے کسی ایسے کپتان کا انتخاب کرنا چاہیے تھا جس کے جیتنے کا امکان زیادہ ہوتا لیکن عدم واقفیت اور حالات نے مجھے خشونی کو منتخب کرنے پر مجبور کر دیا تھا اس لیے اب اچھے یا بُرے، ہر نتیجے کا سامنا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

ہم بجرے پر سوار ہو کر شاہی شامیانے کی طرف روانہ ہوئے جو ایک چوبی پلیٹ فارم پر نصب تھا اور اس پلیٹ فارم کے لنگر جھیل میں ڈال دیے گئے تھے۔ شامیانے سے وہی دھن سنائی دے رہی تھی جس میں دل موہ لینے والی تلخ مٹھاس گھلی ہوئی تھی۔

جب ہم بجرے سے اُترے تو میں اندازہ لگا چکا تھا کہ [illegible] سے لوگوں کی آنکھوں میں بزرگ دانشمند خشونی کے لیے نفرت ہوئی ہے لیکن بظاہر انھوں نے اس نفرت پر ادب واحترام کے پردے ڈال رکھے تھے اور وہ جو اس وقت خشونی کے اشارے پر اپنی گردن جھکا رہے تھے، کسی بھی بڑے لمحے اُس کی گردن اُڑا [illegible] تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے خشونی کے ساتھ سودا کر کے ایسی بھول بھلیوں میں قدم رکھ دیا ہے جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں اور خشونی نے اپنے خلاف نفرت کے جو بیج بوئے ہیں، ان کی فصل مجھے کاٹنا پڑے گی۔

تیرنے والے چوبی پلیٹ فارم پر نصب شامیانے کے کئی حصے تھے۔ سب سے آخر میں وہ حجلۂ مرگ تھا جس میں اجل رسیدہ ملکہ ایک حنوط شدہ لاش کی طرح موت کے فرشتے کا انتظار کر رہی تھی۔

جب ہم اُس حجلۂ مرگ کو جانے والے راستے کی طرف [illegible] تو خشونی نے ملکہ کی خواب گاہ کے دروازے پر کھڑے پانچ کمان داروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ "وہ گدھوں کی طرح ملکہ کی موت کے منتظر ہیں جیسے یہ میرے دشمن تھے، اب تمہارے بھی بن جائیں گے۔"

میں پہلی نگاہ میں ہی انھیں پہچان چکا تھا۔ وہ میرے لیے کسی کتاب کے ایسے پانچ اوراق تھے جنھیں میں بار بار پڑھ چکا [illegible] وہ سب نفرت، نخوت، غیض، ہوسِ اقتدار اور شک و شبہے کی بولتی تصویریں تھے۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ میرے بارے میں شک و شبہے میں مبتلا ہو کر سوچتے رہیں کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔

خشونی نے پھر سرگوشی کی۔ "مجھے تم کو اُن سے متعارف کرانا ہو گا۔ تمہارے امتحان اور اداکاری کا یہی وقت ہے۔ اپنے آپ کو [illegible] اور بہادر ظاہر کرنا۔"

خشونی نہیں جانتا تھا کہ میں ایسے مرحلوں سے کئی بار گزر چکا تھا اسی لیے میں نے پہلے ہی اپنا سینہ تان لیا تھا۔ خشونی نے [illegible] لہجے میں انھیں مجھ سے متعارف کرایا جس میں حقارت اور [illegible] دونوں شامل تھیں۔

"یہ بیشا ہے، یہ فرزال، یہ نورنگ، یہ اساد اور یہ راخش۔"

پہلے چار کمان داروں نے تو اپنے اپنے نام پر گردن اُٹھا [illegible] اور ایڑی بجائی... مگر پانچویں یعنی راخش نے مصافحے کے لیے ہاتھ بھی میری طرف بڑھا دیا اور جب میں نے اس سے ہاتھ [illegible]

تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا ہاتھ کسی آہنی شکنجے میں آ گیا ہو۔ میں نے دیکھا کہ کمان داروں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا اور پھر راخش کی گرفت میں شدت آتی چلی گئی۔ وہ اگرچہ اکہرے بدن کا آدمی تھا مگر اس کے کندھے چوڑے اور ہاتھ میں بے پناہ طاقت تھی۔ یہ ان لوگوں کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں درد کی شدت سے چلا اُٹھوں تاکہ وہ میرے اوتار ہونے کا مذاق اُڑا سکیں۔

راخش پوری قوت سے میرا ہاتھ بھینچ رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے میرے ہاتھ کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی لیکن چونکہ میں شروع سے ہی یہ چال سمجھ گیا تھا اس لیے میں شدید تکلیف کے باوجود مسکراتا رہا۔ میں نے راخش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کی آنکھوں میں دوسرے کمان داروں کی طرح نفرت اور خوف نہیں تھا۔ جب وہ اپنی پوری قوت آزما چکا تو میں نے اُس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ میرے بازو کی مچھلیاں پھڑکنے لگیں اور راخش کے تاثرات بدلنے لگے اب اُس کے چہرے پہ تکلیف کی تحریر پڑھی جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اُس کے ساتھی کچھ متعجب سے ہو گئے پھر راخش کا منہ کھلا اور اس کی پیشانی پہ پسینے کے قطرے جھلملانے لگے مگر وہ کب تک ضبط کرتا۔ بالآخر وہ ایک کراہ کے ساتھ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا۔ "بس کرو۔ بس کرو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو۔ اب میرا ہاتھ چھوڑ دو۔"

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "بڑا اچھا مقابلہ تھا راخش۔ مجھے لطف آیا۔ تم بھی خاصے طاقتور ہو۔ جب کبھی وقت اور موقع ملا تو ہم پھر پنجہ لڑائیں گے۔"

راخش خاموشی سے اپنا ہاتھ ملتا رہا۔ اس کا ایک ساتھی بولا۔ "مانا کہ یہ طاقت ور ہے مگر اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ یہ اوتار ہے۔"

تیسرے کمان دار نے کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ بزرگ دانشمند ایسا اوتار ڈھونڈ لایا ہے جو اس کے کام آ سکے۔"

خشونی اُن کی ان سنی کرتے ہوئے میرے ساتھ ملکہ کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

خواب گاہ میں روشنی مدھم لیکن موسیقی کی آواز تیز تھی اور ایک کونے میں بڑے سے پلنگ پر ملکہ ساکت لیٹی ہوئی تھی۔

خشونی نے سرگوشی کی۔ "میں تمہارے متعلق جو کچھ کہہ سکتا تھا ملکہ سے کہہ چکا ہوں۔ تم نے ان کمان داروں کو بھی دیکھ ہی لیا ہے۔ اب تمھیں ہر صورت میں ملکہ کی خوشنودی حاصل کرنی ہے۔ یہ تم کیسے کرو گے، میں نہیں جانتا۔ یہ تمہارا کام ہے۔ جاؤ۔"

آگے بڑھو۔"

موسیقی کے لہریے اور چھناکے تیز تر ہو گئے۔ میں نے ملکہ کے جھریوں بھرے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اگرچہ اس پہ چادر پڑی ہوئی تھی لیکن ایسا لگتا تھا جیسے اس کا وجود ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا ہو۔

میں کافی دیر تک انتظار کرتا رہا کہ وہ آنکھیں کھولے تو کوئی بات کروں مگر وہ اسی طرح بے حرکت پڑی رہی تو مجھے گمان گزرا کہ کہیں وہ مر گئی ہو لیکن اُسی لمحے اُس نے یوں آنکھیں کھول دیں جیسے اُس نے میری سوچ کی آواز سن لی ہو۔

ملکہ کی بوڑھی اور کالی اور گہری آنکھیں میرے چہرے پر ٹک گئیں۔ اُن نگاہوں میں کوئی خاص بات ضرور تھی۔ پھر ملکہ نے پُتلیاں گھما پھرا کر اوپر نیچے کر کے میرے قد و قامت کا جائزہ لیا۔ وہ شاید اپنا سر نہیں ہلا سکتی تھی آخر وہ کپکپاتے ہونٹوں سے بولی۔ "تو تم وہ سرفروش ہو جس کا ذکر ہماری مذہبی کتابوں میں موجود ہے۔"

"ہاں۔ میں وہی ہوں ملکہ۔"

ملکہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں پھر میرے وجود کا جائزہ لینے لگیں۔ اُس کے ہونٹ یوں سکڑے جیسے اس نے

مسکرانے کی کوشش کی ہو۔
"کیا ہم اکیلے ہیں یا میری خواب گاہ میں کوئی اور بھی موجود ہے؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔
میں نے دروازے کی جانب دیکھا جہاں نیم روشن قنات کے ساتھ خشونی دونوں ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور اُس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھا کر ملکہ سے کہا: "خشونی دروازے کے پاس کھڑا ہے لیکن وہ ہماری گفتگو نہیں سُن سکے گا۔"
ملکہ نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر بڑے ٹھہرے ہوئے لیکن گمبھیر لہجے میں کہنے لگی: "تم اول درجے کے جھوٹے ہو سفروش۔ نہ تو تم خشونی کو خواب میں دکھائی دیے تھے اور نہ ہی تم کوئی اوتار ہو۔ میں جانتی ہوں کہ ہماری کتابوں میں ایک تاجی کا تذکرہ ضرور کیا گیا ہے لیکن تم وہ تاجی نہیں ہو۔ بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم ذہین اور طاقتور ہو۔ چہرے مہرے اور قدوقامت نے تمھیں مرعوب کُن شخصیت عطا کردی ہے اس لیے تم جھوٹے اوتار بن کر ہماری مذہبی کتب میں کیا گیا وعدہ ایک اوپرے طریقے سے پورا کرسکتے ہو۔ یوں تو ہر جمشیدی کی طرح میں بھی احمق ہوں مگر ہر اعتبار سے نہیں۔ تم جو کوئی بھی ہو اور جہاں کہیں سے آئے ہو، مجھے تم پر اعتماد ہے۔ میں اپنی قوم کی باگ ڈور تمھارے ہاتھ میں دے رہی ہوں۔ یہ بہت بڑی ذمّے داری ہے کیا تم اسے سنبھال لوگے؟"
"آپ کا کیا خیال ہے ملکہ عالیہ؟"
"تمھاری آنکھوں میں دیوتاؤں کی سی چمک اور گہرائی ہے مگر تم دیوتا نہیں ہو۔ مجھے تمھاری ذہانت سے اُمید ہے کہ تم یہ ذمّے داری سنبھال لوگے۔ میں نے ایک طویل عرصے تک کاروبارِ مملکت چلایا ہے مجھے خشونی جیسے آدمی سے مدد لینا پڑی کہ اُس سے بہتر آدمی نہ مل سکا لیکن میں تمھیں سچ کہتی ہوں کہ ایسے لوگ ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں۔ اسی لیے مجھے زندگی بھر سکونِ قلب حاصل نہیں ہوسکا۔" اتنا کہہ کر اُس نے آنکھیں مُوند لیں اور زور زور سے سانس لینے لگی۔
میں گھٹنوں کے بل پلنگ کے قریب بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ شاید اس کا دَم اُکھڑ رہا ہے۔ اب بھی جیسے اُس نے میری سوچ کی آواز سُن لی۔
وہ آنکھیں کھولتے ہوئے بولی: "گھبراؤ نہیں۔ جو کام مجھے کرنے ہیں، وہ کرکے ہی مروں گی۔ مگر یاد رکھو، خشونی پر کبھی اعتماد نہ کرنا وہ بڑا عیار اور ظالم آدمی ہے۔"
"یہ میں بھی جان چکا ہوں ملکۂ عالیہ۔"
"اب میری وصیت غور سے سنو۔ میری موت کے فوراً بعد تم ننھی شہزادی دلآرا سے شادی کروگے اور جمشیدیوں کے حکمراں بن جاؤگے۔ میری قوم عرصہ دراز سے اس وادی میں رہتی چلی آرہی ہے۔ میرے مرنے کے بعد تم اسے لے کر شمال کی طرف چل دینا اور اس شہر کو جلا کر راکھ کردینا۔ ہماری مذہبی کتب کہتی ہیں کہ جمشیدیوں کی منزل شمال میں بابِ تاباں کے پار ہے اور جمشیدیوں کو واپس آنے کی ممانعت کردی گئی ہے۔ کیا تم میری وصیت پر عمل کرنے کا وعدہ کرتے ہو؟"
"میں وعدہ کرتا ہوں ملکۂ عالیہ کہ میں آپ کی قوم کی فلاح کے لیے جو کچھ بھی کرسکا، ضرور کروں گا۔"
"تمھیں انتظامِ حکومت چلانے کے لیے خشونی کی مدد درکار ہوگی... مگر اُس سے ہوشیار رہنا۔ اب جلدی سے اُسے اور کمان داروں کو بلاؤ۔"
میں نے ملکہ کے حکم کی تعمیل کی۔
ملکہ کے پلنگ کی ایک جانب میں اور خشونی جبکہ دوسری طرف پانچوں کمان دار کھڑے ہوگئے۔ ملکہ نے اپنے تنِ لاغر کی تمام تر قوت سمیٹ کر گمبھیر اونچی آواز میں اپنے عمائدینِ سلطنت کو ہدایات دیں کہ میں اوتار ہوں اور انھیں حکومت کے نظم و نسق میں میری مدد کرنی ہے۔ مجھے ننھی شہزادی دلآرا سے شادی کرنا ہوگی کہ یہ اُس کی آخری خواہش اور حکم ہے۔
ملکہ کی یہ بات سُن کر میں نے کمان داروں کی طرف دیکھا۔
رانخش کے علاوہ باقی چاروں کی آنکھوں میں نفرت، حقارت اور عداوت کے سائے لہرا رہے تھے۔ اتنے میں ہَو کے لہریے اور جھنکے ایک دم بند ہوگئے۔ خدا معلوم پسِ پردہ بیٹھے سازندوں کو کیسے یہ علم ہوگیا تھا کہ ملکہ مرچکی ہے۔
میں نے ملکہ کی طرف دیکھا۔
دم توڑنے کے بعد بھی اُس کی آنکھیں میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اُس کی آنکھیں بند کرکے چہرے پر چادر ڈال دی۔ پھر پلٹ کر تحکّم کے ساتھ کمان داروں سے مخاطب ہوا: "تم سب نے ملکہ کی آخری ہدایات سُن لی ہیں اب میرے احکامات سنو۔" یہ کہہ کر میں نے بیلشا کو حکم دیا: "ملکہ کی تجہیز و تکفین کے ذمّے دار تم ہو جو آج ہی ہوگی لیکن تمام رسوم و رواج

اور پورے احترام کے ساتھ... جاؤ اور سارے انتظامات کرو کہ میرے پاس اپنے وعدے کی تکمیل کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے۔"
بیلشا نے میرا حکم سُن کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا... مگر وہ اُس سے نظریں ملانے کی بجائے میری طرف دیکھتے رہے۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی بھی براہِ راست میری مخالفت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بیلشا نے سر خم کیا اور باہر چلا گیا۔
اب میں فرزال کی طرف پلٹا جو لحیم و شحیم اور بڑا بدشکل تھا۔
"میں نہیں جانتا کہ عہدے کے اعتبار سے تم کس درجے کے آدمی ہو... مگر اس وقت سے تم سالارِ عسکر ہو۔ فوج کے تمام اختیارات اور ذمّے داریاں تمھارے سپرد ہیں۔ یہاں سے جاتے ہی ساری فوج شہر کے باہر شمال کے میدان میں جمع کرو اور میرے دوسرے حکم کے لیے منتظر رہو۔"
فرزال نے تعجب سے جواب دیا: "شمال کی طرف؟ یہ اقدام دانشمندی کے خلاف ہوگا جناب، کرونو بابِ تاباں سے ہمیشہ نگرانی کرتے رہتے ہیں اور وہ شمال میں کسی عسکری اجتماع کو پسند نہیں کرتے۔ شاید آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ کردبو..."
"تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "بابِ تاباں اور کردلوں کو مجھ پر چھوڑ دو۔ جاؤ۔"
فرزال مزید کچھ بولے بغیر چلا گیا۔
میں نے سوچا کہ مجھے کردبوں اور بابِ تاباں کے بارے میں جلد از جلد معلومات حاصل کرنا پڑیں گی۔ تاہم میں نورنگ سے مخاطب ہوا۔
"نورنگ، تمھیں جتنے آدمی درکار ہوں انھیں اپنی کمان میں لے لو اور کوچ کی تیاری شروع کردو... مگر یاد رکھو یہ تیاری صرف فوج کے کوچ کی نہیں ہوگی۔ اس وادی کے ہر فرد کو یہاں سے کوچ کرنا پڑے گا۔ تمھیں یہ بات اس وقت تک صیغۂ راز میں رکھنی ہے جب تک میں کوئی دوسرا حکم نہ دوں۔ کھانے پینے کے سامان اور دیگر ضروری اشیا کا انتظام بھی تمھاری ذمّے داری ہے۔ مجھے وقتاً فوقتاً انتظامات کی تفصیل سے آگاہ کرتے رہنا۔ جاؤ۔"
نورنگ نے چوتھے کمان دار اساد کی طرف دیکھا مگر وہ انجان بنا رہا تو نورنگ نے بھی سر خم کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں نے خشونی کی طرف دیکھا جس کا تربوز نما سر ایک کندھے کی طرف جھکا ہُوا تھا اور وہ تصویرِ حیرت بنا یہ کارروائی دیکھے جارہا تھا۔
"تمھاری ذمّے داری بڑی نازک ہے اساد۔ تم کسی کو یہ

نہیں بتاؤگے کہ تم ایسا کیوں کررہے ہو یا کس کے حکم پر کررہے ہو۔ تمھیں اس شہر کو جلا کر راکھ میں تبدیل کردینے کے انتظامات کرنے ہیں۔" میں نے کہا۔
"شہر کو جلانے کے انتظامات؟" خشونی نے تعجب سے دُہرایا۔
"ہاں... ملکہ نے مجھ سے اس کام کا وعدہ لیا تھا۔ یہ شہر غلاظت کا ڈھیر بن چکا ہے جس سے وبائیں پھوٹتی ہیں اور ہر نئی وبا پہلی سے شدید ہوتی ہے۔ زرد موت کی وبا سے بچنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔" پھر میں نے اساد سے کہا: "جاؤ آتش زنی کا سامان اور اپنے کارندے جمع کرو... مگر ہر بات راز میں رہے کہ میں کوئی شورش پسند نہیں کروں گا۔"
اساد بھی چلا گیا۔
اب صرف رانخش وہاں رہ گیا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو خشونی نے مجھے ٹہوکا دیا... مگر میں نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ میں چھٹی حس کی رہبری میں ایک اور جوا کھیلنا چاہتا تھا۔ چنانچہ پلنگ کی دوسری طرف سے اُس کے پاس آیا اور اُس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا: "ایک بار پھر پنجہ آزمائی ہوجائے، دوست؟"
رانخش نے لاشعوری طور پر اپنا ہاتھ بڑھایا... مگر دوسرے ہی لمحے چونک کر ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے کہنے لگا: "نہیں جناب! میرا ہاتھ ابھی دُکھ رہا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ مجھ سے زیادہ طاقت ور ہیں۔"
میں نے اپنے ہاتھ اُس کے مضبوط شانوں پر رکھ دیے اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اس نے بھی نظریں نہ چرائیں۔ اس کی آنکھوں میں دوستی کا جذبہ جھلک رہا تھا۔
"میں تمھیں کوئی حکم نہیں دوں گا رانخش۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ تم میرے محافظ اور کمان دارِ اعلا ہو۔ تم مجھے پسند ہو اور میں

تمھیں ایک قابلِ اعتماد دوست سمجھتا ہوں۔"

راخش نے جواب دینے کے بجائے ملکہ کی میت پر نگاہ ڈالی اور کافی دیر تک اُسے دیکھتا رہا وہ دراصل کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچ رہا تھا۔

"تم راجدھانی کی صورتِ حال اپنے ساتھیوں کی صلاحیتوں سے بخوبی آگاہ ہو راخش تم جانتے ہو کہ وہ کیا ہیں، کیا بننا چاہتے ہیں اور طاقت واقتدار کو کیسے استعمال کریں گے۔ ان کے مقابلے میں، میں تمھارے لیے ایک نووارد ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تم خاصے مردم شناس ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی سوچ سمجھ سے خود ہی کسی فیصلے پر پہنچو۔ تم چاہو تو صاف انکار کر سکتے ہو کیونکہ میں کسی ایسے آدمی سے کام نہیں لے سکتا جس پر مجھے اور جسے مجھ پر اعتماد نہ ہو۔"

راخش نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھا اور کھٹ سے اپنی تلوار نیام سے نکال لی۔ خشونی اس کی اس حرکت سے بُری طرح بدک گیا اور میں بھی چوکنا ہو گیا۔

راخش مجھے اسی طرح گھورتا رہا... پھر اُس نے تلوار کو بوسہ دیا اور تلوار میری طرف بڑھا دی۔ میں نے بھی دستہ شمشیر کو چوما اور تلوار اُسے لوٹا دی۔

اس نے مسکراتے ہوئے تلوار نیام میں ڈالی، ملکہ کی میت کی طرف دیکھا اور بولا "میں اپنی ملکہ کی آخری خواہش کی تعمیل کروں گا۔ میں اب بھی اس کا خادم ہوں اور آپ کے لیے بھی میری خدمات حاضر ہیں۔"

میں نے اُس کا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے جواب دیا۔ "شکریہ راخش تم مجھے اپنے دوستوں کے ساتھ وفادار اور پُرخلوص پاؤ گے... اور اب میری بات غور سے سُنو۔ اپنے اعتماد کے پچاس آدمیوں کا ایک دستہ بناؤ جو میرا محافظ دستہ ہوگا۔ تم اور دستے کے افراد میرے حکم کے بغیر مجھے تنہا نہیں چھوڑیں۔ تمھاری ایک اور ذمے داری بھی ہوگی۔ عسکریوں کے علاوہ تم ہر شہری کے ہتھیار ضبط کر لو گے اور یہ کام تمھیں فی الفور انجام دینا پڑے گا۔"

راخش کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی اور اس نے خشونی کی طرف دیکھا۔ اس کا مطلب سمجھ کر میں نے کہا "ہاں۔ اگرچہ بزرگ دانشمند میرا مشیرِ اعلیٰ ہے... مگر تم اس کے ذاتی دستے سے بھی ہتھیار لے سکتے ہو کہ اب بزرگ دانشمند میری حفاظت میں ہے اور اسے ذاتی دستے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس طرح اس کے اخراجات کم ہو جائیں گے۔"

خشونی نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کا تربوزی سر ٹہلنے کی وجہ سے اِدھر اُدھر جھولنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت اس کے ذہن میں کیسی ہلچل مچی ہوئی ہے۔ اور وہ کیا سوچ رہا ہے۔

"اب میری حفاظت کے ذمے دار تم ہو۔" میں نے راخش سے کہا۔ "ملکہ کی تجہیز و تکفین کے بعد مجھے شہزادی سے شادی کرنی ہے۔ اس کے بعد ہمیں کوچ کرنا ہے۔ شادی کے انتظامات بھی تمھیں کرنا ہوں گے لیکن میں چاہتا ہوں کہ پہلے ایک بار شہزادی سے مل لوں تاکہ مجھے اس سلسلے میں اس کے خیالات کا بھی علم ہو جائے۔ اگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہو تو اس پر کوئی جبر نہیں کیا جائے گا۔ ویسے میں تمھیں بتا دوں راخش اور تم چاہو تو سب کو بتا سکتے ہو کہ شہزادی ابھی صرف دس سالہ بچی ہے اس لیے اگر یہ شادی ہوئی تو محض ملکہ کی خواہش کے احترام میں، برائے نام ہی ہو گی کیونکہ میں اُن خبیث مردوں میں سے نہیں ہوں جو کم عمر لڑکیوں سے شادیاں رچاتے ہیں۔"

راخش نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ابھی آپ نے شہزادی کو دیکھا نہیں ہے اس لیے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ ہم جمشیدیوں میں خلائی دیوی کہلاتی ہے۔ میں اس سے آپ کی ملاقات کا انتظام کر دوں گا۔ میرے لیے اور کوئی حکم؟"

"اپنے اعتماد کے چھ آدمی میرے ساتھ متعین کر دو اور سارے کمان داروں کو اطلاع بھجوا دو کہ آج رات بزرگ دانشمند کی رہائش گاہ پر ایک مجلسِ مشاورت منعقد ہوگی۔ اور وہ سب غروبِ آفتاب کے دو گھنٹے بعد وہاں پہنچ جائیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا اور وہاں سے چلا گیا۔

جب اس حجلۂ مرگ میں میرے اور خشونی کے علاوہ کوئی تیسرا فرد نہ رہا تو اُس نے لب کشائی کی۔

مجھے اسی بات کا خطرہ تھا۔ میں نے اپنی سوچ کے خلاف قدم اُٹھا کر دیکھ لیا۔ میں تمھیں اپنی مقصد براری کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا مگر اب اُلٹا تم مجھے استعمال کر رہے ہو۔ یہ میرے لیے ایک سبق ہے۔ اگر میں زندہ رہا تو اس سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔"

میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا تو وہ دوبارہ ٹہلنے لگا۔

"یہ سب کیا ہے، سرفروش؟ کیا میں نظر بند ہوں؟ مجھے قیدی بنا لیا جائے گا یا قتل کر دیا جائے گا؟"

"جب تک تم میرے خلاف کوئی سازش نہیں کرتے یا میرے لیے مصیبت نہیں بنتے، نہ تو تم قید کیے جاؤ گے اور نہ ہی تمھیں قتل

ـے گا۔ مجھے اب بھی تمھاری اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ پہلے ـہ تم اس شہر اور اس قوم کے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ ـہو۔ جب میرا کام ختم ہو جائے گا تو میں یہاں سے چلا جاؤں ـے یہاں زیادہ عرصے تک ٹھہرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی میں ـتمنا کرتا ہوں... پھر تم جانو اور یہ کمان دار۔ جب تک ـے دوست ہو، میں بھی تمھارا دوست رہوں گا... یہ بات ـنا کہ سربراہ میں ہی ہوں اور حکم میرا ہی چلے گا۔"

"مجھے ان ساری باتوں سے اتفاق ہے بشرطیکہ تم واقعی جلد ـاں سے چلے جاؤ اس لیے کہ میں زیادہ دیر تک احمق اور ـ تماشائی نہیں بنا رہ سکتا اور ہاں، تمھارا باب تاباں ـبوں کی سرزمین کی طرف کوچ کا فیصلہ دانشمندانہ نہیں ہے۔ ـدیوانگی ہے۔ کردبوں نے جمشیدیوں کو کبھی اُدھر کا رُخ نہیں کرنے ـب تاباں کی طرف کوچ کا مطلب سب کی موت ہے۔"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھ سے تو ملکہ نے ـی وصیت کی تھی۔ بہر حال، مجھے بابِ تاباں اور کردبوں ـرے میں بتاؤ کہ یہ آخر میں کیا بلا؟"

...اور پھر جب خشونی نے مجھے بابِ تاباں اور کردبوں ـرے میں معلومات بہم پہنچائیں تو میں گُنگ سا ہو کر رہ گیا۔

* *

جب میں راخش کے ساتھ شہزادی دلآرا سے ملنے جا رہا تھا ـحافظ ہمارے جھکڑے کے آگے، دو پیچھے اور ایک ایک ـبائیں چل رہے تھے۔ میں شہر کی گلیوں اور بازاروں کا ـجائزہ لیتا جا رہا تھا۔ مُردے ڈھونے والی گاڑیاں مختلف گھروں ـامنے رُکتیں گھر والے مُردہ اُٹھا لاتے، گاڑی میں پھینکتے اور ـا چل دیتی۔ میں نے راخش کو حکم دیا کہ وہ مُردے ڈھونے ـاڑیوں کو بند کرا دے اور گاڑی بانوں کو کسی دوسرے کام پر ـے۔ زرد موت سے مرنے والوں کو گھروں میں چھوڑ دیا جائے ـجلنے کے ساتھ وہیں راکھ ہو جائیں گے۔

اتنے میں ہمیں ایک مکان سے موت کے قدموں کی چاپ ـو قہقہے سنائی دینے لگے جو وبا کے شکار کی موت یقینی بنا ـتھے۔

"مجھے آپ کے شہر کو جلا دینے کے حکم پر تعجب ہوا تھا لیکن ـہ دیکھنے اور سننے کے بعد احساس ہوا کہ یہ غلیظ شہر جتنی جلدی ـذرِ آتش ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

کچھ دیر بعد ہماری گاڑی ایک بڑی عمارت کے سامنے رُک گئی اور راخش کے متعین کردہ محافظوں نے ہمیں سلامی دی تو میں سمجھ گیا کہ یہی شہزادی دلآرا کی رہائش گاہ ہے۔ یہ عمارت بھی پتھروں اور لکڑیوں سے تعمیر کی گئی تھی مگر خشونی کی رہائش والی عمارت سے بہت بڑی تھی۔ میں نے عمارت میں داخل ہونے سے پہلے راخش سے پوچھا...

"میں نے خشونی کے متعلق جو ہدایات دی تھیں اُن پر عمل ہو رہا ہے؟"

"ہاں جناب! اسے آپ کے حکم کے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ وہ جہاں بھی جانا چاہے، بلا روک ٹوک جا سکتا ہے مگر اس کی کڑی نگرانی کی جائے گی۔ میں نے اُس پر نگاہ رکھنے کے لیے اپنے بہترین آدمی لگا دیے ہیں۔"

"خوب.. لیکن اُسے یونہی بزرگ دانشمند نہیں کہا جاتا۔ اس کے جاسوس بھی تمھارے آدمیوں سے کم زیرک نہیں ہوں گے خیر، تم اس سے کب ملے تھے؟"

"جب تم نے اس کے ذاتی دستے سے ہتھیار لے کر اُسے نہتا کیا تھا۔ میرے اس اقدام پر وہ خوش نہیں تھا۔ وہ اگرچہ مُنہ سے کچھ نہ بولا لیکن اُس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ بہت ناراض ہے۔ اور ہاں، اُس سے بہت سے لوگ ملنے کے لیے آ جا رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اُس کے مخبر تھے اگر آپ کہیں تو اُن کی آمد و رفت پر پابندی لگا دی جائے؟"

"نہیں۔ میں اُسے ڈھیل دے کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا کرتا ہے۔ جب وہ میرے یا شہزادی کے خلاف کوئی باقاعدہ سازش یا اقدام نہیں کرتا، اُسے مت چھیڑنا۔ اچھا اب میں شہزادی سے مل لوں۔ مگر پہلے یہ بتاؤ کہ میرا لباس کیسا ہے اور میں کیسا لگ

رہا ہوں"۔

راخش نے ایک نظر مجھے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا: "آپ اس عسکری لباس میں خوب جچتے ہیں اور ویسے ہی لگتے ہیں جیسا کہ میرے حاکم کو ہونا چاہیے۔" پھر اس نے سلام کیا اور چلا گیا۔

میں اندرونی دروازے کی طرف بڑھا تو ایک سیاہ پوش عورت جس کے گلے میں کھوپڑی جیسی زنجیر جگمگا رہی تھی، باہر آئی اور سرخم کرتے ہوئے بولی: "شہزادی حضور بے تابی سے آپ کی منتظر ہیں جناب۔ آیئے، تشریف لایئے۔"

وہ میری رہبری کرتے ہوئے ایک کمرے کے دروازے تک لائی اور ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"شہزادی سے ملاقات کے دوران کوئی مداخلت نہ کی جائے۔"

"بہتر جناب عالی۔" اس عورت نے جواب دیا اور میں کمرے میں داخل ہو گیا۔

یہ ایک طویل و عریض کمرہ تھا مگر اس میں دو موم شمعیں جل رہی تھیں جن کی روشنی اس کمرے کے لیے ناکافی تھی۔ کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا اور اس پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ سامنے نیم روشن گوشے میں ایک دیوان بھی رکھا ہوا تھا۔ شہزادی دلآرا مجھے کہیں دکھائی نہ دی حالانکہ اس سیاہ پوش عورت نے بتایا تھا کہ وہ میری منتظر ہے۔

... پھر اچانک ہی دیوان کے پیچھے سے سنہری بالوں والا ایک سر ابھرنے لگا۔ دو گہری سیاہ غزالی آنکھیں دکھائی دیں، گلابی ہونٹ نظر آئے اور وہ کھڑی ہو گئی۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ لڑکی کم اور لڑکا زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے بولنے میں پہل کی۔

"چونکہ پہلے میں تمھیں دیکھنا چاہتی تھی، اس لیے دیوان کے پیچھے چھپ گئی تھی کہ تم مجھے نہ دیکھ سکو۔ جمشیدی تمھارے متعلق ٹھیک ہی کہتے ہیں۔"

میں نے سر ذرا سا خم کیا اور اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ دیوان سے گھوم کر میرے سامنے آ گئی وہ جو پہلی نظر میں مجھے لڑکا دکھائی دی تھی، ایسا پیکر جمال نکلی جو میری آنکھوں نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔

"پہلے مجھے یقین نہیں تھا کہ میں تمھیں پسند کروں گی ... مگر تمھیں دیکھنے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم ہی میرے شوہر بنو گے۔ تم جمشیدیوں سے کتنے مختلف ہو۔ میرے کمان دار تم سے حسد کرنے لگیں گے۔ کیونکہ وہ مجھ سے شادی کے خواب دیکھتے رہے ہیں۔"

اس کی باتیں دلچسپ مگر بچوں جیسی تھیں۔ میں مسکراتا رہا۔

"تمھیں معلوم نہیں تھا کہ آپ کے کمان دار آپ سے محبت کرتے ہیں؟"

اس نے ایک قہقہہ لگایا اور بولی: "اُن پر لعنت بھیجو۔ اِدھر آؤ اور میرے پاس بیٹھو۔ مجھے بتاؤ کہ میری نانی کو عالم نزع میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں ... انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اُن کی خواہش تھی کہ ہماری شادی ہو جائے ورنہ میں یہاں نہ آتا۔"

"مجھے اپنی نانی سے بڑی محبت تھی اور آخری وقت میں مجھے اُن کے پاس ہونا چاہیے تھا مگر جمشیدی رسم و رواج چھوٹوں کو بڑوں کی موت کا نظارا کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ جب ہماری شادی ہو جائے گی تو ہم یہ رسمیں ختم کر دیں گے۔ کھڑے کیوں ہو، بیٹھو نا۔"

مجھے اُس دس سالہ لڑکی کے منہ سے ایسی باتیں سن کر خفت سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا: "میں جس دور سے آیا ہوں، وہاں آپ کی عمر کی بچیوں سے شادی کا تصور بھی گناہ سمجھا جاتا ہے۔"

اُس نے میری اُس بات پر قہقہہ لگایا اور ابھی کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ عین اُسی وقت وہی سیاہ پوش عورت اندر آ گئی۔

"کمان دار راخش کا ہرکارہ آیا ہے اور وہ ان کے لیے کوئی بے حد اہم پیغام لایا ہے۔ میں نے اُسے ٹالنا چاہا تو اُس نے کہا کہ اگر میں نے اطلاع نہ دی تو وہ زبردستی اندر گھس آئے گا۔"

یہ سن کر میں نے کہا: "میرا خیال ہے کہ کوئی بہت ہی اہم مسئلہ ہو گا اس لیے اجازت دیجیے میں اُس سے بات کر کے پھر حاضر ہو جاؤں گا۔"

میں باہر آیا تو راخش کا قاصد میرا منتظر تھا۔ اُس کے گلے میں راخش کے دستے کے نشان والی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔

"میں کمان دار راخش کا خصوصی قاصد زارا ہوں۔ اُن کے پاس موک نامی ایک موٹا آدمی آیا ہے اور اس نے کسی لڑکی دیپا کا یہ پیغام دیا ہے کہ وہ سخت خطرے میں ہے اور اُس کی التجا ہے کہ آپ فوراً اُس کی مدد کو پہنچیں۔"

دیپا کا پیغام سن کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں ان الجھنوں میں پھنس کر اُسے فراموش ہی کر بیٹھا تھا۔

"موک نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اُسے کس قسم کا خطرہ درپیش ہے؟"

"مجھے یہ تو معلوم نہیں جناب۔ وہ بزرگ دانشمند کے گھر آیا تھا۔ کمان دار راخش نے مجھے حکم دیا کہ یہ پیغام فوراً آپ تک پہنچا دوں۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے کہا: "تم میرے چھ محافظوں کے ساتھ میرے ساتھ چلو۔"

میں نے محافظوں کو آواز دی اور ہم سب تیزی سے موک کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ چونکہ جمشیدی قد و قامت میں مجھ سے چھوٹے تھے اس لیے وہ میری رفتار کا ساتھ نہ دے سکے اور مجھ سے قدم ملانے کے لیے انھیں دوڑنا پڑ گیا۔ جب ہم پہاڑی پر واقع اس مکان کے قریب پہنچے تو میرے محافظ دروازے پر زرد موت کا پیلا نشان دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

میرا بھی دل دھک سے رہ گیا۔

کیا دیپا زرد موت کی وبا میں مبتلا ہو گئی ہے؟

پیام بر نے زرد نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں کہا: "اس گھر میں کوئی داخل نہیں ہو گا جناب۔"

"میں نے کسی سے داخل ہونے کو نہیں کہا۔" میں نے اُسے جواب دیا: "تم کیا کہتے ہو؟"

"میں بھی نہیں جاؤں گا جناب۔ ہمیں وبا والے مکان میں جانے کی اجازت نہیں۔"

اتنے میں اندر سے قہقہے کی آواز آئی۔

یہ مردانہ قہقہہ موک ہی کا ہو سکتا تھا۔

وہ مسلسل قہقہے جو موت کی چاپ کہلاتے تھے۔

"تم سب یہیں میرا انتظار کرو۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے مکان میں داخل ہو گیا۔

موک اُسی میز کے قریب فرش پر دراز تھا جس پر ہم نے اس رات مشروب پیا تھا اور باتیں کی تھیں۔ اُس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا اور اس پر کرب کے تاثرات چھائے ہوئے تھے۔

وہ مسلسل موت کے قہقہے لگا رہا تھا۔

میں اُسے نظر انداز کرتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جس میں اُس شب دیپا سوئی تھی۔

وہ کمرہ خالی تھا۔

میں دوسرے کمرے میں گیا۔ اُس کی پھوپیاں اپنے بستر پر مر چکی تھیں۔

دیپا نے مجھے بتایا تھا ... مگر وہ خود کہاں گئی؟

اب صرف موک ہی زندہ رہ گیا تھا مگر وہ اس قابل نہیں تھا کہ بات کر سکے تاہم میں اُس کی طرف دوڑا اور گھٹنوں کے بل اُس کے قریب بیٹھ کر اُسے مخاطب کیا: "موک ... موک آنکھیں کھولو۔ میں سرفروش ہوں موک۔ دیپا کہاں ہے؟"

اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور قہقہے لگانا بند کر کے کچھ بولنا چاہا ... مگر اُس کی سوجی ہوئی سیاہ زبان سے الفاظ ادا نہ ہو سکے۔ میں نے میز پر رکھا ہوا برتن اٹھا کر دیکھا کہ شاید اُس میں وہی مشروب ہو ... مگر اُس میں تربوز نما سیب کا رس تھا۔ میں نے کچھ رس اُس کے چہرے پر اور کچھ اُس کے حلق میں ٹپکایا تو اس کے قہقہے بالکل تھم گئے۔

میں نے جلدی سے پوچھا: "دیپا کہاں ہے، موک؟"

"کاشی ... کاشی آ گئے ... اُس کی ... بے ... بے حرمتی کی ... پھر ... پھر اُسے شمشان میں ... پھینک دیا ... زندہ ... زندہ شمشان میں ... تم چال میں ... آ گئے ہو ... انھوں نے کہا ... سرفروش کو بلاؤ ... دیپا نے انکار کر دیا ... تم کیوں آئے ... پھنس گئے ... وہ ... وہ چھپے ہوئے ہیں ... انھوں نے ... وبا والے چاقو سے ... ہمیں زخم لگائے دیکھو ... یہ دیکھو۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنا زخمی بازو دکھایا اور خاموش ہو گیا۔

میں سمجھ گیا کہ انھوں نے زرد موت کا شکار ہونے والے کسی مردے کے جسم میں چاقو گھونپ کر اُسے جراثیم آلود کر لیا ہو گا اور پھر اس چاقو سے انھیں زخم لگائے ہوں گے۔ اتنے میں مجھے باہر سے ایک چیخ کے ساتھ تلواریں ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ میں دروازے کی طرف بھاگا اور یہ دیکھ کر دروازے ہی میں رک گیا کہ میرے چھ محافظوں میں سے تین ڈھیر ہو چکے تھے۔ اور چھ کاشی باقی تین محافظوں سے برسر پیکار تھے۔ وہ تین محافظ، کاشیوں کی لمبی تلواروں کی زد سے بچتے ہوئے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس وقت میرے پاس تلوار اور خنجر تھا۔ میں نے دروازے سے باہر نکلتے ہی تلوار نیام سے نکالتے ہوئے بآواز بلند کہا: "محافظو! تم لوگ ہٹ جاؤ۔"

میری آواز پر کاشیوں نے ہاتھ روک لیے اور میری طرف دیکھنے لگے۔ میرے محافظ موقع غنیمت جان کر بھاگے اور میرے قریب آ گئے۔ اُن میں سے ایک زخمی ہو چکا تھا اور اُس کے کندھے سے خون بہہ رہا تھا۔

"یہ درختوں میں چھپے ہوئے تھے جناب۔ زارا نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ وہ دھوکے سے ہمیں یہاں لایا ہے۔ بہت سے کاشی مکان کے چاروں طرف چھپے ہوئے ہیں۔"

اُس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اب چاروں طرف سے بندر نما کاشیوں کی آوازیں آنے لگی تھیں، جو مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے زخمی محافظ سے کہا: "فکر نہ کرو جوان۔ ہمت نہ ہارو۔

ہم اُن سے نمٹ لیں گے۔"

... پھر میں نے پہاڑی کے نیچے دیکھا تو کھول کر رہ گیا۔ غدار محافظ زار کاشیوں کو حملہ کرنے کا منصوبہ سمجھا رہا تھا کیونکہ وہ بے پناہ جسمانی طاقت رکھنے کے باوجود برائے نام ذہنی صلاحیت رکھتے تھے۔ میں نے سوچا کہ زارا نے کس کے کہنے پر یہ چال چلی ہوگی؟

... اور دوسرے ہی لمحے ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔

میں نے خشونی کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا اور اُس کے دستے کو نہتا کروانے کے بعد مطمئن ہوگیا تھا۔ میں کل رات کی باتیں بھول گیا تھا۔ خشونی نے بتایا تھا کہ اُسے کاشیوں کے پیغام سے یہ تو معلوم ہوگیا ہے کہ میں نے بلونگ کو قتل کر دیا تھا پھر غائب ہوگیا تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر دیپا کا ذکر نہیں کیا تھا ورنہ کاشیوں نے اُسے دیپا کے متعلق بھی ضرور بتایا ہوگا۔ میں نے اُس کا ذکر اس لیے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ وہ محفوظ و مامون رہے ... مگر خشونی کے جاسوسوں اور مخبروں نے اُسے دیپا کے متعلق بتا دیا ہوگا کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے۔ وہ دیپا پر تشدد کر کے میرے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوگا۔

میں نے کتنی بڑی بھول کی تھی۔

اتنے میں زارا نے کاشیوں کو حملے کا سارا منصوبہ سمجھا دیا تھا۔ کاشی مکان کے چاروں طرف سے اوپر آنے لگے اور زارا خود ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ وہ خود اس معرکے میں حصہ نہیں لینا چاہتا تھا تاکہ محفوظ رہ کر اپنے آقا کو ہمارے حشر کا آنکھوں دیکھا حال سُنا سکے۔

میں نے اپنے باقی ماندہ محافظوں سے کہا: "مکان کے اندر چلے جاؤ۔ ہمیں چار کھڑکیوں اور ایک دروازے کا دفاع کرنا ہے۔ میں دروازے پر رہوں گا، تم کھڑکیوں سے دفاع کرنا۔ کاشی ان چھوٹی کھڑکیوں سے اندر نہیں آسکتے۔ آؤ۔"

"مگر اس دروازے پر تو موت کا وبائی نشان لگا ہُوا ہے۔" ایک محافظ بولا۔

"باہر اس سے بھی زیادہ خطرناک وبا تمھیں دبوچنے کے لیے آگے بڑھ رہی ہے۔ دیر مت کرو، اندر چلو۔"

اُدھر کاشی بھی آہستہ آہستہ پہاڑی پر چڑھ رہے تھے تاکہ ہم مکان میں گھس جائیں تو وہ ہمیں گھیر کر ختم کر دیں۔

کمرے میں آتے ہی موک کی لاش دیکھ کر مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ میں نے محافظوں سے کہا: "یہ لاش اُٹھا کر ایک کھڑکی میں ٹھونس دو۔ اس طرح ایک کھڑکی محفوظ ہو جائے گی۔"

محافظوں نے بمشکل لاش اُٹھا کر پچھلی طرف والی ایک کھڑکی میں ٹھونس دی۔ بے چارہ موک آدھا اندر اور آدھا باہر لٹکنے لگا۔

میں نے دوسری کھڑکی سے باہر دیکھا۔ تقریباً بیس کاشی مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ابھی وہ تقریباً پچاس قدم دُور تھے۔ اُن کے پاس لمبی چوبی تلواریں تھیں جن کی نوک پر چقماق کے ٹکڑے لگے ہُوئے تھے۔ میرے دو محافظوں کے پاس برچھے بھی تھے، زخمی کے پاس صرف تلوار تھی۔ میں نے برچھے والے ایک محافظ کو پچھلی ایک کھڑکی پر اور دوسرے کو سامنے والی کھڑکی پر متعین کیا، خود دروازہ اور اس کے قریب والی کھڑکی سنبھال لی اور زخمی کو کمرے کے وسط میں کھڑا کرتے ہُوئے کہا: "موک کی لاش پر نظر رکھنا اگر وہ اسے باہر کھینچیں یا اندر گرانے کی کوشش کریں تو تمھیں اس کھڑکی کا دفاع کرنا ہے ورنہ حسبِ ضرورت ہم لوگوں کی مدد کرتے رہنا۔" پھر میں نے برچھے والے محافظوں کو ہدایت کی کہ وہ تیزی سے برچھے کے ساتھ وار کر کے اُسے فوراً پیچھے ہٹا لیں تاکہ کاشی انھیں چھین یا توڑ نہ سکیں۔ اگر کاشی کھڑکی سے اندر آنے کی کوشش کریں تو وہ انھیں اس وقت تک نہ ماریں جب تک کہ وہ کھڑکی میں پھنس نہ جائیں۔

میری ہدایات سُن کر ایک نوجوان محافظ بولا: "ہم صرف چار ہیں مگر وہ بہت زیادہ ہیں تاہم انھیں یہ فتح بہت زیادہ مہنگی پڑے گی جناب۔"

میں نے اُس کی پیٹھ ٹھونکی اور دروازے سے باہر دیکھا۔ کاشی دس دس کی دو قطاروں میں آگے بڑھ رہے تھے۔ جب اگلی قطار پانچ قدم کے فاصلے پر آگئی تو میں نے پُوری طاقت سے چلاتے ہُوئے کہا: "آؤ کاشیو آؤ۔ میری تلوار تمھارے خون سے پیاس بجھانے کے لیے بے قرار ہے۔ آگے بڑھو اور موت کا مزا چکھو۔"

مجھ پر اس وقت جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ میں نے اچانک چھلانگ لگا کر ایک کاشی کا بازو کاٹا اور دوسرے کے سینے میں تلوار گھونپ کر فوراً پیچھے ہٹ گیا۔

دوسرے کاشی یہ دیکھ کر وہیں رُک گئے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اتنی جلدی اُن کے دو ساتھی ڈھیر ہوگئے ہیں۔ انھوں نے میرے ہاتھوں بلونگ کی موت کے قصے بھی سُن رکھے تھے اس لیے جب میں نے دوسری بار نعرہ لگایا تو وہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے لگے اور پھر پلٹ گئے۔

میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

پچھلی کھڑکی والے محافظ کا برچھا خون آلود تھا اور دوسرے

[...]ڑکی میں موک کی لاش جوں کی توں لٹکی ہوئی تھی۔

میں دوبارہ دروازے کی طرف متوجہ ہُوا۔ اب پلٹنے والے [...]شیوں کا کمان دار انھیں غیرت دلا رہا تھا۔

"بزدلو! صرف چار آدمیوں سے ڈر گئے ہو۔ آگے بڑھو اور [...]ہیں ختم کر دو۔ بزرگ دانشمند ہمیں بیویاں دے گا۔ دیپا سے [...] ابھی ... جاؤ اُن چاروں کے پرخچے اُڑا دو۔"

کاشیوں کے کمان دار کی بات سے مجھے خشونی کی دوسری [...]ل بھی سمجھ میں آگئی۔ وہ مجھے ختم کرنے کے بعد کاشیوں سے [...]ہیں پر حملہ کروانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو کوسا کہ میں [...] قزال کو فوج شمالی میدان میں جمع کرنے کا حکم کیوں دیا؟ [...]یوں سے ہتھیار لینے اور فوج کے شہر سے باہر جانے کے بعد خشونی [...] بندرنما وحشیوں کو کھلی چھوٹ دے دے گا اور ... مگر اس [...] بعد مجھے کچھ اور سوچنے کی مہلت نہ مل سکی۔ بندرنما وحشی پھر [درو]ازے کے قریب پہنچ گئے تھے۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تاکہ وہ اور قریب آجائیں [...] پیچھے ہٹنے سے ایک گڑبڑ ہوگئی کہ میں تلوار دائیں بائیں [...]نے سے قاصر ہوگیا۔ اب صرف اسے گھونپ ہی سکتا تھا چنانچہ [...]نے یہی کیا۔ سب سے آگے والے کو گھونپنے کے بعد پیچھے ہٹ [...] تاکہ دوسرے کاشی کی تلوار سے مجھے ران پر زخم آگیا مگر وہ بھی [...]ے خنجر کی زد سے نہ بچ سکا۔ اتنے میں تیسرے کاشی کی تلوار نے [...]و توڑ ڈالا لیکن اُسے دوبارہ تلوار اُٹھانے کی مہلت [...]ہ دی۔

ایک نسبتاً چھوٹا کاشی کھڑکی سے کُود کر مجھ پر پیچھے سے حملہ [کر]نا چاہتا تھا۔ اُس کا سر اور کندھے اندر تھے اور باہر سے دو کاشی [...] اندر دھکیل رہے تھے مگر اس صورتِ حال میں وہ تلوار نہیں [چلا] سکتا تھا اس لیے جونہی اُس نے میری گردن کی طرف اپنا ہاتھ [بڑھا]یا میری تلوار کی ایک ہی ضرب نے اس کا سر کاٹ دیا جو کمرے [کے فر]ش پر جا گرا اور اُس کی سر بریدہ لاش نے دوسرے کاشیوں [کے لیے کھڑ]کی بھی بند کر دی۔

تب میں اُسے مارنے کے بعد دروازے کی طرف پلٹا تو [...] دو کاشی بیک وقت دروازے سے اندر آنے کی کوشش [میں] پھنس گئے تھے۔ میں نے ایک ایک ضرب اُن کے ہاتھوں [پر لگائ]ی تو اُن کی تلواریں گر پڑیں اور وہ بُری طرح چیخنے لگے مگر [نکل]نے سے پہلے ہی میں اُن کے نرخرے کاٹ چکا تھا۔ اس [طرح و]ہ دروازے کے سامنے ہی ڈھیر ہوگئے اور میں یہی چاہتا

تھا تاکہ دروازے کے سامنے کوئی رکاوٹ آجائے۔

اتنے میں کاشیوں کے نائب کمان دار نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے اُس کا وار اپنی تلوار پر روکا تو اُس کی چوبی شمشیر ٹوٹ گئی ورنہ میری موت یقینی تھی۔ اُس کی تلوار ٹوٹتے ہی میں نے اُس کے چہرے پر وار کیا۔ یہ وار اُس کی آنکھوں پر پڑا۔ وہ چیختا ہُوا پیچھے ہٹا تو باقی بھی ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔

اُدھر پچھلی طرف سے کاشیوں نے موک کی لاش کے پرخچے اُڑا دیے تھے اور اُسے باہر کھینچ رہے تھے۔ میں نے اپنا زخمی محافظ اُدھر بھیجا مگر باہر سے ایک کاشی نے برچھا پھینکا جو محافظ کے سینے میں پیوست ہوگیا اور وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔

میں نے اُس کے سینے سے برچھا نکالا اور جونہی ایک کاشی نے کھڑکی سے جھانکا، میں نے اُسی برچھے سے اُس کی کھوپڑی توڑ دی۔

میں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

دروازہ دُشمنوں سے خالی تھا۔ دوسری کھڑکی کے پاس کھڑا محافظ بھی اب دَم لے رہا تھا کہ اس کی کھڑکی سے بھی وہ بندرنما

وحشی ہٹ گئے تھے۔ اُس نے بڑی تھکی بلکہ مجروح مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا اور بولا: ”واقعی آپ اوتار ہی ہیں“۔

میں پچھلی طرف والی دوسری کھڑکی کی طرف پلٹا جہاں میرا دوسرا محافظ برسرِپیکار تھا۔ ایک کاشی نے برچھے سے حملہ کرنا چاہا تو محافظ ایک طرف ہٹ کر اُسے پکڑ لیا۔ میں نے لپک کر تلوار سے برچھا توڑ ڈالا۔ اب برچھے کے پھل والا آدھا حصہ میرے محافظ کے پاس تھا اور باقی کاشی کے پاس۔ جو پیچھے ہٹ گیا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔

اگرچہ کاشیوں کے حملے کا زور ٹوٹ گیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ اپنی تعداد کے بل بوتے پر پھر حملہ کریں گے۔ اتنے میں کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے محافظ نے کہا: ”وہ شمشان سے مشعلیں لے آئے ہیں جناب اور اس مکان کو آگ لگانا چاہتے ہیں“۔

میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو واقعی دو کاشی اُدھر سے جلتی ہوئی مشعلیں لے آئے اور زارا کئی کاشیوں سے سوکھی بیلوں کے گٹھر بنوا رہا تھا۔ کاشی یہ ترکیب کبھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ زارا نے کاشیوں کو پہاڑ کے نیچے چاروں طرف پھیلا دیا تاکہ مکان سے نکلنے کے بعد ہم فرار نہ ہو سکیں۔

مکان کو نذرِ آتش کرنے کی تیاریاں دیکھ کر میرے ایک محافظ نے اپنی تلوار پھینک دی اور روتے ہوئے کہنے لگا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ میں بہادروں کی طرح لڑا ہوں مگر آگ کا مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ بہتر ہو گا کہ ہم ہتھیار ڈال دیں اور صلح کی بات چیت کر لیں۔ اس طرح ہماری جان بچ سکتی ہے“۔

”اگر تم سمجھتے ہو کہ ہتھیار ڈالنے سے وہ ہمیں زندہ چھوڑ دیں گے تو یہ تمہاری حماقت ہے جوان۔ ہم مرتے دم تک اُن کا مقابلہ کریں گے“۔

میرا دو ٹوک فیصلہ سنتے ہی وہ اُٹھا اور پھر ایک دم کمرے سے نکل کر کاشیوں اور زارا کی طرف بھاگتے ہوئے چلایا: ”رحم... رحم... میں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں کاشیو... زارا... تم جمشید ہو، مجھ پر رحم کرو، زارا“۔

زارا کے گرد کھڑے وحشی کاشی ہٹ گئے۔ محافظ زارا کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر رحم کی بھیک مانگنے لگا۔ زارا نے سفاک مسکراہٹ کے ساتھ ایک کاشی کو قتل کرنے کا اشارہ کیا اور دوسرے لمحے اس کاشی کی تلوار نے محافظ کو چھید ڈالا۔ محافظ بُری طرح چیخنے اور تڑپنے لگا۔ زارا نے قہقہہ لگایا اور اپنی تلوار کی ایک ضرب سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

یہ منظر دیکھ کر میرے قریب کھڑا محافظ بولا: ”وہ بڑا احمق تھا جناب، مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ اگر ہمیں مرنا ہی ہے تو بھی عزت سے آپ کے ساتھ ہی مروں گا“۔

اب کاشیوں نے سوکھی بیلوں کے گٹھر کو آگ لگا دی اور چھ کاشی وہ جلتے ہوئے گٹھر اُٹھا کر مکان کی طرف دوڑے۔

میں نے پچھلی کھڑکی سے دیکھا۔ اِدھر سے بھی ایسا ہی منظر نظر آیا۔

اب ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا کہ یا تو باہر نکل کر مرتے دم تک اُن سے لڑتے رہیں یا پھر مکان میں رہ کر بھسم ہو جائیں۔

کاشیوں نے چاروں طرف سے مکان میں وہ جلتے ہوئے گولے پھینک دیئے اور مکان نے جو بیشتر لکڑی کا بنا ہوا تھا آگ پکڑ لی۔ کمرے میں دھواں بھرنے لگا۔

”اب آپ کس بات کا انتظار کر رہے ہیں جناب؟ آیئے باہر نکلیں جو ہو گا سو دیکھا جائے گا“۔ میرے اکلوتے محافظ نے کہا۔

میں نے اُسے جواب دینے کے بجائے پوچھا: ”تمہارا نام کیا ہے، جوان؟“

”میرا نام خاور ہے جناب۔ میرا باپ راخش کے باپ کا ماتحت تھا اور میں راخش کے دستے کا سپاہی ہوں“۔

”تم ٹھیک کہتے ہو خاور۔ ہم یہاں رہ کر راکھ نہیں بنیں گے“۔ میں نے اُسے اتنا ہی کہا اور جو کچھ میں دیکھ چکا تھا، وہ اُسے نہیں بتایا۔ ”آؤ ہم ایک دوسرے کی پیٹھ سے پیٹھ ملا کر آخر دم تک لڑیں گے“۔ میں نے اُس کا شانہ تھپتھپایا اور ایک برچھا اُٹھاتے ہوئے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

جونہی ہم باہر نکلے۔ چاروں طرف سے وحشی کاشیوں کے قہقہے گونجنے لگے اور وہ ہماری طرف جھپٹے۔ ہم نے ایک دوسرے کی پیٹھ سے پیٹھ ملالی۔

میں نے بائیں ہاتھ میں برچھا تھام رکھا تھا اور میرے دائیں ہاتھ میں تلوار تھی۔ یہی حال خاور کا بھی تھا۔ کاشی اس خوش فہمی میں تھے کہ اب پہلے ہی ریلے میں وہ ہمارے پرخچے اُڑا دیں گے۔ اس لیے وہ ہم پر ٹوٹ پڑے۔ جب موت سر پر کھیل رہی ہو تو آدمی ایسی ہی بے جگری سے لڑتا ہے کہ اُسے اپنا ہوش بھی نہیں رہتا۔ چنانچہ ہمارے برچھے اور تلواریں کاشیوں کا خون چاٹنے لگیں۔ کاشی کٹنے، گرنے اور مرنے لگے۔ ہمارے اردگرد اُن کی لاشوں کے ڈھیر سے لگ گئے۔ کچھ زخم ہمیں بھی آئے۔ ہم خون اور پسینے سے تر

ہو گئے مگر ہم نے ہمت نہ ہاری۔ تاہم کچھ دیر بعد ہمارے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے اور موت آنکھوں کے سامنے ناچتی دکھائی دینے لگی۔ کاشیوں کے کمان دار نے مجھ پر اتنی شدت سے حملہ کیا کہ میری تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اُدھر میرا ساتھی بھی زخمی ہو گیا۔

اب میں برچھے سے مقابلہ کر رہا تھا لیکن میری سانس بُری طرح پھول گئی تھی اور میں کسی بھی لمحے بے دم ہو کر گرنے والا تھا کہ اتنے میں درختوں کے پیچھے سے قرنا پھونکنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی راخش کا عسکری دستہ آگے بڑھا اور کاشیوں پر ٹوٹ پڑا۔ کاشی یہ دیکھ کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے مگر راخش کے سپاہی اُن کے پیچھے تھے۔

میں باآوازِ بلند چلایا: ”راخش۔ میری بات سنو راخش... کاشیوں کو جان سے مت مارو، انھیں گرفتار کر لو۔ زارا کو بھی قتل نہ کرنا۔ اُسے گرفتار کرنا۔ کیا تم نے میرا حکم سن لیا ہے، راخش؟“

”میں نے آپ کا حکم سن لیا ہے جناب“۔ راخش نے جواب دیا اور پھر اپنے سپاہیوں کو ہدایات دینے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں بچے کھچے سارے کاشی گھیر لیے گئے اور زارا کو بھی نرغے میں لے لیا گیا۔ اب مجھے اپنا زخمی محافظ یاد آیا۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا: ”زندہ رہنا اچھا ہے جناب! لیکن کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟“

میں نے اپنے دامن سے کپڑا پھاڑ کر اُس کے زخم پر پٹی باندھتے ہوئے کہا: ”یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے، خاور... اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب تم نئے کمان دار ہو اور راخش کے نائب کی حیثیت سے کام کرو گے“۔

خاور نے سر جھٹک کر کہا: ”دو دو معجزے ایک ساتھ کیسے ہو سکتے ہیں جناب۔ میں موت کے منہ سے بھی بچ گیا اور آپ نے مجھے کمان دار بھی بنا دیا۔ کہیں میں کسی دوسری دنیا میں تو نہیں پہنچ گیا؟“

میں نے قہقہہ لگایا: ”دوسری دنیا میں پہنچتے سے بال بال بچ گئے ہو۔ ورنہ وہاں سپاہی کی حیثیت سے ہی جاتے“۔ یہ کہہ کر میں راخش کی طرف متوجہ ہو گیا جو میرے قریب آ چکا تھا۔ وہ بھی اس لڑائی میں زخمی ہو گیا تھا یا پھر اس کی وردی کسی کاشی کے خون سے آلودہ ہو گئی تھی۔

وہ بہت غصے میں دکھائی دیتا تھا: ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک اوتار اتنا نادان کیسے ہو سکتا ہے، جناب؟“ وہ بولا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا: ”اس معاملے میں اوتار کی نادانی کم اور سازش زیادہ ہے راخش۔ مجھے تمہارا یہ نائب یہاں لایا تھا“۔ میں نے زارا کی طرف اشارہ کیا جسے رسیوں سے جکڑ دیا گیا تھا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارا آدمی بھی غدار ہو سکتا ہے“۔

”مجھے افسوس ہے جناب۔ میں بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ غدار زخشون کے ہاتھوں اپنا ضمیر بیچ چکا ہے۔ خیر اسے اپنی غداری کی پوری پوری قیمت ادا کرنا پڑے گی“۔

میں نے راخش سے کہا: ”اب خاور اس کی جگہ کام کرے گا۔ میں نے اُسے کمان دار بنا دیا ہے“۔ پھر میں راخش کو الگ لے گیا اور کہا: ”تم کسی پر تشدد نہیں کرو گے۔ زارا سے میں خود ہی پوچھ گچھ کروں گا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ زخشون نے میرے خلاف سازش کا کیا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کے بعد تم زارا کو قتل کر دینا“۔

”لیکن قتل تو اس کے لیے بڑی معمولی سزا ہو گی جناب۔ میں اُسے اس طرح زندہ رکھنا چاہتا ہوں کہ وہ موت کے لیے ترستا رہے۔ میں نے ہی اُسے اپنا نائب بنایا تھا مگر اُس نے میرے ساتھ بھی غداری کی ہے۔ میں اُسے ایسی سزا دوں گا جس سے لوگ عبرت حاصل کریں گے“۔

"نہیں راخش تم وہی کروگے جیسا کہ میں نے کہا ہے اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ خشونی کو کوئی ضرر پہنچے۔ وہ اس وقت کہاں ہے؟"

راخش نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا: "وہ اپنے گھر پر ہے جناب۔ میں نے وہاں اپنے محافظوں کی تعداد دُگنی کردی ہے اور خشونی کو ہدایت کی ہے کہ وہ گھر سے باہر نہیں جا سکتا۔ میں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا ہے کہ میں آپ کی وجہ سے متردّد اور پریشان ہوگیا تھا۔"

"تم نے جو کیا اچھا ہی کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم دونوں نادان نہیں اور خشونی محفوظ ہے مجھے اس سے کام لینا ہے کیونکہ اُسے ان کاشیوں پر قابو حاصل ہے، جو آزاد ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان سب کو گھیر کر نہتا کردیا جائے۔ فرزال سے کہو کہ اُن کے لیے شمالی میدان میں پنجرے بنوائے۔"

"وہ بے دماغ وحشی صرف خشونی کا حکم مانتے ہیں۔ جب انھیں پتہ چلے گا کہ خشونی اقتدار سے محروم کردیا گیا ہے تو وہ جنگلوں میں بھاگ جائیں گے اور ان میں سے بہت کم ہمارے ہاتھ آئیں گے۔" راخش نے جواب دیا۔

"پروا نہیں راخش... مگر ہمیں کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ اب ایک بات اور بتا دو۔ تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں خطرے میں ہوں؟"

راخش نے سر جھکا لیا اور بولا: "میں نے شہزادی کی سیاہ پوش خادمہ سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ زارا میرا پیغام لے کر آیا تھا جبکہ میں نے اُسے کوئی پیغام دے کر نہیں بھیجا تھا۔ پھر جس علاقے میں فوج نہ ہو، وہاں کاشی آکر عورتیں اُٹھا لے جاتے ہیں۔"

"مگر تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ کاشی اس علاقے میں آئے ہوئے ہیں؟"

"میرے بھی کچھ مخبر ہیں جناب۔ وہ مجھے زارا کے متعلق بتا چکے ہیں کہ زارا، خشونی کے ہاتھوں اپنا ضمیر بیچ چکا ہے لیکن مجھے اس بات کا ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ جب میں نے یہ سنا کہ وہ میری طرف سے کوئی پیغام لایا تھا تو فوراً سمجھ گیا کہ یہ خشونی کی کوئی چال ہوگی اس لیے میں فوراً خشونی کے پاس پہنچ گیا اور..." اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

"تم نے اُسے قتل تو نہیں کردیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"نہیں جناب۔ البتہ مجھے سچ اُگلوانے کے لیے اس پر تھوڑا سا تشدّد ضرور کرنا پڑا تھا مگر آپ فکر نہ کیجیے اُس کے زخم جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"شکریہ راخش۔ آج تم نے میری جان بچائی ہے اور میں تمھارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔"

"نہیں جناب۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ پھر کسی خطرے میں مبتلا ہو جائیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں راخش۔ میں تھوڑی دیر بعد تم سے خشونی کے گھر ملوں گا۔ جاؤ اور ان قیدیوں کا بندوبست کرو۔"

جب راخش، کاشیوں اور زارا کو اپنے سپاہیوں کے نرغے میں لے کر چلا گیا تو میں شمشان کی طرف چل پڑا۔

شمشان میں اب بھی مُردے جل رہے تھے حالانکہ اب مُردے یہاں نہیں لائے جا رہے تھے اور مُردے جلانے والے بُلا لیے گئے تھے۔ شمشان کے گڑھے میں بہت سے اَن جلے مُردے بھی پڑے تھے۔ میں نے اُن مُردوں میں دیپا کی میت تلاش کی کوشش کی جو کاشیوں کی بربریت کا نشانہ بنی تھی۔ وہ مل گئی۔ اس کا سر تن پر موجود نہیں تھا۔ میں نے جسم پہچان لیا اور پھر اُٹھا کر پہاڑی پر لے آیا، درختوں کے جھنڈ میں قبر کھودی اور اُس میں اُسے لٹا کر دیکھنے لگا۔ مجھے وہ لمحہ یاد آگیا جب پہلی بار میں نے اُسے جھیل والے گوریلوں کی قید سے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ پھر اُس کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ مجھے اپنے ذہن کے گنبد بے روِ صدا میں گونجنے لگا۔ میں اپنے سینے میں پتھر جیسا دل رکھنے کے باوجود آنسو نہ روک سکا۔ اس معصوم اور محبت کرنے والی لڑکی نے میری خاطر جان دی تھی مگر مجھے دھوکا نہیں دیا تھا۔

میں نے اُس کی قبر بند کی اور کہا: "ہمیشہ کے لیے الوداع۔"

یہ کہہ کر میں بھاری دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ واپس چل دیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہوائیں اس کے سوگ میں بین کر رہی ہوں اور میرے اندر کوئی شے چھناکے سے ٹوٹ گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی میری کھوپڑی پر جو ضرب پڑی، اُس سے یوں لگا جیسے میرے اندر ٹوٹنے والی شے کے ساتھ ساتھ وہ بھی چکنا چُور ہو۔

میری کھوپڑی کے ریزے تاریکیوں میں ڈوبتے چلے گئے

۲۲

میرے حواس ٹھکانے آئے تو میں خود کو گرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اُٹھا کر مجھے گہرے پانیوں میں پھینک دیا ہو... میں کسی بھاری گراں ہوتے ہوئے بم کی طرح گہرائی میں اُترتا

مجھے حیرت تھی کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ مجھ سے کسی نے غداری کی ہے یا ڈاکٹر فریدوں کے کمپیوٹر نے مجھے واپس بلانے کا عمل شروع کر دیا اور یہ عمل کسی وجہ سے پورا نہ ہو سکا اور میں کسی اور ہی سرزمین پر پہنچ گیا ہوں۔

بالآخر میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو مجھے اپنے اِرد گرد سبز روشنی دکھائی دی جو پانی سے چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں نے جلدی جلدی ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیے اور اُوپر اُٹھنے لگا۔

جب میں نے سطحِ آب سے سر نکالا تو میرے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا اور اس کا نمکین ذائقہ بتا رہا تھا کہ میں کسی بحرِ ناپیدا کنار کے درمیان تیر رہا ہوں۔ جہاں میری بقا کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

ہر طرف پھیلے ہوئے سمندر کے سوا کچھ بھی نہیں تھا جس کی تہ میں نادیدہ بلائیں خوراک کی تلاش میں گھوم رہی تھیں اور میں اُن کے لیے لقمۂ تر ثابت ہو سکتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بہترین تیراک ہوں اور بیس میل تک تیرتے چلے جانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں مگر مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قریبی ساحل کس سمت کو ہے اور کتنی دُور ہے۔ پانی سے سر اُبھارنے کے ساتھ ہی لاتعداد اندیشے میرے ذہن میں اُبھرے اور مجھے موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا کر گئے۔ میں کم ہمت اور کم حوصلہ آدمی نہیں ہوں لیکن اس صورتِ حال میں میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ اس وقت تک چُپ چاپ اپنی موت کا انتظار کرتا رہوں جب تک کہ شارک مچھلیوں کی خوراک نہیں بن جاتا۔ تاہم میں نے اپنے ربِ عظیم کو پکارا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مجھے کسی سمت کنارہ دکھائی دیا اور نہ ہی دُور و نزدیک کسی کشتی کے بادبان نظر آئے البتہ بہت دُور سطحِ آب پر ایک سیاہ دھبہ ضرور دکھائی دے گیا۔

یہ دھبہ کیا تھا اور کیسا تھا، میری سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ اگر وہ جہاز ہوتا تو پہلے مجھے اُس کے مستول دکھائی دیتے۔ کشتی ہوتی تو پھر بادبان نظر آتے۔ وہ کوئی جزیرہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ چند لمحوں میں اس کی جسامت بڑھ گئی تھی۔ میری نگاہیں اُس پر جم کر رہ گئیں... اُس دھبّے سے ایک سفید لکیر اُوپر اُٹھنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے دھوئیں میں تبدیل ہو گئی۔

سمندر کے بیچوں بیچ اُٹھنے والا دُھواں میرے لیے خاصا حیرت خیز تھا۔ ابھی میں اُس کے سبب پر غور کر ہی رہا تھا کہ اُس سے کچھ فاصلے پر ایک اور دھبہ اور اس سے سفید لکیر اُٹھتی دکھائی دی۔ یہ لکیر بھی اُوپر جا کر دُھواں بن گئی... اور اس کے ساتھ ہی میں سمجھ گیا کہ پانی سے یہ دُھواں کیوں اور کیسے اُٹھ رہا ہے۔ شاید وہاں کشتیاں یا جہاز جل رہے تھے۔

یہ دُھواں میرے لیے نوید بقا تھا۔ میں پُوری قوت سے اُس طرف تیرنے لگا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ اس وقت سمندر پُرسکون تھا ورنہ میں اتنی تیزی سے ہرگز نہیں تیر سکتا تھا۔

کوئی آدھ پون گھنٹے بعد ... دُور سے دو بادبانی جہاز جلتے ہوئے نظر آگئے۔ میں نے تیرنے کی رفتار بڑھا دی تاکہ اگر اِن جہازوں کے ملاح جان بچانے کے لیے چھوٹی کشتیوں میں جا رہے ہوں تو میں بھی اُن میں شامل ہو سکوں لیکن جب میں قریب پہنچا تو مجھے اُن جہازوں پر کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ شاید وہ میرے آنے سے پہلے ہی جا چکے تھے۔

ان جہازوں کے قریب ہی مجھے کچھ تختے، چپّو، رسّے اور صندوق تیرتے نظر آئے۔ میں نے جلدی جلدی تین تختوں کو ایک رسّے کے ساتھ باندھ دیا کہ جلتے ہوئے جہازوں کو تو بالآخر ڈوب ہی جانا تھا...

اگر میں اُن سے کھانے پینے کا سامان نکال بھی لیتا تو اُسے کیسے سنبھالتا اور کہاں رکھتا؟ یہی سوچ کر سب سے پہلے میں نے تختوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا۔ اتنے میں ایک صندوق تیرتا ہوا قریب آگیا۔ میں نے اُسے گھسیٹ کر تختوں پر رکھ لیا... مگر جب اُسے کھولا تو اس میں کچھ کپڑے، خنجر اور ایک تلوار رکھی ہوئی ملی۔ شاید یہ صندوق جہاز کے کسی افسر کا تھا۔ اگرچہ مجھے کسی ہتھیار کی بھی شدید ضرورت تھی مگر اس سے کہیں زیادہ اہم اشیائے خورد و نوش تھیں جن کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے میں نے کسی تاخیر کے بغیر اُن جہازوں پر جانے کا فیصلہ کرلیا اور اُن میں سے ایک پر چڑھ گیا۔ اس جہاز کا آدھا حصّہ جل چکا تھا۔

اس وقت شام کا جھٹپٹا پھیلنے لگا تھا اور میں جلد از جلد کچھ اشیائے خورد و نوش اُن تختوں پر منتقل کر دینا چاہتا تھا۔

جہاز کے عرشے پر کچھ ملّاحوں کی لاشیں بھی پڑی تھیں۔ کچھ لاشیں میں نے سمندر میں تیرتی ہوئی دیکھی تھیں مگر وہ کون تھے اور کیسے لوگ تھے، یہ دیکھنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا۔ اتنا اندازہ ہی میرے لیے کافی تھا کہ دو مختلف گروہوں کے درمیان لڑائی ہوئی، جس کے نتیجے میں یہ دو تجارتی جہاز جل رہے ہیں اور مخالف فریق کے جہاز یا کشتیاں ڈوب چکی ہیں جن کے تختے قریب ہی تیر رہے تھے۔

میں جہاز پر گھوم، اشیائے خورد و نوش کے لیے نظریں دوڑا رہا تھا

کہ اچانک میری نگاہ جلتے ہوئے جہاز کی روشنی میں دُور سمندر پر جا پڑی اور میں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ ایک چھوٹی کشتی میری ہی طرف آ رہی ہے۔ اس میں کچھ لوگ ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھے اور میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے، اس لیے میں نے فی الوقت یہی مُناسب سمجھا کہ اُن کی نگاہوں میں نہ آؤں اور پہلے اُن کا جائزہ لے لوں۔ چنانچہ میں فوراً ڈوبتے جہاز سے اُتر کر تیرتے ہُوئے تختوں پر لیٹ گیا۔۔۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ بھی یقیناً اشیائے خورد و نوش ہی کی تلاش میں یہاں آئے ہوں گے ورنہ تباہ شدہ اور جلتے ہُوئے جہازوں کی طرف کیوں آتے؟ اور میرے لیے یہی بہتر ہوگا کہ میں ان تختوں پر ہچکولے کھا کھا کر موت کا انتظار کرنے کی بجائے اُن کا ہم سفر بن جاؤں۔ کشتی موجوں کے رحم و کرم پر بہنے والے تختوں سے بہرصُورت بہتر اور محفوظ تھی۔۔۔ اور ممکن ہے کہ خدا نے میری مدد کے لیے ہی انھیں بھیجا ہو۔ چنانچہ میں نے بے ساختہ "ہیا ہو" کا نعرہ لگا دیا۔

میرے اس نعرے کا اُلٹا اثر ہُوا۔

کشتی آگے بڑھنے کی بجائے ایک دم گھوم گئی، چپّو چلنے بند ہو گئے اور فضا میں سناٹا چھا گیا۔ یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے نعرے نے اُن سب کو گونگا اور بہرہ ہی نہیں، بلکہ پتھر کا بھی بنا دیا ہو۔۔۔ یا پھر انھیں اچانک ایک ساتھ ہی موت آ گئی ہو۔

"تم لوگ آتے آتے رُک کیوں گئے ہو۔ آگے آؤ نا؟" میں نے اُن سے کہا۔

"تم کون ہو؟" کشتی سے آواز آئی۔

"مجھے اپنا دوست سمجھو دوستو؟" میں نے جواب دیا۔

کشتی والے لوگ آپس میں دھیمی آواز سے یُوں باتیں کرنے لگے جیسے مشورہ کر رہے ہوں پھر کشتی آگے بڑھی اور میرے تختوں سے چند فٹ کے فاصلے پر رُک گئی۔ میں اُن کی طرف اور وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھنے لگے۔ اُن کے چہروں اور حالت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس تصادم کا ایک فریق تھے۔ میں نے انھیں اپنی طرف متوجہ پا کر کہا۔

"میری طرف یوں حیرت سے کیا تک رہے ہو؟" میں نے کہا "کہ میں تمھارا دوست ہوں۔ کیا میں تمھیں اپنا دوست نظر نہیں آتا؟"

اُن میں ایک بار پھر کانا پھوسی شروع ہو گئی۔ آخر اُن میں سے ایک آدمی جو بُشرے سے سردار لگتا تھا، اُٹھا اور اُس نے مجھ سے سوال کیا۔

"تمھارا جہاز کون سا تھا؟"

"ان میں سے کوئی بھی نہیں؟" میں نے جلتے ہُوئے جہازوں اور تباہ شدہ کشتیوں کے تختوں کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے جواب دیا۔ "میں جنوب سے یہاں آیا ہوں جہاں دو روز پہلے میرا جہاز غرقاب ہو گیا تھا۔"

"وہ کیسے غرقاب ہو گیا جب کہ ان دنوں سمندر میں کوئی طوفان آیا نہ بارش ہُوئی۔ کیا بحری قزاقوں نے اسے ڈبو دیا؟"

"بحری قزاق؟" میں نے تعجب سے دُہرایا۔

"اگر تم برقون کے بحری قزاقوں کو نہیں جانتے تو میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ تم کسی اور سرزمین سے آئے ہو؟ نہ ہو؟" اور اگر تم برقون کے بحری قزاقوں سے لاعلم ہو تو اُن میں سے نہیں ہو سکتے۔ اب یہ تلوار پھینک دو اور نہتے ہو کر ہماری کشتی پر آ جاؤ۔ میں کسی ملاح کو قزاقوں کے لیے یہاں نہیں چھوڑ سکتا کہ وہ یہاں آئیں اور تمھیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے آدمیوں کی زندگی بھی خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ چلو جلدی کرو۔"

میں نے تلوار پھینک دی اور تختے سے کُود کر تیرتا ہُوا کشتی میں آ گیا۔ اُس نے غور سے میرا جائزہ لیا اور بولا۔ "میں نے تم جیسا لمبا تڑنگا اور قوی آدمی پہلے نہیں دیکھا۔ اب تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اگر تم نے کسی ہتھیار کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ہم تمھیں مچھلیوں کا لقمہ بنانے میں دیر نہیں کریں گے۔"

اتنے میں پیچھے سے کسی کی آواز آئی "سُلطان۔۔۔ اُدھر دیکھو۔"

میں نے اور کشتی میں سوار ہر آدمی نے پلٹ کر دیکھا۔ جلتے ہوئے جہاز کے عقب سے مُڑ کر دو لمبی کشتیاں ہماری طرف آ رہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اُن میں برقون کے قزاق سوار ہیں جن کا ذکر سُلطان نے کیا تھا۔ یہ بات بھی فوراً میرے ذہن میں آ گئی کہ بحری قزاق مجھے ان لوگوں کا ساتھی اور اپنا دُشمن تصوّر کرتے ہوئے بات کرنے کا موقع دیے بغیر ہی تہ تیغ کر ڈالیں گے۔ اتنے میں وہ کشتیاں ہمارے سر پر آ گئیں۔ سلطان بولا "اب اُوپر والا ہی ہمیں بچائے تو بچائے ورنہ بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔ ہم نے یہاں آ کر زبردست غلطی کی ہے۔"

میں نے کشتی میں پڑی ہُوئی تلواروں میں سے ایک کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سُلطان نے مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "مجھے شک و شبہے کی نگاہوں سے مت دیکھو سُلطان! میں بتا چُکا ہوں کہ تمھارا دوست ہُوں۔ نہ تمھارے ساتھ مجھے بھی ختم کر دیں گے اس لیے وقت ضائع نہ کرو اور مجھے ایک تلوار دے دو۔"

سُلطان نے کچھ کہنے کی بجائے ایک تلوار اور خنجر میری طرف بڑھا دیا۔ اتنے میں قزاقوں کی کشتیاں پہلو بہ پہلو آ گئیں۔ میں تلوار اور خنجر سنبھال کر اُٹھ کھڑا ہُوا تا کہ قزاقوں کی جنگی ہیبت کا جائزہ لے سکوں۔ غنیمت تھا کہ اُن کے پاس تیر کمانیں نہیں تھیں، ورنہ وہ پہلے ہی ہمیں ختم کر دیتے۔ اس وقت ہماری طرح اُن کے پاس بھی تلواریں ہی

تھے۔

قزاقوں کی ایک کشتی نے پہلو سے ٹکر ماری تا کہ ہماری کشتی اُلٹ جائے مگر اس ٹکر سے صرف ہماری کشتی کے ملاحوں کے ہی نہیں، قزاقوں کے قدم بھی ڈگمگا گئے اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر حملہ کرتے، میں اُن پر ٹوٹ پڑا۔ میرے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے میں خنجر۔ چونکہ بحری قزاقوں کے سردار نے ہماری کشتی میں کُودنے کا منصوبہ بنایا تھا، اس لیے سب سے آگے وہی تھا اور سب سے پہلے میری تلوار بھی اُسی کے دل میں اُتری۔ چونکہ میرے بازو قزاقوں کی نسبت لمبے تھے اس لیے میری تلوار اور خنجر کی پہنچ اُن کی نسبت کہیں زیادہ تھی، چنانچہ میں نے اُس سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ مارشل آرٹ اور شمشیر زنی کی تربیت نے مجھے نہ صرف ہتھیاروں بلکہ اپنی ٹانگوں سے بھی بھرپُور کام لینا سکھا دیا تھا لہٰذا میں نے چند لمحوں کے اندر اندر پانچ قزاقوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اب مجھ پر خون سوار ہو گیا تھا۔ میں اسی جنون کی سی کیفیت میں اُن کی کشتی پر کُود گیا اور پھرکی کی طرح گھومتے ہوئے تلوار، خنجر اور پاؤں چلانے لگا۔ چند لمحے تو قزاق میرے مقابلے پر ڈٹے رہے مگر جب کوئی بھی مجھے ایک چرکا تک لگانے میں کامیاب نہ ہو سکا اور میری تلوار اُنھی کا خون چاٹتی رہی تو وہ ایک ایک کر کے سمندر میں کُود گئے۔ اب میں نے پلٹ کر اپنی کشتی کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ قزاقوں کی دوسری کشتی، جس نے ہماری کشتی کے دوسرے پہلو سے حملہ کیا تھا، راہِ فرار اختیار کر رہی ہے۔ اتنے میں سُلطان خوشی سے چلّا اُٹھا "واہ میرے دوست! تم نے تو کمال کر دیا۔ اپنے مرے ہُوئے باپ کی قسم، ایسی لڑائی آج تک کسی نے نہیں دیکھی ہوگی۔ میرے چار ساتھی مر گئے ہیں لیکن ہم نے بھی اُن کے چھ آدمی ہلاک کر دیے ہیں۔ جب اُنھوں نے تمھارے ہاتھوں اپنے ساتھیوں کا انجام دیکھا تو بھاگ نکلے۔"

اس دست بدست لڑائی کے دوران قزاقوں والی اور ہماری کشتی ایک دوسرے سے تقریباً بیس فٹ دُور ہو گئی تھیں۔ جب میں اپنی کشتی میں جانے کے لیے چھلانگ لگانے لگا تو سُلطان بولا "تم وہیں رہو۔ ان بدبختوں کی لاشیں پھینک کر وہ کشتی بھی لے چلیں گے۔"

پھر سُلطان نے اپنے کچھ ساتھیوں کو لاشیں پھینکنے اور کچھ کو جلتے جہازوں سے اشیائے خورد و نوش لانے کا حکم دیا اور میرے پاس آ کر مسرور لہجے میں بولا "تو تم جنوب سے آئے ہو؟"

"ہاں۔۔۔ میں جہاں گرد قسم کا آدمی ہوں؟" میں نے جواب دیا۔

"اپنے مرے ہُوئے باپ کی قسم، میں نے آج تک تم جیسا جنگجو نہیں دیکھا؟"

"مگر میں اپنے وطن میں ملاح نہیں، پیشہ ور عسکری تھا۔ ہماری طرف آزاد پیشہ ور عسکری بھی ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ میں نے اُن کے بارے میں سُنا ہے۔ تم اتنے اچھے جنگجو ہو کر فارش کا کوئی بھی جہاز راں تمھیں دُگنی تنخواہ پر اپنا محافظ بنا لے گا۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ تم ہمیں مل گئے؟" پھر اُس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہُوئے بات جاری رکھی "سُلطان پسرِ ارسلان تمھاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے اور تادمِ آخر تمھارا دوست رہے گا۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہُوئے کہا "سرفروش بھی دوستوں کا دوست ہے اور زندگی کے آخری لمحے تک دوستی نبھائے گا؟"

"جب سلطان جہاز رانوں کی انجمن سے کچھ کہتا ہے تو اس کے ارکان سلطان کی بات نہیں ٹال سکتے۔ دیکھتے جاؤ، سُلطان پسرِ ارسلان تمھارے لیے کیا کرتا ہے؟" اتنا کہہ کر وہ پلٹا اور اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینے لگا۔

* *

ہمیں کشتیوں میں سفر کرتے ہُوئے پانچ روز ہو گئے تھے۔ ان پانچ دنوں میں میں نے مکمل آرام کیا تھا اور سوچتا رہا تھا مگر مجھے سُلطان اور اُس کے ساتھیوں کی باہمی گفتگو سے جو کچھ معلوم ہو سکا تھا، اُس سے میں کسی فائدہ مند فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ اُن لوگوں سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق وہ فارش کے باشندے تھے۔ فارش کے شمال میں سمندر کے بیچوں بیچ برقون کا جزیرہ واقع تھا جو بحری قزاقوں کی آماجگاہ ہی نہیں بلکہ ان کا دارالحکومت تھا۔ عسکری قوت کے اعتبار سے یہ جزیرہ پانچویں مملکت تھی۔ گزشتہ پانچ سالوں کے دوران قزاقوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ اُن کے حوصلے بھی اتنے بڑھ گئے تھے کہ وہ سمندر میں تجارتی جہازوں کو لُوٹنے کے علاوہ فارش اور اس سے ملحق تین مملکتوں کے ساحلی علاقوں کو بھی تاخت و تاراج کرنے لگے تھے۔

سُلطان اُن جلنے والے دو تجارتی جہازوں میں سے بڑے جہاز "ماہیِ سفید" کا نائب کپتان تھا۔ چونکہ یہ دونوں بڑے جہاز تھے اور اُن کا عملہ مسلح ہونے کے ساتھ ساتھ جنگی تربیت یافتہ تھا اس لیے قزاقوں سے تصادم میں اُنھوں نے قزاقوں کی دو جنگی کشتیاں ڈبو دی تھیں اور تین کو آگ لگا دی تھی مگر خود بھی آتش زنی سے نہیں بچ سکے تھے۔ سُلطان نے بتایا تھا کہ عام طور پر جیت قزاقوں کی ہُوا کرتی ہے جو جہاز اور اُن پر لدا ہُوا ساز و سامان برقون لے جاتے ہیں جہاں جہازوں کے

عملے کو غلام بنا لیا جاتا ہے یا کبھی کبھی یرغمال وصول کرنے کے بعد انھیں رہا کر دیا جاتا ہے۔

سلطان کا خیال تھا کہ اگر موسم اسی طرح سازگار رہا تو وہ تین ہفتوں میں ساحلِ فارش تک پہنچ جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں سوائے سوچنے اور آرام کرنے کے میں اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا لہٰذا آج بھی میں کھانا کھا کر جلدی سو گیا۔

دوسری صبح "جہاز... جہاز" کی مسرت انگیز آوازوں سے میری آنکھ کھلی تو میں حیران رہ گیا کیوں کہ سلطان نے بتایا تھا کہ ساحلِ فارش تک راستے میں کسی جہاز کے ملنے کا امکان نہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کافی دُور تک جنوب میں نکل آئے تھے جہاں قزاقوں کا خطرہ ہوتا ہے اور عام طور پر جہاز اُدھر نہیں آتے چنانچہ ملاحوں کی اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے اُس طرف دیکھا جدھر ملاحوں کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بلاشبہ بہت بڑا جہاز تھا جس کے تین مستول تھے اور ہر مستول کے ساتھ تین تین بادبان لگے ہوئے تھے۔ جہاز پر سُرخ اور نیلا رنگ کیا گیا تھا اور اس کی وجہ سے سلطان نے پہچانا تھا کہ وہ فارش کا جہاز ہے۔

اس نے بتایا "یہ شاہی جنگی جہاز ہے سرفروش۔ فارش کی بحریہ کے پاس اچھا خاصا بیڑا ہے۔ اب ہمیں کشتیوں کے تکلیف دہ سفر سے نجات مل جائے گی۔"

سلطان نے مدد کا اشارہ دینے کے لیے بوری میں بھرا ہوا کوئی ایسا مسالہ جلایا کہ اُس سے سبز رنگ کا دھواں اُٹھنے لگا... تھوڑی دیر بعد جہاز سے بھی ویسا ہی دھواں اُٹھتا دکھائی دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہماری کشتیاں جہاز کے قریب پہنچ گئیں۔ جہاز کی ریلنگ سے داڑھیوں والے ملاح جھانک جھانک کر ہمیں دیکھنے لگے۔ اتنے میں ایک آدمی جو غالباً جہاز کا کپتان تھا، ریلنگ سے جھانکتے ہوئے چلایا۔

"کون ہو تم لوگ؟"

"ماہیِ سفید اور مرشاخ کے بچے کھچے ملاح۔ چند روز پہلے قزاقوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ انھوں نے ہمارے دونوں جہاز جلا دیے مگر ہم نے بھی اُن کی دو کشتیاں جلائیں اور تین ڈبو دیں۔" سلطان نے جواب دیا۔

جہاز کے ملاحوں نے یہ سن کر تالیاں بجائیں اور خوشی کا نعرہ لگایا مگر کپتان بولا۔ "اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم لوگ بحری قزاق ہو اور ہمیں دھوکا دینا چاہتے ہو۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" سلطان غصے سے بولا۔ "کیا تم سلطان پسرِ ارسلان کو نہیں جانتے؟"

اتنے میں ریلنگ پر جھکے ہوئے ملاح ہٹنے لگے اور ایک نیا چہرہ نیچے جھانکنے لگا۔ یہ سفید بالوں والے ایک ادھیڑ عمر آدمی کا چہرہ تھا۔ اُس نے سیاہ پگڑی باندھی ہوئی تھی جس پر جہاز کے پرچم کی طرح پانچ برج کڑھے ہوئے تھے۔ سلطان اُسے دیکھتے ہی چلایا۔

"عالی وقار شہزادے۔ کیا یہ تنشور کا جہاز ہے؟"

"ہاں سلطان۔" شہزادے نے جواب دیا اور کپتان سے کہنے لگا۔ "یہ سلطان پسرِ ارسلان ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ اسے اور اس کے ساتھیوں کو جہاز پر سوار کر لو۔"

"لیکن عالی جاہ..."

"ہم جو کہتے ہیں، وہ کرو۔" شہزادے نے کپتان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہم سفیر نہیں، ولی عہد ہیں۔"

کپتان نے سر جھکا دیا۔

چند لمحوں بعد جہاز سے رسی کی سیڑھی لٹکا دی گئی اور ہم ایک ایک کر کے جہاز کے عرشے پر پہنچ گئے۔

شہزادہ شہریار نے چند سوالات کرنے کے بعد کپتان کو حکم دیا کہ میرے اور سلطان کے علاوہ باقی سارے آدمیوں کو لباس فراہم کر کے کھانا کھلا دے پھر وہ مجھے اور سلطان کو اپنے کیبن میں لے آیا جہاں اُس نے الماری کھول کر مجھے اور سلطان کو بہت عمدہ لباس اور جوتے وغیرہ دیے اور خود باہر چلا گیا۔

ہم نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور باہر جانے لگے کہ اتنے میں شہزادہ کپتان کے ساتھ وہاں آ گیا۔ اس نے ہمیں نشستوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سلطان سے بولا۔ "ہاں پسرِ ارسلان۔ اب تم اپنی کہانی تفصیل سے سناؤ۔"

جب سلطان اُسے ہر بات تفصیل سے بتا چکا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم ایک آزاد عسکری ہو سرفروش۔ کیا تمھارے وطن میں تم جیسے اور بھی بہت سے آزاد جنگجو ہوتے ہیں؟"

"وہاں آزاد عسکری تو کافی ہیں عالی جاہ مگر مجھ جیسے بہت کم ہیں۔"

"ہوں..." وہ کچھ سوچتے اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اگر تمھارے وطن میں سبھی تم جیسے ہوتے اور دس دس قزاقوں کو تنہا ختم کرنے کی ہمت رکھتے تو اُن کی ایک چھوٹی سی فوج نہ صرف ہماری چار مملکتوں پر چھا جاتی بلکہ وہ قزاقوں کو بھی تہس نہس کر دیتی۔" اتنا کہنے کے بعد وہ با آواز بلند بولا۔ "فرح مہمانوں کے لیے کچھ لے آؤ۔"

کیبن کے عقبی دروازے پر آویزاں پردہ ہٹا تو ایک کشیدہ قد

وشاداب نہایت حسینہ چرمی بوتل اور چاندی کے چار پیالے لیے نمودار ہوئی۔ وہ قد میں مجھ سے صرف چھ سات انچ کم تھی۔ اس کی چال میں وقار اور چہرے کے نقوش میں بلا کی جاذبیت تھی لیکن عام عورتوں کے برعکس اُس نے میری طرف نظر بھر کر بھی نہ دیکھا۔ اس نے چرمی بوتل اور پیالے تپائی پر رکھ دیے پھر ایک نشست گھسیٹ کر شہزادے کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

کپتان نے پیالوں میں مشروب انڈیلا اور پیالے ہماری طرف بڑھا دیے۔ تب شہزادہ کہنے لگا۔ "اگرچہ قزاقوں کو اپنی فتح کے لیے گراں قیمت ادا کرنا پڑی ہے لیکن اس سے اُن پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اُن کے پاس تقریباً دو سو جہازوں اور جنگی کشتیوں پر مشتمل بیڑا ہے۔ اس کے باوجود ہم اُن کا مقابلہ کر سکتے تھے مگر مشکل یہ ہے کہ گھر کے بھیدی لنکا ڈھانے پر تلے ہوئے ہیں۔ میرے بھائی شاہ اسفندیار کا وزیرِ اعلیٰ شیر کوہ قزاقوں سے ملا ہوا ہے۔ جب میں نے اپنے بھائی کو اس کی غداری سے آگاہ کیا تو اس نے مجھ پر اعتماد کرنے کی بجائے کہا کہ میں شیر کوہ کے خلاف مزید ثبوت بہم پہنچاؤں۔ اس طرح شیر کوہ کو میرے خلاف سازش کرنے کا موقع مل گیا اور اُس نے میرے بھائی کے کان بھر دیے کہ میں اُسے ہٹا کر خود تخت نشین ہونا چاہتا ہوں... اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ مجھے سفیر بنا کر مشرقی مملکت ترغون بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اب میں اپنی بیٹی فرح کے ساتھ ترغون جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنا پیالہ خالی کر کے کپتان کی طرف بڑھا دیا جو اُسے بھرنے لگا۔

اب شہزادہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم جس مملکت سے بھی آئے ہو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ اتنا مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم قزاق نہیں، اُن کے دشمن... پھر تمھاری بہادری میں بھی کوئی کلام نہیں۔ میں تمھیں جہاز پر کوئی اچھا سا عہدہ دے دیتا مگر اس طرح عملہ تم سے پرخاش رکھے گا لہٰذا فی الوقت میں تمھیں اپنا محافظِ خاص بنا سکتا ہوں۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

ظاہر ہے کہ میں جہازیوں اور ملاحوں کا کام نہیں جانتا تھا اس لیے مجھے محافظ بننے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا تھا تاہم میں نے کہا۔ "کیا آپ سلطان پسرِ ارسلان کو بھی ملازم رکھیں گے؟ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کا عہد کیا ہے۔"

"میں اُسے بھی ملازمت دے سکتا ہوں۔ یہ اپنی اوائل عمر میں میرے سسر کے جہاز پر کام کر چکا ہے۔" پھر وہ اُس سے مخاطب ہوا۔ "میرے جہاز پر کام کرو گے سلطان؟"

"بسر و چشم عالی جاہ۔" سلطان نے جواب دیا اور ہم دونوں ہی شہزادے کے ملازم ہو گئے۔

❖

سلطان کے ساتھی ملاحوں کو بھی اُن کی اہلیت کے مطابق جہاز پر کام دے دیا گیا۔ وہ سلطان کے ساتھ جہاز پر اپنے فرائض انجام دینے لگے۔ محافظِ خاص کی حیثیت سے مجھے جہاز پر کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ میں دن کے وقت کئی گھنٹوں تک شمشیر زنی کی مشق کیا کرتا اور ورزش بھی میرا معمول تھی مگر دوسرے محافظ زیادہ تر بحری بخار میں مبتلا رہتے تھے۔ انھیں دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر قزاقوں نے ہم پر حملہ کر دیا تو یہ غریب اُن کا مقابلہ کیسے کر سکیں گے؟ وہ مجھے بڑے تعجب سے دیکھتے اور مجھے پینترے بدلتے دیکھ کر دم بخود رہ جاتے۔ کئی گھنٹوں کی مشق اور ورزش کے بعد میں جہاز کے عرشے پر اور نیچے گھوم پھر کر جہازیوں کو مختلف کام کرتے دیکھتا رہتا۔ اس دوران فرح نے کبھی مجھ سے کھل کر باتیں کیں اور نہ ہی اُس کی کسی ادا سے یہ پتہ چل سکا کہ وہ مجھ میں کسی قسم کی دلچسپی رکھتی ہے۔ میری زندگی میں آنے والی وہ پہلی لڑکی تھی جو میری کسی بات سے مرعوب نہیں ہوئی تھی ورنہ اب تک مجھے جتنی بھی عورتیں ملی تھیں، سب از خود میری طرف بڑھی تھیں اور پوری دیانت داری کے ساتھ بڑھی تھیں۔

ہمیں سفر کرتے ہوئے تقریباً دو ہفتے گزر چکے تھے اور ہر آنے والے دن کے ساتھ میرے دل میں یہ تجسس بڑھتا جا رہا تھا کہ آخر فرح مجھے در خورِ اعتنا کیوں نہیں سمجھتی؟ میں جتنا اس کے بارے میں سوچتا تھا، وہ اتنی ہی معمہ بنتی جاتی تھی۔

فرح کی طرح جہاز کا کپتان بھی میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ اُسے اپنے دلی تاثرات چھپانے میں مہارت حاصل تھی۔ جب کبھی قزاقوں کے بارے میں بات چیت ہوتی، میں اُس کے چہرے کے تاثرات سے مطلق اندازہ نہ کر سکتا کہ اُس کے دل میں کیا ہے؟ لیکن چھٹی حس مجھے بار بار یہ بتاتی تھی کہ وہ شیر کوہ کا آدمی ہے۔

چودھویں روز مجھے جہاز پر ایک عجیب سی ہلچل نظر آئی... جہازی جو پہلے ڈرے سہمے دکھائی دیتے تھے، اب خوش باش نظر آ رہے تھے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو مجھے بتایا گیا کہ جہاز جنوب مشرق میں اتنا آگے آ چکا ہے کہ اب قزاقوں کی یلغار کا کوئی خطرہ نہیں رہا۔ شہزادے اور فرح کے چہروں پر بھی بشاشت اُتر آئی تھی لیکن کپتان کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ میں نے اس پر اس لیے کوئی توجہ نہ دی کہ آج مجھے فرح کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کی جھلک نظر آ گئی تھی اور میری طرف

دیکھتے وقت اُس کے ہونٹوں پر تبسم کے پھول کھل اُٹھتے تھے۔ میں نے سوچا کہ آج رات جب چاندنی اپنا جادو جگائے گی اور وہ کیبن کے دریچے میں موجوں کی بے قراری کا نظارا کرنے آئے گی تو میں خود اُس سے بات کروں گا۔

اس رات جب چاند چمکا اور چاندنی چھٹکی تو میں کیبن کے دریچے کے پاس موجود تھا۔ فرح حسبِ معمول دریچے میں آکھڑی ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ میں اُس سے کوئی بات کرتا، مستول پر چڑھا ہُوا لڑکا زور سے چلّایا "قزاق آگئے۔ قزاق آگئے۔"

میں تیزی سے ہتھیار لینے دوڑا۔ شہزادے کے ذاتی ملازم چیختے چلّاتے نیچے اُتر گئے۔ سارے محافظ اپنے اپنے ہتھیار لیے کیبن کے سامنے جمع ہونے لگے۔ تنومند جہازیوں نے بھی تیغے اور تیر کمان سنبھال لیے۔ میں نے دیکھا کہ کپتان ایک ملاّح کے ساتھ کھسر پھسر کر رہا ہے۔ . . پھر ملاّح تیزی سے نیچے چلا گیا۔ میں نے ایک نظر قزاقوں کے چھوٹے جنگی جہازوں کی طرف ڈالی جو بڑی تیزی سے ہمارے جہاز کی طرف آرہے تھے۔ وہ تعداد میں نو تھے۔ اس صورتِ حال میں اُن سے مقابلہ کرنا اور بچ نکلنا بے حد مشکل بلکہ ناممکن سا لگ رہا تھا۔

میں اُس وقت تک پُوری طرح ہتھیار بند ہو چکا تھا اور ریلنگ سے جُھک کر سب سے آگے آنے والے جہاز کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

میرے سامنے فرح کسی دُلہن جیسی سج دھج کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے بڑا خوب صُورت گلابی لباس پہن رکھا تھا۔ کانوں میں ہیرے کے آویزے تھے۔ ماتھے پر جھُومر جگمگا رہا تھا۔ کلائی سے کہنی تک جڑاؤ چوڑیاں کھنک رہی تھیں اور موتیوں کے گلوبند نے اُسے ملکوتی حُسن عطا کر دیا تھا۔

میں اس کی سج دھج اور خیرہ کُن حُسن کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ دفعتہً وہ مُسکرا کر بولی "شاید تم یہ سوچ کر حیران ہو کہ یہ بارسنگھار کی کون سی تقریب ہے، لیکن اگر ہم مغلوب ہو گئے تو قزاق ان سب کو تہ تیغ کر دیں گے جنھیں وہ غلام بنانے کے قابل نہ سمجھیں یا جن سے اُنھیں یرغمالی کی رقم ملنے کی اُمید ہو۔" پھر اُس نے اپنے زیور دکھاتے ہُوئے بات جاری رکھی "یہ زیور اس بات کی ضمانت ہیں کہ میں معزز خاندان کی ایک معزز خاتون ہوں اور انھیں یرغمال کے طور پر ایک بڑی رقم مل سکتی ہے۔"

"لیکن وحشی قزاقوں کا سامنا کرنا بڑے حوصلے کی بات ہے . . . وہ نہ جانے کیا کر بیٹھیں۔"

"میں ایک بہادر باپ کی جُرأت مند بیٹی ہوں سرفروش! اور مجھے آخری دم تک حوصلے سے کام لینا ہے۔ اس وقت میں تمھارے پاس اسی لیے آئی ہوں کہ اگر ہم مغلوب ہو جائیں تو تمھیں یاد رہے کہ میں تمھاری منگیتر ہوں۔"

"میری منگیتر، وہ کیسے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"تم بھی کتنے نادان ہو سرفروش! اتنا بھی نہیں جانتے کہ شہزادے کی بیٹی کا منگیتر کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ اس طرح وہ تمھیں بھی یرغمال بنا کر لے جائیں گے۔"

میں سمجھا کہ شاید وہ مجھے محبت کی وجہ سے بچانا چاہتی ہے مگر اُس نے یہ کہہ کر میری غلط فہمی دُور کر دی "میں چاہتی ہوں کہ اگر ایسا وقت آئے تو کوئی میری حفاظت کے لیے موجود ہو۔"

مجھے یہ سُن کر ایک دھچکا سا لگا لیکن میں نے سوچا کہ قزاقوں کے ہاتھوں سے تہ تیغ ہونے سے زندہ رہنا بہتر ہے کہ اس طرح بقا کا امکان ہو سکتا ہے۔ اتنے میں مجھے مختلف آوازوں نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ آوازیں قزاقوں کے جہازوں سے آرہی تھیں جو اب ہمارے جہاز کو چاروں طرف سے گھیر چکے تھے۔ اتنے میں شہزادہ بھی وہاں آگیا۔ وہ فوجی وردی میں اور ہتھیاروں سے لیس تھا۔ اُس نے فرح کو نیچے بھیج دیا۔ پھر مجھ سے کہا "یہ قزاق جانتے ہیں کہ ہم پر حملہ کرنا موت و حیات کی بازی لگانے کے مترادف ہے لیکن کپتان نے انھیں بہت سا سونا دینے کا وعدہ کیا ہوگا۔ وہ ہر قیمت پر بچ کر راستے سے ہٹانا چاہتا تا ہم قزاقوں کو سونا حاصل کرنے کے لیے جانوں کی قربانی دینا پڑے گی۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیا۔

میں نے قزاقوں کے جہازوں پر نظر ڈالی۔ وہ اپنے بادبان سمیٹ رہے تھے اور چپو چلا کر اپنے جہاز ہمارے جہاز سے لگنے بڑھ رہے تھے۔ میں ان کا منصوبہ سمجھ گیا۔ وہ ہمیں دائرے میں گھیرتے تھے تاکہ پھر دائرہ تنگ کر کے چاروں طرف سے ہم پر حملہ آور ہوں۔ ان کی تعداد ہمارے جہازیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ ہمارا جہاز برابر آگے بڑھتا رہا اور شہزادہ غالباً یہی ہدایت دینے کے لیے نیچے کپتان کے پاس گیا تھا۔

تب وہ عرشے پر واپس آیا اور اپنے محافظوں اور جہازیوں کو ہدایات دینے لگا تو جہاز ایک دم گھومنے کے باعث ایک طرف جُھکا اور سب لڑکھڑا گئے۔ جہاز کے گھومنے کا یہ مطلب تھا کہ اس کے بادبان مستولوں سے ٹکرا کر پھٹ جائیں اور وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ کون اور کیوں کر رہا ہے۔ میں تیزی

سے دوڑا اور نیچے اُترنے لگا۔ کپتان ایک کھمبے کے ساتھ کھڑا چلا چلا کر ملاحوں کو ہدایات دے رہا تھا جو سکان پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ اُس نے مجھے دیکھ کر اپنی تلوار میان سے نکالنا چاہی مگر میں نے اُسے یہ موقع نہ دیا اور اپنے تیغے کے ایک ہی بھرپور وار سے اس کی گردن اُڑا دی۔ پھر میں نے چلّا کر ملاحوں کو حکم دیا۔

"سکان واپس اپنی جگہ لے آؤ اور جہاز کو سیدھا چلنے دو۔ کپتان غدّار تھا۔"

ملاحوں کو یہ حکم دے کر میں تیزی سے اُوپر آیا مگر اتنی دیر میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ قزاق ہمارے جہازیوں پر تیر برسا رہے تھے تاکہ وہ عرشے کی ریلنگ سے ہٹ جائیں اور قزاق کمند پھینک کر اوپر آسکیں۔ میں نے چلّا کر شہزادے کو بتایا "کپتان غدّار تھا۔ اس نے جہاز موڑنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے اُسے قتل کر دیا ہے۔"

"شکریہ سرفروش۔ میں . . . " ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اس کے عقب سے چند قزاق نمودار ہُوئے اور ایک قزاق کا تیر شہزادے کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ وہ لڑکھڑا کر عرشے پر گرا، ذرا سا تڑپا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں اندھا دُھند اُن قزاقوں کی طرف دوڑتا چلا گیا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہوتے، میں نے شہزادے کو تیر مارنے والے قزاق کا سر بھُٹے کی طرح اُڑا دیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھ پر خون سوار ہو گیا اور میں خون ریزی کے جُنون میں مبتلا ہو کر دونوں ہاتھوں اور پاؤں سے کام لیتے ہُوئے قزاقوں کے پرخچے اُڑانے لگا۔ اُن کے تیرانداز مجھ کو تیروں کا نشانہ اس لیے نہیں بنا سکتے تھے کہ اس طرح خود اُن کے ساتھیوں کے ہلاک ہونے کا زیادہ امکان تھا جو مجھے گھیرنے کے لیے چاروں طرف سے میری طرف بڑھ رہے تھے لیکن میرے لمبے دست و بازو اور میری تلوار انھیں قریب آنے کا موقع نہ دیتے ہُوئے اُن کا خون چاٹے جا رہی تھی۔

میں نے چیتے کی طرح جست لگاتے ہوئے ایک نظر عرشے پر ڈالی۔ ہمارے بہت سے جہازی اور تقریباً سارے محافظ ڈھیر ہو چکے تھے اور مزید قزاق ہر طرف سے اُوپر آرہے تھے۔ ایک طرف ریلنگ کے پاس سلطان تین قزاقوں سے نبرد آزما تھا۔ پھر میری نگاہ اپنے جیسے قد و قامت والے ایک قزاق پر پڑی جو کیبن کے دروازے پر کھڑا تھا۔

میں نے ایک زقند بھری اور اس کے مقابل پہنچ گیا۔

اُس نے میرا وار اپنے چوڑے پھل والے تیغے پر روک کر مجھے پیچھے دھکیلا اور اتنے زور سے تیغہ چلایا کہ ہوا میں "شپ" کی آواز آئی اور اگر میں بروقت ایک جانب جُھکائی نہ دے جاتا تو وہ تیغہ یقیناً میرے دو ٹکڑے کر ڈالتا۔

اب میں سنبھل کر اور پینترے بدل بدل کر اُس پر وار کرنے لگا مگر وہ بھی بلا کا تیغ زن تھا۔ نہ صرف ہر وار سے بچتا بلکہ جواب بھی دیتا جا رہا تھا۔ تلوار اور تیغے کے ٹکرانے سے چنگاریاں اُڑ رہی تھیں مگر ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر غالب نہیں آرہا تھا تا آنکہ مجھے اپنے عقب سے نعرۂ تحسین کی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنے مدِمقابل کو دھکیلا اور اچٹتی سی نظر پیچھے ڈالی تو پتہ چلا کہ ہمارے تمام آدمی ڈھیر ہو چکے ہیں اور بہت سے قزاق کھڑے ہمارا مقابلہ دیکھ رہے ہیں۔

کچھ دیر بعد مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میرے اعضا جواب دینے لگے ہوں لیکن یہ موت و حیات کا معاملہ تھا اس لیے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنے مدِمقابل کے وار روکتا اور اس پر حملہ کرتا رہا۔

رفتہ رفتہ میرا مدِمقابل بھی تھکنے لگا اور اُس کے حملوں میں پہلے والی شدّت نہ رہی۔ اُس کے تیغے سے "شپ شپ" کی آوازیں بھی آنا بند ہو گئیں۔

میں اُس کے اندازِ مدافعت سے سمجھ گیا کہ اب وہ جست لگا کر مجھے گرانے کا ارادہ کر رہا ہے یہی اس کا آخری حربہ تھا اور میں اسی لمحے کا منتظر تھا۔

پھر وہ لمحہ بھی آگیا۔

میں نے جونہی اس کا تیغہ اپنی تلوار پر روکا، اس نے مجھ پر جست لگائی، میں بجلی کی سی پھرتی سے ہٹا اور ہٹتے ہٹتے میں نے اپنی تلوار سے اس کا شانہ زخمی کر دیا۔

خون کی ایک لکیر اُس کے شانے سے سینے تک اُبھرتی چلی گئی۔ یہ زخم اگرچہ کاری نہیں تھا مگر میں اس کے نفسیاتی ردِعمل سے خوب آگاہ تھا۔

وہ جھنجلا کر مجھ پر اندھا دُھند وار کرنے لگا لیکن اب ہر بار اس کے جسم کے کسی نہ کسی حصّے پر ایک نیا زخم اور ایک نیا چرکا لگ جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑنے لگی تھی۔ بالآخر وہ ہانپتے ہُوئے دو قدم پیچھے ہٹا اور اُس نے پوری قوت سے تیغہ میری طرف اچھال دیا جو سنسناتا ہُوا میرے کان کے قریب سے گزر گیا اور اس کے ساتھ ہی میں نے آگے بڑھ کر تلوار اس کے سینے میں گھونپ دی۔

وہ ڈگمگا کر گرا تو پھر نہ اُٹھ سکا۔

میری اپنی حالت بھی غیر تھی۔

میں تھکن کے مارے اُسی پر ڈھیر ہونے والا تھا مگر میں نے تلوار کی نوک عرشے سے ٹکا دی اور اس کا سہارا لے کر ماحول کا جائزہ لینے لگا۔

عرشے پر اِدھر اُدھر ہمارے محافظوں اور جہازیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ تین قزاقوں نے سلطان کو تلواروں کی زد میں لے رکھا تھا۔ باقی سب ایک نیم دائرے میں کھڑے تعجب سے میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔ اُن میں سے ایک پستہ قد مگر مضبوط جسم کا قزاق ایک قدم آگے بڑھا اور مجھ سے بولا۔ "قزاق برادری کے آئین کے مطابق تم نے سالار پسر آذر کو تن تنہا اور ایمانداری سے شکست دے کر اپنا یہ حق تسلیم کروا لیا ہے کہ قزاق برادری میں شامل ہو کر اس سالار کی جگہ لے سکو جسے تم نے ہلاک کیا ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، کیبن کا دروازہ کھلا اور دو قزاق فرح کو بازوؤں سے پکڑے باہر لے آئے۔ اُس کا حسن پریشان دیکھ کر سارے قزاق دنگ رہ گئے بلکہ چند ایک کی تو بے ساختہ سسکیاں بھی نکل گئیں۔ اُن کی نگاہیں دیکھ کر میں فرح کی طرف بڑھا اور بولا۔ "اگر میں قزاق برادری میں شامل ہونے کا اہل سمجھا گیا ہوں تو میری منگیتر اور اس آدمی کو بھی تحفظ دیا جائے جسے تین آدمیوں نے گھیر رکھا ہے۔" میں نے سلطان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "اگر تمہارے لیے میری یہ شرط قابلِ قبول نہیں تو پھر خود ہی اندازہ لگا لو کہ میں مرنے سے پہلے تم میں سے کتنے آدمی موت کی وادی میں دھکیل دوں گا۔"

قزاق ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان میں سے ایک اس طرح بولا جیسے دوسروں کو یاد دہانی کرانا چاہتا ہو۔ "مگر ہمیں تو باپ کے ساتھ بیٹی کو بھی ختم کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔"

یہ سن کر میں نے تلوار کے دستے پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی تاکہ اگر وہ نہ مانیں تو پہلے میں فرح کو ختم کر دوں اور پھر قزاقوں سے لڑتا بھڑتا خود بھی موت کو گلے لگا لوں... مگر اتنے میں اُسی پستہ قامت آدمی نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اگرچہ برادری کے آئین میں اس بات کی کوئی وضاحت نہیں ہے لیکن جنگجو بہادروں کے لیے آئین میں لچک پیدا کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے اور تم بلاشبہ ایک بہادر جنگجو ہو۔" پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔ "اگر تم میں سے کسی میں اتنی ہمت ہے کہ اس کا مقابلہ کر سکے تو وہ سامنے آئے تاکہ سردار کے چناؤ کا فیصلہ کیا جا سکے۔" یہ سن کر قزاقوں کے درمیان سناٹا چھا گیا... لیکن اگلے ہی لمحے درندگی سے بھرپور ایک قہقہے نے سناٹا مجروح کر دیا۔ سب چونک کر اُدھر دیکھنے لگے۔ میں بھی اس طرف متوجہ ہو گیا جدھر سے قہقہے کی گرج اب بھی اُبھر رہی تھی۔

میرا خیال تھا کہ کوئی جیالا مجھ سے مقابلہ کرنے کا تہیہ کر چکا ہے اور وہ میری تضحیک کے لیے قہقہے لگا رہا ہے...... لیکن جب میں نے غور سے اُس قہقہہ لگانے والے کی طرف دیکھا تو ایک مجہول سا آدمی نظر آیا۔

"میں نے کہا تھا......" وہ شخص قہقہوں کے درمیان بولا۔ "سردار کے سر پر موت ناچ رہی ہے...... لیکن کسی نے میری بات پر توجہ

نہیں دی تھی۔"

"خاموش رہو، منصور"۔ وہی مضبوط جسم والا قزاق غرّایا جو سالار پسر آذر کی موت کے بعد مجھ سے ہمکلام تھا۔ اس کی غراہٹ پر مجہول شخص کی مسکراہٹ اور قہقہے دم توڑ گئے۔

میں کن انکھیوں سے اس شخص کی طرف دیکھتا رہا۔ غالباً قزاقوں کے سالار نے اس کے ساتھ کوئی بے انصافی کی تھی جس پر وہ اس کی موت کا خواہاں ہوگیا تھا۔

مضبوط جسم والا پستہ قامت شخص ایک بار پھر اپنے ساتھی قزاقوں کو گھورنے لگا.... کچھ دیر بعد میں نے اپنی بات دہرائی۔ "اگر کسی میں ہمت ہے تو سامنے آئے تاکہ سالار کے انتخاب کا مرحلہ نمٹایا جا سکے۔"

جب کوئی بھی میرے مقابلے کو سامنے نہ آیا تو وہ بولا۔ "اب تم ہی ہمارے سردار اور سالار ہو، اجنبی جنگجو۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اس نے مصافحے کے لیے میرا ہاتھ تھام لیا۔

★★

دوسری صبح میں قزاقوں کی ایک جنگی کشتی "برقِ طوفاں" پر کھڑا دور اپنے جلتے ہوئے جہاز کو دیکھ رہا تھا۔ میرے قریب فرح اور اس سے کچھ فاصلے پر سلطان بھی یہ دلخراش منظر دیکھ رہا تھا۔ میرے بائیں جانب ہی پستہ قامت قزاق موجود تھا۔ اس کا نام تیمور تھا اور وہ اسی جنگی کشتی پر سابق سالار کا نائب تھا۔

حالات نے ایکا ایکی مجھے قزاقوں کی صف میں شامل کردیا تھا اور یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوا ورنہ میرے لیے یرغمال کی رقم کون دیتا؟ قزاقوں کا غلام بننے سے ان کا سالار بننا بہر طور اچھا ہی تھا لیکن میں جہاز رانی کی ابجد بھی نہیں جانتا... اس لیے جہاز کا بیشتر عملہ مجھے سالار تسلیم کرنے میں ہچکچا رہا تھا چنانچہ میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور سارے جہازیوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا....

"قزاق ساتھیو — سالار پسرِ آذر نہ صرف ایک بہادر جنگجو بلکہ جہاز رانی کا بھی ماہر تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں جہاز رانی کے رموز سے آگاہ نہیں ہوں۔ جب ہم لوگ برقون پہنچیں گے تو میں قزاق برادری کے کسی تجربہ کار سالار سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے اپنا نائب بنا کر جہاز رانی کی تربیت دے اور جب میں یہ تربیت حاصل کرلوں گا تو اسی کشتی پر سالار کا عہدہ سنبھال لوں گا۔ اس وقت تک تیمور سالار کے فرائض انجام دیتا رہے گا۔"

میری اس مختصر تقریر کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ جہازیوں کے لٹکے ہوئے چہروں پر مسکراہٹ آگئی اور انھوں نے نعرہ ہائے تحسین اور تالیوں کے ساتھ میرے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا۔

اب تک مجھے فرح اور سلطان سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ فرح اپنے باپ کی موت پر بے حد اداس اور غمزدہ تھی ادھر سلطان کے تاثرات صاف بتا رہے تھے کہ اسے قزاقوں میں میری شمولیت پسند نہیں آئی لیکن میں جانتا تھا، جب میں اسے بتاؤں گا کہ یہ سب کچھ میں نے مصلحتاً کیا ہے اور صرف اسی صورت میں ہمیں فرار کا موقع مل سکتا ہے تو وہ میری مجبوری اور مصلحت کا تقاضا سمجھ جائے گا۔

کچھ دیر بعد قزاقوں کا یہ بیڑا دو حصوں میں بٹ گیا۔ وہ کشتیاں جنھیں نقصان پہنچا تھا یا جن کے زیادہ ملاح مارے گئے تھے، برقون کی طرف چل پڑیں اور باقی لوٹ مار کے لیے متضاد سمت میں روانہ ہوگئیں چونکہ "برقِ طوفان" کے پندرہ ملاح اور سالار لقمۂ اجل بن چکے تھے۔ اس لیے وہ بھی ان کشتیوں میں شامل تھی جو برقون جارہی تھیں۔

ہمارا یہ سفر سترہ روز جاری رہا۔

اس دوران میں میں سلطان اور فرح کو سمجھا چکا تھا کہ میں نے قزاقوں میں شامل ہونا کیوں منظور کیا تھا۔ اب فرح بھی مجھ سے کچھ بے تکلف ہوگئی تھی لیکن اس کی یہ بے تکلفی محض اس وجہ سے تھی کہ قزاق اسے میری منگیتر سمجھتے رہیں ورنہ تنہائی میں وہ حسبِ معمول مجھ سے اجتناب برتتی تھی اور چونکہ مرد کی یہ فطرت ہے کہ جو عورت اس سے اجتناب برتے وہ اس کی طرف کچھ زیادہ ہی متوجہ ہو جاتا ہے۔ گویا وہ اس کا مان توڑنا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں بھی یہی چاہتا تھا لیکن جبر میری طبیعت کے خلاف ہے اس لیے میری خواہش تھی کہ وہ از خود میری طرف پیش قدمی کرے... شاید وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو خود ہی اپنے شہر سرا یا کو کسی کے حوالے کر دیتی ہیں اور اسی بات نے میرے دل میں فرح کی محبت کی کسک بڑھا دی تھی۔

اٹھارویں روز ہمیں جزیرہ برقون دکھائی دے گیا لیکن تیمور نے بتایا کہ وہ رات کو جزیرے کی بندرگاہ میں داخل نہیں ہو سکتے اس لیے ہمیں رات سمندر ہی میں گزارنا پڑے گی۔ یہ قزاقوں کا قانون کہ وہ صرف دن کے وقت ہی کشتیوں اور جہازوں کو بندرگاہ میں داخل ہونے دیتے تھے تاکہ اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر دشمن ان بندرگاہ میں داخل نہ ہوسکیں۔

برقون ایک قدرتی قلعہ تھا اس کی جنوبی سمت میں ساحل

کے ساتھ ساتھ تقریباً دو سو فٹ اونچی پہاڑیاں تھیں جن کے بیچ وہ کھاڑی اندر تک چلی گئی تھی جس میں بندرگاہ واقع تھی۔

یہ کھاڑی تین میل لمبی مگر صرف سو فٹ چوڑی تھی اور اس میں ایک وقت دو سو جہاز لنگر انداز ہو سکتے تھے۔ کھاڑی کے دونوں جانب گودیاں اور عمارتیں تھیں۔ برقون کا جزیرہ پہاڑوں کی وجہ سے دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ بندرگاہ جنوبی حصے میں تھی۔ قزاق شمالی حصے میں غلاموں سے کھیتی باڑی کرواتے تھے اور قزاق برادری کم از کم ایک سال کا غلہ گوداموں میں جمع رکھتی تھی تاکہ اگر دشمن جزیرے کا محاصرہ کرلے تو بھی انھیں سامانِ خورد و نوش کی کمی محسوس نہ ہو۔

دوسری صبح جب ہماری کشتی کھاڑی کی طرف بڑھنے لگی تو کھاڑی کے دہانے پر سرخ جھنڈا بلند ہوگیا۔ تیمور نے بتایا یہ سرخ پرچم اس بات کی علامت ہے کہ کوئی جہاز بندرگاہ سے سمندر میں آرہا ہے چنانچہ ہم سامنے سے ہٹ کر باہر آنے والے جہاز کا انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں نقارے کی لے تال کے ساتھ چپو چلانے کی شپ شپا شپ بھی سنائی دینے لگی اور پھر دہانے پر ایک کشتی نمودار ہوئی جسے دیکھ کر تیمور کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آگئی۔

میں نے تیمور کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے کشتی کی طرف دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔

کشتی کے عرشے پر ریلنگ کے قریب، درمیانہ قد و قامت کی ایک خوبرو عورت کھڑی تھی جس نے سالار کا لباس پہن رکھا تھا۔

"یہ بہن شہلا کی 'بحری چڑیل' ہے جو مرمت کے بعد معائنے کے لیے سمندر میں لائی جارہی ہے اور بہن شہلا کا نام تو شعلہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ بڑی تند عورت اور بہادر سالار ہے۔ اسے خوں ریزی میں بڑا لطف آتا ہے لیکن جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ ہم نے شہزادہ شہریار کا جہاز لوٹا ہے تو جل بھن کے رہ جائے گی۔"

تیمور نے بتایا۔

'بحری چڑیل' ایک چھوٹی سی جنگی کشتی تھی جسے بیس، بیس چپوؤں سے چلایا جاتا تھا۔ جب وہ کھاڑی کے دہانے سے باہر آئی تو چپو چلنے بند ہوگئے اور اس کے ملاح ستونوں پر بادبان چڑھانے لگے۔ شہلا چلا چلا کر اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگی۔ وہ مردوں کی طرح بڑی روانی سے گالیاں بھی بک رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے ملاحوں کے مقابلے میں پستہ قد نظر آتی ہے مگر وہ اس کے احکامات پر یوں عمل کر رہے تھے جیسے غلام جابر مالکوں کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ وہ سبز رنگ کا برجیس نما لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کے سنہرے بال دھوپ میں چمک رہے تھے۔ اس کی کشتی ہم سے کوئی پچاس گز دور تھی۔

معاً وہ پلٹی اور اپنی کرخت آواز میں تیمور سے مخاطب ہوئی: "اوہ تیمور۔ تم اتنی جلدی کیسے واپس آگئے؟ کہاں تک گئے تھے، تم؟"

"شہزادے شہریار کے جہاز تک۔ بہت عمدہ مالِ غنیمت ملا ہے اور ابھی انعام بھی ملے گا، اسے علم کرنے کا شہ تیمور نے جواب دیا۔

اتنا سنتے ہی وہ بپھر گئی۔ "تم لوگ یہ نہیں چاہتے کہ مجھے بھی مالِ غنیمت اور انعام میں حصہ ملے۔ تم مرد لوگ مجھ سے جلتے اور ڈرتے ہو کہ کہیں میں تم سے آگے نہ بڑھ جاؤں۔ کاش میری کشتی زیرِ مرمت نہ ہوتی۔ سالار کہاں ہے؟"

"وہ مر چکا ہے"۔ تیمور نے بتایا اور میری طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ ہے وہ شیر دل جس نے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا.... مزے کی بات یہ ہے کہ اس نے یہ کہہ کر سالار کا عہدہ سنبھالنے سے انکار کر دیا کہ جہاز رانی سے ناواقف ہونے کے باعث اپنے ساتھیوں کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ یہ اپنا عہدہ سنبھالنے سے پہلے کسی اچھے سالار سے تربیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ والد مرحوم کی قسم، تم نے اتنا مضبوط اور بہادر جنگجو کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔"

"ہاں مجھے اندازہ ہوگیا ہے"۔ وہ بولی اور پلٹ کر اپنے جہازیوں کو ہدایات دینے لگی۔

میرا جی چاہا کہ ہماری کشتی اس کی کشتی کے قریب ہوتی تاکہ میں اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ سکتا۔

اتنے میں اس کے ملاح کشتی کھینچنے لگے اور ہماری کشتی کھاڑی کے دہانے کی طرف بڑھنے لگی۔

تیمور نے مجھ سے کہا: "میرا خیال ہے کہ تم اسے پسند آگئے ہو۔ جبھی تو اس نے کہا تھا کہ ہاں میں نے اندازہ لگا لیا ہے۔ وہ بڑی عجیب عورت ہے سرفروش۔ صرف سالار ہی نہیں رہنا چاہتی وہ تو سالاروں کی انجمن کی رکن بھی بننا چاہتی ہے۔ سالار بننے سے پہلے یہ ترغون میں ناگ مندر کی مہا پجارن تھی اور اب ایک بار پھر ناگ پوجا کو فروغ دینا چاہتی ہے۔"

اس دوران فرح ہمارے قریب آگئی اور وہ تیمور کی بات سننے کے بعد "بحری چڑیل" کی طرف دیکھنے لگی۔

تیمور مجھے ایک جانب لے گیا اور سرگوشی میں بولا۔ "میں

نہیں جانتا کہ فرح تمہاری منگیتر ہے یا نہیں۔ اگر واقعی ہے تو اس کی خیر مناؤ کیونکہ جب شہلا کسی پر نگاہ رکھتی ہے تو پھر اس کے ساتھ کسی دوسری عورت کا تعلق برداشت نہیں کر سکتی۔ ہماری قزاق برادری میں دستور ہے کہ جب دو عورتیں کسی ایک شخص کو چاہتی ہوں تو ایک عورت دوسری عورت کو مقابلے کی دعوت دے سکتی ہے اور اس مقابلے کا انجام کسی ایک عورت کی موت پر ہوتا ہے۔ شہلا ایسے مقابلوں میں خنجر اور چھوٹے سے کوڑے کے ساتھ لڑتی ہے۔ میں اُسے ایک بار ایک عورت سے لڑتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔ یہ تمہاری قدوقامت کی عورت کے بھی پرخچے اُڑا سکتی ہے۔"

میں یہ سن کر اُلجھن میں پڑ گیا۔

اگر شہلا واقعی مجھ میں دلچسپی لینے لگی تو کیا ہوگا۔ میں اُسے یہ کہہ کر بھی نہیں ٹال سکتا تھا کہ فرح سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ میں تو پہلے ہی یہ اعلان کر چکا تھا کہ وہ میری منگیتر ہے اور قزاقوں کا قانون شہلا کو یہ اجازت دیتا تھا کہ وہ جب چاہے فرح کو مقابلے کے لیے للکار سکتی ہے۔

اس صورت میں فرح کی زندگی ایک بار پھر خطرے میں پڑ سکتی تھی جسے میں کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اب وہ واقعی میری کمزوری بنتی جا رہی تھی اور میں شاید اس سے محبت بھی کرنے لگا تھا۔

میں ان سوچوں میں گھرا ہوا تھا کہ ہماری کشتی کھاڑی میں داخل ہوگئی جس کے دونوں طرف اونچی اونچی چٹانیں تھیں۔ اگر کبھی دشمن کے جہاز کھاڑی میں آ جاتے تو اُن پر ان چٹانوں سے پتھر برسائے جا سکتے تھے۔

گودیوں میں بہت سے چھوٹے بڑے جہاز کھڑے تھے۔ بعض گودیوں میں پرانی کشتیوں کی مرمت جاری تھی اور بعض جگہ نئے جہاز بنائے جا رہے تھے۔ بڑی بڑی بھٹیوں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا اور لوہا کُوٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

گودیوں سے اوپر کشتی کھینچنے والے غلام مزدوروں اور گودی میں کام کرنے والوں کی بیرکیں تھیں۔ ان سے کچھ اونچائی پر دُکانیں اور دُکانداروں کے گھر، پھر آزاد ملاحوں کی قیام گاہیں اور چوٹی پر قزاق برادری کے سالاروں کا اقامتی علاقہ تھا۔

گودیوں سے سالاروں کے علاقے تک تقریباً ایک میل کا فاصلہ تھا اور ان کے مکانات لگ بھگ پانچ سو فٹ کی بلندی پر واقع تھے۔ ان کے پیچھے بڑی مضبوط شہر پناہ تھی جس میں جگہ جگہ بُرج اور دروازے بنائے گئے تھے۔ فصیل کے عقب میں اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ قزاقوں کی یہ قلعہ بندی دیکھ کر

میں سمجھ گیا کہ فارش، ترغون اور دوسری ریاستیں ان سے کیوں خوفزدہ ہیں اور قزاقوں کی لوٹ کا مال اور دولت کہاں صرف کی گئی ہے۔

ہماری کشتی کو اپنی گودی کی طرف بڑھتے دیکھ کر شہر کی ڈھلان پر بہت سے لوگ جمع ہوگئے اور ہاتھ ہلا ہلا کر ہمارا خیر مقدم کرنے لگے۔

تیمور نے مجھ سے کہا: "لوٹ کی مہم پر جانے والے جہازوں میں سے سب سے پہلے ہماری کشتی واپس آئی ہے۔ اس لیے لوگ ہماری سرگرمیوں کی تفصیل جاننے کے لیے بے چین ہیں۔"

کھاڑی میں متعدد مقامات پر سطحِ آب سے اوپر اور زیرِ آب مضبوط زنجیریں ڈال کر رکاوٹیں بنائی گئی تھیں چنانچہ ہر رکاوٹ عبور کرنے سے پہلے مختلف اقسام کے جھنڈوں سے سگنل دیئے جاتے تھے۔ قزاقوں کا یہ انتظام گواہی دیتا تھا کہ انھیں تسخیر کرنا واقعی ناممکن ہے۔

کچھ دیر بعد شہر پناہ کے برج پر دو پرچم بلند ہوئے اور زرد رنگ کا دُھواں بھی اٹھنے لگا۔

تیمور یہ دیکھ کر خوشی سے سرشار ہو کر بولا: "آج رات قزاق برادری ہماری کامیابی پر جشن منائے گی جس میں شراب اور خواتین کی فراوانی ہوگی۔"

"کیا میں بھی اس جشن میں شریک ہو سکوں گا؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً..." تیمور نے جواب دیا۔

میں جشن میں شرکت کا اس لیے متمنی تھا کہ لوگوں سے مل کر حالات کا جائزہ لے سکوں اور ان امکانات کا بھی اندازہ لگا سکوں جو فرار کے لیے موزوں ہو سکتے ہوں۔

"برقِ طوفاں" کا استقبال کرنے والوں کے جوش اور نعرۂ تحسین سے مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ شہزادہ شہریار کو موت کے گھاٹ اُتارنے پر شیر کوہ نے بہت بڑے انعام کا وعدہ کیا ہوگا۔

جب ہماری کشتی گودی میں لنگر انداز ہو گئی تو تیمور چند چاق و چوبند ملاحوں کے گھیرے میں مجھے، فرح اور سلطان کو سالاروں کے علاقے میں واقع ایک مکان میں لے آیا جس میں دو بُرج بنے ہوئے تھے۔ چکردار زینہ طے کرتے ہوئے جب ہم بُرج کے بالائی کمرے میں پہنچے تو میں نے تیمور سے پوچھا۔

"اب ذرا یہ تو بتا دو کہ ہم لوگ یہاں مہمان سمجھے جائیں گے یا قیدی؟"

"قزاق برادری کے فیصلے تک تم لوگ قیدی شمار کیے جاؤ

...ے اور باہر نہیں جا سکو گے تاہم سرفروش، تم سالار بیدار کی پیٹی ...ندھ کر ہمارے ساتھ جشن میں شرکت کر سکو گے۔ اس نے اپنے ...یلے سے نیلے رنگ کی سنہرے کام والی ایک پیٹی نکال کر مجھے ...ی اور بولا۔ "یہ بھی یاد رکھو سرفروش کہ یہ پیٹی باندھ کر تم کسی کو ...ی مقابلے کی دعوت دے سکتے ہو اور نہ ہی کوئی تمھیں للکار سکتا ہے۔"

میں نے وہ پیٹی باندھ لی اور سارے ہتھیار اتار کر رکھ دیئے ...ن خنجر کو پیٹی میں اڑس لیا اور ایک چھوٹا سا چاقو بھی جوتے میں ...پا لیا تاکہ بوقتِ ضرورت کام آ سکے۔ پھر میں نے سلطان اور تیمور ...ے کہا۔ "میں تم دونوں کو اپنا دوست سمجھتا ہوں اور اس ناتے کیا ...تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ تم لوگ فرح کی حفاظت کرو گے اور اس ...کوئی آنچ نہیں آنے دو گے؟"

سلطان نے اثبات میں سر ہلا دیا اور تیز نگاہوں سے تیمور ...طرف دیکھا تو اس نے بھی سلطان کی تقلید کی۔

سفر کے دوران میں یہ دیکھ چکا تھا کہ ان دونوں کے درمیان ...ہ رشتۂ دوستی استوار نہیں ہوا تھا تاہم وہ ایک دوسرے کی ...ت کرتے تھے اور تیمور نے سلطان سے کبھی قیدیوں یا غلاموں ...سلوک نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں جہازرانی کے یکساں ماہر تھے ...ن کی دوستی میرے حق میں بہت زیادہ مفید ثابت ہو سکتی تھی۔

شام کو میں تیمور کے ساتھ جشن میں شریک ہونے کے لیے ...یا۔ وہ ملاح جو اپنی مہمات کے دوران سخت تنظیم کا مظاہرہ کر... تھے، اپنی کامیابی کا جشن مناتے ہوئے ہر پابندی سے ...نیاز تھے۔ ان کے لیے شراب اور خواتین کی کوئی کمی نہیں تھی ...لیے وہ اُدھم مچا رہے تھے۔ ان کے افسر اور سالار بھی اس ...اے نا و نوش میں برابر کے شریک تھے اور فارش پر حکمرانی کے ...ب دیکھتے ہوئے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہے تھے۔

میرے لیے کسی مہذب مملکت پر قزاقوں کی حکمرانی کا تصور ناقابلِ برداشت تھا اس لیے میں وہاں سے کھسک لیا۔

ابھی چاند طلوع نہیں ہوا تھا۔ گلیوں میں اور سڑکوں پر ...جگہ مشعلیں جل رہی تھیں۔ کہیں کہیں بدمست ملاح زنانِ بازاری ...ہ چہلیں کرتے پھر رہے تھے مگر جب ان کی نگاہ مجھ پر پڑتی تو وہ ...قدوقامت دیکھ کر کچھ دیر کو اپنی چہلیں بھول جاتے۔ بعض ...ت پر مجھے چار چار کی ٹولیوں میں پہرے دار بھی ملے لیکن میری ... بیدار سالار کی پیٹی دیکھ کر انھوں نے مجھ سے کوئی پوچھ گچھ ...ی۔

ایک بازار سے گزرتے ہوئے بھاری تن و توش والے دو

آدمیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر ایک دروازے میں کھینچ لیا۔ ابھی میں اس صورتحال کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ان میں سے ایک بولا۔

"چاندی کے صرف پانچ سکّے دیجیے جناب اور خوابوں کی دُنیا کا لطف اٹھائیے۔"

میں نے نظر اٹھا کے دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ ایک بہت بڑا کمرہ ہے جس میں تقریباً چالیس مرد اور عورتیں چاروں جانب دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے چھوٹی انگیٹھیاں رکھی ہیں۔ وہ ان میں کوئی سفوف ڈالتے ہیں تو نیلا دُھواں اٹھتا ہے۔ وہ اس دھوئیں کو ناک سے سانس لے کر اندر کھینچتے ہیں اور مستی میں عجیب عجیب آوازیں نکالتے ہیں۔

پورے کمرے میں ایک عجیب سی بُو بھی رچی ہوئی تھی۔

میں نے ان دونوں آدمیوں کو ہٹایا اور اس خواب گاہ سے باہر نکل آیا۔

اگرچہ میں اس "خواب گاہ" میں صرف چند لمحے ہی ٹھہرا تھا مگر میرا سر چکرانے لگا تھا اور روشنیاں میری آنکھوں میں چبھنے لگی تھیں۔ انگیٹھیوں میں ڈالا جانے والا سفوف شاید نشہ آور تھا۔

میں سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

.... پھر ایک جگہ مجھے ایک اور آدمی نے روک لیا۔

"آیئے جناب! کوڑوں کا رقص ملاحظہ فرمایئے۔"

میں اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔

ایک بڑے ہال نما کمرے کے درمیان ریت بچھی ہوئی تھی جس پر دو لڑکیاں دیوانہ وار رقص کر رہی تھیں۔ چاروں کونوں پر ایک ایک کوڑا بردار کھڑا تھا۔ جب کوئی لڑکی کسی کوڑے بردار کے قریب جاتی، وہ اُسے کوڑا مارتا اور لڑکی کے رقص میں شدت آ جاتی۔ وہ دونوں پسینے میں شرابور تھیں۔

مجھے یہاں لانے والے نے سرگوشی کے لہجے میں بتایا۔ "یہ سمجھتی ہیں کہ رقص کے بعد گھر چلی جائیں گی حالانکہ انھیں جشنِ طرب کی خوشی میں کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔"

میرے جی میں آیا کہ اپنا خنجر اس کے سینے میں اتار دوں اور پھر کوڑے مارنے والوں کو بھی وہیں ڈھیر کر دوں لیکن مجھے تیمور کی تنبیہ یاد آ گئی اور میں وہاں سے باہر آ گیا۔

ان لڑکیوں کی مسرت آمیز وحشیانہ چیخیں مجھے کافی دُور تک سنائی دیتی رہیں۔

شاید وہ بھی نشے میں دھت تھیں۔

بازار سے گزرتے ہوتے میں نے متعدد مے خانے اور ایسی دُکانیں بھی دیکھیں جہاں قسم قسم کی منشیات دستیاب تھیں۔ کہیں کہیں ایسے مناظر بھی دِکھائی دیے جنھیں ہماری دُنیا میں مغرب کے لوگ تہذیب کا نام دیتے ہیں مگر مشرق میں اُنھیں فحاشی کہا جاتا ہے۔

میں اور آگے بڑھا تو مجھے ایک شرابی، ایک عورت سے دست درازی کرتا نظر آیا۔ اگرچہ وہ عورت صورت اور چال ڈھال سے بے راہ رو دکھائی دیتی تھی مگر اس وقت وہ اس شرابی سے مزاحمت کر رہی تھی جس پر شرابی نے چاقو نکال لیا اور اس پر وار کیا تو اس عورت کا رخسار زخمی ہو گیا۔

یہ دیکھ کر ضبط کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

میں نتیجے سے بے پروا ہو کر شرابی کی طرف لپکا اور اس سے پہلے کہ وہ دوسرا وار کرتا، میں نے اس کی گُدی پر کراٹے کا ایسا ہاتھ مارا کہ وہ چکرا کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

میں نے اس عورت کی طرف دیکھا تو اسے ایک تنگ اور تاریک گلی کی طرف دوڑتے پایا۔ میں نے سوچا کہ کہیں وہ غلط فہمی کی بنا پر مجھے اُچکا سمجھ کر میرے لیے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے، اس لیے اس کو یہ بتا دینا چاہیے کہ میں نے یہ اقدام خود اسی کے بچاؤ کی خاطر کیا ہے۔

میں بھی اس کے پیچھے دَوڑ پڑا۔

گلی میں اتنا اندھیرا تھا کہ وہ مجھے دکھائی نہ دے سکی مگر اس کے قدموں کی آواز میری رہنمائی کے لیے کافی تھی۔ آگے جا کر وہ آواز دائیں طرف مڑ گئی۔ پھر اوپر کی طرف جاتی محسوس ہوئی۔

اب اس آواز میں گونج بھی پیدا ہو گئی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کسی سُرنگ میں داخل ہو گئی ہے۔ ایسی سرنگوں کا پہاڑی پر ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ میں رُک گیا اور سوچنے لگا کہ اس کے تعاقب میں جاؤں یا نہ جاؤں؟

یکایک مجھے اپنے قدموں میں فرش لرزتا ہوا محسوس ہُوا۔

ایک عجیب سی گڑگڑاہٹ بھی سنائی دی۔

اس سے پہلے کہ میں وہاں سے ہٹتا، فرش کی ایک سِل میرے قدموں کے نیچے سے کھسک گئی اور میں تاریک تر خلا میں گرتا چلا گیا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کافی اونچائی سے گرا ہوں اور اتنی اونچائی سے گرنے پر ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی ہے لیکن مجھے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی اور چوٹ اس لیے نہیں آئی تھی کہ میں نرم گدّوں پر گرا تھا۔

یہ بات میرے لیے انتہائی تعجب انگیز تھی اس لیے میں نے فوراً اپنا خنجر نکال لیا۔

عین اسی وقت وہاں ایک ہلکی سی زرد روشنی پھیل گئی۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک کنواں نما بیس فٹ گہری اور ساٹھ فٹ چوڑی عمودی سُرنگ میں بیٹھا ہوں۔ جن گول گول گدّوں پر میں گرا تھا، وہ گہرے سبز رنگ کے تھے اور ان کا کپڑا اس مدھم روشنی میں چمک رہا تھا جو سرنگ میں بنے ایک دروازے کے شیشے سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔

شیشے پر دو بڑے بڑے سانپوں کی شبیہہ بنی ہوئی تھی۔ یہ شبیہہ دیکھ کر تیمور کی بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا شہلا، ترغون میں ناگ پوجا کرنے والوں کی سب سے بڑی کاہن

یکایک شیشے والا دروازہ آہستگی سے کُھلا اور شہلا کی آواز آئی: "میرے پاس آؤ سرفروش"۔

ایک لمحے کے لیے میں بھونچکا سا رہ گیا مگر جب دوبارہ مجھے مدھم آواز لیکن تحکم آمیز لہجے میں بلایا گیا تو میں نے خنجر کے دستے پر گرفت مضبوط کی اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

سرنگ کا فرش بھی سبز پتھروں کا تھا لیکن اس پر سرخ رنگ کی اینٹوں سے سانپ بنے ہوئے تھے۔

دروازے سے گزر کر میں ڈھلان میں اترتا چلا گیا۔

تقریباً پچاس قدم چلنے کے بعد میرے سامنے ایک دیوار آ گئی۔

میں رُک گیا۔

اتنے میں پھر اسی لب و لہجے میں شہلا کی آواز آئی: "رُکو مت میرے پاس آؤ"۔

دفعتہً دیوار کی ایک بہت بڑی سِل ہٹ گئی اور میں نے دیکھا کہ اب میرے سامنے زینہ تھا۔

چند سیڑھیاں اُترنے کے بعد میں رنگین فرش آ گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو پتہ چلا کہ میں ایک بہت بڑے ہال نما کمرے میں ہوں جس کی چھت گنبد جیسی تھی۔ ہال کے بیچوں بیچ قربان گاہ قسم کا چار ہاتھ اونچا اور اتنا ہی لمبا چوڑا چبوترہ تھا جس پر سبز پتھر سے بنا ہوا ایک بہت بڑا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

سانپ کی آنکھوں میں زمرد جڑے ہوئے تھے جو زرد روشنی میں جگ مگ کر رہے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے اُس خیالی ناگ کی آنکھوں سے مسحور کن شعاعیں نکل رہی ہوں پھر اس سانپ کے کھلے منہ سے دُھواں اور ہلکے ہلکے شعلے نکلنے لگے۔

کمرے میں اچانک ہی ایک عجیب سی خوشبو پھیل گئی مگر

یہ خوشبو ایسی نہیں تھی جس کا تجربہ مجھے خواب گاہ میں ہوا تھا۔ اتنے میں قربان گاہ کے عقب سے شہلا یوں بل کھاتی ہوئی اٹھی جیسے ناگن جھوم رہی ہو۔ اس نے بھی سبز رنگ کی ایک قبا اوڑھ رکھی تھی جس سے صرف اس کا چہرہ اور ہاتھ دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے گلے میں سیاہ موتیوں کی مالا پڑی ہوئی تھی اور سر پر سجی ہوئی کلغی سانپ کے پھن کی یاد دلا رہی تھی۔

وہ لہراتی ہوئی آئی اور میرے سامنے کھڑے ہو کر پہلے تو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی رہی، پھر بولی: "آخر تم آ ہی گئے؟"

"اس کے سوا میرے لیے کوئی اور چارہ بھی تو نہیں تھا"۔

"تمھیں اس لڑکی کا پیچھا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن میں جانتی ہوں کہ تم خود کو نہیں روک سکو گے بالکل اسی طرح جیسے تم یہاں سے فرار ہونے کے منصوبے بنا رہے ہو"۔

میں اپنے دل کی چوری پکڑے جانے پر دم بخود سا رہ گیا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا ذہن و قلب اس کے لیے کھلی کتاب ہو۔ اس نے ٹیلی پیتھی کے کسی ماہر کی طرح میرے خیالات پڑھ لیے تھے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ مجھے اس وقت خاموش نہیں رہنا چاہیے ورنہ میری خاموشی اس کی بات پر مہرِ تصدیق ثبت کر دے گی۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو شہلا؟" میں نے کہا۔

"میں صرف چہرے پڑھنا ہی نہیں جانتی۔ مجھے لوگوں کے دل اور ذہن پڑھنا بھی آتے ہیں۔ یہ ایک ایسا فن ہے جو کڑی ریاضت سے حاصل ہوتا ہے اور یہ فن مجھے بتاتا ہے کہ تم لفظوں سے بھی اسی طرح کھیلنا جانتے ہو جیسے شمشیر اور خنجر سے کھیلنے میں ماہر ہو"۔

"لیکن ایک قزاق کا اس فن سے کیا تعلق جس کی مہارت کا تم نے دعوا کیا ہے؟"

"قزاق میں بعد میں ہوں، پہلے کچھ اور ہوں۔ کیا تم مجھ سے خوف زدہ ہو گئے ہو؟"

"ہاں۔ انجانے لوگوں سے خوف زدہ ہونا ہی چاہیے"۔

میری اس بات پر شہلا نے ایک قہقہہ لگایا اور بولی: "عورتیں تمھاری جانی پہچانی مخلوق ہیں۔ تم بہت سی خواتین کو بہت اچھی طرح جانتے ہو"۔

"ہاں یہ تو سچ ہے مگر....."

"تو پھر میں ان میں ایک کا اضافہ کروں گی"۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جو چمک ابھری اور ہونٹوں پر جو تبسم آیا، اُسے میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔

اگر وہ میرے دل کا چور پکڑ چکی تھی تو اب میں نے بھی اس کے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔

وہ وقت قریب آ گیا تھا جب وہ مجھے اپنی کمزوری بنا سکتی تھی۔

★★

تقریباً ایک گھنٹے بعد جب ہم قربان گاہ کے سامنے فرش پر ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ بے حد مسرور نظر آ رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"اب میں تمھیں اچھی طرح جان گئی ہوں"۔ اس نے زیرِ لب کہا۔

"مگر اب بھی میں تمھیں اچھی طرح نہیں جان سکا"۔

"ہاں تم جان بھی نہیں سکتے جب تک کہ میں خود نہ بتاؤں"۔

"تو کیا تم نہیں بتاؤ گی؟"

"چونکہ میں تم سے بہت خوش ہوں اس لیے ضرور بتاؤں گی"۔

.... پھر اس نے بتایا کہ وہ ترغون کے شیش ناگ مندر کی مہا پجارن تھی اور اب بھی وہ ناگ کی پجارن ہے۔ برقون کا یہ جزیرہ ایک زمانے میں ناگ دیوتا کے پجاریوں کے لیے ایک مقدس مقام کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ یہاں ناگوں کی افزائشِ نسل کی جاتی تھی اور کنواری پجارنوں کو "ناگ دیوی" کی تربیت دے کر مختلف مقامات پر بھیجا جاتا تھا۔ وہ جگہ جہاں اس وقت ہم موجود تھے، ناگ پوجا کا بہت بڑا مندر تھا۔ جسے سرنگوں کے ذریعے دوسرے علاقوں سے ملا دیا گیا تھا۔ یہ سرنگیں آج بھی موجود تھیں لیکن ترغون کی پڑوسی ریاستیں ناگ دیوتا کے پجاریوں سے خائف ہو کر متحد ہو گئیں اور ان سب نے مل کر بہت سے پجاریوں کو قتل کر دیا اور باقی جلاوطن کر دیے گئے۔ تب ناگ دیویاں اپنے مذہب کو زندہ رکھنے کے لیے رُوپوش ہو گئیں۔

ایک سو سال قبل، جب قزاقوں نے اس جزیرے برقون پر غلبہ حاصل کر لیا تو مہا ناگ دیوی نے فیصلہ کیا کہ کچھ ناگ پوجا کرنے والی عورتیں قزاق برادری میں شامل کر دی جائیں اور یہ اندازہ لگایا جائے کہ قزاق ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں یا وہ قزاقوں کو اپنا گرویدہ بنا سکتی ہیں یا نہیں۔

شہلا سے پہلے بہت سی عورتیں قزاق برادری میں شامل ہوئیں لیکن وہ پہلی ناگ دیوی ہے جس نے قزاق برادری میں شامل ہو کر سالار کا عہدہ حاصل کیا ہے۔

یہ داستان سنانے کے بعد وہ بولی: "اگر مجھے تم جیسا کوئی ساتھی

مل جائے تو میرے اثر و رسوخ میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ جب تم سالار جیسے بہادر اور تنومند شخص کو ہلاک کر سکتے ہو تو پھر برقون کا کوئی دوسرا سالار تمھارے سامنے نہیں ٹک سکتا اور اگر جہاز رانی سیکھ کر قزاق بن جاؤ تو تم خود بھی اثر و رسوخ کے ساتھ ساتھ دولت مند بن سکتے ہو۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ کہ اگر ہم دونوں متحد ہو جائیں تو قزاق برادری میں ہمارا کوئی مدِ مقابل نہیں ہو گا۔"

"پھر کیا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"سالاروں کی جماعت شیر کوہ سے سونا حاصل کرنے کے بعد فارش پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ وہ فارش کو فتح تو کر لیں گے لیکن ان میں اتنی صلاحیت نہیں کہ کاروبارِ مملکت چلا سکیں۔ تم نے انھیں جشن میں دیکھا ہو گا۔ کیا یہ لوگ رموزِ مملکت سمجھ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ لوگ تو صرف عیش و عشرت کے دلدادہ ہیں۔ اس صورت میں ہم جیسے دو افراد، جن کی پشت پناہی کے لیے وفادار جنگجو اور ناگ مت کے لوگ موجود ہوں، کیا نہیں کر سکتے!"

یہ کہنے کے بعد اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جیسے اس کی تائید کر رہا ہوں۔

"تو پھر یہ طے ہو گیا کہ تم میرے ساتھ فارش پر حکمرانی کرو گے۔"

اس نے کہا۔ "اب تم انکار کرنا بھی چاہو تو نہیں کر سکتے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اگر میں تمھارا ساتھ نہ دوں تو یہاں سے زندہ نہیں لوٹ سکوں گا؟"

"ہاں..... اگر تم یہاں سے نکل جاؤ تو بھی موت کے شکنجے سے نہیں بچ سکو گے۔ میں قزاقوں کی جماعت کو تمھاری نیت سے آگاہ کر دوں گی۔ ہم ناگ دیویاں معمولی ہستیاں نہیں ہوتیں۔"

میں نے اس کے لب و لہجے سے اندازہ لگا لیا کہ اس کے الفاظ میں وزن ہے اور اس سے بگاڑنا یا دشمنی مول لینا میرے لیے کسی طرح بھی سود مند ثابت نہیں ہو گا۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر مجھے اپنا نائب بنائے گی اور جہاز رانی سکھائے گی۔ میں نے اس سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ سلطان میرے ساتھ کشتی پر کام کرے گا۔

جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو پو پھٹنے والی تھی۔

سارے ہنگامے ختم ہو چکے تھے اور گلیاں سونی تھیں۔

اپنی رہائش گاہ کی طرف آتے ہوئے میں نے سوچا کہ شہلا نے فرح کے بارے میں کوئی بات کیوں نہیں کی؟ اسے یقیناً یہ معلوم ہو چکا ہو گا کہ میں نے اُسے اپنی منگیتر بتایا تھا، پھر وہ اس سلسلے میں کیوں کچھ نہیں بولی۔ اس کی پُراسرار خاموشی میری سمجھ سے باہر تھی۔

دوسری صبح مجھے سلطان اور فرح کو سالاروں کی مجلس میں پیش کیا گیا۔

کچھ دیر رسمی کارروائی ہوتی رہی، پھر مجھے قربان گاہ کے پاس کھڑا کر کے میرے بازو میں ایک چیرا لگایا گیا۔ جب خون کی بوندیں قربان گاہ پر ٹپکنے لگیں تو مجھ سے یہ حلف دلوایا گیا...

"میں سالاروں کو گواہ بنا کر حلف اٹھاتا ہوں کہ قزاق برادری کے آئین کی پوری پابندی کروں گا اور قزاق برادری کے مفاد کی خاطر اپنی جان دینے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔"

شہلا نے مجھے اپنا نائب بنانے کے لیے اپنے پہلے نائب کو سالار کے عہدے پر ترقی دلوا دی تھی۔

وہ مجھے اس کا خنجر دیتے ہوئے بولی۔ "اسے اپنی کمر میں باندھ لو اور اس سے ویسے ہی کام لینا جیسے سابق نائب نے لیا۔"

میں نے حلف برداری کے بعد خنجر باندھتے ہوئے فرح کی طرف دیکھا تو اس نے منہ پھیر لیا۔ وہ اس رسمِ حلف برداری سے یہ سمجھی تھی کہ میں صدقِ دل سے قزاق بن گیا ہوں۔ اُسے قزاقوں سے انتہائی نفرت تھی کیونکہ انھوں نے اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا۔

رسم سے فارغ ہونے کے بعد میں نے تیمور سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم فرح کا ہمیشہ خیال رکھو گے۔"

"وہ تو میں رکھوں گا..... لیکن اس چڑیل شہلا نے تم پر ایسا کیا جادو کر دیا ہے کہ تم اس کے نائب بن گئے ہو؟"

میں تیمور کو حقائق بتا سکتا تھا اور نہ ہی ناراض کر سکتا تھا اس لیے ہنس کر ٹال گیا۔

شہلا جلد از جلد کسی نئی مہم پر روانہ ہونا چاہتی تھی لیکن اُسے اس وقت تک اپنا یہ ارادہ ملتوی رکھنا پڑ گیا جب تک کہ میں اس کے نائب کے فرائض انجام دینے کے قابل نہ ہو جاؤں۔ چنانچہ دس روز تک وہ کھلے سمندر میں مجھے تربیت دیتی رہی۔ اس مختصر سے عرصے میں، میں نے نہ صرف بحری نقشہ پڑھنا سیکھ لیا بلکہ مستول اوپری سرے سے کشتی کی تہہ تک ہر حصے سے مکمل آگاہی حاصل کر لی۔ اب میں شہلا کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہو کر عملے کو ہدایات دے سکتا تھا اور مجھے وہ گالیاں بھی زبانی یاد ہو گئی تھیں جو سالار ملاحوں کو دیا کرتے تھے۔

گیارھویں روز جب ہم دوبارہ ناگ مندر میں قربان گاہ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے تو شہلا نے مجھے اپنے قزاقی کے منصوبے کی تفصیل بتائی۔

یہ ایک بے حد خطرناک منصوبہ تھا لیکن کامیابی کی صورت میں بے پناہ مالِ غنیمت کی توقع بھی تھی۔

منصوبہ یہ تھا کہ ترغون کے شمالی حصے میں آبنائے خرم کے دہانے پر واقع شہرِ فروزاں کو لُوٹ لیا جائے۔ یہ آبنائے، فروزاں اور ترغون کے درمیان تھی اور جہاز، فروزاں کا چکر کاٹ کر دوسری طرف جانے کی بجائے آبنائے سے گزر کر وقت اور فاصلہ بچا لیا کرتے تھے مگر اس بچت کے لیے انھیں بھاری محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ محصول کی یہ رقم وہیں ایک چھوٹے سے قلعے میں رکھی جاتی تھی۔ ساحلوں، ریاستوں میں فروزاں جیسے چند ایک ہی چھوٹے شہر ایسے تھے جہاں بہت بڑی رقم بطورِ محصول جمع ہوتی تھی۔

شہرِ فروزاں کی حفاظت کے لیے جنگی جہاز اور کشتیاں دونوں طرف کے دہانوں پر موجود رہتی تھیں اس لیے اُسے لُوٹنا آسان نہیں تھا البتہ رات کے وقت اگر دو تین جہاز آبنائے میں داخل ہو کر فروزاں کی حفاظت پر مامور محافظوں کو غچہ دینے میں کامیاب ہو جائیں اور قزاق بڑی خاموشی سے اچانک یلغار کر دیں تو یہ منصوبہ کامیاب ہو سکتا تھا۔

شہلا نے بتایا کہ اس کے پاس کچھ ایسے قدیم نقشے موجود ہیں جو بہت پہلے ناگ دیویوں نے تیار کیے تھے۔ ان نقشوں میں ایسی کھاڑیاں دکھائی گئی ہیں جو آگے جا کر آبنائے فروزاں میں مل جاتی ہیں۔ اگر ہم ان کھاڑیوں کے ذریعے آبنائے میں داخل ہو گئے تو باقی کام آسانی سے ہو جائے گا۔ قلعے پر چونکہ سالہا سال سے حملہ نہیں ہوا، لہٰذا اس کے محافظ حفاظتی اقدامات سے تقریباً بے نیاز ہو چکے ہوں گے اور کوئی مزاحمت نہیں کر پائیں گے۔

اس مہم میں شہلا کا نائب مرجان، جو اب جنگی کشتی عنکبوت کا کپتان بن چکا تھا، بھی شامل تھا۔

میں نے شہلا کو مشورہ دیا کہ تیمور کو بھی اس مہم میں شریک کر لیا جائے۔

"میں جانتی ہوں کہ تیمور ایک بہادر آدمی ہے اور اس کی کشتی 'برقِ طوفان' ہماری دونوں کشتیوں سے بڑی ہے۔ اس میں عملہ بھی زیادہ آ سکتا ہے لیکن وہ میری بہ نسبت تمھارا دوست زیادہ ہے اس لیے میں اس پر کیسے اعتماد کر لوں؟"

"جب میں تمھارے ساتھ ہوں تو میرے دوست بھی تمھارا ساتھ دیں گے۔"

"واقعی؟" اس نے کہا۔ "لیکن میرا خیال اس سے مختلف ہے۔"

"یہ بھی تو سوچو کہ تیمور کو اس مہم کی کامیابی پر بہت کچھ مل سکتا ہے۔ وہ اپنے فائدے کے لیے بھی تمھارا ساتھ دے گا۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"اچھی بات ہے لیکن اگر اس نے ذرا بھی گڑبڑ کی تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ خیر..... اُسے مہم میں شریک کرنے پر ہمارے پاس تقریباً تین سو جنگجو ہو جائیں گے..... میں شرط لگاتی ہوں کہ ہماری کامیابی یقینی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں سالار کا عہدہ چھوڑ دوں گی۔"

"برقِ طوفان" کو مہم میں شامل کرنے کی وجہ سے روانگی میں مزید تاخیر ہو گئی کیونکہ وہ زیرِ مرمت تھی۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے شہلا کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔

موسمِ سرما کا طوفانی موسم شروع ہونے میں صرف چھ ہفتے باقی رہ گئے تھے..... ان ایام میں، میں فرار کے امکانات پر بھی غور کرتا رہا۔ میں اپنے ساتھ فرح اور سلطان کو بھی لے جانا چاہتا تھا۔ خشکی کے راستے فرار ناممکن تھا۔ برقون کی بندرگاہ کی آبادی ختم ہوتے ہی پہاڑ آ جاتے تھے۔ بالفرضِ محال ان پہاڑوں کو عبور کر لیا جاتا۔ تب بھی آگے جا کر ہمیں کشتی چاہیے تھی کہ اس کے بغیر ہم جزیرے سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔

میں خود تو اس مہم کے دوران فرار ہو سکتا تھا لیکن فرح اور سلطان کو قزاقوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا جو میرے فرار پر اُنھیں اذیت ناک سزائیں دے سکتے تھے۔ تاہم میں مہم کی تیاریوں کے دوران میں، برقون کے شمالی حصے کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرتا رہا۔

شہر پناہ کے بعد پہاڑ اور پہاڑوں کے بعد میدانی علاقہ تھا جہاں غلاموں سے کاشتکاری کروائی جاتی تھی۔ اس علاقے میں کچھ دولت مند سالاروں نے دیہی مکانات بنا رکھے تھے اور اُن کے پاس چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی تھیں جن سے فارش کے ساحل تک سفر کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لیے اب تک فرار کا کوئی منصوبہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔

..... پھر ہماری روانگی کا دن بھی آ گیا۔

ہم پَو پھٹے کھاڑی سے نکلے اور کھلے سمندر میں آ گئے۔

موسم سازگار اور ہوا موافق تھی۔ اس لیے بارھویں روز ہمیں آبنائے فروزاں کے دہانے پر واقع وہ چھوٹی سی پہاڑی نظر آ گئی جس پر ایک بُرج بنا ہوا تھا۔

اس بُرج سے سمندر میں آنے جانے والے جہازوں پر نگاہ رکھی جاتی تھی۔ شہلا نے جہازوں کو آبنائے سے پہلے لنگر انداز کرانے کی بجائے آگے بڑھنے کا حکم دیا تاکہ بُرج کے نگہبانوں کو یہ تاثر دیا جا سکے کہ ہماری کشتیاں آبنائے سے نہیں گزریں گی۔

جب ہم آبنائے سے آگے بڑھ گئے تو شہلا نے اپنے صندوق سے نقشے کی ایک نلکی اور چاندی کی چھوٹی سی صندوقچی نکالی اور حکم دیا کہ چپو چلانے بند کر دیئے جائیں.... پھر وہ دیدبان کے کیبن میں نقشہ پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔

میں اور سلطان اس کی ہدایات کے انتظار میں دروازے ہی پر رک گئے تھے۔

پہلے تو وہ چند لمحے کچھ بڑبڑاتی رہی پھر کیبن میں ویسی ہی عجیب سی خوشبو پھیل گئی جیسی مجھے ناگ مندر والی سرنگ میں گرنے کے بعد آئی تھی۔

مجھے ایک جھرجھری سی آ گئی۔

وہ نظارا ہی ایسا تھا کہ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ مجھے دیدبان کے اس پار سمندر میں ایک سبز سی عظیم الجثہ چیز ابھرتی دکھائی دی اور دوسرے ہی لمحے یوں محسوس ہوا جیسے ہماری کشتی کا نچلا حصہ کسی چیز سے رگڑ کھا رہا ہے۔

اتنے میں شہلا نے باآواز بلند ایک لفظ کہا جسے میں نہ سمجھ سکا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے پھنکار کی آواز سنائی دی۔ شہلا نے پھر وہی لفظ دہرایا۔ ایک بار پھر پھنکار کی آواز آئی اور ہماری کشتی کے سامنے پانی میں پانچ لکیریں ابھریں اور آگے بڑھنے لگیں۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ پھنکار کیسی تھی اور یہ لکیریں کیسی ہیں کہ شہلا دھاڑی....

"چپو چلاؤ ـــــ تیمور اور مرجان سے کہو کہ وہ ہماری کشتی کے پیچھے، پیچھے آئیں"۔

میں عملے کو ہدایات دینے لگا۔

میرا ذہن اب بھی شہلا کی حرکات اور ان لکیروں میں الجھا ہوا تھا جو ہماری کشتی کے آگے آگے بڑھ رہی تھیں۔

شام کا اندھیرا اترنے کے ساتھ ساتھ وہ لکیریں سمندری چٹانوں کی طرف گھوم گئیں۔ اب میں جان چکا تھا کہ شہلا اپنی کشتی ان لکیروں کے پیچھے پیچھے لے جا رہی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی سمندری مخلوق ہماری رہبری کر رہی تھی۔

ہماری کشتیاں، چٹانوں کے جال سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔

نہ جانے ہم کتنی دیر تک اندھیرے میں خطرناک چٹانوں کے درمیان سے گزرتے رہے۔ آخر شہلا کی آواز آئی "چپو چلانے بند کرواور سرفروش ملاحوں سے کہو کہ لنگر ڈال دیں"۔

تینوں کشتیوں کے لنگر ڈال دیئے گئے۔

ہمارے چاروں طرف اندھیرا اور سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اچانک شہلا نے وہی عجیب و غریب لفظ ایک مسرت انگیز مگر وحشیانہ نعرے کی صورت میں دہرایا۔

جواب میں پھر ایک طویل پھنکار سنائی دی۔

اس کے ساتھ ہی پانی میں ابھرنے والی وہ لکیریں پلٹ گئیں جنھوں نے ہماری اس مقام تک رہبری کی تھی۔

میری سمجھ میں اب تک نہیں آ سکا تھا کہ یہ کیا اسرار ہے۔

اتنے میں شہلا میرے قریب آ گئی۔ وہ بڑی نڈھال اور تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ اس نے میرا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ وہ جواب نہیں دیں گے لیکن میری پکار پر وہ آ گئے وہ زندہ ہیں اور میرا حکم مانتے ہیں، سرفروش لیکن تم ان کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرو گے"۔

"یہ تو پوچھ سکتا ہوں کہ اس وقت ہم کہاں ہیں؟" میں نے کہا

"ہم ایک چھوٹے سے دریا کے حصار میں ہیں اور ہماری منزل مقصود یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔ ہم کل دن بھر یہیں آرام کریں گے اور رات کو فروزاں پر حملہ کر دیں گے۔

"اگر کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو....؟"

"یہاں ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا" وہ اطمینان سے بولی "ایک زمانے میں یہاں بھی ہمارا ناگ مندر ہوا کرتا تھا۔ دن کی روشنی میں تمھیں اس کے کھنڈر نظر آ جائیں گے۔ جس حاکم نے اسے مسمار کیا تھا، اس نے یہاں کے لوگوں کو یہ حکم دے دیا تھا کہ آئندہ کوئی بھی اس منحوس جگہ کا رخ نہ کرے۔ توہم پرست لوگ بھولے سے بھی ادھر نہیں آتے۔ اسی لیے ہمیں کوئی بھی نہیں دیکھ پائے گا"۔

کہہ کر شہلا سونے کے لیے اپنے کیبن میں چلی گئی۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ شہلا کی باتوں نے میری نیند اڑا دی تھی۔

وہ کون تھے جو شہلا کی پکار پر آ گئے تھے۔

وہ کون تھے جن کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہیں.... مگر میں ان کے متعلق کوئی سوال نہیں کر سکتا؟

میں نہ جانے کتنی دیر تک عرشے پر بیٹھا یہی سوچتا رہا۔

.... پھر پو پھٹنے لگی۔

میں نے صبح کاذب کی روشنی میں دیکھا کہ ہماری کشتیاں پاٹ کے بیچوں بیچ لنگر انداز ہیں۔ پاٹ کے دونوں طرف اونچی پہاڑیاں ہیں۔ جن پر چھتری دار درختوں کا جنگل ہے اور اس عقب میں دور ایک برج دکھائی دے رہا ہے جس کی کھلی کھڑکیوں سے روشنی جھانک رہی ہے۔ یہ کھڑکیاں کسی مردے کی کھوپڑی میں آنکھوں کے سوراخوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں اس لیے میں نے منہ پھیر لیا اور چادر لپیٹ کر وہیں عرشے پر سو گیا۔

چوکیداروں کے علاوہ تینوں کشتیوں پر لوگ سہ پہر تک سوتے رہے.... پھر اٹھ کر تیاریاں کرنے لگے۔ ہتھیاروں پر ایک بار پھر دھار لگائی گئی اور قزاقوں نے سیاہ لباس پہننے کے ساتھ ساتھ اپنے چہروں پر بھی سیاہی مل لی.... تاکہ وہ اندھیرے میں، اندھیرے ہی کا ایک حصہ بن جائیں۔

جب ہر طرف رات کا اندھیرا پھیل گیا تو شہلا نے سالاروں اور ان کے نائبین کا ایک مختصر سا اجلاس طلب کیا اور ہدایات دینے لگی "برق طوفان" کا عملہ سیدھا شہر میں داخل ہو گا اور عنکبوت کا عملہ بندرگاہ میں.... "بحری چڑیل" کے لوگ قلعے پر دھاوا بولیں گے جہاں محصول کی رقم رکھی جاتی ہے۔ یاد رکھو کہ تمھیں کسی فوجی دستے کے ساتھ جھڑپ کرنے اور خواہ مخواہ لڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے شہری کسی حد تک مسلح ہوں لیکن تم لوگ ان سے نمٹنا جانتے ہو۔ بندرگاہ جانے والی کسی بھی کشتی کو بندرگاہ سے نہ نکلنے دیا جائے۔ ایسی کشتیوں کو لوٹ کر آگ لگا دی جاتے۔ شہر میں جانے والے لوگ بھی دکانیں لوٹ کر انھیں نذر آتش کر دیں"۔

لوٹنے کے بعد خواہ مخواہ دکانوں اور جہازوں کو آگ لگانا قزاق برادری کے اصولوں کے خلاف تھا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ جو چیزیں ساتھ نہیں لے جائی جا سکتیں، وہ دوسری بار لوٹ کر ساتھ لے جائی جا سکتی ہیں۔ شاید اسی بنا پر تیمور نے گول مول سے انداز میں شہلا سے کہا....

"اگر ہم شہر کو آگ لگا دیں گے تو خود ہمارا بھی وہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا، خواہر"۔

"حالات کے اعتبار سے آخری فیصلہ تمھیں خود کرنا ہو گا بلند سالار"۔ شہلا نے جواب دیا۔ "میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ جب ہم واپس جا رہے ہوں تو شہر سے شعلے اور دھواں بلند ہوتا دکھائی دیتا رہے"۔

اس اجلاس کے بعد لنگر اٹھا دیئے گئے اور کشتیاں آگے بڑھنے لگیں۔

شہلا کل کی طرح آج بھی اپنے "عمل" میں مصروف ہو گئی۔

اس کے جواب میں جب پھنکار کی آواز سنائی دی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

یہ پھنکار یقیناً بہت بڑے بڑے سانپوں کی رہی ہو گی۔

دو گھنٹے بعد ہمیں کچھ فاصلے پر مختلف رنگوں کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔

"وہ مینارۂ نور ہے، سرفروش! اپنے منجنیق چلانے والوں سے کہو کہ وہ تیار ہو جائیں"۔ شہلا نے کہا۔

میں نے منجنیق چلانے والوں کو ہدایات دیں اور انھوں نے منجنیق میں سیسے کے گولے بھر لیے۔

اس سے پہلے کہ ہماری کشتیاں لنگر انداز ہوتیں مینارۂ نور سے نگرانی کرنے والوں نے انھیں دیکھ لیا اور "قزاق آ گئے: قزاق آ گئے" کے نعرے بلند ہونے لگے۔

منجنیق سے پھینکے ہوئے گولوں نے مینارۂ نور کی روشنیاں گل کر دیں مگر اب وہ لوگ ہوشیار ہو چکے تھے اور یہ توقع رائگاں ثابت ہوئی تھی کہ وہ مقابلے کے بغیر ہی مغلوب ہو جائیں گے۔ تاہم جونہی کشتیاں کنارے سے لگیں، میں اور میرے ساتھی کود پڑے۔

ادھر تیمور نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا "جلدی کرو ہمیں کافی دور جانا ہے"۔

..... پھر اس کے آدمیوں کے گھومنے اور بھاگنے دوڑنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اسی دوران میں بھی ساتھیوں کے ہمراہ اس راستے پر آ گیا تھا جو قلعے کی طرف جاتا تھا۔

جونہی ہم درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب پہنچے تیروں کی ایک بوچھار آئی۔ میرے کچھ آدمیوں کی کراہیں بلند ہوئیں مگر دوسرے برق رفتاری سے اس جھنڈ کی طرف بڑھتے چلے گئے اور انھوں نے وہاں چھپے ہوئے تیر اندازوں کو دوسری بار تیر چلانے کا موقع نہیں دیا۔

اب دست بدست لڑائی ہونے لگی۔

تلواروں سے تلواریں ٹکرائیں اور چنگاریاں اڑنے لگیں۔

میرے سامنے چھوٹے قد کا ایک آدمی اپنے قد سے بڑی تلوار لیے ڈٹ گیا لیکن اس کی لمبی تلوار ہی اس کی موت کا باعث بن گئی۔ کیونکہ وہ چھتری دار درخت کے نیچے تھا جس کی شاخوں نے اسے تلوار چلانے کا موقع ہی نہیں دیا اور وہ میرے پہلے ہی وار میں ڈھیر ہو گیا۔

یہ معرکہ چند ہی لمحوں میں انجام کو پہنچ گیا اور میں اپنے ـــــ آدمیوں کو لے کر فصیل کی طرف بڑھ گیا۔

فصیل پر محافظ موجود تھے۔

دوسری فصیل کے ساتھ ہی ایک خندق بھی تھی جس کی وجہ سے آٹھ ہاتھ اونچی فصیل سولہ ہاتھ بلند ہو گئی تھی اور اتنی اونچی

فصیل پر چڑھنا ناممکن تھا لیکن خوش قسمتی سے خندق کے کنارے ایسے درخت موجود تھے جن کی شاخیں فصیل تک پہنچ رہی تھیں۔

میں نے کچھ قزاقوں کو ان درختوں کے ذریعے فصیل پر جانے کا حکم دیا اور کچھ قزاق درخت کاٹنے پر لگا دیتے باقی کو آڑ لے کر تیر اندازی کی ہدایات دیں تاکہ فصیل پر آنے والے محافظ مزاحمت نہ کر سکیں اور ہم وہاں تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو جائیں۔

بہت سے قزاق درختوں پر کلہاڑے چلانے لگے۔

اُدھر فصیل پر جو بھی پہرے دار آتا، تیر انداز اسے ڈھیر کر دیتے۔ تھوڑی ہی دیر میں چار درخت کٹ کر فصیل پر گرے اور پل کا کام دینے لگے۔

ہم بندروں کی طرح درختوں کی شاخوں کو پکڑتے ہوئے فصیل پر چڑھ گئے اور اندر کودنے لگے۔

فصیل کے اندر ایک تکون کی صورت میں تین عمارتیں بنی ہوئی تھیں جن کی حفاظت کے لیے اب گنتی کے محافظ رہ گئے تھے۔ یہ محافظ بھی زیادہ دیر تک مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور ایک ایک کر کے تہِ تیغ ہو گئے۔ اس وقت تک میرے بھی چھ ساتھی ہلاک یا بُری طرح زخمی ہو چکے تھے۔

میں نے قلعے کے کماندار کی لاش کی تلاشی لی تو مجھے اس کمرے کی چابی مل گئی جہاں محصول کی رقم رکھی جاتی تھی۔ جلد ہی قزاق سونے چاندی کے سکوں سے بھرے صندوقچے اور دوسرا سامان اُٹھا کر واپس جانے لگے۔ اب قلعے میں محافظوں کی طرف سے صرف ایک ہستی باقی رہ گئی تھی اور وہ تھی کماندار کی تیس سالہ بیٹی... قزاق اس کی بے حرمتی کر کے اُسے مار ڈالنا چاہتے تھے مگر میں نے انھیں سختی سے ڈانٹ دیا اور کہا کہ اُسے قیدی بنا کر کشتی میں پہنچا دیا جائے۔

توقع کے خلاف یہ مُہم بہت آسان ثابت ہوئی۔

جب ہم قلعے سے واپس جانے لگے تو مجھے بندرگاہ اور شہر سے شعلے اور دُھواں اُٹھتا دکھائی دیا۔ تیمور اور مرجان نے شہلا کی ہدایات پر پورا پورا عمل کیا تھا۔

جب ہم درختوں کے جھنڈ سے نکل کر کچے راستے پر آئے تو مجھے اور میرے ساتھیوں کو ایک دم رُک جانا پڑا۔

ہمارے سامنے ایک مسلح فوجی دستہ موجود تھا۔

ہر فوجی نے سینہ بند اور خود پہن رکھا تھا اس لیے انھیں آسانی سے مارنا بھی ممکن نہیں تھا۔ دوسرے ان کے پاس نیزے تھے جو قریب آنے سے پہلے ہی ہمیں موت سے ہمکنار کر سکتے تھے۔ اس صورتِ حال میں انھیں راستے سے ہٹا کر کشتی میں پہنچنا ناممکن ہو گیا تھا۔

میں نے فی الفور ایک فیصلہ کیا اور اپنے آٹھ آدمیوں کو خزانے کے صندوقوں کی حفاظت کے لیے پیچھے بھیج دیا۔ کچھ آدمیوں کو دکھاوے کے لیے سامنے رکھا اور انھیں ہدایت کی کہ وہ حملے کے لیے آگے نہ بڑھیں بلکہ اپنی جگہ ڈٹے رہیں اور اگر فوجی دستہ آگے بڑھے تو پہلے تیروں سے ان کی ٹانگیں زخمی کر دیں۔ کچھ قزاقوں کو ساتھ لے کر میں ڈھلان سے اُتر گیا تاکہ کاداکاٹ کر اس دستے پر پیچھے سے حملہ کر سکوں اور اُن میں ابتری پھیلا دوں۔

میں جونہی کاداکاٹ کر پیچھے آیا، یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ شہلا تنہا ہاتھ پاؤں کے بل چلتی ہوئی مسلح سپاہیوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے ایک سپاہی کے ٹخنوں پر خنجر سے وار کیا، دوسرے کے پیٹ میں گھونپا اور تیسرے کی گُدّی کو نشانہ بنایا۔ اتنے میں میرے ساتھی پیچھے سے سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے۔ اگرچہ سپاہی تعداد میں بہت زیادہ تھے مگر اُن کی ساری توجہ میرے سامنے والے ساتھیوں کی طرف تھی جب اُن پر پیچھے سے حملہ ہوا تو وہ اس ناگہانی اُفتاد سے بُری طرح بوکھلا اُٹھے اور فرار ہونے لگے۔

اُدھر سامنے والے سپاہی اپنے پیچھے افراتفری دیکھ کر پلٹے تو میرے ساتھی ان پر ٹوٹ پڑے۔ اس صورتِ حال میں سپاہیوں کی اکثریت کو تو اپنے ہتھیار استعمال کرنے کا موقع ہی نہ مِلا اور وہ اپنے بھاگتے ہوئے ساتھیوں کی تقلید میں اندھا دھند فرار ہونے لگے۔

اس وقت تک مجھ پر جنگی جنون سوار ہو چکا تھا چنانچہ میں ایک ہاتھ سے تلوار اور دُوسرے سے خنجر چلا رہا تھا اور میرے پاؤں کسی سپاہی کے پیٹ پر پڑ رہے تھے تو کسی کے گھٹنوں کا نشانہ لے رہے تھے۔

اتنے میں تیمور کا نعرہ بھی مالِ غنیمت اُٹھانے لگا تا اُدھر آتا دکھائی دیا تو بچے کھچے سپاہی بھی حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اب ہمارے لیے میدان صاف تھا۔ میرے ساتھی مالِ غنیمت لے کر کشتیوں کی طرف دوڑ پڑے۔ اس دوران مرجان اور اس کے ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے اور شہلا چلا چلا کر ہدایات دینے لگی۔

چند لمحوں کے اندر اندر لوٹ کا مال کشتیوں پر لاد دیا گیا۔

"کیا ہم اسی راستے سے واپس جائیں گے جدھر سے آئے تھے؟" میں نے شہلا سے پوچھا۔

"نہیں سرفروش۔ وہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ ہم اس دہانے سے باہر نکلیں گے لیکن ہم دُوسرے دہانے سے کھلے سمندر میں جائیں گے۔ ایک بار پھر منجنیق والوں کو تیار رہنے کا حکم دو حالانکہ میں سمجھتی ہوں۔ اب اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

شہلا کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔

فردزاں کے جنگی بیڑے اور بحری کمین سپاہ کی توجہ اسی جانب

تھی جبکہ ہماری کشتیاں دُوسرے دہانے سے نکل گئیں۔

ہرچند کہ اس طرف بھی فردزاں کے جنگی جہاز گشت پر تھے مگر چونکہ ہم نے اپنی کشتیوں پر بادبان نہیں چڑھائے تھے لہٰذا انھیں یہ شک بھی نہ گزرا کہ ہم فرار ہو رہے ہیں۔ مجھے فردزاں کی انتظامیہ کی ناقص کارکردگی کا یقین ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ اگر قزاق دو سو جنگی جہازوں اور کشتیوں کا بیڑا لے آئیں تو وہ چاروں ریاستوں پر بآسانی قبضہ کر سکتے ہیں۔ پھر مجھے اپنی اس سوچ پر تعجب ہونے لگا کیونکہ یہ ایک قزاق ہی کی سوچ ہو سکتی تھی۔

کھلے سمندر میں بادبانوں کے علاوہ ملّاح مسلسل تیس گھنٹوں تک باری باری کشتیاں کھیتے رہے اور جب شہلا کو یقین ہو گیا کہ اب ہم تعاقب کرنے والوں کی زد سے بہت دُور نکل آئے ہیں تو اُس نے ملّاحوں کو آرام کرنے کی ہدایت کی اور کشتیاں بادبانوں کی مدد سے آگے بڑھنے لگیں۔

چوبیس گھنٹے آرام کے بعد شہلا نے مالِ غنیمت تقسیم کرنے کا فیصلہ دے دیا۔ مالِ غنیمت کی تقسیم پر کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ ہر کارکن کے حصّے میں اتنی رقم آ گئی کہ وہ کئی سال تک آرام کی زندگی گزار سکتا تھا۔

جب مالِ غنیمت تقسیم ہو گیا تو شہلا قیدیوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

قیدیوں میں قلعے کے کماندار کی بیٹی، بارہ امیر شہری، تین سالار اور ایک فوجی عہدے دار شامل تھا، ان کے لواحقین سے ان کی رہائی کی خاصی اچھی قیمت وصول کی جا سکتی تھی۔ شہلا نے حکم دیا کہ قیدیوں کو اُس کے سامنے پیش کیا جائے۔ جب قیدی اُس کے سامنے لایا جاتا تو وہ اُسے حکم دیتی: "جھکو!" اگر کوئی اُس کے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی تاخیر کرتا تو وہ اُس کے چہرے پر اتنے زور سے چابک مارتی کہ چمڑی اُدھڑ جاتی اور خون رِسنے لگتا۔ پھر وہ اس پر تابڑ توڑ سوالات کرنے لگتی۔ نام...؟ ...عہدہ؟... خاندان؟... دولت؟... پیشہ؟ وغیرہ وغیرہ۔

کبھی کبھی وہ اُس کے سامنے کھڑے ہو کر یوں بل کھانے لگتی جیسے کوئی ناگن جھوم رہی ہو۔ اگر قیدی اس کی طرف دیکھتا تو وہ تڑاخ سے چابک مارتی اور قیدی کی چمڑی اُدھڑ جاتی۔ اس کے بعد وہ یرغمال کی رقم کا تعین کرتی۔ بعض قیدی اتنی بڑی رقم کا سن کر رونے اور فریاد کرنے لگتے کیونکہ انھیں یہ اُمید نہیں تھی کہ اُن کی آزادی کے لیے اتنی بڑی رقم ادا کی جا سکے گی۔

جب عسکری افسر کو اُس کے سامنے لایا گیا اور وہ اُس سے استفسار کر چکی تو مجھ سے بولی: "تمہارا کیا خیال ہے سرفروش، ایک ایسے عسکری کے لیے جو شراب کے نشے میں لڑنے کے قابل نہ رہا ہو، کوئی یرغمال کی رقم ادا کر سکتا ہے؟... نہیں... میرا خیال ہے کہ اسے غلام بنا لیا جائے۔ یہ کم از کم کھیتوں پر سال دو سال نکال ہی لے گا!"

یہ سنتے ہی اُس کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا افسر ایک دم اُٹھا اور اُس نے شہلا کی گردن دبوچ لینا چاہی مگر ایک محافظ نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ پر اتنے زور سے خنجر مارا کہ وہ دستے تک جسم میں گڑ گیا اور وہ دھڑام سے نیچے آ رہا۔ شہلا محافظ کی اس کارکردگی پر خوش ہوتے ہوئے بولی: "تمھیں میرے حصّے سے سونے کے دو سکّے ملیں گے!"

اب کماندار کی بیٹی کو شہلا کے سامنے پیش کیا گیا۔

شہلا نے حسبِ معمول اُس سے سوالات شروع کیے۔

"نام؟"

"عذرا!" اس نے جواب دیا۔

"خاندان؟"

"بس ایک باپ تھا جو مارا گیا!" اور یہ بتاتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"تمہاری طرف سے کوئی یرغمال کی رقم ادا کر سکتا ہے؟"

"نہیں... میں لاوارث ہوں!" عذرا نے جواب دیا: "مجھ پر رحم کرو!"

"ہاں۔ میں تم پر رحم کر سکتی ہوں!" یہ کہتے ہوئے شہلا کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک آ گئی۔ ایسی چمک جو شکار کو مسحور کرنے کے لیے سانپ کی آنکھوں میں آ جاتی ہے۔

یہ دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آ گئی۔

"قزاق برادری کے آئین میں عورتوں کا مقابلہ بھی شامل ہے۔ اگر تم مجھ سے مقابلہ کرو اور جیت جاؤ تو تم آزاد کر دی جاؤ گی اور اگر تم اس کے لیے تیار نہیں ہو تو میں تمھیں اپنے ملّاحوں کے حوالے کر دوں گی!" شہلا نے کہا۔

"نہیں نہیں میں مقابلہ کروں گی!" عذرا نے جواب دیا۔

میں اُس کے اس جواب پر صبر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ میں جانتا تھا کہ شہلا اُسے مقابلے پر اُکسا کر اپنی ایذا پسند فطرت کو تسکین پہنچانا چاہتی ہے۔ وہ اُسے تڑپا تڑپا کر اور سِسکا سِسکا کر مارے گی اور اُس کی کرب ناک آہوں اور کراہوں سے لطف حاصل کرے گی۔ میرا جی چاہا کہ میں ایک ہاتھ مار کر شہلا کو ختم کر دوں۔ میں ایسا کر سکتا تھا مگر اس طرح میری ہی نہیں فرح اور سلطان کی موت بھی یقینی بن جاتی۔ مجھے اپنی تو پروا نہیں تھی مگر اپنی وجہ سے دُوسروں کی موت نہیں چاہتا تھا اس لیے دل پر جبر کا پتھر رکھ کر خاموش کھڑا رہا۔

"تم کون سا ہتھیار پسند کرو گی؟" شہلا نے پوچھا۔

"تلوار!" وہ بولی لیکن مجھے یقین تھا کہ اُس نے آج سے پہلے پھل کاٹنے والی چھری کے علاوہ کوئی ہتھیار نہیں اُٹھایا ہو گا اور اسے تلوار پکڑے دیکھ کر میرے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ بعض اوقات بڑے بڑے تیغ زن اناڑیوں کے ہاتھوں مار

کھاجاتے ہیں۔ وہ اناڑیوں سے ماہرانہ وار کی توقع کرتے ہیں مگر اناڑی اُن پر ایسا وار کرتا ہے جس کے بارے میں وہ سوچ ہی نہیں سکتے۔ ہو سکتا ہے، عذرا، شہلا کی موت کا فرشتہ ہی ثابت ہو۔

عذرا نے دو تین بار ہوا میں تلوار چلائی۔ وہ سچ مچ ہی اوّل درجے کی اناڑی تھی۔ شہلا نے اپنے جُوتے اُتار کر پھینکے، سر پر ایک رُومال باندھا اور اُس کے سامنے آگئی۔

ملّاح چاروں طرف سے پندرہ قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"کیا تم تیار ہو؟" شہلا نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں تیار ہُوں۔" عذرا بولی۔

شہلا نے ایک ہاتھ میں چابک اور دُوسرے میں لمبا سا خنجر تھام لیا اور اپنی جگہ جم کر کھڑی ہوگئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ آگے کیوں نہیں بڑھی۔ اگر وہ چاہتی تو آگے بڑھ کر ایک لمحے کے اندر اندر عذرا کو ختم کر سکتی تھی مگر وہ تو عذرا کے ساتھ بلّی اور چوہے والا کھیل کھیلنا چاہتی تھی۔

عذرا تلوار چلاتے ہُوئے تیزی سے آگے آئی۔

شہلا نے پھرتی سے اُس کا وار خالی دیا اور بڑے زور سے اس کے پیٹ پر چابک مارا۔ عذرا مارے درد کے دُہری ہوگئی۔

شہلا دو قدم پیچھے ہٹ کر مسکرانے لگی۔

عذرا سیدھی ہوئی اور اُس نے شہلا پر پھر وار کیا مگر اس بار بھی شہلا نے وار خالی دیا اور خنجر سے اُس کے شانے پر ایک چرکا لگا کر پیچھے ہٹ گئی۔

عذرا درد سے کراہ اُٹھی اور اُس کے ہاتھ سے تلوار چھُوٹ گئی۔

شہلا نے اُس کے شانے سے خوُن بہتے دیکھا تو اُس کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک میں اضافہ ہوگیا۔ اب وہ ناچنے اور بل کھانے . . . کے انداز میں آگے بڑھی اور اس نے عذرا کے چہرے پر چابک مارا۔

عذرا پھر تڑپ اُٹھی... مگر اُس نے تلوار اُٹھائی اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر شہلا کی طرف بڑھی۔

شہلا جست لگا کر سامنے سے ہٹ گئی۔

عذرا نے اچانک گردش کرنا شروع کردی۔ شہلا یہ دیکھ کر ذرا سا چکرائی مگر خنجر تولتے ہُوئے آگے بڑھی لیکن جُونہی عذرا خنجر کی طرف متوجہ ہُوئی، شہلا نے تلوار پر چابک مارا اور خنجر سے عذرا کے چہرے پر چرکا لگا دیا۔

عذرا نے تلوار پھینک کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔

اب شہلا پر خوُن سوار ہوگیا۔ وہ اُچھل اُچھل کر عذرا پر خنجر سے وار کرنے لگی۔ عذرا کی ہر چیخ پر شہلا وحشیانہ نعرہ لگاتی اور ہر نعرے کے ساتھ عذرا کے زخموں میں ایک اور زخم کا اضافہ ہوجاتا۔

میں زیادہ دیر تک اس خونریزی کا تماشا نہ دیکھ سکا اور ریلنگ کے پاس آ کھڑا ہُوا۔

اتنے میں تیمور میرے پاس آیا اور بولا: "چلو اچھا ہُوا کہ شہلا کو ایک شکار مل گیا۔ اب وہ کچھ عرصہ تک فرح کی طرف توجہ نہیں دے گی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اگر عذرا شہلا کی اذیت پسند فطرت کو تسکین نہ دیتی تو وہ جاتے ہی فرح کو مقابلے کی دعوت دے ڈالتی... اور اُس کا بھی یہی حشر کرتی جو اُس نے عذرا کا کیا ہے۔"

میں اس تصوّر سے ہی کھول کر رہ گیا۔

تیمور نے میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگاتے ہوئے کہا "کھَولنے کی ضرورت نہیں سرفروش! اس وقت کے لیے کچھ سوچو اور کوئی تدبیر کرو جب شہلا فرح کو دعوتِ مقابلہ دے گی۔"

★★

ترغون سے برقون واپسی تک چار ہفتوں کے دوران میں یہی سوچتا رہا کہ شہلا کو جلد از جلد اپنے کیفرِ کردار تک پہنچ جانا چاہیے اور میری اس مسلسل سوچ کا باعث اُس کی ظالمانہ حرکات کم اور اس کی اپنی ذات زیادہ تھی جیسا کہ میں پہلے بتا چُکا ہُوں، شاید اسے لوگوں کے دلوں کا حال پڑھنا آتا تھا چنانچہ ایک رات اُس نے مجھ سے کہا۔

"تم مجھے بڑی آسانی سے قتل کر سکتے ہو سرفروش، سالاروں کی جماعت بھی شاید میرے قتل اور قاتل کے سلسلے میں زیادہ تفتیش کی زحمت نہ کرے کیونکہ میں سالار برادری میں زیادہ مقبول نہیں ہُوں... لیکن یاد رکھو کہ میرا قتل، فرح اور سُلطان کی موت ثابت ہوگا اور اُن کی موت عذرا کی موت سے کہیں زیادہ کرب ناک ہوگی۔"

میرا جی تو چاہا کہ میں اسی وقت شہلا کو ختم کر دُوں لیکن میں فرح اور سُلطان کی زندگیوں سے نہیں کھیل سکتا تھا۔ سُلطان کے ساتھ میں نے دوستی کا حلف اُٹھایا تھا اور فرح سے مجھے محبت ہوگئی تھی۔

میری داستانِ حیات پڑھنے والوں کو میرے اس اعتراف پر تعجب ہوگا اور وہ سوچیں گے کہ میں جو کبھی لالہ رُخ کو دیوانہ وار چاہتا تھا، اُسے کتنی آسانی سے بھُول گیا اور پھر عام مقولہ ہے کہ محبت زندگی میں صرف ایک بار ہوتی ہے تو میں فرح سے کیوں اور کیسے محبت کرنے لگا تھا

میرا خیال ہے کہ محبت ایک بار نہیں، بار بار کی جا سکتی ہے۔ محبت کے خلا کو صرف محبت ہی سے پُر کیا جا سکتا ہے، عورت کا لگایا ہُوا زخم کوئی عورت ہی بھر سکتی ہے۔ میں لالہ رُخ کو کبھی نہیں بھُول سکا اور نہ ہی کبھی بھُول سکتا ہُوں۔ اُس کی یاد کے زخم ہمیشہ تازہ ہی

رہے ہیں لیکن میں نے اُن پر فرائض کی چادر ڈال دی ہے۔ دُوسرے آخری ملاقات میں اُس نے یہ بتایا تھا کہ وہ مجھ سے مایُوس ہو کر کسی اور سے شادی کرنے والی ہے۔ میری مجبُوریاں اُسے اپنانے اور حقیقت حِل بتانے میں مانع تھیں اس لیے میں نے بڑی خاموشی کے ساتھ صبر کا زہر پی لیا تھا... اور اب یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیسی ہے؟ میں نے کبھی اُس کا کھوج لگانے کی بھی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ میں اُس کی ازدواجی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن فرح نے اپنے مزاج اور رکھ رکھاؤ سے میرے سازِ دل کے اُن تاروں کو پھر سے چھیڑ دیا تھا، جو مدتوں سے خاموش تھے۔

میں جذبات کی رَو میں بہہ کر نہ جانے کیا کچھ کہہ گیا ہُوں حالانکہ بات شہلا کی کر رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سالار برادری میں غیر مقبول تھی مگر جب ہم برقون پہنچے اور اُس نے مالِ غنیمت میں سے قزاق برادری کو اُس کا حصّہ دیا تو سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ گزشتہ تین سالوں کے دوران کسی سالار نے قزاق برادری کو اتنی بڑی رقم اور سونا چاندی نہیں دی تھی۔

اگرچہ اس مُہم کی کامیابی میں میرا بھی بڑا دخل تھا لیکن چونکہ مہم کی سربراہ شہلا تھی اس لیے کامیابی کا سہرا اُس کے سر باندھا گیا اور قزاق برادری کے وہ سالار جو پہلے اُسے درخورِ اعتنا بھی نہیں سمجھتے تھے اب اُس کے اردگرد منڈلانے لگے اور سالاروں کی انجمن اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگی۔

موسمِ سرما کے طوفان، باد و باراں شروع ہو چکے تھے اس لیے قزاقوں کی سرگرمیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ اس موسم میں وہ برقون میں آرام اور عیش کیا کرتے تھے۔

میں موسمِ بہار کی آمد تک فرار کے لیے تیار ہو جانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی تمام تر توجہ، معلومات فراہم کرنے پر لگا رکھی تھی۔ شیر کوہ آئندہ گرمیوں میں بغاوت کرنا یعنی قزاقوں سے فارش پر حملہ کروانا چاہتا تھا اور مجھے اُس وقت سے پہلے پہلے وہاں پہنچ کر شاہِ اسفندیار کو خبردار کرنا تھا۔

اُدھر شہلا مجھے فرح سے دُور رکھنا چاہتی تھی اس لیے کوشاں تھی کہ میں علیحدہ مکان کرائے پر لے لُوں۔ مجھے ابھی تک سالار نہیں بنایا گیا تھا مگر اُس کے ایما پر میں نے تین کمروں والا ایک مکان لے لیا کیونکہ میں اُس سے بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔

یہاں وہ اکثر میرے پاس آتی اور مستقبل کے منصوبے بنایا کرتی تھی۔ اسی دوران اُس نے کبھی بھی فرح کا ذکر نہیں کیا اور اس سلسلے میں اُس کی خاموشی میرے دل میں مستقل اندیشے اور وسوسے پیدا کرتی رہی کہ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی ہے۔ اس لیے میں فرح سے ملنے میں احتیاط برتتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ شہلا کے آدمی مجھ پر نظر رکھتے ہوں گے اس لیے فرح کبھی کبھار خُود ہی مجھ سے ملنے آجایا کرتی تھی۔

ایک رات جب سخت سردی تھی اور لوگ سرِ شام ہی اپنے گھروں میں دُبک گئے تھے، میرے دروازے پر دستک ہُوئی۔

دستک کا انداز بتاتا تھا کہ فرح آئی ہے۔

اُس کے یُوں بے وقت آنے پر میں ٹھٹک گیا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا کہ کہیں پڑوسی نہ جاگ جائیں۔ میں نے دروازہ کھولا تو واقعی فرح اور سلطان کھڑے تھے۔

میں اُنھیں اندر لے آیا اور آنے کی وجہ پُوچھی۔

اُنھوں نے بتایا کہ آج اُن کی رہائش گاہ کے باہر کچھ پُراسرار سے لوگ گھُوم رہے ہیں اور آثار اچھے نظر نہیں آتے، اس لیے وہ یہاں آگئے ہیں۔ اُن کی اس بات نے میرے دل میں وہ سارے خدشے اُبھار دیے جو مجھے ڈستے رہتے تھے۔ ابھی میں اس سلسلے میں کوئی اقدام کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ سیڑھیوں پر متعدد قدموں کی چاپ سُنائی دی اور پھر دھڑ سے دروازہ کھُل گیا۔

اس سے پہلے کہ میں یا سُلطان باہر جاتے، شہلا ایک ہاتھ میں خنجر اور دُوسرے میں چابک لہراتی ہُوئی اندر آئی اور غصّے کے عالم میں دھاڑی...

"تیری یہ جرأت کہ تُو اس مرد سے ملاقات کرے جسے میں نے اپنے لیے منتخب کیا ہے... یا تو مجھ سے مقابلہ کرو یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

فرح، شہلا کے تیور دیکھ کر دم بخوُد رہ گئی اور خوفزدہ ہو کر خاموش بیٹھی رہی۔

مجھ سے اُس کی توہین برداشت نہ ہو سکی۔ میں نے تلوار اُٹھالی اور شہلا کا سر قلم کرنے کے لیے آگے بڑھا تو مرجان کُود کر بیچ میں آگیا۔ میں اُسے مارنا نہیں چاہتا تھا مگر اُسے موت کھینچ کر میرے سامنے لے آئی تھی۔ میں نے اُس کا وار روکنے کے ساتھ ساتھ اپنی تلوار اس طرح گھمائی کہ وہ اُس کی زد سے اپنی گردن نہ بچا سکے۔

وہ ایک ہیبت ناک چیخ کے ساتھ ڈھیر ہوگیا۔

یہ دیکھتے ہی شہلا اُلٹے قدموں بھاگی۔ میں اُس کے پیچھے لپکا تو اُس کے دو محافظوں نے میرا راستہ روک لیا۔ میں نے سامنے آنے والے محافظ کو دُوسرے پر دھکا دیا تو دُوسرے محافظ کی تلوار اُس کی پُشت میں پیوست ہوگئی اور دونوں ہی گر پڑے۔

اس سے پہلے کہ دُوسرا محافظ اُٹھتا، سُلطان نے اُسے بھی ختم

کر دیا اور بولا۔ "اب ہمارا یہاں رہنا موت کو آواز دینے کے مترادف ہے سرفروش۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو، سلطان۔" میں نے اسے جواب دیا اور فرح سے کہا۔

"جلدی سے کچھ گرم کپڑے پہن لو۔"

اتنے میں باہر سے کسی نے پکار کر پوچھا۔ "یہ آوازیں کیسی ہیں سرفروش"

میری بجائے سلطان بول اٹھا۔ "یہ قزاق برادری کا معاملہ ہے۔ کسی سالار کو بلا لاؤ۔"

وہ آدمی سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی ہم چھت پر پہنچے اور وہاں سے دوسری چھت پر آ کر سیڑھیوں سے نیچے اتر آئے۔

گلی تاریک اور ویران تھی۔ ہم تیزی سے سڑک پر آئے اور پھر پہاڑوں کی طرف چل دیے۔

ابھی تک خطرے کا اشارہ نہیں ہوا تھا۔ ہمیں شمالی حصے کی شہر پناہ تک پہنچنے کی مہلت مل گئی۔ اب صرف سیڑھیاں چڑھ کر دروازے تک پہنچنا اور باہر نکل جانا تھا کہ اتنے میں خطرے کا طبل بجنے لگا اور اس کے ساتھ ہی نیچے مختلف مقامات پر چنگاریاں اڑانے والی مشعلیں جل اٹھیں لیکن ہم رک نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ ہم شرابی ملاحوں کی طرح جھومتے جھامتے دروازے تک پہنچ گئے جہاں چار پہرے دار سردی سے سکڑے سمٹے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"رک جاؤ..." ان میں سے ایک بولا۔

"آں...کیوں؟" میں نے کسی بدمست شرابی کی طرح پوچھا۔

"خطرے کا طبل بجا ہے۔" وہ بولا۔ "کوئی بھی سالارِ اعظم کی اجازت کے بغیر باہر نہیں جا سکتا۔" اور یہ کہتے کہتے اچانک اس کی نگاہ فرح کے چہرے پر جا پڑی۔

اگرچہ اس نے اپنا چہرہ شال سے چھپا رکھا تھا مگر اس کی خوبصورت آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ عورت ہے۔

پہرے دار اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "ارے واہ۔ کیا دیدار بھی نہیں کراؤ گی۔"

ابھی وہ فرح کا دیدار نہیں کر پایا تھا کہ سلطان کا خنجر اس کے سینے میں اتر گیا اور میں دوسرے پہرے داروں پر ٹوٹ پڑا۔

دو تو ڈھیر ہو گئے مگر تیسرا بھاگ نکلا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ شہر کی بجائے پہاڑوں کی طرف دوڑا تھا۔ میں نے سلطان اور فرح کو اپنی تقلید کرنے کا کہہ کر شور مچا دیا اور تیزی سے پہرے دار کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ "ارے بھائی پہرے دار۔ ٹھہرو۔ سنو تو۔"

سلطان اور فرح نے بھی یہی کیا اور برج میں دبکے ہوئے پہرے داروں نے جھانک کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی اس طرح شور مچا کر فرار ہو سکتا ہے۔ ہم تقریباً ڈیڑھ میل تک دوڑتے چلے گئے۔

اب ہمارے سامنے پہلا درہ تھا اور یہاں بھی محافظ موجود تھے۔ اتفاق سے کمان دار مجھے پہچانتا تھا۔

"کیا بات ہے سرفروش؟ کوئی گڑبڑ ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے دوست۔" میں نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ "سیڑھیوں والے دروازے پر کچھ لوگوں نے چار پہرے داروں کو قتل کر دیا ہے۔"

"اوہ...کیا وہ پکڑے گئے؟"

"نہیں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں شمالی چوکیوں سے کچھ پہرے دار لے کر انھیں تلاش کروں۔"

"کچھ دیر پہلے یہاں سے چند آدمی گزرے تو تھے...کیا میں آپ لوگوں کو اپنے تین گھوڑے دے دوں؟ یہ گھوڑے ضروری پیغام بھیجنے کے لیے ہوتے ہیں اور یہ معاملہ بھی کافی اہم ہے۔"

"ارے واہ، میرے دوست بہت بہت شکریہ۔ جلدی کرو تاکہ ہم بلا تاخیر آگے بڑھ سکیں۔"

جب فرح اور سلطان گھوڑوں پر سوار ہو گئے تو میں نے دیکھا کہ نیچے ڈھلان پر دو آدمی تیزی سے درے کی طرف چیختے چلاتے آ رہے ہیں۔ میں کود کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور کمان دار سے بولا۔ "یہ سونے کا سکہ قبول کرو دوست کیونکہ تم نے فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے۔"

"شکریہ جناب۔ خدا آپ کو کامیاب کرے۔" وہ بولا۔

میں نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

راستہ تنگ مگر ہموار تھا اس لیے ہم گھوڑے دوڑاتے چلے گئے۔ اس طرح ایک گھنٹے میں ہم نے تقریباً آٹھ میل کا فاصلہ طے کر لیا اور جنگل تک پہنچ گئے۔ یہاں ہم نے پختہ راستہ چھوڑ دیا اور جنگل میں گھس گئے تاکہ گھوڑے تھوڑی دیر دم لے سکیں اور میں سلطان اور فرح کو اپنا منصوبہ بتا سکوں۔ چنانچہ ایک جگہ میں نے گھوڑا روک لیا اور ان سے کہا۔

"میں نے فرار کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس کے اعتبار سے ہم یکسر... بے سر و سامان ہیں۔ اب ہمیں سرما کی طوفانی ہواؤں میں سمندر کا سفر کرنا ہوگا اور اس سفر کے لیے کوئی کشتی بھی چرانا پڑے گی... مگر اس سے پہلے ہمیں خوراک اور مزید کپڑوں کے لیے کسی گھر میں گھسنا پڑے گا۔"

"خدا پر بھروسہ رکھو دوست۔ یوں تو اس موسم میں کشتیاں سمندر سے ساحل پر کھینچ لی جاتی ہیں مگر اوپر والا کوئی معجزہ دکھائے گا اور کشتی

مل جائے گی مگر ہم فارش کی بجائے ترعون جائیں گے۔ وہ فارس کے مقابلے میں قریب ہے اور ہوا بھی موافق ملے گی۔" سلطان نے کہا۔

"لیکن ہمارا فارش جانا ضروری ہے کیونکہ ہمیں شاہ اسفندیار کو قزاقوں کی سازش سے خبردار کرنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

فرح نے بھی میری تائید کی۔

"اگر ہم صحیح و سلامت فارش پہنچ گئے تو وہاں ہمیں یہاں سے بھی زیادہ خطرہ ہوگا۔ شیرکوہ کو بھی قزاقوں سے کم نہ سمجھو۔"

"جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ شیرکوہ صرف ایک آدمی ہے جب کہ یہاں پچاس ہزار قزاق ہیں اور اب ان کا ہر فرد ہمارے خون کا پیاسا ہو چکا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا گھوڑا ابھر پہاڑی رہگزر کی طرف موڑ دیا۔

ہم صبح تک سفر کرتے رہے۔ کہیں کہیں ہمیں غلاموں کی جھونپڑیوں میں روشنی دکھائی دی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ کسی سے آمنا سامنا نہیں ہوا۔

صبح کے وقت ہم گھنے جنگل میں گھس گئے جہاں ہم نے گھوڑے باندھ دیے اور سکڑ سمٹ کر لیٹ گئے تاکہ تھوڑی سی نیند لے کر تازہ دم ہو جائیں۔

ہم نہ جانے کتنی دیر تک سوتے رہے کہ اچانک گھوڑوں کی ٹاپوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ لیا مگر ہلے جلے بغیر ہی لیٹا رہا۔

گھڑ سوار رکے بغیر آگے بڑھ گئے۔

میں نے سلطان اور فرح کی طرف دیکھا جو گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے انھیں جگانا مناسب نہ سمجھا اور سوچنے لگا کہ اب ہمیں گھوڑے یہیں چھوڑ دینے پڑیں گے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم چھپ چھپا کر آگے بڑھیں کیونکہ قزاق کتوں کی طرح ہر طرف ہماری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

جب سلطان اور فرح نیند سے بیدار ہوئے تو میں نے انھیں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور ہم درختوں کی آڑ میں پیدل ہی آگے بڑھنے لگے۔

تین دن بعد ہم اپنی تلاش کرنے والے دستوں کی نگاہوں میں آنے سے بال بال بچے، جھاڑیوں میں چھپ کر چلنے کی وجہ سے ہم بار بار گر پڑتے تھے اور ہمیں چوٹیں بھی آتی تھیں لیکن ہم نے سفر جاری رکھا۔

راستے میں ہمیں کسی مقام پر بھی کوئی کشتی دکھائی نہیں دی۔

رات کو بھی رکنا مناسب نہیں تھا۔ ہم آگے بڑھتے رہے لیکن اب ہمارا سب سے اہم مسئلہ کہیں سے اشیائے خورد و نوش حاصل کرنا تھا۔ اگرچہ مجھے اور سلطان کو بھی بھوک پیاس ستا رہی تھی مگر فرح کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ اس سے چلا ہی نہیں جا رہا تھا۔

کسی آبادی میں جانے کا مطلب موت کے منہ میں جانا تھا تاہم ایک مقام پر ہمیں غلاموں کی جھگیوں کے آخر میں ایک گودام نظر آ گیا۔ اس کے سامنے سمندر میں کوئی کشتی گشت نہیں کر رہی تھی اور جھگیوں میں غلام دروازے اور کھڑکیاں بند کیے سو رہے تھے۔

میں نے اپنی تلوار ہاتھ میں لے لی اور ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ وہ میرے پیچھے پیچھے چلے آئیں۔

میں روٹی اور سوکھی مچھلی کے تصور میں اتنا غرق تھا کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔

اچانک مجھے فرح کی چیخ سنائی دی اور پھر اس طرح ادھوری رہ گئی جیسے کسی نے اس کا منہ بند کر دیا ہو۔

میں فوراً پلٹا اور یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ سلطان زمین پر پڑا ہے اور دو آدمیوں نے فرح کو ڈنڈا ڈولی کر رکھا ہے۔

میں تلوار سونتے ادھر لپکا تو ایک درخت کے پاس سے گزرتے ہوئے کوئی چیز بڑے زور سے میرے سر سے ٹکرائی اور میں اس کی ضرب سے منہ کے بل گر پڑا۔ ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا جیسے میں سمندر کی گہرائی میں ڈوبتا جا رہا ہوں اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

★★

جب مجھے ہوش آیا تو میں یہ جان کر حیرت زدہ رہ گیا کہ میں کسی زنداں کے یخ بستہ فرش کی بجائے ایک نرم و گرم بستر پر لیٹا ہوا ہوں۔ میں نے اوپر نگاہ کی تو پتہ چلا کہ یہ کسی کشتی کے سالار کا کیبن ہے۔ ہچکولوں سے اندازہ ہوا کہ موجوں پر رواں دواں ہے۔

معاً دروازہ کھلا اور ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ کے ساتھ تیمور اندر آیا۔

تب مجھے احساس ہوا کہ میں "برقِ طوفان" پر سوار ہوں۔

"جراح نے بتایا ہے کہ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ لہٰذا میں تمھارے سوالوں کا جواب دینے آ گیا ہوں۔" تیمور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے سب سے پہلا سوال کیا۔ "کیا ہم قیدی ہیں؟"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمھیں شہلا کے شکاری کتوں کے حوالے کر دوں گا؟"

یہ سن کر مجھے کچھ اطمینان ہوا اور میں نے پوچھا۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم خلیج دارا کی طرف جا رہے ہیں اور توقع ہے کہ تین ہفتوں میں وہاں پہنچ جائیں گے۔"

خلیج دارا، مملکتِ فارش میں واقع تھی۔ اس لیے میں نے سوال کیا۔ "تمھارا اور تمھارے ملے کا کیا ہوگا؟"

"میرا اللہ میرے ساتھ ہے۔ شاہ اسفندیار ان قزاقوں کو معاف

کر دیتا ہے' جو قزاقی سے تائب ہو کر اچھے شہری بن جائیں اور آیندہ کوئی غلط حرکت نہ کریں۔ تم سوچو گے کہ میں نے قزاق برادری کو چھوڑنے کا فیصلہ کیوں کیا؛ بات دراصل یہ ہے کہ اب شہلا کو سالاروں کی جمعیت میں اقتدار حاصل ہو گیا ہے لہٰذا اُن سے انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ چونکہ شہلا کی فطرت میں انتقام لینا شامل ہے' اس لیے وہ ہر اُس فرد کو اپنا نشانہ بنائے گی جسے وہ پسند نہ کرتی ہو یا تمھارا دوست سمجھتی ہو۔ اس صُورت حال میں وہ مجھے اپنے انتقام کا نشانہ ضرور بناتی۔"

میں تیمور سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا مگر مجھے چکر آنے لگے۔ وہ مجھے سونے کا کہہ کر باہر چلا گیا۔

میں تقریباً بارہ گھنٹے سوتا رہا۔

دوسرے روز فرح میرے لیے کھانا لے آئی۔ وہ بے حد مسُرور دکھائی دیتی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ تیمور کو بھی ہماری تلاش کی مُہم پر بھیجا گیا تھا اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم اُسے مل گئے۔

مجھے خطرہ تھا کہ کہیں "برقِ طُوفاں" کا تعاقب نہ کیا جا رہا ہو۔ میں نے اِسی خدشے کا اظہار بھی کر دیا۔

"پہلے چند روز تک تو اُنھیں یہ خیال ہی نہیں آئے گا کہ ہم فرار ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ چند روز تک ہماری واپسی کا انتظار کریں گے اس طرح ہمیں کم از کم آٹھ دس روز کی مہلت مل جائے گی۔ تب وہ ہماری تلاش کے بارے میں سوچیں گے۔ ممکن ہے طوفانی موسم کی وجہ سے وہ تلاش کا خیال ہی ترک کر دیں۔" تیمور نے وضاحت کی۔

میں اِس وضاحت سے مطمئن ہو گیا۔

●

سُلطان اور تیمور دونوں تجربہ کار جہازراں تھے' اس لیے موسم کی خرابی کے باوجود پچیسویں روز ہم خلیج دارا تک پہنچ گئے۔

"اب ہمیں کوئی ایسی بندرگاہ تلاش کرنا پڑے گی' جہاں شیرکوہ کے دستے موجُود نہ ہوں اور بندرگاہ کے محافظ بھی اتنے بُزدل نہ ہوں کہ ہمیں دیکھتے ہی خطرے کا طبل بجا دیں اور ہمیں اپنے بارے میں وضاحت کا موقع ہی نہ مِل پائے۔" تیمور نے کہا... پھر وہ سُلطان کی طرف متوجہ ہو گیا: "بندرگاہِ رُودگی کے بارے میں کیا خیال ہے' وہ قریب بھی ہے۔"

"رُودگی سے ملحق ہی شیرکوہ کی جاگیر ہے۔ وہاں جانا اپنی موت کو دعوت دینا ہو گا۔" سُلطان نے جواب دیا۔ "اس سے بہتر تو یہ ہے کہ ہم ارموس سے گزر کر رزمانہ پہنچ جائیں۔"

"اگر بادِ شمالی نے طوفانی صُورت اختیار کر لی تو؟" تیمور نے خدشہ ظاہر کیا۔

"یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ طوفان بہر صُورت خطرناک ہُوا کرتے ہیں اور رُودگی جانے میں بھی یہ خطرہ پیش آ سکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ رُودگی' رزمانہ کی بہ نسبت قریب ہے۔"

"ٹھیک ہے' ہم رزمانہ جائیں گے۔" تیمور نے فیصلہ کر دیا۔

جُوں جُوں رات کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا' بادِ شمالی میں شدّت آتی جا رہی تھی اور پھر اُس نے طوفان کی شدّت اختیار کر لی۔

نصف شب کے قریب جب ہم ارموس کے سامنے سے گزر رہے تھے ہماری کشتی بپھری ہوئی موجوں کے درمیان گھِر گئی۔ کوہ پیکر طوفانی لہریں کبھی اُسے ایک جانب جھکا دیتیں اور کبھی دوسری جانب۔ اِس کیفیت نے چپّو چلانے ناممکن بنا دیے۔ ان لہروں میں کشتی کا موڑنا بھی انتہائی خطرناک تھا۔ کشتی مُڑتے ہُوئے پانی کے طوفانی ریلے سے اُلٹ سکتی تھی۔

ہم نے کشتی کو غضب ناک موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور ملّاح اُمڈ اُمڈ کر آنے والا پانی باہر نکالنے لگے مگر جتنا پانی وہ نکالتے تھے' اس سے زیادہ اندر آ جاتا تھا۔

دو گھنٹوں میں ہُوا اور طوفانی لہریں کشتی کو اُس طرف دھکیل لے گئیں جدھر چٹانیں تھیں اور یہی سب سے زیادہ خطرناک بات تھی۔ کشتی کسی بھی وقت چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو سکتی تھی۔ اس صُورتِ حال میں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ یا تو ہم کشتی چھوڑ دیں یا پھر اُسی میں موت کا انتظار کرتے رہیں۔

ابھی ہم کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ کشتی پانی میں چھُپی ہُوئی کسی چٹان سے ٹکرا گئی۔ دُوسری لہر نے اُسے چٹان سے اُچھال کر دُور کر دیا مگر تیسری لہر نے پھر اُسے زیرِ آب چٹان پر پٹخ دیا۔ اب وہ کسی لمحے بھی ٹُوٹ سکتی تھی چنانچہ تیمور نے نعرہ لگایا: "کشتی چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

سُلطان نے بتایا کہ یہ چٹانیں ساحل کے قریب ہیں۔ اگر طوفان نہ ہوتا تو ہم بآسانی تیر کر ساحل تک پہنچ سکتے تھے۔ اُس کے اِس انکشاف پر میں نے تیمور اور سلطان کو مشورہ دیا کہ اگر ساحل قریب ہے تو وہاں تک رسّہ پہنچا دیا جائے تاکہ اُس کے سہارے سب ساحل تک پہنچ سکیں ورنہ طوفانی لہریں آدھے سے زیادہ آدمیوں کو نِگل لیں گی۔

میری اِس تجویز پر سُلطان نے لبیک کہا اور اپنی کمر سے رسّہ لپیٹ کر پانی میں اُتر گیا۔ سب یہ دیکھنے کے لیے ڈگمگاتی ہُوئی کشتی کی ریلنگ تھام کر کھڑے ہو گئے کہ طوفانی لہریں سُلطان کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں۔

سُلطان تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ ایک طوفانی لہر نے اُسے نِگل

[...]یا اور وہ پانی میں غائب ہو گیا۔ بیشتر لوگوں کے مُنہ سے سسکاری نِکل [...]ی لیکن اُس لہر کے گزرنے کے بعد ہمیں سُلطان کا سر اُبھرتا دکھائی دے [...]یا اور اس کے ساتھ ہی سب نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا۔ اب سُلطان [...]سری نہیں آدھا دھڑ بھی دکھائی دے رہا تھا۔

وہ شاید کسی زیرِ آب چٹان پر پہنچ گیا تھا۔ پھر دُوسری لہر آنے [...]پہلے ہی اُس نے ڈبکی لگا دی۔ جب لہر گزر گئی تو ہمیں پھر اُس کا [...]پانی سے اُبھرتا دکھائی دیا۔ اب وہ کافی فاصلے پر پہنچ چُکا تھا۔ تیسری [...]ر جب وہ ہمیں دکھائی دیا تو وہ پانی میں چل رہا تھا اور لہریں اُس [...]گھٹنوں تک جھاگ اُڑا رہی تھیں۔

وہ ساحل پر پہنچ گیا تھا۔

سب نے ایک بار پھر نعرہ لگایا مگر اُن کا یہ نعرہ اُدھورا ہی رہ گیا۔ [...]ک لہر نے کشتی کو اُٹھا کر پٹخ دیا تھا' کشتی کے نچلے تختے ٹُوٹ گئے [...]تھا اب اُس کا لمحوں میں ڈُوب جانا یقینی تھا۔

اتنے میں سُلطان نے اپنی کمر سے رسّہ کھولا اور اُسے ایک [...]ان کے ساتھ باندھ دیا۔ اب ایک ایک کر کے ملّاح اُترنے لگا۔ جُوں [...]رسّے کو پکڑنے والے آدمی بڑھتے گئے' وہ تن کر کمان کے چلّے [...]طرح ہو گیا۔

"تم فرح کو لے جاؤ تیمور۔ شاید اسے تیرنا بھی نہیں آتا۔" میں نے کہا۔
"نہیں دوست۔ مانا کہ تم نے سالار پسرِ آذر کو مار کر سالار بن چکے [...]مگر میں نے اس کشتی پر بارہ سال کام کیا ہے۔ اس لیے میں آخر [...]تک کشتی پر رہوں گا۔ تم فرح کو لے جاؤ۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے شہزادہ شہریار کے کاغذات اور انگوٹھی موم جامے میں [...]سے ہی لپیٹ رکھی تھی۔ اسے مضبوطی کے ساتھ کمر سے باندھا اور فرح [...]لے کر پانی میں اُتر گیا۔

طوفانی لہریں بار بار ہمیں ڈبونے کی کوشش کر رہی تھیں' اُوپر سے [...]کے حواس بھی جاتے رہے اور وہ ڈر کر مجھ سے اس طرح لپٹ گئی کہ [...]میرے لیے موجوں سے لڑنا مشکل ہو گیا لیکن میرے آگے' پیچھے والے [...]ں نے ایک دُوسرے کے ہاتھ تھام کر ہمیں اپنے حصار میں لے لیا [...]بالآخر ہم بھی ساحل تک پہنچ گئے۔

میں نے پلٹ کر کشتی کی طرف دیکھا تو وہ تقریباً ڈُوب چکی [...]ا اور تیمور اُس پر کھڑا ہاتھ ہلا کر خُدا حافظ کہہ رہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک [...]ے کشتی اور تیمور کو نِگل لیا۔ وہ چاہتا تو اپنی جان بچا سکتا تھا مگر [...]برقِ طوفاں" کو اپنی محبوبہ سمجھتا تھا۔ اُسی کے ساتھ ڈُوب گیا۔

"سپاہیوں کا ایک دستہ ہماری طرف آ رہا ہے' سرفردُش!" [...]نا نے مجھے مخاطب کیا۔

میں نے پلٹ کر ساحل کی طرف دیکھا۔

دو قطاروں میں ایک دستہ ہماری طرف آ رہا تھا۔ اُنھوں نے سینہ بند باندھ رکھے تھے جن پر شیرکوہ کا نشان کندہ تھا۔ یہ دیکھ کر فرح کے مُنہ سے سسکاری نکل گئی۔ دستے کا کماندار آگے بڑھا اور بولا...

"میں مملکتِ فارش کے قانون کے مطابق اور علاقہ ارموس کے جاگیردار نیز وزیرِ اعلا شیرکوہ کے نام پر حکم دیتا ہُوں کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ..." یہ کہہ کر اُس نے سپاہیوں کی طرف دیکھا جنھوں نے نیاموں سے تلواریں نکال لیں۔

اگرچہ میرے ساتھی قزاق بُری طرح تھک چکے تھے اور اُن کے پاس ہتھیاروں کے نام پر صرف خنجر ہی تھے... مگر اُن میں چند ایک تنے میں کھڑے ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود وہ اس تازہ دم اور مسلّح دستے کا مقابلہ نہیں کر سکتے' اس لیے میں نے ہاتھ اُٹھا کر اُنھیں روک دیا اور کماندار سے بولا...

"ہم نے قزاق برادری سے علیحدگی اختیار کر لی ہے کماندار!"

"میں اس بات کا مجاز نہیں کہ قزاقوں کو ایسے آدمی سمجھوں جنھیں معافی دی جا چکی ہو۔ اب تم ہتھیار ڈال کر اپنے آپ کو ہمارے حوالے کرتے ہو یا میں اپنے دستے کو کارروائی کا حکم دُوں؟"

یہ کہتے ہُوئے اُس کی آنکھوں میں ایسی چمک آ گئی جیسے اُس نے فرح کو پہچان لیا ہو اور یہ بڑی خطرناک بات تھی کیونکہ وہ ذرا سے بہانے کا سہارا لے کر ہلّہ بول دیتا اور فرح کو آسانی سے ختم کر سکتا تھا۔ میں نے فوراً اپنا خنجر نکالا اور اسے ریت پر پھینک دیا۔ میرے ساتھیوں نے بھی میری تقلید میں اپنے اپنے خنجر پھینک دیے۔

سپاہی اپنی اپنی کمر سے بندھی رسّیاں کھولنے لگے تاکہ ہمیں باندھ سکیں اور میں یہ سوچنے لگا کہ تقدیر بھی کتنی ستم ظریف ہے۔ ہم بِرقون سے فرار ہو کر ساحلِ فارش تک آ گئے' میرے دوست تیمور نے اپنی جان دے دی کہ ہم بہ حفاظت ساحل پر اُتر جائیں... لیکن اس کے بعد تقدیر نے کیسا ستم ڈھایا کہ ہم جس سے بچنا چاہتے تھے' اُسی کے سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے مقدر نے ہمیں فرار کا موقع ہی اس لیے دیا ہو کہ ہم سیدھے شیرکوہ کے ہاتھوں میں جا پہنچیں۔

●

ہمیں دو روز تک عسکری پڑاؤ کے ایک گودام میں رکھا گیا اور پھر ایک دستہ ہمیں اپنی نگرانی میں لے کر فارش کی راج دھانی' درخشاں کی طرف چل پڑا۔

ہم چھ روز پیدل سفر کرنے کے بعد درخشاں پہنچ گئے۔

یہاں تک تو معاملات ٹھیک ٹھاک ہی رہے اور ہم پر کوئی زیادتی

یا تشدد نہیں کیا گیا۔ یہاں آ کر پتہ چلا کہ ارموس کی جاگیر صرف تین ماہ قبل ہی شیرکوہ کو عطا کی گئی ہے کیونکہ اُس نے مالیے کی وصولی میں شہزادہ شہریار کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا اور اُس کے مقابلے میں زیادہ رقم داخلِ خزانہ کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ شہریار مالیے کی رقم میں غبن کر رہا تھا۔ اس لیے شاہ اسفندیار کی نگاہوں میں اُس کی توقیر بڑھ گئی ہے۔

میرا خیال تھا کہ شیرکوہ مجھ سے قزاقوں کے بارے میں پوچھے گا لیکن ایسا نہیں ہُوا۔

ہمیں ایک قلعے میں بند کر دیا گیا۔

شاید شیرکوہ کسی کو بھی یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ اُس کا قزاقوں سے بھی کوئی رابطہ ہے۔

قلعے میں مجھے اور سلطان کو ایک الگ تھلگ کوٹھری میں رکھا گیا جو تنگ و تاریک، سیلن زدہ اور بے حد ٹھنڈی تھی۔ کوٹھری میں مچھروں اور پسوؤں کی بھی بہتات تھی۔ تاہم ہمیں ہتھکڑی یا بیڑی نہیں پہنائی گئی تھی اور کھانا بھی بروقت دیا جاتا تھا۔

ہمیں اس زنداں میں آئے تقریباً دو ہفتے ہو گئے تھے مگر کسی نے بھی کوئی پُوچھ گچھ نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہمیں محبوس کر کے بھول گئے ہوں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ فرح کو کہاں رکھا گیا ہے اور وہ کیسی ہے۔ مجھے رہ رہ کر اس کا خیال آتا تھا مگر میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔

تیرھویں رات ہماری کوٹھری کا دروازہ کھلا اور محافظ نے مجھ سے کہا: "تمھیں کوئی لینے آیا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ محافظ کے پیچھے کوئی سرتاپا سُرخ لبادے میں ملبوس کھڑا ہے۔ وہ فرح نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اُس کا قد لمبا تھا اور آنے والے کا قد چھوٹا تھا۔ وہ شیرکوہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ بہت فربہ آدمی ہے... تو پھر وہ کون ہو سکتا تھا؟ کس کا پیامبر... مگر کس کا؟ پھر میں نے سوچا کہ وہ شیرکوہ کا پیامبر ہو گا۔ اُسی نے مجھے بلوایا ہو گا۔ اگر اُسے ذرا سا بھی شبہ ہو گیا کہ میں شہریار کی مہم پُوری کرنے آیا ہُوں تو وہ فی الفور مجھے قتل کرا دے گا اسی لیے میں ذہنی طور پر ہر خطرے کے لیے تیار ہو گیا۔

کوٹھری کے دروازے سے نکلتے ہُوئے لبادہ پوش نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تو مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے وہ کسی لڑکی کا ہاتھ ہو... مگر اُس نے ہاتھ پر دستانہ چڑھا رکھا تھا اس لیے مجھے پتہ نہ چل سکا کہ وہ مرد ہے یا عورت... بہرکیف وہ جو کوئی بھی تھا مجھے قلعے کی متعدد راہداریوں سے نکالتا ہُوا ایسے زینے پر لے آیا جو اُوپر کی بجائے نیچے جاتا تھا۔

زینہ اُترنے کے بعد ہم پھر متعدد راہداریوں سے گزرے۔ میں نے جا بجا ہتھیاروں کے انبار لگے دیکھے۔ کہیں تلواروں کا ذخیرہ کیا گیا تھا تو کہیں نیزے رکھے ہُوئے تھے۔ کہیں خنجروں کے ڈھیر تھے تو کہیں تیروں کے انبار دکھائی دے رہے تھے۔

چلتے چلتے بالآخر ہم ایک ایسی جگہ جا پہنچے جہاں راستہ ختم ہو... پر ایک سنگی دیوار بنی ہُوئی تھی۔ میرے رہبر نے آگے بڑھ کر دیوار کو دبا دیا تو دروازے کے برابر ایک سِل گھوم گئی۔ وہ اس کے اندر داخل ہُوا اور مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

اندر بہت اندھیرا تھا مگر ٹٹولنے پر مجھے پتہ چل گیا کہ یہ ایک چکردار زینہ ہے۔ میں اُس کے پیچھے احتیاط سے چلنے لگا اور سوچنے لگا کہ اس قلعے میں بھی ویسے ہی زیرِ زمین راستے، سُرنگیں اور زینے ہیں جیسے کہ ناگ مندر میں تھے۔ کہیں یہ بھی کوئی ناگ مندر تو نہیں اور میں کسی دُوسری ناگ دیوی کے حضور تو نہیں جا رہا ہُوں؟

... لیکن جب زینہ طے کر کے ہم نے ایک دروازے میں قدم رکھا تو پتہ چلا کہ وہ ایک گول کمرہ ہے۔ جہاں نہ کوئی قربان گاہ ہے اور نہ ہی شیش ناگ کا مجسمہ ہے۔ اس کمرے کی کھڑکیوں سے درخشاں عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں پھر مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ کمرہ کسی بُرج کی بالائی منزل پر واقع ہے۔

کمرے کی دیواروں پر سُرخ پردے آویزاں تھے اور فرش پر سُرخ قالین بچھا ہُوا تھا۔ ایک طرف آرام دہ بستر لگا ہُوا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ کمرہ کسی شاہی افسر ہی کا ہو سکتا ہے۔ اتنے میں میرے رہبر نے اپنا لبادہ اُتار کر پھینک دیا اور میں اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

میرے سامنے ایک حسین عورت کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں نے بے ساختہ سوال کیا: "تم کون ہو؟"

"کیا تم کوئی اور خوبصورت سوال نہیں کر سکتے قزاق سالار؟" اُس نے ہنستے ہُوئے جواب دیا۔

"باقی سوال تو بعد میں بھی کیے جا سکتے ہیں خاتون، یہ سوال میرے لیے زیادہ اہم ہے۔"

"میں وزیرِ اعلیٰ شیرکوہ کی بیگم ہُوں۔ تم مجھے لیلیٰ کہہ کر پکار سکتے ہو۔"

"مجھے یہاں لانے کا مقصد؟" میں نے پُوچھا۔

"بہت سی باتیں سمجھی جاتی ہیں سرفروش، پوچھی اور بتائی نہیں جاتیں۔" اُس نے جواب دیا۔

اب میں اپنی یہاں آمد کا مقصد جان چکا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے وہ دُوسری شہلا ہو... لیکن وہ لمبی چوڑی تمہید کے بعد بولی تو میں بھونچکا رہ گیا۔

"میرا شوہر مملکت سے غداری کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے تم قزاقوں سے سازباز کر رکھی ہے۔ وہ مجھ پر ہی نہیں، کسی پر بھی اعتماد نہیں کرتا لیکن وہ میرے علاوہ کسی دُوسرے کے سامنے ڈینگ بھی نہیں مار سکتا۔ بہرحال، مجھے اُس کے منصوبے کا پتہ چل گیا ہے۔ اس لیے میں تم سے کچھ کام لینا چاہتی ہُوں۔"

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم اپنے شوہر سے غداری کیوں کرنا چاہتی ہو؟"

"اس لیے کہ میرا شوہر نہ پہلے کبھی میرا وفادار رہا ہے اور نہ ہی اپنے منصوبے کی تکمیل کے بعد رہے گا۔ بلکہ اگر اُس کا منصوبہ کامیاب ہو گیا تو وہ سب سے پہلے مجھے ہی اپنے راستے سے ہٹائے گا۔ جب وہ اتنا خود غرض ہے تو میں کیوں نہ بنوں؟ شہریار کے قتل کے بعد تخت کا کوئی وارث نہیں رہا کیونکہ شاہ اسفندیار لاولد ہے اور ملکہ کے مرنے کے بعد اُس نے دُوسری شادی نہیں کی لیکن اگر کوئی خوبصورت عورت اُسے وارثِ تخت و تاج دے سکتی ہو تو وہ اُس سے اس صورت میں ضرور شادی کرے گا کہ اُس نے شاہ پر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہو۔"

"احسان سے تمھارا مطلب اس کے شیرکوہ کی سازش بے نقاب کرنے سے ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"ہاں۔" وہ تائید میں بولی۔

"اس طرح وہ مارا جائے گا اور تم بیوہ ہو جاؤ گی۔ تب شہنشاہ اسفندیار تمھارا ممنونِ احسان ہو گا، تم سے شادی کر کے تمھیں ملکہ بنا لے گا۔ یہی ہے نا تمھارا منصوبہ؟"

"ہاں۔ شاید تم مجھے انتہائی لالچی سمجھ رہے ہو مگر ایسا بھی نہیں ہے۔ میرا شوہر بہت گھٹیا فطرت کا آدمی ہے۔ اُس نے دولت کے لالچ میں مجھ سے شادی کی تھی کیونکہ میرا باپ بہت بڑا جاگیردار تھا اور میں اُس کی اکلوتی اولاد تھی۔ اُس نے میرے باپ کی جاگیر پر قابض ہونے کے لیے اُسے زہر دلوا دیا۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں نے پُوچھا۔

"دراصل مجھے ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو بہادر ہو اور دربارِ شاہ کا ایک معتبر افسر بھی ہو۔"

"مگر میں تو ایسا افسر نہیں ہُوں۔"

"تم ایسے معتبر افسر بن سکتے ہو۔"

"وہ کیسے؟" میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہماری مملکت میں زمانۂ قدیم سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ اگر کوئی آدمی بھرے دربار میں شاہی سُورما کو مقابلے کی دعوت دے اور مقابلے میں اُسے مار ڈالے تو وہ اُس کی جگہ شاہی سُورما بن سکتا ہے۔ پہلے چونکہ شاہی سُورما کو نہایت اہم فرائض انجام دینا ہوتے تھے اس لیے سب سے بہادر آدمی کو شاہی سُورما منتخب کرنے کے لیے یہ طریقہ رائج کیا گیا تھا مگر آج کل شاہی سُورما اہم خدمات کی بجاآوری کے لیے کم اور نمائش کے لیے زیادہ ہوتا ہے۔ ویسے وہ دربار کا ایک قابلِ عزت فرد ضرور ہوتا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ تم بہت اچھے تیغ زن ہو۔ اگر تم شاہی سُورما افراسیاب پر غالب آ جاؤ تو تمھیں اس کی جگہ شاہی سُورما بنا دیا جائے گا۔ تم شاہ کے محافظِ خاص کی حیثیت سے کام کرتے ہُوئے میرے شوہر پر نظر رکھو گے اور اُس کے منصوبے کی تفصیلات معلوم کر کے مجھے بتاؤ گے پھر جب مناسب وقت آئے گا، ہم دونوں مل کر شاہ اسفندیار کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیں گے۔"

"کیا شیرکوہ مجھے شاہی سُورما کو مقابلے کی دعوت دینے دے گا؟"

"اگر تم دربار میں پہنچ کر دعوت دو تو شیرکوہ اس مقابلے کو کسی صورت نہیں رُکوا سکتا لیکن دربار میں پہنچنے سے پہلے وہ تمھیں قتل ضرور کرا سکتا ہے۔ اُسے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ تم شہزادہ شہریار کا اَدھورا کام پُورا کرنا چاہتے ہو۔"

"اُسے یہ کیسے معلوم ہُوا؟"

"فرح نے اُسے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

یہ سُن کر مجھے ایسا دھچکا سا لگا کہ میں بے اختیار اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس پر لیلیٰ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھاتے ہُوئے بولی: "غلط مت سمجھو سرفروش، فرح نے تمھارے ساتھ غداری نہیں کی۔ شیرکوہ نے حفاظت کے بہانے فرح کو اپنی تحویل میں لے رکھا ہے۔ اُس نے فرح کو ایک ایسا نشہ آور مشروب پلا کر یہ بات معلوم کی ہے جس کے زیرِ اثر آدمی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ فرح، شیرکوہ کے سوالوں کا سچ سچ جواب دینے پر مجبُور تھی۔"

اب جبکہ حقیقتِ حال شیرکوہ پر منکشف ہو چکی تھی، میرے لیے دوبارہ زنداں کی کوٹھری میں جانا موت کے مُنہ میں جانے کے مترادف تھا اس لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ میں لیلیٰ کی تجویز پر عمل کر دوں لیکن مجھے اپنے ساتھیوں کی فکر بھی تھی۔

"میرے ساتھیوں کا کیا ہو گا؟" میں نے پُوچھا۔

"کیا تم اُنھیں شاہ کے انصاف سے بچانا چاہتے ہو؟"

"اُس کے فیصلے میں شیرکوہ کا مشورہ زیادہ شامل ہو گا اور میں جانتا ہُوں کہ وہ اُسے کیا مشورہ دے گا۔ میرے ساتھیوں نے محض میری وجہ سے قزاقوں کا ساتھ چھوڑا ہے۔ اگر تم اُنھیں زنداں سے نکالنے میں میری مدد نہیں کر سکتیں تو میں بھی تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

"تم خود ہی اپنے ساتھیوں کو بچا سکتے ہو، سرفروش۔"

"وہ کیسے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اگر تم شاہی سُورما سے مقابلہ جیت لو اور شاہ اسفندیار سے ساتھیوں

ل رہائی کی درخواست کرد تو وہ اسے ہرگز رَد نہیں کرے گا۔"

"تم اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتیں؟"

"میں صرف اتنا کر سکتی ہوں کہ کچھ لوگوں کو یہ یقین دلا دوں کہ وہ قزاقی چھوڑ چکے ہیں اور معافی چاہتے ہیں۔ اس سے اُنھیں یہ فائدہ پہنچے گا کہ اُن پر مقدمہ نہیں چلایا جائے گا۔"

★★

یہ آراستہ و پیراستہ کمرہ بھی میرے لیے قید خانہ ہی تھا۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے گیارہ دن ہو گئے تھے۔ لیلیٰ آتی تھی اور میرے ساتھ کچھ وقت گزار کر چلی جاتی تھی۔ ادھر میں اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

فرح کے بارے میں مجھے اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ وہ اب تک شیرکوہ کی تحویل میں ہے جو بہت جلد اپنے سازشی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے والا ہے اور اس کے لیے خفیہ طور پر تیاریاں کر رہا ہے۔ جونہی موسم سرما کے طوفان ختم ہوں گے شیرکوہ کے ساتھ ساتھ قزاقوں کی تیاریوں میں بھی تیزی آ جائے گی اور فارش پر حملہ کر دیں گے۔ اگر میں یونہی اس عیش گاہ میں مقید رہا تو شیرکوہ کامیاب ہو جائے گا اور شاہ اسفندیار کے ساتھ ساتھ یا تو فرح کو ختم کر دے گا یا پھر اسے اپنی ملکہ بنا لے گا۔

میں لیلیٰ پر اپنے ان جذبات کا اظہار تو نہیں کر سکتا تھا لیکن معاملات کی سنگین نوعیت کے تحت اُسے اکسا ضرور رہتا تھا کہ جو کرنا ہے، جلدی کیا جائے۔

بارھویں روز جب لیلیٰ آئی تو اُس کے ساتھ دو گونگے اور بہرے ملازم بھی تھے۔ وہ میرے لیے درباری لباس اور میرے پسندیدہ ہتھیار لائے تھے۔ میں یہ دیکھ کر خوش ہو گیا لیکن لیلیٰ نے یہ خبر سنا کر میری خوشی پر اوس ڈال دی کہ شیرکوہ آج فرح کا مقدمہ شاہ اسفندیار کے سامنے پیش کرنے والا ہے... یا تو وہ اُس کے قتل کا حکم صادر کروانے میں کامیاب ہو جائے گا یا پھر اُسے اپنی قید میں رکھنے کی منظوری حاصل کر لے گا اور پھر وقت آنے پر اُسے قزاقوں کے حوالے کر دے گا۔

اس کا مطلب تھا کہ فرح بالآخر شہلا کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی جو اُس کے خون کی پیاسی تھی۔ اس تصور سے ہی میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

میں جلدی جلدی تیار ہوا اور لیلیٰ کے ساتھ چل پڑا جو آج مجھے دربار میں پہنچا دینا چاہتی تھی۔

جب ہم پیچ در پیچ راستوں اور محل کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے دربار کے محراب دار دروازے میں داخل ہوئے تو لیلیٰ نے سرگوشی میں کہا: "یاد رکھو، شیرکوہ کی باتوں سے طیش میں نہ آنا۔ شاہی سورما کو دعوتِ مقابلہ دینے سے پہلے وہ کسی وقت بھی تمھیں قتل کرا سکتا ہے اس لیے فرح کو کوئی اشارہ مت کرنا اور موقع ملتے ہی سورما کو مقابلے کی دعوت دے دینا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنا چہرہ رومال میں یوں چھپا لیا جیسے میرے سر اور چہرے کے زخموں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ لوگ اُنھیں دیکھ کر کراہیت محسوس کریں۔

گنبد والے دربار کے وسیع و عریض کمرے میں زرق برق لباس پہنے اس وقت تقریباً پانچ سو مرد اور عورتیں موجود ہیں۔ سبز پتھر سے تعمیر شدہ اس کمرے کی شان و شوکت قابلِ دید تھی۔ بڑے بڑے دو فیل پایوں کے درمیان سنہرا تخت رکھا ہوا تھا۔

میں سب سے پچھلی قطار میں کھڑا ہو گیا۔

چند منٹ بعد چوب دار نے آواز لگائی: "باادب باملاحظہ ہوشیار! عالم پناہ، شہنشاہ اسفندیار تشریف لاتے ہیں!"

چوب دار کی اس صدا پر دربار میں موجود ہر فرد ادب سے کھڑا ہو گیا اور جونہی اسفندیار دربار میں داخل ہوا، سب نے اپنا ایک ایک گھٹنا ٹیک کر اس کا استقبال کیا۔

اسفندیار نے اپنا بازو اُٹھا کر اُن کے استقبال کا جواب دیا اور سنہرے تخت پر متمکن ہو گیا۔

شیرکوہ کے اشارے پر باری باری کئی آدمی آگے بڑھے اور ادب سے اپنی اپنی عرض داشت پیش کرنے لگے۔ وہ کیا کہہ رہے تھے، میں نہیں سن سکا۔

چند آدمیوں کے بعد شیرکوہ نے محافظوں کو اشارہ کیا۔ وہ فرح کو لیے آگے بڑھے تو ہاتھ بے ساختہ اپنی تلوار کے دستے پر چلا گیا مگر میں ضبط کرتے ہوئے اپنے آپ کو آگے بڑھنے سے روک لیا۔

شیرکوہ نے شاہ اسفندیار سے کچھ کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلا محافظ شیرکوہ کے اشارے پر اُسے واپس لے جانے لگے۔

فرح کا رنگ زرد تھا اور وہ بے حد کمزور دکھائی دے رہی تھی اُس کے خوبصورت چہرے پر اداسیوں اور مایوسیوں کی پرچھائیاں تھیں میرا دل اُسے دیکھ کر تڑپ اُٹھا لیکن اس صورتِ حال میں، میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے لیلیٰ کی طرف دیکھا تو اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اپنے بال سنوارے یہی وہ اشارہ تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔

میں تیزی سے آگے بڑھا اور تخت سے بیس قدم کے فاصلے پر رُک کر سر خم کرنے کے بعد اپنا رومال چہرے سے ہٹا دیا۔ سب مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔

محافظوں نے تلواریں نکال لیں مگر حکم کا انتظار کرنے لگے

، کہ میں نے شاہ اسفندیار سے کہا۔

"عالم پناہ۔ یہ خاکسار سرفروش خدمتِ عالی میں اس لیے حاضر ہے کہ مملکت کے قدیم دستور کے مطابق شاہی سورما کو دعوت بلا دے سکے مگر یہ خاکسار اس مقابلے میں کامیاب ثابت ہو پ کا حلفِ وفاداری اٹھائے اور اُس وقت تک اپنے فرائض دیتا رہے جب تک کہ کوئی دوسرا اُسے مغلوب نہیں کر لیتا۔"

یہ سنتے ہی شیرکوہ بول اُٹھا: "یہ نہیں ہو سکتا عالی جاہ کیونکہ یہ قزاق ہے۔"

"نہیں شیرکوہ!" شاہ نے رعب دار آواز میں جواب دیا۔ "قانون ہے کہ اگر کوئی شاہی سورما کو مقابلے کی دعوت دے تو یہ دعوت بت پر قبول کی جائے۔ جب تک ہم اپنی مملکت کے حکمران ہیں، قانون میں کوئی ردّ و بدل نہیں کیا جا سکتا۔" پھر وہ نقیب فاطب ہوا: "شاہی سورما کو طلب کیا جائے۔"

... لیکن نقیب کے صدا لگانے سے پہلے ہی درباریوں نوں کو چیرتا ہوا ایک گرانڈیل آدمی آگے بڑھا اور شاہ کے نے سر خم کرتے ہوئے بولا: "آپ کا غلام افراسیاب حاضر ہے پناہ اور وہ اس بڑبولے کی دعوت قبول کرتا ہے۔"

میں نے افراسیاب کو غور سے دیکھا۔ وہ قد میں مجھ سے چند انچ تھا مگر اس کا سینہ چوڑا اور بازو بہت لمبے تھے۔ وہ اپنے ڈول سے بن مانس ہی لگتا تھا۔ میں نے پہلی نظر میں ہی ں کر لیا کہ وہ میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

"ہمیں تم سے یہی اُمید تھی افراسیاب!" اسفندیار بولا۔

"عالم پناہ چونکہ یہ ذلیل قزاق مسلح ہو کر آیا ہے لہٰذا اجازت کہ حضور کا قیمتی وقت برباد کیے بغیر اور بلا تاخیر مقابلہ شروع جائے۔" یہ کہتے ہوئے افراسیاب نے اپنی تلوار اور لمبا خنجر نکال یکھنے میں کسی تلوار سے کم نہیں تھا۔

"میں شاہی سورما کی آرزو پوری کرنے کو تیار ہوں عالی جاہ یا مجھے ایک ڈھال مل سکتی ہے؟"

شاہ اسفندیار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک محافظ رہ کیا جس نے آگے بڑھ کر اپنی ڈھال مجھے دے دی۔ یہ دو ڑی ایک چوبی ڈھال تھی جس پر چمڑا منڈھا ہوا تھا۔ اُس کے کانسی کی ایک تھالی نصب تھی۔ میں نے ڈھال کو ہاتھ پر اس کے وزن کا اندازہ کیا اور موت و زیست کے اس کے لیے تیار ہو گیا۔

نقیب کے اشارے پر شہنائی بجنے لگی اور درباری چند قدم پیچھے ہٹ گئے... پھر محافظ آگے بڑھے اور اُنھوں نے تقریباً تیس فٹ کے دائرے کا احاطہ کر لیا جس میں میں اور افراسیاب ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے اور ہم دونوں میں سے کسی ایک کو لقمۂ اجل بننا تھا۔

میں نے آج تک کسی ایسے تیغ زن کا مقابلہ نہیں کیا تھا جو ایک کی بجائے دو تلواروں سے لڑتا ہو۔ افراسیاب نے تلوار نما خنجر کو دفاعی حالت میں لاتے ہوئے تلوار سے میرے سر پر ضرب لگانا چاہی تو میں نے تلوار کو ڈھال سے روکا مگر عین اُسی وقت اُس نے خنجر میرے پیٹ میں گھونپنے کے لیے آگے بڑھا دیا۔

اگر میں ہٹنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر کرتا تو خنجر میرے جسم کے آر پار ہو جاتا۔

میں نے پیچھے ہٹ کر اُس پر وار کیا تو اُس نے تلوار اور خنجر کو اس طرح ملا لیا کہ اُن کی ایک قینچی سی بن گئی اور اُس نے میرا وار اُسی قینچی پر روک لیا۔

افراسیاب اتنا پھرتیلا تیغ زن تھا کہ مجھے اُس کے دُہرے حملوں سے بچنے کے لیے بار بار پینترے بدلنے پڑ رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اس پر غلبہ پانا تو بعد کی بات ہے، پہلے اپنا بچاؤ کرنا ضروری ہے۔

وہ میرا ہر وار ایک تلوار پر روک کر دوسری تلوار سے مجھ پر وار کیے جا رہا تھا۔ اُس کی تلوار میری تلوار سے زیادہ چوڑی تھی اس لیے اُس کی ضرب بھرپور پڑتی تھی چنانچہ اُس کا ایک وار روکتے ہوئے میری ڈھال دونیم ہو گئی۔

درباریوں نے بے ساختہ نعرۂ تحسین بلند کیا۔

افراسیاب کا حوصلہ دوچند ہو گیا اور وہ زیادہ تیزی، زیادہ پھرتی سے حملے کرنے لگا۔

ہر گزرتے پل کے ساتھ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اب اس کا مقابلہ کرنا پہلے سے زیادہ مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں پسینے سے شرابور ہو گئے۔ افراسیاب کے ہاتھ کسی مشین کی طرح چل رہے تھے۔ اگر میری ٹانگیں بھی مشین کی طرح نہ چلتیں تو وہ اب تک مجھے ختم کر چکا ہوتا۔ میں دو بار اس کے حملوں سے مرتے مرتے بچا تھا جبکہ میں خود اُس پر ایسا کوئی وار نہیں کر سکا تھا چنانچہ اب درباری افراسیاب کو بڑھ چڑھ کر داد دینے لگے تھے۔ اُنھیں یقین ہو گیا تھا کہ جیت اُسی کی ہو گی۔

اب میں نے ایک اور چال چلی۔

ہم پہلے ایک مختصر دائرے میں لڑ رہے تھے۔ میں نے اسے تھکانے کے لیے آہستہ آہستہ دائرہ بڑھانا شروع کر دیا۔ شروع میں تو اُس پر

کوئی اثر نہ ہُوا... پھر اس کے چہرے پر تھکن کے آثار دکھائی دینے لگے لہٰذا وہ جھنجلا کر وار کرنے لگا اور کوشش یہ کرتا رہا کہ اس کے وار کاری ثابت ہوں مگر میں بچ نکل جاتا جس سے اُس کی جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ بات میرے حق میں اچھی تھی۔

جلد ہی میں خود بھی تھکن محسوس کرنے لگا۔

... پھر ایک بار جب اُس نے تلوار سے میری گردن پر وار کرتے ہُوئے خنجر میرے پہلو میں گھونپنا چاہا تو میں نے جھکتے اور پیچھے ہٹتے ہوئے اچانک بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر اُس کا خنجر والا بازو زخمی کر دیا۔ میری تلوار اُس کی کہنی سے کلائی تک چرکا لگانے میں کامیاب ہوگئی اور اُس سے خون بہنے لگا۔

میں نہیں جانتا کہ اس وقت لوگوں نے میرے لیے نعرۂ تحسین بلند کیا تھا یا وہ افراسیاب کی ہمت بندھانے کے لیے چیخے تھے۔ البتہ مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ افراسیاب اپنا خون دیکھ کر مجھ پر اندھا دُھند جھپٹنے لگا تھا اور یہی اُس کی غلطی تھی۔

میں نے ایک چرکا اُس کی گردن اور دُوسرا ران پر لگا دیا۔

اُس کا خون فرش پر گرنے لگا... مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ زخم لگنے کے بعد اُس میں پہلے سے زیادہ پھرتی آگئی ہے جبکہ تھکن کے مارے میرا دم ٹوٹنے لگا تھا۔ میں نے اپنی بچی کھچی توانائی سمیٹی اور اُس کے وار روکنے لگا۔

... پھر افراسیاب بھی تھکن کے مارے ہانپنے لگا۔

اسے ہانپتا دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ پہلے وہ مجھ پر حملے کر رہا تھا اور میں دفاع میں مصروف تھا مگر اب میں اُس پر تابڑ توڑ وار کر رہا تھا اور وہ دفاع پر مجبور ہو گیا تھا۔ پھر اُس کا دفاع بھی کمزور پڑنے لگا اور مجھے اپنی فتح یقینی معلوم ہونے لگی۔

میں اُس پر آخری وار کرنے کے لیے لپکا تو فرش پر گرے ہُوئے خون کی وجہ سے میرا پاؤں پھسل گیا اور میں پیٹھ کے بل گر پڑا۔

میرے گرنے سے پانسہ پلٹ گیا۔

افراسیاب جو میرے وار سے مرنے والا تھا، مجھے تہِ تیغ کرنے کے لیے جھپٹا لیکن اس سے پہلے کہ اُس کی تلوار میرا خون چاٹتی، میں نے اس کا وار ٹوٹی ہُوئی ڈھال سے روکنے کے ساتھ ساتھ پاؤں سے اُس کے گھٹنے پر زوردار ٹھوکر لگائی تو وہ اُلٹ گیا۔

میں نے اُلٹی قلابازی لگائی، زقند بھری اور اپنی تلوار اُس کے سینے میں گھونپ دی۔

یہ سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا تھا۔

افراسیاب کھانسا تو اُس کے مُنہ سے خون کا فوارہ اُبل پڑا اور وہ ٹھنڈا ہو گیا۔

میری حالت بھی غیر تھی۔ میں تھکن کے مارے گرنے ہی والا تھا۔ میں نے ڈھال فرش پر پھینکی اور تلوار کی نوک اُس میں گاڑ کر ٹیک لگا لی۔ پھر میں اسفندیار کی طرف پلٹا اور میں نے اپنا سر خم کر دیا۔

درباریوں پر سکوت طاری تھا۔

اسفندیار نے مسکراتے ہُوئے میری طرف دیکھا اور کہا: "تم نے اپنے آپ کو شاہی سُورما بننے کا اہل ثابت کر دیا ہے سرفروش!"

شاہ کی یہ بات سُنتے ہی درباری مجھے مبارک باد دینے لگے اور شہنائی پھر سے بجنے لگی۔

چند لمحوں کے بعد جب محافظ مجھے میری نئی قیام گاہ کی طرف لے جا رہے تھے تو میں نے دروازے سے گزرتے ہُوئے لیلیٰ اور فرح کی طرف دیکھا۔ مجھے اُن دونوں کی آنکھوں میں اُمید کی جوت جلتی دکھائی دی۔ میں نے چاہا کہ میں فرح سے بات کروں لیکن موقع ایسا تھا کہ مجھے دل پر جبر کر کے آگے بڑھ جانا پڑا۔

★★

شاہی سُورما کا حلف اُٹھاتے ہی سب سے پہلے میں نے شاہ سے اپنے ساتھیوں کو معاف کرنے کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی اور انھیں گودی میں کام پر لگا دیا گیا۔

مجھے سلطان سے کھُل کر بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن میں نے اُسے یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ گودی میں کام کرنے والے لوگوں پر کڑی نظر رکھے اور یہ معلوم کرے کہ شیرکوہ کے وفادار کون کون ہیں اور مخالف کون سے ہیں... پھر ہو سکے تو وہ شیرکوہ کے مخالفوں کو اپنا بنالے اور اُن کی تنظیم میں مصروف ہو جائے۔

شاہی سُورما کی حیثیت سے مجھے کام کم اور اپنی نمائش زیادہ کرنی پڑتی تھی۔ میں اس پرندے کی مانند تھا جسے سونے کے پنجرے میں ڈال دیا گیا ہو تاہم مجھے اپنے اور لیلیٰ کے منصوبے کے اعتبار سے آزادانہ گھومنے پھرنے کے مواقع حاصل تھے۔ میں نے برقوں میں جو باتیں سُنی تھیں ان کی تائید و تصدیق ہو گئی۔ شیرکوہ نئے سال میں اپنے ارادے کو عملی شکل دینے والا تھا۔

فرح اب تک شیرکوہ کے قبضے میں تھی اور وہ اُسے کسی وقت بھی اپنی جاگیر پر بھیج سکتا تھا۔ کئی ہفتوں کی کوشش کے باوجود اس تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں اسے جلد از جلد شیرکوہ کے قبضے سے نکالنا چاہتا تھا تاکہ اگر شیرکوہ پر غلبہ حاصل کر لیا جائے تو اُس کے آدمی فرح کو یرغمال بنا کر کوئی سودے بازی نہ کر سکیں لیکن اب تک کوئی ایسی صورت نہیں نکل سکی تھی۔

سلطان نے میری ہدایات پر عمل کرتے ہُوئے ایسے لوگوں کی ایک فہرست تیار کر لی تھی جو شیرکوہ کے خلاف تھے۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن شام کے وقت غریبوں کے محلے میں واقع ایک مے خانے میں اس سے ملا کرتا تھا۔ یہاں جاسوسی کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ایک شام جب میں سلطان سے ملنے کے بعد محل جانے کے لیے گھوڑے پر سوار ہُوا تو ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔ بادلوں کے باعث شہر اندھیرے میں ڈُوبا ہُوا تھا۔ میں نے اپنی عبا اوڑھ لی اور تلوار کو نیام سے نکال لیا تاکہ بوقتِ ضرورت بلا تاخیر اپنا دفاع کر سکوں۔

میں بمشکل ایک یا ڈیڑھ میل ہی گیا ہوں گا کہ اچانک گلی سے ایک لبادہ پوش نکلا اور میری طرف لپکا۔ میں نے فوراً اپنی تلوار بلند کر لی۔

"گھوڑے سے اُترو اور میرے ساتھ چلو، سرفروش!" وہ بول پڑا۔

یہ آواز سُنتے ہی میرا ہاتھ وہیں کا وہیں رُک گیا۔ لبادہ پوش کوئی مرد نہیں بلکہ لیلیٰ تھی۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی بہت ہی اہم بات ہو گی جو لیلیٰ اس غلیظ علاقے میں آئی ہے۔

میں نے گھوڑے سے اُتر کر اُسے ہانک دیا اور خود لیلیٰ کے ساتھ چل پڑا جو مجھے ایک اندھیری گلی میں نیچی چھت والے ایک سائبان میں لے گئی۔ یہاں چار آدمی ایک ٹمٹماتے ہُوئے چراغ کے سامنے بیٹھے تھے۔ اُن سب نے کالک لگا کر اپنے چہرے سیاہ کر رکھے تھے۔

"یہ میرے محافظ ہیں۔" لیلیٰ نے انکشاف کیا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"بتاتی ہوں۔ کیا تمھارے گودی والے دوست تیار ہیں؟"

"ہاں..." میں نے جواب دیا۔

"پھر ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔ "شیرکوہ کل سے اپنے منصوبے پر عمل کرنے والا ہے۔ اس کے آدمی گودی میں آگ لگا کر بحریہ کی رسد اور کچھ جہازوں کو تباہ کر دیں گے۔ اس ہنگامے کو فرو کرنے کے لیے وہ عسکری دستے طلب کرے گا جو دراصل محل کو گھیرے میں لے لیں گے اور شاہ اسفندیار کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ قزاقوں کی آمد تک اُسے نشہ آور دواؤں کے ذریعے کٹھ پتلی بنا کر کام لیا جاتا رہے گا۔ شیرکوہ فرح کو آج رات ہی شہر سے کہیں مضافات میں بھیج رہا ہے۔"

اس پر میرا خون کھول اُٹھا مگر میں نے فرح کے بارے میں پوچھنے کے بجائے سوال کیا: "کیا تم جانتی ہو کہ گودی میں ہنگامہ اور آتش زنی کون کریں گے؟"

لیلیٰ نے اثبات میں سر ہلایا اور کئی افسروں کے نام بتا دیے جو پہلے سے سلطان کی فہرست میں موجود تھے۔

میں نے جلدی سے سلطان کے نام ایک رقعہ لکھ کر لیلیٰ کو دیتے ہوئے کہا: "اسے اپنے کسی محافظ کے ذریعے فوراً سلطان کو بھجوا دو جو غالباً ابھی تک ملاحوں کے مے خانے میں بیٹھا ہو گا۔ گودی کے معاملات سے وہ بخوبی نمٹ لے گا۔"

لیلیٰ نے وہ رُقعہ اپنے ایک محافظ کو دے کر بھیج دیا... پھر بولی: "اب وقت آگیا ہے کہ ہم فوراً شاہ اسفندیار کو حقائق سے آگاہ کر دیں۔ میں ثبوت کے طور پر شیرکوہ کی تحریروں کے علاوہ وہ تحریریں بھی ساتھ لیتی آئی ہُوں جو تم برقوں سے لائے تھے۔"

"تمھیں شیرکوہ کی تحریریں کیسے مل گئیں۔ وہ تو اُنھیں بڑی حفاظت سے رکھتا ہو گا۔"

"ہاں... وہ بہت محفوظ مقام پر تھیں۔ اس کا ایک معتمدِ خاص جو مجھ پر نظر رکھتا ہے، ان کا محافظ تھا۔ میں نے اس کے ساتھ کچھ وقت گزارا، مشروب میں بے ہوشی کی دوا پلائی اور اُس کی تجوری سے وہ دستاویزی ثبوت حاصل کر لیے۔ اب اگر ہم اسفندیار کو ان ثبوتوں کی مدد سے قائل کر لیں تو باقی سارا کام آسانی سے ہو جائے گا۔ درباریوں میں سے بہت کم لوگ شیرکوہ کے دوست ہیں اور تم انھیں بخوبی سنبھال لو گے۔ شاہی محافظ، شاہ کے وفادار ہیں۔ اگر اُنھیں خبردار کر دیا جائے تو وہ اُس وقت تک محل کو شیرکوہ کے ساتھیوں سے بچائے رکھیں گے جب تک کہ وفادار عسکری دستے وہاں نہ پہنچ جائیں لیکن بہتر ہو گا کہ اب مزید وقت باتوں میں برباد نہ کیا جائے۔ ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے۔"

گھوڑے تیار تھے اس لیے ہم فوراً ہی چل پڑے۔

محل کے پہرے دار مجھے شاہی سورما کی حیثیت سے پہچانتے تھے اس لیے کسی نے بھی مجھے شاہ کے ذاتی محل میں داخل ہونے سے نہ روکا۔

لیلیٰ بھی میرے ساتھ تھی۔

ہم نیم روشن پیچ در پیچ راستوں اور راہداریوں سے گزرتے ہُوئے محل کے اس حصّے میں پہنچ گئے جہاں اسفندیار کی خواب گاہ تھی۔

خواب گاہ کے بیرونی حصّے میں بھی روشنی کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ چھت سے آویزاں ایک قندیل کی مدھم روشنی میں مجھے چار محافظ پہرہ دیتے نظر آئے۔

میں سیدھا اُن کی طرف بڑھ گیا۔

یہ محافظ شاہی دستے سے منتخب کیے جاتے تھے اور اُن پر میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اُن میں سے کچھ افسر میرے ذاتی دوست ضرور تھے مگر اس وقت اُن میں سے کوئی بھی وہاں نہیں تھا۔ البتہ اُن میں سے ایک سالار بہزاد نے مجھے پہچان لیا۔

"کہو سرفروش! اس وقت کیسے آنا ہُوا اور یہ کون لوگ ہیں؟"

"یہ وزیرِ اعلیٰ کی بیگم اور اُن کے ملازمین ہیں۔ ہمیں شاہِ معظم سے بے حد اہم بات کرنی ہے۔"

بہزاد نے تعجب سے لیلیٰ کی طرف دیکھا اور بولا "جو بات کرنی ہے، مجھے بتادو۔ میں صبح سب سے پہلے شہنشاہ کے گوش گزار کردوں گا۔"

"نہیں بہزاد... وہ باتیں ہم تمھیں نہیں بتا سکتے اور وہ اسی وقت شہنشاہ کے گوش گزار کرنا ضروری ہیں۔"

بہزاد کوئی جواب دیے بغیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا، شاید وہ یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ کیا واقعی کوئی اہم بات ہوسکتی ہے جس کے لیے شہنشاہ کو نیند سے بیدار کیا جائے۔

"اچھی بات ہے، مَیں شہنشاہ کو تمھاری آمد سے آگاہ کرتا ہوں" یہ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اگر تمھیں اپنے شہنشاہ سے محبت ہے تو دیر مت کرو۔"

یہ سُن کر اُس نے مشعل اُٹھائی اور شہنشاہ کی خواب گاہ کا زینہ چڑھنے لگا۔

مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہُوا کہ شاہ کی حفاظت کے لیے صرف چار محافظ متعین کیے گئے ہیں جنھیں شیرکوہ کے آدمی چٹکی بجاتے میں ختم کرسکتے تھے۔ مَیں نے بے ساختہ پلٹ کر راہداری کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ آتو نہیں رہے... مگر راہداری خالی تھی۔

مَیں مطمئن ہوکر بہزاد کی طرف دیکھنے لگا جو اُوپر پہنچ کر دستک دے رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد دروازہ کُھلا اور وہ اندر چلا گیا۔

ہمیں بہزاد اور شاہ کی گفتگو، بھنبھناہٹ کی طرح سُنائی دینے لگی۔

بہزاد نے واپس آکر بتایا کہ صرف مَیں اور لیلیٰ ہی شاہ سے مل سکتے ہیں لیکن مجھے اپنے ہتھیار محافظوں کے حوالے کردینا ہوں گے۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی لیلیٰ نے ہامی بھرلی اور مجھے اپنی تلوار بہزاد کے حوالے کرنا پڑگئی جو میرے نکتۂ نظر سے ایک غلطی تھی۔

مَیں اور لیلیٰ، شاہ کی خواب گاہ میں داخل ہُوئے تو وہ اپنی کشادہ مسہری پر بیٹھا ہُوا تھا اور اُس کی تلوار اُس کے زانو پر رکھی تھی نیند سے بیدار ہونے کے باعث اُس کی آنکھیں سُرخ ہوگئی تھیں۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ہماری جانب دیکھا تو مَیں نے لیلیٰ کو اشارہ کیا کہ وہ شاہ کو حقائق سے آگاہ کرے کیوں کہ شاہی ادب و آداب وہ مجھ سے بہتر جانتی تھی۔

لیلیٰ نے بات یوں شروع کی...

"جہاں پناہ! آپ کے برادرِ محترم نے آپ کو بالکل صحیح بتایا تھا کہ میرا شوہر شیرکوہ قزاقوں کے ساتھ مِل کر آپ سے غداری کرنا چاہتا ہے۔"

اس تمہید پر شاہ کے کان کھڑے ہوگئے اور وہ اس کی باتیں غور سے سُننے لگا۔

لیلیٰ نے اُسے شیرکوہ کی سازش کی تفصیل بتاتے ہُوئے بات جاری رکھی "مَیں نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے، اس کے دستاویزی ثبوت بھی ساتھ لائی ہوں۔ یہ ملاحظہ فرمالیجیے" یہ کہتے ہُوئے اس نے وہ تمام کاغذات شاہ کے حوالے کردیے۔

شاہ نے وہ کاغذات ایک طرف رکھتے ہوئے کہا "اگر یہ تمام باتیں سچی ہیں تو تم نے اپنے شوہر کی گردن اُڑا دینے کا خود بھی بندوبست کردیا ہے، خاتون!"

لیلیٰ نے بڑی خوب صورت اداکاری کرتے ہُوئے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولی "مَیں جانتی ہوں عالم پناہ! لیکن میں شوہر کو وطن کی محبت پر ترجیح نہیں دے سکتی۔"

عین اسی وقت سیڑھیوں پر کئی آدمیوں کے چڑھنے کی آوازیں سُنائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ ایک دھماکے سے کُھلا اور ایک شخص شدید زخمی حالت میں اندر آیا۔ لیلیٰ ایک چیخ مار کر اس کی طرف لپکی لیکن وہ شخص اس کے بازوؤں کا سہارا ملنے سے پہلے ہی فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کا دایاں ہاتھ کُھلے دروازے کی طرف اشارہ کررہا تھا اور ہونٹ بے آواز حرکت کررہے تھے۔

مَیں نے پریشانی کے عالم میں دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے کا خلا کسی ایسے فریم کی طرح خالی تھا جس سے تصویر نکال لی گئی ہو۔ میں دوبارہ اُس زخمی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کے متحرک لبوں سے اب مدھم آواز نکلنے لگی تھی۔

لیلیٰ اس کی طرف جُھک گئی۔

مَیں نے بھی اس کے لبوں سے کان لگادیا۔

"وہ... وہ آرہے ہیں" زخمی کہہ رہا تھا "شہنشاہ کی زندگی... خطرے میں ہے۔"

اتنا سُنتے ہی مَیں نے لپک کر اُس کے ہاتھ سے تلوار چھین لی اور زینے کی طرف لپکا۔

چار آدمی تلواریں سُوتتے تیزی سے اُوپر آرہے تھے۔ اگلے دو آدمیوں نے میرے سینے اور پیٹ میں تلواریں گھونپنا چاہیں مگر مَیں بائیں جانب ہٹتے ہُوئے ایک پاؤں پر گھوما اور دوسرے پاؤں سے آگے والے کو زوردار ٹھوکر رسید کی تو وہ لڑھکتا ہُوا سیڑھیوں سے نیچے جا گرا...

ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ مَیں نے اُس کی گردن پر جوڑ دو کا وار کیا۔

اُس کے ہاتھ سے تلوار چھُوٹ گئی جسے مَیں نے ہَوا میں ہی اُچک لیا اور اُن دو آدمیوں کی طرف متوجہ ہُوا جو اُن کے پیچھے آرہے تھے۔

اُن دو سے نمٹنا تو میرے لیے مشکل نہیں تھا لیکن اب زینے پر بہزاد اور لیلیٰ کے دو ملازموں کے لیے مزید آٹھ دس آدمیوں کو روکنا مشکل ہوگیا تھا۔

مَیں چار چار سیڑھیاں ایک ساتھ اُترتا ہُوا نیچے آیا اور پھر مجھ پر حملہ ہوگیا۔

حملہ آور بھی اچھے تیغ زن تھے۔

مَیں نے تلوار کے ساتھ ساتھ اپنی ٹانگوں سے بھی کام لینا شروع کیا اور چار آدمی تہ تیغ کرڈالے۔

اسی دوران حملہ آوروں میں سے ایک نے میز اُلٹ دی جس کی وجہ سے لیلیٰ کے دونوں محافظ گر پڑے اور مارے گئے۔

اَب مَیں اور بہزاد چھ آدمیوں سے مقابلہ کر رہے تھے لیکن یہ مقابلہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔

تین حملہ آور مارے گئے اور تین بُری طرح زخمی ہوکر گر پڑے۔ باہر سے بہت سے آدمیوں کے دوڑنے کی آوازیں آئیں اور پھر محافظ دستے کے سپاہی تلواریں سونتے اندر آگئے۔

وہ صورتِ حال سے بے خبر تھے۔ اس لیے میری طرف لپکے لیکن بہزاد نے بیچ میں آکر انھیں روک دیا ورنہ وہ میری بوٹیاں اُڑا دیتے۔

عین اُسی وقت خواب گاہ کا دروازہ کُھلا اور شاہ اسفندیار کے پیچھے لیلیٰ نمودار ہُوئی۔

لیلیٰ نے لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ملاحظہ فرمائیے جہاں پناہ... یہ اُن لوگوں کی لاشیں ہیں جو حضور کا چراغِ زندگی گُل کرنے آئے تھے۔ کیا اَب بھی آپ کو میری باتوں پر یقین کرنے میں تامل ہے؟"

"نہیں خاتون! تمھاری باتیں بڑی حد تک درست ہیں۔ اَب شیرکوہ سے بات کرنا ہی پڑے گی۔"

"بشرطیکہ وہ آپ کو مِل جائے" لیلیٰ نے کہا "میرا خیال ہے وہ اب تک شمال کے عسکری پڑاؤ میں پہنچ چُکا ہوگا جس کے دستے وہ آپ کی گرفتاری کے بعد یہاں لانا چاہتا تھا۔"

"ہُوں..." شاہ نے کچھ سوچتے ہُوئے کہا "اَب ہم وہ کاغذات پڑھنا چاہتے ہیں تاکہ شیرکوہ کے ساتھ پُورا پُورا انصاف کرسکیں" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور اپنی خواب گاہ میں واپس چلا گیا۔

مَیں نے سالار بہزاد کی طرف پلٹ کر کہا "کیا تم اپنے کچھ آدمیوں کو لے کر شیرکوہ کی قیام گاہ پر جاسکتے ہو، سالار! وہ خود تو وہاں نہیں ہوگا لیکن شاید اُس کے چند گُرگے وہاں موجود ہوں۔"

بہزاد نے حفاظتی دستے میں سے بارہ مضبوط آدمی منتخب کیے اور وہاں سے چل دیا۔ اگرچہ مجھے عسکری دستوں کو حکم دینے کا کوئی اختیار نہیں تھا لیکن موجودہ صورتِ حال میں کسی نے بھی ایک لفظ نہ کہا اور میرے احکام کی بلا چون و چرا تعمیل کرنے لگے۔

مَیں نے وفادار عسکری کمان داروں اور بندرگاہ کی انتظامیہ کو پیغامات بھیجے اور محل کے محافظوں کو خبردار کیا کہ اَب شیرکوہ کے آدمی محل میں قدم نہ رکھنے پائیں۔

جوں جوں متعلقہ افسروں کو اطلاع ملتی گئی، وہ میرے پاس آتے اور ہدایات لیتے رہے۔ وہ لوگ میرے احکام کو شاہی احکام سمجھ رہے تھے۔ لیلیٰ میرے ساتھ کھڑی مسرور انداز میں یہ کارروائی دیکھتی رہی۔

پو پھٹے جب لاشیں وہاں سے ہٹادی گئیں تو شاہ اسفندیار کی خواب گاہ کا دروازہ کُھلا اور وہ باوقار انداز سے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آگیا۔

اُس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ سُرخ تھیں اور اُس نے بغل میں وہ کاغذ دبا رکھے تھے جو لیلیٰ نے اُسے دیے تھے۔ شاید وہ اَب تک انھی کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔

"تم نے ہمارے اور وطن کے لیے شاندار خدمات انجام دی ہیں خاتون!" یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہُوا "تمھارا کارنامہ بھی قابلِ داد ہے، سرفروش! گزشتہ تین صدیوں میں کسی شاہی سُورما نے شاہی خاندان کے لیے ایسا کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔"

اتنے میں ایک محافظ اندر آیا جس کے پیچھے پیچھے بارہ ملّاح تھے، انھوں نے دو بڑے بڑے صندوق اُٹھا رکھے تھے۔ ان ملّاحوں میں سُلطان بھی شامل تھا۔

وہ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی بولا "مجھے تمھارا پیغام وقت پر مِل گیا تھا، سرفروش!" ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اس کی نگاہ شاہ پر جا پڑی۔ اُس نے سر خم کرتے ہُوئے کہا "عالم پناہ... گودی کے افسروں میں کچھ غدار بھی شامل تھے، انھیں ملاحظہ فرمالیجیے" اس کے ساتھ ہی اس نے ملّاحوں کو اشارہ کیا۔

ملّاحوں نے صندوق فرش پر رکھ کر ان کے ڈھکنے کھول دیے۔ شاہ بُری طرح چونک گیا۔

لیلیٰ کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

مجھے اُبکائی آگئی۔

دونوں صندوقوں میں بہت سے کٹے ہُوئے سر موجود تھے۔

لیلیٰ نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہُوئے شاہ سے کہا "بہت جلد

حضور اپنے مزید دشمنوں کو بھی اسی حالت میں ملاحظہ فرمائیں گے، جہاں پناہ!"

"ہم اپنی وفادار سپاہ کی کمان تمھارے سپرد کرتے ہیں سرفروش! تم جو مناسب سمجھو، کرو۔" یہ کہہ کر وہ پھر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

میں نے فوراً گھر گھر تلاشی لینے اور ہتھیار ضبط کرنے کا حکم دے دیا۔

"اس ہنگامے کا ذمّے دار شیرکوہ ہے۔ اگر اُسے ختم کر دیا جائے تو یہ ہنگامہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ وہ شمال کے عسکری پڑاؤ میں ہو گا۔ اس سے پہلے کہ اس پڑاؤ کے دستے شہر کا رُخ کریں، منتخب افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا گر پوری طرح مسلح دستہ شمالی پڑاؤ میں پہنچ کر شیرکوہ کو ختم کر دے یا گرفتار کر لے۔" میں نے لیلیٰ سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اس دستے کی کمان تم خود سنبھالو گے؟" لیلیٰ نے پوچھا۔

"ہاں... اس دستے کی کمان میں خود سنبھالوں گا۔" میں لیلیٰ کو یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ یہ اقدام فرح کی وجہ سے کر رہا ہوں۔

کچھ دیر بعد میں پچاس جنگجو سپاہیوں کے ساتھ اُسی مشرقی دروازے سے باہر جا رہا تھا جس سے کچھ عرصہ پہلے مجھے ایک قیدی کی حیثیت سے لایا گیا تھا۔

دن کی روشنی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی اس لیے شہر سے نکلتے ہی ہم نے گھوڑے دوڑا دیئے اور ایک گھنٹے میں پڑاؤ کے قریب پہنچ گئے۔

ہم نے اپنے گھوڑے ایک ایسی جگہ روک دیئے جہاں سے وہ پڑاؤ کے پہرے داروں کو دکھائی نہ دے سکیں جو صدر دروازے پر موجود تھے۔

یہ پڑاؤ دو سو گز چوڑا اور تین سو گز لمبا تھا جس کے اِرد گِرد آٹھ فٹ اونچی کچی دیوار بنی ہوئی تھی۔ پڑاؤ کے وسط میں صرف ایک پختہ عمارت تھی جب کہ اس کے اطراف [illegible] نصب تھے۔

طے شدہ منصو[بے] کے مطابق مجھے، بہزاد اور سلطان کو رسّیوں سے اس طرح باندھ دیا گیا کہ ہم جب چاہیں، ایک جھٹکے سے انھیں کھول سکتے تھے... پھر بہزاد کے ایک نائب نے کمان سنبھال لی اور سب کے سب قہقہے لگاتے اور شور مچاتے ہوئے پڑاؤ کی جانب چل دیئے۔

میرا، بہزاد کا اور سلطان کا مُنہ ڈھانپ دیا گیا تھا اسی لیے میں منزل کے فاصلے کا تعیّن صرف آوازوں سے ہی کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد محافظوں کی آواز آئی۔

"ٹھہر جاؤ... کون ہو تم لوگ؟"

"ہم کچھ قیدی لائے ہیں جنھیں وزیرِ اعلا دیکھنا پسند فرمائیں گے۔" بہزاد کے نائب نے جواب دیا۔

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔

میرا دل شدّت سے دھڑک اُٹھا تھا۔

"مگر وزیرِ اعلا اس وقت سو رہے ہیں۔" محافظ کچھ دیر بعد بولا۔

میں نے اطمینان کی ایک سانس لی کہ شیرکوہ وہاں موجود تھا۔

"میرا خیال ہے، وہ ان قیدیوں کو دیکھنے کے لیے اپنے جگائے جا[نے] کا بُرا نہیں منائیں گے۔ قیدیوں کے چہروں سے کپڑے ہٹا دو۔" بہزاد کے [نائب] نے کہا۔

ہمارے چہروں سے کپڑے ہٹا دیے گئے۔

میں نے دیکھا کہ ہم بہت سے محافظوں اور ایسے سپاہیوں [سے گھرے] ہوئے ہیں جو مکمل لباس میں نہیں تھے۔ غالباً وہ سب کے سب ہمار[ے] سپاہیوں کا شور سُن کر مشعلیں اُٹھائے تماشا دیکھنے آ گئے تھے۔

"وزیرِ اعلا قیدیوں کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ تم سے بات بھی کرنا [چاہیں] گے۔ اس لیے گھوڑوں سے اُتر جاؤ اور انھیں ہمارے گھوڑوں کے ساتھ [جانے] دو۔" محافظوں کے کمان دار نے کہا۔

"شکریہ کمان دار۔" بہزاد کے نائب نے جواب دیا۔ "مگر ہمیں [یہاں] زیادہ دیر نہیں رُکنا کیوں کہ ہمارا پڑاؤ قریب ہی ہے اور ہمیں شہر سے [فرار] ہونے والوں پر نظر رکھنی ہے اور تم تو جانتے ہی ہو کہ ایسے موقعوں پر اچھ[ا] مالِ غنیمت مِل جاتا ہے لہٰذا گھوڑے کھولنے کی ضرورت نہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

چھ آدمی ہم تینوں کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ باقی پڑاؤ کے دروازے پر ہی کھڑے رہے۔

کمان دار ہمیں پختہ عمارت کے پاس رُکنے کا اشارہ کر کے [اندر چلا] گیا۔ چند لمحے بعد شیرکوہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آ گیا اور جونہی اس کی نظر [مجھ پر] پڑی، وہ خوش ہو گیا۔

"یہ بھی اچھا ہُوا کہ یہ لوگ تمھیں یہاں لے آئے، قزاق۔ مجھے [یقین] ہے کہ تم فرح کو اور فرح تمھیں دیکھنے کے لیے بے چین ہو گی۔"

شیرکوہ کی اس بات سے پتہ چل گیا کہ فرح بھی اسی پڑاؤ میں ہے۔ میں نے جھٹکے سے رسّی کھولی اور گھوڑے کی زین سے شیرکوہ [پر] چھلانگ لگا دی۔ اگرچہ وہ لحیم شحیم آدمی تھا مگر میرے دھکے سے گر [گیا]۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا خنجر نکالتا، میں نے اُسے بالوں سے پکڑ کر اس [کا سر] فرش سے ٹکرانا شروع کر دیا۔

چند ہی لمحوں میں شیرکوہ کی مزاحمت دم توڑ گئی اور وہ بے [ہوش] ہو گیا۔

پہلے تو محافظ یہ نظارا دیکھ کر گُم صُم سے رہ گئے مگر جلد ہی [جب] اُنھوں نے میری طرف بڑھنا چاہا تو ہمارے چھ ساتھیوں نے تلو[اریں] سونت کر اُن کا راستہ روک لیا۔

بہزاد نے اپنے گھوڑے سے کمان دار کے گھوڑے پر جست [لگائی] اور اُسے گرا دیا۔ میں نے اور دِلاور نے بے ہوش شیرکوہ کو کمان دار کے [گھوڑے] پر ڈال کر انھی رسّیوں سے جکڑ دیا جن سے ہمیں دِکھاوے کے لیے باندھ کر یہاں لایا گیا تھا۔

اتنے میں چھ سواروں کے علاوہ ہمارے باقی سپاہی بھی وہاں پہنچ گئے اور انھوں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال دیا۔

میں نے شیرکوہ کو ہلایا جُلایا تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

"فرح کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔

میں نے ایک مشعل اُٹھا کر اُس کے چہرے کے قریب کی تو وہ بول پڑا۔ "وہ... اندر... پچھلے کمرے میں ہے۔"

میں مشعل پھینک کر اندر جانے لگا تو ایک سپاہی نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ میں نے اُس کی گردن اُڑا دی اور پہلے کمرے میں داخل ہو گیا۔

دوسرے کمرے کا دروازہ مقفل تھا۔ میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر پوری طاقت سے اپنا کندھا دروازے پر مارا تو وہ ٹوٹ گیا۔

فرح، فرش پر بے سُدھ پڑی تھی۔ اس کا لباس دریدہ اور حالت غیر تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُس پر تشدّد کیا گیا ہو۔ میں نے اُسے جگانا چاہا مگر پتہ چلا کہ اُسے کوئی نشہ آور مشروب پلا دیا گیا ہے۔

میں نے اُسے اُٹھایا اور باہر لا کر اپنے ساتھ گھوڑے پر سوار کرتے ہوئے کہا۔ "واپس چلو۔"

سلطان نے شیرکوہ والے گھوڑے کی راس تھام رکھی تھی۔ ہم واپس جانے لگے تو کچھ سپاہیوں نے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر ہمارے ساتھی انھیں روندتے اور کاٹتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

پڑاؤ سے نکلتے ہی ہم نے گھوڑوں کو پوری رفتار سے دوڑا دیا تاکہ جتنا زیادہ ہو سکے، تعاقب کرنے والوں سے دُور نکل جائیں۔ اگر شمالی پڑاؤ کے سپاہیوں نے ہمارا تعاقب کیا بھی ہو گا تو وہ ہم تک نہیں پہنچ پائے اور ہم شہر میں داخل ہو گئے۔

شہر میں وفادار دستے گشت کر رہے تھے۔ ایک دستے نے ہمارا راستہ روکنا چاہا مگر مجھے اور بہزاد کو پہچان کر وہ سامنے سے ہٹ گیا... جب ہم محل پہنچے تو شاہ اسفندیار، لیلیٰ کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا۔

ہم شیرکوہ کو نرغے میں لیے، شاہ کے حضور پیش ہُوئے تو وہ ناشتہ چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس وقت وہ بے حد تازہ دَم لگ رہا تھا۔ اُس نے شیرکوہ سے کہا...

"ہمیں تم سے یہ توقع نہیں تھی شیرکوہ... تمھیں اپنے کیے کی سخت ترین سزا ملے گی۔"

"مجھے اپنی سزا کی پروا نہیں ہے۔" شیرکوہ غرّایا۔ "لیکن میرے مَرنے کے بعد آپ اور یہ ذلیل عورت بھی زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گی۔"

یہ کہتے ہُوئے اُس نے دائیں جانب والے سپاہی کے پیٹ میں ایک ہاتھ سے مُکّا مارا اور دوسرے سے اُس کی تلوار چھین کر شاہ کی طرف لپکا۔

شاہ جلدی سے ہٹ گیا لیکن لیلیٰ نہ ہٹ سکی۔ شیرکوہ نے تلوار اُس کے سینے میں گھونپ دی۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ میں دخل نہ دے سکا۔ جونہی مجھے صورتِ حال کا اندازہ ہُوا، میں نے طیش میں اُسے اُٹھا کر بالکونی سے نیچے پھینک دیا اور وہ تقریباً سو ہاتھ اُونچائی سے گرنے کے بعد گوشت کے لوتھڑوں میں تبدیل ہو گیا۔

میں لیلیٰ کی طرف بڑھا اور بولا۔ "میں احمق تھا کہ میں نے اُسے..."

لیلیٰ نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش کر دیا۔ "وہ... وہ دِل برداشتہ... ہو کر... سب کر سکتا تھا... تمھارا... اس میں... کوئی قصور نہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک ہچکی لی اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

شاہ اسفندیار نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر لیلیٰ کی طرف نم آنکھوں سے دیکھتے ہُوئے کہا۔ "اسے شاہی اعزاز کے ساتھ ایک ملکہ کی طرح، ملکہ ہی کے پہلو میں دفن کیا جائے گا۔ اس نے وہی کچھ کیا ہے جو اِن حالات میں ایک ملکہ کرتی۔"

... پھر وہ بالکونی کی طرف بڑھا اور شہر پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ "ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ وہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے جو اُس نے اور تم نے شروع کیا تھا۔"

اگلے تین روز میرا اور شاہ اسفندیار کا بیشتر وقت جنگی جمعیت کے اجلاسوں میں گزرا۔ شیرکوہ نے شاہ پر قاتلانہ حملہ اس وقت ہی کروایا ہوگا جب وہ قزاقوں کو بلا چکا ہوگا اور وہ پہنچنے والے ہوں گے۔ چنانچہ غور طلب مسئلہ یہ تھا کہ مملکت کو قزاقوں کی تاخت و تاراج سے کیسے بچایا جائے؟ ایک تازہ ترین اطلاع کے مطابق قزاق چار سو جنگی جہازوں اور کشتیوں پر مشتمل بیڑا لے کر برقون سے روانہ ہو چکے تھے اور وہ دو تین ہفتوں کے اندر فارش پہنچ سکتے تھے۔ اب اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ دیگر تین مملکتوں سے دفاعی معاہدے کیے جاتے۔ چھ سو میل لمبے ساحلی علاقے کی حفاظت کے لیے اگر فوج پھیلا دی جاتی تو دفاع کے اعتبار سے یہ بہت بڑی غلطی ہوتی، اگر قزاق اس علاقے میں کسی ایک مقام پر حملہ کرتے تو سپاہ کو یکجا کر کے وہاں تک لانے سے پہلے ہی وہ آگے بڑھ کر بہت سے شہروں کو لوٹ چکے ہوتے اور بکھری ہوئی سپاہ کے دستوں کو بھی تباہ کر ڈالتے۔

ان تمام حقائق کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے تجویز پیش کی کہ کسی طرح قزاقوں کو کسی ایسے علاقے میں ساحل پر آنے کے لیے مجبور کر دیا جائے جہاں ہماری بحری اور بری سپاہ خاصی تعداد میں موجود ہو... مگر قزاقوں کو اس کی موجودگی کا علم نہ ہو۔ اس طرح ہماری سپاہ انھیں بڑی آسانی سے ہمیشہ کے لیے تہس نہس کر دے گی۔

میری اس تجویز پر ایک نوجوان کمان دار نے بتایا کہ راج دھانی کے شمال میں ایک بڑا دریا ہے جس کے کنارے گھنے جنگل واقع ہیں؛ اگر ہمارے جہاز سمندر سے اُس دریا میں چلے جائیں تو قزاق انھیں نہیں دیکھ سکیں گے اور جنگل میں چھپی ہوئی سپاہ کا بھی انھیں پتہ نہیں چلے گا۔

"تمھاری تجویز تو معقول ہے کمان دار۔" میں نے کہا۔ "لیکن بوقتِ ضرورت دریا سے ہمارے کتنے جہاز ایک ساتھ سمندر میں آسکیں گے؟"

"موجودہ صورت میں تو وہ ایک ایک یا دو دو کر کے نکل سکتے ہیں لیکن اگر ہم مزید راستے بنا لیں تو حسبِ ضرورت، جہازوں کو اندر اور باہر لایا جا سکے گا۔ راستے بنانا کوئی مشکل کام نہیں کیوں کہ ہماری سپاہ بڑی آسانی سے ریت ہٹا کر دریا کی شاخوں کو جہاز رانی کے قابل بنا سکتی ہے۔"

مشاورتی جماعت کے عہدے داروں نے یہ تجویز قابلِ عمل قرار دیتے ہوئے منظور کر لی لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ قزاقوں کو اس طرف جانے کے لیے کیسے مجبور کیا جائے؟

"اگر یہ مشہور کر دیا جائے کہ شاہی خزانہ اور عوام کی دولت شمال کے کسی شہر منتقل کر دی گئی ہے تو قزاق اُدھر کا رُخ کر سکتے ہیں اور اُن پر عقب سے حملہ بھی کیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر شیرکوہ زندہ ہوتا تو ہم اُس سے یہ جھوٹ بول دیتے اور وہ اُسے سچ سمجھ کر قزاقوں کو آگاہ کر دیتا۔" شاہ اسفندیار نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "اب تو یہی ہو سکتا ہے کہ شیرکوہ کی طرف سے یہ پیغام قزاقوں تک پہنچا دیا جائے۔"

"میں آپ سے اختلاف کی جسارت پر معافی چاہتا ہوں... عالی جاہ!" میں نے کہا۔ "شیرکوہ کی موت کی خبر عام ہو چکی ہے جو قزاقوں تک ضرور پہنچے گی لہٰذا وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ ان کے ساتھ چال چلی جا رہی ہے۔ انھیں شمال میں تمام خزانے کے منتقل ہونے کا یقین اس صورت میں دلایا جا سکتا ہے کہ میں ایک کشتی میں خود ہی اُن سے جا ملوں۔"

"تم اُن کے پاس جاؤ گے، سرفروش؟" شاہ نے تعجب سے پوچھا۔ "وہ تمھیں قتل کر دیں گے کیوں کہ تم نے اُن سے غداری کی ہے!"

"وہ بے شک ایسا کر سکتے ہیں، جہاں پناہ... مگر میں انھیں یہ یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ محض جاسوسی کے لیے غداری کی تھی جو دراصل قزاق برادری کی خدمت ہے اور اس کے ثبوت میں، میں جھوٹے کاغذات اور نقشے لے جاؤں گا۔ مجھے پوری توقع ہے کہ وہ دھوکے میں آجائیں گے۔"

"لیکن ہم تمھاری زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے، سرفروش!" شاہ اسفندیار بولا۔

"موت تو ایک نہ ایک دن آنی ہی ہے، جہاں پناہ۔ اگر میری موت سے بہت سی جانیں اور فارش تباہ ہونے سے بچ جائے تو وہ موت نہیں بلکہ میری زندگی ہوگی۔"

یہ میرا جواب تھا۔

▼

جنگی مجلس نے یہ منصوبہ منظور کر لیا۔ بحریہ کے جہاز، شمال کی طرف جانے لگے۔ فوجیں بھی اُدھر منتقل ہونے لگیں اور شہریوں کے ہتھیار اُنھیں واپس کر دیے گئے۔ چونکہ شہر کے گرد مضبوط فصیل موجود تھی، اس لیے وہاں زیادہ سپاہ کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ مشہور کرنے کے ساتھ ساتھ کہ خزانہ شمال کے ایک شہر تاران میں منتقل کیا جا رہا ہے، شہریوں کو خبردار کر دیا گیا کہ بوقتِ ضرورت انھیں بھی دفاعی جنگ لڑنا پڑے گی اس لیے وہ بھی جوش و خروش کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔

میں ہر صبح فرح کے ساتھ شہر کے سب سے اُونچے بُرج پر جاتا اور سمندر کی طرف دیکھتا رہتا۔ مجھے قزاقوں کے بیڑے کا انتظار تھا کہ وہ

آتا دکھائی دے تو میں ایک کشتی میں اُس سے جا ملوں۔ فرح اُس وقت کے تصور سے مغموم ہو جاتی تھی اور بعض اوقات تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بھی جھلملانے لگتے تھے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی تھی اور اس نے میرے دل پر لگا ہوا لالہ رُخ کی جُدائی کا زخم بھر دیا تھا۔ کبھی کبھی تو میں یہ سوچتا تھا کہ اب کبھی اپنے دور اور اپنی سرزمین پر واپس نہ جاؤں اور باقی زندگی فرح کی چاہت کی چھاؤں میں بسر کر دوں لیکن مستقل طور پر یہاں رہنا بھی میرے بس کی بات نہیں تھی اور قزاقوں کو دھوکا دینے کے لیے اُن کے پاس جانا بھی ضروری تھا جو مجھے موت کے گھاٹ اُتار سکتے تھے۔

... اور پھر ایک روز یہ اطلاع بھی مل گئی کہ قزاقوں کا بیڑا صرف ایک روز کی مسافت پر رہ گیا ہے۔ آنے والی رات میرے اور فرح کے لیے جُدائیاں سمیٹ لائی۔ فرح روتی رہی اور میں اُسے جھوٹی تسلیاں دیتا رہا۔ فرح سے پہلے بھی میری زندگی میں بہت سی لڑکیاں آئی تھیں لیکن کوئی بھی لالہ رُخ کی نعم البدل ثابت نہیں ہو سکی تھی۔ انھیں جسم کی پُکار نے میری طرف بڑھنے پر مجبور کیا تھا لیکن فرح نے لالہ رُخ کی طرح رُوح کی گہرائیوں سے مجھے چاہا تھا۔ مجھے بھی اُس کے رُوپ میں اپنی گم گشتہ محبت مل گئی تھی لیکن حالات بڑی تیزی سے ہمارے درمیان جُدائی کی فصل اُگا رہے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے مقدر میں زندہ لوٹ آنا لکھا ہے یا نہیں اس لیے میں رات بھر نہ سو سکا اور پو پھٹتے ہی گودی کی طرف روانہ ہو گیا۔

سلطان، جسے شاہ اسفندیار نے کمان دار بنا دیا تھا، اپنی کشتی 'صاعقہ' پر میری راہ دیکھ رہا تھا۔

صبحِ کاذب کی روشنی پھیلنے سے پہلے 'صاعقہ' اپنے سفید اور نیلے بادبان پھیلائے سمندر کی آغوش میں آ چکی تھی۔

دوپہر کے وقت ہمیں قزاقوں کا بیڑا دکھائی دے گیا۔ کچھ دیر بعد اُفق پر اُن کے جہازوں اور کشتیوں کے بادبانوں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے سلطان کو صُلح کا سفید جھنڈا بلند کرنے کے ساتھ ساتھ قزاقوں کا پرچم بھی مستول کے اُوپر باندھنے کا حُکم دیا اور خود ہتھیار بند ہونے کے لیے نیچے کیبن میں چلا گیا۔

جب میں تیار ہو کر دوبارہ عرشے پر آیا تو دیکھا کہ قزاقوں کی دو کشتیاں قطار سے الگ ہو کر ہماری کشتی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ مجھے یہ پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ اُن میں سے ایک شہلا کی 'بحری چڑیل' ہے۔ سلطان نے اپنے آدمیوں کو بھی مسلح ہونے کا حُکم دے دیا کیوں کہ بقول اُس کے شہلا ایسی عورت ہے جو انتقام یا مالِ غنیمت کے لالچ میں اندھی ہو جاتی ہے اور تب وہ قزاق برادری کے قوانین کی بھی پروا نہیں کرتی۔

چند لمحے بعد جب بحری چڑیل اور قریب آگئی تو میں نے دیکھا کہ شہلا اُس کے عرشے پر کسی بُت کی مانند ساکت کھڑی ہے۔ اس کا عملہ بھی اُس کے پیچھے منجمد سا کھڑا تھا۔ وہ سب ہتھیار بند تھے۔ شہلا مجھے پہچان کر چلائی۔ "کہو سرفروش! غداری سے تمھیں کیا حاصل ہوا؟"

"تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں نے غداری کی ہے؟"

"تم نے شیرکوہ اور اس کے آدمیوں کو چُن چُن کر موت کے گھاٹ اُتارا پھر بھی یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ تم نے قزاق برادری سے غداری نہیں کی۔ شیرکوہ ہمیں مملکت فارش، کسی بھُنی ہوئی مرغی کی طرح طشتری میں سجا کر دینے والا تھا... مگر تم نے اُسے قتل کر دیا غدار!"

میں نے دیکھا کہ اُس کے عملے نے تلواروں کے دستوں پر ہاتھ رکھ لیے ہیں اور تیر اندازوں نے تیر چلوں پر چڑھا لیے ہیں مگر میں اُن کی طرف توجہ دیے بغیر شہلا سے مخاطب ہوا۔ "شیرکوہ جس طرح فارش سے غداری کر رہا تھا، اُسی طرح قزاق برادری سے بھی غداری کا مرتکب ہو رہا تھا۔ قزاق برادری اُس کی وجہ سے تباہ ہو جاتی۔"

یہ سُن کر شہلا تعجب سے مجھے دیکھتی رہ گئی۔

میں نے بات جاری رکھی۔ "شیرکوہ قزاق برادری کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر فارش پر حکمرانی نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ وہ قزاق برادری سے اپنے دُشمنوں کا قلع قمع کرانے کے بعد خود قزاقوں پر ٹوٹ پڑتا اور پھر فارش کا نجات دہندہ بن کر حکومت کرتا۔ میرے پاس ان حقائق کا دستاویزی ثبوت ہے۔" میں شہلا کے تاثرات سے تو کوئی اندازہ نہ لگا سکا لیکن اُس کے آدمیوں نے کوئی جنبش یا کوئی حرکت نہیں کی اور خاموش کھڑے رہے پھر شہلا نے بھی انھیں اشارہ کر دیا کہ وہ حملہ نہ کریں۔

"تم نے صلح کا پرچم بلند کر رکھا ہے۔ اس لیے کمان داروں کی

انجمن سے مذاکرات لازمی ہوگئے ہیں۔ ورنہ میں، تم سب سمیت کے پرخچے اُڑا دیتی۔ اپنی کشتی، میری کشتی کے پیچھے پیچھے لے آؤ۔"

ہماری کشتی 'بحری چڑیل' کے پیچھے چلنے لگی جب کہ دو کشتیوں نے دائیں بائیں سے ہمیں نرغے میں لے لیا۔ ہم تقریباً آدھ گھنٹے تک قزاقوں کی کشتیوں کی قطار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ میں اُن میں سے بہت سی کشتیوں اور ملاحوں کے بارے میں جانتا تھا۔ وہ لوگ ہماری طرف بڑے تعجب سے دیکھتے رہے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہماری کشتی پر قزاقوں کے پرچم کے ساتھ ساتھ سفید جھنڈا کیوں لہرا رہا ہے۔

اَب تک ہم ہراول دستے کی کشتیوں کے پاس سے گزرتے رہے تھے۔ اس دستے کے بعد جنگی ...ں کا بیڑا تھا جو تاحدِ نگاہ پھیلا ہُوا تھا۔

شہلا کی کشتی ایک بہت بڑے جہاز کے پاس رُک گئی جس پر کمان داروں کی انجمن کا سبز و سفید پرچم لہرا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے عرشے پر مسلح قزاق، ملاحوں کے ساتھ ساتھ انجمن کے پُورے ارکان بھی جنگی وردی میں ملبوس کھڑے ہیں۔

جہاز سے رسّے کی سیڑھیاں نیچے پھینک دی گئیں۔ میں اور شہلا اُوپر چلے گئے۔ اَب پتہ چلا کہ کپتانوں کے ساتھ اُوپر سے جھانکنے والے ملاح نہیں بلکہ کرائے کے سپاہی تھے۔ اَب میں شہلا کے تاثرات بھی پڑھ سکتا تھا۔ اس کے چہرے سے بدگمانی، نفرت اور غصّے کا اظہار ہو رہا تھا۔ میرے لیے اس کے سینے پر سجا کمان داروں کی انجمن کا نشان بھی تعجب خیز تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اُس انجمن کی رُکن بن چکی تھی اور یقیناً اس کی رائے وزن بھی رکھتی ہو گی۔

انجمن کے صدر نے رسمی کارروائی کے بعد شہلا سے کہا کہ وہ مجھ پر فردِ جُرم عاید کرے۔

شہلا نے نفرت سے میری طرف دیکھا اور زہریلے لہجے میں بولنے لگی "برادر کمان دارو! جانتے ہیں کہ یہ ایک کمان دار اور اس کے دو نائبوں کو قتل کر کے برقون سے فرار ہو گیا تھا۔ اس نے شیرکوہ اور اُس کے خاص آدمیوں کو چُن چُن کر قتل کیا ہے اور اس طرح قزاق برادری سے غدّاری کا مرتکب ہُوا ہے جس کی سزا اذیت ناک موت ہے۔"

اَب مجھے اپنی صفائی میں بولنے کا موقع دیا گیا۔

"یہ دُرست ہے کہ میں ایک کمان دار اور اُس کے دو نائبوں کو قتل کر کے برقون سے فرار ہُوا تھا لیکن یہ سب کچھ میں نے اپنے دفاع میں کیا تھا کیوں کہ وہ لوگ میرے مکان پر مجھے قتل کرنے آئے تھے اور حملے میں پہل انھوں نے ہی کی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرا فرار کا فیصلہ غلط تھا اور مجھے برادری کے سامنے پیش ہو کر انصاف کا طالب ہونا چاہیے تھا لیکن مجھ پر غدّاری کا الزام سراسر غلط ہے۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو فارش پہنچنے پر قزاق ہونے کے جُرم میں قید کر دیا گیا تھا۔ اگر ہم غدّار ہوتے تو ہمارا استقبال کیا جاتا، ہمیں زندان میں نہ ڈالا جاتا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو قید و بند سے نجات دِلانے کے لیے شاہی سُورما کا مقابلہ کیا اور جب ہمیں آزادی مل گئی تو پتہ چلا کہ شیرکوہ صرف اسفندیار سے ہی نہیں بلکہ قزاق برادری سے بھی غدّاری کر رہا ہے۔ وہ دُہری چال چل رہا تھا تاکہ اسفندیار کی فوج سے قزاقوں کو ٹکرا کر دونوں کو تباہ کر دے اور خود مزے سے حکومت کر سکے۔ چنانچہ میں نے قزاق برادری کے مفاد میں اُسے شکست دی اور قزاقوں کو اُس کی چال کا شکار ہونے سے بچا لیا۔"

"تمھارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے؟" صدر نے سوال کیا۔

"ہاں۔۔" میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔

"پھر اُسے انجمن کے سامنے پیش کرو۔"

اس سے پہلے کہ میں جعلی کاغذات پیش کرتا، شہلا نے مجھ سے کہا "یاد رکھو سرفروش۔ اگر کوئی بات جھوٹی نکلی تو تمھارے پرخچے اُڑا دیئے جائیں گے۔"

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے شہلا۔ میں اَب بھی قزاق برادری کا ایک فرد ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے تم خود جھوٹ بول کر بہت کچھ چھپا رہی ہو۔ یہ تو بتاؤ کہ کتنے کمان دار ناگ دیویوں کی حکومت بحال کرنے کے لیے تمھارا ساتھ دیں گے؟ تو میں دیتا۔"

شہلا یہ سُن کر بوکھلا گئی۔

میرا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔

"شہلا مجھے غدّار سمجھتی ہے۔ اگر میں غدّار ہوتا تو بہت بڑا شاہی عہدہ چھوڑ کر آپ لوگوں کے پاس کیوں آتا، وہ دستاویز اور نقشے کیوں لاتا جن کی مدد سے خزانہ لُوٹا جا سکتا ہے۔" میں نے کمانداروں سے کہا۔

میری اس دلیل کا ان پر خاصہ اچھا اثر پڑا لیکن انھوں نے تقریباً دو گھنٹے تک جرح جاری رکھی اور مجھ سے حالات پوچھتے رہے۔ میں جانتا تھا کہ راج دھانی میں ہونے والے سارے واقعات سے وہ بخوبی آگاہ ہوں گے اس لیے میں انھیں صاف صاف بتاتا رہا کہ راج دھانی میں کیا ہو رہا ہے۔ بحریہ کے جہاز کس سمت گئے ہیں، اور خزانہ کہاں منتقل کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ میں نے انھیں یہ

...بتایا کہ بحریہ بے حد کمزور ہے۔ کمان داروں نے شاہ کو صاف صاف ...بتایا تھا کہ وہ قزاقوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بہتر یہ ہو گا کہ وہ اپنے جہاز ...چھپا لیں اور جب قزاق لُوٹ مار کر کے چلے جائیں تو وہ جہاز ...نکال لے آئیں اس طرح کم از کم جہاز تو قزاقوں کی تاخت و تاراج ...سے بچ جائیں گے۔"

میری اس بات پر قزاقوں نے قہقہہ لگایا۔

"کتنا خزانہ تاران منتقل کیا گیا ہے؟" صدر نے پوچھا۔

"میں یقین سے نہیں بتا سکتا، البتہ سُننے میں آیا تھا کہ سونے ...بیس کروڑ سکّے بھیجے گئے ہیں۔ جن گاڑیوں میں خزانہ بھیجا گیا تھا، ...کا قافلہ ڈھائی تین میل لمبا تھا اور متعدد لشکری دستے اُس کی ...حفاظت کر رہے تھے۔" حقیقت یہ تھی کہ ان گاڑیوں میں سامانِ رسد ...بھیجا گیا تھا مگر حفاظتی اقدامات اس طرح کیے گئے تھے جیسے خزانہ ...بھیجا جا رہا ہو۔

"ہُوں۔۔" ایک اعلا کمان دار بولا "مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ...وہ یہ خزانہ ہمارے حوالے کرنا چاہتے ہوں اور اگر یہ سارا خزانہ ہمارے ...ہاتھ لگ جائے تو۔۔"

"ہمیں نہ تو ان کے جہاز جلانے کی ضرورت پڑے گی اور نہ ہی ...فوج سے مقابلہ کرنے کی۔" صدر نے اُس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا "خزانہ ...کے بعد شاہ اتنا مفلوج ہو جائے گا کہ ہم آیندہ سال زیادہ نفری ...کے ساتھ آ کر بڑی آسانی سے اُس کا خاتمہ بالخیر کر سکیں گے۔"

"یہ بعد کی باتیں ہیں۔" شہلا بولی "وہ خزانہ شمال کی طرف کس ...نام پر بھیجا گیا ہے؟"

"جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، وہ اُسے کسی ایک ...نام یا شہر میں نہیں رکھیں گے۔ میں نے ایک نقشہ چُرایا ہے جس میں ...علاقہ دِکھایا گیا ہے جہاں خزانہ منتقل کیا گیا ہے مگر اس علاقے میں ...شہر واقع ہیں۔"

"وہ نقشہ کہاں ہے؟"

"میری کشتی میں۔" میں نے جواب دیا۔

کچھ آدمی نقشہ لینے کے لیے میری کشتی پر چلے گئے اور کچھ اشیائے ...خورد و نوش لے آئے۔ انجمن کے اعلا کمان دار نے مجھے بھی کھانے ...میں شریک کر لیا۔ اس دوران وہ سب نقشہ بھی دیکھتے رہے۔ جب ...کھانا ختم ہو گیا تو کمان دارِ اعلا نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔

"قزاق برادری کے قانون کے مطابق اَب اس مسئلے پر رائے ...شماری ہو جانی چاہیے کہ ہم منتقل شدہ خزانہ حاصل کرنے کے لیے ...شمال جاتے میں جائیں یا نہ جائیں۔"

رائے شماری میں اُنیس کمان داروں نے شمال کی طرف جانے اور چھ نے نہ جانے کا فیصلہ دیا۔ جب اکثریت کا فیصلہ منظور کر لیا گیا تو میری جان میں جان آئی۔

ابھی میں پُوری طرح اطمینان کی سانس بھی نہ لے پایا تھا کہ شہلا بول اُٹھی "برادر کمان دارو! تم نے اس شخص کی اطلاعات پر بھروسا کرتے ہُوئے شمال میں جانے کا فیصلہ تو کر لیا ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ شخص ہمارے ساتھ غدّاری کرتے ہُوئے پھر شاہ اسفندیار سے نہیں جا ملے گا؟ اس لیے یہ فیصلہ ابھی ہو جانا چاہیے کہ سرفروش کس کی نگرانی میں رہے گا؟"

"کیا تم اس کی نگرانی کی ذمّے داری قبول کرنے کو تیار ہو۔۔؟" کمان دارِ اعلا نے پوچھا۔

"ہاں۔۔ میں تیار ہُوں۔" شہلا نے جواب دیا۔

بہت سے کمان دار بے ساختہ ہنس پڑے اور شہلا کے چہرے پر غم و غصّے کی پرچھائیاں تیر گئیں۔

کچھ دیر بعد جب میں جہاز کے عرشے پر آیا تو چار مسلح سپاہی میرے دائیں بائیں آ گئے۔ میں نے دیکھا کہ بارہ لشکری اور کچھ ملاح رسّی کی سیڑھی سے اُتر کر میری کشتی میں جا رہے ہیں۔ اب گویا میں اور میری کشتی، شہلا کی تحویل میں تھے۔

میں غصّے کے مارے کھول اُٹھا لیکن بہتری اسی میں تھی کہ خاموش رہوں۔ میرا مقصد پُورا ہو چکا تھا۔ قزاقوں کا بیڑا اَب شمال کی طرف جا رہا تھا۔

میں جانے کے لیے پلٹا تو دیکھا کہ شہلا میرے سامنے کھڑی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو گہری نظروں سے دیکھتے رہے۔

"کمان دار تو وہ سونا بانٹنے میں مصروف ہیں جس کا میرے خیال میں کوئی وجود ہی نہیں ہے لیکن شہلا خوش آئند خیالوں سے بہلنے

والی عورت نہیں ہے، سرفروش! تم بار بار مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ اگر اس بار بھی تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو تمھارے حق میں بہت بُرا ہوگا۔ اگر میں مر بھی گئی تو میرے ساتھی تمھیں نہیں بخشیں گے۔" یہ کہتے ہُوئے شہلا نے سمندر کے پانی پر نظر ڈالی۔

مَیں نے اُس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو میری ہڈیوں میں خوف کی لہر اُترتی چلی گئی۔ اس وقت بھی جہاز کے ساتھ ساتھ ویسی ہی لکیریں اُبھر رہی تھیں جیسی مَیں ایک بار پہلے بھی دیکھ چُکا تھا... وہی سمندری مخلوق اَب بھی شہلا کی ہم سفر تھی جس نے فردزاں کا خزانہ لُوٹنے کے لیے اس کی رہنمائی کی تھی۔

▼▼

ساتویں روز ہمیں وہ سرسبز پہاڑیاں دِکھائی دے گئیں جو اس دریا کے دہانے کے عقب میں واقع تھیں جس کے ذریعے فارش کی بحریہ کا بیڑا اندر، دریا میں جا کر چُھپا ہُوا تھا۔ نقشے کے مطابق اس کے بعد کے علاقے میں شاہی خزانہ منتقل کیا گیا تھا۔

قزاقوں کے بیڑے نے دریا کے دہانے سے گزرنے کے بعد لنگر ڈال دیئے اور جو کشتیاں ساحل تک جا سکتی تھیں، کنارے جا لگیں۔ آٹھویں روز تیس ہزار قزاق ساحل پر اُتار دیئے گئے۔

مجھے پرچم بردار جہاز پر پابند کر دیا گیا اور ہماری کشتی اُسی جہاز کے ساتھ باندھ دی گئی۔

نویں دِن جب مَیں صبح ناشتے کے انتظار میں عرشے پر ٹہلتا ہُوا سوچ رہا تھا کہ فارش کے جو جہاز عقب سے حملہ کرنے والے تھے، وہ ابھی تک دریا کے دہانے سے برآمد کیوں نہیں ہُوئے؟ کیا فارش کے کمان دار، قزاقوں کا بیڑا دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ مَیں انھی سوچوں میں گھرا ہُوا تھا کہ مجھے شہلا کی 'بحری چڑیل' قریب سے گزرتی دِکھائی دی۔ شہلا نے ہاتھ لہرا کر پرچم کو سلام کیا اور مجھے دیکھ کر رُخ پھیر لیا۔

مجھے ایک لمحے کے لیے پھر اُسی سمندری مخلوق کا خیال آ گیا، جسے شہلا اپنے ساتھی کہتی تھی مگر میں یہ خیال ذہن سے جھٹک کر پھر اُنھی سوچوں میں ڈوب گیا کہ آخر فارش کی فوجیں کس بات کا انتظار کر رہی ہیں؟ تیس ہزار قزاق ساحل پر اُتر کر چار حصّوں میں تقسیم ہونے کے بعد چار مختلف مقامات کی طرف بڑھ گئے تھے مگر ابھی تک کہیں سے بھی یہ اطلاع نہیں آئی تھی کہ اُن کا فارش کی فوج سے تصادم ہُوا ہے، البتہ کہیں کہیں سے بلند ہونے والے دھوئیں کی لکیریں یہ بتا رہی تھیں کہ قزاقوں نے وہاں سے گزرتے ہُوئے، بستیوں کو آگ لگا دی ہے۔

اتنے میں ایک ملاح میرا ناشتہ لے آیا۔

مَیں وہیں عرشے پر بیٹھ کر وہ بدمزا ناشتہ کرنے لگا۔ میرا نگران سپاہی جنگلے سے لگا آبی پرندوں کا نظارا کر رہا تھا اور سامنے ایک ملاح رنگ کی بالٹی لیے منجنیق کے پایوں پر رنگ کرنے میں مصروف تھا۔

ناشتہ کرتے ہُوئے اچانک میری نگاہ دریا کے دہانے کی طرف اُٹھی تو مجھے ایک جہاز سے دُھواں اُٹھتا دِکھائی دیا جو ساحل کے قریب ہی لنگر انداز تھا... پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے دو اور جہازوں سے دُھواں اور شعلے بلند ہونے لگے۔ اَب مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ فارش کے فوجی دریائی دہانے کے ٹیلوں کی اوٹ سے منجنیقوں کے ذریعے اُن جہازوں پر جلتے ہُوئے تیل کی ہانڈیاں پھینک رہے ہیں۔ اگر مجھے قزاقوں کی قید سے نجات حاصل کرنا تھی تو اس سے بہتر کوئی وقت نہیں ہو سکتا تھا۔ ذرا سی تاخیر میرے اور میری کشتی کے عملے کے لیے موت کا پیغام لا سکتی تھی۔ اس وقت میرے پاس کھانے کی چُھری کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مَیں نے اپنے نگران سپاہی کی طرف دیکھا جو اَب تک جنگلے پر جُھکا ہُوا تھا۔

مَیں تیزی سے اُس کی طرف لپکا۔ ایک ہاتھ اُس کی تلوار کے دستے پر رکھا اور دوسرے سے اُسے دھکا دے کر سمندر میں پھینک دیا۔ اَب میں سیدھا اُس ملاح کی طرف بڑھا جو رنگ کرنے میں مصروف تھا۔ مَیں نے رنگ کی بالٹی اُٹھائی اور اُسے چمنی میں پھینک دیا جو نیچے باورچی خانے تک جاتی تھی اور جہاں اس وقت باورچی، ناشتہ تیار کر رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں چمنی سے گاڑھے دُھوئیں کے ساتھ شعلے بھی دِکھائی دینے لگے۔ اتنے میں تین ملاح تلواریں سونتے میری طرف لپکے لیکن وہ میرے سامنے ٹِک نہ سکے۔ مَیں نے پہلے ملاح کا وار نگران سپاہی کی تلوار سے روک کر اُسے پیچھے آنے والوں پر دھکیل دیا۔ تینوں گِرے تو میری تلوار نے انھیں اُٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ پھر میں رسّے کے رستے سے پھسلتا ہُوا نیچے اُترا اور اپنی کشتی پر کُود گیا۔

اس وقت چند ملاح کشتی کے عرشے کو دھو رہے تھے اور دو سپاہی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ میری طرف لپکتے ہُوئے آئے تو مَیں نے ایک ملاح سے بالٹی چھین کر آگے آنے والے سپاہی پر دے ماری۔ وہ گرا تو اُس کے ہاتھ سے تلوار چُھوٹ گئی... دوسرے کو مَیں نے جھجکتے پایا تو اُسے تلوار لہرا کر اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر لات مار کر گرا دیا۔ پہلے سپاہی کی تلوار، جو اَب سلطان کے ہاتھ میں آ چکی تھی، دوسرے کا کام بھی تمام کر گئی۔

"کشتی کے رسّے کاٹ دو اور اسے ساحل کی طرف لے چلو۔" مَیں نے سُلطان سے کہا۔

سُلطان وہ رسّے کاٹنے لگا جن سے کشتی بندھی ہُوئی تھی۔ ملاح نیچے بھاگے تاکہ پتوار چلانے والوں کو خبردار کر سکیں مگر اُوپر آنے والے

ایک سپاہی نے یہ منظر دیکھ کر دوسرے سپاہیوں کو خبردار کر دیا جو نیچے ناشتہ کر رہے تھے۔ مَیں سیڑھیوں کی طرف بھاگا اور تلوار اس سپاہی کی پُشت میں گھونپ دی جو اپنے ساتھیوں کو خبردار کر رہا تھا۔ اُس کے ساتھی میری طرف لپکے تو میرے عملے نے اُن پر پیچھے سے چپوؤں کے ذریعے حملہ کر دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈھیر ہو گئے اور کشتی ساحل کی طرف چل پڑی۔

مَیں دوبارہ اُوپر کو دوڑا تاکہ حالات کا جائزہ لے سکوں۔

اَب ساحل کے قریب لنگر انداز قزاقوں کے بہت سے جہازوں میں آگ لگ چکی تھی اور بہت سے جہاز افراتفری میں لنگر اُٹھا رہے تھے۔ اُدھر دریا کے دہانے سے فارش کے بحری جہاز باہر آ رہے تھے۔ ان جہازوں کی منجنیقیں، پتھر اور کھولتے ہُوئے تیل کی ہانڈیاں برسا رہی تھیں۔ ہماری کشتی، ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں تھا۔ شاید قزاق یہ سمجھ رہے تھے کہ پرچم بردار جہاز میں آگ لگ جانے کے باعث ہماری کشتی آزاد کر دی گئی ہے کیوں کہ اَب پرچم بردار جہاز سے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ سُلطان اُوپر آیا تو مَیں نے کہا۔ "کشتی جنوبی سمت والے جہازوں کی طرف لے چلو۔ ہم ان جہازوں پر حملہ کریں گے۔"

وہ پھر نیچے چلا گیا۔

شہلا کی 'بحری چڑیل' کا کچھ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں ہے۔ اتنے میں ایک کشتی ہماری طرف بڑھتی دِکھائی دی۔ مَیں نے سلطان کو بُلایا اور اُسے سمجھا دیا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ جب وہ کشتی قریب آ گئی تو ہم نے اپنی منجنیق سے اُس پر سیسے کے گولوں کی بوچھار کر دی، جس سے اُس کے متعدد ملاح ہلاک ہو گئے تب انھیں پتہ چلا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اتنے میں سُلطان نے ایک جانب کے چپو کشتی کے اندر کھنچوا لیے۔ اب ہماری کشتی دوسری کشتی کے پہلو سے لگی ہُوئی گزری تو اُس کی ایک جانب کے چپو ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور وہ ہماری کشتی کی ٹکر سے دوسری طرف جُھک گئی۔ ہم نے چکر کاٹ کر دوبارہ اُسے ٹکر ماری تو وہ اُلٹ کر ڈوبنے لگی۔

ایک اور کشتی کے ساتھ بھی ہم نے یہی سلوک کیا اور تیسری کشتی پر، جلتے ہوئے رسّے کا گٹھا، منجنیق کے ذریعے پھینک دیا۔ کشتی نے آگ پکڑ لی اور اُس کا عملہ سمندر میں کُودنے لگا۔

ہم تھوڑی سی دیر میں قزاقوں کی تین کشتیاں تباہ کرنے پر مسرور اور چوتھے شکار کی تلاش میں تھے کہ اتنے میں سُلطان چلّا اُٹھا۔ "ہوشیار! 'بحری چڑیل' اِدھر آ رہی ہے۔"

مَیں نے پلٹ کر دیکھا، 'بحری چڑیل' جلتے ہُوئے پرچم بردار جہاز کے عقب سے نکل کر بڑی تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ شہلا کشتی کے اگلے حصّے میں بازو پھیلائے کھڑی تھی... پھر یکایک اُس نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے تو مَیں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ سطحِ آب سے پانچ سمندری بلاؤں نے سر نکالے اور وہ شہلا کی طرف دیکھنے لگیں۔ شہلا نے ایک ہاتھ سے ہماری کشتی کی جانب اشارہ کیا تو سُرخ انگارہ آنکھوں اور سبز کھپروں والی وہ اژدہا نُما بلائیں ہماری طرف دیکھنے لگیں... پھر اُن کے سر پانی میں ڈوب گئے اور سطحِ آب پر پانچ بڑی بڑی لکیریں اُبھریں، جن کا رُخ ہماری طرف تھا۔

ناگ دیوی شہلا نے سمندر کی گہرائیوں سے اپنے ساتھی بُلا لیے تھے۔

... پھر اُن پانچوں بلاؤں نے اپنے سر پانی سے نکال کر جبڑے کھول لیے۔ یہ نظارا بے حد دہشت ناک تھا لیکن اُسے دیکھ کر میرا خوف جاتا رہا اور مَیں اُن کا مقابلہ کرنے کی سوچنے لگا لیکن سلطان نے پہل کرتے ہوئے منجنیق کا رُخ اُن کی طرف موڑ کر فاصلے کا اندازہ کیا اور منجنیق چلا دی۔

سیسے کے گولوں کی بوچھار نے اُن پانچ میں سے ایک کو نشانہ بنا دیا۔ اُس کی باہر نکلی ہُوئی گردن کے کھپرے اور گوشت کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ اُس نے بڑے زور کی پھنکار ماری اور تڑپ کر غرقاب ہوتا چلا گیا۔

ایک اژدہے کی ہلاکت نے عملے کے حوصلے بلند کر دیئے۔ انھوں نے کمانوں میں تیر چڑھائے اور چلّے کھینچ کھینچ کر چلانے لگے۔ تیر اُن بلاؤں کو لگے مگر بے اثر ثابت ہُوئے اور اُچٹ کر پانی میں گر پڑے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے نیزے سنبھال لیے اور اُن کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے تھے۔

مَیں نے چلّا کر ہدایت دی۔ "اُن کی آنکھوں کو نشانہ بنایا جائے اور بحری چڑیل پر منجنیق سے حملہ کر دو۔"

جب اژدہے قریب آئے تو انھوں نے اپنے سر پانی کے اندر کر لیے اور پھر ہمیں یوں محسوس ہُوا جیسے ہماری کشتی اُلٹ جائے گی۔ وہ پانی میں ہماری کشتی کے نیچے سے اُبھر رہے تھے جس سے ہماری کشتی ایک دم ڈگمگانے لگی اور وہ ایک طرف جُھکی تو ملاحوں کے قدم بُری طرح اُکھڑ گئے۔

دو ملاح ریلنگ نہ تھام سکے اور پانی میں گر پڑے۔ دوسرے ہی لمحے دو اژدہوں نے انھیں نگل لیا۔

یہ نظارا دیکھ کر ملاح منجنیق پر یوں چڑھ گئے جیسے بندر کسی درخت پر چڑھ جاتے ہیں۔ صرف مَیں اور سُلطان ہی عرشے پر رہ گئے۔ اتنے میں ایک اژدہے نے سر نکالا اور بڑے زور سے منجنیق پر مارا تو منجنیق ٹوٹ

گئی اور اُس کے شہتیر اژدہے کے سر پر گر گئے۔ مَیں نے لپک کر اپنی تلوار اُس کی ایک آنکھ میں گھونپ دی۔

اژدہا تڑپا، اُس نے بڑے زور سے سسکاری لی اور سر پیچھے کھینچ کر سمندر میں غائب ہو گیا۔

اَب مَیں نے اور سُلطان نے کلہاڑے اُٹھا لیے۔ اتنے میں ہمیں اپنے پیچھے سے چیخ و پکار سُنائی دی، ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ تین ہاتھ موٹے اژدہا نے عرشے پر ایک ملاّح کو اپنے مُنہ میں لے رکھا تھا اور اُسے نگلنا ہی چاہتا تھا کہ دوسرے ملاّح نے مردانہ وار آگے بڑھ کر نیزے سے اژدہے کے سر پر وار کرنے شروع کر دیے۔ اژدہے نے پہلے ملاّح کو چھوڑ دیا اور اُس ملاّح کی طرف متوجہ ہُوا جو دیوانہ وار اُس کے سر پر نیزے سے وار کر رہا تھا۔ اتنے میں مَیں اور سلطان وہاں پہنچ گئے اور ہم نے کلہاڑوں سے اُس کے سر پر پے در پے وار کرنا شروع کر دیے۔ اژدہے کے سَر سے بدبُودار گاڑھا گاڑھا خون نکلنے لگا۔ خدا جانے وہ کتنا لمبا تھا کہ اپنے وزن سے لُڑھکتا ہُوا پانی میں گُم ہو گیا۔

اس وقت تک میرے دو ملاّح ہلاک اور ایک زخمی ہو چکا تھا۔ جب کہ شہلا کے تین ساتھی... یعنی تین اژدہے ہلاک ہو چکے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اَب وہ باقی دو کو واپس بُلا لے گی... مگر شاید اس پر خون سوار ہو گیا تھا۔ اُس نے دُور سے اپنے ہاتھ بُلند کیے اور پھر ایک دَم گرا دیے۔ چند لمحے بعد دو اژدہے پانی سے سَر اُٹھائے ہماری طرف بڑھے اور اپنے سر ہماری کشتی کے عرشے پر مارنے لگے۔ وہ اتنے بھاری تھے کہ کشتی اُن کے وزن سے پانی میں بیٹھنے لگی اور سطحِ آب سے صرف چند ہاتھ اُونچی رہ گئی۔ اُن کی ہر ضرب سے تختے چرچرا اُٹھتے تھے اور یُوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ بہت جلد ٹُوٹ جائیں گے۔

مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو پتہ چلا کہ عرشے پر اَب صرف مَیں اور سلطان ہی باقی رہ گئے ہیں۔ باقی سارا عملہ سمندر میں کُود کر جان بچانے کے لیے ساحل کی طرف جا رہا تھا۔

"اژدہے آدمیوں پر غالباً اسی وقت حملہ کرتے ہیں، جب وہ شہلا کی نگاہ میں ہوں۔ اگر ہم شہلا کو دِکھائی نہ دیں تو وہ ہم پر حملہ نہیں کریں گے۔" مَیں نے سُلطان سے کہا۔

"مگر اس وقت تو یہ بدبخت کشتی ڈبونے کی فکر میں ہیں۔" وہ بولا۔ "آؤ انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔" یہ کہہ کر وہ ایک اژدہے کی طرف لپکا اور اس پر وار کرنے لگا۔

مَیں دُوسرے اژدہے پر ٹوٹ پڑا۔ ہمارے کلہاڑوں کی ضربوں سے وہ کشتی پر سر پٹخنا بھُول گئے اور اس طرح مچلے کہ اُن کے جسموں کی ٹکر سے مَیں اور سُلطان اُچھل کر پانی میں جا گرے۔

اب اژدہے بڑی آسانی سے ہمیں نگل سکتے تھے لیکن اس خیال کے تحت کہ شاید شہلا کی نظروں سے اوجھل ہونے پر وہ میری طرف متوجہ نہ ہوں، مَیں پانی کے اندر ہی اندر تیرتا چلا گیا۔ جب میرا دَم ٹوٹنے لگا تو مَیں اُبھرا اور پانی سے سَر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مَیں ساحل کی طرف جانے کی بجائے متضاد سمت نکل آیا تھا۔ اژدہے اَب تک کشتی پر سر پٹخ رہے تھے جو اَب ڈُوبنے ہی والی تھی۔ سلطان مجھے کہیں بھی نظر نہ آیا تو مَیں بحریۂ فارش کی اُس کشتی کی طرف بڑھ گیا جس پر قزاقوں اور بحریہ کے جوانوں کے درمیان جنگ جاری تھی۔

جب مَیں سُکّان کا رَسّہ پکڑ کر کشتی پر پہنچا تو پتہ چلا کہ اُس کشتی کی دُوسری جانب قزاقوں کی ایک کشتی موجود ہے جس سے قزاق اُس کشتی پر کُود رہے ہیں۔ بحریۂ فارش کی کشتی کے بہت سے ملاّح مارے جا چکے تھے اور اُن کی لاشیں عرشے پر بکھری ہُوئی تھیں۔ مَیں نے ایک مُردہ ملاّح کی تلوار اُٹھائی اور قزاقوں پر ٹُوٹ پڑا۔

جب مجھ پر جنگی جنون طاری ہو جاتا ہے تو مجھے اپنا ہوش نہیں رہتا۔ اس جنگی جنون میں مَیں نے قزاقوں کی اُس ٹولی پر حملہ کر دیا جو اس کشتی پر کُشت و خون میں مصروف تھی۔

میرے ہاتھ پاؤں مشینی انداز میں چلنے لگے۔ میری ٹانگیں قزاقوں کو ٹھوکریں مار رہی تھیں اور تلوار اُن کی گردنیں اُڑا رہی تھی۔ اس حالتِ جنوں میں مجھے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ مجھ پر عقب سے حملہ نہیں ہو سکتا کیونکہ میری پُشت پر بحریہ کے جوان ہیں جن کے حوصلے میرے وہاں پہنچنے پر بُلند ہو گئے تھے۔

کچھ قزاق مجھے پہچان کر دوبارہ اپنی کشتی پر جانے لگے۔ اُن کا تعاقب کرتے ہُوئے مجھے شہلا دکھائی دے گئی جو دُوسری کشتی پر کھڑی تھی اَب مجھے احساس ہُوا کہ دُوسری کشتی 'بحری چڑیل' ہے۔

شہلا پر نگاہ پڑتے ہی میرے خُون میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ مَیں اندھا دُھند 'بحری چڑیل' پر کُود گیا۔ قزاقوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مَیں لٹّو کی طرح گھُوم کر اُن کے پرخچے اُڑانے لگا۔ میری کوشش تھی کہ جلد از جلد شہلا تک پہنچ جاؤں۔

شہلا نے جب اپنے ساتھیوں کو گاجر مُولی کی طرح کٹتے اور پسپا ہوتے دیکھا تو اُس نے اپنا خنجر میری طرف پھینکا۔ اگر مَیں ایک جانب ہٹنے میں ذرا سی بھی دیر کرتا تو وہ خنجر میرا بازو چھیدنے کے بجائے میرے سینے میں پیوست ہو گیا ہوتا۔

شہلا کی اِس حرکت نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ مَیں دھاڑتا ہُوا آگے بڑھا اور مزاحمت کرنے والے تین قزاقوں میں سے

…پیٹ میں لات ماری، دُوسرے کے نرخرے میں تلوار گھونپ… کی گردن پر کرانے کا ہاتھ رسید کیا... مگر جب راستہ صاف … نے کشتی سے چھلانگ لگا دی اور سمندر میں کُود گئی۔ مَیں نے … نے آنے والے مزید دو قزاقوں کا صفایا کیا اور پھر دوڑتا ہُوا … کُود گیا۔

…شہلا مجھ سے تقریباً بیس ہاتھ آگے تیزی سے تیرتی جا رہی … بیں اس کے خنجر سے، بازو پر لگنے والے زخم کی وجہ سے زیادہ … نہیں تیر پا رہا تھا۔ سمندر کے نمکین پانی نے مجھے احساس دلایا … جسم پر اور بھی متعدد چھوٹے چھوٹے زخم لگ چکے ہیں جن میں شدید … رہی تھی... مگر میں کسی قیمت پر بھی شہلا کو زندہ نہیں چھوڑنا … اگرچہ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ گھٹنے کی بجائے بڑھتا جا … مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور اس کا تعاقب جاری رکھا۔

…شہلا ساحل کی طرف جا رہی تھی اور میری نگاہیں اسی پر جمی ہوئی … میں اُسے یہ مہلت نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ پھر اُن سمندری بلاؤں … اگر وہ انھیں بلانے میں کامیاب ہو جاتی تو میری موت …

…یکایک میں نے دیکھا کہ شہلا نے تیرنا بند کر دیا اور وہ اُتھلے پانی … تھی۔ اُس کا بالائی دھڑ پانی سے اُوپر تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد … اس نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ … وں کو طلب کر رہی ہے میں نے اپنی تمام تر قوت سمیٹی اور … آگے بڑھنے لگا چند لمحے بعد اُس نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف … ۔ میں جان گیا کہ اس اشارے کے ساتھ ہی سمندری بلائیں … سطحِ آب سے بلند کر لیے ہوں گے اور اب تیزی سے میری طرف … ۔ اتنے میں میرے پاؤں بھی زمین سے لگ گئے میں ایڑی … لگا کر آگے بڑھنے لگا۔ جب میں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں … کر دیکھا۔

…واقعی دو اژدہے اپنے ہیبت ناک مُنہ پھاڑے تیزی سے … آ رہے تھے۔

…میں اندھا دُھند ساحل کی ریت پر بھاگتا چلا گیا لیکن تھوڑی … کر گر پڑا۔ میں نے پھر پلٹ کر دیکھا۔ اژدہے، شہلا کے … سے سر لگائے ہوئے تھے۔ شہلا نے میری طرف اشارہ کیا … ہوئے پانی سے نکل آئے۔ میں اُٹھا اور دوڑنے لگا۔ میرے … گڑھے بھی تھے اور ٹیلے بھی... مگر میں انھیں پھلانگتا چلا گیا … سامنے کچھ فاصلے پر ایک خیمہ نصب تھا۔ میں اس میں گھس گیا … میں تیل کے بہت سے ڈبّے رکھے ہوئے تھے۔ میں ان کے درمیان گھُستا ہُوا وسط میں پہنچا تو مجھے کچھ نیزے رکھے نظر آئے۔ میں نے جلدی سے تین نیزے اُٹھا لیے جو تقریباً دس ہاتھ لمبے تھے۔ اب میں کسی حد تک اژدہوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

میں نیزے لے کر خیمے سے نکل آیا لیکن اژدہے کہیں بھی دکھائی نہ دیے۔ میں ایک ٹیلے کی طرف بڑھا اور اس پر چڑھ کر ساحل کی طرف نگاہ ڈالی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شہلا اُسی طرح کھڑی ہے اور دونوں اژدہے اس کے سامنے کنڈل مارے بیٹھے ہیں شاید وہ اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ میں دِکھائی دوں تو وہ انھیں پھر میرے پیچھے لگائے

جونہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی، اُس نے اژدہوں کو اشارہ کیا یہ دیکھتے ہی میں نے ایک نیزہ اُس کی طرف پھینکا مگر نیزہ اس تک نہیں پہنچ سکا اور ریت میں گر گیا۔

اب دونوں اژدہے پھر رینگتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک اژدہا آگے تھا اور دوسرا پیچھے... اگلے اژدہے نے پھنکارنے کے لیے جیسے ہی مُنہ کھولا، میں نے دوسرا نیزہ اس کی طرف پھینک دیا۔ نیزہ اُس کے جبڑے میں گڑ گیا اور وہ بُری طرح اُچھلنے لگا۔ دوسرا اژدہا شاید زیادہ زخمی تھا اس لیے وہ سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اتنے میں میری نگاہ شہلا کی طرف اُٹھ گئی اور میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ سلطان آہستہ آہستہ پیچھے سے اُس کی طرف بڑھ رہا ہے... اور پھر اس نے اپنا خنجر اُس کی پیٹھ میں اتار دیا۔

شہلا نے ایک دلدوز چیخ ماری اور اژدہوں کو بُلانے کا اشارہ کیا مگر وہ اژدہا جسے میں نے نیزہ ملا تھا، تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا تھا جب کہ دوسرا اژدہا پلٹ کر شہلا کی طرف جانے لگا... یہ دیکھ کر میں چلایا "بھاگو سلطان!"

وہ میری آواز پر کاوا کاٹ کر ریت پر دوڑنے لگا۔ شہلا نے اژدہے کو اس کے پیچھے جانے کا اشارہ کرنے کے لیے ہاتھ اُٹھانا چاہا مگر چکرا کر گر پڑی اژدہے نے جو اس کے قریب پہنچ چکا تھا، اُسے ہی نگل لیا... اور پھر سمندر میں اُتر کر نگاہوں سے غائب ہو گیا۔

میں اطمینان کی سانس لے کر ٹیلے پر بیٹھ گیا۔

سلطان ہانپتا ہُوا آیا اور میرے قریب گر گیا۔ وہ بھی تھکن سے نڈھال تھا جب وہ قدرے دم لے چکا تو بولا "ہماری بحریہ نے تو کمال ہی کر دیا، سرفروش! قزاقوں کے ایک تہائی سے زیادہ جہاز جل چکے ہیں اور باقی نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔"

"بحری چڑیل، کا کیا ہُوا؟"

"معلوم نہیں... مگر سچ مچ کی بحری چڑیل، شہلا تو مر چکی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک جھرجھری لی۔ پھر بولا "اگر ناگ دیوتا…

ایسی ہوتی ہیں تو اچھا ہی ہُوا کہ ان کے مندر مسمار کر دیے گئے۔"

اتنے میں نشکری باجے کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں اور سلطان کھڑے ہو کر ان درختوں کی طرف دیکھنے لگے جہاں سے آواز آ رہی تھی۔ چند ہی لمحے بعد درختوں کی اوٹ سے فارش کی فوج کے دستے باہر آنے لگے۔ سب سے اگلے دستے کا کمانڈر بہزاد تھا۔ اُس نے ہمیں دیکھا تو دوڑتا ہُوا آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

"مبارک ہو، سرفروش۔ ہماری فوج نے قزاقوں کو شکستِ فاش دے دی ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "اور یہ سب تمھاری وجہ سے ہُوا ہے۔ شاہ اسفندیار تم سے بے حد خوش ہے۔ اُسے توقع نہیں تھی کہ تم قزاقوں سے بچ نکلو گے تاہم اس نے کہا تھا کہ اگر تم بچ گئے تو وہ تمھاری شادی اپنی بھتیجی فرح سے کر دے گا اور تمھیں اپنا ولی عہد بنائے گا۔"

"نہیں بہزاد۔ مجھے ولی عہد بننا منظور نہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ کیوں؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

اب میں اُسے کیا بتاتا اور کیسے بتاتا کہ کمپیوٹر مجھے کسی بھی وقت اپنے دَور اور اپنی سرزمین پر واپس بُلا سکتا ہے میں اُسے یہ کہہ کر ٹال گیا کہ میں صرف جنگجو بنا رہنا زیادہ پسند کرتا ہُوں۔

"شاہ اسفندیار نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم قزاقوں کے ساتھ گرفتار ہو جاؤ تو تمھیں راجدھانی بھیج دیا جائے لہٰذا تم روانگی کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"میں تیار ہُوں بہزاد۔" میں نے جواب دیا کیونکہ میں جلد از جلد فرح سے ملنا، اُسے دیکھنا چاہتا تھا۔

بہزاد نے فوراً ایک گاڑی کا بندوبست کیا۔ میں اُس میں سوار ہُوا اور تھکن کے مارے لیٹ گیا لیکن میرے ذہن پر فرح کی یادیں چھائی ہوئی تھیں۔ فرح، جس نے میرے دل کا گھاؤ بھر دیا۔ جو لالہ رُخ کے بعد میری محبت کے آسمان پر روشن ستارہ بن کر چمکی تھی۔ میں اس کے ساتھ گزارے اور آنے والے خوش بخت لمحوں کے تصوّر میں ڈوبا ہوا تھا کہ یکلخت میری کنپٹیاں سنسنا اٹھیں اور میرے سر میں شدید درد ہونے لگا شاید کمپیوٹر میری تلاش میں تھا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا لالہ رُخ کی طرح، میں فرح کی محبت سے بھی محروم رہ جاؤں گا کہ مجھے اپنا جسم پارہ پارہ ہوتا محسوس ہُوا، رگوں کی طنابیں کھنچنے لگیں اور پھر میں تاریک خلاؤں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆

ایک مشہور مقولہ ہے کہ انسان زنجیروں سے جکڑے جا سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ لیکن ان کی سوچوں پر پہرے بٹھائے جا سکتے... مگر ڈاکٹر فریدون نے یہ مقولہ غلط ثابت ... وہ جب چاہتا تھا، میری سوچوں پر پہرہ لگا دیتا تھا... بلکہ زیادہ موزوں ہوگا کہ اس نے میرے دماغ میں کا غدّہ ... ایک کرسٹل لگا کر میری سوچوں پر مستقل چوکی بٹھا دی تھی چوکی ہمارے درمیان رابطے کا کام بھی کرتی تھی۔ میرے دا... کرسٹل نصب کرنے کے لیے اس نے میری کھوپڑی کا آ... تھا اور اس آپریشن کے لیے مجھے اپنے سر کے بال منڈوا... تھے۔ اس دَور میں جبکہ مرد بھی لڑکیوں کی طرح لمبے بال ... ہیں، مجھے یُل برائنر بننا پڑا تھا۔ اپنے خوبصورت بال کٹو... مجھے مطلق احساس نہیں ہُوا تھا کہ بعد میں کوفت اور خو... کی ندامت بھی ہوگی۔ یہ احساس تو مجھے اُس وقت ہُوا ... فریدوں نے اپنے اس کرسٹل والے تجربے کو عملی طور ... کے لیے مجھے خیابانِ شیراز تک پیدل جانے کی ہدایہ...

میں خیابانِ شیراز پر ٹہلتا ہُوا جب قصرِ کسریٰ ... پر مُڑنے لگا تو اچانک مجھے اپنے دماغ میں ٹِک کی ... آواز اُبھرتی سُنائی دی اور میرے قدم قصرِ کسریٰ والی سڑ... بجائے شاہراہِ پہلوی کی طرف اُٹھنے لگے۔ میں چُپ چا... رہا۔ ہر بار ٹِک کی موہوم آواز کے ساتھ میرے قدم ا... کوئی موڑ مڑ جاتے۔ ایک بار تو ٹِک ٹِک۔ ٹِک ٹِک کے ... پُورا ہی گھوم کر پھر اُس راہ پر چل پڑا جس پہ چلا جا ر... سب اُسی کرسٹل کا کرشمہ تھا جو اَب اگرچہ میرے دما... جزو بن چکا تھا لیکن براہِ راست ڈاکٹر فریدوں کے ... منسلک تھا اور اُسی کی زیرِ ہدایت کام کر رہا تھا۔

یہ صُورتِ حال مجھے کچھ عجیب سی محسوس ہوتی ... چاہتا تھا... مگر دماغ اُس کی نفی کر دیتا تھا اور اپنی ... لیتا تھا۔ دل و دماغ کی اس کش مکش سے مجھے اُلجھن ہو... لگی اور میں سوچنے لگا کہ اگر میرا ذہن کمپیوٹر کے تابع ... وجود کا مقصد ہی کیا رہے گا؟ آدمی فرائض کی بجا آو... کچھ پابندیاں تو برداشت کر سکتا ہے... مگر اپنے ذہن ... مستقل حکمرانی قبول نہیں کر سکتا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ڈ... کو صاف صاف بتا دوں گا کہ مجھ سے یہ ذہنی غلامی ... نہیں ہو سکتی۔

میری سوچوں کا کارواں ابھی یہیں تک پہنچا ... کی آواز کے ساتھ یُوں محسوس ہُوا جیسے میرا ذہن ایک ...

...نے سوچا کہ مجھے کیفے شیراز جانا چاہیے۔ میں اُس راستے ... کرسٹل نے میرے قدم نہیں روکے اِس کا مطلب تھا کہ ڈاکٹر ... کے کمپیوٹر نے اسے میری سوچوں سے آگاہ کر دیا تھا اور ... میرے ذہن سے کمپیوٹر کی گرفت ہٹا لی تھی۔

...کٹر فریدوں نے جس مقصد کے لیے میرے دماغ میں وہ ... کیا تھا، اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہا تھا۔ وہ ... اس بار جب کمپیوٹر مجھے ماضی کے نادیدہ جزیروں میں ... میرے اور اُس کے درمیان رابطہ قائم رہے۔ کرسٹل نے ... اس خواب کو تعبیر بخش دی تھی۔

...ب میں کیفے شیراز میں داخل ہُوا تو وہاں موجود تقریباً سبھی ... نگاہیں میری طرف اُٹھ گئیں۔ میری جانب دیکھنے والوں ... لڑکیاں بھی شامل تھیں جن کی نگاہوں میں میرے لیے ... پیغام ہونے چاہئیں تھے... مگر اُن میں تعجب اور ... تبسّم تھا۔ میں یہ دیکھ کر کھول سا گیا اور آخری میز کی طرف ... اتنے میں مجھے کسی لڑکی کی سرگوشی جیسی آواز سُنائی ... "...یُل برائنر نہیں ہوتا۔"

...نے پلٹ کر دیکھا مگر متعدد میزوں پر لڑکیاں بیٹھی ... میں سے یہ آوازہ کس نے کسا تھا، یہ تو مجھے معلوم نہ ... اُن کے کھنکتے قہقہے میرے خون میں چنگاریاں سی ... ئے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے خواہ مخواہ کی ندامت بھی ... ئی اور میں قہوہ پینے کی بجائے کیفے شیراز سے باہر ...

...سی۔" میں نے چلا کر ایک ٹیکسی روکی اور سیدھا ڈاکٹر ... دفتر پہنچ گیا۔

...ندو تو کبڑا سائنس داں اُس وقت بڑے خوش گوار ... مجھے دیکھتے ہی بولا: "آؤ آؤ سرفروش۔ تم بعینہٖ اُنھی ... چلتے رہے جو کمپیوٹر نے تمھارے لیے منتخب کیے تھے ... فندی کو وہ نقشہ دکھا چکا ہوں۔ تم خیابانِ شیراز سے ... والی سڑک پر مُڑنا چاہتے تھے... مگر میں نے کمپیوٹر ... تمھیں شاہراہِ پہلوی..."

"...ہنے دیجیے ڈاکٹر۔" میں نے غصّے سے اُس کی بات ... یہ مستقل ذہنی غلامی میرے لیے ناقابلِ برداشت ...

...تمھاری ذہنی کش مکش کا علم ہو گیا تھا برخوردار اسی ... کمپیوٹر اور کرسٹل کے باہمی رابطے کا سوئچ آف کر دیا تھا۔ مگر تم بہت جلد اس کے عادی ہو جاؤ گے اور نئے سفر میں تمھیں اس سے بڑی مدد ملے گی۔"

"مجھے نئے سفر پر کب جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تقریباً ایک ماہ بعد۔"

"سنو ڈاکٹر! مجھے آج ہی بھیج دو۔ یا تو میں ابھی اور اسی وقت جاؤں گا یا پھر کبھی نہیں جاؤں گا۔" میں نے باغیانہ لہجے میں اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

"یہ... یہ تم کہہ رہے ہو سرفروش؟" اس نے تعجب سے کہا۔

"ہاں۔ یہ میں کہہ رہا ہوں ڈاکٹر۔ اب مجھے زندگی سے پیار نہیں رہا۔ یا تو مجھے آج اور ابھی بھیج دو... یا پھر میری بجائے وہ آدمی جائے گا جسے میرے نعم البدل کے طور پر تربیت دی جا رہی ہے۔ مجھے اپنے اس فیصلے کے لیے ہر سزا قبول ہے۔"

"مگر ہُوا کیا ہے، سرفروش؟ تم نے ایسا کیوں سوچا؟"

وہ میرے فیصلے پر حیران ہی نہیں پریشان بھی ہو گیا تھا لیکن رضا آفندی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، رضا آفندی بول اُٹھا "تم سائنس دانوں کے سینوں میں دل نہیں بلکہ پتھر دھڑکتے ہیں ڈاکٹر... سرفروش انسان ہے۔ آخر کب تک موت کے مراحل سے گزرتا رہے گا؟"

ڈاکٹر فریدوں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

"مُلک و ملّت کی طرف سے عائد ہونے والی ذمّے داریوں کا مجھے بھی پُورا پُورا احساس ہے ڈاکٹر... لیکن تمھارے یہ تجربات اُن ذمّے داریوں کے لیے کم اور سائنسی ارتقا کے لیے زیادہ ہیں اور پھر سرفروش اُن ذمّے داریوں سے رُوگردانی تو نہیں کر رہا۔ یہ تم سے صرف درخواست کر رہا ہے کہ اسے فوری طور پر بھیج دیا جائے۔" رضا آفندی نے میری وکالت کی۔

"مگر یہ ناممکن ہے، رضا۔"

"کیوں؟" رضا آفندی کی بجائے میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ ابھی میرا کرسٹل والا تجربہ ادھورا ہے۔ اگرچہ ارتکازِ توجہ سے تمھارے خیالات کمپیوٹر تک اور کمپیوٹر کی ہدایات کرسٹل تک پہنچ سکتی ہیں لیکن ابھی کوڈ فیڈنگ کا بہت سا کام باقی ہے جو میں ایک مہینے میں مکمل کروں گا پھر تمھارے اور میرے درمیان پیغامات کی ترسیل بہت آسان ہو جائے گی اور اگر کبھی تمھیں کوئی خطرہ پیش آ گیا تو میں تمھاری رہنمائی اور مدد کر سکوں گا۔"

"خطرہ کب نہیں ہوتا، ڈاکٹر؟ ہر سفر کے دوران مجھے اپنی

بقا کی خاطر جنگ کرنا پڑتی ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر یہ بھی تو سوچو برخوردار کہ بقا کی اس جنگ میں تمھاری وجاہت ہمیشہ مددگار ثابت ہوتی ہے۔ کیا ٹیل برائنز کے اس دور میں ماضی کی کوئی شہزادی تمھیں پسند کرسکتی ہے؟ اس لیے اُس وقت تک تو رُک جاؤ جب تک تمھارے سر پر بال نہیں اُگ آتے..."

ڈاکٹر نے یہ کہہ کر گویا میرے زخموں پر نمک چھڑک دیا۔

"میں اور میرے بال گئے جہنم میں، اگر مجھے فوری طور پر بھیجتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں جارہا ہوں۔ اپنی سکیورٹی فورس سے کہہ دو کہ وہ مجھے شوٹ کردے۔" یہ کہہ کر میں چل پڑا۔

ڈاکٹر فریدوں کسی کیکڑے کی طرح اُچھلتا ہوا میرے سامنے آیا اور راستہ روکتے ہوئے کہنے لگا۔ "اچھی بات ہے، برخوردار چلو"

... اور تقریباً نصف گھنٹے بعد میں کمپیوٹر چیمبر کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

حسبِ معمول دھماکے ہوئے، میں نے اپنے آپ کو پگھلتے دیکھا اور پھر درد کے سمندر میں ڈوب گیا۔ کمپیوٹر نے مجھے ماضی کے اندھیروں میں منتقل کردیا تھا۔

جب میرے حواس درست ہوئے اور فہم نے کام شروع کیا تو میں نے حسبِ معمول اپنے آپ کو زمین پر پیٹ کے بل لیٹے پایا لیکن میرے نیچے زمین پر گھاس اُگی ہوئی تھی اور سامنے درخت تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس بار کمپیوٹر نے مجھے ماضی کی انوکھی سرزمین کے کسی جنگل میں منتقل کیا ہے۔

میں نے سر اُٹھا کر اردگرد دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری گردن میرے سر کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہ ہو۔ میں نے ٹھوڑی زمین پر ٹکا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو پتہ چلا کہ میں جنھیں درخت سمجھ رہا تھا، وہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ہیں۔ میں نے سوچا کہ پھر یہ جھاڑیاں مجھے اتنی بڑی کیوں لگ رہی ہیں اور میں اپنا سر کیوں نہیں اُٹھا سکتا؟

میں نے اُٹھنا چاہا تو اُٹھ بھی نہ سکا۔

اچانک میری نگاہ میرے ہاتھوں پر جم گئی۔

مجھے زبردست ذہنی دھچکا پہنچا اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔

میں نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ اگر حقیقتاً ایسا ہی تھا تو بھی میں اُس پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنے آپ کو یہ یقین دلا ہی نہیں سکتا تھا کہ میں ایک بالشتیا بن چکا ہوں۔ لمبے چوڑے بازو اور ہاتھ نوزائیدہ بچوں کی طرح پلپلے اور گول ہو چکے تھے۔ میرا وجود ایک ٹوٹ بٹوٹ بچے میں بدل گیا تو میرا سر اتنا ہی بڑا تھا جتنا کہ چھ فٹ سے زیادہ قامت کے آدمی کا ہونا چاہیے۔

شاید کمپیوٹر میرے سالمے دوبارہ یکجا کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔

"اوہ میرے خدا۔ یہ کیا ہوگیا ہے۔ کمپیوٹر کی غلطی سے عجیب الخلقت بن گیا ہوں۔ اگر کوئی مجھے دیکھ لے تو وہ ابھی مجھے ختم کردے گا۔ میں زندہ کیسے رہوں گا؟ اس ہیئت میں اپنی بقا کی جدوجہد بھی نہیں کرسکتا۔ نوزائیدہ بچہ تو ہمیشہ دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ کیا میں یہاں بھوک سے بلک بلک کر مر جاؤں گا... اگر میں نوزائیدہ بچے کے جسم اور پورے مرد کے سر کا نہ ہوتا تو شاید کوئی مجھ پر رحم کرتے ہوئے اپنا لیتا لیکن موجودہ حال میں تو وہ بھوت اور چھلاوا سمجھ کر فوراً مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہیں گے... اور نجات کا مطلب میری موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ میں کتنا بے بس ہوگیا ہوں کہ کروٹ بھی نہیں لے سکتا۔"

یہ سوچیں مجھے پاگل کیے دے رہی تھیں۔

اس سے پہلے ماضی کے ہر سفر میں، میں اپنا تحفظ کرنے کے قابل ہوا کرتا تھا لیکن اس بار میرے پاس نہ تو وہ جسم تھا نہ پہلے جیسی طاقت تھی۔ البتہ میرا دماغ بالکل صحیح وسلامت تھا اور اس میں نصب کرسٹل بھی کام کررہا تھا۔

"خداوندا... میری مدد کر۔" میں نے باآوازِ بلند کہا۔ میں بول سکتا ہوں... لیکن سوال یہ تھا کہ میری قوتِ گویائی کیا کام آسکتی ہے؟ اگر میں بولوں، کسی کو آواز دوں اور کوئی میری پکار پر اِدھر آ بھی جائے تو ایک نوزائیدہ بچے کو بولتے دیکھ کر اُس پر کیا بیتے گی؟ اُس کا ردِعمل میری موت بھی بن سکتا ہے۔ اپنی بقا کے لیے مجھے کسی نہ کسی کو تو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے۔ میں نے سوچا کہ مجھے بولنے اور آواز دینے کی بجائے بچوں کی طرح رونا اور چلانا چاہیے۔ اگر مقدر میں ہوگا تو کوئی مجھے بچالے گا ورنہ موت تو ویسے بھی ہے۔ یہ سوچ کر میں کسی نوزائیدہ بچے کی طرح آواز بنا کر رونے لگا۔

رونے کے ساتھ ساتھ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگتا جارہا تھا کہ خدا کرے میرے دماغ میں نصب کرسٹل میری سوچوں کو کمپیوٹر تک پہنچا دے تاکہ ڈاکٹر فریدوں کو صورتِ حال کا علم ہوسکے اور وہ مجھے واپس بلا لے۔

میں کچھ وقفے کے بعد رونا بند کردیتا تھا کیونکہ رونے سے مجھے نقاہت محسوس ہونے لگی تھی۔ اتنے میں مجھے عورتوں کی خوشبو آئی۔ جی ہاں عورتوں کی خوشبو... ماضی کے اندھیرے زمانوں کے ہر سفر نے مجھے نیم وحشی انسانوں کی تھوڑی بہت خصوصیات بخش دی تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اگر میرے آس پاس عورتیں موجود ہوں تو اُن کی آواز یا گفتگو سُنے بغیر ہی مجھے ان کی موجودگی کا احساس ہوجاتا تھا۔ جانوروں کی سی اس حِس نے مجھے بتادیا تھا کہ اردگرد کہیں نہ کہیں عورتیں موجود ہیں اور چونکہ عورتوں میں ممتا کا جذبہ ہوتا ہے اس لیے میں زور زور سے رونے لگا تاکہ میری آواز اُن تک پہنچ جائے تو شاید کوئی ممتا کی ماری اِدھر آنکلے۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

خاموشی کے وقفے میں مجھے ایک عورت کی آواز سُنائی دی جو کسی سے کہہ رہی تھی۔ "یہ آواز کیسی تھی طاؤسہ؟"

"شش۔" دوسری عورت نے جواب دیا۔ "مجھے تو کسی بچے کے رونے کی آواز معلوم ہوئی تھی۔"

"بچے کی آواز کیسے ہوسکتی ہے؟" پہلی عورت بولی۔ "تم تو جانتی ہو کہ اس حرم میں بچوں کو قتل کردیا جاتا ہے۔ یقیناً یہ ہوا کی سرسراہٹ ہوگی۔ آؤ چلیں۔"

یہ سُن کر میں ایک بار پھر زور سے رویا اور اُن کا ردِعمل جاننے کے لیے خاموش ہوگیا۔

"یہ بچے ہی کے رونے کی آواز ہے روشی۔ تم جانتی ہو کہ حرم کی عورتیں اپنا جرم چھپانے کے لیے بچے جھاڑیوں میں پھینک دیتی ہیں۔" اس آواز میں نرمی اور ملائمت تھی۔ میں اس توقع پر پھر زور زور سے رونے لگا کہ شاید یہ عورت مجھے بچانے پر آمادہ ہوجائے۔

چند لمحے بعد جھاڑیاں ہٹائی گئیں اور دو عورتوں کے چہرے جھانکتے دکھائی دینے لگے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور رونے لگا۔ ایک عورت بولی۔ "ہاں بچہ ہی ہے۔ چلو بھاگ چلیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا الزام ہمارے سر آجائے۔"

"نہیں روشی۔ میں اس معصوم کو مرنے کے لیے چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔" دوسری نے جواب دیا۔

"... تم اس معصوم کو مرنے کے لیے چھوڑ کر نہیں جاسکتیں" دوسری نے جواب دیا۔ لہجہ تنبیہہ آمیز تھا۔

"تم نے اس معصوم کو غور سے نہیں دیکھا۔ مجھے تو یہ کسی عفریت کا بچہ لگتا ہے۔ ذرا اس کا سر تو دیکھو؟"

طاؤسہ نے کوئی جواب نہ دیا اور میری طرف دیکھتی رہی۔ میں اسے لبھانے کے لیے قلقاریاں مارنے لگا۔

اتنے میں دوسری عورت جس کا نام روشی تھا، بولی۔ "کسی مصیبت میں پھنسنے سے پہلے ہی یہاں سے چل دو طاؤسہ۔ اگر سُہراب کو پتہ چل گیا تو ہمارے سر قلم کردیے جائیں گے۔ اس مکروہ عفریت زادے کے لیے کوئی خطرہ مول نہ لو۔"

"تمھیں تو میرے المیے کا علم ہے، روشی۔" طاؤسہ گلوگیر ہوکر بولی۔ "اُس خبیث کاہن نے میرے بچے کو میرے بطن میں ہی قتل کر ڈالا تھا... میں قانون کے احترام میں خاموش رہی حالانکہ میرا جی چاہتا تھا کہ اپنے ہونے والے بچے کے قاتل، اُس کاہن کا خون پی جاؤں جو ماؤں کی گود آباد ہونے سے پہلے ہی اُن کی کوکھ اُجاڑ دیتا ہے۔"

"چُپ ہوجاؤ طاؤسہ۔ تمھیں اپنے بچے کے غم نے پاگل کردیا ہے ورنہ ایسی باتیں کبھی نہ کرتیں۔ میں تمھیں اس عفریت زادے کے لیے جان کا خطرہ مول نہیں لینے دوں گی۔ چلو۔" یہ کہتے ہوئے روشی نے طاؤسہ کا بازو تھام لیا... مگر طاؤسہ نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔

"نہیں روشی۔ میں اسے مرنے نہیں دوں گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اسے اُن دیوتاؤں نے میرے لیے بھیجا ہے جن کے بارے میں وہ بڈھا کاہن کچھ بھی نہیں جانتا مگر جن کے نام لے لے کر ہمیشہ ہمیں ڈراتا رہتا ہے۔ اگر میں اسے یہاں مرنے کے لیے چھوڑ دوں گی تو دہری لعنتوں کا شکار ہوجاؤں گی۔ میں اسے کہیں چھپا کر اس کی پرورش کروں گی اور اپنے مقتول بچے کا نعم البدل سمجھوں گی۔ جہاں تک تمھارا تعلق ہے، نہ تو تم نے اسے دیکھا ہے اور نہ ہی کچھ اس کے بارے میں جانتی ہو۔ میرا مطلب سمجھ گئی ہو نا تم؟"

"ہاں سمجھ گئی ہوں۔ مجھے اپنی جان عزیز ہے اس لیے میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم نہ ماری جاؤ۔"

"تم میری فکر نہ کرو اور یہاں سے چلی جاؤ۔"

روشی چلی گئی تو میں طاؤسہ کی طرف دیکھ کر مسکرانے اور ہمکنے لگا تاکہ وہ اپنا ارادہ نہ بدل دے... پھر مجھے اپنی ان بچکانہ حرکتوں پر سچ مچ ہنسی آگئی جنھیں طاؤسہ نے میری معصومیت پر محمول کیا اور میرے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ارے واہ میرے منّے۔ بول میرے پاس رہے گا؟"

میں نے اُسے مزید رُجھانے کے لیے غوں غاں شروع کردی.
اُس نے مجھے اُٹھاتے ہُوئے کہا" ارے گندے اب میں تجھے نہلاؤں گی کہاں ، خیر، پوتڑوں سے کام چلالوں گی. میرا خیال ہے تُو بُھوکا ہے." یہ کہتے ہُوئے اس نے میری دیکھ بھال اس انداز میں شروع کردی جیسے میں واقعی اس کا بچہ تھا.

بقا کی یہ کتنی عجیب و غریب صورت تھی.

میں نے سوچا، اگر میں زندہ رہ گیا اور کبھی کسی کو یہ داستان سُنائی تو وہ مجھے دیوانہ سمجھے گا اور میری کسی بات پر یقین نہیں کرے گا. آخر میں بچہ بھی بن سکتا تھا.. اگر کرسٹل کے ذریعے ڈاکٹر فریدوں کو اس صورت حال کا علم نہ ہو سکا تو شاید وہ بھی میری بات پر یقین نہ کرے. میں ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں یہ عورت طاؤسہ کسی وجہ سے مجھے حالات کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دے. اتنے میں وہ میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہُوئے بولی...

" ارے لال... روشی ٹھیک ہی کہتی تھی. دیکھو نا تمھارا سر تو اچھے خاصے مرد کے سر جتنا ہے. کہیں تم سچ مچ کوئی بُھتنے تو نہیں ہو؟"

میں لاشعوری طور پر اُسے جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ رُک کر غوں غاں کرنے لگا. وہ پھر بولی" چاہے تم بُھتنے ہو یا عفریت، میں تمھیں مرنے نہیں دوں گی. کہیں چھپا کر پالوں گی. مگر کہاں؟ پُورے حرم میں چوکیدار گشت کرتے رہتے ہیں. اگر انھوں نے دیکھ لیا تو ہم دونوں مارے جائیں گے."

وہ کچھ دیر سوچتی رہی، پھر مجھے اپنے بازوؤں کی پناہ میں لیے جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں کسی طرف بھاگنے لگی. کبھی کبھی وہ رُک کر ادھر اُدھر بھی دیکھتی جاتی تھی. بالآخر وہ ایک ویران اور شکستہ عمارت میں داخل ہُوئی اور مجھے ایک کوٹھڑی میں لٹا کر چلی گئی.

قدرت نے میرے تحفظ کا سامان کر دیا تھا. اُدھر کرسٹل سے بھی اشارے ملنے لگے تھے. ڈاکٹر فریدوں کو پتہ چل گیا تھا کہ کمپیوٹر کی کسی خرابی کے باعث میرے سالمے میری حقیقی عمر کی بجائے ایک نوزائیدہ بچے کی جون میں یکجا ہو گئے ہیں. اب وہ مجھے اس شکل میں بُلا بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا وجود کمپیوٹر کے مرحلے سے گزرنے کے جھٹکے برداشت نہیں کر سکتا تھا. مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے وہ کرسٹل کے ذریعے مجھے انتظار کرنے کا پیغام دے رہا ہے. میرے لیے انتظار کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا. اس طرح چار دن گزر گئے.

اُس وقت تو میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون سی جگہ تھی مگر بعد میں مجھے پتہ چل گیا کہ وہ بارہ دری کے عقب میں واقع نوکروں کے حُجرے تھے. اب یہ حُجرے اور بارہ دری تقریباً کھنڈر بن چکی تھی.

طاؤسہ کچھ کچھ وقفوں کے بعد آتی، مجھے بوتل سے دُودھ پلاتی اور کپڑوں میں لپیٹ کر، لٹا کر، سُلا کر چلی جاتی. حُجرے کی تاریکی کے باعث اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میرا وجود بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے. پہلے روز جب وہ میرے لیے دُودھ کی بوتلیں اور کپڑے لائی تھی، میں اُس کی واپسی کے بعد گھٹنوں چلنے لگا تھا. دوسرے روز مجھے چلنا آگیا تھا اور تیسرے روز میں دوڑ سکتا تھا. میرے بال بھی تیزی سے آگنے لگے تھے. چوتھے روز میں حُجرے کا دروازہ کھول کر چوری چھپے باہر کا ایک چکر بھی لگا آیا تھا. مگر چوتھے ہی دن طاؤسہ کو بھی میری تیز افزائش کا احساس ہو گیا تھا اور وہ اس پر حیرت زدہ رہ گئی تھی. میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ مجھے بُھتنا سمجھ کر چھوڑ نہ دے. اب وہ وقت قریب تر آتا جا رہا تھا، جب اُس پر کچھ حقائق منکشف کر کے اُسے اعتماد میں لے لیا جاتا کیونکہ اس سرزمین پر وہی ایک مہربان ہستی تھی جس پہ اعتماد کیا جا سکتا تھا.

میرے دماغ میں نصب کرسٹل کے اشارے مسلسل بتا رہے تھے کہ ڈاکٹر مجھے فوری طور پہ میری اصلی ہیئت میں لانے کے لیے کوشاں ہے مگر اب میں فوری طور پر اپنی اصلی عمر اور جسامت نہیں چاہتا تھا. اس کی وجہ وہ باتیں تھیں جو میں نے بارہ دری میں آنے والی عورتوں سے سُنی تھیں. وہ چُھپ کر اس کھنڈر نما عمارت میں آتیں اور ایک دوسرے کا دُکھ درد بانٹنے کے ساتھ ساتھ آسودگی بھی حاصل کرتیں. میں اندھیرے گوشوں میں چُھپ کر انھیں دیکھتا اور اُن کی باتیں سُنتا رہتا تھا. اس لیے میں چاہتا تھا کہ میری موجودہ افزائش برقرار رہے جو ایک دن میں ایک سال کے برابر تھی.

میں چھ روز میں چھ سال کا ہو چکا تھا چنانچہ میں نے ارتکازِ توجہ سے کمپیوٹر کے ذریعے ڈاکٹر فریدوں کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا تھا.

بارہ دری کے کھنڈر میں آنے والی عورتوں کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ ازمیر کا یہ علاقہ آذربائیجان میں واقع

اُسے سمجھنے کی کوشش کرو."

" اوہ. میں پاگل ہو جاؤں گی. زنجیریں اور موت میرا مقدر بن جائیں گی." وہ خوفزدہ لہجے میں بولی " تم یقیناً کوئی بدرُوح ہو."

" نہیں طاؤسہ. میں آدمی ہوں. مجھ سے تمھیں کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا. تمھارا بال بھی کوئی بیکا نہیں کر سکے گا."

ہے اور سہراب اس علاقے کا مالک و حاکم ہے. اُس کے حرم میں پانچ سو عورتیں محبوس ہیں. وہ ضعیف العمر بھی ہے اور اولادِ نرینہ سے محروم بھی.

میں حُجرے کی کھڑکی سے حرم کے وسیع و عریض باغ کا نظارا کر چکا تھا. ایسا لگتا تھا کہ وہ میلوں میں پھیلا ہُوا ہے. اس میں جا بجا فوارے لگے ہُوئے تھے اور انواع و اقسام کے خوش رنگ پھول روش روش اپنی بہار دکھا رہے تھے. کبھی کبھی اس باغ میں محافظ بھی گھومتے نظر آتے تھے. وہ بڑی بڑی شلواریں پہنتے تھے. اُن کے ہاتھوں میں بھالے اور کمر سے تلوار لٹکتی رہتی تھی. ایک بار تو مجھے یوں محسوس ہُوا تھا جیسے اُنھوں نے مجھے دیکھ لیا ہے. میں ڈر کے مارے ایک اندھیرے گوشے میں دُبک گیا تھا اور گھنٹوں وہاں بیٹھا رہا. ابھی میں اس قابل نہیں تھا کہ ان کا مقابلہ کر سکوں.

ساتویں روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب مجھے طاؤسہ سے کُھل کر بات کر ہی لینی چاہیے. اس لیے کہ وہ میری بڑھتی ہُوئی جسامت سے خوفزدہ ہونے لگی تھی اور اپنے خدشوں کا برملا اظہار بھی کر بیٹھی تھی. ہُوا یوں تھا کہ حسبِ معمول جب شام کے اندھیرے میں وہ دُودھ لائی تو میں اپنی جسامت چُھپانے کے لیے بستر میں سُکڑ گیا. اُس نے مجھے اُٹھایا تو میرا وزن محسوس کرتے ہُوئے بولی" تم تو دیو کے بچے بنتے جا رہے ہو. میرا خیال ہے، تم دنیا بھر میں واحد بچے ہو جس کا صرف سات روز میں اتنا وزن ہو گیا ہے. روشی ٹھیک ہی کہتی تھی کہ تم عفریت زادے ہو."

" وہ جھوٹ بکتی تھی." میں بولا تو طاؤسہ نے ڈر کے مارے مجھے چھوڑ دیا اور آنکھیں پھٹ پھٹا کر مجھے دیکھنے لگی. میں نے کہا" مجھ سے ڈرو مت طاؤسہ. میں عفریت زادہ یا بُھتنا نہیں بلکہ بچے کی جون میں ایک مرد ہوں."

میری توقع کے عین مطابق طاؤسہ بے ہوش ہو گئی.

میں نے دُودھ پی کر برتن خالی کیا پھر چُھپتا چُھپاتا ایک فوارے سے برتن میں پانی بھر لایا. طاؤسہ ابھی تک بے ہوش پڑی تھی. میں نے اُس کے مُنہ پر چھینٹے مارے پھر اُس کی ہتھیلیاں اور تلوے سہلانے لگا. کچھ دیر بعد اُس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں اور بولی.

" میں نے بڑا خوفناک خواب دیکھا تھا مُنّے. یا پتہ نہیں کیا ہُوا تھا. مجھے یُوں لگا تھا جیسے تم مرد کی آواز میں بول رہے ہو."

" ہاں. میں بولا تھا." میں نے اُس کی ہتھیلی تھپ تھپاتے ہُوئے کہا" مجھ سے مت ڈرو طاؤسہ. میری بات غور سے سُنو اور

" میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، کیسے ہو رہا ہے. تم... تم کیسے اتنے بڑے ہو گئے ہو؟ مردوں کی طرح کیسے بول رہے ہو؟" یہ کہتے کہتے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا.

" پہلے تم میری پُوری بات سُن لو پھر سب سمجھ جاؤ گی. دیکھو میں ایک ایسی دُنیا سے آیا ہوں جسے تم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا. مگر یہاں آتے وقت کسی غلطی نے مجھے ایک بچے کی جون دے دی ہے. اب اس غلطی کی اصلاح کی جا رہی ہے اور ایک مہینے کے اندر اندر میں پھر مرد کی جون میں آ جاؤں گا. اُس وقت تک مجھے تمھاری مدد اور تحفظ کی ضرورت ہے. میں اس احسان کے بدلے تمھارے لیے وہ سب کچھ کروں گا جو تم چاہو گی."

" اگر ایسا ہے تو پھر تم بُھتنے، شیطان یا جادوگر ہو." اُس نے کہا.

" میں ان میں سے کوئی بھی نہیں اور اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو میں بیک وقت بُھتنا، شیطان اور جادوگر ہُوں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا. تم صرف ایک مہینے تک میری مدد کرتی رہو. مجھ سے ڈر کر مجھے موت کے حوالے مت کرو."

" اب مجھے تم سے ڈر تو نہیں لگ رہا لیکن بچے کی جون میں

مرد والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"وقت آنے پر یہ بات بھی تمھاری سمجھ میں آجائے گی۔"

"اچھا اگر تم جادوگر ہو تو وعدہ کرو کہ اپنے کسی سحر سے مجھے بچّے کی ماں بنا دو گے۔ مجھے میرا اپنا بچّہ چاہیے جس کے لیے میری ممتا تڑپ رہی ہے۔" طاؤسہ اب مجھے جادوگر سمجھ رہی تھی۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب میں پُوری طرح اپنی جُون میں آجاؤں گا تو تمھاری یہ خواہش ضرور پوری ہو جائے گی۔" میں نے اپنی بقا کے لیے جھٹ ایک ایسا وعدہ کرلیا جو میں نہیں، قدرت ہی پُورا کر سکتی تھی۔ "مگر تم بھی وعدہ کرو کہ میرا ساتھ دو گی اور جو میں پوچھوں گا بتاؤ گی۔"

"ہاں۔ میں اپنی ممتا کی پیاس بُجھانے کے لیے سب کچھ کر سکتی ہوں۔ پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"مجھے ازمیر اور سُہراب کے بارے میں وہ سب کچھ بتاؤ جو تم جانتی ہو۔"

وہ مجھے اُس سرزمین اور سُہراب کے متعلق بتاتی رہی، میں سُنتا اور اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دیتا رہا۔ یہ منصوبہ بے حد خطرناک تھا لیکن مجھے ماضی کے ہر سفر میں قدم قدم پر خطرات سے دوچار ہونا پڑا تھا اور اس سفر میں بھی میرے لیے ہر قدم پر خطرے تھے بلکہ کچھ زیادہ اور شدید قسم کے تھے کیونکہ میں ایک بچّے کی جُون میں تھا تاہم اُن سے رُوگردانی بھی ممکن نہیں تھی۔ اس لیے میں نے طاؤسہ کو اعتماد میں لیتے ہُوئے بتا دیا کہ اُسے کیا کرنا ہوگا۔ وہ خوف سے جُھرجُھری لیتے ہُوئے بولی۔

"نہیں نہیں بابا، ایسا نہیں کروں گی۔ وہ تمھارے ساتھ مجھے بھی تہِ تیغ کر دیں گے۔"

"اگر وہ ساری باتیں سچّی ہیں جو تم نے سُہراب اور کاہن ارژنگ کے بارے میں بتائی ہیں تو ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔" میں نے طاؤسہ کو قائل کرنے کے لیے دلیلیں دینا شروع کیں۔ "تم کہتی ہو کہ سُہراب لاولد ہے اور وارثِ تاج و تخت کی شدید آرزو رکھتا ہے۔ کاہنِ اعظم ارژنگ نے اُسے پیش گوئی کی ہے کہ دیوتا اُس کے پاس ایک ایسا بچّہ بھیجیں گے جو غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہوگا اور سُہراب اُسے اپنا جانشین مقرّر کرے گا۔ یہی بچّہ بڑا ہو کر سلطنتِ ازمیر کی عظمتوں میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ سُہراب کا نام بھی روشن کرے گا۔ تم نے یہی بتایا تھا نا؟"

"ہاں۔ یہ باتیں سچ ہیں۔ بُڈھا سُہراب ان باتوں پر یقین بھی کرتا ہے مگر کاہنِ اعظم پرلے درجے کا مکّار، ظالم اور جھُوٹا ہے۔ وہ سُہراب کی بیٹی فرازیہ سے محبت کرتا اور سُہراب کو راستے سے ہٹا کر اُسے تخت پر بٹھانا چاہتا ہے۔ دونوں سُہراب کی موت کے منتظر ہیں یا موقع ملتے ہی وہ اُسے قتل کر دیں گے۔ یہ بھی درست ہے کہ اگر تم سُہراب کے پاس پہنچ جاؤ اور کہو کہ تمھیں دیوتاؤں نے بھیجا ہے تو وہ تمھاری بات پر یقین کرلے گا مگر کاہن ارژنگ تمھیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"یہ بعد کی بات ہے طاؤسہ۔ تم کسی طرح مجھے سُہراب کی خواب گاہ تک پہنچا دو۔ وہاں مجھے دیکھنے اور مجھ سے بات کرنے والا وہی پہلا آدمی ہو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس لیے میری مدد کرو اور مجھے سُہراب تک پہنچا دو۔"

میری اس بات پر وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ "حرم کا ایک چوکیدار فیل تن مجھ پر نظر رکھتا ہے اور اپنی جان کی پروا کیے بغیر اظہارِ محبت کرنے سے باز نہیں آتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتا ہے۔"

"تو پھر آج ہی اُس سے ملو طاؤسہ اور کوئی صُورت نکالو۔"

"میں اس سے مل لوں گی مگر تم نے میرے لیے ایک مشکل پیدا کردی ہے۔ جب تک میں یہ نہیں جانتی تھی کہ تم مرد ہو، تب تک تو تمھیں مُنّا کہتی رہی، اب تمھیں کیا کہوں؟"

"سرفروش۔ میرا نام سرفروش ہے۔ تم مجھے اسی نام سے پُکار سکتی ہو۔ اب صبح ہونے والی ہے، تم چلی جاؤ کہیں ایسا نہ ہو، کسی کو پتہ چل جائے کہ تم رات بھر حرم سرا سے غائب رہی ہو۔"

"حرم سرا میں میرے پاس الگ کمرہ ہے اور سُہراب کئی مہینوں سے میرے پاس نہیں آیا۔ وہ بیمار ہے اور اب اُس کی راتیں اپنی خواب گاہ میں تنہا ہی سوتے گزرتی ہیں۔ دوسرے میں ایک خفیہ راستے سے یہاں آتی ہوں اس لیے کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ میں رات بھر یہاں رہی ہوں۔" تاہم یہ کہتے ہُوئے وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ "اچھا، اب میں چلتی ہُوں۔ اپنا خیال رکھنا۔"

جب طاؤسہ چلی گئی تو میں کمبل اوڑھ کر حُجرے کے کونے میں لیٹ گیا مگر بھوک کے مارے مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے سوچا، اگر منصوبے پر عمل درآمد ہو گیا اور وہ کامیاب ثابت ہُوا تو مجھے حسبِ خواہش کھانا ملنے لگے گا اور اگر منصوبہ ناکام رہا تو پھر کھانے سے ہی نہیں، ہر شے سے بے نیاز ہو جاؤں گا۔

میں نے ارتکازِ توجہ سے کمپیوٹر کے ساتھ رابطہ قائم کرنا چاہا مگر ایسا محسوس ہُوا کہ میرے دماغ کا کرسٹل ہڑتال پر ہے۔ شاید ڈاکٹر فریدوں نے کمپیوٹر سے اس کا رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

میں ایک بار پھر سہراب اور اپنے منصوبے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اگر سہراب واقعی اتنا ہی توہم پرست ہے، جتنا کہ طاؤسہ نے بتایا تھا تو منصوبے کی کامیابی کے امکانات روشن تھے۔ انھی سوچوں میں مجھے نیند آگئی پھر اچانک اُس وقت میری آنکھ کھُلی جب اندھیرے میں کوئی مجھے اپنے بازوؤں میں بھر کر اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھُڑانے لگا تو طاؤسہ کی آواز آئی۔

"ارے ارے۔ یہ میں ہُوں سرفروش۔"

یہ سُن کر میری جان میں جان آئی۔ میں نے کہا۔ "مجھے یوں اُٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ ویسے ہی جگا دیا ہوتا۔"

"میں اپنی ممتا سے مجبور ہُوں سرفروش۔ خیر سنو۔ اگر کل رات مجھے تمھاری باتوں پر یقین نہ آیا ہوتا تو اب آجاتا۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک ہی دن میں تمھارا وزن کم از کم دس پونڈ بڑھ گیا ہے اور بالوں میں گھنگر آگئے ہیں۔" وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہُوئے بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ابھی غذا اور گوشت کے بغیر وزن کیوں کر بڑھ جاتا ہے؟" میں بھی اُلجھ کر رہ گیا۔

"اگر تمھارا دیوانوں کا سا منصوبہ کامیاب ہو گیا اور تم صبح تک زندہ رہ گئے تو جو چاہو گے تمھیں مل جائے گا۔"

"کیا تم فیل تن سے ملی تھیں؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ انسان نہیں، وحشی ہے وحشی۔ اس نے مجھے کافی پریشان کیا ہے۔ مگر اُس نے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ سہراب کی خواب گاہ کے باہر پہرا دینے والے کو آج شام ایک ایسی بُوٹی کھلا دے گا جس سے وہ بیمار پڑ جائے گا پھر اس کی جگہ رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر دے گا۔"

"اگر اُس کی بجائے کوئی دوسرا آدمی منتخب کر لیا گیا تو؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا امکان نہیں ہے کیونکہ خواب گاہ کی چوکیداری کوئی پسند نہیں کرتا۔" طاؤسہ نے وضاحت کی۔

"تم مجھے حرم سرا میں کیسے لے جاؤ گی؟"

"یہ مرحلہ بھی آسان ہو گیا ہے۔ میں نے اپنی سہیلی روشی کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ ہماری مدد کرے اور اس محافظ کو تھوڑی دیر کے لیے کہیں اِدھر اُدھر لے جائے جو خواب گاہ کے راستے پر متعین ہے۔"

"کیا تمھیں یقین ہے کہ روشی ایسا کرے گی؟"

"ہاں۔ میں اُس کے کچھ راز جانتی ہُوں۔ میں نے اُن کے افشا کی دھمکی دے کر اُسے راضی کر لیا ہے۔ جب وہ محافظ کو حرم کے کسی گوشے میں لے جائے گی تو میں تمھیں محل کے اندر لے جاؤں گی۔ رات کے وقت محل کی راہداریاں سُونی ہوتی ہیں۔ صرف سہراب کی راہداری میں پہریدار ہوتا ہے اور آج فیل تن وہاں ہوگا۔ وہ آہستہ سے خواب گاہ کا دروازہ کھول دے گا اور میں تمھیں وہاں چھوڑ کر باہر آجاؤں گی۔ اگر دیوتاؤں نے چاہا تو سہراب سو رہا ہوگا اور کوئی دوسری گڑبڑ بھی نہیں ہوگی۔" طاؤسہ نے ساری تفصیل سمجھا دی۔ میں نے اس پر تھوڑی دیر غور کیا اور کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جتنا کر سکتیں تھیں، کر رہی ہو اور میں تمھارا یہ احسان کبھی نہیں بھُولوں گا۔" پھر میں نے جلدی جلدی وہ دُودھ پیا جو طاؤسہ لائی تھی۔ "آؤ چلیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ابھی نہیں۔ ہم آدھی رات کو جائیں گے جب محل کے بیشتر چوکیدار اونگھنے اور چھُپ کر سو جاتے ہیں۔"

آدھی رات کو جب ہم حرم کے باغ سے گزرے تو واقعی چوکیدار لالٹینوں کے کھمبوں، درختوں اور ستونوں سے ٹیک لگائے سو رہے تھے۔ ہر کام اُسی طرح ہُوا تھا جیسے طاؤسہ نے بتایا تھا۔ وہ مجھے سہراب کی خواب گاہ میں چھوڑتے ہُوئے سرگوشی میں بولی۔ "اگر تمھارا منصوبہ کامیاب ہو جائے تو مجھے مت بھول جانا۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا طاؤسہ، یہ میرا وعدہ ہے۔" میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ جب وہ چلی گئی تو میں سہراب کے پلنگ کی پائنتی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور صبح کے اُجالے کا انتظار کرنے لگا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ آنے والی صبح میرے لیے نوید مسرت لاتی

ہے یا پیغام اجل :

میں نے ارتکاز توجہ سے کپیوٹ کے ذریعہ ڈاکٹر فریدوں کو صورت حال سے آگاہ کرنا چاہا مگر میرے دماغ والا کرشل کام نہیں کر رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آسکا کہ اس نے یوں ہڑتال کیوں کر دی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرا وقت پورا ہو گیا ہو اور قدرت مجھے اتنی مہلت نہ دینا چاہتی ہو کہ ڈاکٹر فریدوں صورت حال سے آگاہ ہو سکے۔ بہرکیف اب تو میں شیر کی کچھار میں آ ہی گیا تھا اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں شیر کو زیر کرنے والا ہوں یا شیر مجھے لقمہ بنانے والا ہے۔ میں نے خراٹے لینے والے سہراب کی طرف دیکھا۔ اس کے دانت اور بال جھڑ چکے تھے۔ ناک طوطے کی چونچ سے مشابہ تھی اور جھریوں نے اس کے چہرے پر ہی نہیں گردن پر بھی ڈیرے ڈال رکھے تھے وہ اتنا ضعیف دکھائی دیتا تھا کہ کسی بھی لمحے موت اُسے اپنے پنجوں میں دبوچ سکتی تھی۔

جب صبح کا اجالا پھیلا اور روشنی دریچوں کے پردوں سے چھَن کر سہراب کے چہرے پر پڑنے لگی تو وہ کسمسایا اور اس نے ایک مکروہ جمائی لے کر اپنی کیچڑ بھری آنکھیں کھول دیں جو مجھ پر جم کر رہ گئیں۔ میں بولا "مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کہ میں ہی وہ بچہ ہوں جس کی پیشین گوئی کاہن اعظم ارڈنگ نے آپ سے کی تھی۔ دیوتاؤں نے مجھے بچے کے جسم مگر بڑے آدمی کے سر اور فہم و ادراک کے ساتھ آسمانوں سے بھیجا ہے تاکہ آپ مجھے اپنا جانشین بنا سکیں۔"

یہ کہتے ہوئے مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر بھی اُترتی محسوس ہوئی کیونکہ اگلے چند لمحے فیصلہ کُن تھے۔ اگر سہراب نے ڈر کے مارے اپنے محافظ کو آواز دے دی تو میرے بچنے کا امکان نہیں تھا۔ میں خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے ذرا بھی حرکت نہ کی۔ وہ اُسی طرح ایک ٹک مجھے گھورتا رہا۔ پھر اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور وہ بڑے ٹھنڈے مگر گمبھیر لہجے میں بولا۔

"اگر تم کوئی بھتنے ہو تو بھاگ جاؤ کہ میں پیرانہ سالی کی اِس منزل میں تم سے خوف زدہ نہیں ہو سکتا لیکن اگر تم میرا وہم یا بھتنے نہیں بلکہ حقیقت میں وجود رکھتے ہو تو ذرا میری چٹکی لو تاکہ میں یقین کر سکوں، حالانکہ اس کے باوجود میں تمھارے وجود کو تسلیم کرنے سے شاید انکار کر دوں۔"

میں نے اپنے ننھے سے ہاتھ سے اُس کے ہاتھ پر چٹکی لیتے ہوئے کہا "میں نہ تمھارا وہم ہوں نہ بھتنا۔ میں دیوتاؤں کا فرستادہ بچہ ہوں مگر ایک بھرپور مرد کے سر اور دماغ کے ساتھ۔ کیا تمھیں میرا سر بہت بڑا دکھائی نہیں دیتا؟"

"بچکانہ جسم کے ساتھ اتنا بڑا سر تو مجھے مضحکہ خیز نظر آتا ہے۔" وہ بولا۔

"اور میری آواز کیسی لگتی ہے؟"

"سو فیصد مردانہ۔"

"کیا یہ دونوں باتیں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں کہ مجھے دیوتاؤں نے بھیجا ہے؟" میں نے پوچھا تو سہراب بے ساختہ ہنس پڑا اور بولا۔

"میں اتنا احمق نہیں جتنا لوگ اور خاص طور پر ارڈنگ سمجھتا ہے۔ میں جادو یا معجزات پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں بڑا توہم پرست ہوں، میں اُن کی تردید نہیں کرتا کہ ان کے ایسا سمجھنے سے مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

سہراب کی ان باتوں نے میری ساری توقعات پر پانی پھیر دیا۔ میں نے فوری طور پر اپنے منصوبے میں ترمیم کی اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ مجھے اُن میں علم اور تجربے کے ساتھ ساتھ عیاری اور مکر بھی جھانکتے دکھائی دیے۔

"تمھاری آنکھوں میں بچوں کی معصومیت نہیں بلکہ ایک مبہم خوف کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مگر ایک بچے کے جسم پر یہ سر اور یہ آنکھیں کس کام کی؟" اس نے کہا۔

"اگرچہ آپ سحر اور معجزات پر اعتقاد نہیں رکھتے لیکن ان دونوں کا میری یہاں آمد سے گہرا تعلق ہے۔ میں کسی اور دُنیا سے آیا ہوں اور میرا وجود ایک دن میں ایک سال کے برابر بڑھتا ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ کے خادم خواب گاہ میں کب آتے ہیں؟"

سہراب نے گھنٹی بجانے والی رسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں جب چاہوں انھیں بُلا سکتا ہوں۔"

"خوب۔ اب ذرا ادھر ملاحظہ فرمایئے۔" یہ کہہ کر میں نے چند اُلٹی قلابازیاں کھائیں، کُرسی کے ہتھوں پر سر کے بل کھڑا ہوا اور ہوا میں قلابازی کھاتے ہوئے فرش پر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ سہراب میری یہ حرکتیں تعجب سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا آپ نے کبھی کسی عام بچے کو ایسی حرکتیں کرتے دیکھا ہے؟"

"تم اپنی ان حرکتوں سے یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ تمھیں دیوتاؤں نے بھیجا ہے؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا

"ان حرکتوں سے مجھے تمھاری بات کا یقین نہیں آسکتا" وہ بولا اور مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں سفاکانہ چمک تھی جو بتا رہی تھی کہ اُس نے میرے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ پھر بول اٹھا "البتہ جیسا کہ تم نے کہا ہے، تمھاری عمر ایک دن میں ایک سال بڑھ جاتی ہے تو اس طرح تمھیں چند روز تک جوان ہو جانا چاہیے۔ اگر تم واقعی جوان ہو گئے تو ٹھیک ورنہ تمھاری گردن اُڑا دی جائے گی۔"

"مجھے منظور ہے جناب" میں نے کہا۔ "اب میں چند حقائق کا اعتراف کر لوں تو بہتر ہے کیونکہ آپ ویسے نہیں ہیں جیسا آپ کو سمجھا جاتا ہے۔"

"لوگ سمجھتے ہیں کہ میں احمق ہوں، سٹھیا گیا ہوں اور میری عقل ماری گئی ہے۔ یہی نا؟"

"جی ہاں" میں نے تائید کی۔

"میں بے وقوف تو ہو سکتا ہوں لیکن میری ضعیف العمری مجھے فاتر العقل نہیں بنا سکتی۔"

"اسی لیے میں یہ اعتراف کر رہا ہوں کہ پہلے میں نے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے کاہن ارڈنگ کی پیش گوئی کے مطابق دیوتاؤں نے نہیں بھیجا۔ میں نے اُسے بے وقوف بنایا کہ اُسے بے وقوف بنانا آسان نہیں تھا۔"

"میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ارڈنگ جھوٹا اور مکار ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اُس کی باتوں پر یقین رکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے قہقہہ لگانا چاہا مگر اس کی ہنسی کھانسی میں بدل گئی۔ کچھ دیر کھانسنے کے بعد اُس نے اپنی بات کا سرا پھر سے جوڑا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ چوری چھپے کسی بچے کو تربیت دے رہا ہے اور اُس موقعے کی تلاش میں ہے جب اُسے سامنے لے آئے اور اُسے میرا جانشین مقرر کرا دے۔ جب میں مر جاؤں گا تو وہ فرازیہ کو قتل کرا دے گا اور اس بچے کا نگران بن کر حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔"

"اس صورت میں جب آپ نے میرا سچ پرکھنے کے لیے مجھے کچھ دنوں کی مہلت دی ہے تو میرے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہوگا؟"

سہراب نے پھر قہقہہ لگایا اور بولا "تم نے تو اُس کے سارے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا ہے بھتنے۔ اُس کا سارا منصوبہ چوپٹ ہو گیا ہے۔ وہ یقیناً تمھیں قتل کرا دینا چاہے گا۔"

"تب تو آپ کو اس وقت تک میرا تحفظ کرنا چاہیے جب تک میں دوبارہ جوان نہیں ہو جاتا" میں نے کہا۔

"لوگ مجھے احمق سمجھتے اور میرے خلاف سازشیں کرتے ہیں مگر میں شکاری کتے کی طرح چوکنا رہتا ہوں اس لیے میرا خیال ہے کہ میں تمھیں اس کی دستبرد سے محفوظ رکھوں گا۔ ویسے تمھارا نام کیا ہے؟"

"سرفروش" میں نے جواب دیا۔

"کچھ عجیب سا نام ہے... خیر یہ بات ایک بار پھر کان کھول کر سن لو۔ اگر تم دنوں میں جوان نہ ہوئے تو میں ارڈنگ کو تمھارے قتل کی زحمت نہیں دوں گا بلکہ خود ہی تمھاری گردن اُڑا دوں گا۔ اب بولو تم کیا چاہتے ہو؟"

"سب سے پہلے عمدہ خوراک۔ خاص طور پر گوشت" میں نے کہا۔

"اس کے بعد لباس؟" وہ بولا۔

"لباس کے ساتھ ایک چھوٹی سی تلوار بھی تاکہ میں اپنے آپ کو قدرے محفوظ محسوس کر سکوں۔"

"یہ سب تمھیں مل جائیں گے" اُس نے گھنٹی کی رسّی کھینچتے ہوئے کہا "آج ہی میں تمھیں اپنے دربار میں وزیروں اور مشیروں سے متعارف کرواؤں گا۔ شہزادی فرازیہ اور کاہن ارڈنگ سے تو بطورِ خاص ملاؤں گا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اپنی پیش گوئی کے مطابق دیوتاؤں کی طرف سے بھیجے جانے والے وارث تاج و تخت بچے کو سامنے پا کر اُن کے چہروں پر ملال کے کتنے رنگ بکھرتے ہیں۔ وہ اُس بچے کا استقبال کن تاثرات سے کرتے ہیں جو بقول ارڈنگ بڑا ہو کر ازمیر کو آشوریوں کی یلغار سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دے گا۔"

"یہ آشوری کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ خلیج کے اُس پار رہتے ہیں اور بار بار ازمیر پر چڑھائی کرتے ہیں۔ ہمارے آبا و اجداد ہمیشہ اُن سے مغلوب ہوتے رہے ہیں۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ مرنے سے پہلے اُن تمام شکستوں کا بدلہ لوں گا۔ ارڈنگ

نے پیش گوئی کی تھی کہ دیوتاؤں کی طرف سے بھیجا جانے والا بچہ بڑا ہو کر آشوریوں کو شکستِ فاش دے گا۔ اب اگر تمھاری بات سچ ثابت ہوئی اور قتل ہونے سے بچ گئے تو تم ہی آشوریوں پر فوج کشی کرو گے۔"

اتنے میں دو فربہ اندام غلام خواب گاہ میں داخل ہوئے۔ سہراب اُنھیں ہدایات دیتا رہا اور وہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتے رہے اُن کے چہروں سے حیرت و استعجاب مترشح تھا۔ جب وہ تعمیلِ احکام کے لیے چلے گئے تو سہراب بولا۔

"یہ جنوبی علاقے کے غلام ہیں۔ مجھے آشوریوں کو غلام بنانے کی حسرت ہی رہی ہے سرفروش۔ اوّل تو وہ بدبخت ہاتھ ہی نہیں آتے اور اگر کوئی زندہ گرفتار ہو جائے تو غلام بننے کی بجائے موت کو ترجیح دیتا اور خودکشی کر لیتا ہے اور سنو، حرم سرا میں کام کرنے والے غلاموں کو آختہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات میں تمھیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ اگر تم واقعی جوان ہو گئے تو تمھاری وجہ سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ میرے حرم میں پانچ سو عورتیں ہیں۔ تم اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گے۔ تمھارے لیے نئی حرم سرا فراہم کر دی جائے گی۔"

اتنے میں غلام کھانا، لباس اور تلواریں لے آئے۔ میں بھوکے وحشیوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانے کے دوران ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دماغ کا کرسٹل پھر سے کام کرنے لگا ہے میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ میری افزائش کا تعلق براہِ راست کرسٹل سے تھا۔ جب کرسٹل کام نہیں کرتا تھا تو میری افزائش رُک جاتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کرسٹل اور کمپیوٹر کے درمیان کم از کم اُس وقت تک ضرور رابطہ قائم رہے جب تک کہ میں اپنی اصلی حالت پر نہیں آ جاتا ورنہ سہراب میری گردن اُڑائے بغیر نہیں رہے گا۔

*

• سہراب نے میرے تحفظ کا وعدہ یوں پورا کیا کہ میری حفاظت کے لیے بارہ سپاہیوں کا ایک دستہ مقرر کر دیا۔ اس دستے کا سردار کپتان اوغیر تھا۔ اوغیر سہراب کا وفادار تھا۔ جب سہراب نے اُسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ بولا...

"اس عجیب الخلقت بچّے کی حفاظت کوئی بڑا کام نہیں ہے عالی جاہ۔ یہ یہیں آپ کے محل میں رہے گا۔ میرے بارہ وفادار سپاہیوں میں سے چھ دن کو اور چھ رات کو ہر وقت اس کی حفاظت پر مامور رہیں گے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور بات جاری رکھی۔ "میں نے دربار میں اسے دیکھا تھا۔ تب سے اب تک اس مختصر سے وقت میں کافی بڑا ہو گیا ہے اور یہ ایک معجزہ ہے۔ لوگ بھی اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں۔"

"لوگوں کو اسے دیکھنے کے لیے اُس وقت تک انتظار کرنا پڑے گا جب تک یہ پوری طرح اپنی جسامت میں نہیں آ جاتا اور میں اسے اپنا ولی عہد مقرر نہیں کر دیتا۔ مگر میں اسے اپنا ولی عہد بنانے کا اعلان اُس وقت کروں گا جب یہ آشوریوں سے جنگ جیت کر اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دے گا۔ یہ تو بتاؤ اوغیر کہ کاہن ارژنگ اور شہزادی فرازیہ کے تاثرات کیا ہیں؟ دربار کے بعد وہ مجھے دکھائی نہیں دیے۔ ارژنگ تو خاموش بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہے؟"

سہراب کی اس بات پر کپتان اوغیر نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "وہ بڑا مایوس ہے.... آقا۔ خاص طور پر سرفروش کو اغوا کرنے کی کوشش ناکام کے بعد تو وہ بہت ہی دل شکستہ ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ خاموشی سے کسی نئی سازش کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ شہزادی فرازیہ نے البتہ اپنے جاسوس چھوڑ دیے ہیں لیکن وہ اُسے حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں بتا سکیں گے۔ ویسے ارژنگ پر شہزادی کا اعتماد بھی متزلزل ہو گیا ہے اور ہاں، کوڑے کے ڈھیر سے ایک بچّے کی سر بریدہ لاش بھی ملی ہے۔ میرے جاسوسوں نے بتایا ہے کہ وہ غالباً اُسی بچّے کی ہے جسے کئی مواقع پر ارژنگ کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔"

یہ سن کر میں خاموش نہ رہ سکا اور بولا۔ "وہ اُسی بچّے کو آپ کا ولی عہد بنانے کی سوچ رہا تھا مگر جب میں آ گیا تو اُس نے بچّے کو ٹھکانے لگا دیا۔ میرا خیال ہے کہ جوان ہونے کے بعد بھی میری اُس کی نہیں بنے گی۔"

• •

خدا کا شکر ہے کہ میرے کرسٹل اور کمپیوٹر میں رابطہ قائم رہا اور میں ایک بار پھر وہی سرفروش بن گیا جو قد آور، جسیم، توانا اور مارشل آرٹس کا ماہر تھا۔ میں نے سر کے بال تو مناسب حد تک ترشوا لیے تھے لیکن داڑھی بڑھنے دی تھی۔ اب میں چہرے مہرے سے ازمیر کا باشندہ نظر آتا تھا ایک اور فرق جو میں نے اپنے اندر محسوس کیا، وہ یہ تھا کہ میں اپنی دُنیا اور اپنے دَور کا ایک عام سا آدمی نہیں رہا تھا بلکہ میرے اندر مکاری اور عیاری آ گئی تھی۔

اس دوران کاہن ارژنگ اور شہزادی فرازیہ خاموش رہے تھے۔

سہراب نے حسبِ وعدہ میرے لیے علیحدہ حرم فراہم کر دیا تھا۔ یہ حرم اُس کے محل کے باغ کے دوسرے کنارے واقع تھا۔ اُس نے اوغیر اور اُس کے بارہ سپاہیوں کو میرا محافظ دستہ بنا کر میری تحویل میں دے دیا تھا۔ جس دن مجھے اپنے حرم میں منتقل ہونا تھا، ایک جلوس نکالا گیا۔ میں سفید گھوڑے پر سوار تھا جبکہ غلاموں نے سہراب کی پالکی اُٹھا رکھی تھی۔ یہ جلوس راجدھانی کی سڑکوں سے گزرا تو دُور رویہ کھڑے لوگ حیرت سے مجھے دیکھتے رہ گئے۔ انھیں یہ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ کوئی بچّہ دنوں

ہی میں مجھ جیسا بھرپور مرد بن سکتا ہے۔

جب ہم نئے محل میں پہنچے تو سہراب نے کہا۔ "ہجوم میں ارژنگ کے بے شمار جاسوس شامل تھے۔ جب وہ اُسے بتائیں گے کہ معجزہ رُونما ہو چکا ہے تو اُسے یقین نہیں آئے گا۔ وہ اسے میری کوئی چال سمجھے کیونکہ وہ خود چالباز ہے۔ دیکھیں اب وہ کیا کرتا ہے؟ آؤ پہلے میں تمھیں تمھارا محل دکھا دوں۔ اس کے بعد ہم آشوریوں کے ساتھ نمٹنے کی بات چیت کریں گے۔"

ہم محافظ دستے کے چھ سپاہیوں کے گھیرے میں محل کے باغ اور مختلف راہداریوں سے گزرے۔ اس باغ میں بھی روش روش پھول اور جا بجا فوارے بہار دکھا رہے تھے محل کی عمارت سنگِ مرمر سے بنی ہوئی تھی اور دروازوں پر خواجہ سرا متعین تھے راہداریوں سے گزرتے ہوئے مجھے دبے دبے نقرئی قہقہے سنائی دیے اور کچھ نوعمر حسیناؤں کی جھلک بھی دکھائی دی جو بے حد خوبصورت اور نازک اندام تھیں۔ کمروں کے دروازوں پر سنگِ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی تھیں فرنیچر آبنوس کا بنا ہوا اور ہاتھی دانت سے مرصّع تھا۔ ظروف سونے اور چاندی کے تھے لیکن یہ عجیب سی بات ہے کہ ان قہقہوں اور سرگوشیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے مجھے کسی عورت کی طلب محسوس نہ ہوئی اور ہم آگے بڑھ کر اُس کمرے میں آ گئے جہاں تخت رکھا ہوا تھا۔

سہراب نے اوغیر کے علاوہ سپاہیوں کو دروازے پر ٹھہرنے کا حکم دیا اور مجھ سے کہا کہ میں چبوترے پر رکھے ہاتھی دانت کے تخت پر بیٹھ جاؤں۔ میں نے اُس کے حکم کی تعمیل کی تو وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"تم اس تخت پر بیٹھے ہوئے سجتے ہو سرفروش۔ کیوں اوغیر؟"

"آپ بجا فرماتے ہیں عالی جاہ۔" اوغیر بولا۔ "ارژنگ کی پیش گوئی ثابت ہوئی ہے اور آپ کو ولی عہد مل گیا ہے۔"

یہ سن کر سہراب نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "ہاں۔ اُس کا جھوٹ پکڑا گیا ہے۔ مجھے تین ہفتوں میں ایک ایسا وارثِ تخت مل گیا ہے جو ازمیر جیسی دس سلطنتوں پر حکمرانی کر سکتا ہے۔ کاش میں آشوریوں کو شکست خوردہ دیکھنے تک زندہ رہ سکوں۔ میری کچھ اور خواہشیں بھی ہیں۔ اوغیر، تم ذرا باہر چلے جاؤ۔"

اوغیر نے سرِ تسلیم خم کیا اور باہر چلا گیا۔ تب سہراب مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تم نے جو کچھ کہا تھا، وہ سچ نکلا اور یہ معجزے سے کم نہیں۔ تم بڑی عجیب و غریب اور پُراسرار قوتوں کے مالک ہو اور بہت کچھ کر سکتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے ایک بار پھر جوان بنا دو۔"

"اگر آپ اسے میری گستاخی نہ سمجھیں تو میں عرض کروں گا کہ میری ساحرانہ قوت آپ کو دوبارہ جوان بنانے سے قاصر ہے۔" میں نے اُدب سے جواب دیا۔

یہ سن کر اُس نے ٹھنڈی سانس لی، پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اگر تم مجھے دوبارہ جوانی عطا نہیں کر سکتے تو نہ سہی میری صحت ہی بحال کر دو تاکہ مجھے کچھ عرصہ زندہ رہنے کی مہلت مل جائے اور جو کچھ میں نہیں کر سکا، تمھیں کرتا دیکھ سکوں۔"

"یہ بھی میرے بس سے باہر ہے میرے عظیم محسن۔ آپ اُس بیماری

یں مُبتلا ہیں جسے میری دُنیا میں سرطان کہا جاتا ہے اور یہ لاعلاج مرض ہے۔ اگر یہ میرے بس میں ہوتا تو مَیں اپنی زندگی دے کر آپ کی حیات کو طول دے دیتا۔"

سہراب کو سوچتے وقت اپنی چونچ دار ناک کھُجانے کی عادت تھی۔ وہ اپنی ناک کھُجاتا اور سوچتا رہا، پھر بولا۔

"یہ بھی اچھا ہے سرفروش کہ مَیں دوبارہ جوان اور صحت مند نہیں بن سکتا ورنہ سب سے پہلے مَیں تمھیں قتل کر دیتا۔ اب تمھارا میرا نباہ ہو جائے گا اور مَیں اپنی قوتِ ارادی سے اُس وقت تک ضرور زندہ رہُوں گا جب تک کہ تم آشوریوں کو مغلوب کر کے میرے خوابوں کو تعبیر نہیں دے دیتے۔"

جب سہراب چلا گیا تو مَیں نے ادغیر کے ساتھ حفاظتی انتظامات کا جائزہ لیا۔ وہ بلاشبہ ایک تجربہ کار سپاہی تھا۔ مَیں نے اُس سے آشوریوں کے متعلق بات کی تو وہ بولا۔

"سہراب آشوریوں کو مغلوب دیکھنے کا آرزومند ہے لیکن اُن پر غالب آنا بہت مشکل ہے۔ وہ ہم سے زیادہ اچھے جنگجو ہیں۔ وہ کوہستانی علاقے میں رہتے ہیں جہاں گاڑیاں کارآمد نہیں رہتیں۔ پھر وہ چھُپ کر حملہ کرتے اور بھاگ جاتے ہیں۔ مَیں زندگی بھر اُن سے نبرد آزما رہا ہُوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہُوں کہ اُن پر فتح حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ سہراب کو دعدوں پر ٹالتے رہیں۔ وہ زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہے گا لیکن بظاہر جنگ لڑنے کی تیاریاں ضرور شروع کر دیں۔ اس طرح فوج منظم ہو جائے گی اور آشوری بھی متوقع حملے کے پیشِ نظر متردّد و پریشان ہوں گے۔ بگر خلیج عبور کر کے حملے کی غلطی ہرگز نہ کیجیے گا ورنہ کاہن ارزنگ کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ آپ جھُوٹے اور نام نہاد بہادر ہیں۔"

مَیں ادغیر کو پسند ضرور کرتا تھا لیکن اُس کا یُوں برتری کے انداز میں مشورہ دینا مجھے پسند نہ آیا۔ اس طرح وہ آگے چل کر ہر معاملے میں دخل اندازی کر سکتا تھا اس لیے مَیں نے اُسے پہلے ہی قدم پر ٹوک دینا مناسب سمجھا اور بولا "مَیں جھُوٹا نہیں ہُوں ادغیر۔ مَیں نے جو کہا تھا وہ سچ ثابت کر دکھایا۔"

"جی ہاں" وہ بولا "مَیں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن مَیں نہیں سمجھتا کہ آپ کا کوئی معجزہ آشوریوں کو شکست دے سکتا ہے۔ ویسے آپ ولی عہد اور مرضی کے مالک ہیں۔ مَیں صرف ایک کپتان اور آپ کا مخلص خادم ہوں۔"

"بس تو پھر اتنا یاد رکھو کپتان کہ فیصلے کرنا میرا کام ہے اور اُن پر عمل کرنا تمھارا۔" مَیں نے قدرے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔ مَیں یہ بات کبھی نہیں بھُولوں گا۔" اُس نے جواب دیا۔

"آج رات تمھیں میرا ایک کام کرنا ہو گا ادغیر۔ اُس کے بدلے میں تمھارے اور تمھارے آدمیوں کے لیے کچھ کروں گا۔ کیا تمھیں عورتوں سے دلچسپی ہے؟" مَیں نے پُوچھا۔

"یقیناً جنابِ عالی۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ وضاحت کریں گے؟"

"تم جانتے ہو کہ سہراب نے مجھے حسین و جمیل عورتوں پر مشتمل ایک حرم دیا ہے۔ فی الوقت مجھے حرم کی ان حسیناؤں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" مَیں نے کہا۔

"یہی ایک بات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ آپ عام انسانوں سے بلند ہیں ورنہ کوئی ایسا مرد ہے جو حسن و جوانی سے گریز کرے۔" ادغیر بولا "آپ آج رات مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟"

"سہراب کے حرم میں طاؤسہ نامی ایک عورت شامل ہے۔ مَیں چاہتا ہُوں کہ آج رات تم اسے یہاں لے آؤ۔ تم چاہو تو سہراب کو بھی یہ بات بتا سکتے ہو۔ جب اُسے اُس کے بُلاوے کا مقصد معلوم ہو گا تو اُسے بھی طاؤسہ کے یہاں آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"میرے خیال میں اُسے بتانا مناسب نہیں ہو گا۔ ہر چند کہ وہ اب عورتوں سے بے نیاز ہو چکا ہے مگر اس سلسلے میں جذبۂ رقابت سے بے نیاز نہیں ہُوا۔ تاہم آپ طاؤسہ کو کیوں بُلانا چاہتے ہیں؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے ادغیر۔ اس کام کے عوض تم اپنے اور اپنے آدمیوں کے لیے جتنی کنیزیں چاہو، میرے حرم سے لے سکتے ہو۔"

"شاید آپ میرا مطلب نہیں سمجھے جناب۔ مَیں نے وجہ اس لیے پوچھی تھی کہ اب آپ کا اور سہراب کا رشتہ باپ بیٹے جیسا ہو گیا ہے۔ مَیں نہیں چاہتا کہ آپ کے اور اُس کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ تاہم یہ کام آسانی سے ہو جائے گا۔ طاؤسہ آج رات آپ کی خواب گاہ میں پہنچ جائے گی۔"

اور رات کو طاؤسہ میری خواب گاہ میں پہنچ گئی۔ جونہی اُس نے مجھے دیکھا، گھٹنوں کے بل جھُکی اور کانپنے لگی۔ مَیں نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھاتے ہُوئے کہا "کیا بات ہے طاؤسہ، کیا تم مجھ سے خوفزدہ ہو؟"

"ہاں شہزادے۔ اب آپ ولی عہد ہیں اور مَیں وہی معمُولی سی کنیزِ حرم۔" وہ بولی۔

"لیکن مَیں تمھارے لیے صرف سرفروش ہُوں طاؤسہ اور صرف سرفروش ہی رہوں گا۔ مَیں تمھارا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر حرم میں نہیں آ سکتا تھا۔ اسی لیے مَیں نے تمھیں زحمت دی ہے۔ تمھیں یہاں آنے میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟"

"نہیں۔" وہ بولی "ادغیر کی بات کسی میں ٹالنے کی ہمت ہے نہ اس پر اعتراض کرنے کی۔"

"تمھاری سہیلی روشی کیسی ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

"اب اُسے یہ پچھتاوا ہو رہا ہے کہ میری بجائے اُس نے تمھیں پناہ کیوں نہ دی ورنہ وہ انعام کی حقدار ٹھہرتی۔"

"اے ہاں۔ انعام کی مستحق تو تم ہو اور تمھیں انعام ضرور ملے گا۔"

"مجھے کسی انعام کی نہیں، بچے کی ضرورت ہے اور تم نے وعدہ کیا تھا کہ جب تم اپنے اصلی رُوپ میں آ جاؤ گے تو مجھے بیٹا ضرور ملے گا۔" اس نے مجھے وہ وعدہ یاد دلایا جو مَیں نے محض اپنی جان بچانے کے لیے کر لیا تھا اور جسے صرف قدرت ہی پُورا کر سکتی تھی۔

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے طاؤسہ۔ تم نے پہلے بھی مجھ پر احسان کیا تھا اور اب بھی مَیں تم سے ایک اور احسان کا متمنی ہُوں۔"

"وہ کیا؟" اُس نے پُوچھا۔

"مَیں جانتا ہُوں کہ میرے بارے میں لوگ بہت سی باتیں کر رہے ہیں اور میرے خلاف سازشیں بھی کی جائیں گی۔ اس لیے مَیں چاہتا ہُوں کہ تم اپنے اعتماد کی کچھ سہیلیوں سے کہو کہ وہ میرے بارے میں جو کچھ سُنیں یا اُنھیں کسی سازش کا علم ہو تو وہ تمھیں بتا دیا کریں اور تم وہ سب مجھے بتا دیا کرو۔"

"یہ کوئی بڑی بات نہیں سرفروش۔ حرم کی عورتوں کو اُن لوگوں سے بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے جن سے وہ چوری چھُپے ملتی ہیں لیکن سہراب کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ مَیں تمھارے لیے کیا کر رہی ہُوں ورنہ وہ رقابت میں میرا سر قلم کروا دے گا۔"

"اُسے بالکل معلوم نہیں ہو گا طاؤسہ۔ تم بے فکر رہو۔" مَیں نے اُسے یقین دلایا۔

کچھ دیر بعد جب وہ میری خواب گاہ سے نکلی تو بڑی آسودہ اور مطمئن تھی۔

مَیں بستر پر لیٹ کر حالات پر غور کرنے اور مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ اتنے میں وہ گھنٹیاں بج اُٹھیں جو دروازے پر آویزاں پردے کے ساتھ لگی ہُوئی تھیں۔ مَیں فوراً چوکنا ہو گیا۔ رات کو اس وقت میری خواب گاہ میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی لیکن گھنٹیوں نے کسی کی آمد کا اعلان کیا تھا۔ مَیں نے لپک کر کرسی پر رکھی تلوار اُٹھا لی اور اُس پردے کی طرف بڑھا جو کچھ اُبھرا ہُوا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اُبھار اس بات کا ثبوت تھا کہ کوئی پردے کے پیچھے چھُپا ہُوا ہے۔ مَیں نے آگے بڑھ کر تلوار کی نوک اُس اُبھار پر رکھ دی اور بولا۔

"باہر آ جاؤ ورنہ تلوار تمھارے جسم کے آر پار ہو جائے گی۔"

پردے کے پیچھے سے آواز آئی "تم شہزادی فرازیہ سے مخاطب ہو سرفروش۔ ادب سے بات کرو۔"

• •

فرازیہ کی آواز میں بڑی نخوت تھی اور کھنک تھی۔ مَیں تین قدم پیچھے ہٹا اور بولا۔

"مَیں چشم براہ ہوں شہزادی۔ باہر تشریف لائیے۔"

پردہ درمیان سے وا ہُوا تو گھنٹیاں پھر بج اُٹھیں اور

شہزادی باہر آکر رک گئی۔ وہ اتنی حسین ہوگی، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ سرو قد تھی، ماہ وش تھی اور ازمیر کی پہلی عورت تھی جس کے حسین سراپا کا بالائی حصہ بھی لباس میں مستور تھا۔ اُس کے بال سُرخ تھے اور آنکھیں سبز زمرد کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کے تیکھے خدوخال، دیکھنے والے کو پہلی نظر میں دیوانہ بنا دینے کے لیے کافی تھے۔ میں دو قدم مزید پیچھے ہٹا اور قدرے جھک کر اُسے تعظیم دیتے ہوئے بولا۔

"مجھے خوشی ہے کہ بالآخر ہماری ملاقات ہو گئی لیکن یہ ملاقات اس انداز میں متوقع نہیں تھی۔" آپ کب سے پردے کے پیچھے کھڑی تھیں؟ اور یہاں کیسے آئیں؟"

اُس نے جواب دینے کی بجائے سبز سمندروں جیسی گہری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اس کی تیز سانسیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ کافی دیر سے پردے کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس امر کی گواہی اس کے چہرے پر چمکنے والے پسینے کے قطرے بھی دے رہے تھے پھر وہ بولی۔

"میں اُس وقت سے یہاں کھڑی ہوں جب تم اُس کنیز سے باتیں کر رہے تھے اور تمھاری خواب گاہ میں دریچے سے داخل ہوئی تھی..."

"مگر باہر محافظ موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ آپ کا آدمی ہے؟"

"نہیں۔ وہ تمھارا وفادار ہے۔ شاید تم نہیں جانتے کہ پہلے کبھی میں بھی اِس محل میں رہتی تھی۔ یہاں دریچے تک پہنچنے کے لیے ایک زمین دوز خفیہ راستہ موجود ہے۔ میں اسی راستے سے آئی اور انتظار کرتی رہی کہ تمھارا محافظ حوائجِ ضروری کے لیے ہٹے تو میں اندر آ جاؤں۔"

"اوہ۔ مجھے واقعی اُس راستے کا علم نہیں تھا۔ آپ کھڑے کھڑے تھک گئی ہوں گی۔ تشریف رکھیے۔" اور ساتھ ہی میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ مگر وہ کرسی کی بجائے بستر پر بیٹھ گئی اور عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی جن میں غصہ بھی تھا اور غرور بھی... میں خاموش ہی رہا تو وہ بولی۔ "تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کیوں آئی ہوں؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ خود نہیں آئیں بلکہ ارژنگ نے آپ کو بھیجا ہے۔"

"ہاں یہ صحیح ہے۔" اُس نے کہا۔ "وہ تم سے ملنا اور باہمی دلچسپی کے معاملات پر گفتگو کرنا چاہتا ہے۔"

"تو وہ خود ہی مجھ سے ملنے کیوں نہیں آیا؟" میں نے پوچھا۔

"فی الوقت وہ بے حد مصروف ہے اس لیے خود نہیں آ سکتا۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں شہزادی۔ وہ میرے اور سہراب کے خلاف سازش کی منصوبہ بندی میں اتنا مصروف ہے کہ اُسے مجھ سے ملنے کا وقت نہیں مل سکتا۔ وہ سہراب کی موت کا بھی شدت سے منتظر ہے۔ اُسے کہہ دیجیے گا کہ وہ اتنا بے صبرا نہ بنے سہراب کسی بھی وقت مر سکتا ہے۔ اُس کے بعد اُسے صرف مجھ سے نمٹنا پڑے گا۔"

شہزادی فرازیہ بڑے اطمینان سے میری بات سنتی اور مسکراتی رہی پھر اُس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ "تمھیں ارژنگ کے بارے میں بڑی غلط فہمی ہے سرفروش۔ تم نے اُس کے متعلق صرف سہراب اور اُس کے دوستوں کی باتیں سُنی ہیں تمھیں یک طرفہ باتوں سے نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے۔"

"آپ کی دلیل میں وزن ہے شہزادی۔" میں بولا۔ "میں آپ کے کاہنِ اعظم سے کب اور کہاں ملوں؟"

وہ بستر سے اُٹھ کر میرے قریب آ گئی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کا شاداب مہکتا سراپا پکار بن کر رہ گیا ہو۔ اُس کے نیم وا لب بہت ہلکے تھرتھرا رہے تھے اور سانسیں اُلجھی اُلجھی سی لگ رہی تھیں۔

"کل دوپہر کو... نصف النہار کے وقت۔ کیا تم نے اہراموں والا میدان دیکھا ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا وہ اہرام بھی دیکھ چکے ہو جو سہراب اپنے لیے تعمیر کروا رہا ہے؟" فرازیہ نے پوچھا۔

"ہاں۔ مگر میں نے اُسے دُور سے دیکھا تھا۔" میں بولا اور اس کے ساتھ ہی مجھے سہراب کی بات یاد آ گئی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اُس کے آبا و اجداد نے اپنے لیے چھوٹے چھوٹے اہرام تعمیر کروائے تھے مگر وہ اپنے لیے اُن سے کئی گنا زیادہ وسیع و عریض اور بلند اہرام بنوا رہا ہے جس کے نیچے بھول بھلیاں ہوں گی تاکہ اس کے مرنے کے بعد کوئی بھی اُس کی قبر سے ہڈیاں نکال کر اُن کی بے حُرمتی نہ کر سکے۔" میں سہراب کی اس سوچ پر مسکرا دیا۔ شہزادی فرازیہ میری مسکراہٹ کے کچھ اور معنی لیتے ہوئے بولی۔

"تمھیں ارژنگ سے نہیں ڈرنا چاہیے سرفروش بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میری طرح وہ بھی تم سے کچھ خوفزدہ ہے اور مفاہمت کی شرائط طے کرنا چاہتا ہے۔"

"میں اُس سے ضرور ملوں گا شہزادی۔ مگر تنہا نہیں آؤں گا۔" [illegible] نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ وہ زیرِ تعمیر اہرام کے درمیانی حصے میں رہتا [illegible]اب اپنے محافظ کو دروازے پر بلاؤ تاکہ میں دریچے سے [illegible]کل جاؤں۔"

میں نے دروازے پر جا کر محافظ کو پکارا تو وہ دریچے کی [illegible]چل دی۔ جب محافظ میرے پاس آیا تو میں نے اُسے کہا۔ [illegible] کہیں پائیں میں ایک زمین دوز خفیہ راستہ ہے کہاں؟ یہ [illegible]نہیں جانتا مگر ہے ضرور۔ تم کچھ آدمیوں کے ساتھ اُسے تلاش [illegible]ور جب تک وہ راستہ تلاش نہ کر لو، میرے پاس نہ آنا۔"

محافظ نے مجھے تعظیم دی اور چلا گیا۔

میں نے بستر پر لیٹ کر ارتکازِ توجہ سے دوبارہ کمپیوٹر کو [illegible]بھیجنا چاہا لیکن میرا کرسٹل کام نہیں کر رہا تھا اس لیے میں [illegible]یا۔

• •

دوسرے روز جب میں، اوغیر اور محافظ دستے کے ساتھ گھوڑے [illegible]محل کے جنوب میں واقع اہراموں والے میدان کی طرف بڑھ رہا تھا [illegible]یر بڑا کبیدہ خاطر تھا۔ میں نے اُسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور میدان [illegible]زہ لینے لگا۔ یہ میدان چاروں طرف میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس [illegible]جا بجا مخروطی اہرام بنے ہوئے تھے۔ انھی کے درمیان سہراب کا [illegible] اہرام بھی زیرِ تعمیر تھا۔ اتنے میں اوغیر بول اُٹھا۔

"آپ کا یہ اقدام نہ میری سمجھ میں آیا ہے اور نہ سہراب اسے پسند [illegible]گا۔ ارژنگ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا جناب! ایک جانب وہ [illegible] اعظم ہے اور دوسری طرف وہ مقبروں کے درمیان ایک زیرِ تعمیر [illegible]میں رہتا ہے۔ سازشیں اور کالا جادو کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ [illegible]ہمیں کسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑے گا۔"

میں نے اُس کی بات پر ایک نظر اپنے دس مسلح سواروں کی [illegible] دیکھا۔ میں خود بھی پوری طرح مسلح تھا اور اوغیر بھی... میں نے [illegible]ہوئے اوغیر سے کہا۔

"اگر ہم لوگ کسی مشکل صورتِ حال میں کاہنوں پر غالب [illegible] آ سکتے تو ہمیں سپاہ گری چھوڑ دینی چاہیے اوغیر... تمھیں [illegible]ہٹ ہو رہی ہے تو میں خود اُن سے نمٹ لوں گا اور ہاں... اگر [illegible] یہ ملازمت پُرخطر نظر آتی ہے تو تم مجھے چھوڑ کر جا سکتے ہو۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے جناب!" اوغیر نے جواب دیا۔ [illegible]پ تو دیوتا یا دیوتاؤں جیسے انسان ہیں اور اُن چیزوں سے خوفزدہ نہیں ہو سکتے جن سے ایک عام آدمی ڈرتا ہے۔ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ ارژنگ اور اُس کے کاہن بڑے خوفناک ہیں۔ اُن کے پاس عجیب الخلقت بلائیں ہیں جنھیں دیکھ کر آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔"

"وہ اُن بلاؤں سے کیا کام لیتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بلائیں اُن کے خزانے کی حفاظت کرتی ہیں جناب! اگر کوئی خزانہ چُرانے کے لیے بھول بھلیوں میں جاتا ہے تو بلائیں اُس کا خون پی جاتی اور پرخچے اُڑا دیتی ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ اُن کاہنوں کے پاس، جن کا سربراہ ارژنگ ہے، بہت بڑا خزانہ ہے۔"

"جب تک میں یہ بلائیں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔ مجھے یقین نہیں آئے گا۔" میں نے اُسے جواب دیا اور زیرِ تعمیر مقبرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

سہراب کا یہ اہرام سطحِ زمین سے تقریباً تین سو فٹ اُونچائی تک بن چکا تھا اور ابھی اس کی تعمیر جاری تھی۔ اس کے چاروں طرف مختلف قسم کی عجیب سی مشینیں اور ہزاروں مزدور کام کر رہے تھے۔ سنگِ مرمر سے تیار ہونے والی یہ یادگار فنِ تعمیر کا نادر نمونہ تھی۔ اوغیر نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ سہراب اپنے اس مقبرے کی تکمیل تک زندہ رہ سکے گا۔ یہ تین سو ہاتھ اُونچائی تک بن چکا ہے مگر وہ اسے مزید تین سو ہاتھ اونچا بنوانا چاہتا ہے۔ ہاں اگر اُس کے پاس مزید ایک لاکھ غلام ہوں تو شاید یہ اُس کی زندگی میں مکمل ہو جائے۔"

"اس اہرام کا معمار کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اُس کا نام فرہاد ہے۔ وہ ایک باکمال معمار ہے۔ میں نے ہی اُسے عین اُس وقت گرفتار کیا تھا جب اُس نے خلیج عبور کر کے ازمیر کی سرزمین پر قدم رکھے تھے۔"

"لیکن مجھے تو یہ بتایا گیا ہے کہ آشوری ہتھیار ڈالنے اور غلام بننے پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"یہ سچ ہے جناب!" اوغیر بولا۔ "مگر فرہاد کا معاملہ استثنا میں شمار ہوتا ہے۔ لوگ سہراب کو احمق سمجھتے ہیں مگر وہ بڑا مردم شناس ہے اُس نے فرہاد کو اپنی قابلیت اور ذہانت دکھانے کا موقع دیا۔ اب وہ آزاد شہری ہی نہیں، ایک بڑا عہدے دار بھی ہے۔"

"میں اُس سے ملنا اور کچھ باتیں کرنا چاہوں گا اوغیر۔" میں نے کہا۔ "اگر مجھے آشوریوں پر فوج کشی کرنی ہے تو مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ لوگ کیسے ہوتے ہیں۔"

"آپ کی مرضی جناب، ورنہ میں آشوریوں پر چڑھائی کو حماقت

سمجھتا ہوں۔ جہاں تک فرہاد کا معاملہ ہے۔ وہ کوئی عام سا آشوری نہیں بلکہ ایک قابل اور پڑھا لکھا آدمی ہے۔ دراصل آشوریوں کے سربراہ حُمیر سے اس کا اختلاف ہوگیا تھا جو بڑا وحشی اور ظالم آدمی ہے۔ اس لیے فرہاد وہاں سے فرار ہو کر یہاں آگیا۔"

"حُمیر کے متعلق بعد میں بات کریں گے مگر آج ارژنگ سے ملاقات کے بعد تم مجھے فرہاد سے ضرور ملاؤ گے۔" میں نے ادغیر کو حکم دیا تو وہ سر جھکا کر راضی ہوگیا۔

ہم اہرام کے مغربی اور شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مشرقی جانب آئے تو غار نما دروازے پر دو کاہن کھڑے دکھائی دیئے۔ اس سرزمین پر آمد کے بعد میں نے پہلی بار "کوّے" دیکھے تھے۔ چونکہ یہ لوگ از سرتا پا سیاہ لبادوں میں لپٹے رہتے تھے، اس لیے عرفِ عام میں کوّے کہلاتے تھے۔

مَیں نے محافظ دستے کے سپاہیوں کو رُکنے کا اشارہ کیا اور ادغیر کے ساتھ اُن کاہنوں کی طرف بڑھ گیا۔ ادغیر نے اُن میں سے طویل القامت کاہن سے کہا۔

"ولی عہدِ سلطنت کاہن ارژنگ کو شرفِ ملاقات بخشنا چاہتے ہیں۔ اس تک ہماری رہ نمائی کرو۔" یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنی شمشیر کے دستے پر چلا گیا۔

کاہنوں نے ادغیر کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اپنی ہیروں کی مانند چمکتی آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں۔ انھوں نے اپنے سیاہ لبادوں پر سفید پٹیوں میں خم دار خنجر اُڑس رکھے تھے جن کی نیام میں ہاتھی دانت کی تھیں۔ جب وہ بولے تو پتہ چلا کہ اُن کی آواز بے حد کرخت ہے جس سے بے رحمی بھی جھلکتی ہے۔ دراز قد کاہن نے کہا۔ "کیا تم ہی سرفروش ہو؟"

"ہاں۔۔" میں نے جواب دیا۔ "مجھے ارژنگ کے پاس لے چلو۔" اور یہ کہتے ہوئے مَیں گھوڑے سے اُتر گیا۔ ادغیر نے بھی میری تقلید کی مگر مَیں نے اُسے وہیں ٹھہرنے کا حکم دیا اور دراز قد کاہن کے پیچھے پیچھے جانے لگا جو سر جھکائے میری رہ نمائی کر رہا تھا۔

ہم غار نما دروازے سے پُر پیچ راستہ طے کرتے ہوئے ایک بڑے ہال میں پہنچے جس کی ہر جانب بہت سی راہداریاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ ساری راہداریاں ایک ہی طرز کی تھیں اور اُن میں روشنی کا عجیب انتظام تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر راہداری میں کسی پہیے کی تاروں کے پیچھے سے روشنی ڈالی جا رہی ہے جس سے اندھیرا اور اجالا لکیروں میں بٹ گیا ہے۔ کاہن نے ایک دیوار سے آویزاں شمع دان اُتارا اور حسبِ سابق خاموشی سے میرے آگے آگے چلنے لگا۔ یہ راہداری ہمیں ایک اور ہال میں لے آئی جس کے چاروں طرف ویسی ہی راہداریاں بنی ہوئی تھیں۔ کاہن اور مَیں ایسے متعدد کمروں سے مختلف سمتوں کی راہداریوں سے گزرتے رہے اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ مَیں زندگی بھر ان بھول بھلیوں سے نہیں نکل سکتا۔ اب کاہن کی رفتار تیز ہوگئی تھی، جیسے وہ مجھے بھول بھلیوں میں اُلجھا کر خود نکل جانا چاہتا ہو۔ مَیں نے بھی اپنی رفتار بڑھا لی تا کہ اگر وہ میرے ساتھ کوئی چال چلے تو میں اُسے تلوار کی نوک پر رکھ لوں۔ درجنوں کمروں اور راہداریوں کو عبور کرتے ہوئے بالآخر وہ ایک سُرنگ میں داخل ہوا جس کے اختتام پر تنگ سیڑھیاں اُوپر چلی گئی تھیں۔ یہ زینہ چڑھنے کے بعد ہم ایک گول کمرے میں آئے جس کے وسط میں ایک گڑھا تھا اور اس گڑھے پر ایک چوبی چبوترہ بنا ہوا تھا۔ کاہن نے مجھے اُس چبوترے پر چڑھنے کا اشارہ کیا۔

جب میں چبوترے پر چڑھا تو وہ چوکی نما چبوترہ ایک دم تیزی سے نیچے جانے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی گہرے کنوئیں میں گر رہا ہوں۔ مَیں نے بے ساختہ اپنی تلوار نکال لی اور دُکھ سے سوچا کہ مجھے ادغیر کو اپنے ساتھ لانا چاہیے تھا مگر اَب کیا ہو سکتا تھا۔ اچانک وہ چبوترہ یوں تھم گیا جیسے لفٹ رُک جاتی ہے۔ مَیں نے دیکھا کہ اس کھوہ میں چاروں طرف دروازے بنے ہوئے ہیں مگر اُن میں سے صرف ایک سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ مَیں اُسی دروازے سے باہر نکل آیا۔

یہ ایک بڑا کمرہ تھا جس کی ایک دیوار کے ساتھ آگ جل رہی تھی اور مدھم سی سُرخ روشنی اُسی آگ سے پھوٹ رہی تھی۔

کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری تھی جس سے مجھے اُلجھن ہونے لگی مگر میں تلوار تھامے وہیں کھڑا رہا۔۔ پھر میری دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی چلی گئیں۔ اس مدھم روشنی میں مجھے ایک ہیولا اپنی طرف بڑھتا دکھائی دے رہا تھا۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

یہ شہزادی فرازیہ کا ہیولا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی، میرے قریب آئی اور رُک گئی۔

آج وہ کل رات سے بھی زیادہ حسین لگ رہی تھی اور اس نے ازمیر کی عام خواتین کا سا لباس پہن رکھا تھا۔ اُس کے جسمانی حُسن نے مجھے مسحور سا کر دیا۔ وہ شہہ دینے والے انداز میں نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکرائی مگر پھر ایک دم مڑ گئی اور بولی۔

"اپنی تلوار نیام میں ڈال لو اور میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ ارژنگ تمھاری راہ دیکھ رہا ہے۔"

مَیں نے تلوار نیام میں ڈال دی مگر میرا ہاتھ اُس کے دستے پر ہی رہا اور میں فرازیہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس کمرے سے بھی متعدد راہداریاں نکلتی تھیں۔ وہ ایک راہداری میں داخل ہوئی جو ہمیں ایک اور کمرے میں

لے آئی۔ یہاں بہت سے انسانی پنجر رکھے اور لٹکے ہوئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے یہ سب مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اتنے میں فرازیہ بولی۔ "ارژنگ بہت بڑا عالم ہے سرفروش۔ یہ پنجر کسی کو ڈرانے کے لیے نہیں لٹکائے گئے وہ ان پر تجربے کرتا ہے۔ یہ جسمِ انسانی کے مطالعے کی غرض سے یہاں رکھے گئے ہیں۔ ارژنگ ایک ایک عضو کی ہڈی کا نام جانتا ہے۔"

پھر ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک کونے میں آگ جل رہی تھی۔ آگ کی تپش سے کمرہ خاصا گرم ہو رہا تھا۔ فرازیہ نے کہا۔ "جب ارژنگ کو کسی ایسے اوزار کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے پاس نہ ہوں تو وہ خود اُسے ڈھال لیتا ہے۔ اس نے بہت سی کلیں ایجاد کرنی ہیں جو خود بخود کام کرتی ہیں۔"

میں نے فرازیہ کو کوئی جواب نہ دیا اور سوچنے لگا کہ ارژنگ کوئی عام سا کاہن نہیں اور اس سے برابر ہی کی ٹکر ہوگی۔

فرازیہ چمڑے کے ایک بھاری پردے کے پاس رُک گئی اور بولی۔ "ارژنگ تمھارا منتظر ہے۔ پہلے وہ خود علیحدگی میں تم سے بات کرے گا۔ جاؤ۔"

میں پردہ ہٹانے کے لیے آگے بڑھا تو فرازیہ ایک دم پلٹی اور مجھ سے ٹکرا گئی۔ اس حسین ٹکرے سے میرے جسم میں جیسے برقی رو دوڑ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارژنگ سے ملاقات کے بعد تمھاری اور میری ملاقات ہوگی۔ میں تمھارے متعلق جاننے کے لیے بے چین ہوں۔" پھر اس نے سامنے سے ہٹ کر خود ہی پردہ ہٹا دیا اور میں اندر چلا گیا۔

یہ کمرہ نسبتاً چھوٹا اور مختلف چیزوں سے اَٹا ہوا تھا۔ کہیں مختلف جانوروں کے پنجر رکھے تھے اور کہیں انسانی کھوپڑیاں۔ ایک جانب بیش قیمت اور ایسے آلات بھی رکھے نظر آئے جو سائنسی لیبارٹریوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ کمرے کے آتشدان میں آگ جل رہی تھی اور آتش دان کے سامنے ہی ایک بڑی میز کے پیچھے ارژنگ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ باب الداخل والے کاہنوں کی طرح سیاہ لباس پہنے ہوئے تھا۔

"آگ کی روشنی میں آجاؤ سرفروش۔ تقریباً تین ہفتے پہلے جب میں نے تمھیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو تم بچے تھے۔ روشنی میں آجاؤ تا کہ وہ معجزہ میں بچشمِ خود دیکھ سکوں جو ان تین ہفتوں کے دوران تمھاری شکل میں رونما ہوا ہے۔"

میں آتش دان میں بھڑکنے والے شعلوں کی لرزتی روشنی میں آگیا۔

"کیا تم ہی کاہنِ اعظم ارژنگ ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں ہی ارژنگ ہوں اور تم ہی وہ سرفروش ہو جسے میں نے ایک بچے کی شکل میں دیکھا تھا۔ کس شعبدے نے تمھیں دنوں میں اتنا بھرپور جوان بنا دیا ہے؟ میں اُس شعبدے سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے اپنے سینے میں سمیٹا ہوا تمام علم نذر کرنے کو تیار ہوں۔"

میں روشنی سے اندھیرے میں پلٹ گیا۔ خدا معلوم یہ اُس کمرے کے ماحول یا کاہن ارژنگ کی شخصیت و آواز کا اثر تھا یا کچھ اور کہ مجھے اپنے دل میں خوف و ہراس کروٹیں لیتا محسوس ہوا۔ میں نے اپنے

جسم میں بھی ایک لرزہ سا محسوس کیا مگر اُس پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"میں نے تمھاری خواہش پوری کردی ہے ارژنگ۔ اب تم اپنا رُخ روشنی کی طرف موڑ دو تاکہ میں بھی تمھیں دیکھ سکوں۔"

وہ ہنسا اور یہ کہہ کر اُس نے اپنا رُخ روشنی کی طرف موڑ دیا۔

"تم یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہو سرفروش۔"

میں نے آتش دان کی لرزتی روشنی میں اُس کے چہرے پر نظر ڈالی جو زعفران کی طرح زرد تھا اور اُس میں دو بڑی سیاہ آنکھیں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اُس کا سر لمبوترا اور گردن کسی کرگس کی طرح لمبی تھی جس میں نیلی رگیں اُبھری ہوئی یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے جونکیں چمٹی ہوئی ہوں۔ ان سب سے زیادہ عجیب یہ بات تھی کہ نہ اُس کے سر پر بال تھے، نہ داڑھی مونچھیں اور نہ بھویں۔ وہ ایک انڈے کی طرح سفید اور چکنا نظر آرہا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر تعجب ہُوا کہ شہزادی فرازیہ اُسے کیسے پسند کرتی ہے۔ اتنے میں وہ یوں بول اُٹھا جیسے اُس نے میرا ذہن ایک کھُلی کتاب کی طرح پڑھ لیا ہو۔ "صورت کسی کی ذات، شخصیت اور علمیت کی مظہر نہیں ہوتی نہ جسمانی ساخت سے آدمی کی مہارت اور ہنرمندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تم نے مجھے اچھی طرح دیکھ لیا ہے مگر تم نے وہ کچھ نہیں دیکھا جو میں اصل میں ہُوں۔ بیٹھ جاؤ اور میری بات غور سے سنو سرفروش۔ نہ تم بے وقوف ہو اور نہ میں نادان ہُوں مجھے وقت کا زیاں قطعی پسند نہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ صرف سچ بولیں تو معاملات بہت جلدی اور بڑی آسانی سے طے ہو جائیں گے۔ کیا تم میرے اس خیال سے متفق ہو؟"

"میں اصولی طور پر اس خیال سے متفق ہُوں۔" میں نے اُس کی پشت پر دیوار سے آویزاں اجرام فلکی کے ایک نقشے پر نظر ڈالتے ہُوئے جواب دیا۔ اس نقشے سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ستارہ شناس بھی ہے۔ وہ پھر بولنے لگا۔

"میں ایک عملی آدمی ہُوں اور طاقت کا خواہاں ہُوں۔ میں اب بھی طاقت ور ہُوں مگر مجھے مزید طاقت و قوت درکار ہے تاکہ وہ سب کچھ کرسکوں جو کرنا چاہتا ہُوں۔ میں تمھیں بآسانی قتل کروا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا محض اس لیے نہیں کیا کہ میرے خیال میں تم میرے اچھے معاون ثابت ہوسکتے ہو اور میں بھی تمھاری مدد کرسکتا ہُوں۔ اگر یہ بات درست ہے تو ہمارے مابین ایک دوسرے کے خلاف مخاصمت سراسر حماقت ہوگی۔"

"یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے کہ میں تمھاری معاونت کرسکتا ہُوں مگر تم میرے مددگار کیوں کر بن سکتے ہو، یہ امر وضاحت طلب ہے۔"

وہ ہنسا اور بولا۔ "میں بہت سے طریقوں سے تمھارا معاون بن سکتا ہُوں سرفروش۔ میں تمھیں مفید مشورے بھی دے سکتا ہُوں [illegible] بھی کرسکتا ہُوں، تمھارے مفاد میں وحشت و بربریت سے بھی گریز [illegible] کروں گا اور تمھارے لیے خزانوں کے دروازے بھی کھول دوں گا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ تمھاری جان کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔"

مجھے اُس کی اس بات پر تاؤ آگیا۔ میں نے دستۂ شمشیر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم بار بار میرے قتل کی بات کرکے میری غیرت کو للکار رہے ہو۔ اگر تمھیں اس بات کا یقین ہے کہ مجھے موت کے گھاٹ اُتار سکتے ہو تو ابھی اسی وقت ایک کوشش کرکے اپنے آپ کو کیوں نہیں آزما لیتے؟"

یہ سُن کر اُس کی آنکھوں میں شعلے سے لپکنے لگے لیکن وہ ہنستے ہُوئے بولا۔ "میرا طریقِ کار کچھ اور ہے سرفروش۔" پھر اس نے اپنی کھوپڑی کو انگلیوں سے بجاتے ہُوئے بات جاری رکھی۔ "میری طاقت تلوار میں نہیں دماغ میں ہے۔ میری بات غور سے سنو، ہم بچّے، نادان غلام یا سیدھے سادے آدمی نہیں۔ یہ بتاؤ کہ تمھارا تعلق کس سرزمین، کس ملک سے ہے؟"

اس کا اندازِ تخاطب ایسا تھا جیسے وہ کسی بچّے سے ہمکلام ہو۔ اس پر غصّہ تھا اور میں اُسے بآسانی قتل کرسکتا تھا لیکن اس کے بعد مقبرے کی بھُول بھلیوں سے نکل کر باہر نہیں جاسکتا تھا۔ اس لیے میں نے کہا۔ "یوں سمجھ لو کہ میں کسی دوسرے سیارے سے آیا ہُوں، کیسے؟ یہ تم نہیں سمجھ سکتے۔ یہ باتیں تمھاری فہم و ادراک سے بالاتر ہیں۔"

"اتنے خود پسند اور مغرور و متکبّر مت بنو سرفروش۔ تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں وہ باتیں نہیں سمجھ سکتا؟ کیا تم یقین کروگے کہ میں بہت پہلے یہ جان چکا ہُوں کہ کائنات میں صرف ہمارا سیارہ ہی نہیں اور بھی بہت سے سیارے ہیں۔ میں زمان و مکاں کے نظریے سے بھی آگاہی رکھتا ہُوں۔ ہوسکتا ہے کہ تم کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہو لیکن ایک مہینے میں تمھارا جوان ہو جانا دیوتاؤں کا معجزہ نہیں۔ یہ دماغ اور علم کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔ میں نہ اسے سمجھ سکتا ہُوں نہ ایسا کرسکتا ہُوں لیکن اگر اس کی وضاحت کی جائے تو میں اسے سمجھ بھی جاؤں گا اور کر سکوں گا۔ تم کوئی مافوق البشر نہیں ہو کہ مجھ سے اپنے آپ کو برتر محسوس کرو۔ میں تمھیں زندہ رکھنا اور تم سے سب کچھ سیکھنا چاہتا ہُوں جو تم جانتے ہو۔ مرنے مارنے کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔"

اس کی ان باتوں سے میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ میری ٹکر کا مدِّ مقابل ہے۔ میں نے کہا۔ "اچھی بات ہے ارژنگ۔ وقت آنے پر میں تمھیں بتادوں گا کہ میں کون ہُوں اور یہاں کیسے آیا ہُوں۔ سمجھنے کا دارومدار تمھاری صلاحیت و اہلیت پر ہے۔ اس کے بدلے میں تم میری جان و ایمان کے علاوہ کیا دے سکتے ہو؟"

"تمھیں تحفّظ کے علاوہ طاقت اور آزادی بھی ملے گی اور میں تمھیں خزانہ دوں گا یا وہ جگہ دکھادوں گا جہاں سے تم وہ خزانہ حاصل کرسکو گے۔"

"مگر کس قسم کا خزانہ؟" میں نے پوچھا۔

اس پر اُس نے میز کی دراز کھولی اور کوئی چیز نکال کر میری طرف بڑھادی۔ میں نے اُسے اُٹھا کر دیکھا تو فرطِ حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ ایک بہت بڑا ناتراشیدہ ہیرا تھا۔ جو آتشدان کی روشنی میں اس طرح چمک اُٹھا کہ میری آنکھیں خیرہ ہوکر رہ گئیں۔

میں نے وہ ہیرا اُٹھایا تو اُس کا وزن محسوس کرکے دنگ رہ گیا۔ وہ کم از کم دس پونڈ وزنی تھا۔ میں نے اُسے آتش دان کے سامنے رکھ کر دیکھا تو یوں محسوس ہُوا جیسے اُس کی ہر نوک سے شعلے لپک رہے ہیں۔ میں نے سوچا کاش میں اسے اپنے ساتھ لے جاسکتا۔ اتنے میں ارژنگ بول اُٹھا۔

"میں جانتا ہُوں کہ یہ تمھارے لیے بے حد قیمتی ہے۔ اس کی طلب تمھارے چہرے پر لکھی ہُوئی ہے اور یہ بھی جانتا ہُوں کہ اب تم میرے ساتھ سودے بازی کی سوچ رہے ہو۔"

میں نے وہ وزنی ہیرا میز پر رکھتے ہُوئے جواب دیا۔ "تم کسی حد تک ٹھیک سمجھے ارژنگ۔ یہ پتھر تمھیں کہاں سے ملا اور کیا ایسے پتھر آسانی سے دستیاب ہوسکتے ہیں؟"

ارژنگ نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور بولا۔ "معلومات حاصل کرنے کے لیے تمھیں بھی معلومات فراہم کرنا پڑیں گی سرفروش۔ یہ بتاؤ کہ تمھاری سرزمین پر اس پتھر کو کیا کہا جاتا ہے؟"

"ہمارے ہاں اسے ہیرا کہتے ہیں اور یہ قیمتی تصور کیا جاتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہیرا...! میں نے یہ لفظ کبھی نہیں سُنا۔ مہندس فرہاد نے مجھے اس کا استعمال دکھایا تھا۔ یہ پتھر تک کاٹ دیتا ہے۔" وہ بولا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا یہ پتھر یہاں دستیاب ہے؟"

"یہ از میر میں نہیں ملتے سرفروش۔ آشوریوں کے ملک میں عام ہیں مگر وہ اسے قیمتی نہیں سمجھتے۔ وہاں اس پتھر کی بڑی بڑی چٹانوں سے بادشاہوں اور دیوتاؤں کے مجسمے بنائے جاتے ہیں۔ وہ بھی اُس وقت جب وہ مرجائیں۔ اگر تم اسے قیمتی سمجھتے اور حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمھیں خلیج کے پار آشوریوں کے ملک پر حملہ کرنا پڑے گا۔ مگر یہ آسان کام نہیں۔ آشوریوں کا سردار شمیر بڑا جنگجو ہے۔ اُسے شکست دینے والا اُس سے زیادہ بہادر اور جنگجو ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بھی جنگجو نظر آتے ہو۔ مگر کیا تم حقیقتاً بھی جنگجو ہو؟"

"یقیناً۔" میں نے اُسے جواب دیا۔ "اگر تمھارے پاس کوئی جنگجو سُورما ہو تو اُسے آزما سکتے ہو۔"

ارژنگ نے میری طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔ "ہاں میرے پاس جنگجو سورما ہے لیکن میں وقت آنے پر اُسے تمھارے مقابل لاؤں گا۔ اب ہمیں پھر اُسی موضوع پر آجانا چاہیے۔ اگر تمھیں ہیرے درکار ہیں تو تمھیں آشوریوں پر فوج کشی کرنا ہوگی۔ تم ان پر میری مدد کے بغیر فتح حاصل نہیں کرسکتے۔ بولو کرتے ہو سودا؟"

میں اُس کی اِس بات پر سوچنے لگا کہ آخر اُس کے دل میں کیا ہے۔ وہ مجھے خاموش دیکھ کر قدرے بے تابی سے بولا۔ "میں یہ بات تمھیں ابھی نہیں بتانا چاہتا تھا مگر شاید یہ تمھیں فیصلے پر پہنچنے میں مدد دے، اس لیے بتلائے دیتا ہُوں کہ سہراب مرچکا ہے۔ اُسے مرے ہُوئے ایک گھنٹہ ہوگیا ہے۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہُوا کہ وہ مرچکا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آئینے کے عکس کے ذریعے جو پیغام دیے جاتے ہیں، اُن سے۔ کیا تم نے یہاں آئینوں کے ذریعے پیغاموں کی ترسیل ہوتے نہیں دیکھی؟"

میں کئی بار آسمان پر آئینوں کی چمک دیکھ چکا تھا مگر اُس کا مقصد نہیں سمجھ پایا تھا۔ ہمارے ہاں اس طریق کار کو ہیلیوگراف کہا جاتا ہے۔ مجھے ارژنگ کی بات کا یقین آگیا۔ میں نے پوچھا۔ "تمھیں کیا پیغام ملا ہے؟"

"سہراب طبّی امداد ملنے سے پہلے ہی مرگیا۔ یہ ایک گھنٹہ پہلے کی بات ہے اور میرے جاسوس مجھے غلط اطلاع دینے کی جرأت نہیں کرسکتے۔"

اس خبر نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ ہرچند کہ سہراب ضعیف و ناتواں تھا لیکن بڑی حد تک میرا محافظ و محسن تھا۔ اس نے مجھے اپنا ولی عہد منتخب کیا تھا۔ اب اُس کی موت کے بعد مجھے اپنی طاقت، تلوار اور عیّاری سے کام لینا تھا کہ میرے حامی اور دوست بہت کم تھے اور غیر ادراس کے بارہ سپاہی میرے لیے کیا اور کتنا کچھ کرسکتے تھے؟ ارژنگ نے مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کہا۔

"تمھیں یہ سودا کر ہی لینا چاہیے سرفروش۔ نہ میں اپنے لیے کوئی مشکلات و مصائب چاہتا ہُوں نہ تم اپنے لیے پسند کروگے۔ اگر میں تمھیں قتل کروا دوں تو گھاٹے میں رہوں گا کیونکہ اس علم سے محروم ہو جاؤں گا جو تمھارے پاس ہے۔ کہو، معاہدہ کرتے ہو یا نہیں؟"

"فی الوقت میں تمھارے ساتھ معاہدہ کرنے کو تیار ہوں ارژنگ، بتاؤ مجھے کن شرائط پر کاربند رہنا ہوگا؟"

ارژنگ مسکرایا تو اُس کے جھڑے ہُوئے دانتوں والے مکروہ مسوڑھے دکھائی دینے لگے۔ وہ میز پر پڑی ایک کھوپڑی سے کھیلتے ہُوئے بولا۔

"تم دانش مند بھی ہو سرفروش۔ پہلے میری بات سنو، پھر میں تمھارے اعتراضات سنوں گا اگر ہُوئے تو... سب سے پہلے میں یہ چاہتا ہُوں کہ تم شہزادی فرازیہ سے شادی کرلو۔ اسی طرح تخت و تاج پر تمھارا اقتدار

اہلِ ازمیر کے لیے قابلِ قبول ہوگا۔ لوگ مجھ سے ڈرتے اور نفرت کرتے ہیں۔ مجھے ان کی نفرت کی پروا نہیں ہے مگر یہ میرے منصوبوں کے آڑے آتی ہے اس لیے میں پس پردہ رہنا چاہتا ہوں۔ بظاہر تم اور فرازیہ سلطنت پر حکمرانی کروگے۔ سہراب کی تدفین کے فوری بعد تم دونوں کی شادی ہو جانی چاہیے اور شادی کے بعد آشوریوں پر لشکر کشی۔ میں انھیں تباہ و برباد دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"مگر کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ وہ میرا مذاق اُڑاتے ہیں اور میری مخالفت کرتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اُس کے چہرے پر پہلی بار غصے اور نفرت کے تاثرات آئے۔ "ان کا سردار میر ایک مغرور اور ظالم آدمی ہے۔ اُسے تکبر کی سزا ملنی ہی چاہیے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی وجوہ ہیں۔ آشوریوں کے ملک پر قابض ہونے کے بعد ہمارے شمالی علاقے شورش و یلغار سے محفوظ ہو جائیں گے پھر میں مشرق، مغرب اور جنوب کے ممالک فتح کردوں گا۔ کہو تم مجھ سے متفق ہو؟"

"بشرطیکہ افواج کی کمان مکمل طور پر میرے سپرد کردی جائے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں فوج کے افسروں کا انتخاب اپنی پسند سے کروں گا اور آشور لوراسے جتنے ہیرے جواہرات لوٹوں گا، انھیں مالِ غنیمت میں سے میرا حصہ سمجھا جائے گا۔ اگر فرازیہ شادی کے لیے تیار ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"مجھے تمھاری شرائط منظور ہیں اور فرازیہ وہی کرے گی جو میں چاہوں گا۔ اب تم محل میں جاؤ اور میری ہدایات کا انتظار کرو لیکن اپنی تیاریاں جاری رکھو۔"

"اچھی بات ہے ارڑنگ میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں جانے کے لیے پلٹا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا رہا اور بولا۔

"سنو۔ فرازیہ تمھاری منتظر ہے۔ وہ بے وقوف نہیں، تم ابھی سے اس پر توجہ دو اور ہاں کسی گڑبڑ کی مت سوچنا کہ میرے جاسوسی ذرائع بہت وسیع ہیں اور اس طرح ہمیں نقصان پہنچے گا۔ اگرچہ ہم دوست نہیں مگر ایک دوسرے کے دشمن بھی نہیں بن سکتے۔ جذباتی فیصلے ہمیشہ غلط ثابت ہوتے ہیں اس لیے دل کو دماغ پر حاوی مت ہونے دینا۔"

میں باہر جانے لگا مگر حجرے کا پردہ ہٹانے سے پہلے رُکا اور پلٹ کر بولا۔ "میں فرہاد مہندس سے ملنا چاہتا ہوں کیونکہ آشوریوں پر لشکر کشی کے دوران مجھے اس سے کام لینا ہوگا۔"

"بے شک ملو اور اُس سے جو طے کرنا ہو کرو۔ دیوتا ہماری حفاظت کریں۔"

میں باہر نکل گیا۔

دوسرے کمرے میں فرازیہ میری راہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی سبز آنکھوں میں انوکھے تاثرات لیے میری طرف بڑھی اور میرا ہاتھ پکڑ کر ایک چھوٹے سے حجرے میں لے آئی۔ میں نے اُس کی آنکھوں کی تحریر پڑھ لی تھی لیکن یہ عجیب سی بات ہے کہ مجھے اُس کی طلب بالکل محسوس نہ ہوئی۔ تاہم میں نے ارڑنگ کی ہدایت پر اس کی خواہش کا احترام کیا۔ مگر ایک فرض ناخوشگوار کی طرح۔

ہم اس حجرے میں جب تک رہے، مجھے ہر طرف ایک ناگوار سی بُو پھیلی ہوئی محسوس ہوتی رہی۔ جیسے کہیں چمڑا جل رہا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ محسوس کیا کہ میں فرازیہ کو بھی مطمئن نہیں کرسکا۔ اس کے باوجود اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سا تبسم کھیلتا رہا۔ جاتے وقت میں نے پلٹ کر فرازیہ کی طرف دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ یہ ماحول اور اس کی ہنسی اپنے اندر عجیب سا اسرار لیے ہوئے تھی۔ میں نے فرازیہ سے پوچھا۔

"یہ... یہ سب کیا ہے تمھیں کس بات پر ہنسی آئی؟"

اُس نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور بولی۔ "کچھ نہیں سرفروش۔ تم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکوگے۔ جاؤ تمھیں دیر ہو رہی ہے۔"

مجھے اس پر غصہ تو بہت آیا مگر حالات کے تحت میں اس کا اظہار نہیں کرسکتا تھا اس لیے چپ چاپ اس راہداری میں آگیا جس کی طرف فرازیہ نے اشارہ کیا تھا۔

اس راہداری میں وہی طویل قامت کاہن میری رہنمائی کو موجود تھا۔ وہ مجھے اوپر اسی دروازے پر لے آیا جہاں سے ہم اندر داخل ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا اوغیر بڑے مضطرب انداز میں ٹہل رہا تھا۔ اُس نے خشمناک نگاہوں سے کاہن کو گھورتے مگر خندہ پیشانی سے میرا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کو آنے میں مزید کچھ تاخیر ہو جاتی تو میں آپ کی تلاش میں اندر آنے ہی والا تھا اور پھر مجھے جو 'کوا' دکھائی دیتا، میں اُس کا سر کاٹے بغیر نہ رہتا۔" اتنے میں کاہن غائب ہوگیا تھا اُدھر سپاہی کچھ دُور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں نے اوغیر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میری بات توجہ سے سنو اوغیر اور اُس کے بعد فیصلہ کرو۔ حالات بدل چکے ہیں اور مجھے دوستوں کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔"

پھر میں نے اُسے اپنی اور ارڑنگ کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو تفصیل سے بتادی۔ اوغیر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اُس نے مجھے اوپر سے نیچے دیکھا اور پوچھا۔ "آپ نے اُس کی باتوں سے اتفاق کیوں کیا؟"

"میرے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا اوغیر۔ میں اپنے آپ کو تنہا اور کمزور محسوس کرتا ہوں۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں نے اور میرے آدمیوں نے آپ کی وفاداری کا حلف اُٹھایا ہے اور اُسے ہر قیمت پر پورا کریں گے۔" وہ بولا۔

"اوغیر، ذرا عقل سے کام لو میرے دوست۔ درجن بھر سپاہی اور ہم تم کس کس کا مقابلہ کرسکتے ہیں؟"

"میری آواز پر بہت سے لوگ لبیک کہنے کو تیار ہو جاتے۔ کاہنوں سے نفرت کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔"

"تم کتنے آدمی جمع کرسکتے تھے اوغیر؟"

"ایک ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ۔" وہ بولا۔

"اور ازمیر میں کاہنوں کی تعداد کتنی ہے؟" میں نے پوچھا۔ "مجھے ایک جذباتی آدمی کی حیثیت سے نہیں، فوجی افسر کی حیثیت سے جواب دو۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "ارڑنگ کے چیلے دس ہزار سے کم نہیں ہوں گے مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر مجھے ایک ہزار جنگجو مل جائیں تو میں مچھروں کی طرح سارے کاہنوں کے سر اُڑا سکتا ہوں۔ اس لیے ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے اور ارڑنگ سے پہلے..."

"نہیں اوغیر۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ کھیل میں اپنے طریقے سے کھیلوں گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی جناب، میں نے سہراب سے جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور نبھاؤں گا لیکن آپ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ ارڑنگ آپ کو آشوریوں پر لشکر کشی کے بہانے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ جب تک ہم آشوریوں کو مغلوب نہیں کریں گے، کوئی دوسرا ملک فتح نہیں کرسکتے۔"

"شاباش۔ اب تم ایک سپاہی کی طرح سوچ رہے ہو اوغیر۔ ان سازشوں سے میں خود نمٹ لوں گا۔ فی الوقت تم فرہاد مہندس کے پاس لے چلو۔"

میدان میں ایک مقام پر متعدد جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ اُن میں سب سے بڑا جھونپڑا مہندس فرہاد کا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ میز پر بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ اس کا قد میرے جتنا مگر سینہ مجھ سے زیادہ چوڑا اور ہاتھ میرے ہاتھوں سے زیادہ بھاری تھے۔ اس کے سر اور سینے کے بال بھورے تھے اور آنکھیں کشادہ روشن۔ اوغیر نے مجھے اُس سے متعارف کرایا تو وہ اسی طرح اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے بولا۔ "اچھا تو تم ہو وہ سرفروش۔ جس نے ایک ماہ کے اندر اندر جوانی کی منزلیں طے کی ہیں۔ میں بچشم خود تمھیں دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے ان احمق مقامی باشندوں کی کسی بات کا اعتبار نہیں ہے لیکن یہ سب کیسے ہوا؟ میں اس شعبدے کا راز جاننے کے لیے اچھی خاصی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

"کاہن ارڑنگ بھی یہی کہتا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

فرہاد نے غصے سے میز پر مکا مارا اور بولا۔ "اس کالے کرگس کا نام میرے سامنے مت لو۔ مجھے اس کے ذکر سے متلی ہونے لگتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اہلِ دماغ کا دیوانہ ہے۔ وہ میرے فن کے راز معلوم کرنے کا بھی خواہاں ہے۔ میں ہمیشہ اُسے جھوٹ بتاتا ہوں۔ وہ بھی اتنا کائیاں ہے کہ ان جھوٹوں پر یقین نہ کرنے کے باوجود میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کہنے کے ساتھ اس آنکھ مچولی میں مجھے بڑا مزا آتا ہے۔"

میں فرہاد کے سامنے بیٹھ گیا اور اپنے لیے ایک پیالے میں اس کے سامنے رکھی صراحی سے مشروب انڈیلا تو اوغیر خاموش نہ رہ سکا اور بولا۔ "یہ پینے پلانے کا نہیں، سوچنے اور تیاریاں کرنے کا وقت ہے جناب۔"

"تمھارا کیا خیال ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" میں نے پوچھا تو اوغیر سے پہلے فرہاد بول اُٹھا۔

"تم ایک جنگجو کمان دار کی طرح بات کرتے ہو سرفروش۔ کیا تم جنگجو ہو؟"

"یقیناً۔ اور آنے والا وقت یہ ثابت کردے گا۔ میں تم سے جنگ ہی کے سلسلے میں بات کرنے آیا ہوں۔ مجھے آشوریوں پر لشکر کشی کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ میں تمھیں ایک کپتان کا عہدہ، مکمل اختیارات اور مالِ غنیمت میں سے حصہ دوں گا۔"

"میں یہیں ٹھیک ہوں ... اب جبکہ سہراب مر گیا ہے، میں ہر کام جلد از جلد پایۂ تکمیل کو پہنچا دینا چاہتا ہوں۔" اس نے دو ٹوک جواب دے دیا۔

"میں تمھیں حکم بھی دے سکتا ہوں فرہاد، مگر میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے کہ ناخوش کارکن سے بہتر کام کی توقع فضول ہے۔ جہاں تک اہرام کی تکمیل کا معاملہ ہے تو اس میں عجلت کی ضرورت نہیں۔ سہراب اس نامکمل مقبرے میں بھی آرام کی ابدی نیند سوتا رہے گا۔ میں آشوریوں پر جلد از جلد اور ان کی غفلت میں یلغار کرنا چاہتا ہوں۔ اس مقصد کے لیے میں آبنائے پر ایک پُل کی تعمیر کا متمنی ہوں تاکہ کشتیوں اور ہوا پر انحصار ختم ہو جائے۔"

یہ سن کر فرہاد ہنسنے لگا اور بولا۔ "تم کشتیوں کا پُل بنوانا چاہتے ہو سرفروش۔ مگر یہ تجربہ ناکام ہو چکا ہے۔ آشوریوں نے تیر کر اس پُل کو رسیاں سے کاٹ دیا تھا اور وہ ازمیری جو ڈوبنے سے بچ کر کنارے تک پہنچ گئے تھے، آشوریوں نے انھیں بھی تہِ تیغ کردیا تھا۔ کشتیوں کے پُل کی بجائے کوئی اور ترکیب سوچو۔"

میں نے سوالیہ نگاہوں سے اوغیر کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔ "یہ سچ ہے جناب چھ سال پہلے سہراب نے بھی پُل تعمیر کرایا تھا۔"

"تم جنگجو تو ہو سکتے ہو مگر کماندار نہیں ہو سکتے سرفروش" فرہاد بولا۔ "تم آشوریوں کو کبھی مغلوب نہیں کر سکو گے۔"

"میں اُنھیں شکستِ فاش دوں گا فرہاد" میں نے نرم لہجے میں مگر عزم سے کہا "تم نے میرا پورا منصوبہ تو سُنا ہی نہیں۔ میں بیک وقت دو پُل بنوانا چاہتا ہوں۔ ایک وہ جو پانی کے اوپر دکھائی دے اور دوسرا زیرِ آب۔ وہ سطحِ آب سے ایک ہاتھ نیچے ہونا چاہیے اور پہلے پُل سے دُور واقع ہو۔ پہلا پُل دن کی روشنی میں دھوم دھڑکے سے اور دوسرا رات کے اندھیرے میں خاموشی سے تعمیر کیا جائے مگر یہ کام مشکل اور تمھارے بس سے باہر ہے فرہاد۔ چلو ادغیر" یہ کہہ کر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

فرہاد نے پھر میز پر ہاتھ مارا اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولا: "دو پُل! ... ایک سطحِ آب پر اور دوسرا زیرِ آب۔ بلاشبہ اچھوتا خیال ہے جو میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرا پُل کامیابی کا باعث بن جائے مگر جیسا تم نے کہا تھا، کام خاصا مشکل ہے۔"

"مشکل ہی نہیں ناممکن ہے" میں نے کہا "میں نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر تمھارے بس میں نہیں۔ بہرصورت تمھارے مشروب کا شکریہ فرہاد۔"

فرہاد نے ایک نظر مجھے دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا "میں تمھارا مطلب خوب سمجھتا ہوں سرفروش۔ تم مجھے اشتعال دلانا چاہتے ہو؟ میں اشتعال میں آ کر تو نہیں مگر چیلنج سمجھ کر زیرِ آب پُل بناؤں گا لیکن تمھیں اس کا معاوضہ ادا کرنا پڑے گا۔"

"وہ معاوضہ کیا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"کیا ادغیر نے تمھیں وہ بات سُنائی ہے جس کی وجہ سے میں نے جلاوطنی اختیار کی تھی؟"

"نہیں" میری بجائے ادغیر نے جواب دیا "تم نے مجھے اپنی کہانی سُنائی ہی کب تھی۔"

فرہاد نے جو کافی نشے میں تھا چند لمحے سوچا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو، پھر بولا "ہاں میرا خیال ہے کہ میں نے تمھیں اپنے فرار کی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ بہرکیف میں جلاوطنی سے قبل ایک عورت سے محبت کرتا تھا۔ اُس کا نام شبانہ تھا اور دیوتاؤں نے اُسے میرے لیے آسمانوں سے بھیجا تھا مگر حمیر کے ایک کپتان شمروز کو بھی اُس سے محبت ہو گئی۔ میری غیر موجودگی میں اُس نے حمیر سے اجازت حاصل کی اور اُسے اپنا لیا۔ جب میں لوٹا تو وہ شمروز کے شبستان میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے حمیر سے کہا کہ مجھے شمروز سے مقابلے کی اجازت دی جائے اور اگر میں جیت جاؤں تو میری محبت، میری شبانہ مجھے مل جانی چاہیے مگر حمیر نے یہ اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح اُسے اپنے ایک کپتان کی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ یہ مت سمجھیے کہ شمروز کوئی کمزور سا آدمی تھا۔ نہیں، وہ شہزور جنگجو تھا لیکن جب آدمی کسی عورت سے محبت کرتا ہے، تو وہی محبت اُسے شیروں سے لڑ جانے کی ہمت عطا کر دیتی ہے۔ اگر حمیر مجھے اجازت دے دیتا تو شبانہ کی محبت مجھے فنِ سپہ گری بھی سکھا دیتی اور میں شمروز پر غالب آ جاتا۔ خیر... شبانہ شمروز کی ہو گئی لیکن اُس کی روح میری تھی۔ ہم شمروز کی غیبت میں یا چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملتے رہے مگر ایک بار رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ ہم جانتے تھے کہ اس جرم کی سزا موت ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے میرے سامنے میری محبوبہ، میری محبت شبانہ کو گھوڑے کی کاٹھی سے باندھ کر گھسیٹا اور جب اُس کے نرم و نازک جسم کی کھال اُدھڑ گئی تو اُسے گھوڑے کی ٹاپوں سے روند ڈالا۔ اس منظر نے میرے خون میں انگارے بھر دیے۔ میں سپاہیوں پر ٹوٹ پڑا۔ لڑتا بھڑتا ان کی گرفت سے آزاد ہوا اور تیر کر آبنائے عبور کی تو ادغیر کے ہاتھوں پکڑا گیا۔" اتنا کہہ کر وہ دم لینے کو رُکا تو میں نے کہا۔

"بیشتر محبت کرنے والوں سے اُن کی محبوبائیں اسی طرح چھین جایا کرتی ہیں فرہاد۔ بہرصورت تم بچ گئے، یہی غنیمت ہے۔"

"میں موت سے ڈر کر نہیں بھاگا تھا سرفروش۔ میں نے یہ زندگی اپنے لیے نہیں چاہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اُسی وقت مر گیا تھا جب شبانہ کو اذیت دی جا رہی تھی۔ مجھ پر یہ زندگی شبانہ کا قرض ہے۔ میں تب سے اب تک لمحہ لمحہ انتقام کی آگ میں سُلگتا رہا ہوں جو صرف شمروز کے خون سے ہی بجھ سکتی ہے۔ مجھ سے صرف اتنا وعدہ کرو کہ تم مجھے شمروز کا بریدہ سر دو گے اور اس کے بدلے میں دو پُل ہی نہیں، دو اہرام بھی تعمیر کر دوں گا۔"

"اگر ہم آشوریوں کے ساحل پر اُتر گئے اور شمروز سے سامنا ہو گیا تو میرا وعدہ ہے کہ تمھارے رقیب کا سر تمھارے قدموں میں رکھ دیا جائے گا۔" میں نے اُسے یقین دلایا تو وہ میرا ساتھ دینے کو تیار ہو گیا۔

ہم راجدھانی لوٹ آئے اور میں اُسی شب سہراب کے محل میں منتقل ہو گیا۔ حالات نے بڑی تیزی سے پلٹا کھایا تھا اور مجھے اُن کے ساتھ ساتھ چلنا تھا۔

●

سہراب کی تدفین کے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر میری اور فرازیہ کی شادی ہو گئی لیکن ایک ہی ہفتے کے اندر اندر ہم علیحدہ علیحدہ خواب گاہوں میں سونے لگے۔ یا تو فرازیہ کاہنِ اعظم ارژنگ کے زیرِ اثر تھی یا میں اُسے مطمئن و مسرور نہیں رکھ سکا تھا۔ بہرکیف مجھے اس علیحدگی کا کوئی دُکھ نہیں تھا۔ میری خواب گاہ اُس کے بغیر سُونی نہیں رہی تھی۔ میں طاؤسہ کو بلوا لیا کرتا تھا جو مجھے محل میں اُڑنے والی افواہوں اور سازشوں

سے بھی باخبر رکھتی تھی۔

اس دوران مجھے ارژنگ سے صرف اتنا پیغام موصول ہُوا کہ میں آشوریوں پر لشکر کشی میں تاخیر نہ کروں۔

مجھے یہ اطلاعات بھی برابر موصول ہو رہی تھیں کہ ازمیر کے کونے کونے سے "کوتے" راجدھانی میں جمع ہو رہے ہیں اور کاہن ارژنگ نے انھیں سہراب کے اہرام کی تکمیل میں مزدوروں کے ساتھ لگا دیا ہے۔ یہ صرف ایک دکھاوا تھا ورنہ ارژنگ کا مقصد انھیں یکجا کر کے اپنی افرادی قوت بڑھانا تھا جبکہ مجھے اپنی افرادی قوت بڑھانے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ سہراب کے عسکریوں میں بددلی پھیلی ہُوئی تھی اور اُن کا حوصلہ ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے اُن کی تنظیمِ نو کے لیے ادغیر کو فوج کا کماندارِ اعلیٰ بنا دیا۔

فرہاد بھی اب کپتان کے عہدے پر فائز تھا اور اُس نے اپنا شعبہ سنبھال لیا تھا۔ بقول طاؤسہ ازمیر کے عوام میرے ان اقدامات کو بنظرِ پسندیدگی نہیں دیکھ رہے تھے۔

میں کئی بار رتناز توجہ سے کرسٹل کے ذریعے کمپیوٹر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر چکا تھا مگر اس میں کامیاب نہیں ہُوا تھا۔ خدا جانے ڈاکٹر فریدوں نے کمپیوٹر اور کرسٹل کا باہمی رابطہ منقطع کر دیا تھا یا میرا کرسٹل ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ پھر خیال آیا کہ ایک بار میں نے ڈاکٹر فریدوں سے کہا تھا کہ میں مستقل ذہنی غلامی برداشت نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ اسی بنا پر ڈاکٹر فریدوں نے وقتی طور پر رابطہ منقطع کر دیا ہو۔

ایک صبح میں ادغیر، فرہاد اور ایک لمبے تڑنگے محافظ کے ساتھ آبنائے پر زیرِ تعمیر کشتیوں کے پُل کا معائنہ کرنے کے لیے چل دیا۔ یہ پُل راجدھانی سے ایک یوم کی مسافت پر واقع تھا۔ فرہاد نے اپنی زرہ بکتر اور خود بنات خود بنوائے تھے جو ازمیری فوج سے مختلف تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو وہ بولا۔ "آشوری اسی قسم کے خود استعمال کرتے ہیں۔ جب ہم خلیج کے اُس پار جائیں گے تو وہ مجھے اپنی ہی فوج کا فرد سمجھ کر مجھ پر حملہ نہیں کریں گے۔ اس طرح مجھے شمروز کے قریب پہنچنے اور اُسے تہِ تیغ کرنے کا موقع مل جائے گا جو میرا مقصدِ حیات ہے۔"

اس پر ادغیر نے بے ساختہ کہا "میرا خیال ہے کہ تم نے پھر بے تحاشا پینی شروع کر دی ہے۔ اسی لیے یہ بھول گئے ہو کہ ہمارے فوجی تمھیں آشوری سمجھ کر موت کے گھاٹ اُتار سکتے ہیں۔"

"جب تک پُل تعمیر نہیں ہو جاتے، تم شراب نہیں پیو گے فرہاد۔" میں نے اُسے حکم دیا جسے وہ ماننے پر مجبور تھا۔

شام کے جھٹپٹے میں ہم اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں سطحِ آب پر پُل بنایا جا رہا تھا۔ یہاں پر آبنائے صرف نصف میل چوڑی تھی۔ آبنائے کی دوسری جانب پہاڑیوں پر الاؤ روشن تھے۔ میں نے پُل کے لیے کام کرنے والے لوگوں سے گپ شپ کی اور ان سے خوراک اور سہولتوں کے بارے میں پوچھا۔ وہ مطمئن تھے مگر فرہاد کا کہنا تھا کہ وہ سست اور کاہل الوجود ہیں اس لیے اُسے کوڑوں سے کام لینا پڑے گا ورنہ کام کی رفتار میں تیزی نہیں لائی جا سکتی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اُس کے بہترین کارکن زیرِ آب پُل کی تعمیر کے لیے رات کو کام کرتے ہیں۔

"وہ پُل کہاں بن رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

فرہاد نے ایک نقشہ میرے سامنے پھیلا دیا اور ایک جگہ اُنگلی رکھتے ہوئے بولا "یہاں۔ اس پُل سے نصف میل دُور مشرق کی جانب۔ وہاں بھی آبنائے کی چوڑائی اتنی ہی ہے جتنی یہاں ہے مگر ساحل سے پہاڑیاں ایک میل کے فاصلے پر ہیں اگر ہم اُس پار اُتر گئے تو بڑی آسانی سے پہاڑیوں تک جا سکیں گے۔"

میں نے فرہاد اور ادغیر سے کہا۔

"تم لوگ اپنی سوچ کا یہ منفی انداز بدل دو۔ ہم یقیناً آشوریوں کے ساحل پر اُتریں گے۔ یاد رکھو فرہاد، زیرِ آب پُل بنانے والے دن کے وقت ہرگز ہرگز دکھائی نہ دیں۔ رات کو کام کرتے ہُوئے بھی روشنی یا آگ نہیں جلنی چاہیے اور ادغیر۔ دن کے وقت تمھارے زیادہ سے زیادہ آدمی سطحِ آب پر زیرِ تعمیر پُل کے لیے کام کرتے رہیں اور آشوریوں کو اپنی طرف متوجہ رکھیں۔ اس مقصد کے لیے کچھ گروہ باری باری آشوریوں پر حملے بھی کریں مگر آشوری ساحل پر ایک گھنٹے سے زیادہ نہ رکیں اور لُوٹ مار کر کے فوراً لوٹ آئیں۔"

"لوٹ آنا ناممکن ہے جناب۔ اس لیے کہ آشوری مرد ہی نہیں عورتیں اور بچے بھی جنگجو ہیں۔ دوسرے اس طرح کے حملوں میں صرف ہمارے سپاہی ہی نہیں، بہت سی کشتیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا "مزید آدمی بھرتی کرو اور مزید کشتیاں بنواتے رہو میں چاہتا ہوں کہ آشوریوں کی تمام تر توجہ مغربی کی جانب رہے، وہ اسی طرف جمع ہو جائیں اور مشرق کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھیں۔"

"یہ ناممکن ہے سرفروش" فرہاد بولا "آشوریوں کے پاس ساحل کی دیکھ بھال کے لیے اُڑنے والا خصوصی دستہ ہے۔"

"اُڑنے والا دستہ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ اپنے بازوؤں کے ساتھ باریک چمڑے کے بڑے بڑے پَر باندھ لیتے ہیں اور چمگادڑوں کی طرح پرواز کرتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں" فرہاد بولا اور پھر اس نے مجھے پَروں کی تصویر بنا کر دکھائی۔ یہ پَر بہت ہلکی لکڑی اور چمڑے سے بنائے جاتے تھے اور گلائیڈر کی بھونڈی شکل تھے ان کے ذریعے بلندی کی طرف سے پستی کی جانب پرواز کی جا سکتی تھی۔ مگر نیچے سے اوپر نہیں جایا جا سکتا تھا۔

"چمڑے کے پروں والے یہ آدمی پل پر حملہ کر چکے ہیں وہ اپنے ساتھ آگ کی ہانڈیاں بھی لاتے ہیں تاکہ اُنھیں کشتیوں پر پھینک کر نذرِ آتش کردیں۔ میرے چار آدمی اُن کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں۔" اوغیر بولا۔

"کیا کشتیوں میں آگ لگی تھی؟"

"نہیں۔ ہانڈیاں نشانے پر نہیں گری تھیں۔"

"اور اُن اُڑنے والے آشوریوں کا کیا ہوا؟"

"وہ پانی میں گرے تو ہم نے تیروں سے اُنھیں ہلاک کردیا۔" اوغیر نے بتایا۔

"بس ٹھیک ہے۔ اُنھیں اسی طرح الجھائے رکھو۔" میں نے کہا۔

فرہاد جماہیاں لینے لگا تھا۔ اُس نے کہا۔ "مجھے ایک جام پینے کی اجازت دے دیجیے تاکہ مجھے آرام کی نیند آجائے۔"

"نہیں فرہاد۔ اگر تمھیں نیند نہ آئے تو زیرِ آب پل کے بارے میں سوچتے رہنا۔"

دوسری صبح میں نے اُن لوگوں کے کیمپ کا معائنہ کیا جو رات کے وقت زیرِ آب پل تعمیر کر رہے تھے۔ انھوں نے لکڑی کے شہتیر، تختے، اوزار اور دوسرا ساز و سامان ریت میں چھپا رکھا تھا۔ فرہاد نے کہا۔

"ہمارے لیے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمیں اندھیرے میں خاموشی سے کام کرنا پڑتا ہے ہر چند کہ میرے کارکن بہترین تیراک ہیں، مگر وہ بھی پانی میں زیادہ دیر تک سانس نہیں روک سکتے۔ اس لیے یہ پل دوسرے پل کے مقابلے میں بہت پیچھے ہے اور اس کی تکمیل میں بہت زیادہ وقت لگے گا۔"

"نہیں فرہاد۔ یہ دونوں بیک وقت مکمل ہونے چاہئیں۔" میں نے کہا۔ "میرے منصوبے کا سارا دار و مدار ہی اس بات پر ہے۔"

"تو پھر میرے کارکنوں کو پانی میں سانس لینا سکھا دو۔" وہ بولا۔

"ہاں، یہ میں کرسکتا ہوں۔ کیا تمھارے پاس خیموں والا کپڑا اور بھٹی ہے؟"

"ہاں۔"

"تو مجھے کچھ کپڑا، دھاگا اور سوئی لادو۔" میں نے کہا۔

جب مجھے یہ چیزیں فراہم کردی گئیں تو میں نے کپڑا کاٹ کر اُسے نلکیوں کی طرح سیا اور کہا کہ اب ان نلکیوں کو کولتار میں بھگو کر سکھایا جائے تو ان کے اندر پانی نہیں جائے گا مگر ہوا جاسکے گی۔

فرہاد بولا۔ "لیکن ہوا کیسے جائے گی؟"

"بھٹیوں کی پھکنیوں کے ذریعے۔" میں نے وضاحت کی۔ پھر میں نے فرہاد کو ماسک کی تصویر بنا کر دکھائی جسے پہن کر اس کے کارکن بڑی دیر تک زیرِ آب کام کرسکتے تھے۔ فرہاد یہ طریقِ کار سمجھ کر دنگ رہ گیا اور بولا۔ "دیوتاؤں کی قسم۔ یہ ہوسکتا ہے۔ اب میرے کارکن تیزی سے کام کرسکیں گے۔"

پھر میں اُسے وہیں چھوڑ کر اوغیر کے ساتھ مغربی پل کی طرف چل دیا۔ اوغیر بولا۔ "اب بھی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی جناب کہ آپ ارڈنگ کے حکم کی تعمیل کیوں کر رہے ہیں جبکہ وہ آپ کا مخالف اور دشمن ہے۔"

"میں خود بھی آشوری سرزمین جانا چاہتا ہوں اوغیر۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہاں ہیرے بکثرت ملتے ہیں بلکہ وہاں ہیروں کے پہاڑ ہیں۔ ہیرا بہت چمک دار پتھر ہوتا ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

"وہ پتھر جو فرہاد پتھر کاٹنے کے لیے استعمال کرتا ہے؟" اوغیر تعجب سے بولا۔ "اس سے بچوں کے کھلونے بھی بنائے جاتے ہیں جنھیں وہ سورج کے سامنے رکھ کر دیکھتے ہیں تو اُن سے قسم قسم کی رنگین شعاعیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ آپ کو ان پتھروں سے کیا دلچسپی ہے؟"

"ہمارے ہاں وہ پتھر بڑے قیمتی سمجھے جاتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر جہاں سے آپ آئے ہیں، وہاں کے لوگ پاگل ہیں۔ پتھر بہرصورت پتھر ہوتا ہے۔ آپ نہ اُسے کھا سکتے ہیں، نہ پی سکتے ہیں نہ اوڑھ سکتے ہیں پھر ان کی خاطر انسانی جانوں کی بھینٹ کہاں تک جائز ہے۔ آپ ان کے لیے جنگ کیوں لڑنا چاہتے ہیں؟"

"میں اسے اپنے لیے ضروری سمجھتا ہوں اوغیر۔ اگر تم میرا ساتھ نہیں دینا چاہتے تو مت دو۔"

"میں اپنے قول سے منحرف نہیں ہوسکتا جناب! مگر مجھے بے مقصد جنگ و جدل سے نفرت ہے۔" اس کے بعد ہم نے کافی دیر تک ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ آخر اوغیر نے خاموشی توڑی۔ "آپ یہ جنگ کب شروع کریں گے؟"

"جب زیرِ آب پل مکمل ہوجائے گا۔ اس دوران دوسرا پل صرف تین چوتھائی مکمل ہوجانا چاہیے۔"

"تین چوتھائی؟" اوغیر نے تعجب سے دوہرایا۔ "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ باقی ٹکڑا ہمارے سپاہی تیر کر پار کرلیں گے تو یہ ناممکن ہے۔ ان کے بھاری خود اور زرہ بکتر اُن کی غرقابی کا باعث بن جائیں گے۔"

مجھے اوغیر کی بات پر ہنسی آگئی۔ میں بولا۔ "تم ہمیشہ منفی سوچتے ہو اوغیر۔"

"میں منفی نہیں سوچتا، سچ کہتا ہوں جناب۔"

"کبھی روشن پہلو پر بھی غور کرلیا کرو یار۔ میں اُس نامکمل پل کو گھاٹ کے طور پر استعمال کروں گا۔ باقی ٹکڑا کشتیوں کے ذریعے عبور کیا جائے گا۔ اس گھاٹ سے کشتیاں مسلسل ساحل کی طرف بڑھتی رہیں گی حمیر کو یہ تاثر دیا جائے گا کہ ہم اپنی پوری قوت سے حملہ کر رہے ہیں لیکن اصل حملہ ہم زیرِ آب پل کے ذریعے کریں گے۔"

"مگر ہم اتنی سپاہ کہاں سے لائیں گے جناب؟" اوغیر نے پوچھا۔

"کیا میں نے تمھیں اپنے منصوبے کی ہر تفصیل بتائی ہے اوغیر؟"

"نہیں جناب۔ اچھا کمان دار بہت سی باتیں راز میں رکھتا ہے۔" وہ بولا۔ "میں سمجھا کہ ..."

"تم غلط سمجھے۔" میں نے اس کی قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "حمیر یہ سمجھے گا کہ ہم نے اپنی ساری قوت وہاں لگا دی ہے۔ میں اُسے تاثر بھی یہی دینا چاہتا ہوں لیکن میں کچھ چیدہ چیدہ عسکریوں کے ساتھ زیرِ آب پل پار کرکے حمیر پر عقب سے حملہ کروں گا۔ چونکہ وہ اپنے سامنے تم سے برسرِ پیکار ہوگا اس لیے وہ پیچھے سے کرنے والی ناگہانی افتاد سے سراسیمہ ہوکر حواس باختہ ہوجائے گا اور اس پر فرار کی راہیں بھی مسدود ہوجائیں گی۔ اب بولو کیا خیال ہے تمھارا؟"

"میرا خیال ہے یہ منصوبہ کامیاب رہے گا۔" وہ بولا۔ "تاہم ہمارے پاس بہت کم لشکری ہیں۔ فوج کا ایک دستہ یہاں کام کر رہا ہے اور نو دستے راجدھانی میں زیرِ تربیت ہیں۔ آپ خود ہی سوچیں کہ وہ کیا خاک جنگ لڑیں گے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم اور تمھارے افسر اس وقت تک اُنھیں اتنی تربیت دے دیں کہ وہ بظاہر فوجی نظر آنے لگیں اور حمیر اُنھیں دیکھ کر مرعوب ہوجائے۔ اصلیت کا پتہ اُسے اس وقت ہی چلے گا جب ہمارے سپاہی پکڑے جائیں گے اور وہ ان سے پوچھ گچھ کرے گا۔"

"اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی جناب۔" اوغیر بولا۔ "یہ آشوری اپنے دشمنوں کو غلام نہیں بناتے بلکہ فی الفور قتل کردیتے ہیں۔"

"پھر تو بہت اچھا ہے اوغیر۔ تم فوراً راجدھانی روانہ ہوجاؤ اور اُن کی تربیت ایک ہفتے کے اندر اندر مکمل کرلو۔"

جب اوغیر چلا گیا تو میں اپنے خیمے میں آیا اور ارتکازِ توجہ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک گھنٹے کی جدوجہد کے بعد رابطہ قائم ہوگیا اور میں نے ڈاکٹر فریدون کو ہیروں کی صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ ہیروں کے حصول کے لیے مجھے جنگ لڑنے کی اجازت دے دی گئی کیونکہ اب ڈاکٹر فریدون خزانوں کی منتقلی کے لیے بھی کمپیوٹر بنا رہا تھا۔

●

اوغیر نے میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ایک ہفتے کے اندر اندر از میری فوجیوں کی تربیت مکمل کردی۔ وہ جنگ لڑنے کے اہل تو نہیں تھے لیکن تربیت یافتہ عسکری ضرور نظر آتے تھے۔ میں تو صرف اتنا چاہتا تھا کہ آشوری اُن کی تعداد سے مرعوب ہوجائیں اور اوغیر اُس وقت تک اُنھیں اُلجھائے رکھے کہ میں آزمودہ کار سپاہیوں کے مختصر لشکر کے ساتھ آشوریوں کے عقب میں نہ پہنچ جاؤں۔

جس روز میں نے سطحِ آب اور زیرِ آب بننے والے پلوں کا معائنہ کیا تھا، اُس کے ٹھیک دسویں دن جنگ کا آغاز ہوگیا۔

منصوبے کے مطابق اوغیر نے مغربی پل کے ساتھ لاتعداد کشتیاں تیار رکھی تھیں اور اُس کے پاس دس ہزار فوجی تھے اُس نے سرِ شام ہی فوجی دستے آشوری ساحل پر اُتارنا شروع کردیے تھے جن کے لیے حمیر وہاں موجود تھا۔ اس کی افرادی قوت بھی تقریباً اتنی ہی تھی مگر اُن میں جوان، بوڑھے، عورتیں اور بچے سبھی شامل تھے اور جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا عورتیں اور بچے بھی جنگ میں حصہ لیا کرتے تھے۔ بقول فرہاد آشوری قوم خوف کے لفظ سے ناآشنا تھی اور ان کا بچہ بچہ جنگ میں مرنا اپنی خوش نصیبی تصور کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کا فلسفہ حیات ہی یہی ہو تو اس کا بہادر اور جنگجو ہونا لازمی ہے۔

جب اوغیر نے میدانِ کارزار میں اپنے دستے اُتارنا شروع کیے، میں تین ہزار آزمودہ کار سپاہیوں کے ہمراہ زیرِ آب پل کے قریب ٹیلوں کے عقب میں چھپا ہوا تھا۔ ان تین ہزار فوجیوں میں ایک ہزار شہسوار تھے اور باقی پیدل۔ فرہاد بھی آشوریوں جیسے سینگ والے خود اور زرہ بکتر کے ساتھ میرے ہم رکاب تھا۔

رات بھر ہمیں مغربی پل سے آشوریوں کے جنگی نعرے، ہاؤ ہو کی آوازیں، چیخ و پکار، طبلِ جنگ اور شمشیر و سپر ٹکرانے کی آوازیں آتی رہیں۔ مغربی پل کے سامنے ہی پہاڑیاں واقع تھیں جن پر الاؤ اور مشعلیں جلتی رہیں۔ یہاں حمیر کے سارے لشکری جمع تھے۔ حمیر کو اب تک زیرِ آب پل کا علم نہیں ہوا تھا ورنہ وہاں بھی اس کے لشکریوں کی نقل و حرکت نظر آتی۔ میں مطمئن تھا کہ ہم اس پر بے خبری کے عالم میں پیچھے سے ٹوٹ پڑیں گے تو اس کے لیے ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ کار نہیں رہے گا۔

پو پھٹے میں نے اپنے فوجیوں کو کوچ کا حکم دیا میں نے اپنے سپاہیوں کو ایک ایک ہزار کے تین دستوں میں تقسیم کردیا تھا۔ ایک دستے کا کپتان فرہاد اور دوسرے کا افراسیاب تھا۔ تیسرا دستہ خود میری کمان میں تھا۔ جب ہم زیرِ آب پل عبور کرنے لگے۔ ہمیں آبنائے میں بہت سی لاشیں تیرتی دکھائی دیں۔ ان میں صرف ایک لاش آشوریوں کی تھی اور یہ لاش بھی کسی مرد کی نہیں بلکہ عورت کی تھی باقی ساری لاشیں ازمیریوں کی تھیں جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اوغیر کو حمیر کے ساتھ اُلجھنے یا اُسے اُلجھائے رکھنے کی کتنی بڑی قیمت

ادا کرنی پڑ رہی ہے۔

زیرِ آب پل سے نصف میل دُور پہاڑیاں تھیں آبنائے سے وہاں تک کا علاقہ ایک سرسبز چراگاہ پر مشتمل تھا۔ جب گھڑسواروں نے پُل عبور کر لیا اور پیدل دستے آنے لگے تو یکایک پہاڑیوں سے آشوریوں کا ایک اڑنے والا فوجی آگ کی ہانڈیاں اٹھائے ہماری طرف پرواز کرتا دکھائی دیا... میں اُسے تعجب سے دیکھتا اور سوچتا رہ گیا کہ حمیر اِدھر سے غافل نہیں تھا۔ اور شاید اُس نے اپنے لشکری ان پہاڑیوں کے پیچھے چھپا رکھے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم آگے بڑھیں گے تو خود ہی ان کے نرغے میں آ جائیں گے اور میرا سارا منصوبہ چوپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ اتنے میں وہ اُڑتا ہوا آشوری قریب آگیا۔ اُس نے آگ کی ایک ہنڈیا پھینکی جو ہم سے کچھ دُور گری مگر اس کے ہنڈیا پھینکنے سے پہلے ہی میں نے اس پر بھالا پھینکا جو اُس کے پیٹ میں پیوست ہو گیا اور وہ آبنائے میں جا گرا۔

میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خدشوں کے تحت اپنی سپاہ وہیں درمیانی میدان میں صف آرا کر لی اور کچھ لوگوں کو پہاڑیوں کی طرف ٹوہ لگانے کے لیے بھیجا۔ جو جلد ہی لوٹ آئے اور انھوں نے بتایا کہ ان کے عقب میں انھیں حمیر کا لشکر دکھائی نہیں دیا۔ اب میں نے ایک دستہ دائیں طرف سے اور ایک بائیں طرف سے آگے بڑھایا اور قلب کا دستہ خود لے کر آگے بڑھا۔ میں نے اپنے کپتانوں کو ہدایات دی تھیں کہ انھیں آشوری لشکر کے پیچھے جا کر ایک قوس کی شکل میں پھیل جانا ہے اور میرا اشارہ ملتے ہی حملہ کر دینا ہے مگر حملہ کرتے وقت کچھ سپاہیوں کو پہاڑیوں کے تنگ دروں پر موجود رہنا ہے تاکہ کوئی آشوری بچ کے نہ نکلنے پائے۔ اگر وہ لوگ ہتھیار ڈال دیں تو انھیں گرفتار کر لیا جائے۔ ورنہ مرد عورت کی تخصیص کیے بغیر انھیں ختم کر دیا جائے۔

جب میں اپنے دستے کے ساتھ پہاڑیوں میں داخل ہوا تو اچانک ایک پہاڑی کے پیچھے سے "یاہُو" کا نعرہ سنائی دیا اور آشوری جنگجو سامنے آنے لگے۔ میں نے اپنے دستے کو رُکنے کا اشارہ کیا اور خود چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آشوری مختلف پہاڑیوں سے میرے دستے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ حمیر نے میرے ساتھ وہی چال چلی تھی جو میں اُس کے ساتھ چلنا چاہتا تھا۔ میرا دستہ چاروں طرف سے آشوریوں کے گھیرے میں آگیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے دائیں اور بائیں دستے کس حال میں ہیں۔ میں نے اپنے نائب کو حکم دیا کہ وہ اُن آشوریوں پر تیر برسانا شروع کرا دے جو مختلف پہاڑیوں سے اُتر کر حملے کی غرض سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ وہ لوگ ہم پر انڈوں سے دُگنی جسامت کے پتھر برسا رہے تھے۔ میرے سپاہیوں نے اُن پر تیروں کی بوچھار شروع کر دی مگر وہ بلا خوفِ مرگ تیروں کی بارش میں آگے بڑھتے اور ڈھیر ہوتے رہے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُن کی اکثریت بوڑھوں اور ایسے لوگوں کی تھی جو غالباً کسی جنگ کی وجہ سے معذور ہو چکے تھے تھوڑی دیر بعد ان یلغار ختم ہو گئی.... میرے اندازے کے مطابق وہ سو سے کم تھے۔ اتنے میں فرہاد کا ایک پیامبر گھوڑا دوڑاتے ہوئے میرے پاس اس کا پیغام لایا کہ یہ حملہ آور صرف اتنے ہی تھے۔ انھیں پیرانہ سالی اور معذور ہونے کی بنا پر پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس لیے میں آگے بڑھتا رہوں۔ اس دوران میرے نائب نے اپنے جو آدمی مختلف پہاڑیوں پر ٹوہ لینے کے لیے بھیجے تھے، وہ بھی لوٹ آئے اور اُنھوں نے بھی فرہاد کے پیغام کی تصدیق کر دی تو میں اپنے دستے کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

جب میں حمیر کے لشکر کے عقب میں پہنچا تو میرے دائیں بائیں والے دستے پہلے سے وہاں پہنچ چکے تھے اور درختوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے۔ حمیر کا لشکر ہمارے سامنے کی پہاڑیوں کے پیچھے تھا اور یہ پہاڑیاں مغربی پُل کے سامنے واقع تھیں۔ ان دستوں کے جاسوسوں نے میدانِ کارزار کا جائزہ لے لیا تھا۔ فرہاد اور افراسیاب نے بتایا کہ حمیر کے لشکر کا بیشتر حصہ پہاڑیوں کے ڈھلوانوں پر اپنی باری کا منتظر ہے جب کہ ایک چوتھائی کے قریب آشوری اگلی صفوں میں اوغیر سے مصروفِ پیکار ہیں۔ جونہی اوغیر کا دستہ ساحل پر اُترتا ہے وہ یلغار کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور اُسے پسپا کر کے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ہر ریلے میں اوغیر کو ان کی نسبت بہت زیادہ جانی نقصان اُٹھانا پڑتا ہے مگر اوغیر یکے بعد دیگرے سپاہیوں سے بھری کشتیاں ساحل پر بھیجتا جا رہا ہے۔ بیشتر کشتیاں بھی آشوریوں کے ہاتھوں جل کر راکھ ہو چکی ہیں۔

میں نے خود بھی آگے بڑھ کر چوری چھپے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور پھر اپنے سپاہیوں کو حملے کا حکم دے دیا۔ میرا گھوڑا اپنے شہسواروں سے آگے آگے تھا جب ہم پہاڑیوں کی چوٹیوں سے ڈھلوانوں پر اُترنے لگے تب آشوریوں کو پتہ چلا کہ وہ دونوں طرف سے نرغے میں آ چکے ہیں اب ان میں کچھ آشوریوں کا رُخ ہماری طرف تھا اور کچھ اوغیر کی جانب۔ میں نے اپنے کپتانوں کو ہدایات دے رکھی تھیں کہ وہ پہلے آشوری لشکر کے بیچوں بیچ گھس کر اُنھیں دو حصوں میں تقسیم کر دیں پھر دائیں بائیں مڑ کر موقع دیکھتے ہوئے بھالوں، تلواروں اور کلہاڑوں سے کام لیں۔

ڈھلوانوں والے آشوریوں میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے اور اُن میں سے بیشتر کے پاس پتھروں کے سوا کوئی آلاتِ حرب نہیں تھے لیکن وہ بلا خوف و خطر آگے بڑھتے تھے اور پتھر برساتے ہوئے ہمارے گھوڑوں کی گردنوں سے لپٹ جاتے تھے اُن کی اس حرکت سے ہمارے گھوڑے بدکنے لگتے تھے۔ آشوری میرے سواروں کی تلواریں چھینتے اور اُنھی سے سواروں کو قتل کر دیتے تھے۔

ایک جگہ مجھے کچھ آشوریوں نے گھیر لیا۔ دو آدمی میرے گھوڑے

کی گردن سے لٹک گئے اور تین نے مجھ پر دائیں بائیں سے حملہ کر دیا مگر میں نے زنجیر کے ساتھ بندھا ہوا گولا گھما کر ان کے سر پاش پاش کر دیے۔ اُن کا حشر دیکھنے کے باوجود کچھ عورتیں میری طرف لپکیں مگر میرے ساتھیوں نے انھیں مجھ تک پہنچنے سے پہلے ختم کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک آشوری عورت نے مرنے سے پہلے میرے ایک سپاہی کے نرخرے میں اپنے دانت گاڑ دیے تھے۔

ہمیں عقب سے حملہ آور دیکھ کر اوغیر کی ہمت بڑھ گئی تھی اور اب اُس کے اناڑی سپاہی بھی بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ اتنے میں فرہاد میرے پاس آگیا۔ اُس کے بازو میں ایک تیر پیوست تھا مگر وہ اس کی پروا کیے بغیر بولا۔

"وہ بدبخت شموز مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ اگر کسی ازمیری نے اُسے مار دیا ہے۔ تو دیوتاؤں کی قسم میں اُس ازمیری کا خون پی جاؤں گا۔"

"یہ تو بعد کی بات ہے پہلے اپنے بازو سے تیر تو نکلوا دو۔" میں نے کہا۔

"تو پھر ذرا اس کا سرا توڑ دو۔"

میں نے تیر کا سرا توڑ دیا۔ اس نے تیر نکال پھینکا اور بولا "میں اپنے شکار کو کہاں اور کیسے تلاش کروں شہزادے؟"

"وہ حمیر کے ساتھ ہوگا۔"

"وہ اس کے ساتھ نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"حمیر کہاں ہے؟ ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ۔"

اس نے پہاڑی کے نیچے ایک طرف اشارہ کیا اور کہنے لگا۔ "وہ دیکھو۔ چھوٹے قد کا مگر چوڑا چکلا جو آدمی کلہاڑا گھما رہا ہے، وہی حمیر ہے۔"

میں نے بغور اُسے دیکھا۔ وہ آدمیوں کے جھرمٹ میں بڑی چابکدستی سے چوڑے پھل اور لمبے دستے والا کلہاڑا گھما رہا تھا۔ اُس کا سینہ اور شانے غیر معمولی طور پر کشادہ تھے۔ وہ جدھر بھی رُخ کرتا، اوغیر کے دو چار سپاہی کھیت ہو جاتے۔ یہ دیکھ کر فرہاد بولا۔

"یہ اوغیر بھی عجیب احمق ہے۔ اپنے آدمیوں کو حمیر کے ساتھ دست بدست لڑنے کے لیے بھیجتا اور کٹوائے جا رہا ہے۔ اُسے تیر کا نشانہ کیوں نہیں بنا دیتا؟"

"میں نے اُسے کہا تھا کہ وہ حمیر کو زندہ گرفتار کرے۔ اسی لیے وہ اُسے تیروں کا نشانہ نہیں بنا رہا ورنہ یہ تو اُس کے لیے بہت آسان تھا۔"

"مگر تم اسے زندہ گرفتار کیوں کرنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"تاکہ وہ اپنے بچے کھچے ساتھیوں پر حکمرانی کر سکے اور میرا دست بن کر مجھے سرِدوں کی کانوں تک پہنچا دے۔" میں نے سچ سچ بتا دیا۔

"یہ تمھاری بھول ہے سرفروش۔ دیکھ لینا۔ اوّل تو کوئی آشوری زندہ ہی نہیں بچے گا اور اگر بچ کر گرفتار ہو گیا تو خودکشی کر لے گا۔ دوسرے حمیر خود بھی جب تک زندہ ہے گرفتار نہیں ہو گا۔ اگر اُسے فرار کا راستہ نہ مل سکا تو وہ اپنے ہی کلہاڑے سے اپنا سر پاش کر دے گا۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا فرہاد۔ دیکھو اوغیر کے آدمی اُسے گھیر کر چٹانوں کے قریب لے جا رہے ہیں تاکہ وہ فرار نہ ہو سکے۔ اب اُس کے محافظ بھی اتنے نہیں رہے۔ صرف پانچ آدمی کب تک بچا سکیں گے۔"

"تم نہیں مانتے تو تمھاری مرضی، اور ہاں آج تو میں شراب پی سکتا ہوں نا؟" یہ کہتے ہوئے اُس نے پیٹی سے لٹکی شراب کی ایک کُپی اتار لی۔

"یہ کہاں سے آئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے دستے کو آشوریوں کے خیموں سے دو سو کُپّے ملے ہیں اور آشوری شراب اتنی تیز اور تلخ ہوتی ہے کہ آدمی دو گھونٹ پیتے ہی ہوش و حواس گنوا بیٹھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج میرے سپاہی یہ شراب پی کر ہم سب کے لیے دردِ سر بن جائیں گے۔"

اتنے میں مجھے ایک طرف سے قہقہوں کی صدا سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ فرہاد والے دستے کے سپاہی تھے جنھوں نے پی رکھی تھی اور آشوریوں کی اُن عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے جنھیں گرفتار کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے نائب کو حکم دیا کہ جب تک فتح کا اعلان نہیں ہو جاتا، انھیں عورتوں سے دُور رکھو۔ وہ اپنے دستے کے کچھ سپاہیوں کے ساتھ ان کی طرف بڑھ گیا۔

اب جو میں نے ان چٹانوں کی طرف نگاہ دوڑائی جدھر اوغیر کے سپاہی حمیر کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے تو دنگ رہ گیا کہ وہاں نہ حمیر ہے اور نہ اس کے محافظ۔

"حمیر کہاں گیا؟" میں بے ساختہ چلایا۔

فرہاد نے بھی اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں اور میں نے بھی مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ اتنے میں اوغیر نے نیلگوں دھوئیں والی آگ جلا کر مکمل فتح کا اعلان کر دیا۔ آشوری عورتیں یہ دیکھ کر بین کرنے لگیں اور ہمارے سپاہی نعرہ ہائے مسرت بلند کرنے لگے۔ میں نے فرہاد سے کہا۔ "ہم نے جنگ تو جیت لی مگر حمیر کی گرفتاری کے بغیر میرا منصوبہ ادھورا رہ جائے گا۔"

"یہی حال میرا بھی ہے سرفروش۔" وہ کُپّی مُنہ سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ "شبابہ کی ہڈیاں مجھ سے شموز کے سر کا قصاص طلب کر رہی ہیں اور وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں نے آشوریوں کی لاشیں بھی چھان ماری ہیں مگر اُس مردود کی لاش نہیں ملی۔"

اتنے میں اوغیر کا ایک پیغامبر گھوڑا دوڑاتے ہوئے آیا اور اُتر کر سیلوٹ کرتے ہوئے بولا۔ "کماندارِ اعلیٰ! اوغیر نے آپ کو جنگ جیتنے کی مبارکباد بھیجی ہے..... اور اس بات پر افسوس کا اظہار بھی کیا

ہے کہ عمیر گرفتار نہیں ہوسکا۔ وہ فرار ہوگیا ہے۔"

"کیسے اور کہاں فرار ہوگیا ہے؟" میں چلایا۔ "میں نے اُسے چٹانوں کے قریب اپنے سپاہیوں میں گھرا ہُوا دیکھا تھا۔"

"آپ بجا فرما رہے ہیں شہزادے۔" پیامبر بولا۔ "وہ جان بوجھ کر اُن چٹانوں کی طرف پسپا ہُوا تھا کیونکہ اُن چٹانوں میں سرنگیں بنی ہوئی ہیں جنھیں مصنوعی طور پر جھاڑیوں وغیرہ سے چھپا دیا گیا تھا وہ ان میں سے کسی سرنگ میں فرار ہوگیا ہے اور اُسے اس وقت تلاش کرنا ناممکن ہے۔"

"یہ ٹھیک کہتا ہے۔" فرہاد بولا۔ "مجھے یہ بتانا یاد ہی نہیں رہا کہ ان چٹانوں میں شہد کے چھتے کی طرح بیسیوں سرنگیں اور غاریں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ مردود دشمن زادہ بھی انہی میں سے کسی سرنگ یا غار میں روپوش ہوگیا ہوگا۔"

"اوہ، تو پھر کل صبح میں عمیر کو تلاش کروں گا اور تم میرے ساتھ آؤ گے تاکہ اپنے رقیب رُوسیاہ کو تلاش کرسکو۔"

"میں ضرور آؤں گا بشرطیکہ یہاں آنے سے پہلے مجھے جگا دیا جائے۔"

"کمان دار کے لیے آپ کی طرف سے کوئی پیغام شہزادہ عالی مقام؟" پیامبر نے مجھ سے پوچھا۔

"اُسے ہماری طرف سے شاندار فتح پر مبارکباد۔ آج رات وہ ہمارے خیمے میں ہمارے ساتھ کھانا کھائے گا، اور ہاں۔ کیا اُس نے جنگ میں کام آنے والے سپاہیوں کی تعداد کا صحیح اندازہ لگایا ہے؟"

"جی ہاں۔ ہمارے چھ ہزار سپاہی کھیت رہے۔ تقریباً ایک ہزار شدید زخمی ہیں کماندار نے پوچھا ہے کہ کیا انھیں تکلیف سے نجات دلانے کے لیے ختم کردیا جائے؟"

"نہیں۔ اُن کا علاج کیا جائے اور ان کے آرام پر بھرپور توجہ دی جائے۔ باقی باتیں رات کے کھانے پر ہوں گی۔"

پیامبر نے سیلوٹ کیا اور وہاں سے چلا گیا۔

میں نے ایک نظر میدان کارزار پر ڈالی جو آشوریوں اور ازمیریوں کی لاشوں سے اٹا ہُوا تھا۔ نیچے آبنائے میں بہت سی کشتیاں اب تک جل رہی تھیں اور گرفتار ہونے والی عورتیں بین کررہی تھیں۔ اُن کے بچے رو رہے تھے اور فاتح سپاہی قہقہے لگا رہے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ یہاں بھی سب کچھ ویسا ہی ہو رہا ہے جیسا ہمارے دَور اور ہماری دُنیا میں ہوتا ہے۔

●

فرہاد نے سچ ہی کہا تھا کہ اُس کے دستے کے سپاہی دردِ سر بن جائیں گے۔ انھوں نے آشوریوں کی شراب پورے لشکر میں تقسیم کردی۔ میں غروبِ آفتاب تک مدہوش سپاہیوں کو قیدی عورتوں سے بمشکل دُور رکھ سکا اور جب سارے نجی آشوری بچے اور عورتیں ازمیری ساحل پر منتقل کردی گئیں تو میں بھی اپنے خیمے میں آگیا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں نے غسل کیا، لباس بدلا اور اپنے خادموں کو آواز دی تو پتہ چلا کہ وہ غائب ہیں۔ اتنے میں اوخیر بھی نہا دھو کر آگیا اور اُس نے بتایا کہ خادموں کو آواز دینا فضول ہے۔ وہ سب فتح کا جشن منا رہے ہیں اور فتح کا جشن جس انداز سے منایا جارہا تھا اس پر انسانیت ماتم کناں تھی۔ کہیں سے آشوری عورتوں کے بین بلند ہورہے تھے کہیں سے چیخیں۔ وہ ازمیری جو آشوریوں کو وحشی کہا کرتے تھے اس وقت خود وحشی بنے ہُوئے تھے۔

میں نے اوخیر کے ساتھ ساتھ فرہاد کو بھی رات کے کھانے کی دعوت دی تھی مگر وہ نہیں آیا تھا۔ اس کے خیمے سے کبھی اس کے بے سُرے گانے کی آواز آتی تھی اور کبھی اول جلول بکنے کی۔

خادموں کے نہ ہونے کے باعث میں نے اور اوخیر نے مل کر کھانا تیار کیا اور جب کھانے بیٹھے تو اوخیر نے کہا۔

"فرہاد ٹھیک کہتا ہے جناب۔ عمیر کو تلاش کرنے کی کوشش حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگی اگر وہ خود بخود سامنے نہ آنا چاہے تو آپ اُسے کبھی تلاش نہیں کرپائیں گے اس سے زیادہ اچھا یہ ہوگا کہ ہم جلد از جلد راجدھانی لوٹ جائیں اور ارژنگ کے کالے کوڑوں سے نمٹیں مجھے میرے جاسوسوں نے مطلع کیا ہے کہ وہ زیر تعمیر مقبرے سے محل سرا میں منتقل ہوگیا ہے اور ملکہ فرازیہ کا خود ساختہ نگران بن گیا ہے۔ ہم نے جنگ جیت کر اگرچہ آشوریوں کو ایک طویل عرصے تک سر اُٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا ہے لیکن اگر ہم ان کی بجائے ارژنگ اور اُس کے کوڑوں کی سرکوبی کرتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔"

"تمھارا مشورہ اپنی جگہ درست ہے اوخیر مگر مجھے افسوس ہے کہ میں اس پر عمل نہیں کرسکتا۔ میں عمیر کو ضرور تلاش کروں گا تم یہیں رہو گے اور اپنے ان بے قابو سپاہیوں کی تنظیم نو کرکے عسکری قواعد کا پابند بناؤ گے۔"

"سپاہی یہ حرکتیں نشے کے زیر اثر اور فتح کی خوشی میں سرشار ہوکر کررہے ہیں صبح جونہی اُن کا نشہ اُترے گا ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے ویسے اگر آشوری ہم پر غالب آجاتے تو وہ بھی ہماری عورتوں کے ساتھ یہی سلوک روا رکھتے۔"

کھانے کے بعد ہم خیمے سے باہر نکل آئے تاکہ تازہ ہوا سے لطف اندوز ہوسکیں۔

خیمہ گاہ میں ہر طرف مشعلیں اور الاؤ جل رہے تھے۔ سپاہی جشن و طرب منانے میں مصروف تھے۔ اُن کے قہقہوں میں بربریت کا شکار ہونے والی عورتوں کی چیخیں بھی شامل تھیں جو میری برداشت سے باہر ہوتی

جا رہی تھیں اس لیے میں فرہاد کے خیمے کا جائزہ لینے کا کہہ کر [illegible] چلا گیا اوخیر بھی میرے پیچھے پیچھے تھا۔

خیمے کے وسطی کھمبے کے ساتھ ایک شمع دان لٹکا ہُوا تھا اس کی روشنی خیمے کا اندھیرا دُور کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ خیمے کے ایک کونے میں [illegible] کے ڈھیر پر لیٹا فرہاد نشے کے خراٹے لے رہا تھا اچانک [illegible] کے قریب بیٹھی ہوئی ایک لڑکی اُٹھی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر فرہاد کے [illegible] کا خنجر اُٹھا لیا۔

اس لڑکی کی عمر بمشکل سولہ سال ہوگی وہ آشوری حسن کا شاہکار تھی اُس کے سُنہرے بال [illegible] شانوں پر لہرا رہے تھے اور نیلی [illegible] آنکھیں [illegible] بھیگی ہوئی تھیں۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ وہ خنجر مجھ پر پھینکنا [illegible] چاہتی ہے مگر جب اُس نے خنجر اس طرح [illegible] جیسے اپنے دل میں گھونپ دینا چاہتی ہو تو میں نے مسکراتے ہوئے [illegible] کہا۔ "ایسا نہ کرو لڑکی۔ ہم تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے [illegible] یہ بتاؤ کہ تم اس خیمے میں کیسے آگئیں؟ کیا [illegible] جانتا ہے کہ تم یہاں ہو؟"

"اس عالم میں تو اُسے اپنا ہوش بھی نہیں ہے۔" لڑکی کی بجائے [illegible] بولا۔

میں نے لڑکی سے نگاہیں ہٹائے بغیر اوخیر کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اسی نرم لہجے میں دوبارہ لڑکی سے مخاطب ہُوا۔ "میں ازمیر کا [illegible] ہوں لڑکی اور تمھیں قول دیتا ہوں کہ ہم سے تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اس لیے بے خوف و خطر ہم سے بات کرو اور خنجر [illegible] دو۔"

لڑکی خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ اُس کے ہونٹوں کی کلیاں نیم وا ہوئیں اور وہ بولی۔ "سُنا تھا [illegible] مجھے تمھارے متعلق بتایا تھا کہ تم دیوتا سمان ہو مگر تمھیں دیکھنے کے بعد اس بات سے میرا یقین اُٹھ رہا ہے کیونکہ تم مجھے دیوتاؤں جیسے نظر نہیں آتے۔"

اس پر اوخیر ہنس پڑا۔ میں نے کہا۔ "میں نہیں جانتا کہ دیوتا کیسے ہوتے ہیں۔ بہر صورت اس سلسلے میں پھر کبھی بات کریں گے پہلے یہ بتاؤ تم یہاں کیوں اور کیسے آئی ہو؟"

"میں ایک آشوری لڑکی ہوں۔ تمھارے سپاہیوں کے ایک گروہ نے مجھے پکڑ رکھا تھا مگر اتنے میں فرہاد وہاں پہنچ گیا۔ اس نے انھیں حکم دیا کہ مجھے چھوڑ دیں مگر وہ نہ مانے اور لڑنے لگے۔ تب فرہاد نے ان میں سے تین آدمیوں کو زخمی کردیا اور مجھے اپنے ساتھ خیمے میں لے آیا۔ میں نے اس کے خنجر سے خودکشی کرنا چاہی تو اس نے مجھے روک دیا اور بتایا کہ وہ خود بھی ایک آشوری ہے۔ پھر اُس نے مجھے کچھ ایسی باتیں بتائیں جو صرف ایک آشوری ہی جان سکتا ہے تب مجھے یقین آگیا اور میں نے وعدہ کرلیا کہ خودکشی نہیں کروں گی۔ پھر وہ تو نشے میں سوگیا مگر مجھے بھوک کے مارے نیند نہیں آرہی تھی۔"

میں نے اوخیر سے کہا کہ وہ میرے خیمے سے بچا کھچا کھانا لے آئے۔ [illegible] لڑکی نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "فرہاد نے کہا تھا کہ صبح تم سے اجازت لے کر مجھے اپنے خیمے میں رکھے گا۔"

"کیا تم اس کے ساتھ رہنا پسند کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ بھی آشوری ہے اور [illegible] بھی۔"

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"ملازیہ۔"

"اچھی بات ہے ملازیہ۔ اگر وہ اتنا [illegible] تمھیں اپنا لیا جائے گا اور مجھے اجازت دینے میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔"

اتنے میں اوخیر کھانا لے آیا اور ملازیہ اُس پر بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑی۔ میں نے اوخیر سے کہا۔ "اب ہم ملازیہ کو یہاں [illegible] فرہاد کی شراب سے [illegible] میں سوچتا ہوں جب تمھیں نیند آنے لگے تو مجھے جگا دینا۔ صبح سویرے [illegible] مجھے فرہاد کو اپنے ساتھ لے جانا ہے۔" یہ کہہ کر میں اوخیر کے خیمے سے باہر آگیا۔

اب ہوا میں خنکی آگئی تھی اور [illegible] تھی۔ میں نے اپنے خیمے کے گرد چکر لگا کر [illegible] ایک [illegible] دماغ میں [illegible] کرسٹل [illegible] دھواں [illegible] واقعی ایسا ہی تھا [illegible] ذہن میں پیدا ہونے والی خرابیاں [illegible] گئی ہے [illegible] کی تلاش [illegible] پیغام [illegible] ہوگئے۔

مجھے اپنی آنکھیں [illegible] محسوس ہونے لگا۔

میں نے افق کی جانب دیکھا۔ [illegible] پھیلنے لگا تھا میں نے [illegible] سپاہیوں کو [illegible] اور انھیں حکم دیا کہ وہ جلدی سے [illegible] تاکہ اُسے [illegible] جگایا جاسکے۔

★ ★

فرہاد نے کل رات اتنی چڑھا لی تھی کہ [illegible] کے بعد [illegible] ہوش میں آیا اگرچہ [illegible] آنکھیں بھی [illegible] جلدی [illegible] یہ خوش قسمتی [illegible] ملازیہ ہے۔

میں نے اُسے جلدی سے تیار ہونے کے لیے کہا تو وہ ٹال مٹول کرتے ہوئے بولا۔

"ہم حمیر اور شمروز کو تلاش نہیں کر سکیں گے شہزادے۔"

جب سے فرازیہ کے ساتھ میری شادی ہوئی تھی، سب مجھے شہزادہ کہنے لگے تھے۔ کبھی کبھی مجھے اس اندازِ تخاطب پر ہنسی بھی آجاتی تھی۔ میں نے فرہاد کے منہ پر پانی کے چھپاکے مارتے ہوئے کہا۔ "یہ بہانے رہنے دو فرہاد۔ میرا خیال ہے، شراب نے تمھیں اتنا بزدل بنا دیا ہے کہ تم شمروز سے ڈرنے لگے ہو۔ اسی لیے اس کی تلاش سے گریز کرنا چاہتے ہو۔"

"دیوتاؤں کی قسم میں اُس مردود سے نہیں ڈرتا۔ وہ مجھے مل جائے تو میں اُس کے خون سے شبایہ کا قصاص ادا کروں گا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ پہاڑیوں کی اُن غاروں میں انھیں تلاش کرنا ناممکن سا ہے۔ آپ نہیں جانتے، اُن پہاڑیوں کے نیچے غاروں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ ہم انھیں ڈھونڈنے کی بجائے خود کھو جائیں گے۔"

"جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں نے اُسے جواب دیا۔ "اگر اب ہم حمیر کو گرفتار نہ کر سکے تو پھر زندگی بھر وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ بس تم جلدی سے لباس تبدیل کر لو۔" اتنے میں اوغیر بیس سپاہی اپنے ساتھ لے آیا اور بولا۔

"اس وقت صرف یہی لوگ آپ کے ساتھ چل سکنے کے قابل ہیں شہزادے، باقی سپاہیوں کو اتنا ہوش بھی نہیں کہ وہ اُٹھ کر بیٹھ سکیں۔"

"کوئی بات نہیں اوغیر۔ اتنے ہی بہت ہیں۔ کیا انھیں ضروری سامان دے دیا گیا ہے؟"

"جی ہاں۔ ہتھیاروں کے علاوہ ان کے پاس رسیاں اور مشعلیں کافی تعداد میں موجود ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد میں فرہاد اور نازیہ کے علاوہ بیس جوانوں کے ساتھ آشوری ساحل کی ایک پہاڑی غار میں داخل ہو چکا تھا لیکن جیسا فرہاد نے بتایا تھا، یہ غاریں جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں اور یہ اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا کہ حمیر نے اپنے فرار کے لیے کون سی سرنگ منتخب کی ہوگی۔ فرہاد نے مشعل کی روشنی متعدد غاروں پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ مہم ترک کر دو شہزادے۔ حمیر اور سیروں کی چٹانوں تک پہنچنے کے دوسرے طریقے بھی ہیں اور پھر وہ اب تک ان میں سے کسی سرنگ میں بیٹھ کر اپنی گرفتاری کا انتظار نہیں کر رہا ہوگا۔ وہ اپنے پہاڑوں میں پہنچ کر بچے کھچے آشوریوں کو اکٹھا کر رہا ہوگا۔"

"تم یہ بات یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو فرہاد؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا مگر میرا اندازہ یہی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اور اس کے بچے کھچے ساتھی کسی سرنگ کے موڑ کے پیچھے چھپے ہوئے ہوں اور اچانک ہم پر ٹوٹ پڑیں۔"

اگرچہ فرہاد کی بات میں وزن تھا مگر میں اپنی بات پر اڑ گیا اور بولا۔ "خدشوں سے خوفزدہ ہونا بزدلی ہے فرہاد۔ ہم دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر الگ الگ غاروں میں ڈھونڈیں گے۔"

"مگر یہ غار بھول بھلیوں سے کم نہیں شہزادے۔"

"رسیاں اسی مقصد کے لیے لائی گئی ہیں فرہاد۔ ہم کسی چٹان کے ساتھ رسیاں باندھ کر مختلف غاروں میں داخل ہوں گے اور پھر انہی رسیوں کی رہنمائی میں واپس آجائیں گے۔ اگر حمیر اور اس کے ساتھی کہیں دکھائی دے جائیں تو ان پر نہ تیر چلائے جائیں اور نہ حملہ کیا جائے۔ بس مجھے مطلع کر دیا جائے۔ پھر اُن پر قابو پانا میرا کام ہے۔" میں نے وضاحت کی تو فرہاد بولا۔

"کاش آپ مجھے شراب لانے دیتے تاکہ مجھے ان غلط اقدامات کا احساس تو نہ ہوتا۔"

اس سے پہلے کہ میں فرہاد سے بحث کرتا، نازیہ بول اٹھی۔ "جب میں چھوٹی تھی اور اپنے بھائی کے ساتھ ساحل پر کھیلا کرتی تھی تو ایک بار ان غاروں میں آئی تھی۔ ان میں سے ایک غار کئی میل لمبی ہے جو وادی تک جاتی ہے اور یہ وادی ہمارے پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے۔"

"پھر وہ اُسی غار سے گئے ہوں گے۔ وہ کون سی سرنگ ہے نازیہ؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

نازیہ نے وہ سرنگ دکھائی اور ہم سب اُس میں داخل ہو گئے۔ کچھ دُور چلنے کے بعد ایک مقام پر ہمیں ایک آشوری کی لاش دکھائی دی۔ جس نے زخموں کی وجہ سے دم توڑ دیا تھا۔

میں بے ساختہ بول اُٹھا۔ "وہ اسی راستے سے گئے ہیں فرہاد۔"

"ہاں۔ اس لاش کی موجودگی تو یہی بتاتی ہے۔" وہ لاش کو پاؤں سے سیدھا کرتے ہوئے بولا۔ "یہ حمیر کے محافظوں میں سے ایک تھا۔ مگر میں نے جن خدشوں کا اظہار کیا ہے، وہ اپنی جگہ اب بھی موجود ہیں۔ آپ کے ساتھ مٹھی بھر سپاہی ہیں جو جنگجو وحشی آشوریوں کے سامنے نہیں ٹک سکتے۔ میری حالت بھی ابتر ہے۔ اب صرف آپ اور یہ لڑکی ہی باقی رہ جاتے ہیں اور اس لڑکی کے بارے میں اب تک متذبذب ہوں کہ اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔"

یہ سن کر نازیہ نے غصے سے فرہاد کی طرف دیکھا اور بولی۔ "میں نے تم پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا کہ مجھ پر اعتماد کرو۔ مجھے اس کی پروا بھی نہیں کہ تم مجھے قابلِ اعتماد سمجھتے ہو یا ناقابلِ اعتماد۔"

میں نے بغور لڑکی کے تاثرات کا جائزہ لیا لیکن اس کی آنکھوں یا چہرے کے تاثرات سے کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکا۔ وہ مجھے اپنی طرف گھورتا پا کر بولی۔

"میں نے تمھیں سچ بتایا ہے۔ یہ سرنگ وادی کی طرف جاتی ہے اور

ی اُن پہاڑوں میں واقع ہے جہاں آشوری بادشاہ رہتے ہیں۔ اب تمہارا جی چاہے کرو۔ جاؤ یا نہ جاؤ تمھاری مرضی۔"

"ہم جائیں گے نازیہ۔" میں نے کہا۔ "مگر تم ہمارے آگے آگے چلو گی ہمارے تیر اندازوں کی زد میں رہو گی۔" پھر میں نے اپنے سپاہیوں سے اس پر نظر رکھنا۔ اگر یہ فرار ہونا چاہے تو اسے تیروں سے چھید ڈالنا۔"

نازیہ مسکرائی اور ہم سے پہیں تیس قدم آگے آگے چلنے لگی۔

تقریباً نصف گھنٹے تک اُسی سرنگ میں چلنے کے بعد وہ ایک اور ب میں داخل ہوئی۔ ہم بھی اُس کے پیچھے پیچھے تھے اور وہ تیروں کی زد تھی۔ مگر اس سرنگ میں جا بجا مینار نما چٹانیں بھی تھیں۔ کچھ دُور چلنے کے اس نے مشعل بلند کی اور اس کی روشنی ایک اور غار کے دہانے پر ڈالتے ئے بولی۔ "یہ سیدھی وادی میں نکلے گی۔"

وہ غار میں داخل ہو گئی۔

جب ہم اس غار میں داخل ہوئے تو وہ غائب ہو چکی تھی اچانک چٹان کے پیچھے سے آشوری نکلے اور انھوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ میں اور فرہاد نے ایک دوسرے کی پیٹھ سے پیٹھ ملا لی اور ان کا مقابلہ کرنے لیکن یہ مقابلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ انھوں نے ہم پر جال پھینک کر ہمیں بے بس کر دیا تاہم اُس وقت تک ہم گیارہ آشوریوں کو موت کے گھاٹ اُتار چکے تھے۔

جال میں پھانسنے اور بے بس کرنے کے بعد انھوں نے ہمیں بیلوں باندھ دیا۔ ہمارے سپاہیوں کے سر قلم کر کے نیزوں پر بلند کیے اور بلیاں اُٹھا کر چل دیے جن کے ساتھ میں اور فرہاد بندھے ہوئے تھے۔ میں جو حمیر کو گرفتار کرنا چاہتا تھا، اب خود حمیر کا قیدی بن گیا تھا۔ آشوریوں نے مجھ سے شاہی قیدی کا سلوک کیا۔ انھوں نے میرے پاؤں کھول کر ایک بڑے جھونپڑے میں نظر بند کر دیا جس کے باہر کڑا پہرہ تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ فرہاد کو کہاں لے گئے ہیں۔

دوسرے دن مجھے ایک ایسی جگہ لے جایا گیا جسے مقتل کہا جا سکتا ہے۔ حمیر، شمروز اور فرہاد موجود تھے۔ فرہاد کی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور اس کے پاؤں بھی جکڑ دیے گئے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ اُسے وہ سزا دی جانے والی ہے جو آشوری قانون کے مطابق غداروں کو دی جاتی ہے اور وہ سزا یہ تھی کہ مجرم کو کلہاڑے کی پانچ ضربیں لگائی جاتی تھیں۔ دو ضربوں سے اس کے پاؤں کاٹے جاتے تھے، دو ضربوں سے ہاتھ اور پانچویں سے گردن۔

شمروز نے، جو صورت ہی سے انتہائی مکار اور رذیل نظر آتا تھا، حمیر سے درخواست کی کہ فرہاد کو سزا دینے کا کام اُس کے سپرد کر دیا جائے اور حمیر نے اس کی درخواست قبول کر لی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اپنے دانت شمروز کے نرخرے میں گاڑ دوں لیکن میں پندرہ بیس آشوریوں کے نرغے میں گھرا ہوا تھا اور مجھے اس لیے وہاں بلایا گیا تھا کہ میں بچشم خود اپنے ساتھی کو موت کے گھاٹ اُترتا دیکھوں۔

فرہاد کو ایک چبوترے پر لٹا دیا گیا اور اُس کے ہاتھ پاؤں چار کھونٹوں سے جکڑ دیے گئے۔

شمروز جو دبلا پتلا مگر دراز قد آدمی تھا کلہاڑا لے کر اس کی طرف بڑھا میں نے فرہاد کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا۔ مگر بھالوں کی زد پر مجھے اس کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا گیا۔

شمروز فرہاد کے قریب آیا تو فرہاد نے اُس کے منہ پر تھوک دیا۔ شمروز کے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹا اور جوشِ دہشت میں اُس نے دو ضربوں سے فرہاد کے دونوں پاؤں کاٹ دیے۔ یہ منظر دیکھ کر غم و غصے کے مارے میرے منہ سے کراہ نکل گئی مگر آفرین ہے فرہاد پر اس کے منہ سے سسکاری تک نہ نکلی اس نے دوبارہ شمروز کی طرف منہ کر کے تھوک دیا۔

شمروز آگ بگولا ہو کر پھر آگے بڑھا اور اس نے فرہاد کے ہاتھ بھی کاٹ دیے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس وقت کھولیں جب فرہاد کا سر کٹ چکا تھا اور اُسے نیزے پر بلند کیا جا رہا تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل میں چھرا گھونپ دیا ہو۔ غم، غصے، نفرت، اور ندامت کی شدت سے مجھے متلی سی ہونے لگی۔ میرے ضمیر نے مجھے سانپ کی طرح ڈسنا شروع کر دیا کہ فرہاد میری وجہ سے اتنی کرب ناک موت کا شکار ہوا تھا۔ میں اپنے ضمیر کی ملامت کا بوجھ نہ اُٹھا سکا اور بے ہوش ہو گیا۔

جب دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میں ایک سطح مرتفع پر بنے ہوئے جھونپڑے میں پڑا تھا۔ میں نے بمشکل اُٹھ کر جھونپڑے اور سطح مرتفع کا جائزہ لیا۔ یہ پہاڑی نہیں بلکہ ایک اونچا ٹیلہ تھا اور اس کے اردگرد ہر طرف اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں جن پر آشوری محافظ متعین تھے۔ میں گرتا پڑتا دوبارہ جھونپڑے میں آیا تو مجھے شدید بخار ہو رہا تھا۔ میں کھالوں کے بستر پر گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

نہ جانے کتنے دن بخار میں پھنکتا رہا۔ کبھی کبھی نیم بے ہوشی اور غنودگی کی کیفیت میں مجھے مختلف لوگوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اسی عالم میں اکثر مجھے ایک لڑکی کی آواز بھی آتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خواب دیکھ رہا ہوں۔ خواب ہی کی کیفیت میں میں نے اُس سے اس کا نام پوچھا تھا۔ اس نے اپنا نام سمیرا بتایا تھا۔

مگر جب میرا بخار ٹوٹا تو پتہ چلا کہ وہ خواب نہیں تھا، حقیقت تھی۔ حمیر کی بیٹی سمیرا میری بیماری کے دوران بھی آتی رہی تھی اور اب بھی ہر

دوسرے روز آیا کرتی تھی۔

مجھے صحت یاب ہونے کے بعد اسی بندی خانے میں رہتے ہوئے ایک مہینے سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے بارے میں آشوریوں کے ارادے کیا ہیں مگر میرا ارادہ بہرطور وہاں سے فرار حاصل کرنے کا تھا۔ اسی لیے میں نے اُن سے کھالیں اور سُوئی دھاگا منگوایا تھا اور انہوں نے بلا چون وچرا یہ چیزیں مہیا کر دی تھیں۔ میں ان کھالوں کو ایک دوسرے کے ساتھ سی کر ایک غبارہ تیار کر رہا تھا کہ وہاں سے صرف پرواز کے ذریعے ہی فرار ممکن تھا۔ دوسری کوئی صورت اس لیے نہیں تھی کہ اس پچاس فٹ اونچے ٹیلے پر صرف سیڑھی کی مدد سے آیا یا اُترا جا سکتا تھا۔

فرہاد کی عبرتناک موت نے میرے دل میں ہی نہیں روح تک میں گھاؤ ڈال دیے تھے۔ اس کی موت کا منظر میری لوحِ ذہن پر اس طرح نقش ہو گیا تھا کہ کسی طور پر مٹنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ ہر بار اس کی یاد میری آنکھوں میں آنسو بھر دیتی تھی۔ میرا ضمیر مجھے مسلسل کچوکے دیتا رہتا تھا اور میں خود اپنی نگاہوں سے گر گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں خود اس کا قاتل ہوں۔

میں روزانہ اپنے جھونپڑے سے باہر نکل کر ٹہلنے کے بہانے اطراف کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ میرے چاروں طرف پہاڑیوں پر ہمہ وقت محافظ چوکس رہتے تھے اور دن میں کئی بار اُڑنے والے آدمی بھی کسی بلند پہاڑی سے پرواز کرتے ہوئے میرے سر سے گزر جاتے تھے اور میں سوچتا رہ جاتا تھا کہ آشوریوں نے گلائیڈر تو بنا لیے ہیں مگر انھیں غبارہ بنانے کا خیال کیوں نہیں سُوجھا۔ میں غبارے کی وجہ سے روز ہوا کا رُخ بھی معلوم کیا کرتا تھا جو گزشتہ پچیس دنوں میں اٹھارہ روز تک شمال سے جنوب کی طرف چلتی رہی تھی۔

آشوریوں کی یہ قید نظر بندی سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ مجھے اچھا کھانا دیتے تھے۔ جھونپڑے کو گرم رکھنے کے لیے مجھے کافی ایندھن بھی فراہم کر دیا گیا تھا اور میں اُس ٹیلے پر گھوم پھر بھی سکتا تھا۔

سمیرا ہر دوسرے روز میرے پاس آتی تھی۔ وہ درمیانہ قد و قامت کی نازک اندام لڑکی تھی۔ اگرچہ وہ بہت زیادہ حسین تو نہیں تھی لیکن اُس کے بال بہت لمبے اور ہونٹ گلاب رنگ تھے۔ وہ چوری چھپے نہیں بلکہ حمیر کے حکم پر آتی تھی اور اُس کی آمد کا صرف ایک مقصد تھا کہ وہ ایک بیٹے کی ماں بن جائے۔ میں اُسے پسند نہیں کرتا تھا، مجھے اُس پر اعتماد بھی نہیں تھا۔ مگر اُس کی آمد خوش وقتی کا باعث ضرور بنتی تھی۔ سمیرا بھی مجھے پسند نہیں کرتی تھی، اُسے بھی مجھ پر اعتماد نہیں تھا مگر وہ اپنے باپ کا حکم ماننے پر مجبور تھی۔

میری سمجھ میں یہ ایک بات نہیں آتی تھی کہ حمیر مجھ سے ملنا کیوں نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کئی بار اُسے پیغام بھی بھیجا... مگر اس نے مجھے حاضری کا اِذن نہیں دیا تھا۔ آخر کیوں؟ یہ سوال میری مستقل سوچ بن گیا تھا۔

ایک روز میں غبارے کے لیے کھالوں کی سلائی میں مصروف تھا کہ اتنے میں جھونپڑے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے کھالیں کونے میں رکھ دیں اور آنے والے کی راہ دیکھنے لگا۔

وہ سمیرا تھی۔

حسبِ معمول نہ اُس کے گلاب رنگ ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھری اور نہ آنکھوں میں تاثرات دکھائی دیے۔ وہ آئی اور بھیگی ہوئی چڑیا کی طرح سمٹ سمٹا کر الگ بیٹھ گئی۔ میرے اندازے کے مطابق اُس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو وہ اپنا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں رکھتے ہوئے بولی۔

"تم ٹھیک ہو نا؟ تمھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" وہ ہمیشہ اپنی گفتگو کا آغاز اسی فقرے سے کیا کرتی تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں سمیرا۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر تمھارا باپ مجھ سے ملنا کیوں نہیں چاہتا۔ میں کوئی عام قیدی نہیں، میں وہ آدمی ہوں جس نے اُسے میدانِ جنگ میں شکستِ فاش دی۔ اُسے تو مجھ جیسے مردِ میدان اور بہادر مدِمقابل سے ملنے کے لیے بے تاب ہونا چاہیے تھا۔"

"وہ بے تاب تو ضرور ہے مگر یہ خبر سننے کے لیے کہ میں ایک بچے کی ماں کب بنوں گی۔ شموز اُسے برابر اُکسا رہا ہے کہ تم باپ بننے کے قابل ہی نہیں اسی لیے تمھیں اُس کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ تم سے بھی وہی سلوک کرے جو اُس نے فرہاد سے کیا تھا۔ وہ تمھیں نہ دیوتا تسلیم کرتا ہے نہ دیوتاؤں کا فرستادہ۔ اور ہاں اُس نے نازیہ سے شادی کر لی ہے جو اس کے بچے کی ماں بنے گی۔ وہ اپنے آپ کو تم سے زیادہ بہتر ہونے کا دعوا کرتا ہے۔"

"اس سلسلے میں تمھارے باپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا باپ اب بھی تمھیں دیوتا سمجھتا ہے۔ وہ شموز سے کہتا ہے کہ اگر تم دیوتا نہ ہوتے تو اُسے ہرگز ہرگز شکست نہ دے سکتے۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ میں تمھارے بیٹے کی ماں بنوں۔ وہ بچہ آدھا آشوری اور آدھا دیوتا ہوگا۔ وہ آشوریوں کی عظمتِ رفتہ واپس لائے گا اور ہماری خوش بختی کا ضامن ہوگا۔ کبھی کبھی تو تمھارے متعلق میرے باپ اور شموز میں تلخ کلامی کے بعد لڑنے تک کی نوبت آ جاتی ہے۔"

سمیرا کی ان باتوں سے مجھے پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ حمیر نے مجھے قتل کیوں نہیں کیا اور شموز کس قدر میرے خون کا پیاسا ہے۔ اب تک میں نے سمیرا کی خواہش پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ مگر اب میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے کوئی ثبوت دینا ہی پڑے گا۔ اُس دن میں نے سمیرا پر ہر وہ حربہ

آزمایا جو ایک مرد کسی خاتون کے دل و جان پر حکمرانی کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے قرب و وصال کی ان گھڑیوں اُس پر وارفتگی سی طاری کردی۔ اس آنکھیں یوں بند ہوگئیں جیسے خمار نے اس کے پپوٹے بوجھل بنا دیے ہوں۔ اس نے پلکوں کی چلمن ذرا سا ہٹائی اور سرور کے عالم میں بولی "آج سے پہلے تو کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا تھا سرفروش"۔

"آج محبت نے ہمارے دلوں پر دستک دی ہے سمیرا" میں نے اُسے جواب دیا "آج ہمارے دلوں کا ملاپ ہوا ہے۔ اب تمھارے بغیر میری زندگی ادھوری رہے گی"۔

"میں بھی یہی محسوس کر رہی ہوں سرفروش۔ لیکن تم آشوری نہیں ہو اس لیے ہماری شادی نہیں ہوسکتی" وہ بولی۔

"پھر میں تمھارے بغیر کیسے زندہ رہوں گا سمیرا؟" میں نے بالکل اُسی طرح جھوٹ بولا جیسے ہمارے دَور میں لڑکیاں اور لڑکے ایک دوسرے کو بے وقوف بنانے کے لیے بولتے ہیں۔

"ایک صورت ہے سرفروش۔ تم میرے محبوب اور نگران بن کر میرے ساتھ رہو گے میں جلد ہی تمھیں اپنے باپ سے ملاؤں گی اور یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ رکھوں گی"۔

"مگر شموز اس کی مخالفت کرے گا سمیرا"۔

"میرا باپ اُس کی بات بائیں کان سے سنتا ہے اور میری دائیں کان سے۔ شموز میری محبت میں حائل نہیں ہوسکتا سرفروش۔ ہمیں کوئی ایک دوسرے سے جُدا نہیں کر سکے گا"۔

جب وہ چلی گئی تو میں نے سوچا کہ میں بھی کتنا احمق تھا ورنہ اب سے بہت پہلے یہ حربہ استعمال کرچکا ہوتا۔ ہرچند کہ یہ ایک گھٹیا بات ہے مگر میں اپنی بقا کے لیے ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ دراصل فرہاد کی موت نے مجھے اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑا کر دیا تھا۔ میں اُس کا مجرم ضرور تھا مگر ماضی ایک ایسی چیز ہے جسے خدا بھی نہیں لوٹاتا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب فرہاد کی موت اور ماضی کا ماتم نہیں کروں گا۔ اس سوچ نے اُس سرفروش کو پھر زندہ کردیا جو حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا جانتا تھا۔

اُسی رات میرے دماغ میں نصب کرسٹل نے پھر کام شروع کر دیا۔ جب سے ٹیلے پر نظر بند کیا گیا تھا، کرسٹل نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ ڈاکٹر فریدوں میری ذہنی حالت کی وجہ سے بہت متفکر تھا۔ میں نے ارتکازِ توجہ سے اُسے غبارے کے ذریعے فرار ہونے کی اطلاع دے دی اور پھر سو گیا۔ بہت دنوں کے بعد مجھے اُس رات گہری نیند آئی تھی۔

صبح وہ مجھے لینے کے لیے آگئے۔ انھوں نے نہ مجھے زنجیروں سے جکڑا نہ رسیوں سے۔ بس اپنے نرغے میں لے لیا۔ ہم سیڑھی کے ذریعے ٹیلے سے اُترے اور وادی سے گزرے تو راستے کے دونوں جانب لوگ کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے مگر دیکھنے والوں کی اکثریت عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھی، مرد بہت کم تھے۔

محافظوں کا دستہ مجھے اپنے گھیرے میں لیے ایک بہت بڑے غار میں داخل ہوا حمیر اسی غار میں دربار لگایا کرتا تھا۔ غار میں بیسیوں مشعلیں جل رہی تھیں۔ سامنے حمیر پتھر کے قدرتی تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد محافظ اور سامنے دو رویہ مجلسِ مشاورت کے ارکان موجود تھے۔ منصب داروں کے گلے میں زنجیریں پڑی تھیں جو اُن کے مناصب کو ظاہر کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ عہدے داروں کی پیشانیوں پر نیلے نشانات اُن کے عہدوں کی نشان دہی کرتے تھے۔

سمیرا تخت کے نیچے بیٹھی تھی جب میں محافظوں کے نرغے میں وہاں پہنچا تو اس کے گلاب رنگ ہونٹوں پر خوبصورت مسکراہٹ اُتر آئی۔ حمیر کے دائیں جانب شموز اور اس کی نئی بیوی نازیہ بیٹھے تھے نازیہ نے نہ سر اُٹھایا نہ کنکھیوں سے مجھے دیکھا۔ وہ سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ البتہ شموز مجھے دیکھ کر نفرت سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ میں نے سوچا کہ فرہاد تو شموز کے خون سے تبابہ کا قصاص ادا نہیں کر سکا تھا مگر میں اس کے خون سے فرہاد کا قصاص ضرور ادا کروں گا۔

اُس وقت حمیر کے سر پر خود کی بجائے ایک آہنی تاج تھا۔ اس کے شانے حیرت انگیز حد تک چوڑے تھے۔ اس کی آنکھیں ہلکی نیلی تھیں مگر اُس کی بینائی کمزور ہو چکی تھی اس لیے اس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کے سامنے جُھکا نہ سر خم کیا کہ آشوری یہ دونوں عمل معیوب سمجھتے تھے۔ وہ نرم لہجے میں بولا۔

"تم نے اپنے سحر کا نیا کرشمہ دکھایا ہے شہزادے۔ میری بیٹی کسی دوسرے مقصد کے لیے تمھارے پاس جایا کرتی تھی مگر اب وہ تمھاری زندگی چاہتی ہے۔ وہ تمھیں اپنے محافظ، محبوب اور جنگجو کی حیثیت سے رکھنے کی طلب گار ہے اور وہ بتاتی ہے کہ تم بھی رضامند ہو۔ کیا یہ سچ ہے شہزادے؟"

"ہاں۔ یہ درست ہے" میں نے جواب دیا تو شموز نے میری طرف غصے سے دیکھتے ہوئے تھوک دیا اور بولا۔

"یہ جھوٹ ہے سردار۔ قیدِ تنہائی سے نجات حاصل کرنے کے لیے پہلے اس نے سمیرا سے محبت کا ڈھونگ رچایا اور اب یہ آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ اسے میرے حوالے کر دیجئے تاکہ میں اسے اس کے دوست فرہاد کے پاس بھیج دوں"۔

حمیر نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "سزا دینے کا اختیار مجھے ہے شموز۔ فرہاد کو سزا میں نے دی تھی اُس پر عمل تم نے کیا تھا اپنے آپ کو یہیں تک محدود رکھو"۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "کیا یہ سچ ہے کہ تم ایک ماہ کے اندر اندر جوان ہو گئے تھے؟"

"جی ہاں۔ یہ بھی سچ ہے" میں نے جواب دیا۔

"میرے جاسوسوں نے مجھے بتایا تھا مگر مجھے یقین نہیں آیا تھا"۔

"اور مجھے اب بھی یقین نہیں ہے" شموز پھر بیچ میں ٹپک پڑا حمیر نے اُسے غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں دوسری بار تنبیہ کر رہا ہوں شموز کہ یہاں کا بادشاہ میں ہوں یاد رکھو کہ تیسری بار اس تنبیہ کی ضرورت محسوس نہیں کروں گا"۔

شموز نے قہرِ درویش برجانِ درویش اپنا سر جھکا لیا مگر اُس کے تاثرات سے پتہ چلتا تھا کہ اگر اُس کا بس چلے تو وہ مجھے ابھی ابھی قتل کر ڈالے۔ پھر بولا۔

"تم نے مجھے شکست دی ہے شہزادے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ میں جان چکا ہوں کہ تم زیرِ آب پُل عبور کرکے میرے عقب میں پہنچے تھے۔ میں نے تمھارے کمان دار اعلا ادغیر کو دونوں پُل تباہ کرتے دیکھا ہے لیکن زیرِ آب پُل تعمیر کرنے کا خیال بھی کسی دیوتا ہی کو آسکتا ہے عام انسان کو نہیں۔ ہم کہ پُرانے دیوتاؤں نے ہم سے مُنہ موڑ لیا ہے۔ اس لیے ہمیں ایک نئے دیوتا کی ضرورت ہے۔ کیا تم ویسی ہی جادوئی قوت پر اب بھی قادر ہو؟"

"کون سی جادوئی قوت؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"بچوں کو ایک ماہ کے اندر اندر جوان بنا دینے والی ساحرانہ قوت جس نے میری قوم کے بیشتر مرد جنگ میں موت کے گھاٹ اتار دیے ہیں اب ہماری قوم میں گنتی کے مرد باقی رہ گئے ہیں لیکن ہمارے پاس بچوں کی بہتات ہے میں چاہتا ہوں کہ تم انھیں فوراً جوان بنا دو تاکہ میں پھر سے اپنی فوج تیار کر سکوں"۔

حمیر کی خواہش پُوری کرنا میرے بس میں نہیں تھا لیکن صورتِ حال کا تقاضہ یہ تھا کہ میں اُسے بہلاوا دوں۔ اس لیے میں نے کہا "میں ایسا کرسکتا ہوں لیکن اس کے لیے کچھ وقت لگے گا اور مجھے تمھاری مدد کے ساتھ ساتھ چمک دار پتھروں کی بھی ضرورت پڑے گی۔ میں نے سُنا ہے کہ تمھارے ہاں اُن پتھروں کی بڑی بڑی چٹانیں ہیں"۔

یہ سُن کر حمیر کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ اس نے بے تابی سے پوچھا "تم حلفیہ کہتے ہو ایسا ممکن ہے؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا "بشرطیکہ مجھے ہر قسم کی آزادی حاصل ہو اور میرے کام میں مداخلت نہ کی جائے۔ اس سلسلے میں میں سب سے پہلے وہاں جانا چاہوں گا جہاں وہ چمک دار پتھر ملتے ہیں"۔

"میری سمجھ میں نہیں آیا کہ چمک دار پتھروں سے تمھاری کیا مراد ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ اس کی مراد اس پتھر سے ہے" اس کا ایک منصب دار اور ایک پتھر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بات جاری رکھی "میں اس سے اپنے خنجر کو دھار لگایا کرتا ہوں"۔

منصب دار نے جو پتھر حمیر کو دیا تھا وہ ٹینس کی گیند کے برابر تھا۔ حمیر نے وہ پتھر مجھے دیتے ہوئے پوچھا "تمھاری مراد ایسے پتھروں سے ہے؟"

میں نے پتھر کا جائزہ لیا۔ وہ وزن میں اُس پتھر سے نصف کے برابر ہوگا جو مجھے ارژنگ نے دکھایا تھا مگر یہ بھی خالص ہیرا تھا جس کی چکا چوند سے میری آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ میں نے اُسے منصب دار کو لوٹاتے ہوئے کہا "ہاں میری مراد ایسے ہی پتھروں سے ہے۔ مگر مجھے اس سے بہت زیادہ بڑے پتھر چاہئیں۔ اس لیے کہ اگر مجھے بچوں کو جنگجو جوان بنانا ہے تو پہلے مجھے اُن کے قدِ آدم مجسمے بنانا ہوں گے"۔

میری اس بات پر دربار میں خاموشی چھا گئی۔ حمیر خاموشی سے مجھے گھورنے لگا مگر شموز خاموش نہ رہ سکا۔ وہ کھڑا ہوگیا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ دیوتا کی قوت نہیں سردار، کالا جادو ہے۔ یہ ہمارے بادشاہوں اور ملکاؤں کے مقدس مقابر تک نہیں جا سکتا اور پھر یہ چمک دار پتھروں کے مجسمے ہی کیوں بنانا چاہتا ہے؟ اسے ابھی قتل کر دو سردار، اسی وقت۔ اگر یہ کوئی دیوتا ہے تو شیطانی دیوتا ہے۔ بدارواح کا نمائندہ ہے"۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی نازیہ بول اُٹھی "یہ دیوتا ہے یا نہیں میں نہیں جانتی مگر یہ بدی سے بالاتر ہے۔ یہ میرے ساتھ مہربانی سے پیش آیا تھا اور اس نے جو قول دیا تھا اُس پر بھی پورا اُترا تھا۔ میں سوتی رہی اور یہ میری عزت کا محافظ بن کر پہرہ دیتا رہا"۔

شموز اس کی طرف پلٹا اور اُسے تھپڑ مارتے ہوئے بولا "بکواس بند کر عورت، مردوں کی مجلس میں عورتیں نہیں بولا کرتیں"۔

سمیرا جو اس دوران مُسکرا کر اور سر ہلا کر میری ہمت بڑھاتی رہی تھی شموز سے بولی "تم نے اپنی بیوی کو سچ بولنے پر مارا ہے۔ تم..."

"اس نے ہماری باتوں میں دخل دیا تھا" وہ سمیرا کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"اور تم ہمیشہ میرے والد کی باتوں اور معاملات میں دخل دیتے رہتے ہو" سمیرا نے اُسے ترکی بہ ترکی جواب دیا "مجھے تم سے نفرت ہے۔ اور ہر گزرتے پل کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دیوتاؤں کا شکر ادا کرو کہ میں ملکہ نہیں ہوں"۔ پھر وہ حمیر سے مخاطب ہوئی "آپ آشوری قوم کے سردار اور بادشاہ ہیں آبا جان۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ وہی کریں جو شہزادہ سرفروش کہتا ہے۔ کیونکہ آپ کو فوج کے لیے جوانوں کی ضرورت ہے اور مجھے اس کی"۔ اتنا کہہ کر وہ اُٹھی اور حمیر کے کان میں کچھ کہنے لگی۔ حمیر کے چہرے پر مسرت کے تاثرات آگئے۔

"کیا واقعی میں آدھے دیوتا کا نانا بننے والا ہوں؟" وہ بولا۔

سہارا دے کر سر جھکا لیا۔ جمیر نے پیالے سے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا
اور شمروز سے کہنے لگا "شمروز! ایک محافظ دستے کے ساتھ شہزادے کو آشوری
بادشاہوں اور ملکاؤں کے مقابر پر لے جاؤ اور ہاں۔ اگر شہزادہ سرفروش
بحفاظت نہ لوٹا تو تمھارا سر بھی [illegible] کے ساتھ لٹکا کر
عبرت بنا دیا جائے گا۔"

★ ★

وہ دستہ جس کی حفاظت میں، میں شاہی مقابر کی طرف جا رہا تھا
آشوری شاہی دستہ تھا جس کے بیشتر آشوری مرد جنگ میں کام آ چکے تھے اس
دستے میں بیس جوان شامل تھے۔ [illegible] میدان جاری
تھا۔ کبھی کبھی [illegible] ہمارے سروں پر سے گزر جاتے تھے۔
ہم جنوب مشرق کی طرف جا رہے تھے جدھر [illegible] واقع تھی۔
میں مختلف وادیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے راستے کی نشانیاں بھی
ذہن نشین کرتا جا رہا تھا۔ آخری وادی کا اختتام ایک وسیع میدان پر ہوا۔
[illegible] اس میدان جیسا نہیں تھا جس میں آشوری بادشاہوں
کے مقبرے بنے ہوئے تھے۔ اس کے برعکس اس میدان کے بیچ میں ایک
پیالہ نما گڑھا تھا۔ غروب آفتاب کے وقت جب اس کی تہہ میں [illegible]
[illegible] عجیب سی روشنی سے منور ہو گیا۔ شمروز اور
محافظ دستے کے لیے شاید اس کی اہمیت نہیں تھی مگر میری حیرت
زدہ نگاہوں کے لیے [illegible] کا حامل تھا اس لیے کہ روشنی سرخی کی
جھلک لیے ہوئے تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سورج اس
کے نصیب میں غروب نہیں ہو رہا بلکہ طلوع ہو رہا ہے۔
جب ہم پیالہ نما گڑھے کے قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ کسی زمانے میں آتش
فشاں رہا ہوگا جو اب سرد ہو چکا ہے۔ شمروز نے ایک [illegible]
ڈال دیا اور [illegible] لہجے میں مجھ سے بولا "[illegible]
[illegible] مقابر کی طرف جا سکتے ہیں۔ [illegible]
[illegible] پسند نہیں کرتے [illegible] میں چاہتا ہوں کہ [illegible]
سے جتنی جلدی [illegible] ہو جائے۔ کیا تم [illegible] کے لیے تیار ہو؟"
مجھے اس شخص سے نفرت ہو گئی تھی [illegible]
[illegible] اسے ختم کر دوں مگر
پھر میں [illegible] اور بولا "میں تیار ہوں۔"
شمروز نے محافظوں میں سے دس آدمی منتخب کیے۔ [illegible]
ہم [illegible] میں داخل ہو گئے۔ ایک [illegible] ہمارے آگے چل رہا تھا
کچھ دور جا کر [illegible] ایک [illegible] ہال [illegible]
میں [illegible] یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم [illegible] میں آ گئے ہیں
[illegible] کی چٹانیں تھیں اور [illegible] سے ان گنت [illegible]

آشوری مجسمے [illegible] میری نگاہیں [illegible] ہونے کے باوجود [illegible]
[illegible] لیکن شمروز مجھے دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ بولا۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا یہ چٹانیں دیکھ کر تمھارے چہرے
پر حیرت کیوں ٹپکنے لگی ہے۔ تم تو ان پتھروں کو یوں دیکھ رہے ہو جیسے
کوئی جنگجو اچھا ہتھیار یا تاجر کسی چیز کو دیکھتا ہے۔"
میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کہا۔
"کہاں ہیں؟ میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"
شمروز نے یہ سن کر اپنی تلوار نیام سے نکال لی اپنے ساتھی
سے سرگوشی میں کچھ کہا اور پھر مجھ سے بولا "عام آدمیوں کو آشوری شہنشاہ
کے مجسمے دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ تم میرے آگے آگے چلو گے [illegible]
[illegible] میں اسے فرار کی کوشش پر محمول کروں گا۔"
میں نے ایک مشعل اٹھائی اور آگے آگے چلنے لگا۔ راستہ
طویل نہیں تھا۔ یہ ایک کگر پر ختم ہو گیا جس کے بعد ایک گہرا گڑھا تھا
کے دوسری جانب کگر پر آشوری بادشاہوں اور ملکاؤں کے مجسمے [illegible]
تھے۔ میں نے مشعل کی روشنی گڑھے پر ڈالتے ہوئے جھانکا تو دم بخود [illegible]
مشعل کی روشنی اس کی گہرائی تک پہنچنے میں ناکام رہی تھی۔ اتنے میں
سے شمروز کی آواز آئی۔
"سنبھل کے مجھے تو تمھیں قتل کرنے کی خوشی نصیب نہیں۔
مگر میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ تم اتھاہ گہرائی میں گر کر میرے لیے مصیبت
کھڑی کر دو اور میں جمیر کو یقین نہ دلا سکوں کہ تم خود ہی اس کنویں میں گر
گئے تھے۔" پھر اس نے [illegible] کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اسے گہرائی [illegible]
پھینکتے ہوئے بولا "سنو، [illegible] اس کی گہرائی کے بارے میں تمھارا کیا خیال [illegible]
مگر مجھے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ شمروز ہنسا اور بولا "پاتال۔
آواز نہیں آئی [illegible]"
میں کگر سے پیچھے ہٹ گیا اور اچانک میری نگاہ اس [illegible]
سامنے والی کگر پر اپنی بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔ میں نے اپنی [illegible]
میں بے شمار حسین عورتیں دیکھی تھیں لیکن ایسا مکمل حسن اب تک
نگاہوں سے نہیں گزرا تھا۔ اس پیکر شباب نے مجھے [illegible]
دیوانہ کر دیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کا حصول ہی اب میرا مقصد
ہے۔ اتنے میں مجھے اپنی پشت پر کسی چیز کی چبھن محسوس ہوئی۔ میں نے
مڑ کر دیکھا تو شمروز اپنی تلوار کی نوک سے دوبارہ ٹھوکا دیتے ہوئے بولا
"یہ قدیم جمال زرتاج ہے۔ ہزار ہا سال پہلے کی آشوری [illegible]
ساحرہ نے شاہی مجسموں کی روایت ڈالی تھی۔ [illegible] کیا خاتون تم
[illegible] ہے۔ وہ اب بھی زندہ ہے شمروز۔" [illegible]
آپ میری زبان پہ آ گئے

"میں تمھاری اس بات سے اختلاف نہیں کرسکتا کہ یہ آج بھی
[illegible]والوں کو مسحور کر لیتی ہے لیکن تم صرف اسے دیکھنے نہیں آئے تھے۔
[illegible]رے مجسموں پر بھی نگاہ ڈالو اور چلو کہ ہم رات بھر یہاں نہیں رُک سکتے۔"
لیکن میں اتنی جلدی واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ مجھے ایک منصوبے
[illegible]ل کرنا تھا اور اُسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے شمروز کو باتوں میں
[illegible]ائے رکھنا تھا۔ اسی لیے میں نے کہا "میں کسی ایک مجسمے کو غور سے دیکھنا
[illegible]ہتا ہوں بلکہ بچوں کو جنگجو جوان بنانے کے لیے مجھے ان میں سے ایک
[illegible]درکار ہوگا تاکہ اس کے مطابق دوسرے مجسمے تیار کروا سکوں۔ ورنہ
[illegible]ری ساحرانہ قوت بے نتیجہ ثابت ہوگی۔"
شمروز نے میری بات پر قہقہہ لگایا اور بولا "تمھاری یہ خواہش
[illegible]ری نہیں کی جاسکتی جھوٹے دیوتا۔ جب مجسمے وہاں رکھ دیے جاتے ہیں
پھر انھیں کوئی نہیں چھو سکتا۔ دوسرے ان مجسموں تک صرف اسی
[illegible]ورت میں پہنچا جاسکتا ہے جب کوئی اس گڑھے پر سے پھلانگ کر دوسری
[illegible]رف جاسکے۔ اگر تم اتھاہ گہرائی والے اس گڑھے کو پھلانگ سکتے ہو تو جمیر کو
[illegible]کر ادھر آ جانا۔"
میں نے ایک بار پھر درمیانی گڑھے پر نگاہ دوڑائی۔ صرف ایک مقام
[illegible]ہاں اس کی چوڑائی کم تھی مگر وہ بھی پندرہ فٹ سے کم نہیں تھی۔ میں آہستہ
آہستہ شمروز کی طرف کھسکنے لگا۔
"شاید تم یہ سوچ رہے ہو کہ یہ مجسمے اُدھر کیسے پہنچائے گئے ہوں گے۔
[illegible]یں بتاتا ہوں۔ جب کوئی آشوری بادشاہ یا ملکہ مرتی ہے تو اس کا مجسمہ
بنا کر یہاں لایا جاتا ہے پھر آشوریوں میں سے وہ تندرست و توانا مرد اور
عورتیں جو ملکہ بننے کے متمنی ہوں، اس گڑھے کو پھلانگنے کی کوشش کرتے
ہیں، جو کامیاب ہو جائے اُسے ملکہ یا بادشاہ بنا لیا جاتا ہے۔" اس نے کہا۔
"کیا اس کوشش میں لوگ گڑھے میں گر جاتے ہیں؟" میں نے اس
کی طرف سرکتے ہوئے پوچھا۔
"لاتعداد۔" اس نے جواب دیا۔
"کیا جمیر کو بھی بادشاہ بننے کے لیے اس گڑھے کو پھلانگنا پڑا تھا؟"
"دو بار۔" وہ بولا۔ "اس سے پہلے نو آشوری اس کوشش میں پاتال
پہنچ چکے تھے۔ جمیر دسواں تھا۔ جب وہ دوسرے کگر پر پہنچا تو رسیوں اور
جال کے ذریعے مجسمہ ادھر پہنچا دیا گیا۔ پھر رسیاں اور جال دوبارہ کھینچ لیے گئے
اس لیے کہ بادشاہ بننے کے متمنی کو اسی طرح ایک بار پھر گڑھا پھلانگنا پڑتا ہے۔"
میں نے مزید سرکتے ہوئے اُس کگر کا جائزہ لیا۔ وہاں مجسموں کے آگے
صرف پانچ فٹ جگہ تھی۔ میں نے شمروز سے کہا۔
"تم بھی تو جمیر کے ہم عمر دکھائی دیتے ہو۔ تم نے یہ گڑھا پھلانگنے کی
کوشش کیوں نہیں کی تھی؟" مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، میں اس

سے ٹکرا گیا تھا۔ میں نے اُس کی توجہ ہٹانے کے لیے فوراً کہا: "میں سمجھ گیا۔
اس گڑھے کو پھلانگنا بے حد خطرناک ہے۔ میں ہوتا تو یہ جرأت کبھی نہ کرتا۔"
یہ کہہ کر میں اپنے منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے تیار ہو گیا۔
"یہ بات نہیں تھی سرفروش، جمیر مجھ سے پہلے۔۔۔"
"رہنے دو شمروز۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم نے اس لیے
یہ کوشش نہیں کی ہوگی کہ اس بزدلی کے باعث بہادروں سے زیادہ عرصے تک
زندہ رہ سکو۔"
یہ سنتے ہی شمروز آگ بگولا ہو گیا وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور تلوار بلند کرتے
ہوئے بولا "کوئی دیوتا اور آدمی مجھے ایسا کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ میں تجھے
زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ میری طرف لپکا۔ میں نے فوراً۔۔
جھکائی دے کر اُسے ٹانگوں سے پکڑا اور اپنے سر پر سے اُچھال کر گڑھے
میں پھینک دیا۔ اس کی چیخ تو بلند ہوئی مگر صدائے بازگشت پیدا نہ ہو سکی۔
میں نے سب سے پہلے اپنی پیٹھ پر ہاتھ پھیرے کہ کہیں اُس کی تلوار
سے مجھے کوئی چرکا تو نہیں لگا ورنہ میرا جھوٹ پکڑا جائے گا۔ مگر وہاں کوئی
تازہ زخم نہیں تھا۔ البتہ پُرانے زخموں کے کچھ کھرنڈ باقی تھے۔
میں نے ایک بار پھر زرتاج کے مجسمے پر نظر ڈالی۔ مجھے یوں محسوس
ہُوا جیسے ہزار ہا سال گزرنے کے باوجود وہ زندہ ہے اور اُس نے مجھے دیکھ
کر اپنی بانہیں پھیلا دی ہیں۔ جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہے: "میں صدیوں
سے تمھاری راہ دیکھ رہی ہوں سرفروش، آخر میں کب تک انتظار کے
ساحل پر یوں بانہیں پھیلائے کھڑی رہوں گی۔ آؤ میرے محبوب میرے
پاس آ جاؤ۔"
"میں آؤں گا زرتاج۔ میں ضرور آؤں گا۔ جہاں تم نے صدیوں میرا
انتظار کیا ہے، وہاں تھوڑے سے دن اور۔" مجھے یاد نہیں کہ میں نے یہ الفاظ
کہے تھے یا یہ صرف میرے دل کی آواز تھی میں نے زرتاج پر نگاہ واپسیں ڈالی
اور شمروز کی جان سے فرہاد کے خون کا قصاص ادا کر کے پڑاؤ پر لوٹ آیا۔
جب محافظ دستے کو میں نے بتایا کہ شمروز پھسل کر گڑھے میں گر پڑا
ہے تو انھوں نے میرے اس جھوٹ کو سچ تسلیم نہ کیا۔ اگر انھیں جمیر کی ہدایت یاد
نہ ہوتی تو وہ اُسی وقت میرے پرخچے اُڑا دیتے مگر انھوں نے میرے ہاتھ پاؤں
رسیوں سے جکڑ دیے اور وادی میں واپس لے آئے۔
اب میں ایک بار پھر اُسی ٹیلے پر قید یا نظر بند کر دیا گیا اور میری آمد و
رفت پر بھی پابندی عاید کر دی گئی لیکن ایک دن پچھلے پہر وہ محافظوں کو رشوت
دے کر میرے بندی خانے پہنچ ہی گئی میں سمجھا، شاید وہ میری رہائی یا فرار
کی راہ ہموار کر کے آئی ہے اس لیے میں نے اُسے اپنے حصار میں لے لینا
چاہا مگر اُس نے مجھے سختی سے روک دیا اور ایک خنجر میری طرف بڑھاتے
ہوئے بولی۔

"میرا باپ کسی بھی معاملے کا فیصلہ فوری طور پہ نہیں کیا کرتا۔ وہ تخلیے میں سوچتا رہتا ہے اور کسی سے حتیٰ کہ مجھ سے بھی بات نہیں کرتا جب وہ کسی فیصلے پر پہنچتا ہے تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت اُس کا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اُس کا فیصلہ تمھارے حق میں نہیں ہوگا۔"

"کیا تم بھی مجھے شمروز کا قاتل سمجھتی ہو سمیرا؟"

"ہاں۔ میں سمجھتی ہُوں کہ تم نے اپنے دوست فرہاد کا انتقام لینے کے لیے اُسے مار ڈالا۔ یہ صرف میرا ہی نہیں ہر آشوری کا خیال ہے اگرچہ میری اور اس کی نئی بیوی نازیہ کی نظر میں شمروز کی موت کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن وہ میرے باپ کا وفادار دوست اور آشوری قوم کا اہم منصب دار تھا۔ اس لیے وہ تمھیں ضرور سزا دے گا۔"

"یہ سزا کس قسم کی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

وہ کچھ لمحے میری طرف دیکھتی رہی۔ اُس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ وہ لرزتے لہجے میں بولی: "وہ تمھیں ایک پہاڑ کی چوٹی پر لے جائیں گے اور چٹان سے باندھ کر لوٹ آئیں گے تاکہ گدھ تمھاری بوٹیاں نوچ کر کھا جائیں۔ یہ بڑی کربناک موت ہوگی۔ اگرچہ تم نے محبت کے نام پر مجھے بے وقوف بنایا ہے پھر بھی میں تمھارے لیے ایسی موت کا تصور نہیں کر سکتی۔ یہ خنجر میں اسی لیے لائی ہُوں۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ میں اس سے اپنی شہ رگ کاٹ لوں؟"

"اگر تمھارے اندر اتنی ہمت ہے تو۔ یہ موت جیتے جی گدھوں کے لقمے بننے سے بہتر ہوگی۔" پھر وہ واپسی کے لیے پلٹی مگر چند قدم جا کر رُک گئی۔ اب آنسو اس کی پلکوں کی منڈیروں سے اُتر آئے تھے۔ وہ بولی: "میں دوبارہ نہیں آ سکوں گی اور تمھیں کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔ بہتر ہوگا کہ میں تمھارے بچے کی ماں نہ بنوں۔ اگر بن گئی تو اُسے اپنے ہاتھوں مجھے مارنا پڑے گا۔"

"تم خود اپنی ممتا کا گلا گھونٹو گی سمیرا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ تم نے محبت کے نام پر مجھے اور میں نے اپنے باپ کو دھوکا دیا ہے۔ مجھے کوئی ایسی یادگار نہیں چاہیے جو زندگی بھر میری شرمندگی کا باعث بنے۔ الوداع سرفروش۔ یہ خنجر تمھاری مشکل آسان کر دے گا۔"

اُس خنجر نے میری مشکل آسان ضرور کی مگر اُس انداز میں نہیں جس طرح سمیرا چاہتی تھی۔ اُس کے جاتے ہی میں خنجر سے چارپائی کی رسیاں کاٹیں اور اس کی ایک پٹی نکال کر خنجر اس کے ساتھ باندھ دیا۔ یہ بھالے کی ایک بھونڈی شکل تھی پھر میں نے آگ جلائی اور جب وہ خوب بھڑک اُٹھی تو میں نے اُس پر گیلی لکڑیاں ڈال دیں تاکہ اُن کے سُلگنے سے دھواں پیدا ہو جسے میں غبارے میں بھر سکوں۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں جھونپڑے سے باہر آ گیا تاکہ ہوا کا رُخ بھی معلوم ہو جائے۔ ہوا حسبِ معمول شمال سے جنوب کی طرف چل رہی تھی اور خاصی تیز تھی۔ اتنے میں اُڑنے والا ایک

محافظ میرے سر پر سے گزر گیا۔ میں نے جنوبی پہاڑیوں کی طرف دیکھا جن کے عقب میں وہ آبنائے واقع تھی جسے عبور کر کے میں نے آشوریوں کو شکست دی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں وہاں تک پہنچ جاؤں تو نہتا نہیں رہوں گا کیونکہ آشوری عام آدمیوں کو دفن نہیں کرتے اور وہاں اب تک بہت سی ایسی لاشیں پڑی ہوں گی جن کے ہتھیار اور زرہ بکتر میرے کام آ جائیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ چمڑے کا یہ غبارہ مجھے اُن پہاڑوں تک پہنچا بھی سکے گا؟ کچھ بھی ہو فرار تو ہونا ہی تھا کہ پھر شاید اس کا موقع کبھی نہ مل پاتا۔ تیمر کسی وقت بھی تخلیے سے نکل کر میری موت کا فیصلہ صادر کر سکتا تھا۔

جونہی سورج غروب ہُوا اور میں نے غبارے میں دُھواں بھرنا چاہا کہ بندی خانے کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔ یہ دستک موت کی دستک تھی۔ میرا دم سینے میں اٹکنے لگا کہ وہ مجھے لینے آ گئے تھے۔ میں نے اپنا وہی بھونڈا سا بھالا اُٹھا لیا اور دروازے پر پہنچ گیا۔ مگر یہ دستک ایک ایسے محافظ کی تھی جو میرے لیے کھانا اور پانی لایا تھا۔ میں کھانے پر ٹوٹ پڑا کہ پھر نہ جانے کب ملے۔

میں چاہتا تھا کہ چاند چڑھنے سے پہلے وہاں سے نکل جاؤں تو بہتر ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آشوری کے اُڑنے والے محافظ رات کے اندھیرے میں پرواز کر سکتے ہیں یا نہیں۔ تاہم میں نے اس امکان کو رَد نہ کیا اور جلدی سے چمڑے کا غبارہ باہر گھسیٹ لایا۔

میں نے غبارے کی دُہری سلائی کی تھی مگر اس کے باوجود اس سے ہوا خارج ہونا لازمی تھی۔ میں دل ہی دل میں دُعا مانگ رہا کہ ایک بار وہ مجھے آشوریوں کے گھیرے سے باہر پہنچا دے پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں نے غبارے میں گرم ہوا یعنی دُھواں بھرنے کے لیے چمڑے کا ایک پائپ تیار کر رکھا تھا۔ اس کا ایک سرا میں نے غبارے کے منہ سے باندھا اور دوسرا سرا آتشدان کی چمنی سے جوڑ دیا۔ اس طرح دُھواں غبارے میں داخل ہونے لگا۔

میں نے غبارے سے لٹکنے کے لیے چمڑے کے تسمے بھی بنا رکھے

تھے۔ مگر یہ ناکافی تھے میں نے اس ڈر کے مارے مزید چمڑہ نہیں مانگا تھا کہ کہیں آشوری مشکوک نہ ہو جائیں اور یہ تحقیق نہ کرنے لگیں کہ آخر تنا چمڑا مجھے کس لیے درکار ہے۔ میں نے یہ تسمے غبارے کے مُنہ کے پاس باندھ دیے تاکہ انھیں پکڑ کر لٹک سکوں۔ اگر تسمے زیادہ ہوتے تو میں ان کا جھولا بنا کر آرام سے بیٹھ جاتا مگر میں نے لٹکنا بھی غنیمت جانا۔

اب غبارہ پھولنے لگا تھا مگر اس میں متعدد جگہوں سے تھوڑا تھوڑا دھواں خارج بھی ہو رہا تھا میں نہیں جانتا تھا کہ یہ غبارہ مجھے اُٹھا کر پرواز بھی کر سکے گا یا نہیں۔ تاہم میں نے آتش دان میں مزید لکڑیاں ڈال دیں تاکہ وہ جتنا زیادہ پھول سکے اُتنا ہی بہتر ہے۔

تھوڑی دیر میں غبارہ پھول کر تن گیا۔ میں نے اس پر مکّے مار کر جائزہ لیا تو وہ مجھے فٹ بال کی طرح سخت محسوس ہُوا۔ اب وہ فرش سے اُٹھ کر دُھواں بھرنے والے پائپ کے ساتھ جھولنے لگا۔ میں نے جلدی سے اپنا بھونڈا بھالا اور سمیرا کا دیا ہُوا خنجر سنبھالا۔ اتنے میں اُڑنے والا ایک محافظ میرے سر سے گزر گیا۔ اس نے غبارہ دیکھ لیا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ اُڑنے والے محافظ رات کو بھی میری نگہبانی کرتے تھے۔ اور اب جبکہ اُس نے پھولا ہُوا غبارہ دیکھ لیا تھا تو اُس کا مشکوک ہو جانا لازمی تھا اور یہ صورتِ حال سب کو چوکنا کرنے کے لیے کافی تھی۔

میں نے جائزہ لینے کے لیے ٹیلے سے نیچے جھانکا تو مجھے اندھیرے میں مشعلیں متحرک نظر آئیں وہ مشعلیں میرے بندی خانے والے ٹیلے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ گویا اُڑنے والے محافظ نے انھیں بھی خبردار کر دیا تھا یا وہ تیمر کے فیصلے پر مجھے لینے کے لیے آ رہے تھے۔ اب لمحے کی تاخیر بھی میرے لیے موت کا پیغام بن سکتی تھی۔ میں نے ارد گرد کی پہاڑیوں پر نظر ڈالی تو وہاں بھی مشعلوں کو متحرک پایا اور نیچے سے آوازیں بھی سُنائی دینے لگیں۔ وہ لوگ محافظوں کو چوکس کر رہے تھے۔

یہ دیکھ کر میں غبارے کی طرف لپکا۔ آخری تسمے سے میں نے پائپ کو ایک جگہ گرہ لگائی اور اپنے ہاتھ اُن تسموں میں ڈالنے لگا جو میں نے لٹکنے کے لیے باندھے تھے۔ اتنے میں مجھے ان آشوریوں کی آوازیں سُنائی دینے لگیں جو ٹیلے پر چڑھ رہے تھے۔ میں نے جلدی جلدی پائپ کو کاٹنا شروع کیا تاکہ غبارہ آزاد ہو کر پرواز کرنے لگے مگر بھالے کی لکڑی بھی مزاحم ہو رہی تھی اور چمڑہ بھی سخت تھا اس لیے اُسے کاٹنے میں سخت دقت پیش آ رہی تھی۔ اتنے میں بندی خانے کا دروازہ پیٹا جانے لگا۔ ہر دستک کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں اور چمڑا کاٹنے کی رفتار بھی۔

پھر ایک جھٹکے کے ساتھ انھوں نے دروازہ توڑ دیا اور میری طرف بھاگے۔ عین اُسی وقت پائپ کا چمڑا بھی کٹ گیا اور غبارہ ایک جھٹکے کے ساتھ اوپر اُٹھنے لگا۔ آشوریوں کے پہنچتے پہنچتے وہ بیس فٹ بلند ہو چکا تھا۔ ایک آشوری نے اپنا بھالا میری طرف پھینکا مگر وہ مجھ تک نہ پہنچ سکا۔ البتہ ایک تیر غبارے میں پیوست ہو گیا۔ مگر اس سے غبارے کو کوئی خاص نقصان نہ پہنچا اور وہ ہوا کے رُخ پر پرواز کرنے لگا۔

کچھ دیر کی پرواز کے بعد میرے ہاتھ دُکھنے لگے کہ وہ میرا وزن سہارے ہُوئے تھے۔ میں نے ایک ہاتھ پر زور ڈال کر دوسرے کو آرام دینا چاہا تو میرا توازن بگڑنے لگا۔ ہر گزرتے پل کے ساتھ میرے ہاتھوں کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میرا بایاں ہاتھ مفلوج ہو گیا ہے۔ میں نے چاندنی میں نیچے دیکھا تو دل دہل کر رہ گیا۔ غبارہ پہاڑیوں سے کافی بلندی پر پرواز کر رہا تھا اگر میں اُسے چھوڑ تا یا وہ میری گرفت سے چھوٹ جاتا تو وہ نیچے گر کر میری ہڈیاں بھی سُرمہ بن جائیں۔ میں نیچے کی بجائے سامنے دیکھنے لگا۔

سامنے بھی موت مُنہ پھاڑے کھڑی تھی۔

غبارہ تیزی سے ایک ایسے پہاڑ کی طرف بڑھ رہا تھا جس کی بلند چوٹی برف سے ڈھکی ہُوئی تھی اور غبارہ اس مخروطی چوٹی سے ڈیڑھ دو سو فٹ نیچے تھا۔ اگر وہ اسی رفتار کے ساتھ پہاڑ سے ٹکراتا تو بھی میری ہڈی پسلی ایک ہو جانا یقینی تھی۔

ابھی میں لمحہ لمحہ قریب آنے والی موت کا استقبال کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور مصیبت نازل ہو گئی۔ مجھے اس پہاڑ سے اُڑنے والا ایک محافظ اپنی طرف پرواز کرتا دکھائی دیا۔ وہ سیدھا غبارے کی جانب آ رہا تھا۔ شاید مشعلوں کے اشاروں سے اُسے بتا دیا گیا تھا کہ وہ اُس شے سے بھڑ جائے جو مجھے اُٹھائے اُڑتی چلی جا رہی ہے۔ میرے لیے مشکل یہ تھی کہ میں غبارے کو کنٹرول بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اور کچھ نہ سُوجھا تو میں سرکس کے بازی گروں کی طرح جھولنے لگا۔ میری اس حرکت سے غبارہ بھی قدرے اِدھر اُدھر ڈولنے لگا لیکن اس میں خطرہ یہ تھا کہ کہیں تسمے نہ ٹوٹ جائیں۔ مجھے جھُولتا دیکھ کر اُڑنے والا محافظ بھی خوفزدہ ہو گیا اور اُس نے بھی اپنے پروں کو حرکت دی۔ اس حرکت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کمبخت غبارے سے ٹکرانے کی بجائے مجھ سے ٹکرا گیا اور اس کے چمڑے والے پر پھٹ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ میری ٹانگیں پکڑنے میں کامیاب ہوتا، میں نے بھالا اس کے سینے میں اُتار دیا۔ اُس کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی اور میں نے پیروں کو حرکت دے کر اُسے چمڑے کے پَر سے نکال لیا۔ اس کارروائی کے دوران غبارہ پہاڑ سے تقریباً دس فٹ کے فاصلے سے گزر گیا۔

اُس وقت میں صرف ایک قمیص پہنے ہُوئے تھا۔ مجھے سخت سردی لگ رہی تھی اور میرے ہاتھ یخ ہو کر اکڑ گئے تھے۔ اب ان میں شدید ٹیسیں بھی اُٹھنے لگیں۔ میں نے بائیں ہاتھ والے تسمے میں اپنا دایاں

پیر اڑلنے کی کوشش کی تو غبارے کا چمڑا ایک جگہ سے پھٹ گیا اور اس میں بھرا ہوا دھواں تیزی سے خارج ہونے لگا۔ دھوئیں کے اخراج کے ساتھ ہی وہ نیچے آنے لگا۔ اتنے میں چاند بادلوں میں چھپ گیا۔

اب غبارہ نیچے آ رہا تھا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ سامنے کوئی پہاڑی ہے یا غبارہ زمین پر گرے گا۔ نیچے مجھے کہیں کوئی مشعل بھی دکھائی نہ دی۔ غبارے کے نیچے آنے کی رفتار بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ اگر وہ زمین پر گرا تو بھی میری موت یقینی تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ خداوندا، اگر مجھے مارنا ہی تھا تو وہیں مار دیتا۔ یہاں تک لانے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنے میں چاند بادلوں سے نکل آیا اور غبارہ گرنے سے پہلے میں نے دیکھ لیا کہ نیچے پانی ہے۔ دوسرے لمحے میں چھپاک سے پانی میں گر گیا۔ مگر تیزی سے گرنے کے باعث مجھے پانی سے بھی چوٹ محسوس ہوئی تاہم یہ ناقابلِ برداشت نہیں تھی۔ میں نے جلدی سے اپنے ہاتھ تسموں سے نکالے اور غبارے کو دبا کر اس کی باقیماندہ ہوا خارج کر کے اُسے ڈبو دیا۔ پھر میں نے چاروں طرف جائزہ لیا تو پانچ سو گز کے فاصلے پر مجھے ساحل کی ریت چمکتی دکھائی دے گئی۔ میں تیرتا ہوا کنارے پر آیا اور بے دم سا ہو کر ریت پر لیٹ گیا۔

جب میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے اندازہ لگایا کہ غبارہ تقریباً آدھ گھنٹہ پرواز کرتا رہا تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ابھی پوری رات باقی تھی۔ میں بندی گھر سے تو نکل آیا تھا مگر ابھی خطرے سے نہیں نکلا تھا۔ میرے پاس نہ خوراک تھی، نہ پینے کا پانی اور نہ کوئی ہتھیار۔ میری قمیص بھیگ چکی تھی، میں ننگے پاؤں تھا اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ تقدیر لے مجھے کہاں لا پھینکا ہے۔ وہاں ہر طرف خاموشی تھی جسے صرف ساحل سے ٹکرانے والی لہریں توڑ رہی تھیں۔

میں نے سوچا کہ یہ وہی آبنائے ہوگی۔ مگر میں اس وقت کون سے ساحل پر تھا؟ یہ آشوری بھی ہو سکتا تھا اور ازمیری بھی۔ میں نے قرب و جوار کے ماحول سے اندازہ لگانے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ ساحل سے کچھ دُور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور ٹیلے ہیں۔ مگر ایسی پہاڑیاں تو دونوں ساحلوں پر تھیں۔ میں نے مزید مغز ماری بہتر نہ سمجھی اور قمیص اُتار کر خوب نچوڑنے کے بعد دوبارہ پہن لی۔ میرے لیے پہلا مسئلہ کسی محفوظ مقام کی تلاش تھا کہ رات گزار سکوں۔ اتنے میں میری نگاہ کچھ دُور ایک آدمی پر جا پڑی جو کنارے کے قریب اوندھے منہ لیٹا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر جب میں قریب پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ کسی سپاہی کی لاش ہے جو گل سڑ چکی تھی یا مچھلیوں کی خوراک بننے کے بعد لہروں نے اُسے کنارے پر لا پھینکا تھا۔ اُس کے بکتر اور تلوار سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ ازمیری ہے اور آشوریوں کے ہاتھوں مرا تھا۔ وہ تیر ابھی تک اُس کی

پسلیوں میں اٹکا ہوا تھا جو اُس کی موت کا باعث بنا تھا۔ میں نے اس کی نیام سے تلوار نکال کر دیکھی۔ اس غریب کو اسے استعمال کرنے کی موقع ہی نہیں ملا تھا کیونکہ وہ بے داغ تھی اور اُس کی دھار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کا زرہ بکتر بھی قابلِ استعمال تھا۔ ہر چند کہ وہ میرے جسم کے ناپ سے کچھ چھوٹا تھا مگر میں نے اُسے اپنے تن پر سجا لیا اور پھر دو ٹیلوں کے درمیان ایک غار نما کھنڈ میں سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو سورج نکلنے والا تھا۔ میں رینگتا ہوا ایک ٹیلے پر چڑھ گیا اور ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ اتنے میں مجھے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ میں چھپکلی کی طرح زمین سے چپک گیا۔ چند لمحوں بعد مجھے دس بارہ گھڑ سوار آتے دکھائی دیے۔ جب کچھ اور قریب آئے تو میں پہچان گیا کہ وہ ازمیری ہیں۔ میں نے فرطِ مسرت سے ایک نعرہ لگایا اور ٹیلے پر جا کھڑا ہوا۔ میں آشوری نہیں بلکہ ازمیری ساحل پر پہنچ چکا تھا۔ میرے نعرے کی آواز پر گھڑ سوار میری طرف متوجہ ہو گئے۔ انھوں نے اپنی تلواریں نیاموں سے نکال لیں اور اپنے گھوڑے میری طرف دوڑا دیے۔ انھوں نے مجھے آشوری سمجھا تھا اس لیے وہ مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے تھے مگر میں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے انگلیاں پھیلا دیں اور ہتھیلیاں دکھائیں تو انھوں نے گھوڑوں کی باگیں کھینچ لیں کیونکہ میں نے انھیں ازمیری طریقے سے سلام کیا تھا۔

جب ان سواروں کا سرغنہ قریب آیا تو وہ مجھے پہچان گیا اور سیلوٹ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”یہ آپ ہیں شہزادہ سرفروش؟ ہم تو سمجھے تھے کہ آشوریوں نے آپ کو قید یا قتل کر دیا ہوگا۔“

”قتل تو نہیں مگر قید ضرور کیا تھا اور اگر انھوں نے مجھے قتل کر دیا ہے تو پھر میں سرفروش کا بھوت ہوں۔ ایسا بھوت جو بہت بھوکا ہے۔ سب سے پہلے مجھے کھانا کھلاؤ اور یہ بتاؤ کہ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو اور کہاں خیمہ زن ہو؟“

”ہم گشت پر ہیں جناب۔ ہمارے خیمے یہاں سے دو گھنٹے کی مسافت پر ہیں۔ کمان دار اوغیر آپ کی بخیریت واپسی پر بہت مسرور ہوگا۔“

جب ہم پڑاؤ پر پہنچے اور میں نے اُس کا معائنہ کیا تو اُسے بہت بری حالت میں پایا۔ سپاہیوں کی وردیاں پھٹ چکی تھیں اور ہتھیار خراب ہو چکے تھے۔ سپاہیوں کی حالت بھی بہت خستہ تھی کچھ تو گھوڑوں کی زین پر بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میں نے صوبے دار سے کہا۔

”ان لوگوں کو آرام کی ضرورت ہے اور تم لوگ اتنی قلیل تعداد میں کیوں ہو؟“

”ساحل کے گشت کے لیے کمان داران سے زیادہ سپاہی نہیں دے سکتا جناب۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھا تو وہ خاموش ہی رہا۔ میں جھنجلا گیا۔ ”کچھ بولو نا منہ سے، مجھے بھی تو کچھ معلوم ہو۔ آشوریوں کی قید میں جانے کے بعد مجھے ازمیر کے حالات کا کوئی علم نہیں ہے۔“

”ازمیر کے حالات بدتر ہو گئے ہیں جناب، خانہ جنگی کی نوبت آ چکی ہے مگر ابھی اس کا آغاز نہیں ہوا۔“ وہ بولا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ سب اس کاہن ارژنگ کی وجہ سے ہے؟“

”جی ہاں۔ اس کالے کوّے اور ملکہ فرازیہ کی وجہ سے۔ کوا اب محل میں رہتا ہے اور فوج میں پھوٹ ڈلوانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ اُس کے اور کمان دار اوغیر کے مابین تلخ کلامی بلکہ رزم آرائی کی نوبت آ چکی ہے۔ ارژنگ نے فوج میں اپنے کوّے پھیلا دیے ہیں جو عسکریوں کی مدد کے بہانے انھیں نفاق کا زہر پلا رہے ہیں اور ارژنگ کی وفاداری کا سبق پڑھا رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ فوج پر چھا گئے ہیں اور کوئی ان کے خلاف بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔“

یہ سُن کر میری بھوک اُڑ گئی۔ میں نے کہا۔ ”اور اوغیر کیا کر رہا ہے؟“

”وہ... وہ آج کل اپنی وفادار فوج کے ساتھ اہراموں والے میدان میں آ گئے ہیں اور وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ روزانہ ارژنگ کے ساتھ مذاکرات کرتے ہیں ان کی ملاقات میدان اور محل کے درمیان ایک مقام پر ہوتی ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے۔ آپ بہت بڑے وقت پر لوٹے ہیں شہزادے۔“

”نہیں جوان۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں بالکل ٹھیک وقت پر لوٹا ہوں۔ ازمیر میں خانہ جنگی نہیں ہونی چاہیے اور میں خانہ جنگی نہیں ہونے دوں گا۔“

”مگر کیسے جناب؟“

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ میرے پاس اس سوال کا جواب تھا بھی نہیں مگر میں جانتا تھا کہ ایسے مواقع پر قدرت خود ہی میری راہنمائی کرتی ہے اور مجھے یقین تھا کہ وہ اب بھی میری رہنمائی کرے گی۔

●

اوغیر ازمیریوں کے میدانِ مقابر میں خیمہ زن تھا اور میں اُسی کے سامنے اُس کے خیمے میں بیٹھا اپنی داستان سُنا رہا تھا۔ یہاں آتے ہی میں نے حجامت کروائی تھی، نہایا تھا اور نیا لباس پہن کر کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔

اوغیر اب فوج کا سربراہ بن چکا تھا اور اس نے شان دار وردی زیب تن کر رکھی تھی۔ میں نے اپنی داستان بیان کرتے ہوئے کچھ باتیں اُس سے بھی چھپالی تھیں۔ آخر میں اوغیر بولا۔

”آپ کے آشوریوں کی قید سے نجات پانے اور واپس آنے

سے مجھے دلی مسرت ہوئی ہے۔ اب آپ زمامِ اقتدار سنبھالیں گے تو مجھے کچھ سکون ملے گا۔"

"نہیں اوغیر۔" میں نے جواب دیا۔ "فوج کی سربراہی تم نے سنبھال لی ہے ازمیر کی زمامِ اقتدار بھی تمھیں ہی سنبھالنا پڑے گی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں شہزادے؟ سہراب نے آپ کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔" وہ بولا۔

"میں ولی عہد کی تمام تر ذمے داری سے دستبردار ہو چکا ہوں اوغیر۔ اور پھر حالات پر قابو پانے کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ازمیر تمھارے زیرِ سایہ پھلے پھولے گا۔ اب اس سلسلے میں مزید بحث نہ کرو اور مجھے ارژنگ کے متعلق ساری باتیں تفصیل سے بتاؤ۔"

اس سے پہلے کہ اوغیر کچھ بتاتا، ایک کوّا خیمے میں داخل ہوا اور تعظیم و اخلاق بالائے طاق رکھتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"کاہنِ اعظم ارژنگ آج رات تمھارا انتظار کریں گے۔ ملکہ فرازیہ بھی اُن کے ساتھ ہوگی۔"

اوغیر نے اُسے جواب دینے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور مجھے گھورنے لگا۔ میں نے بھی اُس کاہن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُس نے اپنا چہرہ سیاہ نقاب سے چھپا رکھا تھا۔ صرف آنکھیں دکھائی دیتی تھیں جو انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اس نے اوغیر سے کہا۔ "تم کاہنِ اعظم سے ملنے کے لیے تنہا مقبرے میں آؤ گے۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

اوغیر اس کے تحکمانہ لہجے اور اندازِ تخاطب سے کھول اُٹھا تھا۔ وہ کافی دیر تک ارژنگ اور اس کے کوّوں کو گالیاں بکتا رہا۔ میں نے مسکراتے ہوئے سمجھایا۔

"خواہ مخواہ اپنا خون مت جلاؤ اوغیر۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ وہ کس حد تک آگے جا چکے ہیں۔"

"پہلے میں اُس کی عیاری اور مکاری کا جواب عیاری اور مکر سے دینا چاہتا تھا مگر اب مجھے اُس سے کھلم کھلا جنگ کرنی پڑے گی۔" اوغیر بولا۔ "ورنہ وہ میرے باقی ماندہ سپاہیوں اور افسروں کو بھی اپنے حلقۂ اثر میں لے لے گا۔"

آشوریوں سے برسرِ پیکار ہونے سے پہلے میں دیکھ چکا تھا کہ کاہنِ اعظم ارژنگ کے چیلے ملک کے کونے کونے سے راج دھانی میں جمع ہو رہے تھے مگر میں ان پر کوئی توجہ نہیں دے سکا تھا۔ اب وہ اوغیر کے لیے دردِ سر بن گئے تھے۔ میں نے اوغیر سے کہا۔

"کوّوں سے نمٹنا تمھارا مسئلہ ہے اوغیر۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ ارژنگ نے مجھے ملاقات کے لیے کیوں نہیں بلایا۔ حالانکہ اُسے میری واپسی کا علم میرے یہاں پہنچنے کے چند لمحے بعد ہو گیا ہوگا۔"

"وہ ہم سے علٰحدہ علٰحدہ ملاقات کر کے ہمیں ایک دوسرے سے لڑوانا چاہے گا شہزادے۔ اسی لیے اس نے صرف مجھے بلایا ہے۔"

"اس کی یہ چال کامیاب نہیں ہوگی اوغیر۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ محل چھوڑ کر سہراب کے مقبرے میں تم سے ملنا چاہتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ یہ مقبرہ تمھارے فوجیوں کے گھیرے میں ہے۔"

"یہ بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں شہزادے۔ ہمارے درمیان ایک معاہدہ ہو چکا ہے جس کے تحت وہ ہفتے میں دو بار سہراب کے مقبرے میں آتا ہے۔ کیوں؟ یہ میں نہیں جانتا۔ مگر میرا اندازہ ہے کہ یہاں کوئی ایسی چیز ضرور ہے جس کے لیے وہ یہاں آئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے اس سلسلے میں نہ کوئی تحقیق کی ہے اور نہ کروں گا کیونکہ مقبرے کے متعلق میں نے ایسی خوفناک کہانیاں سُن رکھی ہیں جن سے میرا خون میری رگوں میں منجمد ہونے لگتا ہے۔"

مجھے اوغیر کی اس بات پر ارژنگ سے اپنی پہلی ملاقات یاد آگئی۔ وہ میز کی دوسری جانب بیٹھا کسی مُردے کا ڈھانچہ لگ رہا تھا۔ دوسرے کوّوں کی طرح اس کی آنکھیں بھی دہکتے انگاروں کی طرح سرخ نظر آ رہی تھیں۔ پھر مجھے فرازیہ اور وہ حجرہ یاد آگیا جہاں ایک عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی تھی اور فرش پر مچھلیوں کے سے کچھ چھپڑے بھی پڑے تھے۔ ان یادوں سے مجھے بھی جھرجھری آگئی۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے اوغیر سے کہا۔

"اگر میں ارژنگ کا کام تمام کر دوں تو تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں شہزادے۔ یہ کارِ ثواب تو میں خود انجام دینے کا متمنی ہوں۔ مگر تم اُسے کس طرح قتل کر سکتے ہو؟ وہ ہر وقت محافظوں کے گھیرے میں رہتا ہے۔"

اتنے میں میری نگاہ خیمے کی ایک قنات پر جا پڑی جو اندر کی جانب کچھ اُبھری ہوئی تھی اور یہ اُبھار بتاتا تھا کہ باہر کوئی آدمی ہماری گفتگو سُن رہا ہے۔ میں نے اوغیر کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر خنجر نکال کر آہستہ آہستہ قنات کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور پسینے کی بوندیں مجھے اپنی پیشانی پر رینگتی محسوس ہو رہی تھیں۔

میں نے خنجر پر ہاتھ کی گرفت سخت کر لی اور بلند آواز میں اوغیر کو مخاطب کیا۔

"ہم دونوں ارژنگ کو ختم کرنا چاہتے ہیں اوغیر لیکن ہمارا یہ اقدام دانشمندی کے خلاف ہوگا۔ ہمیں اس کے ساتھ بات چیت کے ذریعے معاملات طے کرنا ہوں گے اور اس وقت تک امن و سکون سے

...ا جب تک کہ وہ خود جنگ نہیں چھیڑتا۔" یہ کہنے کے ساتھ ہی میں ...ت میں اُبھری ہوئی جگہ خنجر گھونپ دیا۔ باہر سے ایک ہلکی سی چیخ ...ی اور پھر کسی کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ہم دونوں بھی بھاگ کر ... باہر آئے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ قنات پر خون کا ایک ...ایاں نظر آ رہا تھا۔

"اب کوّے بھی زرہ بکتر پہنتے ہیں شہزادے۔ اس لیے اُسے ...خم نہیں لگا اور وہ بھاگ گیا۔" پھر اوغیر خیمے کے دروازے پر کھڑے ...ے پاس آیا اور پوچھا۔ "تم نے یہاں سے کسی کوّے کو بھاگتے ...ہے؟"

"نہیں جناب۔" وہ بولا۔ "میں ابھی ابھی یہاں آیا ہوں۔"

اوغیر نے اُس کا اور اس کے دستے کا نام پوچھا اور میرے ساتھ ...آگیا۔

"مجھے تمھارے اس محافظ کے بیان پر شک ہے۔" میں نے اوغیر سے کہا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔ کوّوں نے میرے بہت سے آدمیوں کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا ہے۔ میں اس سپاہی کے خلاف سخت اقدام کر کے دوسروں میں بددلی نہیں پھیلانا چاہتا اس لیے اسے کسی سخت اور گندے کام پر لگا دوں گا۔"

"اب اصل موضوع پر آ جاؤ اوغیر۔ میں بہر طور ارژنگ کو قتل کرنا چاہتا ہوں اور اُسے آج ہی موت کے گھاٹ اُتار کر رہوں گا۔"

"مگر اس کا جاسوس ہماری باتیں سُن چکا ہے۔ وہ اُسے خبردار کر دے گا اور آپ ارژنگ کے جال میں پھنس جائیں گے۔"

"ایک امکان یہ بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اگر میں تنہا وہاں جاؤں تو وہ مجھے قتل نہیں کرے گا۔ بلکہ اپنی قید میں رکھنا پسند کرے گا کیونکہ وہ مجھ سے علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ چاہے گا کہ میں خود ہی اس تک پہنچ جاؤں۔"

پھر ہم کافی دیر تک ایک منصوبے کی تفصیلات پر غور اور بحث کرتے رہے۔ آخر میں اوغیر بولا۔ "اس میں آپ کی جان کا خطرہ ہے شہزادے مگر میں آپ کو روک بھی نہیں سکتا۔ اگر آپ ارژنگ کو ختم کر دیں تو ازمیر کو ایک بہت بڑی مصیبت سے نجات مل جائے گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ملکۂ فرازیہ کا قتل بھی ضروری ہے ورنہ اہالیانِ ازمیر اسی طرح عذاب میں مبتلا رہیں گے۔"

"کیا میں تم پر اعتماد کر لوں کہ تم وہی کرو گے جو ہمارے درمیان طے ہوگا؟"

میری اس بات پر اوغیر نے اپنی تلوار میز پر رکھی اور پھر اس پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میں اپنی شمشیر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہی کروں گا چاہے زندہ بچوں یا مارا جاؤں۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ ایک گھنٹے کے بعد میرے خیمے میں آ جانا اور اپنے ساتھ چھ ایسے محافظ بھی لیتے آنا جو کوّوں کے حلقۂ اثر میں نہ ہوں۔"

مجھے اوغیر نے جو خیمہ دیا تھا وہ سب سے الگ تھلگ تھا۔ وہاں ہم اُس کے قابلِ اعتماد محافظوں کے پہرے میں بلا تکلف خفیہ بات چیت کر سکتے تھے چنانچہ ہم نے وہاں اطمینان سے تمام معاملات پر بحث کی اور تفصیلات طے ہونے کے بعد جب اوغیر واپس جانے لگا تو میں نے کہا... "اپنے محافظ بھی اپنے ساتھ لیتے جاؤ اوغیر۔ اب میں جو کچھ کروں گا تنہا ہی کروں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ وعدے کے مطابق تم طاؤسہ کا پورا خیال رکھو گے۔"

"آپ مطمئن رہیں شہزادے۔ ایسا ہی ہوگا۔"

"اور تم اس کے بچّے کو بھی قتل نہیں ہونے دو گے۔"

"اگر ہمارا منصوبہ کامیاب ثابت ہُوا اور میں برسرِ اقتدار آگیا تو آیندہ ازمیر میں کوئی بچہ قتل نہیں ہوگا جناب۔ یہ تو بدبخت ارژنگ کی چال ہے کہ وہ ہمارے بچّوں کو قتل کروا دیتا ہے تاکہ اُس کے کالے کوؤں کی نسل پھلتی پھولتی رہے اور اس کی افرادی قوت بڑھتی رہے۔"

"اچھا او غیر۔ الوداع۔ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہے بہرحال تم اچھے سپہ سالار اور وفادار دوست ہو۔ میں ہمیشہ تمھیں یاد رکھوں گا۔"

"میں بھی آپ کو کبھی نہیں بھول سکوں گا شہزادے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ازمیری اور آشوری تو میں بھی مدتوں آپ کو یاد رکھیں گی۔"

پھر اس نے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔

چاند چڑھنے میں کافی دیر تھی اس لیے میں لیٹ گیا اور ارتکازِ توجہ سے کمپیوٹر کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا تاکہ ڈاکٹر فریدوں کو موجودہ صورتِ حال اور اپنے آیندہ پروگرام سے آگاہ کر دوں مگر کوشش کے باوجود رابطہ قائم نہ ہوسکا۔ تھک ہار کر میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور آنکھیں بند ہوتے ہی زرتاج میرے تصور میں اُتر آئی۔

جب پہلی بار میں نے اُسے آشوری شاہوں کے مقبرے کی گیلری میں دیکھا تھا تو شمرفند نے کہا تھا کہ ہزارہا سال گزرنے کے باوجود زرتاج کے حُسن کا سحر زندہ ہے اور وہ آج بھی دیکھنے والوں کو بُری طرح مسحور کر لیتی ہے۔ اس دروغ گو کی یہ بات بالکل سچ تھی۔ زرتاج کے طلسمی حسن نے اس وقت سے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور وہ میری سوچوں میں یوں گھُل مل گئی تھی جیسے بارش کے قطرے سمندر کے پانی میں گھُل مل جاتے ہیں اور پھر کبھی جُدا نہیں ہو پاتے۔

میں نے اپنی بند آنکھوں سے دیکھا کہ زرتاج کا ہیرے کی چٹان سے تراشا ہُوا جسم گوشت پوست میں ڈھل گیا ہے اور اس کی ساکت وصامت مورتی سانسیں لینے لگی ہے اس کے ہونٹوں پر تبسم کی کلیاں چٹکنے لگی ہیں اور سحرکار آنکھوں میں چاہت کی چاندنی چھا گئی ہے۔ وہ اس اتھاہ گہرائی والے تاریک اندھے کنوئیں کی کگر پر کھڑی، بانہیں پھیلا کر مجھے پکار رہی ہے۔ "میں انتظار کے ساحل پر کھڑے کھڑے تھک گئی ہُوں سرفروش۔ اب تو آجاؤ۔" اور اس کی اس پکار پر مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے وقت کی طنابیں ٹوٹ گئی ہیں اور میں وجود سے عدم کی جانب چل رہا ہُوں یا زرتاج عدم سے وجود میں آگئی ہے۔ مجھے اپنے دل کے دالان سے ایک چاپ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ چاپ گزرتے وقت کی تھی یا زرتاج کی، میں نہیں جان سکا تھا۔ میں تو صرف اتنا جانتا تھا کہ زرتاج میرا مقصدِ حیات بن چکی ہے۔

میں نے بیسیوں زندہ عورتوں سے ہوس آرائی کی تھی اُن میں سب سے زیادہ لالہ رُخ کو چاہا تھا اُس سے عشق کیا تھا مگر جب میں اُسے نہیں پاسکا تھا تو ایک روز میں نے سوچا تھا کہ اب کسی ایسی عورت سے عشق کروں گا جسے مرے ہُوئے صدیاں گزر چکی ہوں۔ وہ عورت مجھے مل گئی تھی۔ وہ زرتاج تھی اور سچ مچ اس سے عشق ہوگیا تھا۔

میں جانتا تھا کہ کسی مجسمے سے عشق کرنا دیوانہ پن ہے لیکن یہ جاننے کے باوجود میں اپنے آپ کو اُسے چاہنے اور اس سے عشق کرنے پر مجبور پاتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہے مگر ایسا تھا ان تمام عورتوں میں سے جو اب تک مجھے مل تھیں، سب سے زیادہ محبت مجھے زرتاج سے ہوگئی تھی۔

پھر میں نے سوچا کہ ڈاکٹر فریدوں سے کہوں گا آیندہ وہ مجھے تاریک ماضی کے اس سفر پر بھیج دے جس میں میری ملاقات زرتاج سے ہو جائے لیکن پھر خیال آیا کہ ابھی اس کا کمپیوٹر ماضی کی پیمائش پر قادر نہیں ہے۔ ڈاکٹر فریدوں کو تو خود اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ اس کا کمپیوٹر مجھے ماضی کے کس دور میں منتقل کرے گا۔ اس لیے ڈاکٹر فریدوں کے توسط سے زرتاج کے زمانے تک رسائی ممکن نہیں اور زرتاج سے دُوری کا تصور بھی جان لیوا ہے۔

میں جانتا تھا کہ یہ سب پاگل سوچیں ہیں مگر ان پاگل سوچوں کے گرداب سے نکلنا بھی میرے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ سوچیں اپنے آپ ہی ذہن میں در آتی تھیں اور مجھے دیوانگی کی سرحدوں کی جانب دھکیلتی چلی جاتی تھیں۔

اچانک دُور سے ہنہنانے والے گھوڑوں کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں یوں اُٹھ بیٹھا جیسے کوئی خواب سے بیدار ہوتا ہے۔

میں نے خیمے سے نکل کر آسمان کا جائزہ لیا چاند افق پر طلوع ہو رہا تھا۔ میں جلدی سے اپنی مہم پر روانگی کی تیاری کرنے لگا۔

میں نے کمر سے تلوار لٹکائی اور پیٹی میں دو خنجر اُڑس لیے۔ بائیں بازو سے ایک چھوٹی سی فولادی ڈھال باندھی اور پتلی ڈوری کا گولا لے کر باہر آگیا۔

میں جانتا تھا کہ ارژنگ مقبرے کے حجرے میں میرا انتظار کرے گا مگر اُس حجرے تک پہنچنے کے لیے مجھے ایک ایسی بھول بھلیوں سے گزرنا تھا جس میں بھٹکنے کے بعد آدمی مقبرے سے باہر نہیں نکل سکتا اس لیے میں نے یہ ڈوری منگوائی تھی تاکہ مقبرے میں داخل ہوتے ہی اس کا ایک سرا داخلی دروازے کے ساتھ باندھ دوں اور پھر جہاں جہاں سے گزروں اسے بچھاتا جاؤں تاکہ واپسی کے لیے یہ میری رہنمائی کرسکے۔

★★

چاند چڑھنے کے ایک گھنٹہ بعد میں سہراب کے مقبرے کے مشرقی

دروازے پر پہنچ گیا۔ رات بہت تاریک تھی، میدان میں جا بجا الاؤ دہک رہے تھے لیکن مقبرے کے دروازے پر نہ کوئی مشعل جل رہی تھی نہ کوئی کاہن وہاں موجود تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ارژنگ کے زخمی ہونے والے جاسوس نے اُسے میری آمد سے مطلع کر دیا ہوگا۔ اس لیے اُس نے اپنے حجرے تک پہنچنے کے لیے میرا راستہ صاف کر دیا ہے۔

میں نے مقبرے کے داخلی دروازے پر کھڑے ہو کر اندر نگاہ ڈالی۔ طویل راہداری کے دوسرے سرے پر مجھے ایک مشعل تو جلتی دکھائی دی لیکن اس میں کوئی ذی روح، کوئی آواز نہیں تھی۔ ہر طرف خاموشی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ میں اللہ کا نام لے کر آگے بڑھ گیا۔

یہ راہداری مقبرے کے وسطی ہال تک آتی تھی جو گول تھا۔ اس گول ہال سے چاروں طرف ایک ہی طرز کی درجنوں راہداریاں مختلف سمتوں کو جا رہی تھیں۔ میں باری باری ہر راہداری میں جھانکنے لگا تمام راہداریاں تاریک تھیں مگر چوتھی کے ایک سرے پر مشعل جل رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ مشعلیں میری رہنمائی کے لیے روشن کی گئی ہیں۔ ورنہ یا تو ہر راہداری تاریک ہوتی یا ہر راہداری میں مشعلیں جلتی نظر آتیں۔

میں اس راہداری سے پھر ایک گول کمرے میں پہنچا۔ جہاں سے ہر طرف راستے نکلتے تھے اُن میں سے ایک راستے پر میری رہنمائی کو مشعل موجود تھی۔ میں اس راہداری میں بڑھ گیا اچانک مجھے وہی چمڑا جلنے کی سی بدبو آئی جو پہلے اس وقت آئی تھی جب میں ارژنگ سے ملنے کے بعد باہر نکلا اور اس حجرے میں گیا تھا جہاں فرازیہ میری منتظر تھی۔ یہ عجیب بدبُو اتنی ناگوار تھی کہ مجھے متلی محسوس ہونے لگی۔ میرا جی چاہا میں واپس چلا جاؤں اور میرے لیے واپس جانا آسان تھا کیونکہ پہلی راہداری میں داخل ہوتے وقت میں نے دیوار میں ایک خنجر گاڑ کر ڈوری باندھ دی تھی اور اُسے فرش پر بچھاتا آیا تھا لیکن پھر میں نے بدبو سے بچنے کے لیے سانس روک لی اور آگے بڑھنے لگا۔

اس راہداری کے بعد مجھے کسی راستے پر مشعل دکھائی نہ دی تو میں رُک گیا۔ میرے ایک ہاتھ میں خنجر اور ڈوری تھی دوسرے میں تلوار۔ میں نے تلوار نیام میں ڈالی اور مشعل اُتار کر اس مقام کا جائزہ لینے لگا۔ اتنے میں مجھے اپنے سر کے اوپر روشنی کا جھماکا محسوس ہُوا جس سے میرے سامنے کا فرش روشن ہوگیا مگر قبل اس کے کہ میں سر اُٹھا کر اس جھماکے کا منبع دیکھتا، چھت کا پتھر سرک کر اپنی جگہ پہنچ چکا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ وہ لوگ بخوبی جانتے تھے، اس وقت میں نے پلٹ کر اور مشعل بلند کر کے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کوئی نہیں تھا۔ البتہ آندھی کی طرح تیز مگر بہت گرم ہوائیں آنے لگی تھی جیسے کسی مافوق الفطرت قوت نے صحرائی طوفان کا رُخ اس راہداری میں موڑ دیا ہو۔ اس بگولے کے ساتھ ریت یا کسی دوسری چیز کے ذرّے بھی اُڑ کر آرہے تھے اور چھرّوں کی طرح میرے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ میں نے پیٹھ موڑ کر آنکھیں بند کرلیں اور سر نہوڑا کے بیٹھ گیا۔

پھر اچانک طوفانی ہوا بند ہوگئی۔ میں اُٹھ کر آگے بڑھنے لگا۔ ابھی میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ راہداری میں ایک بچّے کی چیخیں اور بھیڑیے کی غراہٹ گونجنے لگی۔ میں نے آگے پیچھے دیکھا مگر راہداری خالی تھی چیخیں اور غراہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے لیکن میں نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور پھر آگے بڑھنے لگا۔

آگے جا کر یہ راہداری تنگ ہونے کے ساتھ ساتھ چکردار زینے کی طرح بل کھاتی چلی گئی۔ یہاں آکر ڈوری بھی ختم ہوگئی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے دوسرے لمحے میں آگے بڑھ گیا کہ ڈر کر پیچھے ہٹ جانا میری فطرت کے خلاف تھا۔

چکردار راہداری طے کرتے ہُوئے مجھ پر ایک دم غنودگی سی طاری ہونے لگی غنودگی کا یہ حملہ یا دورہ اتنا شدید تھا کہ میں فرش پر گر پڑا فرش اور دیواروں سے ایک عجیب سی خوشبو پھُوٹنے کے ساتھ ساتھ نہ جانے کہاں سے سانپ کی سی تیز پھنکار بھی سُنائی دینے لگی تھی۔ میں نے چند لمحوں کے لیے سانس روکی تو غنودگی دُور ہونے لگی۔ پھر یہ عجیب سی خوشبُو بڑے نفیس عطر کی خوشبُو میں بدل گئی۔ اس خوشبُو نے میرے اوسان بحال کر دیئے اور سانپ کی وہ پھنکار بھی چاندی کی ننھی مُنّی گھنگریوں کی جھنکار میں ڈھل گئی جیسے دُور کہیں کوئی رقاصہ جھانجر باندھے دیوانہ وار ناچ رہی ہو۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ بھُول بھلیاں طلسم کدہ کیوں بن گئی ہیں۔ وہ ساحر کون ہے جو یہ سحر پھونک رہا ہے۔ یا یہ ازمیر کے باشندوں کی بھٹکی ہُوئی روحیں ہیں جو سہراب کے اس غیر مکمل مقبرے میں گھُس آئی ہیں تاکہ اس کی ہڈیوں کی حفاظت کرسکیں پھر میں نے ان سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور اس طلسماتی ماحول کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی تلوار کی نوک اپنی ران میں چبھونے لگا۔ اس چبھن نے موجوں کی وہ دُھند اور غنودگی یکسر ختم کر دی اور میں اپنے آپ کو چاق و چوبند محسوس کرنے لگا۔

کچھ دُور آگے جا کر چکردار راہداری ختم ہوگئی۔ اب میرے سامنے سیدھا راستہ تھا لیکن وہاں گھُپ اندھیرا چھایا ہُوا تھا۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ کچھ دُور جا کر مجھے رُکنا پڑا کیونکہ راستے کے بیچوں بیچ ایک گڑھا آگیا تھا۔ میں نے مشعل کی روشنی میں گڑھے کی طرف قدم بڑھائے اور اس کی گہرائی کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ مشعل کی روشنی اس کی تہ تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ میں نے گڑھے کی چوڑائی کا اندازہ لگایا۔ وہ تقریباً نو یا دس فٹ تھی اور اُسے لمبی چھلانگ مار کر عبور کیا جاسکتا تھا۔

میں نے پیچھے ہٹ کر دو چار مرتبہ اُٹھک بیٹھک کی تاکہ پہلے جیسا جسم

لگانے کے لیے تیار ہو جاتیں پھر میں نے مشعل گڑھے کی دوسری طرف پھینک دی تاکہ مجھے اس کے دونوں کنارے نظر آتے رہیں۔ اب میں کچھ پیچھے ہٹا تاکہ دوڑ کر چھلانگ لگا دوں لیکن جونہی میں دوڑتا ہوا گڑھے کے پہلے کنارے کے قریب پہنچا، مجھے دوسرے کنارے پڑی مشعل دور ہوتی نظر آئی۔ اب میرے لیے اپنے آپ کو روکنا بھی ناممکن تھا اور وہ فرش بھی آگے کو کھسکتا جا رہا تھا جس پر مشعل پڑی تھی۔ رُکنے کی صورت میں، میں اتھاہ گہرائی میں گرتا اور دوسرے کنارے نہ پہنچ پانے کا مطلب بھی یہی تھا۔ میں نے چشم زدن میں چھلانگ لگانے کا فیصلہ کیا اور ایک نعرے کے ساتھ اپنی تمام تر قوت سمیٹ کر چھلانگ لگا دی۔ اگر میں دو لمحوں کی دیر کرتا یا مشعل والا فرش صرف چھ انچ اور آگے سرک جاتا تو میری موت یقینی تھی۔

چھلانگ لگا کر میں دوسرے کنارے پہنچ تو گیا تھا مگر خوف کی ایک سرد لہر نے مجھے جیسے مفلوج سا کر دیا تھا۔ میں کچھ دیر فرش پر پڑا لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ جب میرے اوسان بحال ہوئے تو یہ خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا کہ ارژنگ یقیناً فرہاد سے کہیں زیادہ بڑا مہندس ہے اور اب تک میں جس طلسمی ماحول سے گزرا تھا، وہ سب ارژنگ ہی کا مرہون منت ہے۔

میں اس راستے پر آگے کو چل پڑا۔ یہاں تک کہ مجھے ایک دیوار میں تین دروازے نظر آئے۔ یہ دروازے کسی چمکدار دھات کے بنے ہوئے تھے۔ میں نے پہلے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے عکس کا جائزہ لیا تو حیران رہ گیا۔ میرے سامنے ایسا سرفروش کھڑا تھا جسے دلِ جدید کی تہذیب چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ وہ ہزاروں سال پہلے کا وحشی نظر آتا تھا جس نے اپنی بقا اور مدِ مقابل کو مغلوب کرنے کے لیے ایک ہاتھ میں تلوار تھام رکھی تھی اور دوسرے بازو پر ڈھال باندھی ہوئی تھی اس کی آنکھوں سے وحشت و بربریت اور مکاری جھلک رہی تھی مجھے اپنا یہ روپ دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ میں نے ماضی کے وحشی انسانوں کی طرح بڑے زور کا قہقہہ بلند کیا اور تلوار اس پر دے ماری۔ قہقہے اور ڈھال پر تلوار کی ضرب کی آوازیں راہداری میں گونجنے لگیں۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

میں نے کمرے میں جو کچھ دیکھا وہ میری رگوں میں دوڑنے والا خون منجمد کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کمرے میں فرش نہیں تھا بلکہ یہ ایک چھوٹی سی باؤلی تھی جس کی گہرائی میں سرخ شعلے لپک رہے تھے مگر اس سے کسی قسم کا دھواں نہیں اٹھ رہا تھا۔ کمرے میں گرمی کی بجائے بے حد خنکی تھی جس سے مجھ پر کپکپی سی طاری ہو گئی پھر اس سرد آگ سے بہت سے لوگوں کے رونے، چیخنے چلانے اور بین کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں بھی غیر انسانی سی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے گزری صدیاں اپنے عہد میں ہونے والے ظلم، جبر، تشدد، نادانیوں اور ناکامیوں پر ماتم کناں ہوں۔ نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں بھی خود بخود آنسو آ گئے جیسے میں بھی ماضی کے دکھوں پر اشک بار تھا۔ میں نے جلدی سے آنسو پونچھ کر دروازہ بند کر دیا۔ خداوندا، یہ کیسا طلسم ہے، جو لوگوں کو اشک ریزی اور ماتم گساری پر مجبور کر دیتا ہے۔ میں نے ارژنگ کو اپنی سوچوں سے کہیں زیادہ پایا۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ مجھے بری طرح پچھاڑ کے رکھ دے گا۔ میں جسمانی طور پر اس سے زیادہ طاقتور سہی لیکن ذہنی طور پر وہ مجھ سے بہت آگے لگتا تھا۔

میں نے دوسرے دروازے کا پٹ کھولا تو میرے لیے مزید حیرتیں منہ پھاڑے کھڑی تھیں۔ اس کمرے کی تاریکی میں کوندے لپک رہے تھے بادل گرج رہے تھے اور سیاہ رنگ کی موسلا دھار بارش جاری تھی اور اس بارش میں وہ مردوں کے ڈھانچے قطار در قطار کسی میدانِ کارزار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے استخوانی ہاتھوں میں تلواریں اور بھالے تھے، یوں لگتا جیسے وہ کمرہ نہیں بلکہ بہت بڑا میدان ہے پھر سیاہ رنگ کی وہ بارش سرخ رنگ میں بدل گئی۔ یوں جیسے لہو برس رہا ہو۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر خون کی بوچھار محسوس کرنا چاہی مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرا ہاتھ ویسے کا ویسا خشک ہے اس کا یہ مطلب تھا کہ کوندوں کی لپک، بادلوں کی گرج اور مردہ ڈھانچوں کی فوج سب کا سب فریبِ نظر تھا۔ اس شعبدے پر میں دنگ رہ گیا۔

میں نے تیسرا دروازہ کھولا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اسی سے گزر کر ارژنگ کے حجرے یا محل تک پہنچ سکتا ہوں۔ اس کمرے کی سامنے والی دیوار میں ایک چوکور سوراخ سے ہلکی روشنی باہر آ رہی تھی میں آگے بڑھ کر اس سوراخ سے آگے جھانکنے لگا۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے وسط میں ایک پلنگ بچھا ہوا تھا اور اس پلنگ پر فرازیہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں کمرے کی ایک دیوار میں بنے ہوئے موکھے پر مرکوز تھیں اور وہ آہستہ آہستہ کسی کو پکار رہی تھی۔ "آؤ۔ میرے پاس آؤ۔ آ بھی جاؤ۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ فرازیہ کی نہیں، زرتاج کی آواز ہے جو مجھے پکار رہی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے بدبو کے ایک بھبکے نے مجھے زرتاج کے تصور کی دنیا سے باہر کھینچ لیا اور میں اس موکھے کی طرف حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

اس موکھے سے ایک عجیب الخلقت جانور نما انسان یا انسان نما جانور نکل رہا تھا اس کے جسم پر کھپل کی طرح کھپرے تھے، سر پر سینگ اوپر کا دھڑ عورت کا اور نیچے کا مردوں جیسا تھا۔ یہ بدبو اسی سے آ رہی

تھی مگر فرازیہ کو اس کا احساس تک نہیں تھا۔ وہ اسی عجیب الخلقت ہستی کو پیار سے پکارے جا رہی تھی۔

پھر میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اس نے فرازیہ اور ارژنگ کے خلاف میرے دل میں غصے اور نفرت کے شعلے بھڑکا دیے۔ میرا جی چاہا کہ میں ابھی اندر جا کر فرازیہ کے پرخچے اڑا دوں۔ پھر یہ سوچ کر رُک گیا کہ شاید اس طرح ارژنگ تک نہ پہنچ سکوں جو اصلی مجرم تھا اور جس نے فرازیہ کو اس فعلِ قبیح کی علت میں مبتلا کر کے اس پر قابو پا لیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ بھی فریبِ نظر یا شعبدہ نہ ہو۔ اس لیے میں وہیں کھڑا رہ گیا کچھ دیر بعد میں نے کمرے میں دوبارہ جھانکا تو وہ عجیب الخلقت بلا وہاں نہیں تھی۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

فرازیہ پلنگ پر بے سدھ سی پڑی تھی لیکن بے ہوش نہیں تھی میں نے تلوار سے پلنگ کی پٹی پر ٹھک ٹھک کی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی نیلی آنکھوں میں نشہ سا گھلا ہوا تھا۔ وہ بولی۔

"کیا تم نے اُسے میرے ساتھ دیکھ لیا ہے؟"

"ہاں!" میں نے جواب دیا اور سوچا کہ یہ فریبِ نظر یا شعبدہ نہیں بلکہ حقیقت تھی۔

"اوہ!" فرازیہ نے بے ساختہ اور تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ "پھر تو تم یہ بھی سمجھ گئے ہو گے کہ میں ارژنگ کے ہاتھوں کٹھ پتلی کیوں بنی ہوئی ہوں؟"

"ہاں۔ یہ بھی سمجھ چکا ہوں۔ مگر وہ کیا بلا تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ارژنگ اور اس کے چیلے ان عجیب الخلقت بلاؤں کی افزائش حاصل کرنا ہے۔ ارژنگ کا کہنا ہے کہ یہ بلائیں انسان سے کئی گنا زیادہ طاقتور مگر ذہنی طور پر بہت کمزور ہوتی ہیں۔ وہ ان کی افزائشِ نسل کر رہا ہے تاکہ ایک فوج بنا سکے جو پہلے ازمیر اور اس کے بعد دوسرے ممالک فتح کر سکے۔"

"یہ خواہش پرانی مگر طریقہ مختلف ہے فرازیہ۔ کبھی تم نے یہ بھی سوچا تم کس حد تک گر چکی ہو؟"

"ہاں سرفروش جب اس نشے کی طلب کا دورہ ختم ہوتا ہے تو میں اپنے آپ پر نفرین بھیجتی ہوں اور اس زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگتی ہوں۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خباثت کے الاؤ کی طرح پھر میری طلب بڑھنے لگتی ہے۔ اس سے پہلے کہ پھر وہ وقت آئے، میں تم سے ایک احسان کی آرزومند ہوں۔ اگر تم مجھ پر یہ احسان کرنے کا قول دو تو میں حتی الوسع تمہاری مدد کروں گی۔ تمہیں ان خطروں سے آگاہ کر دوں گی جو تمہیں پیش آئیں گے۔ ان سے نمٹنا تمہارا کام ہے۔ اگر تم ان سے بچ نکلے تو تمہارے لیے اس بھول بھلیاں سے نکلنا ناممکن ہوگا مگر میں تمہیں اس سے نکلنے کا راستہ بتا دوں گی بس شرط یہ ہے کہ تم مجھ پر ایک احسان کر دو۔"

"وہ کیا فرازیہ؟"

"مجھے مار ڈالو سرفروش۔ میرا سر کاٹ کر اپنے ساتھ لے جانا۔ وہ اس وقت تمہارے کام آئے گا جب مگرڑا سے تمہارا سامنا ہوگا۔"

"وہ کون یا کیا بلا ہے؟" میں نے پوچھا۔

فرازیہ یہ سن کر رونے لگی پھر سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "وہ دو بلاؤں کے ملاپ سے پیدا ہونے والی سب سے خوفناک ترین بلا ہے سرفروش۔ وہ ارژنگ کی حفاظت کرتی ہے۔ وہ آدم خور ہے اور ارژنگ اس کا پیٹ بھرنے کے لیے مظلوم انسانوں کو اس کے سامنے پھینکواتا ہے۔ اب جبکہ تم یہاں تک پہنچ گئے ہو تو اس سے تمہارا سامنا ضرور ہوگا۔ اگر تم نے مگرڑا کو مار دیا تو سمجھو کہ تم نے ارژنگ کو مار دیا۔ میرا خیال ہے کہ تم اس آدم خور بلا کو شاید ہی مار سکو لیکن اب تم واپس بھی نہیں جا سکتے کہ اب ارژنگ تمہیں باآسانی ختم کر دے گا۔ تم یہاں تک محض اس لیے پہنچ پائے ہو کہ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے ورنہ بہت پہلے مار دیے جاتے۔ براہِ کرم مجھے فوراً مار ڈالو ورنہ ارژنگ مجھے بھی عجیب الخلقت بلاؤں کی پیدائش کے لیے استعمال کرنے لگے گا۔ تمہیں اپنے دیوتاؤں کی قسم، مجھے مایوس نہ کرو۔ میری موت ازمیر کی عورتوں کو بلاؤں کی تخلیق سے بچا لے گی۔"

"نہیں فرازیہ۔ میں عورت پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔"

"ایسا نہ کہو سرفروش۔" یہ کہتے ہوئے وہ میرے قدموں سے لپٹ گئی اور روتے ہوئے بولنے لگی۔ "ارژنگ چاہتا ہے کہ میں حرم سرا کی عورتوں کو اس فعلِ قبیح کا عادی بنا دوں۔ میں اپنی تمام تر کمینگی کے باوجود ایسا نہیں کرنا چاہتی لیکن طلب کے دوروں میں شاید میں اتنی نیچ ہو جاؤں، دیکھو مجھے قتل کرنے کا قول دے دو تاکہ میں تمہیں ان بھول بھلیوں سے نکلنے کا راستہ بتا دوں ورنہ تم مگرڑا اور ارژنگ کو مارنے کے باوجود خود بھی بھول بھلیوں کی دیواروں سے سر ٹکرا کر مر جاؤ گے۔"

میں نے سوچا کہ اس کی موت ازمیر کی بہت سی عورتوں کو بچا سکتی ہے اور پھر اوطینے بھی یہی کہا تھا۔ وہ یہ بھی سچ کہتی تھی کہ بھول بھلیوں سے نکلنا ناممکن ہے۔ یہ سوچ کر میں نے اُسے کہا۔ "بھول بھلیوں سے نکلنے کا راستہ بتاؤ فرازیہ۔"

"تم قول دیتے ہو کہ مجھے مار ڈالو گے؟"

"ہاں۔ میں قول دیتا ہوں۔"

"تم پہلی بار جب ارژنگ سے ملنے اس کے حجرے میں گئے تھے تو تم نے آتش دان میں آگ جلتی دیکھی تھی؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ آتش دان ایک دھوکا ہے اس میں جلنے والی انگیٹھی ہٹا دینا اس کے نیچے ایک جنگلا ہے۔ وہ جنگلا اوپر اٹھاؤ گے تو تمھیں ایک سرنگ نظر آئے گی۔ یہ سرنگ تمھیں ایک ایسے راستے پر لے جائے گی جو میدان میں جانکلتا ہے۔ اب جلدی سے میرا سر قلم کر دو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا سر نگوں کر لیا۔ "شکریہ سرفروش دیر نہ کرو۔"

"الوداع فرازیہ۔" یہ آخری الفاظ تھے جو اس نے زندگی میں سنے۔

★★

اس کمرے میں موکھے کے علاوہ ایک دیوار میں دروازہ بھی تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو میرے سامنے ایک سیدھی راہداری تھی۔ میں ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں فرازیہ کا بریدہ سر لیے مشعل کی طرف بڑھتا رہا جو راہداری کے ایک سرے پر جل رہی تھی۔ مگر میں جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا راستہ اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ ایک آہنی دروازے کے سامنے ختم ہو گیا۔ مشعل اس دروازے کے پاس ہی جل رہی تھی۔ یہاں ایک بار پھر مجھے بدبو کے بھبکے آنے لگے اور یہ بدبو بہت تیز تھی۔ میں دروازے کے قریب رک گیا جو اس بدبو کا مخرج تھا۔ اتنے میں مجھے اپنے سر پر چھت کے سوراخ سے ارژنگ کی آواز آئی۔

"خوش آمدید سرفروش۔ میرا خیال تھا کہ تم یہاں تک نہیں پہنچ پاؤ گے مگر فرازیہ میرے قابو سے باہر ہو گئی۔ خیر... میں نے تم جیسا بہادر جنگجو اب تک نہیں دیکھا۔ مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے لیکن یہ بڑی افسوس ناک بات ہو گی کہ ہم تم آپس میں متحارب ہوں۔ نہیں سرفروش، ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ نہیں لڑنا چاہیے۔ اس وقت تک اس دروازے میں داخل نہ ہونا جب تک میں خود تمھارے پاس نہ پہنچ جاؤں۔"

"بس یہی کہنا تھا یا کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"صبر سے کام لو سرفروش۔ ہم دونوں صاحب فہم و فراست ہیں۔ تمھاری طاقت اور عسکری تجربہ اور میرے علم کا اشتراک ہمیں ساری دنیا کا فرمانروا بنا سکتا ہے۔ ہم دونوں برابری کی بنیاد پر حکومت کر سکتے ہیں۔ بس میرے وہاں پہنچنے تک دروازہ مت کھولنا۔"

"سنو ارژنگ۔ میں یہ دروازہ ضرور کھولوں گا، تم تک خود ہی پہنچوں گا اور تمھیں موت کے گھاٹ اتار کر ہی رہوں گا۔ چونکہ تم کاہن ہو اس لیے میرے آنے تک اپنے دیوتاؤں کی عبادت کرتے رہو۔"

میری بات کے جواب میں ارژنگ کا قہقہہ سنائی دیا۔ پھر وہ بولا۔ "مجھے اس بات کا افسوس رہے گا سرفروش کہ میں نے تمھیں لقمۂ اجل کیوں بنوایا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ خود سر لوگ احمق ہوتے ہیں۔ وہ کسی کی نہیں مانتے اور تم بھی خود سر ہو۔" اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ پھر میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی بہت تیز بدبو کے بھبکے نے میرا دماغ اڑا دیا۔ میرے سامنے ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس میں اگرچہ مشعلیں جل رہی تھیں مگر ان کی روشنی کمرے کی وسعت کے لیے بہت کم تھی۔ اس کمرے کا فرش بھی پتھر کا نہیں تھا۔ میں نے چند قدم آگے بڑھائے تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے قدم گندگی کے ڈھیر سے آلودہ ہو گئے ہیں۔ میں وہیں رک گیا۔ اچانک ایک خوفناک پھنکار کے ساتھ مجھے ایک اندھیرے گوشے سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی خطرناک درندہ ہڈیاں چبا رہا ہو۔ میں نے آنکھوں پر زور ڈال کر ادھر دیکھا تو دہشت کے مارے مجھے جھرجھری آ گئی۔ میں مگرڑا کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے ارد گرد بہت سی انسانی کھوپڑیاں اور ڈھانچے بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں زیادہ دیر تک اس مکروہ نظارے کی دید کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جو کچھ ہونا ہے، جتنی جلدی ہو جائے، بہتر ہے۔

چونکہ میں ابھی تک مگرڑا کو اچھی طرح نہیں دیکھ پایا تھا۔ اس لیے میں نے قریب پڑی ایک کھوپڑی کو پاؤں کی ٹھوکر سے اس اندھیرے گوشے کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

"سامنے آؤ مگرڑا۔ روشنی میں آؤ تاکہ میں تمھارا خاتمہ کر سکوں۔"

مجھے اس اندھیرے اور نسبتاً گہرے گوشے میں سرسراہٹ اور شوکار سنائی دی۔ میں نے ایک ہاتھ سے تلوار اور دوسرے سے فرازیہ کا بریدہ سر بلند کر لیا۔

پھر مگرڑا روشنی میں آ گیا اور اسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں لاشعوری طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مگرڑا دھیرے دھیرے میری طرف بڑھنے لگا۔ اس کا منہ مگرمچھ کی طرح لمبوترا مگر جسم اژدہے کی مانند تھا۔ وہ رینگنے کے ساتھ ساتھ اپنے دو چھوٹے چھوٹے مگر بھاری اور مضبوط پیروں سے چل بھی سکتا تھا اس کے جسم پر بڑے بڑے کھپرے تھے اور استے مضبوط دکھائی دے رہے تھے کہ اگر تلوار سے ضرب لگائی جاتی تو تلوار ٹوٹ سکتی تھی مگر وہ نہیں کٹ سکتے تھے۔ اس پر اگر کہیں کاری ضرب لگائی جا سکتی تھی تو وہ اس کے پیٹ کا نچلا حصہ تھا۔

مگرڑا رک کر اپنی خونناک آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اتنے میں اوپر سے ارژنگ کا قہقہہ بھی سنائی دیا۔ گویا وہ میری اور مگرڑا کی کشمکش زیست و مرگ کا تماشا دیکھ رہا تھا اور یہی وہ قہقہہ تھا جس نے مجھے مگرڑا کا لقمہ بنانے سے بچا لیا۔ اس لیے کہ میں تو مگرڑا کی آنکھوں کی مقناطیسی سے مسحور ہو چکا تھا۔ قہقہے نے مجھے چونکایا تو میں نے مگرڑا کی توجہ ہٹانے کے لیے فرازیہ کا سر اس کی طرف اچھال دیا۔ مجھے فرازیہ کی دو باتیں بھی یاد آ گئیں۔ پہلی یہ کہ ارژنگ کی یہ عجیب الخلقت بلا ذہنی دماغی طور پر بہت

کمزور ہیں، دوسری یہ کہ میرا سر لے جانا، مگرڑا سے سامنا کرتے ہوئے تمھارے بہت کام آئے گا اور وہ واقعی کام آ رہا تھا۔ مگرڑا نے مجھ سے توجہ ہٹا لی تھی اور فرازیہ کا سر ادھیڑنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ میرے لیے یہی وقفہ غنیمت تھا۔ میں تیزی سے لپکا اور تلوار کی ایک ہی ضرب سے میں نے اس کا ایک پیر کاٹ دیا۔ مگرڑا تیزی سے مڑا مگر مجھ پر حملہ کرنے سے پہلے اس کی نگاہ اپنے کٹے ہوئے پیر پر پڑ گئی۔ وہ اپنا پیر چبانے میں مصروف ہو گیا۔

میں تیزی سے گھوم کر دوسری جانب آیا مگر اب خوف مجھ پہ بری طرح مسلط ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے مگرڑا کے دوسرے پیر پر ضرب لگائی لیکن وہ تیسری ضرب سے الگ ہو سکا۔ اس کے ساتھ ہی مگرڑا کی پھنکار سے وہ تہہ خانہ نما وسیع کمرہ گونجنے لگا۔ اب مگرڑا پھر کر اچھلنے اور لوٹنے پلٹنے لگا تھا۔ اتنے میں تہ خانوں دیواروں میں بنے ہوئے سوراخوں سے گاڑھا دھواں خارج ہونے لگا جس سے مجھ پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا دھواں دھند کی طرح پھیلا تو مگرڑا میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور دیوار ٹٹول کر کھسکنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ مگرڑا میری تلاش میں ہے۔ دھوئیں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور غالباً وہ مجھے دیکھ بھی سکتا تھا۔ اتنے میں ارژنگ کا قہقہہ پھر سنائی دیا قہقہے سے پیدا ہونے والی نفرت اور غصے نے مجھے ہمت دلائی۔ میں ایک بار پھر اپنی توانائی سمیٹ کر آگے کو کھسکا تو میرا پیر ایک کھوپڑی پر پڑ گیا۔ میں نے جلدی سے وہ کھوپڑی اٹھالی اور اس کی آنکھوں کے گڑھوں میں انگلیاں ڈال دیں۔ اتنے میں مجھے اندھیرے میں مگرڑا کی آنکھیں چمکتی دکھائی دے گئیں وہ میرے سر پر پہنچ چکا تھا اس کی سانس مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہوئی اور بدبو کے تیز بھبکے سے مجھے قے محسوس ہونے لگی۔

اتنے میں مگرڑا نے اپنا جبڑا کھولا اور میری گردن دبوچنا چاہی تو میں نے وہی کھوپڑی اس کے کھلے جبڑے میں ٹھونس کر اپنا ہاتھ نکال لیا۔ ساتھ ہی خود بھی اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ کھوپڑی کرچ کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گئی اور مگرڑا اسے چبانے میں مصروف ہو گیا۔ میں لاشعوری طور پر کود کر اس کے سر پر سوار ہوا اور ہاتھ سے اس کے کھپرے ٹٹولتے ہوئے نچلا حصہ تلاش کرنے لگا جہاں کھپرے نہ ہوں۔ سرد، سخت اور چکنے کھپروں کی وجہ سے سنبھلنا مشکل ہو رہا تھا دوسرے موت کا خوف بھی بے جان کیے جا رہا تھا مگر میں نے سوچا کہ اس کے بعد شاید مگرڑا پر حملے کا موقع نہ مل سکے اس لیے آخری کوشش کر کے ہی اس کا لقمہ بننا چاہیے۔ ابھی میرے ہاتھ نے اس کے پیٹ کا وہ حصہ تلاش کیا ہی تھا جہاں کھپرے نہیں، صرف کھال تھی کہ مگرڑا کھوپڑی کی ہڈیاں نگل کر پھر مجھے تلاش کرنے لگا تھا اور شاید اس نے اپنے سر پر میرا بوجھ محسوس کر لیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر مجھے گرانا چاہا لیکن گرنے سے پہلے میں نے اپنی تلوار اس کے پیٹ میں گھونپ دی اور پھر دونوں ہاتھوں سے تلوار کا دستہ پکڑ کر اسے زیادہ سے زیادہ چیرنے کی تگ و دو کرنے لگا۔

مگرڑا بڑے زور سے تڑپا۔ میں زمین پر گر پڑا۔ اس کے پیٹ سے بہنے والا خون مجھے تر بتر کر گیا مگر میں نے تلوار پر گرفت نہ چھوڑی اور اسے گھماتا اور گھونپتا رہا۔ مگرڑا کی تڑپ میں شدت آ گئی ایک بار وہ اچھلا تو میں اس کے نیچے آ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ مگرڑا کے اینٹھنے اور تڑپنے سے میری حالت ابتر ہو گئی پھر آہستہ آہستہ وہ دم توڑنے لگا۔ میں نے اپنی تلوار نکالی لیکن اب میں تھکن اور مگرڑا کے نیچے دبنے سے اتنا چور ہو چکا تھا کہ مجھ سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں نے مردہ مگرڑا کے ساتھ پیٹھ لگا لی اور دم لینے لگا۔ اب دھواں بند ہو چکا تھا اور ارژنگ کے قہقہے بھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ فرار تو نہیں ہو گیا۔ اگر وہ بھاگ نکلا تو پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا اور اس خیال نے مجھے پھر توانائی بخش دی۔ اب ایک ایک لمحہ بہت قیمتی تھا۔ میں نے اس غلیظ تہ خانے کا جائزہ لیا تو مجھے ایک اور دروازہ دکھائی دے گیا۔ اس دروازے میں پٹ نہیں تھے بلکہ جنگلا تھا جسے ایک زنجیر کے ذریعے بند کیا گیا تھا۔ میں نے زنجیر پر تلوار سے ضربیں لگانا شروع کر دیں زنجیر بہت مضبوط تھی۔ ہر ضرب کے ساتھ میرا غصہ بڑھتا اور طاقت گھٹتی جا رہی تھی بالآخر زنجیر ٹوٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی تلوار بھی۔

میں نے وہ جنگلا نما دروازہ کھول دیا اور ٹوٹی ہوئی تلوار کا دستہ لیے آگے بڑھنے لگا جس کے ساتھ صرف چار انچ پھل رہ گیا تھا۔

یہ ایک سیدھی سرنگ تھی جس میں جابجا مشعلیں جل رہی تھی۔ سرنگ کے اختتام پر بائیں جانب ایک راہداری ملی۔ یہ راہداری مجھے اسی کمرے میں لے آئی جہاں پہلی مرتبہ فرازیہ نے میرا استقبال کیا تھا۔ سامنے ہی چمڑے کا وہ پردہ آویزاں تھا جس کے دوسری جانب ارژنگ آتش دان کے پاس بیٹھا ملا تھا۔

میں نے رک کر آگے پیچھے دیکھا، کوئی آواز نہیں تھی، ارژنگ کے کالے کوتے نہ جانے کہاں چلے گئے تھے؟ پھر مجھے یاد آ گیا کہ منصوبے کے مطابق اوغیر نے کوتوں پر حملہ کر دیا ہو گا اور وہ سب اس سے مقابلے میں مصروف ہوں گے۔

میں نے آگے بڑھ کر چرمی پردہ ہٹا دیا۔

یہ وہی کمرہ تھا، وہی میز تھی، وہی ساز و سامان تھا، دیوار پر

اجرامِ فلکی کے وہی نقشے آویزاں تھے مگر نہیں تھا تو ارژنگ۔ وہ واقعی فرار ہو چکا تھا اور اس کا ثبوت وہ انگیٹھی تھی جو آتش دان سے ہٹا دی گئی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر آتش دان کا سرنگ والا جنگلا اُٹھایا اور سرنگ میں اُتر گیا۔ فرازیہ نے مجھے سچ ہی بتایا تھا۔

میں نے تلوار کا دستہ پھینک دیا اور خنجر نکال کر آگے بڑھنے لگا۔ سرنگ کے اختتام پر ایک ایسی راہ داری ملی جس میں ایک آدمی بآسانی دوڑ سکتا تھا۔ اس راہداری میں ایک مشعل جل رہی تھی۔ میں دوڑنے لگا۔ جب میں سرے پر پہنچا تو راہداری بائیں جانب مُڑ گئی میں بھی مُڑا تو بہت دُور سامنے مجھے ایک مشعل متحرک نظر آئی۔ یہ ارژنگ تھا جو مشعل اُٹھائے بھاگ رہا تھا۔ میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔

اچانک ارژنگ رُک گیا۔ میں نے بھی قدم روک لیے۔ وہ غالباً یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اُس کا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔ مگر میں اندھیرے میں تھا اگر میں نے بھی اس کی طرح مشعل اُٹھائی ہوتی تو اُسے پتہ چل جاتا۔ وہ مطمئن ہو کر پھر بھاگنے لگا میں نے پنجوں کے بل اُس کا تعاقب دوبارہ شروع کر دیا۔

کچھ دُور جا کر راستہ تنگ ہونے لگا مگر اب تازہ ہوا کے جھونکے بھی محسوس ہونے لگے تھے اور اُن میں پھولوں کے ساتھ ساتھ مٹی کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ اب ہم اہراموں والے میدان میں پہنچ چکے تھے۔ میرے اور ارژنگ کے درمیان اب تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا تھا اور یہ فاصلہ میں نے جان بوجھ کر چھوڑ دیا تھا تاکہ اُسے یہ معلوم نہ ہو سکے کہ موت اس کے تعاقب میں ہے۔

کچھ دُور جا کر ارژنگ رُک گیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ مشعل اس نے بلند کر رکھی تھی لہٰذا نیچے اندھیرا تھا۔ میں چیتے کی طرح دبے پاؤں سیڑھیوں کے قریب پہنچا۔ اپنا خنجر تولا اور پھر ایک دم بولا: "ارژنگ!"

ارژنگ جو باہر نکلنے ہی والا تھا، ٹھٹکا اور پلٹا تو اُس کے سر اور چہرے سے سیاہ نقاب ہٹ گیا اُس نے اندھیرے میں جھانکتے ہوئے کہا: "یہ تم ہو سرفروش؟"

"سرفروش نہیں تمھاری موت۔" میں نے جواب دیا اور خنجر تول کر پھینکا جو اُس کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ ارژنگ کے مُنہ سے ایک چیخ اُبھری۔ اس نے لوہے کے زینے سے ہاتھ ہٹا کر خنجر نکالنا چاہا مگر توازن قائم نہ رکھ سکا اور زینے سے گر پڑا۔ میں اس کے پاس گیا۔ وہ ابھی زندہ تھا اس نے بمشکل تمام کہا: "نادان۔ ہم دونوں ۔۔ حکمرانی" مگر موت نے اُسے اپنی بات پُوری کرنے کی مہلت نہ دی۔

میں نے ارژنگ کی لاش اپنے کندھے پر ڈالی اور زینہ چڑھنے لگا۔

زینے کے اوپری تختے پر پھولوں کی ایک چھوٹی سی کیاری بنی ہوئی تھی۔ میں نے تختہ ہٹایا اور باہر نکل کر ارژنگ کی لاش ایک طرف پھینک دی۔ چاند اور ستارے آسمان پر چمک رہے تھے اور ہر طرف سے بھاگنے دوڑنے اور چیخنے چلّانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ متحرک مشعلیں شاید تھیں کہ ان کی روشنی میں چُن چُن کر کوکوں کو موت کے گھاٹ اُتارا جا رہا ہے۔ اتنے میں ایک مشعل بردار گھڑ سوار دستہ اپنی طرف آتا نظر آیا۔ اُن کے نیزوں پر کاہنوں کے سر تھے۔ جب وہ قریب آئے تو ان کے سردار نے مجھے پہچان لیا اور لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

"یہ کون ہے جناب؟"

"ارژنگ۔" میں نے جواب دیا۔

"ارژنگ؟" اُس نے تعجب سے دُہرایا۔ "کاہنِ اعظم۔ کالے کوکوں کا سردار؟ مگر شہزادہ حضور۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ۔۔۔"

"اس کی ضرورت بھی نہیں۔" میں نے اس کی قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے ساتھ اب جو سلوک کرو تمھاری مرضی مگر اوغیر کو ضرور بتا دینا اور ہاں، تمھارا حملہ کیسا رہا؟"

"بہت کامیاب رہا جناب۔ جن کوکوں نے ہتھیار ڈال دیے، انھیں ہم نے گرفتار کر لیا ہے اور جنھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے ان کے سر نیزوں پر سجا دیے گئے ہیں۔ مقبرے کے سارے دروازے بھی بند کیے جا رہے ہیں تاکہ اگر کوکوں نے اس میں پناہ لی ہو تو اب باہر نہ آسکیں۔"

"خوب۔ یہ دروازہ بند کرنا بھی نہ بھولنا۔" میں نے زیرِ زمین راستے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اسے بند کر کے اس پر بڑے بڑے پتھر رکھوا دو۔"

"بہتر جناب۔" اور اس نے اپنے ساتھیوں کو پتھر لانے کا حکم دیا۔ پھر مجھ سے بولا۔ "کیا آپ میرے ساتھ چل کر لباس تبدیل کرنا اور آرام کرنا پسند کریں گے؟"

"وہ میں خود ہی کر لوں گا۔ اوغیر کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ اب ہماری ملاقات نہیں ہوگی اور آج رات ہی میں کسی کا ایک گھوڑا چُرا کر یا مانگ کر لے جاؤں گا۔ اور ہاں اُسے کہہ دینا کہ وہ طاؤسرا وعدہ نبھانا نہ بھولے۔"

"بہتر جناب۔" وہ ادب سے بولا اور میں اُسے وہیں چھوڑ کر چل دیا۔

★★

مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں سچ مچ نیم دیوانہ ہو گیا ہوں۔ مجھے ہر وقت زرتاج کی خاموش پکار سُنائی دیتی تھی۔ وہ

کی چٹان سے تراشا ہوا مجسمہ تھی مگر میں اُس کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اُس کا صدیوں قائم رہنے والا سحر مجھے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا اور یہ اُسی سحر کا کرشمہ تھا کہ اب میں اپنے دور اپنی دُنیا میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا بلکہ زرتاج کے ساتھ رہنے کا متمنی تھا۔

میں نے اُسی شب آبنائے عبور کر لی تھی اور صبح کا اُجالا پھیلنے سے پہلے ایک پہاڑی غار میں چھپ گیا تھا دن میں کئی بار آشوری گھڑ سوار میرے قریب سے گزرے۔ میں نے ان کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ اب مجھے ساحلی علاقے میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ ان کا خیال شاہی مقابر کی طرف نہیں گیا ورنہ وہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے پہنچ چکے ہوتے۔

میں تین راتوں کے سفر کے بعد مردہ آتش فشاں پر پہنچ گیا جس کے وسط میں مجسموں کی گیلری واقع تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہاں کوئی محافظ نہیں ہوگا۔ ان تین روز میں مجھے کھانے کو بھی کچھ نہیں ملا تھا۔ ہتھیاروں کے نام پر میرے پاس ایک تلوار اور ایک خنجر تھا جو چلتے وقت میں نے ایک ازمیری افسر سے لے لیے تھے اور اب مجھے ان کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی۔

میں نے دو چقماق تلاش کیے اور انھیں ٹکرا کر ایک مشعل جلائی۔ یہ مشعل لے کر میں کان میں داخل ہو گیا اور بڑے ہال تک جا پہنچا۔ مشعل کی روشنی میں اس کی چٹانوں والی دیواریں جگمگا اُٹھیں اور اس کے ہر ٹکڑے میں مجھے اپنا عکس دکھائی دینے لگا۔ مگر یہ عکس اس سرفروش کا تھا جسے صدیوں پہلے مر جانے والی ایک عورت کی محبت نے نیم دیوانہ بنا دیا تھا۔ میں نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ اُٹھا کر اپنے آپ کو سلام کیا پھر میں اُس اتھاہ گہرے گڑھے کی کگر پر آ گیا جس کے دوسرے کگر پر مجسمے ایستادہ تھے اور ان میں سے ایک زرتاج کا تھا۔

میں نے مشعل بلند کی تو زرتاج روشنی میں نہا گئی۔ اس کے انگ انگ سے رنگ پھوٹنے لگے۔ وہ ان سب عورتوں سے زیادہ خوبصورت تھی جو اب تک میں نے دیکھی تھیں پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زرتاج کہہ رہی ہو: "آخر تم آ ہی گئے میرے محبوب۔"

"ہاں زرتاج میں آ گیا ہوں۔ اپنی باہیں یونہی پھیلائے رکھو پھر جب میں اُس کگر پر پہنچوں تو مجھے اُن کے حلقے میں سمیٹ لو۔"

میں گڑھے کے اُس مقام پر آیا جہاں وہ کم سے کم چوڑا تھا اور ابھی چوڑائی کا جائزہ لے رہا تھا کہ میرے دماغ والا کرسٹل مجھے اشارے بھیجنے لگا۔ یوں تو وہ کئی دنوں سے مجھے اشارے دے رہا تھا مگر میں نے ان پر خود اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ڈاکٹر فریدون کو میری ذہنی کیفیت کا علم ہو چکا ہے اور اب وہ ہدایات دینا چاہتا ہے۔ ان ہدایات کا مطلب و مقصد اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا کہ میں اپنے دل سے زرتاج کی محبت نوچ کر پھینک دوں اور یہ میرے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ مگر اس وقت اشارے بہت واضح اور طاقتور تھے۔ مجھے ارتکازِ توجہ کے بغیر ہی یہ پیغام مل گیا۔

"اپنے ارادے سے باز آ جاؤ۔ واپسی کے لیے تیار رہو اور جو کچھ لا سکتے ہو لیتے آؤ۔"

میں نے اس پیغام پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ میری محبت کو، میری خوشیوں کو پھر قتل کر دینا چاہتے تھے۔ میں اپنے دور اور دُنیا میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں بھی یہاں کی طرح دُکھ تھے، درد تھے، بیماریاں تھیں، فریب تھے ۔۔۔ میرا جی بھر چکا تھا اب میں کسی جنگ و جدال میں حصہ نہیں لینا چاہتا تھا۔ میری تمنا تھی تو صرف اتنی کہ زندگی کا آخری لمحہ زرتاج کے ساتھ بسر ہو جائے۔

میں نے اشاروں پر کوئی توجہ نہ دی اور گڑھے کی چوڑائی کا اندازہ لگانے لگا۔ وہ پندرہ فٹ یا چند انچ کم زیادہ تھی۔ اگر ایک بار میں اس کگر پر پہنچ جاؤں تو دوبارہ ادھر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ جمیر تھا جو دوبارہ ادھر آ گیا تھا لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا اور کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اتنے میں زرتاج کی آواز سنائی دی۔

"دیر کیوں کر رہے ہو سرفروش۔ ادھر آؤ نا میرے پاس۔"

"میں آ رہا ہوں زرتاج۔ میں آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے آخری بار گڑھے میں جھانکا۔ اتھاہ گہرائی میں مجھے اندھیروں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں پیچھے ہٹا اور آخری حصے تک چلا گیا جو کگر سے تقریباً تیس ہاتھ تھا۔ اتنے کم فاصلے میں رفتار پکڑنا مشکل تھا لیکن مجھے تو بہرطور زرتاج کے پاس پہنچنا تھا۔ نہ پہنچ سکا تو کوئی مضائقہ نہیں۔ زرتاج کے لیے جان دینا بھی کم خوشی کی بات نہیں تھی۔

"آ جاؤ سرفروش۔" اس کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر فریدون کا پیغام ملا۔ "تمھاری ذہنی کیفیت دیوانوں کی سی ہو گئی ہے۔ واپسی کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"نہیں۔" میں چلّایا۔ "اس وقت تم مجھے واپس نہیں بلا سکتے ڈاکٹر۔" اور اس کے ساتھ ہی میں نے گڑھا پھلانگنے کے لیے دوڑ لگا دی۔

میں ہوا میں اچھلا اور جب گڑھے کے درمیان پہنچا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں دوسری کگر تک نہیں پہنچ پاؤں گا۔ تاہم میں نے اپنے بازو آگے کو پھیلا دیے۔ یہ سب ایک سیکنڈ کے اندر اندر ہو گیا۔ میں دوسری کگر تک نہ پہنچ سکا مگر میرے بازو پہنچ گئے اور جسم خلا میں جھولتا رہ گیا۔ میں نے کگر پر اُبھرے ہوئے ٹکڑے بڑی مضبوطی سے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیے تھے لیکن میرے اندر اتنی توانائی نہیں رہی

تھی کہ اپنے آپ کو گھسیٹ کر اوپر جا سکوں۔ میں اس وقت کا انتظار کرنے لگا کہ میرے ہاتھوں کی توانائی جواب دے جائے تو انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے پر میں اتھاہ گہرائی میں گر کر شہروز سے جا ملوں لیکن جونہی میں نے زرتاج کی طرف دیکھا، وہ مسکراتے ہوئے بولی: "رُک کیوں گئے ہو میرے پاس آؤ نا۔"

زرتاج کے ان الفاظ نے میری ساری کھوئی ہوئی توانائیاں مجھے لوٹا دیں۔ میں نے ایک نعرہ لگایا اور دوسرے لمحے میں گگر پر تھا۔ میں اُٹھا اور مجسموں کے درمیان سے گزر کر زرتاج کی طرف بڑھنے لگا۔

کرسٹل نے بتایا: "تیار رہو۔ واپسی کے لیے تیار رہو۔ جو لینا ہے لے لو۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" میں چلایا اور زرتاج کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ زندہ ہے۔ میں نے کہا: "تم مجسموں میں کیوں کھڑی ہو زرتاج؟"

"میں جانتی تھی کہ مجسموں کی تلاش تمھیں یہاں لائے گی۔ اس لیے میں مجسمہ بن کر یہاں کھڑی ہو گئی اور صدیوں تک تمھاری راہ دیکھتی رہی۔ آؤ میری بانہوں میں سما جاؤ۔ مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لو۔"

اور میں نے آگے بڑھ کر اُسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ لیکن پتہ نہیں کیا ہوا کہ ہم دونوں گر پڑے اور گگر کی طرف لڑھکنے لگے۔ میں نے کہا: "ہم اتھاہ گہرائی میں گرنے والے ہیں زرتاج۔"

"ڈرو مت سفروش۔ موت تمھیں ہمیشہ کے لیے مجھ سے ملا دے گی۔ میں زندہ ہو کر تمھیں نہیں مل سکتی تھی مگر تم مر کر مجھے مل سکتے ہو۔ یا تم میری خاطر، اپنے پیار کی خاطر نہیں مر سکتے؟"

"اگر میرے پاس ہزار زندگیاں ہوتیں تو میں اپنی ہر زندگی تمھارے نام پر نچھاور کر دیتا زرتاج۔" میں نے جواب دیا۔ اب ہم لڑھکتے ہوئے گگر کے کنارے تک پہنچ گئے تھے پھر میرے سر میں درد کی شدید لہر نے مجھے بے ہوش کر دیا۔

★★

زرتاج اگرچہ اب بھی میری بانہوں کے حصار میں تھی مگر اس نے دم توڑ دیا تھا۔ ان لوگوں نے اُسے مار ڈالا تھا۔ اس کا جسم پھر پتھر ہو چکا تھا۔ "زرتاج!" میں زور سے چیخا۔ مگر مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اور گہرائی کی تہ میں آ گرے۔ ہمارے قریب ہی شہروز کی لاش پڑی تھی۔

یہ عجیب سی بات تھی کہ گڑھے کی اتھاہ گہرائی میں روشنی تھی۔ مجھے بہت سے بنجر اور کھوپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے زرتاج سے کہا: "مجھے ڈر لگ رہا ہے زرتاج۔" مگر وہ کچھ نہ بولی۔ میں بھول گیا

تھا کہ وہ دوبارہ ہیرے کی چٹان میں ڈھل گئی ہے، بے جان مجسمہ بن گئی ہے۔

اور پھر میں رونے لگا۔ یہاں تک کہ روتے روتے بے ہوش ہو گیا۔

★★

جب میں ہوش میں آیا تو مجھے بتایا گیا کہ میں کئی روز سے ہسپتال میں بے ہوش پڑا تھا۔ میرے ہوش میں آتے ہی برین سرجن ڈاکٹر قدسی کو اطلاع دے دی گئی۔

ڈاکٹر قدسی نے میرا معائنہ کیا اور بولا: "تم ٹھیک ٹھاک ہو۔ تمھیں جلد ہی یہاں سے چھٹی مل جائے گی۔ بے ہوشی کے دوران تم کچھ بولتے رہے ہو۔ میری ہدایت یہ ہے کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو، کچھ عرصے کے لیے وہ کام چھوڑ دو۔"

کچھ روز مزید آرام کرنے کے بعد جب مجھے ہسپتال سے چھٹی ملی تو رضا آفندی مجھے لینے آ گیا۔ اس دوران مجھ سے ذرا سے ملنے دیا گیا نہ ڈاکٹر فریدوں کو۔ رضا آفندی میری خیریت دریافت کرنے کے بعد مجھے ڈاکٹر فریدوں کے پاس لے گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا: "اب تم اپنی ذہنی کیفیت میں کچھ فرق محسوس کرتے ہو؟"

"کوئی خاص نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"کمال ہے بھئی۔ یعنی دماغ سے کرسٹل ہٹا لینے کے بعد تمھیں کوئی فرق محسوس ہی نہیں ہوا۔"

"کیا وہ میرے دماغ سے نکال دیا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ میرا خیال ہے کہ شاید یہ گڑبڑ اسی کی وجہ سے ہوئی۔ اب کے تم جو مجسمہ لائے ہو وہ اربوں روپے کی مالیت کا ہے۔ ذرا ساتھ آؤ۔"

ہم تینوں اس کے ساتھ اس کی خواب گاہ میں چلے گئے۔ ڈاکٹر فریدوں نے ایک خاص قسم کی آہنی تجوری کا دروازہ کھول دیا۔ الماری میں زرتاج کا مجسمہ استادہ تھا۔ ڈاکٹر فریدوں بولا: "جب کبھی رات کو مجھے نیند نہیں آتی، میں اس مجسمے پر روشنی ڈالتا ہوں تو اس کے انگ انگ سے رنگ پھوٹنے لگتے ہیں اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یہ مجھے گوشت پوست کی عورت معلوم ہونے لگتی ہے۔ ساتھ ہی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس سے دیوانہ وار چاہنے لگا ہوں اور مجھے کہیں دُور سے ایک آواز سی آتی ہے کہ میں کب سے انتظار کے ساحل پر کھڑی تمھاری راہ دیکھ رہی ہوں فریدوں۔ کیا تم نے بھی ایسا محسوس کیا تھا؟"

"مجھے یاد نہیں ڈاکٹر۔" میں نے صاف جھوٹ بول دیا۔

ڈاکٹر اور رضا آفندی نے بے ساختہ ایک ساتھ قہقہہ لگایا تو مجھے یاد آیا کہ میری ذہنی کیفیت ان سے ڈھکی چھپی نہیں تھی پھر اس نے تو واپسی پر میری یادداشت کا ذخیرہ ٹیپ پر منتقل کر لیا ہو گا۔ میں نے ایک آخری نظر زرتاج کے مجسمے پر ڈالی اور چپ چاپ باہر نکل گیا۔

★★

زرتاج کے مجسمے کی جو مالیت بتائی گئی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ڈاکٹر فریدوں بالآخر کمپیوٹر سے منافع کمانے کی پوزیشن میں پہنچ گیا ہے۔۔ چند روز بعد ہی وہ میرے لیے نئے سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اس بار وہ پہلے سے کہیں زیادہ پرجوش تھا۔

۔۔۔ اور پھر وہ مقررہ دن بھی آ پہنچا۔

کمپیوٹر رُوم کی وہ کرسی آج بھی مجھے موت کی کرسی دکھائی دے رہی تھی۔ میں وقفے وقفے سے اس کرسی پر مر رہا تھا اور تھوڑے تھوڑے عرصے بعد جب کمپیوٹر کا ریسیور میرے ذرات سمیٹ کر تجسیم نو کر دیتا تو میں دوبارہ زندہ ہو جاتا۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا اور الیکٹروڈز میرے جسم سے منسلک کر دیے گئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

پھر یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک تند بگولے کی لپیٹ میں آ گیا ہوں جو مجھے برق رفتاری سے چکر دیتے ہوئے اوپر ہی اوپر لیے جا رہا ہے۔ ساتھ ہی مجھے بادِ گرد کی سنسناتی ہوا کے تھپیڑے لٹو کی طرح گھما بھی رہے ہیں۔ پھر ایک دھماکے کی آواز سنائی دیتی ہے اور میں گردش کرتے ہوئے بگولے کی زد سے نکل کر اتھاہ اندھیرے خلا میں گرنے لگتا ہوں لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ میں جوں جوں نیچے آتا ہوں گرنے کی رفتار میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے مجھے ایک نہیں، متعدد پیراشوٹ سنبھالے ہوئے ہیں۔ جوں ہی میرے پاؤں زمین پر ٹکتے ہیں میں لڑھکنیاں کھانے لگتا ہوں۔ تب میں لاشعوری طور پر اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا دیتا ہوں تاکہ میں اپنے آپ کو لڑھکنیاں کھانے سے روک سکوں اور کچھ دور گھسٹنے کے بعد واقعی رُک جاتا ہوں۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ یہ سب ایک ڈراؤنا خواب تھا لیکن دوسرے ہی لمحے گھسٹنے سے جسم پر آنے والی خراشوں نے اس خیال کو جھٹلا دیا۔ میں پتھریلی اور ڈھلوان زمین پر چت پڑا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھولیں تاکہ دیکھ سکوں کہ میں کہاں ہوں مگر مجھے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں بینائی سے محروم ہو گیا ہوں۔ میں بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگا لیکن اس کے باوجود مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا البتہ تیز ہوا کی سائیں سائیں اور بادلوں کی گھن گرج ضرور سنائی دے رہی تھی۔ معاً یہ خیال کوندے کی طرح ذہن میں لپکا، کہیں ایسا تو نہیں کہ میری بینائی بالکل ٹھیک ہو مگر گھور اندھیرے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہ دے رہا ہو؟ یہ سوچ کر میں نے اُوپر آسمان کی جانب نگاہ کی تو اُمنڈتے گھمنڈتے بادلوں کے بیچ ایک جگہ چاند کی ذرا سی جھلک دکھائی دے گئی۔ میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا اور خراشوں کا جائزہ لینے کے لیے جسم کو ٹٹولا تو پتہ چلا کہ لباس کے نام پر چند لتے جھول رہے ہیں لیکن کمر میں بندھی ہوئی چمڑے کی پیٹی اور اس میں اُڑسا ہوا تیز دھار شکاری چاقو اپنی جگہ موجود ہے۔ میں نے ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ اتنی لڑھکنیاں کھانے کے باوجود میں زخمی نہیں ہوا تھا ورنہ چاقو کا ننگا پھل میرا پیٹ چیر کر انتڑیاں باہر نکال سکتا تھا۔

سرد ہوا کے تیز جھکڑوں سے مجھ پر کپکپی طاری ہونے لگی تو میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب میری آنکھیں اس اندھیرے میں کچھ کچھ دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ میں جس ڈھلوان پر کھڑا تھا، اس کے اُوپری جانب سر بہ فلک پہاڑ تھے اور باقی تین اطراف اندھیرے کے باعث کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ نیچے اُترتے ہوئے سوچنے لگا کہ میں یہاں کیسے آ گیا ہوں؟ مجھے جان بوجھ کر یہاں بھیجا گیا ہے یا کمپیوٹر کی کسی غلطی یا خرابی نے مجھے یہاں لا پھینکا ہے؟ پھر میں نے ان سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا کہ ان کا جواب آنے والا وقت ہی دے سکتا تھا۔۔۔ سردست تو مجھے ایک بار پھر اپنی بقا کے مسئلے سے نمٹنا تھا۔ عین اُسی وقت مجھے اپنے قدموں کے نیچے زمین تھرتھراتی محسوس ہوئی اور ایک دہشت انگیز گڑگڑاہٹ بھی سنائی دی۔ پھر چند بڑے بڑے پتھر میرے سامنے سے لڑھکتے ہوئے نیچے چلے گئے۔ میری جسامت سے کئی گنا ایک بڑا پتھر تو عین اس جگہ سے گزرا جہاں چند لمحے قبل میں چت پڑا تھا۔ اگر اس وقت میں وہاں ہوتا تو میرا وجود گوشت کے بکھرے ہوئے لوتھڑوں میں بدل چکا ہوتا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نیچے سے

چند دھماکوں کی آواز آئی۔ یہ دھماکے ابھی اُوپر سے لڑھکنے والے پتھروں کے تھے جو نیچے پڑے ہوئے پتھروں کے ساتھ ٹکرانے سے ہوئے تھے۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ ڈھلوان زیادہ طویل نہیں ہے اور اس سے پہلے کہ کوئی اور بڑا پتھر یا چٹان میرا قیمہ بنا دے، مجھے نیچے جا کر اپنے لیے کوئی جائے پناہ تلاش کر لینی چاہیے چنانچہ میں تیزی سے نیچے اُترنے لگا۔

ڈھلان کے اختتام پر ہر جگہ چھوٹے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے اور اُن سے پرے کچھ فاصلے پر ایک دیوار سی نظر آ رہی تھی۔ اتنے میں بادل چھٹنے سے چاند نکل آیا تو پتہ چلا کہ وہ دیوار دراصل بلند و بالا درختوں کا ایک وسیع جنگل ہے۔ لڑھکتے پتھروں اور تند و تیز یخ بستہ ہوا سے بچنے کے لیے میں جنگل کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

جنگل بے حد گھنا تھا۔ سنسناتی ہوا میں درختوں کی جھومتی شاخیں یوں لگ رہی تھیں جیسے چڑیلیں بال کھولے وحشیانہ انداز میں رقص کر رہی ہوں۔ ہوا کے جھکڑوں سے ٹوٹنے والے درختوں کی چرچراہٹ پر ارواحِ خبیثہ کی چیخوں کا گمان ہوتا تھا۔ پھر یہ بات بھی خارج از امکان نہیں تھی کہ جنگل ریچھوں اور بھیڑیوں جیسے درندوں کا مسکن بھی ہو سکتا ہے اس لیے میں جلد از جلد رات بسر کرنے کا کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لینا چاہتا تھا۔

ایک جگہ دو تناور درختوں کے درمیان گھنی اور خاردار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور اُن میں داخل ہونے کا ایک چھوٹا سا قدرتی راستہ بھی موجود تھا۔ میں اُن جھاڑیوں میں گھس گیا۔ چاقو سے کچھ خاردار جھاڑیاں کاٹ کر راستہ بند کیا، سو[illegible] پتے سمیٹے اور اُنھیں بچھا کر لیٹ گیا۔ میرا خیال تھا کہ اس موسم اور ما[illegible] میں مجھے نیند نہیں آئے گی تاہم میں تھوڑا سا آرام ضرور کر سکوں گا مگر لیٹتے ہی مجھ پر غنودگی چھا گئی اور میں نیند کی نرم و مہربان آغوش میں پہنچ گیا۔

خدا جانے وہ رات کا کون سا وقت تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی یا چھٹی حس نے مجھے گہری نیند سے بیدار کر دیا۔ ہوا کی شدت میں قدرے کمی آ چکی تھی اس لیے اُس کی شوکار میں وہ دہشت نہیں تھی لیکن اب اس شوکار میں نفیریوں اور دف کی آواز ضرور شامل ہو گئی تھی۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگا کہ وہ واقعی نفیریوں اور دف ہی کی آواز ہے یا میرا واہمہ لیکن یہ میرا وہم نہیں تھا۔ ہوا کی لہریں کہیں دُور سے ان سازوں کی آوازیں اپنے ساتھ لا رہی تھیں۔ اس جنگل اور ایسے موسم میں بھوت پریت ہی بزمِ طرب سجا سکتے تھے۔ اگر اُنھوں نے یہ بزمِ طرب سجائی تھی تو کہاں سجائی تھی؟ تھوڑی دیر کے بعد مجھے یہ اندازہ ہو سکا کہ سازینوں کی آوازیں بائیں جانب سے آ رہی ہیں۔ میں اُٹھ کر اُدھر دیکھنے لگا۔ اچانک بہت دُور جگنو کی طرح ایک چمک دکھائی دی مگر دُوسرے لمحے غائب ہو گئی۔ نفیریوں اور دف کی آواز بھی کبھی ہوا کی سائیں سائیں میں مدغم ہو جاتی . . . اور کبھی اُبھر کر سماعت کو اپنے وجود کا یقین دلا دیتی تھی۔ جب بہت دیر تک وہ روشنی یا چمک پھر دکھائی نہ دی تو میں یہی سمجھا کہ وہ جگنو ہو گا لیکن ایک بار پھر وہ سُرخ چمک نظر آ گئی جو کسی الاؤ کی نشاندہی کرتی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ اس بے پایاں جنگل میں کوئی ذی ہوش خیمہ زن ہو کر الاؤ روشن نہیں کر سکتا تو پھر یہ آگ کیسی تھی اور سازکیوں بج رہے تھے؟ میں نے اپنا چاقو اُٹھا کر پیٹی میں اُڑسا اور احتیاط سے اُس طرف چل دیا۔

ظاہر ہے کہ میں اتنے گھنے جنگل میں سیدھا اُس طرف نہیں جا سکتا تھا اس لیے کبھی وہ سُرخ چمک مجھے دائیں جانب نظر آتی تھی تو کبھی بائیں جانب۔ پھر کبھی وہ بہت دیر تک غائب ہو جاتی تھی تب سازینوں کی آواز میری رہنمائی کرتی تھی۔ بالآخر میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے الاؤ صاف دکھائی دیتا تھا مگر وہاں جانے میں بھی کئی خطرے تھے کیونکہ ایسے ویرانے اور جنگل میں خیمہ زن ہونے والوں نے اپنی حفاظت کے لیے پہرے کا انتظام بھی ضرور کیا ہو گا۔ یہ پہرے دار درختوں کی اوٹ یا اُن کی شاخوں میں چھپ سکتے اور ذرا سی آہٹ پر تیر چلا سکتے تھے۔ اس لیے میں گُربہ پا اور چھپ چھپ کر آگے بڑھتا رہا۔

جب میں الاؤ کے قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ وہ ایک سڑک کے کنارے جل رہا ہے جو جنگل کے بیچوں بیچ گزرتی ہے۔ میں اُسی کچی سڑک پر آ گیا تھا اور سڑک بائیں جانب موڑ کے ساتھ ہی الاؤ جل رہا تھا۔ میں نے سڑک پار کی اور مزید قریب آیا تو مجھے سازوں کے ساتھ ساتھ کچھ لوگوں کی آوازیں بھی سُنائی دینے لگیں۔ پھر سازوں کی لَے ایک دم تیز ہو گئی اور دف پر بھی تیز تھاپ پڑنے لگی۔ لَے تال کی اس اچانک تبدیلی نے مجھے شک و شبہے میں مبتلا کر دیا کہ کہیں وہ میری آمد سے تو باخبر نہیں ہو گئے۔ کہیں یہ لَے تال اطلاعی اشارہ تو نہیں؟ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُونچے سُروں میں بجنے والے یہ ساز ایک دم جھٹکے سے خاموش ہو گئے جیسے زمین نے شق ہو کر سازندوں کو نگل لیا ہو۔ اس اچانک چھا جانے والی خاموشی میں اب صرف ہوا کی شوکار باقی رہ گئی تھی اور یوں لگ رہی تھی جیسے بھٹکی ہوئی رُوحیں جنگل میں بین کرتی پھر رہی ہوں۔ میں عجیب مخمصے میں گرفتار تھا کہ آگے بڑھوں یا پلٹ جاؤں کہ اتنے میں تالیاں بجنے لگیں اور کچھ داد و تحسین سے "واہ وا . . . واہ وا" کہہ اُٹھے۔

وہ کون تھے؟ وہاں کیا ہو رہا تھا؟ یہ جاننے کا شوقِ تجسس

مجھے آگے بڑھنے پر اُکسانے لگا اور میں جھاڑیوں کی اوٹ میں رینگنے لگا۔ جب میں موڑ پر پہنچا تو پتہ چلا کہ اس کچی اور ٹیڑھی میڑھی سڑک کے کنارے تقریباً سو گز کا ایک ٹکڑا جھاڑیوں اور درختوں سے صاف کر دیا گیا ہے جس کے پرلے کنارے نیم دائرے کی صورت چھ چھوٹے چھوٹے خیمے نصب تھے، درختوں کے ساتھ کچھ گھوڑے اور گدھے بندھے ہوئے تھے اور درمیان میں الاؤ جل رہا تھا جس کے ارد گرد تقریباً دس بارہ آدمی آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ یہ سب کے سب کھلی آستینوں والے چغے اور گھیر دار شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ لیکن اُن میں سے دو افراد کے چغے اور شلواریں چمک دار ریشمی کپڑے کی بنی ہوئی تھیں جبکہ باقی افراد کا لباس معمولی کپڑے کا تھا۔ ہر فرد کے پاس ہتھیار تھے اور ان میں سے پانچ آدمی اس وقت ہاتھوں میں ساز لیے بیٹھے تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُن لوگوں کے درمیان ایک نازک اندام لڑکی بھی موجود ہے۔ اُس نے برائے نام مختصر لباس پر منکوں کے ہار پہن رکھے تھے اور اُس کے خوبصورت بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ وہ لڑکی زور زور سے سانس لے رہی تھی جس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ رقص کرتی رہی ہے اور بُری طرح تھک گئی ہے۔

اس سے پہلے کہ اُن میں سے کسی کو میری آمد کا احساس ہوتا، میں اُٹھا اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اُن کے سامنے چلا گیا۔ میں نے یہ انداز اس لیے اپنایا تھا کہ اُنھیں پہلی نظر ہی میں یہ احساس ہو جائے کہ میں نہتا ہوں ورنہ وہ میری بات سُننے سے پہلے میرے سینے میں بھالا بھونک سکتے تھے۔

جُونہی میں الاؤ کی روشنی میں اُن کے سامنے آیا، ہر فرد کے ہاتھ بے اختیار اپنے اپنے ہتھیاروں پر جا پہنچے۔ لڑکی میری ہیئت کذائی دیکھ کر اتنی خوفزدہ ہوئی کہ اُس نے اپنا چہرہ اپنی باہوں میں چھپا لیا۔ اتنے میں عمدہ لباس والے دو آدمیوں میں سے ایک نے جو بوڑھا تھا کسی کو حکم دیا: "طغرل . . . ارغون۔ درخت پر چڑھ کر دیکھو۔ کوئی آ رہا ہو تو ہمیں خبردار کر دو۔"

یہ حکم سُنتے ہی دو ہٹے کٹے جوان اُٹھے اور بندروں کی سی پُھرتی کے ساتھ ایک اُونچے درخت پر چڑھنے لگے۔ میں نے بوڑھے اور اُس کے ساتھ بیٹھے نوجوان کو غور سے دیکھا۔ وہ باپ بیٹے لگتے تھے۔ بوڑھے نے تلوار اپنی گود میں رکھ دی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا: "تم کون ہو اور تمھیں سلطنتِ بہرام میں قدم رکھنے کی جرأت کیونکر ہوئی؟"

"میں ایک مسافر ہوں۔ مجھے لباس اور خوراک کی ضرورت ہے اور میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ مہمان نواز ثابت ہوں گے۔"

"سلطنتِ بہرام کی سرحد میں بلا اجازت قدم رکھنے والوں کی مہمان داری تلوار سے کی جاتی ہے اجنبی۔ اگر ہم کسی ایسے آدمی سے ہمدردی برتنا چاہیں تو صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ اُسے ترسا ترسا کر نہ ماریں بلکہ ایک ہی جھٹکے میں اُس کا سر تن سے جُدا کر دیں تاکہ وہ موت کے طویل کرب سے نہ گزرے اور اگر ہمیں اُس پر رحم نہ آئے تو ہم اسے شہنشاہ ضرغام کے پاس بھیج دیتے ہیں جو اپنی سلطنت میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے والوں کو تڑپا تڑپا اور سسکا سسکا کر مارتا ہے۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"میں نے ایسا کوئی جُرم نہیں کیا جو میرے معزز میزبانوں کو میرے قتل پر اُکسائے۔"

"آخر تم ہو کون؟" اب نوجوان نے سوال کیا۔ "یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے کہ تم نے کوئی جُرم کیا ہے یا نہیں۔"

"میرا بیٹا ٹھیک کہتا ہے۔" بوڑھا اس کی تائید کرتے ہوئے بولا: "یہ سلطنتِ بہرام کی سرحد کا وہ علاقہ ہے جو کہستانِ منگول سے ملتا ہے۔ تم سلطنتِ بہرام کے باشندے نہیں ہو اور منگول ہمیشہ ہمیں نقصان پہنچانے کے لیے ہماری سرحد میں داخل ہوتے ہیں۔"

"اگر آپ سچ سُننے کا حوصلہ رکھتے ہوں تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ دُنیا کے بارے میں آپ کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ میں منگول نہیں، سلطنتِ آریانہ کا باشندہ ہوں جو کہستانِ منگول اور اُس کے بعد صحرائے اعظم کی دُوسری جانب واقع ہے۔ میں وہاں کا شہزادہ ہوں۔ میرے ساتھ چھ شہسوار بھی تھے۔ ہم سلطنتِ بہرام کے شاہ ضرغام کی خدمت میں آ رہے تھے کیونکہ ہم نے اُن کی طاقت کے بارے میں بہت سی داستانیں سُنی تھیں۔ ہم اُن کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

"شہنشاہِ دوراں اعلیٰ حضرت ضرغام کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ لوگ ان کے بارے میں کیا سوچتے یا سُنتے ہیں۔" نوجوان نے کہا۔ "اور پھر تمھیں ان معلومات سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟"

"ہم ایک دُوسرے کی اچھی باتیں اپنا سکتے ہیں۔ دُوسرے ہم اس حقیقت کی کھوج بھی لگانا چاہتے تھے کہ اعلیٰ حضرت ضرغام کے بارے میں یہ افواہ کہاں تک دُرست ہے کہ وہ عقل و دانش سے محرُوم ہیں یا آپ حضرات یہ چاہتے ہیں کہ ہم بلا تصدیق اس افواہ پر یقین کر لیتے؟"

یہ بات سُن کر نوجوان کا مُنہ کُھلے کا کُھلا رہ گیا۔ اُس نے تعجب سے باپ کی طرف دیکھا جو اپنے تاثرات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میری اس بات نے اُنھیں کسی ذہنی کشمکش میں مُبتلا کر دیا ہے۔ میں نے کہا: "ہم نے بہت زیادہ افراد پر مشتمل سفارت اس لیے مناسب نہیں سمجھی تھی کہ ہمیں صحرائے اعظم اور منگول علاقے سے گزرنا تھا اور منگول شاید فوجی دستے کو برداشت نہ کر سکتے۔ اس کے باوجود

جب ہم سرحد کے قریب پہنچے تو اُنھوں نے میری مختصر سی جماعت پر حملہ کر دیا۔ وہ بہت زیادہ تعداد میں تھے۔ اس لیے میرے پانچ شہسوار اُن سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ میں اور میرا ایک شہسوار بچ نکلا مگر ہم جنگل میں ایک دُوسرے سے بچھڑ گئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے ساتھی پر کیا بیتی البتہ میں خود یہاں تک آ پہنچا ہُوں۔"

"کیا منگول گھوڑوں پر سوار تھے یا پیدل؟" نوجوان نے سوال کیا۔

"بہت سے گھوڑوں پر سوار تھے مگر اُن کے ساتھ پیدل جنگجو بھی کافی تعداد میں تھے۔"

"کیا تم انھیں دیکھتے ہی بھاگ نکلے تھے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"ایک جنگجو شہزادے سے اس قسم کی توقع وابستہ کرنا اُس کی بہادری اور مردانگی کی توہین کے مترادف ہے سردار۔ میں اُس وقت تک منگولوں کو تہ تیغ کرتا رہا تھا جب تک کہ میری تلوار ایک زرہ کو چیرتی ہُوئی منگول گھڑ سوار کی پسلیوں میں نہ پھنس گئی۔ کیا آپ میرے لباس سے یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں کس حال سے گزرا ہُوں گا؟"

"لباس تو خاردار جھاڑیوں سے گزرتے ہُوئے بھی تار تار ہو سکتا ہے۔ تم جنگجو ہو، اس کا کیا ثبوت ہے تمھارے پاس؟"

"اس وقت میں کوئی ثبوت تو نہیں دے سکتا، البتہ اتنا ضرور کہہ سکتا ہُوں کہ آپ جس طرح چاہیں، مجھے آزما سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" بوڑھا بولا اور اُس نے تین بار تالی بجائی تو لڑکی اُٹھ کر خیمے کے اندر چلی گئی۔ بوڑھا اور اُس کا بیٹا چند قدم پیچھے ہٹ گئے اور باقی لوگوں نے بھی اُٹھ کر ایک نیم دائرہ بنا لیا۔ تب بوڑھے نے آواز لگائی "طغرل۔ ارغون۔ یہاں آؤ۔"

چند لمحوں بعد ہی دو ہٹے کٹے درخت سے اُتر آئے اور بوڑھے کے سامنے مؤدب کھڑے ہو گئے۔ میں نے الاؤ کی روشنی میں غور سے اُن کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں قد و قامت میں تقریباً میرے برابر تھے۔ اپنے سردار کا حکم سنتے ہی ایک نے کلہاڑا اور دُوسرے نے گرز اُٹھا لیا۔ بوڑھے سردار نے میری طرف اشارہ کرتے ہُوئے اُن سے پُوچھا "تم اسے دیکھ رہے ہو؟"

"جی ہاں سردار۔"

"یہ کہتا ہے کہ یہ سلطنت آریانہ کا شہزادہ ہے جو کہستانِ منگول کے جنوب میں بہت دُور واقع ہے۔ یہ ہمارے شہنشاہ سے ملنے آیا ہے۔"

اُن دونوں نے میری طرف دیکھا اور یُوں ناک سکیڑی جیسے انھیں بدبو آ رہی ہو۔ بوڑھا پھر بولنے لگا "یہ کہتا ہے کہ منگولوں نے اس کی جماعت پر حملہ کر دیا تھا۔ اس کے آدمی مارے گئے مگر اُس نے بھی بہت سے منگولوں کو تہ تیغ کر دیا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ سچ کہتا ہے یا جھوٹ۔ تاہم یہ اجنبی ہے اور سلطنت بہرام میں کہستانِ منگول سے داخل ہُوا ہے۔" یہ کہتے ہُوئے اُس نے میان سے تلوار نکالی اور میری طرف لہراتے ہُوئے دہاڑا "قتل کر دو اسے۔"

میں نے تعجب سے بوڑھے سردار کی طرف دیکھا جس نے اتنی آسانی سے میرے قتل کا حکم صادر کر دیا تھا جیسے اُس نے خادم سے پانی مانگا ہو۔ اُس کا حکم سُنتے ہی طغرل اور ارغون اپنا اپنا ہلاکت خیز ہتھیار لیے محتاط انداز سے میری طرف بڑھنے لگے۔ میں نے بھی سردار سے نگاہیں ہٹا کر اپنی توجہ اُن پر مرکوز کر دی۔ اُنھوں نے اپنے اپنے ہتھیار پر گرفت تو مضبوط کر لی تھی مگر انھیں حملے کے لیے تولنا شروع نہیں کیا تھا۔ اس لیے مجھے یہ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ میں مدافعت کا کون سا انداز اپناؤں۔ میں نے پیٹی سے چاقو نکالنا چاہا مگر یہ سوچ کر رہ گیا کہ اگر مجھے چاقو سے وار کرنے کا موقع مل سکے گا تو میں چاقو کا کام بھی اپنے ہاتھوں سے لُوں گا۔ یہ ضروری نہیں کہ مدِمقابل کو جان سے مار ا جائے اور اگر دشمن کو مارنا ہی مقصود ہے تو اُسے ہاتھ کی ضرب سے بھی ختم کیا جا سکتا ہے۔ طغرل اور ارغون قدم قدم چلتے الاؤ کے قریب آ گئے۔ پھر ایک الاؤ کی دائیں اور دُوسرا بائیں جانب جانے لگا۔ اس وقت چاہتا تو دو قدم پیچھے ہٹ کر درختوں کے سائے کا فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ وہ لوگ مجھے نہ دیکھ پاتے مگر میں انھیں باآسانی دیکھ لیتا لیکن میری غیرت نے یہ گوارا نہ کیا۔ دُوسرے یہ موقع بھی ایسا تھا کہ مجھے اُن لوگوں پر دھاک بٹھانا تھی۔ میں جانتا تھا کہ فتح و شکست تو مقدر کا کھیل ہے اور میں اُن کے ہاتھوں مارا بھی جا سکتا ہُوں لیکن میں مرنے مارنے کا یہ کھیل مردانہ وار کھیلنا چاہتا تھا۔

طغرل اور ارغون اگرچہ بیک وقت میری طرف اس طرح بڑھ رہے تھے جیسے وہ پہلے بھی ایک ساتھ مل کر اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں انسانی شکار کھیلتے رہے ہوں لیکن اُن کی حرکات و انداز میں ہم آہنگی نہیں تھی اور یہی ایک بات میرے حق میں تھی ورنہ میں نہتا تھا جبکہ اُن کے پاس کلہاڑا اور گرز تھے۔

جب وہ مجھ سے چند قدم دُور رہ گئے تو طغرل نے کلہاڑا سر سے بلند کر لیا گویا وہ ایک ہی وار سے میرے دو ٹکڑے کر دینے کا آرزومند تھا جبکہ ارغون بڑی تیزی سے گرز گھمانے لگا۔ گرز کے دائرے میں آنے کا مطلب یہ تھا کہ جو چیز بھی اُس سے ٹکرائے، پاش پاش ہو کر رہ جائے۔ میں نے دیکھا کہ طغرل گرز کے دائرے سے بچتے ہوئے میری طرف بڑھ رہا ہے۔ پھر اُس نے بھی کلہاڑا گرز کی طرح گھمانا شروع کر دیا اور دو قدم آگے آ گیا۔ اب اگر میں پیچھے ہٹتا تو کلہاڑے کی زد میں آ سکتا تھا اور آگے بڑھتا تو گرز میری کھوپڑی یا ہڈیاں چُور کر سکتا تھا۔ یہ صورت حال انتہائی خطرناک اور ہلاکت آفریں تھی مگر گرز اور کلہاڑے کو باہمی تصادم

سے بچانے کے لیے وہ ایک دُوسرے سے دُور ہو گئے تھے جب وہ میرے اور نزدیک آ گئے تو میں سمجھ گیا کہ اب گردش کرتا ہُوا گرز اور کلہاڑا اُوپر نیچے دائرے بنائیں گے تاکہ ایک میرے سر اور دُوسرا میرے سینے کو نشانہ بنا سکے لیکن اس سے پہلے کہ وہ ایسا کرتے، میں برق رفتاری سے طغرل کی طرف جھکا، وہ ایک لمحے کے لیے بھونچکا سا رہ گیا کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ میں اپنے بچاؤ کے لیے پیچھے ہٹوں گا مگر میں خلافِ توقع آگے آ گیا تھا۔ پھر اُس نے یہ اندازہ لگاتے ہوئے کہ میرا سر کہاں ہوگا، وہاں کلہاڑے سے ضرب لگائی لیکن اُس وقت تک میں دوبارہ اُسی برق رفتاری سے پیچھے آ چکا تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے اپنا داؤ آزمانا تھا جونہی طغرل کا وار خالی گیا، میں نے اُسے کلہاڑا بلند کرنے کا موقع دیے بغیر سیدھے ہاتھ سے اُس کی کلائی پر کراٹے کی ضرب لگائی اور بڑے زور سے اُس کے پیٹ میں گھٹنا مارا مگر مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے میرا گھٹنا سیمنٹ کی بوری سے ٹکرا گیا ہو۔ طغرل یہ ضرب بھی برداشت کر گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر اُسے ذرا سا بھی موقع ملا تو وہ میرا کام تمام کر دے گا اس لیے میں نے گھومتے ہُوئے بڑے زور سے اُسے لات ماری جو اُس کے مُنہ پر لگنے کی بجائے سینے میں لگی اور وہ اُلٹ گیا۔ اس دوران ارغون جو محض اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے حملہ آور نہیں ہُوا تھا، اب تیزی سے میری طرف بڑھا۔ میں نے اُس پر بھی وہی داؤ آزمایا اور گرز کے دائرے سے نیچے جُھکائی دے کر اُس سے لپٹ گیا۔ شاید ارغون کا ایسی صُورت حال سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ بُری طرح گھبرا گیا اور اُس نے گرز دُوسرے ہاتھ میں لینا چاہا تو میں نے اُس کی کلائی پر ایک زوردار چاپ جڑ دی۔ وہ تلملایا تو ضرور مگر اُس نے گرز ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر اُوپر اُچھالا اور جب وہ گرنے لگا تو میں نے اُسے اپنے گھٹنے پر روکا تاکہ ریڑھ کی ہڈی پر ضرب لگنے سے وہ نڈھال ہو جائے لیکن وہ یہ ضرب برداشت کر گیا۔ اُس دوران میں طغرل کو اُٹھنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ کلہاڑا تولے میری طرف لپکا تو میں نے ارغون کو اُٹھا کر اُس پر دے مارا۔ دونوں بُری طرح آپس میں ٹکرائے، ارغون کے ہاتھ میں پکڑا ہُوا گرز طغرل کے بازو پر پڑا تو اُس کے مُنہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی ادھر ارغون بھی کراہے بغیر نہ رہ سکا کہ تصادم نے اُس کی بھی کئی پسلیاں توڑ دی تھیں۔ وہ دونوں زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ گرز تو الاؤ میں جا گرا مگر میں نے کلہاڑا اُٹھا لیا۔ اب میرے دونوں دشمن بے بسی سے میرے سامنے پڑے ہُوئے تھے۔ میں اُن کے قریب گیا، کلہاڑا سر سے بلند کیا مگر پھر اُس کے پھل کو زمین میں گاڑ کر اُس پر پاؤں رکھتے ہُوئے پلٹا اور بوڑھے سردار کی طرف دیکھنے لگا

بوڑھا سردار اب تک ہاتھ میں شمشیرِ برہنہ لیے کھڑا تھا مگر وہ اور اُس کا بیٹا دونوں حیرت زدہ سے تھے۔ سردار کے ایک جانب اُس کا ایک محافظ توڑے دار بندوق تھامے اشارے کا منتظر تھا۔ اب وہ لڑکی بھی وہاں آ چکی تھی جو مقابلے کے آغاز سے پہلے خیمے میں چلی گئی تھی۔ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی جھلک رہی تھی۔ باقی ماندہ آدمی بھی تعجب سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی پیٹی میں اُڑسا ہُوا چاقو نکالا، سردار کے سامنے سر کو ہلکا سا خم کیا اور چاقو اس طرح زمین پر رکھ دیا جیسے میں نے مقابلہ جیتنے کے باوجود ہتھیار ڈال دیے ہوں۔

یہ دیکھ کر بوڑھے سردار کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے تلوار نیام میں ڈالی اور میری طرف بڑھنے لگا۔ اُس کے بیٹے نے بھی تقلید کی اور جب وہ میرے قریب آ گئے تو سردار نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا ہاتھ تھاما تو وہ بولا "میرے دوست ... مگر نہیں، ابھی میں تمھیں دوست نہیں کہہ سکتا اور اُس وقت تک نہیں کہہ سکتا جب تک کہ شہنشاہِ دوراں ایسا کہنے کی اجازت نہ دے دیں۔ تم اجنبی ہو اور قوانینِ سلطنت کسی اجنبی کو دوست سمجھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ تاہم اتنا مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم منگول نہیں ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم واقعی بہادر ہو اور تم نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، وہ سچ ہی ہوگا۔ میں کلدانی جاگیر کا سردار نوروز ہُوں اور میرے بیٹے کا نام مہروز ہے۔ باقی سب میرے ملازم ہیں۔ تمھاری دلیری نے مجھے تم کو خوش آمدید کہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ خوش آمدید سرفروش۔"

●●

کچھ دیر بعد میں ایک خیمے کے دروازے پر بیٹھا گرم گرم قہوہ پی رہا تھا۔ اب میرے جسم پر چیتھڑوں کی بجائے اُونی فرغل اور گھیر دار شلوار تھی۔ یہ لباس ارغون یا طغرل کا تھا اور اب اُن کے لیے بیکار تھا کیونکہ دونوں اُسے استعمال کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ایک کا بازو ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا اور دُوسرے کی کئی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں اس لیے دونوں پٹیاں باندھے اپنے خیمے میں پڑے تھے۔

جونہی میرا پیالہ ختم ہُوا، میں نے اُسے اُس لڑکی کی طرف بڑھا دیا اور ایک بار پھر اُسے غور سے دیکھا۔ بڑی بڑی غزالی آنکھوں اور تیکھے نقوش والی وہ لڑکی سحر انگیز کشش رکھتی تھی۔ اُس نے جلدی سے میرا پیالہ بھر دیا جبکہ سردار نوروز بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ اس وقت تمھارے لیے بہتر لباس فراہم نہیں

کیا جاسکا لیکن مجھے اُمید ہے کہ اعلا حضرت شاہ ضرغام سے ملاقات سے پہلے ہم عمدہ لباس کا بندوبست کرلیں گے۔"

"یہ تو بتایئے سردار کہ آپ لوگ منگولوں سے اس قدر شدید نفرت کیوں کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ لٹیرے ہیں۔" مہروز نے جواب دیا۔ "جو سلوک انھوں نے تمھارے ساتھ کیے ہیں، وہی ہمارے سپاہیوں اور سرحد پر واقع بستیوں اور شہروں کے لوگوں کے ساتھ بھی کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلطنت بہرام کے لوگوں نے سرحدوں کے قریب رہائش ترک کردی ہے۔ یہ لٹیرے کبھی شبخون مارتے اور کبھی گھات لگا کر مردوں کو قتل کردیتے اور عورتوں کو اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔"

"شہنشاہ ضرغام نے اُن کے انسداد کے لیے کچھ نہیں کیا؟"

"شہنشاہ نے اُن شہروں اور بستیوں میں نئے لوگ بھیج دیے ہیں اور انھیں حکم دیا ہے کہ وہ لڑا کر منگولوں سے لڑتے ہوئے مرجائیں مگر راہِ فرار اختیار نہ کریں۔ جو لوگ مقابلہ نہیں کرتے اور فرار ہوجاتے ہیں، شہنشاہ انھیں اور اُن کی بیوی بچوں کو قتل کروا دیتا ہے، کبھی کبھی دوسروں کے لیے انھیں زندہ جلایا جاتا یا خونخوار درندوں کے سامنے چھوڑ دیا جاتا ہے۔"

"اوہ... تو ہم نے جو سُنا، وہ ٹھیک تھا۔"

"اور تم نے ہمارے شہنشاہ کے بارے میں کیا سُنا ہے؟"

"یہی کہ وہ سرحدوں کی حفاظت کے لیے اس قسم کے احکام جاری کرتا رہتا ہے۔"

"ہاں منگول اگر برابر کی تعداد میں ہوں تو ہمارے سامنے نہیں ٹک سکتے لیکن وہ اچانک اور بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ چونکہ ہمارے فوجیوں کو فرار ہونے کے بعد مرنا ہی پڑتا ہے۔ اس لیے وہ آخر دم تک منگولوں کا مقابلہ کرتے ہوئے تہِ تیغ ہو جاتے ہیں۔ شہنشاہ کے اس حکم کے نتیجے میں ہمارے لشکر کی تعداد روز بروز گھٹتی جارہی ہے جبکہ منگولوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔"

"اب سمجھ میں آیا کہ منگولوں کے خلاف شدید نفرت کا باعث کیا ہے۔" میں نے سردار کو جواب دیا اور دل میں شاہ ضرغام پر بھی نفریں کیے بغیر نہ سکا جو اپنے عوام اور سپاہیوں کی جانوں سے کھیل رہا تھا۔ کوئی ذی ہوش حاکم اس قسم کے احکامات جاری نہیں کرسکتا۔

"ہم تمھیں اس لیے منگول سمجھ رہے تھے کہ تم اُن کے علاقے سے آئے تھے۔" مہروز بولا۔ "ورنہ منگولوں میں تم جیسے قدآور لوگ نہیں ہوتے۔ مسلسل گھڑسواری کے باعث نوے فی صد منگولوں کی ٹانگیں کمانوں کی طرح خمیدہ ہوتی ہیں۔"

میں خاموش رہا۔

"اور وہ تمھاری طرح لڑنا جانتے ہیں، نہ انھیں اپنے دشمن پر رحم آتا ہے۔ تم چاہتے تو طغرل اور ارغون کے سر بھٹے کی طرح اُڑا دیتے مگر تم نے انھیں معاف کردیا۔" اس نے مزید کہا۔

"ہاں۔ انھوں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی مگر وہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے تو میں انھیں خواہ مخواہ زندگی سے محروم کیوں کرتا، اب میں سوچتا ہوں کہ بے چارہ ارغون ایک بازو سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا ہے۔ کاش میں اُس کی کوئی مدد کرسکتا۔"

"تم... تم اُس کی مدد کرنے کے متمنی ہو؟" سردار نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں سردار، اس حال میں پہنچنے میں اس کا ذاتی قصور نہیں ہے۔ میں یہاں ایک بے مایہ اجنبی ہوں اور نہیں جانتا کہ اس سرزمین پر کیسے اور کب تک رہ سکوں گا۔ ورنہ میں ارغون کو اپنے عملے میں رکھ لیتا، وہ ایک ہاتھ سے بھی بہت کچھ کرسکتا ہے۔"

"کیا تمھارے وطن میں نوکروں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے؟" مہروز نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا اور سوچا کہ یہاں غالباً اُن غلاموں کو قتل کردیا جاتا ہوگا جو کسی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہیں رہتے۔

"ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ البتہ سلطنتِ جزائر میں غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔" سردار نوروز نے بتایا۔ "بہرصورت میں کوشش کروں گا کہ ارغون کو جان سے نہ مارا جائے اور اُسے کسی ایسے کام پر لگا دیا جائے جسے وہ آسانی سے کرسکے۔ تمھارے لیے ایک خیمہ خالی کردیا گیا ہے۔ تم ہمارے ساتھ کھا پی تو سکتے ہو مگر قانون تمھیں ہمارے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔" یہ کہہ کر وہ باپ بیٹا اُٹھے اور اپنے خیمے کی طرف چلے گئے۔

●●

میں اپنے خیمے میں سمور دار کھالوں کے بستر پر سو رہا تھا کہ ایک ہلکی سی آہٹ نے مجھے جگا دیا۔ یہ آہٹ خیمے کے دروازے کا تسمہ کھولنے کی کوشش میں ہوئی تھی۔ کوئی باہر سے ہاتھ ڈال کر تسمہ کھولنے میں مصروف تھا۔ اگرچہ باہر پہرے دار موجود تھے لیکن خیمے میں آنے کی کوشش کرنے والے کو کسی نے نہیں روکا تھا۔ اس کا تو یہی مطلب ہوسکتا تھا کہ کوئی سردار نوروز کے ایما پر مجھے ختم کرنے کی نیت سے آنا چاہتا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے چاقو کے دستے پر ہاتھ رکھ دیا اور سوچا کہ کاش اس وقت میرے پاس چاقو سے بہتر ہتھیار ہوتا۔ عین اُس وقت تسمہ کھل گیا، دروازے کا پردہ ہٹا اور کوئی بڑی احتیاط سے اندر آنے لگا۔ میں نے چاقو تولا اور اس پر پھینکنے ہی والا تھا کہ ہاتھ روک لیا۔ خیمے میں داخل

ہونے والی وہی رقاصہ تھی مگر اُس کی آمد کا یہ انداز بھی مشکوک تھا اس لیے میں آہستہ سے اُٹھ بیٹھا۔ رقاصہ گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی میرے قریب آئی تو دروازے کے پھڑپھڑاتے ہوئے پردے سے الاؤ کی روشنی کے جھماکے میں مجھے بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"او شہزادے!" وہ بولی۔ "کیا آپ میرے خیرمقدم کو جاگ رہے ہیں؟"

"جاگ تو رہا ہوں لیکن تمھارے خیرمقدم کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمھاری آمد، مہمان نوازی کا ایک حصہ ہے یا کچھ اور؟"

"سردار نوروز نے مجھے مہمان نوازی کے لیے بھیجا ہے لیکن میرے آنے کا ایک اور مقصد بھی ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں لیکن اس بات کا علم سردار نوروز کو نہیں ہونا چاہیے ورنہ مجھے سخت سزا بھگتنا پڑے گی۔"

"تو پھر تمھیں یہ بات مجھے نہیں بتانا چاہیے تھی۔"

"نہیں شہزادے۔ یہ بتانا ضروری ہے۔ آپ اس سرزمین پر اجنبی ہیں اور ہر وہ اجنبی جو یہاں آتا ہے اُسے جلد یا بدیر موت سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے۔ قانون کے مطابق کسی اجنبی کا کوئی دوست نہیں ہونا چاہیے لیکن اس وقت یہاں آپ کے دو دوست موجود ہیں اور ان کا آپ کو علم ہونا چاہیے۔ شاید اس طرح آپ کی جان بچ جائے۔"

"میرے وہ دوست کون ہیں؟ کیا سردار اور اس کا بیٹا؟"

"نہیں۔ ایک دوست تو میں ہوں۔ فرزانہ میرا نام ہے۔ اپنی نانی کی نانی اور ماں کی ماں کی طرح میں کلدانی سرداروں کی کنیز ہوں اور آپ کا دوسرا دوست ارغون ہے۔ ارغون دراصل میرا سوتیلا بھائی ہے۔ میرے باپ نے ایک آزاد عورت سے شادی کی تھی اور وہ اُس کے بطن سے ہے۔ وہ غلام نہیں لیکن اگر یہ بات کسی کو معلوم ہوگئی کہ وہ کنیز کا بھائی ہے تو اُسے غلام بنا دیا جائے گا اور مجھے اس بات کی کڑی سزا دی جائے گی کہ میں نے اس حقیقت کو اب تک کیوں چھپائے رکھا۔ میں اور ارغون دونوں آپ کے تہِ دل سے شکرگزار ہیں کیونکہ آپ نے اُسے جان سے نہیں مارا۔ اب وعدہ کیجیے کہ آپ یہ راز کسی کو نہیں بتائیں گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارا راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔"

اتنا سُنتے ہی اُس نے اپنی بانہوں کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔

●

صبح جب میری آنکھ کھلی تو سردار نوروز کے ملازم سفر کی تیاری میں مصروف تھے۔ میں نے فرزانہ کو جگایا اور جب وہ چلی گئی تو میں بھی اپنے خیمے سے باہر نکل آیا۔ میرے میزبان ناشتے پر میرا انتظار کررہے تھے۔ ہم نے مل کر ناشتہ کیا اور اگلی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔

جنگل کے درمیان سے گزرنے والا یہ کچا راستہ بہت خراب تھا۔ اردگرد کوئی آبادی تھی نہ جانوروں کے لیے چارہ دستیاب ہوسکتا تھا۔ موسمی حالات بھی سال میں چھ ماہ بہت خراب رہتے تھے۔ شہنشاہ ضرغام نے جان بوجھ کر اس علاقے میں چوکیاں نہیں بنوائی تھیں۔ یہ علاقہ اپنی مشکلات کے باعث بذاتِ خود ایک دفاعی حصار کا کام دیتا تھا۔

ہم مسلسل سفر کرتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ ارغون کو ایک ہاتھ سے گھوڑے کی لگام تھامنا پڑ رہی ہے اور راستے کی اونچ نیچ سے اُس کے شکستہ بازو میں درد کی ٹیسیں اُٹھنے لگتی ہیں لیکن سفر ناگزیر تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قانون کے مطابق ہر سردار کو تین سالوں میں ایک بار شہنشاہ کی خدمت میں حاضری دینا لازمی تھی اور جو سردار ایسا نہیں کرتا تھا، اُسے باغی تصور کرتے ہوئے جان سے مار دیا جاتا تھا چنانچہ سردار نوروز اور مہروز شاہ، شاہ ضرغام کی سلامی کے لیے جارہے تھے جو آج کل سلطنت کے جنوبی حصے کے ایک قلعے میں فروکش تھا! انھیں یہ دشوار گزار راستہ محض اس لیے اختیار کرنا پڑا تھا کہ وہ جلد از جلد شہنشاہ کی خدمت میں حاضری دینا چاہتے تھے اور یہ راستہ نسبتاً مختصر تھا۔ اگر اُنھیں سلامی دینے میں تاخیر ہوجاتی تو بھی وہ سزا کے مستحق ٹھہرتے۔

مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوتی تھی کہ اس سلطنت میں کون سا جرم ایسا ہے جس پر سزائے موت نہیں دی جاتی۔ بس یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں شاہ ضرغام بلا اجازت مملکت میں داخل ہونے پر مجھے سزائے موت کا مستوجب قرار نہ دے دے لیکن پھر اس خیال سے دل کو دلاسا دے لیا کرتا کہ میں اُن سرداروں کے ساتھ جارہا ہوں جو سلطنت بہرام اور شاہ ضرغام کے وفاداروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

تین روز کے اس سفر میں مجھے بارہا یہ خیال بھی آیا کہ میں گھوڑے سمیت فرار ہوجاؤں لیکن ہر بار یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا کہ جنگل میں کب تک چھپا رہ سکوں گا۔ دوسرے کہستان کے منگول بھی تو شہنشاہ ضرغام سے کم خونخوار نہیں ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں فرزانہ سے مشورہ کیا تو اُس نے کہا: "ایسا کبھی نہ کرنا شہزادے، ورنہ آپ کو جاسوس تصور کرلیا جائے گا۔ شاہ ضرغام، سردار مہروز کو یرغمال بنا کر سردار نوروز کو حکم دے گا کہ وہ آپ کو تلاش کرلائے۔ آپ کی تلاش میں ناکام ہونے والا فوجی دستہ، سردار نوروز اور مہروز قتل کردیے جائیں گے اور اگر انھوں نے آپ کو تلاش کرلیا تو بھی آپ اور سردار جان سے مار دیے جائیں گے۔" اتنا کہہ کر اُسے جھرجھری آگئی۔ "آپ اُس موت کا تصور بھی نہیں کرسکتے شہزادے... پہلے آپ کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلائی پھیر دی جائے گی۔ پھر آپ کے جسم پر شہد لگا کر چیونٹیوں کے بل کے پاس ایک کھمبے سے باندھ دیا جائے گا۔"

یہ سُن کر مجھے بھی جھرجھری آگئی۔

●

چوتھے روز ہم جنگل سے نکل کر میدانی علاقے میں سفر کرنے لگے۔ اب ہمارا رُخ قدرے شمال کی طرف تھا۔ اس وقت شاہ ضرغام جس قلعے میں قیام پذیر تھا، وہ بحرِ سیمیں کے ساحل پر واقع تھا اور بحرِ سیمیں مشرق کی جانب ایک ہزار میل تک پھیلا ہُوا تھا۔

میدانی علاقے میں ہمیں متعدد آبادیاں اور شہر دکھائی دیے جس شہر میں فوجی چھاؤنی ہوتی، اُس کے گرد فصیل پر چھوٹی بڑی توپیں اور پہرے دار دکھائی دیتے تھے لیکن جہاں جہاں فوجی چھاؤنیاں نہیں تھیں، وہاں کی فصیلیں خستہ اور ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ فرنازہ نے بتایا کہ "ہمارا شہنشاہ کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔ اُسے نہ اپنے فوجی کمان داروں پر بھروسہ ہے نہ سرداروں پر۔ عوام کو تو ہتھیار رکھنے کی اجازت ہی نہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ چاقو رکھ سکتے ہیں۔" اس پر مَیں نے پُوچھا "کیا لوہاروں پر بھی اس قسم کی پابندی عائد ہے؟"

"سارے لوہار حکومت کے ملازم ہیں۔ وہ کسی کو ہتھیار فراہم نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی لوہار اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اُس کے مُنہ میں پگھلا ہُوا سیسہ ڈال دیا جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ شہر اور آبادیاں جہاں فوجی چھاؤنیاں نہیں ہیں منگولوں یا کسی دُوسرے دشمن سے اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔"

"ہاں" وہ دُکھ سے بولی "لوگوں کو شہروں کی فصیلیں مرمت کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ دو سال پہلے ایک شہر کے لوگوں نے ٹوٹی ہُوئی فصیل کی مرمت کی تھی۔ شہنشاہ ضرغام نے شہر کے سربرآوردہ لوگوں پر تشدد کروا کے زبردستی یہ اعتراف کرا لیا کہ وہ اُس کے خلاف بغاوت کرنا چاہتے تھے اور اُن کا یہ اعتراف اُن کی موت بن گیا۔"

"اور اس شہر کے باقی لوگ چُپ چاپ یہ ظلم برداشت کر گئے؟"

"وہ بھی شہنشاہ کی عقابی فوج کی غارت گری کا نشانہ بن گئے۔ عقابی فوج مظالم اور خوں ریزی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اُس نے عوام کو قتل کیا، اُن کے گھروں کو آگ لگا دی اور اُن کے اندوختے لُوٹ لیے۔"

یہ تفصیل جان کر مَیں اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہ رہ سکا کہ شاہ ضرغام ایک جنُونی قسم کا خونخوار اور ظالم ترین آدمی ہے۔ اُسے تو یہ چاہیے تھا کہ وہ سرحدی علاقے کے لوگوں کو خود ہتھیار فراہم کرتا تاکہ وہ منگولوں کے خلاف مدافعت کر سکیں۔ اس کے برعکس اُس نے عوام کو ظلم و ستم کا نشانہ بنانے کے لیے خصوصی عقابی فوج تیار کر رکھی تھی اور اب مجھے اسی ظالم جنُونی کے سامنے پیش کیا جانا تھا۔

●

چھٹے روز ہم منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔

یہ کوئی شہر نہیں بلکہ ایک فوجی کیمپ تھا۔ چمنیوں سے بلند ہوتا گاڑھا دھواں یہ بتا رہا تھا کہ وہاں ہتھیار ڈھالے جا رہے ہیں۔ دیوار کے باہر بڑی بڑی توپیں رکھی ہوئی تھیں بغیر پہیوں کے۔ اُنھیں تختوں پر رکھ کر گھسیٹا جاتا ہوگا اور یہ صورتِ حال فوجی کارروائی کو سُست کر دیتی ہوگی۔ ایسا لگتا تھا کہ شاہ ضرغام اُن سے بھرپور فائدہ اُٹھانے کی بجائے اُن کی نمائش سے خوش ہوتا ہے۔

ہم کہیں رُکے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے۔ اتنے میں ایک فوجی دستے نے ہمارے دائیں بائیں چلنا شروع کر دیا۔ تقریباً سارے فوجی قدآور اور مضبوط و توانا تھے۔ اُن کے چہروں سے برستی ہوئی خشونت اس بات کی مظہر تھی کہ وہ عقابی فوج سے تعلق رکھتے ہیں۔

کیمپ سے گزرنے کے بعد ہم تقریباً ایک گھنٹہ سفر کرتے رہے۔ اب ہمارے سامنے سرسبز پہاڑیاں تھیں اور اُن کے دامن میں بڑے بڑے سفید مکانات بنے ہُوئے تھے۔ ہر مکان کا اپنا ایک باغیچہ تھا جگہ جگہ مصنوعی جھیلیں بنی ہُوئی تھیں جن کے اردگرد خوشنما پھُول لگے ہُوئے تھے۔ ان پھُولوں کی وجہ سے فضا میں خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ کچھ اور آگے بڑھے تو ایک پہاڑی پر سُرخ پتھروں کا ایک اہرام بنا ہُوا تھا۔ اس اہرام کی چوٹی پر ایک چوبی محل تعمیر کیا گیا تھا اور محل کی چھت پر بہت سے نیزے گڑے ہُوئے تھے جن پر لاتعداد انسانی سر آویزاں تھے۔ ان میں سے کچھ سر تازہ کٹے ہُوئے دکھائی دیتے تھے۔ کچھ کو چیل کوؤں نے آدھا نوچ لیا تھا اور باقی ہڈیوں میں بدل چکے تھے جن کے کھُلے ہوئے جبڑے اور آنکھوں کے گڑھے بڑے ہیبت ناک نظر آتے تھے۔

وہ راستہ جس پر ہم جا رہے تھے، ہمیں اُسی پہاڑی پر لے گیا۔ جب ہم اُوپر پہنچے تو پتہ چلا کہ چوٹی پر بنی ہوئی عمارت اچھا خاصا قلعہ ہے۔ اس کے چاروں طرف مضبوط فصیل تھی جس میں بارہ بُرج بنے ہُوئے تھے۔ فصیل کے درمیان بنی ہُوئی عمارت چوکور تھی اور اُس کے چاروں کونوں پر فصیل کے بُرجوں سے بھی زیادہ اُونچے بُرج تعمیر کیے گئے تھے۔ مَیں ابھی پُورے ماحول کا جائزہ بھی لے نہیں پایا تھا کہ سردار نوروز نے آہستہ سے مجھے کہا "ہم فصیل کے صدر دروازے پر گھوڑوں سے اُتر کر داروغۂ محل کے پاس جائیں گے، اپنے ہتھیار اُس کے حوالے کریں گے، پھر نہا دھو کر اور عمدہ لباس پہن کر باریابی کے منتظر رہیں گے کہ شاہِ شاہاں کب ہمیں قصرِ خونیں میں طلب فرماتے ہیں۔"

"قصرِ خونیں؟"

"ہاں۔ شہنشاہ نے اپنے محلات کے نام ایسے ہی رکھے ہیں خانۂ

مرگ، خانۂ شمشیر دستان، پنجۂ عقاب، چاہِ عذاب وغیرہ وغیرہ۔۔ قصرِ خونیں سلطنتِ بہرام کا مضبوط ترین قلعہ ہے۔ پانچ ہزار غلاموں نے دس سال تک شب و روز اس کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ تین سال پہلے مکمل ہُوا اور شہنشاہ کا کہنا ہے کہ پچاس ہزار کا لشکر بھی اسے تسخیر نہیں کر سکتا۔"

"ہاں۔ یہ بات مَیں نے سلطنتِ آریانہ میں بھی سُنی تھی اور یہ بات صداقت پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔"

جب ہم داروغۂ محل، جسے قلعہ دار کہنا چاہیے، پہنچے تو اُس نے میری طرف بڑی چبھتی ہُوئی نگاہوں سے دیکھا۔ سردار نوروز نے اسے بتایا کہ مَیں سلطنتِ آریانہ کا شہزادہ ہُوں اور وہ مجھے شہنشاہ ضرغام کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لایا ہے۔

"میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس آدمی کو سردار نوروز لایا ہے اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا، اس کا فیصلہ شہنشاہ عالم پناہ ہی فرما سکتے ہیں لیکن اگر یہ شہزادہ ہے تو اسے شایانِ شان لباس میں اعلیٰ حضرت کے سامنے جانا چاہیے۔" قلعہ دار بولا۔

چنانچہ نہانے دھونے اور میرے لیے "شایانِ شان" لباس فراہم کرنے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ مَیں نے اپنی پیٹی اور چاقو داروغہ کے حوالے کر دیا تاکہ میرے اور اس کے درمیان اعتماد کی فضا قائم ہو سکے۔ پھر نئے لباس میں سردار نوروز اور مہروز کے ساتھ شہنشاہ ضرغام کی خدمت میں حاضر ہونے چل دیا۔

اہرام کی سیڑھیاں کافی اُونچی تھیں۔ اس لیے اُنھیں عبور کرتے وقت خاصی دقت ہو رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ شاہ ضرغام نے جان بُوجھ کر ایسی سیڑھیاں بنوائی تھیں تاکہ جب کوئی اُس کے حضور پیش ہو تو اُس میں اتنا دم ہی نہ رہے کہ وہ کوئی غلط حرکت کر سکے۔

اندرونی عمارت کی دیواروں کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر توپیں رکھی ہوئی تھیں اور چھت سے بھی اُن کی نالیں جھانکتی نظر آ رہی تھیں۔ ایک بُرج کے دروازے پر پہنچ کر سردار نوروز نے دروازے کے بیچ لٹکنے والی طلائی زنجیر کھینچی تو اندر کہیں بہت دُور گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھُلا تو مَیں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دروازے کے سامنے کوئی راستہ نہیں بلکہ ایک سنگی دیوار تھی البتہ اس دیوار کے قدموں میں ایک چوکور موکھا سا بنا ہُوا تھا جس سے نیچے جانے والی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ سیڑھیاں ہمیں ایک سُرنگ کے دہانے پر لے آئیں جو خاصی طویل تھی اور بتدریج اُوپر جا رہی تھی۔ سُرنگ کے دُوسرے سرے پر مجھے ایک قندیل یُوں ٹمٹماتی نظر آئی جیسے بہت دُور جگنو چمک رہا ہو۔

کافی دیر بعد جب ہم وہاں پہنچے، جہاں قندیل جل رہی تھی تو ہمارے پیچھے دروازہ بند ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی قندیل بھی بجھ گئی۔ خدا جانے یہ اتفاق تھا یا کوئی حفاظتی اقدام۔ سردار نوروز بولا "میرا غل پکڑ لو اور چُپ چاپ چلے آؤ۔"

مَیں نے سردار کا غل تھام لیا اور وہ دیوار ٹٹول کر آگے بڑھنے لگا۔ اب ہم پھر ایک سُرنگ سے گزر رہے تھے۔ یہ سُرنگ بھُول بھلیاں قسم کی تھی۔ یہ سُرنگ ہمیں ایک چوکور کمرے تک لے آئی۔ یہ کمرہ بے حد وسیع و عریض تھا اور اس کے چھت کے گنبد سے روشنی کا ایک دھارا سا پھُوٹ رہا تھا۔ یہ دھارا آئینوں کے انعکاس کا نتیجہ تھا جنھیں ایسے زاویوں سے نصب کیا گیا تھا کہ غروبِ آفتاب تک وہ اُس کی کرنوں کو اس وسیع کمرے میں منتقل کر سکیں۔ کمرے کا فرش سُرخ اینٹوں سے بنا ہُوا تھا لیکن دیواریں سنگِ سفید کی تھیں۔ کمرے کے عین وسط میں سنگِ سیاہ کا ایک تخت بچھا ہُوا تھا اور اس تخت پر بہت چوڑے شانوں والا ایک آدمی اس طرح بے حس و بے حرکت بیٹھا تھا جیسے وہ انسان نہیں مجسمہ ہو۔ اُس کا سر مُنڈا ہُوا تھا مگر بیچوں بیچ گائے کی دُم جیسی ایک چوٹی اُوپر کو اُٹھی ہُوئی تھی۔ مَیں نے سوالیہ نگاہوں سے سردار نوروز کی طرف دیکھا تو اُس نے سر کی خفیف جنبش سے اثبات میں اشارہ کر دیا جس کا یہ مطلب تھا کہ ہاں۔ وہی شہنشاہ ضرغام ہے۔ پھر وہ نگاہیں جھُکا کر تخت کی طرف بڑھ گیا۔ مَیں اور سردار مہروز اُس کے پیچھے پیچھے تھے۔

ضرغام کے دائیں پہلو میں مرصع نیام والی ایک خمدار تلوار رکھی ہُوئی تھی اور بائیں جانب پھینکنے والے تین عدد چھوٹے بھالے۔ اُس کی پیٹی میں تین عدد خنجر بھی اُڑسے ہُوئے تھے۔ وہ چشم زدن میں بادشاہ سے جنگجو فرد بن سکتا تھا۔ اس کمرے کے چاروں کونوں میں عقابی فوج کے چار چار جوان بھی سنگی مجسموں کی طرح بے حس اور بے حرکت کھڑے تھے۔ اُن میں سے تین تین جوان تو تلواروں اور خنجروں سے مسلح تھے جبکہ چوتھا تیر انداز تھا۔

تخت سے تقریباً دس قدم دُور سردار نوروز اور مہروز فرش پر مُنہ کے بل تقریباً لیٹ گئے اور فرش پر آہستہ آہستہ ٹکّے مارنے لگے۔ مَیں نے بھی اُن کی تقلید کی کہ شاہ ضرغام کو کورنش بجا لانے کا یہی طریقہ تھا۔

"یہ احمق کون ہے جس نے ہمارے سامنے سرنگوں ہونے میں تاخیر کر دی؟" ضرغام میری طرف اشارہ کرتے ہُوئے گرجا "اور تم نے اسے ہمارے حضور لانے کی حماقت کیوں کی سردار نوروز؟"

سردار نوروز شاہ ضرغام کی بات پر لرزنے لگا اور بولا: "یہ اجنبی ہے عالی جاہ۔ جب ہم جنگل سے گزر رہے تھے' یہ ہم سے ملا اور اس نے بتایا کہ سلطنت آریانہ کا شہزادہ ہے جو کہستانِ منگول کے اُس پار کہیں واقع ہے۔"

"ہم نے آج تک کسی ایسی سلطنت کا نام نہیں سُنا۔"

"آپ کا ارشاد بجا ہے عالم پناہ۔ بندہ تو صرف اس اجنبی کے الفاظ دُہرا رہا ہے۔ کیا غلام اپنا بیان جاری رکھے عالی جاہ؟"

"ہاں۔ ما بدولت جاننا چاہتے ہیں کہ کلدانی سردار ایسے اجنبی کو کیوں لیے پھرتا ہے جو ہمیں دُنیا کا سب سے بڑا دروغ گو معلوم ہوتا ہے۔"

مجھے ضرغام کے ان الفاظ سے صاف اندازہ ہو گیا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا اور اُس کی ناپسندیدگی کسی بھی فرد کے لیے موت کا پیغام ہوتی تھی۔ وہ مجھے خونریزی نہیں نیم دیوانہ بھی معلوم ہُوا جو ایک جنبشِ ابرو سے ہم تینوں کو دنیں جان سے مروا سکتا تھا۔

سردار نوروز نے اپنی تمام تر ہمت سمیٹ کر اُسے وہ رُوداد سُنا دی جو میں نے بیان کی تھی اور جو کچھ پہلی ملاقات میں ہُوا تھا وہ بھی بیان کر دیا۔ شاہ ضرغام کچھ نہ بولا اور خاموش بیٹھا ہمیں خونخوار نگاہوں سے گھورتا رہا۔ پھر اُس نے اچانک تالی بجائی اور اس گمبھیر خاموشی میں تالی کی آواز کسی توپ کے گولے کی مانند گونج اٹھی۔ تالی کی آواز سُنتے ہی عقابی فوج کے آٹھ جوان ہمارے دائیں بائیں آ گئے۔ شاہ ضرغام بھی اپنی تلوار میان سے نکال کر اس سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے گرجا۔

"یہ اجنبی اپنے آپ کو شہزادہ کہتا اور بتاتا ہے کہ یہ ہمارے طور طریقے سیکھنے آیا ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔ ہم نے کبھی سلطنتِ آریانہ کا نام نہیں سُنا۔ اس لیے یہ شہزادہ نہیں ہو سکتا۔ پرخچے اڑا دو اس کے۔"

سپاہیوں نے اپنی تلواریں نیام سے نکال لیں۔ عین اُس وقت سردار نوروز گھٹنوں کے بل بیٹھتے اور بھیک کے انداز میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا: "رحم۔ عالی جاہ رحم۔"

شاہ ضرغام اسے تند نگاہوں سے گھورتا رہا۔ سپاہیوں نے تلواریں سر سے بلند کر لیں۔ تیر اندازوں نے تیر چلّے پر چڑھا لیے۔ وہ اشارے کے منتظر تھے کہ ضرغام نے تین بار اثبات میں سر ہلا دیا اور بولا: "ہم جاننا چاہتے ہیں کہ تم نے اس اجنبی کے لیے رحم کی درخواست کیوں کی؟"

"ممکن ہے یہ اجنبی جھوٹ بولتا ہو عالم پناہ لیکن ہمارے ساتھ دورانِ سفر اس نے آئینِ سلطنت کی خلاف ورزی کی ہے نہ حضور کی شان میں کوئی غلط بات کی ورنہ اسی وقت اس کی گردن مار دی جاتی۔ یہ چاہتا تو میرے دو جنگجو جوانوں کو قتل کر سکتا تھا مگر اس نے اُن کی جاں بخشی کی اور اب وہ منگولوں کے خلاف لڑ کر قوم و وطن کی خدمت کر سکتے ہیں۔"

"کیا اس نے انھیں شکست دینے کے بعد اُن کی جاں بخشی کی تھی؟"

"جی ہاں جہاں پناہ۔"

"پھر تو یہ شخص نرا احمق ہے۔ اگر سلطنت آریانہ کا کوئی وجود ہے تو وہاں کے شہزادے پاگل ہیں اور جب یہ شخص پاگل ہے تو ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کیا یہ واقعی بہادر جنگجو ہے؟"

"میں نے ایسا دلیر جنگجو اپنی ساری زندگی میں نہیں دیکھا عالم پناہ۔"

"ہم تمھاری بات پر یقین فرماتے ہوئے اسے اپنی بحریہ کے ملاحوں میں شامل کیے لیتے ہیں۔ اسے بحرِ سیمیں پر ہمارے بحریے میں بھیج دیا جائے اور اگر یہ پاگل وہاں اپنے آپ کو شہزادہ سرفروش کہلوانا چاہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

یہ سُنتے ہی چار سپاہیوں نے مجھے گھیر لیا اور باہر لے جانے لگے۔ میں نے جاتے جاتے سُنا۔ ضرغام سردار نوروز سے کہہ رہا تھا: "تم نے ہمارے سامنے جرأت سے کام لیتے ہوئے جس طرح اس پاگل کی وکالت کی ہے وہ ہمیں ناگوار گزری ہے۔ اس لیے ہم تمھیں تھوڑی سی سزا دینے پر مجبور ہیں۔ دس روز کے اندر اندر کلدانی قبیلے کے پچاس جنگجو، پچاس غلام اور پچاس کنیزیں ہمارے پاس بھجوا دی جائیں۔ پانچ سال بعد ان سب کو واپس بھیج دیا جائے گا۔"

شاہ ضرغام کے اس احمقانہ حکم پر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ نیم دیوانہ ہے اور اُسے سلطنتِ بہرام کی رعایا پر مزید ظلم و ستم کا موقع نہیں ملنا چاہیے لیکن میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں اپنی جان پر کھیل کر اسے ختم بھی کر دیتا تو اس کا عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ منگول اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر سلطنت پر قابض ہو جاتے اور رعایا کے ساتھ ضرغام سے بھی زیادہ بُرا سلوک کرتے۔ اس لیے میں نے ضرغام کے خلاف ساری سوچیں اس وقت تک ملتوی کر دیں جب تک کہ اُس سے بہتر وارث تخت و تاج نہ مل جائے۔

میں اس سے پہلے بھی کئی بار غلام بنایا جا چکا تھا اور اب تک زندہ تھا اس لیے میں نے سوچا کہ اب کے بھی مجھے اپنے آپ کو اچھا غلام ثابت کرنا چاہیے اور اس موقعے کا منتظر رہنا چاہیے جب اس سلسلے میں کوئی ٹھوس اور عملی اقدام کیا جا سکے۔

●●

اس رات مجھے قصرِ خونیں کے باہر ایک تنگ و تاریک زنداں میں

بس کر دیا گیا۔ صبح معمول سے ناشتے کے بعد عقابی فوج کے چار سپاہی ریں اور بیڑیاں لیے وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے میرے پاؤں میں یاں اور ہاتھوں میں زنجیر ڈال کر مجھے اس زنداں سے باہر نکالا اور ایسی جگہ لے آئے جہاں پہلے سے قیدیوں کی ایک قطار موجود تھی۔ نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو مجھے ایک دیوار پر ارغون کھڑا دکھائی دیا۔ وہ ہماری طرف ہی دیکھ رہا تھا مگر ہم نے ایک دوسرے کو کوئی اشارہ کہ وہ ہم دونوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

ہم زنجیروں میں جکڑے دن بھر دھوپ اور دھول میں سفر کرتے دو مرد اور ایک عورت چلتے چلتے گر پڑی۔ سپاہیوں نے انھیں زنجیروں آزاد کیا، سڑک کے کنارے لے گئے اور ان کے سر تن سے جدا کر دیے۔ مجھے اُن کے قتل پر حیرت نہ ہوئی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ قتل کرنے سے پہلے کوئی اذیت نہ دی گئی۔ شاید اذیت رسانی کے میں صرف شاہ ضرغام ہی مبتلا تھا۔ اس صورتِ حال میں اگر مجھ سے غلطی سرزد نہ ہو تو میں اذیت کے عذاب سے بچ سکتا تھا۔

غروبِ آفتاب کے بعد ہمیں رُوکھا سُوکھا کھانا اور پانی دیا گیا پھر زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک کھلی جگہ گھاس پر سُلا دیا گیا تاکہ دوسرے دن سفر جاری رکھ سکیں۔ دوسری صبح گارڈز کی نئی ٹولی آ اپنے ساتھ مزید چار قیدی بھی لے آئی۔

ہم دس روز تک تقریباً بیس میل فاصلہ یومیہ طے کرتے رہے۔ دو تین قیدی تھکن کے مارے گر پڑتے اور قتل کر دیے جاتے تھے۔ میرے لیے بیس میل چلنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ گیارھویں دن کنارے جا پہنچے۔ یہاں ہمیں نہانے کی اجازت دی گئی اور جب ہو چکے تو اُن غلاموں کو ہم سے الگ کر دیا گیا جنھیں منڈی میں کیا جاتا تھا۔ باقی غلاموں کو بندرگاہ گومانی پر شاہی بحریے میں نے کے لیے بھیج دیا گیا۔ یہاں ضروری کارروائی اور اندراجات ہماری زنجیریں اور بیڑیاں کھول دی گئیں اور ہمیں غلاموں کی بڑی بیرک میں جگہ دے دی گئی۔

اس بیرک میں ایسے غلام بھی رہتے تھے جنھیں شاہی بحریے کرتے ہوئے سالہا سال گزر گئے تھے۔ وہ نئے غلاموں کے کا جواب نہیں دیتے تھے اور بعض اوقات سوال کنندہ پر ہاتھ سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے اس لیے میں نے اپنی زبان کان کھلے رکھے اور جتنی بھی معلومات اس طرح حاصل ہو سکتی کرتا رہا۔ ان معلومات کے مطابق بندرگاہ گومانی بحرِ سیمیں کے میں واقع تھی اور شمال میں بحرِ یاقوت تھا۔ ان دونوں سمندروں آپس میں ملاتی تھی جسے خلیج الجزائر کہتے تھے۔ بحرِ سیمیں کے

مشرق میں پانچ چھوٹی چھوٹی مملکتیں قائم تھیں جنھیں امارتِ خمسہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ سب مل کر مملکتِ بہرام کے نصف کے برابر بھی نہیں تھیں۔

مجھے یہ بھی معلوم ہُوا کہ سو سال پہلے ضرغام کے جدِ امجد نے سلطنتِ بہرام کے حکمرانوں سے حکومت چھین کر انھیں اماراتِ خمسہ کی طرف فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُن دنوں اُس کی بحریہ موجودہ بحریے سے پانچ گنا بڑی تھی اور بندرگاہ گومانی کی یہ بیرکیں اُسی زمانے میں تعمیر ہوئی تھیں۔

خلیج الجزائر پر بحری قزاق قابض تھے۔ وہ کبھی بحرِ سیمیں میں سے گزرنے والے جہازوں کو لُوٹ لیا کرتے تھے اور کبھی بحرِ یاقوت کے جہازوں کو۔ شاہ ضرغام محض ان قزاقوں کی وجہ سے بحریہ کو وسعت دینے پر مجبور ہو گیا تھا کیونکہ وہ منگولوں کا مقابلہ کرنے کی وجہ سے اپنی سپاہ کو ساحل کی نگرانی کے لیے نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس لیے قزاقوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ وہ اچانک آتے اور بحریے کے جہاز لے جاتے تھے۔

اب بندرگاہ گومانی میں نئی جنگی کشتیاں اور جہاز تیار کیے جا رہے تھے اور روزانہ سلطنت کے مختلف حصوں سے غلام یہاں پہنچ رہے تھے۔ یہ حالات میرے لیے بہت سازگار تھے۔ اگر قزاقوں سے مقابلہ ہو جاتا اور میں اس میں اپنے جوہر دکھا سکوں تو مجھے آزادی مل جانے کا امکان تھا۔

ایک ہفتے بعد ہمیں مختلف جنگی کشتیوں پر متعین کر دیا گیا۔ یہ کشتیاں یک منزلہ تھیں اور انھیں دونوں جانب سے پچاس پچاس غلام کھیتے تھے۔ ہر کشتی پر بادبانوں کے لیے دو دو مستول بھی نصب تھے۔ اُن کے اگلے حصوں پر بڑی اور پچھلے حصوں پر چھوٹی توپیں لگی ہوئی تھیں۔ کشتیوں کا درمیانی حصہ پتھر برسانے والی منجنیقوں کے لیے مخصوص تھا۔

غلاموں کے نگران ظالم اور اذیت پسند نہیں تھے لیکن چپو چلاتے وقت بھی غلاموں کو زنجیروں سے آزاد نہیں کیا جاتا تھا۔ اگر غلام مسلسل حکم عدولی کرتے یا باغی ہو جاتے تو انھیں سمندر میں پھینک دیا جاتا تھا جس میں شارک مچھلیوں کی بہتات تھی۔ مجھے جس کشتی پر متعین کیا گیا اس کا نام "کہسار" تھا۔ کبھی چند کشتیاں جنگی مشقیں کرتی تھیں اور کبھی پورا بیڑا ان مشقوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ ان مشقوں کے دوران ایک بار دو کشتیاں اس بُری طرح آپس میں ٹکرائیں کہ ایک تو اپنے ملاحوں سمیت فوراً ڈوب گئی اور دوسری کو بمشکل بندرگاہ تک لایا جا سکا۔ اُس شب میں سوچتا رہا کہ یہ حادثہ "کہسار" کو بھی پیش آ سکتا تھا اور آئندہ آ سکتا ہے کیا میرا جسم بھی شارک مچھلیوں کی غذا بن جائے گا؟ جب ہماری کشتی

کنارے پر آئی تو کسی نے کپتان کو پکارتے ہوئے کہا: "تمہارا مزید عملہ آگیا ہے کپتان۔ چھ ملاح۔ ایک ترکھان اور ایک مددگار باورچی۔"

میں نے دیکھا ان آنے والوں میں ارغون بھی شامل تھا جس کا ایک بازو بے کار ہو چکا تھا مگر دوسرے کندھے پر ایک کلہاڑا لٹک رہا تھا۔ اُسے باورچی کے مددگار کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آسکا کہ اس کی آمد اتفاق پر مبنی ہے یا سردار نوروز نے اُسے جان بُوجھ کر یہاں بھجوایا ہے۔ میں نے ایک بار پھر ارغون کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا میری پیٹی اُس نے کمر سے باندھ رکھی تھی اور اُس میں میرا شکاری چاقو اُسی طرح اُڑسا ہُوا تھا۔ کلہاڑے اور چاقو کی موجودگی اس بات کی مظہر تھی کہ وہ غلام کی نہیں بلکہ ایک آزاد ملازم کی حیثیت سے کام کرے گا کیونکہ غلاموں کو کوئی ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔

جب میں کشتی سے اُتر کر جانے لگا... تو ارغون کی طرف دیکھنا بھی مناسب نہ سمجھا بلکہ چاہا کہ وہ بھی میری طرف نہ دیکھے۔ ہمارا ایک دُوسرے کی طرف دیکھنا یا کوئی اشارہ کرنا ہمیں مشکوک بنا دیتا اور ہم دونوں قابلِ تعزیر گردانے جاتے۔

●●

اب میں اور ارغون ایک ہی کشتی پر کام کر رہے تھے۔ میں اُسے کشتی پر مختلف کام کرتے دیکھتا تھا۔ وہ ایک بازو سے دو آدمیوں کے برابر کام کر سکتا تھا۔

ایک صبح غلاموں کو حکم دیا گیا کہ وہ پُوری کشتی کو اچھی طرح دھوئیں اور جہاں جہاں ضروری ہو، وہاں وہاں رنگ و روغن کریں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ ضرغام بذاتِ خود بحریہ کا معائنہ کرنے کے لیے آنے والا تھا۔

معائنے والے روز ساری کشتیاں اور جہاز بندرگاہ سے ایک میل دُور سمندر میں قطار کی صُورت لنگر انداز ہو گئے۔ یہ قطار تقریباً چار میل طویل تھی۔ ہر آدمی اپنی جگہ چاق و چوبند تھا۔ دوپہر بعد ساحل سے بگل اور نقارے کی آواز آنے لگی۔ "کہسار" کے ملاح، ان کے نگران اور افسر قطاریں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

پھر بگل اور نقاروں کی آواز قریب آنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف کشتیوں سے افسروں کے احکامات گُونجنے لگے۔ پھر ہماری کشتی کے کپتان نے بھی پُوری قوت سے چلاتے ہُوئے کہا۔

"کہسار کے غلامو... سر اُٹھاؤ اور عالم پناہ شہنشاہ ضرغام کا انصاف دیکھو اور اس سے فرماں برداری کا سبق سیکھو!"

یہ حکم سُنتے ہی تین سو غلام اُس جانب دیکھنے لگے جدھر کپتان نے اشارہ کیا تھا۔ ایک بجرا جسے چوبیس ملاح کھے رہے تھے لنگر انداز کشتیوں اور جہازوں کی قطار کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس بجرے کے لال پرچم پر سیاہ عقاب کی تصویر کڑھی ہُوئی تھی اور اس پرچم کے زیرِ سایہ شاہ ضرغام ایک سنگی مجسّمے کی طرح بیٹھا ہُوا تھا۔ شاہی بجرے کے پیچھے چھ کشتیاں آ رہی تھیں۔ یہ سلطنت بہرام کے معزز سرداروں کی کشتیاں تھیں جن میں سردار نوروز کی کشتی بھی شامل تھی۔ اتنے میں ایک دلدوز چیخ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ چیخ ایک چھوٹی سی کشتی سے اُبھری تھی جو شاہی بجرے کے پہلو سے نکل کر سامنے آگئی تھی۔ اس کشتی پر آٹھ نوکدار کھمبے گڑے ہُوئے تھے اور ہر کھمبے کے ساتھ ایک ایک آدمی بندھا ہُوا تھا۔ ان میں سے ایک کا سر کاٹ کر اُس کے قدموں میں رکھ دیا گیا تھا۔ باقی سات زندہ تھے مگر اُن کے چہروں پر موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ اس کشتی سے اعلان کیا گیا۔

"دیکھنے والی آنکھو ہوشیار۔ شہنشاہ عالم پناہ ضرغام کا انصاف دیکھو اور فرماں برداری کو اپنی فطرت بنا لو!"

اس اعلان کے ساتھ ہی عقابی فوج کے آٹھ سپاہی اپنی تلواریں سونتے دُوسرے کھمبے کے ساتھ بندھے آدمی کی طرف بڑھے اور اُنھوں نے اس آدمی کے مختلف اعضا پر بیک وقت آٹھ چرکے لگا دیے۔ وہ آدمی درد کے مارے تڑپ تو نہیں سکتا تھا مگر چیخ ضرور سکتا تھا اور اُس کی یہ چیخیں جگر خراش تھیں۔ میں نے اس ظلم کے شکار سے اپنی نگاہیں ہٹا لینا چاہیں لیکن وہ بے اختیار اُس مظلوم پر مرتکز ہو گئیں جسے دوبارہ چرکے لگائے جا رہے تھے۔ یہ مظلوم ارغون کا وہی ساتھی طغرل تھا جس نے جنگل میں میرے ساتھ مقابلہ کیا تھا۔

طغرل شاید اُن آدمیوں میں سے ایک تھا جو شاہ ضرغام نے سردار نوروز سے پانچ سال کے لیے طلب کیے تھے اور "انصاف" اس کھیل میں طغرل کو ضرغام نے بطورِ خاص شامل کروایا ہوگا تاکہ کلدانی سردار کو یہ تاثر دے سکے کہ وہ اُس سے خوش نہیں ہے اور سردار نوروز کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جا سکتا ہے۔

جب طغرل کا سر قلم کیا جانے لگا تو میں نے اپنی نگاہیں دُوسری جانب دیکھنے لگا۔ کشتی کے ایک سرے پر مستول کے قریب ارغون کندھے پر کلہاڑا رکھے اپنے ساتھی کی طرف ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ وہ کسی ستون کی مانند سیدھا کھڑا تھا۔ جب طغرل کی آخری چیخ فضا میں بلند ہُوئی تو ارغون نے اپنے کندھے سے لٹکتا ہوا کلہاڑا اُتارا اور اُس کا پھل کشتی کے تختے پر گاڑ دیا۔ اُس کی اس حرکت کو نگران نے گھورا تو ارغون نے ٹھنڈی سانس لے کر کلہاڑا دوبارہ اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ اس دوران میں شاہ ضرغام کا بجرا اور کشتیاں آگے بڑھ چکی تھیں۔ پھر ارغون جُونہی جانے کے لیے پلٹا

اُس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کے پنجے ایک دُوسرے میں پھنسا کر ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ گویا میں اُسے بتانا چاہتا تھا کہ میں ہر حال میں اُس کا ساتھ دُوں گا۔ وہ یہ اشارہ سمجھ گیا اور سر کی خفیف جنبش سے اثبات کا اشارہ کرتے ہُوئے کشتی کے باورچی خانے میں چلا گیا۔

●●

دُوسری دن پچاس کشتیاں سمندر میں نکلیں تو بیس بڑے جہاز بھی اُن کے ساتھ تھے۔ میری سمجھ میں نہ آسکا کہ آج جہاز ہمارے ساتھ کیوں ہیں مگر جب کشتیاں جنگی مشق کرنے کی بجائے آگے بڑھتی رہیں تو پتہ چلا کہ جہازوں پر پانی، خوراک اور گولہ بارُود لدا ہُوا ہے جو سمندر میں اور ساحل کے مختلف مقامات پر متعین کشتیوں کو فراہم کیا جائے گا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ دن سمندر میں رہ کر سلطنت بہرام کے ساحلوں کی حفاظت کر سکیں اور بحری قزاقوں کو تاخت و تاراج کا موقع نہ مل سکے۔ چھوٹی کشتیوں پر بوقتِ ضرورت آٹھ چھوٹی توپیں نصب کی جا سکتی تھیں جبکہ جہازوں پر تیس سے پچاس توپیں لگی ہوئی تھیں... علاوہ ازیں اُن میں عقابی فوج کے لڑاکا دستے بھی موجود تھے۔ جہازوں پر لگی ہُوئی توپیں پانی کی سطح سے بلند ہونے کے باعث صحیح نشانہ لگا سکتی تھیں اور دُور تک مار سکتی تھیں۔

ہمارا بیڑہ تین روز تک شمال کی طرف سفر کرتا رہا اور سمندر کے کنارے پہاڑوں تک جا پہنچا جو سلطنتِ بہرام کی شمالی سرحد کہلاتے تھے۔ بیڑا یہاں لنگر انداز ہونے کی بجائے آگے بڑھ گیا اور ایک ایسی سرزمین کے سامنے جا رُکا جو کسی کی ملکیت نہیں تھی اور جس پر گھنے جنگل اُگے ہوئے تھے۔ آگے جا کر یہ جنگل کہستانِ منگول سے مل جاتے تھے۔

کشتیوں اور جہازوں کا عملہ ساحل پر اُترنے کے بعد مختلف کاموں میں مصروف ہو گیا۔ کچھ لوگ خالی برتنوں میں نہروں سے میٹھا پانی بھر کر لانے لگے۔ کچھ نے مچھلیاں پکڑنے کے جال پھیلا دیے اور کچھ درختوں کے تنے کاٹ کر صاف کرنے لگے تاکہ اُنھیں کشتیوں پر لادا جا سکے۔ تین دن بعد بیڑا لنگر اُٹھا کر آگے چل پڑا۔ میری معلومات کے مطابق وہ اُس جزائر کی طرف بڑھ رہا تھا جو بحری قزاقوں کے زیرِ تسلط تھے لیکن میں اس بارے میں کسی سے کوئی سوال نہیں کر سکتا تھا اس لیے دن بھر چپّو چلاتا رہا اور شام کو جب ملاحوں کی دُوسری ٹولی نے چپّو سنبھال لیے تو آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھتے دیکھتے سو گیا۔

●●

صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہماری کشتی کے ساتھ آنے والے جہاز غائب ہیں۔ میں نے آنکھیں مل کر ادھر اُدھر دیکھا تو پتا چلا کہ ہمارے ساتھ صرف چھ کشتیاں ہیں۔ وہ بھی ایک دُوسرے سے بہت دُور۔ یہ صُورتِ حال دیکھ کر بے ساختہ میرے مُنہ سے یہ الفاظ نکل گئے: "ہم راستہ بھُول کر بیڑے سے بچھڑ گئے ہیں!"

مجھ سے آگے بیٹھا ہُوا دراز ریش ملاح ہنس پڑا اور بولا: "ہم راستہ بھُولے ہیں نہ بیڑے سے بچھڑے ہیں!"

"تو پھر جہاز اور باقی کشتیاں کہاں ہیں؟"

"وہ امیرالبحر اسکندر کے منصُوبے کے مطابق گہرے سمندر سے گھُوم کر قزاقوں کے اڈوں پر حملہ کریں گے!"

"لیکن ہم تو شاہی بحریہ کے جہازوں اور کشتیوں کو سامانِ رسد فراہم کرنے آئے تھے!"

"وہ سب ایک ڈھونگ تھا۔ امیرالبحر سب کو غچہ دے کر اپنی برتری ثابت کرنا چاہتا تھا!"

اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ اسکندر نے منصُوبہ یہ بنایا تھا کہ جب قزاق جہازوں اور باقی کشتیوں سے برسرِ پیکار ہوں تو وہ ان سات کشتیوں کے ساتھ پیچھے سے اُن کے اڈوں کو لُوٹ لے اور سارا مالِ غنیمت خود ہڑپ کرنے کے ساتھ ساتھ فتح کا سہرا بھی اپنے سر باندھ سکے لیکن یہ کوئی دانشمندانہ منصُوبہ نہیں تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ قزاق اپنا ہر فرد جنگ میں جھونک دیں اور اُن کے اڈوں کا دفاع کرنے والا کوئی نہ ہو۔ قزاق اتنے احمق تو نہیں تھے کہ اُنھوں نے اُن راستوں پر نگہبانی اور دفاع کے لیے کوئی کشتیاں یا جہاز متعین نہ کر رکھے ہوں جن سے اسکندر اُن کے اڈوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔

"اسکندر نے اس منصُوبے پر عمل کرنے کی اجازت کیسے لی ہوگی۔" میں نے سوچا۔ شاید وہ ضرغام کا بیٹا یا کوئی قریبی عزیز ہوگا ورنہ ایسے احمقانہ منصُوبے پر عمل کرنے کی اجازت اسے ہرگز نہ مل سکتی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ اس دراز ریش ملاح کو یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہو گئیں؟ اتنا تو مجھے علم ہو چکا تھا کہ وہ گزشتہ بیس سال سے شاہی بحریہ میں کام کر رہا ہے اور شاید اسی بنا پر اسے منصُوبے کا علم ہو گیا ہوگا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اُسے اعتماد میں لے کر منصُوبے سے آگاہ کر دیا گیا ہو۔ بہرکیف حقیقت کچھ بھی ہو، میں تو صرف اتنا جانتا تھا کہ امیرالبحر اسکندر ان سات کشتیوں کو موت کے مُنہ میں لیے جا رہا ہے جن میں سے ایک کہسار بھی تھی۔

دن بھر ساتوں کشتیاں مدھم رفتار کے ساتھ آگے بڑھتی رہیں۔ شام کا جھٹپٹا پھیلنے سے پہلے ہمیں دُور سمندر میں وہ جزیرے دکھائی دینے لگے جنھیں اسکندر اپنا ہدف بنانے والا تھا۔ چنانچہ اندھیرا پھیلنے کے بعد کشتیاں ایک چھوٹے سے غیر آباد جزیرے کے کنارے لنگر انداز کر دی گئیں اور ایک گروہ کو یہ دیکھنے کے لیے بھیج دیا گیا کہ وہ اس جزیرے اور اس کے ارد گرد سمندر کا جائزہ لے کر قزاقوں کی موجودگی اور انتظامات

کا مُراغ لگانے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد نگہبانوں کے علاوہ سب سو گئے۔ علی الصباح میری آنکھ اُس ملاح کی چیخ و پکار سے کھل گئی جو مستول پر چڑھا ہُوا تھا اور چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا۔

"قزاق آ گئے۔ وہ سمندر کی طرف سے آ رہے ہیں۔ وہ ہم سب کو مار ڈالیں گے۔ کوئی اُن کے ہاتھوں موت سے نہیں بچ سکتا... بھاگو..."

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ایک تیر سنسناتا ہُوا اُس کے سینے میں پیوست ہو گیا اور وہ سر کے بل مستول سے کشتی پر آ گرا۔ یہ تیر ہماری کشتی کے ایک عہدے دار نے چلایا تھا۔ کپتان نے سر ہلا کر اُس کے اس اقدام کی تائید کر دی کہ بزدلوں کو فوری طور پر موت کے گھاٹ اُتار دینا ہی سلطنت بہرام کا آئین تھا۔ مَیں نے کپتان کی طرف دیکھا جو صرف اپنی محنت اور صلاحیتوں کی بنا پر ملاح سے کپتان کے عہدے تک پہنچا تھا۔ اُس کے چہرے پر تردد کے تاثرات نمایاں نظر آ رہے تھے۔

مَیں نے سمندر پر نگاہ ڈالی تو مجھے قزاقوں کے سیاہ پرچموں والی کشتیاں تیزی سے آگے بڑھتی نظر آئیں۔ مَیں اُنھیں گننے لگا۔ وہ بیس سے زیادہ تھیں اور ہماری کشتیوں کے گرد نیم دائرے کی صورت بڑھ رہی تھیں۔ ہماری کشتیاں اُن کے نرغے میں آتی جا رہی تھیں۔ ہم جزیرے پر نہیں جا سکتے تھے اور سمندر کی طرف جانے کا مطلب قزاقوں سے بلاواسطہ تصادم تھا۔ اب ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا تھا کہ ہم مردانہ وار قزاقوں کا مقابلہ کریں اور لڑتے ہوئے مر جائیں۔

قزاقوں کی کشتیاں ہم سے تین گنا زیادہ تھیں۔ وہ ہماری کشتیوں سے ہلکی تھیں اور اُن پر کام کرنے والا ہر فرد مسلح اور آزاد تھا جبکہ ہماری کشتیوں کے ملاح زنجیروں سے جکڑے ہُوئے تھے اور اُن کو کوئی ہتھیار نہیں دیا گیا تھا چنانچہ قزاق ہماری کشتیوں پر اُترتے ہی قتل عام کر سکتے تھے اور زنجیروں سے جکڑے ہُوئے غلام ملاح اُن کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ مَیں نے یہ بھی سُنا تھا کہ کبھی کبھی قزاق بڑے بڑے عہدے داروں کو زرِ عمال کی رقم وصول کرنے کے بعد چھوڑ دیتے تھے اور تندرست و توانا غلاموں کو خوراک اور دُوسرے ساز و سامان کے عوض بیچ دیتے تھے لیکن یہ اُس صورت میں ہوتا تھا جب اُن کا مقابلہ کیے بغیر ہتھیار ڈال دیے جائیں۔

اتنے میں کشتیوں پر نقارے بجنے لگے جو اعلانِ جنگ تھا۔ ساتوں کشتیوں کے لنگر فی الفور اُٹھا دیے گئے اور عہدے دار ملاحوں کو حکم دینے لگے۔ کہسار کے توے ملاحوں نے چپّو سنبھال لیے اور وہ قزاقوں کی کشتیوں کی طرف بڑھنے لگی۔ مَیں نے چپّو چلاتے ہُوئے اپنی کشتیوں کی طرف دیکھا۔ سب سے آگے والی کشتی پر امیر البحر کا پرچم لہرا رہا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہُوئی کہ امیر البحر اسکندر موت سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔

اب مَیں نے اپنے کپتان کی جانب دیکھا جو نقارچیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اُس کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ جانتا ہے ہر آنے والا لمحہ ہمیں موت کے قریب تر لے جا رہا ہے لیکن موت کا سواگت کرنا بھی جیسے اُس کے فرائض میں شامل تھا۔ مَیں نے اُس کے چہرے پر لکھی عزم و ہمت کی تحریر پڑھتے ہی سوچ لیا کہ اس لڑائی میں مجھے وہ سب کچھ کرنا ہو گا جو مجھے آزادی اور ممتاز مقام دلانے کا باعث بن جائے۔ میرا خیال تھا کہ ارغون بھی یہی چاہے گا اور ہم دونوں مل کر اُس منزل کی جانب بڑھ سکیں گے جو ہماری تقدیر بدل دے گی۔

قزاقوں کی کشتیاں اپنا گھیرا تنگ کرنے لگی تھیں۔ شاید اُنھوں نے ہماری سات کشتیوں کے بیچوں بیچ امیر البحر کے پرچم والی کشتی دیکھ لی تھی اور اب اُسے سبق سکھانا چاہتے تھے۔ اس لیے اُن کی کشتیوں کا زیادہ جمگھٹا بھی وسط میں تھا۔ عین اُسی وقت ہماری کسی کشتی سے توپ چلنے کی آواز آئی۔ یہ حرکت کسی توپچی سے گھبراہٹ میں سرزد ہوئی تھی کیونکہ قزاقوں کی کشتیاں ابھی دو ڈھائی میل دُور تھیں جبکہ ہماری بڑی توپوں کی مار بھی صرف ڈیڑھ میل تک تھی۔ قزاقوں نے اپنی کشتیوں کے بادبان لپیٹ لیے تھے اور اُن کی کشتیاں گویا رُک گئی تھیں۔ اُنھیں ملاحوں سے چپّو چلوانے کی بجائے آگے بڑھانے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ ہماری کشتیاں خُود ہی اُن کی طرف بڑھ کر اپنی تباہی کو آواز دے رہی تھیں۔

"کہسار" اپنے بیڑے کے ایک سرے پر تھی۔ قزاقوں کا بیڑا دونوں پہلوؤں سے چھدرا تھا کیونکہ اُن کی تمام تر توجہ ہمارے وسط میں چلنے والی امیر البحر کی کشتی پر مرکوز تھی۔ مَیں نے سوچا کہ اگر کہسار تیز رفتاری سے آگے بڑھتی رہی اور اُس کا کسی قزاق کشتی سے ٹکراؤ نہ ہُوا تو وہ گھیرا توڑ کر آگے نکل سکتی ہے۔ ابھی مَیں ان اندازوں پر غور کر رہا تھا کہ کچھ بڑے بڑے پتھر سنسناتے ہوئے ہمارے سروں پر سے گزر کر سمندر میں جا گرے۔ یہ پتھر قزاقوں کی ایک کشتی سے منجنیق سے پھینکے گئے تھے۔ ہماری کشتی کی چار توپوں نے فوراً جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ اب ہماری اور قزاقوں کی کشتیاں ایک دُوسرے کی زد میں تھیں۔ وہ ہم پر پتھر برسا رہے تھے اور ہم گولے۔ ہماری گولہ باری سے دو کشتیوں میں آگ لگ گئی لیکن سنگ باری نے ہماری کشتی کے ایک مستول کو بھی اُڑا دیا۔ مستول کشتی پر گرا تو ہمارے کافی ملاح اُس سے زخمی ہو گئے اور کچھ اُس کے نیچے دب کر بھی مر گئے۔ اب جنگی جنوں طاری تھا۔ کسی کو کسی کا خیال نہیں تھا۔ ہر طرف موت رقص کر رہی تھی۔

آگ اور خُون کا کھیل جاری تھا۔ نقارے بج رہے تھے۔ توپیں گرج رہی تھیں، منجنیق چرچرا رہی تھیں اور ہر طرف سے زخمیوں کی آہ و بکا بلند ہو رہی تھی۔

توپوں کی مسلسل گولہ باری سے کہسار پر دھوئیں کی دبیز چادر پھیلی ہوئی تھی اور مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ عین اُس وقت وہ کسی کشتی سے ٹکرائی۔ ہمیں بڑے زور کا ایک جھٹکا لگا اور مَیں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہماری کشتی نے ایک قزاق کشتی کو درمیان سے جیسے چیر کر رکھ دیا تھا۔ دو ٹکڑے ہو جانے والی کشتی کے ملاح کہسار پر کودنے لگے مگر تیر اندازوں اور بندوقچیوں نے اُنھیں بھون کر رکھ دیا۔ فضا میں مزید چیخیں اور کراہیں گونج اُٹھیں۔ اُسی وقت کہسار کو ایک اور زبردست جھٹکا لگا۔ ایک اور قزاق کشتی اُس سے ٹکرائی تھی۔ چپّو چلانے والے اس جھٹکے سے گر پڑے اور ایک دُوسرے پر ڈھیر ہو گئے۔ مَیں بھی اُن میں دھنسا ہُوا تھا لیکن مَیں نے اپنے اُوپر گرے ہُوئے ملاح کو دھکیل کر ہٹا دیا اور اُٹھ کھڑا ہُوا مگر صرف ایک قدم ہی آگے بڑھا سکا کیونکہ میرے قدموں میں زنجیر پڑی ہوئی تھی جبکہ قزاقوں کی کشتی سے اُن کے جنگجو نعرے لگاتے ہُوئے ہماری کشتی پر کُود گئے تھے اور اُنھوں نے زنجیروں سے جکڑے ہُوئے غلام ملاحوں کا قتلِ عام شروع کر دیا تھا۔ اپنی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی موت کو دیکھ کر مَیں نے جھٹکے سے زنجیر توڑنے کی کوشش کی مگر زنجیر بہت مضبوط تھی۔ میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا کہ مَیں اپنا دفاع کر سکوں۔ بے بسی نے مجھے دیوانہ سا کر دیا اور میرے مُنہ سے ایک وحشیانہ نعرہ نکل گیا۔ عین اُسی وقت مَیں نے دیکھا کہ قزاقوں سے لڑنے والا ایک شخص پلٹا اور میرے قریب آ گیا۔ وہ ارغون تھا۔ اُس نے اپنا کلہاڑا بلند کیا اور ایک ہی ضرب سے میرے پاؤں کی زنجیر کاٹ دی۔ پھر وہ کلہاڑا مجھے دے کر تلوار لیے آگے بڑھ گیا۔ مَیں نے کلہاڑے سے دو ساتھیوں کی زنجیریں کاٹیں اور کلہاڑا اُنھیں دے کر آگے بڑھا تاکہ کوئی ہتھیار تلاش کر سکوں مگر مجھے کوئی ہتھیار دکھائی نہ دیا کیونکہ لڑائی کشتی کے دُوسرے سرے پر جاری تھی۔ مَیں بغیر کسی ہتھیار کے لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی اِس عالم میں نہتا اپنا دفاع کر سکتا تھا۔ مَیں نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے آٹھ فٹ لمبا چپّو کا ایک ٹکڑا نظر آ گیا۔ مَیں نے ٹکڑا اُٹھا لیا اور اندھا دُھند دوڑتا ہُوا اُس سرے پر پہنچ گیا جہاں لڑائی جاری تھی۔ قزاقوں کی کشتی سے دھڑا دھڑ جنگجو جوان کُود رہے تھے۔ مَیں نے دیوانہ وار چپّو کا وہ ٹکڑا گھمانا شروع کر دیا۔ قزاق اگرچہ شمشیر بدست تھے مگر اُن کی تلواریں مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ تلواریں پھینک کر مجھے مارتے یا تیروں کا نشانہ بناتے، مَیں نے نو دس کی کھوپڑیاں توڑ دیں۔ کسی کے پیٹ میں ڈنڈے کا سرا مارا تو کسی کی پسلیوں میں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس ٹکڑے میں میدان صاف ہو گیا۔ مَیں نے قزاقوں کے ہاتھوں سے گری ہوئی دو تلواریں اُٹھائیں اور وہیں سے اُن کی کشتی پر کُود گیا جہاں سے وہ ہماری کشتی پر کُود کر آ رہے تھے۔

مَیں ہمیشہ اس مقولے پر عمل کرتا رہا ہُوں کہ دُشمن سے اس کے اپنے میدان میں لڑو۔ مَیں جونہی قزاقوں کی کشتی پر کُودا سامنے سے ایک قزاق نے توڑے دار بندوق سے مجھ پر فائر کرنا چاہا مگر مَیں نے جھکائی دے کر تلوار اُس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ اتنے میں دو قزاق میری طرف لپکے۔ مَیں نے بیٹھے بیٹھے چپّو کا وہ ٹکڑا گھمایا جس نے اُن کی ٹانگیں توڑ دیں۔ وہ چیختے چلّاتے گرے تو دو اور میری طرف لپکے۔ مَیں نے تلواریں پھینک کر اُسی چپّو سے اُنھیں بھی جہنم رسید کر دیا۔ اب مجھ پر خُون سوار ہو چکا تھا۔ مَیں اندھا دُھند قزاقوں پر ٹوٹ پڑا۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے اس عجیب و غریب ہتھیار کا مقابلہ کیسے کریں۔ وہ اُس کی زد سے بچنے کے لیے سمندر اور "کہسار" پر کُودنے لگے... لیکن ہر دو جگہ موت اُن کی منتظر تھی۔ اتنے میں ان غلام ملاحوں کی ایک ٹولی بھی وہاں پہنچ گئی جنھوں نے اپنی زنجیریں خُود کاٹ لی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے قزاقوں کا صفایا ہو گیا۔ تب "کہسار" کے کپتان نے جو کافی زخمی ہو چکا تھا، چلّا کر مجھے اپنی کشتی پر واپس آنے کا حکم دیا اور مَیں تعمیلِ حکم میں وہاں پہنچ گیا۔

ارغون کپتان کے ساتھ ساتھ لگا ہوا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی تھی کہ اس نے ایک بازو سے بہت سے قزاقوں کو جہنم رسید کر دیا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ سوچ کر دکھ بھی ہوا کہ اگر اس کا دوسرا بازو مجھ سے مقابلہ کرتے ہوئے ناکارہ نہ ہو جاتا تو آج وہ اس سے بھی زیادہ بڑا کارنامہ انجام دیتا۔ ارغون نے ملاحوں کو چپو سنبھالنے کا حکم دیا تو میں نے بھی چپو سنبھال لیا لیکن اب ہم غلام ملاحوں کو زنجیر سے جکڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔

"کہسار" آگے بڑھنے لگی تو ارغون نے کپتان کی ہدایت پر مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ میں عرشے پر پہنچا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ قزاقوں کا ایک جہاز تیزی سے ہماری کشتی کی طرف بڑھ رہا ہے اور جس طرح ہم نے قزاقوں کی ایک کشتی کو ٹکر مار کر دو ٹکڑے کر دیا تھا، اسی طرح وہ ہماری کشتی کو ٹکر مار کر دو ٹکڑے کر دینا چاہتی ہے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور ارغون سے پوچھا۔ "توپ تیار ہے؟"

"ہاں!"

"توپچی کو ہٹا دو۔ میں خود اُسے چلاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے کپتان کی طرف دیکھا کہ وہ کوئی اعتراض تو نہیں کرتا مگر اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ میں لپک کر توپچی کی جگہ آیا اور ملاحوں کو ہدایات دینے لگا۔ ساتھ ہی میں نے ارغون سے کہا کہ وہ کہسار کا رخ اس طرح رکھے کہ میں اپنی طرف بڑھنے والے جہاز کے درمیانی حصے کو توپ کا نشانہ بنا سکوں۔ یہ بڑی عجیب صورتِ حال تھی کیونکہ قزاقوں کا جہاز بھی ہماری کشتی کو وسطی حصے میں ضرب لگا کر دو نیم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ بھی رخ موڑنے لگا۔ اب میں نے ایک اور ترکیب کی اور ٹوٹے ہوئے چپوؤں کے ٹکڑے اٹھا کر توپ کے نیچے رکھوا دیے تاکہ کشتی کی بجائے توپ کا رخ موڑ دوں۔ قزاق میری اس ترکیب کو نہ سمجھ پائے۔ میں نے فلیتہ جلایا اور جہاز کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب جہاز کہسار سے صرف دو سو گز کے فاصلے پر رہ گیا تو میں نے نشانہ لے کر توپ داغ دی۔ دھماکے کے ساتھ کشتی کو ایک جھٹکا لگا اور ابھی ہم اس جھٹکے سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ قزاقوں کے جہاز سے یکے بعد دیگرے تین زبردست دھماکے ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی اس کے مستول اور ملاح فضا میں اڑتے دکھائی دیے۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے مگر جب تیسرے دھماکے کے ساتھ جہاز کے پرخچے اڑ گئے تو میں سمجھ گیا کہ ہماری توپ کا گولہ قزاقوں کے ذخیرۂ بارود پر گرا تھا۔ اس میں کوئی کمال نہیں تھا بلکہ خوبیٔ تقدیر تھی جس نے قزاقوں کے سب سے بڑے جہاز کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ میں نے ارغون کو حکم دیا کہ کہسار کو جتنی تیزی سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے بڑھایا جائے کہ اب ہمارے آس پاس کوئی قزاق کشتی یا جہاز دکھائی نہیں دے رہا تھا اور ہم اُن کے نرغے سے نکل کر فرار ہو سکتے تھے۔

جب کہسار کے ملاح اسے تیزی سے کھے رہے تھے، میں نے پلٹ کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ ہماری باقی ساری کشتیاں تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ قزاق بھی اپنی بہت سی کشتیوں اور سب سے بڑے جہاز سے محروم ہو چکے تھے۔ سمندر پر گولے بارود اور جلتی ہوئی کشتیوں کا دھواں پھیلا ہوا تھا اور شاید اسی دھوئیں کی وجہ سے وہ ہماری کشتی کو دیکھ نہیں سکے تھے جو پوری رفتار سے اجنبی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

دو گھنٹے بعد جب ہم کافی دور نکل آئے تو کپتان نے کشتی کے عہدیدار کو بلایا اور کہا۔

"تم لوگ جانتے ہو کہ کسی بھی جنگ میں بچ جانے والے شاہِ ضرغام کے غیظ و غضب کا شکار بننے سے بچ نہیں سکتے۔ اعلیٰ حضرت کا عتاب صرف بچ جانے والوں تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اُن کی بیوی بچوں کو بھی کرب انگیز موت کا جام پینا پڑتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی اور معصوم بچے میری وجہ سے مظالم کا شکار ہوں۔ اس لیے میں کشتی کی کمان سرفروش کے سپرد کرتا ہوں۔ اب یہی کہسار کا کپتان ہو گا اور تم اُس کے ہر حکم کی تعمیل کرو گے۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھا اور اپنے سر سے خود اتار کر ایک نائب کو دیتے ہوئے بولا۔ "آئین کی رو سے مرنے والے کی خود اُس کے بچوں کو پہنچا دی جاتی ہے۔ یہ میرے بچوں کو پہنچا دینا!" یہ کہنے کے بعد اُس نے کشتی سے سمندر میں چھلانگ لگا دی اور زرہ بکتر کی وجہ سے چشم زدن میں ڈوب گیا۔

تب ارغون آگے بڑھا اور اپنی کمر سے میری پیٹی اور چاقو اتار کر دیتے ہوئے بولا۔ "اپنی امانت سنبھالو کپتان!"

●●

دراز ریش ملاح نے کشتی کی کمان سنبھال لی اور اُسے ایسے راستے پر ڈال دیا جو ہمیں جلد از جلد ایسی خشکی تک پہنچاتی جہاں سے کہسار کی مرمت کے لیے لکڑی مل جائے۔ کشتی اب اس قابل نہیں رہی تھی کہ کسی حملے کا مقابلہ کر سکے۔ میرے لیے ابھی ایک اور مسئلہ حل طلب تھا۔ اس پر صرف غلام ملاح ہی نہیں بلکہ آزاد عملہ اور سپاہی بھی سوار تھے۔ انھوں نے تو جان بچانے کے لیے اُن سے کچھ نہیں کہا تھا مگر میں جاننا چاہتا تھا کہ دو سو افراد میں سے کون کون میرا ساتھ دینے کو تیار ہے اور کتنے سلطنتِ بہرام واپس جانا چاہتے ہیں۔

دوسری شب جب کہسار ساحل سے جا لگی تو میں نے سب کو آرام کرنے کا حکم دے دیا کیونکہ ہر فرد بری طرح تھکا ہوا تھا۔ خود میری اپنی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اگرچہ میں زخمی نہیں ہوا مگر میرے جسم پر بھی بہت سی خراشیں آئی تھیں اور آنکھیں بھی سوج گئی تھیں۔

تقریباً بارہ گھنٹے مکمل آرام کے بعد جب سب لوگ نہا دھو اور کھا پی کر تازہ دم ہو گئے تو میں نے انھیں ساحل پر جمع کیا اور خود کشتی پر کھڑا ہو کر اُن سے مخاطب ہوا۔

"دوستو! تم نے جس بہادری سے یہ جنگ لڑی اور جیتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کشتی نے قزاقوں کی دو کشتیوں اور ایک بڑے جہاز کو ہمیشہ کے لیے سمندر کی تہ میں بٹھا دیا ہے لیکن یہ کارنامہ صرف کشتی کا نہیں بلکہ تمھارا تھا!"

میری اس بات پر لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ میں پھر تقریر کرنے لگا۔ "ہم لوگ دشمنوں کے نرغے سے نکل کر ساحل پر لنگر انداز ہو چکے ہیں اور اب لنگر اٹھانے سے پہلے ہمیں کشتی کی مرمت کرنی ہے لیکن مرمت کے بعد بھی یہ پہلے والی "کہسار" نہیں رہے گی۔ تب یہ شاہی بیڑے کی کشتی تھی۔ اب یہ آزاد ہو گی اور اس پر کام کرنے والا ہر فرد بھی آزاد ہو گا۔ کسی کے پاؤں میں زنجیر نہیں ڈالی جائے گی، کسی کو سمندر میں نہیں پھینکا جائے گا اور کسی کے حلقوم پر تلوار نہیں پھیری جائے گی۔"

ایک بار پھر تالیاں بجیں اور نعرۂ ہائے تحسین بلند ہوئے۔

"میں کہسار کو سلطنتِ بہرام کی بجائے امارات خمسہ لے جانا چاہتا ہوں اس لیے کہ سلطنتِ بہرام کے ساحل پر تو یقینی موت استقبال کرے گی لیکن یہ بات امارات خمسہ کے بارے میں ابھی نہیں کہی جا سکتی۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ آپ لوگوں میں سے کچھ شاید امارات خمسہ نہ جانا چاہتے ہوں اس لیے میں کسی پر کوئی دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا۔ یہ فیصلہ خود آپ لوگوں کو کرنا ہے۔ جو لوگ میرا ساتھ دینا چاہیں، وہ میرے پاس آئیں اور میرے ساتھیوں میں اپنا نام لکھوا دیں۔ جو لوگ ہمارے ساتھ نہ جانا چاہیں، ہم انھیں کسی آبادی کے قریب ساحل پر اتار دیں گے تاکہ انھیں کھانے پینے اور واپس جانے میں کوئی دقت نہ ہو اور وہ شاہ ضرغام کی پھر سے خدمت کر سکیں!"

میری اس بات پر کچھ لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔ انھوں نے یہ طنز محسوس کر لیا تھا کہ شاہِ ضرغام کی خدمت خود اپنے پروانۂ موت پر دستخط کرنے کے مترادف ہے۔ میں نے تقریر جاری رکھی۔

"آپ لوگ سوچ لیجیے اور جو لوگ میرا ساتھ دینا چاہیں... وہ فوراً اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لیں!"

فی الفور سوائے چند بوڑھوں کے سب نے اپنے ہاتھ اٹھا دیے۔ یہ بوڑھے اپنے بچوں کی محبت میں واپس جانا چاہتے تھے لیکن جب باقی لوگوں نے انھیں کپتان کی مثال دے کر سمجھایا کہ اُن کی واپسی اُن کے بال بچوں کی موت بن جائے گی تو وہ بھی امارات خمسہ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اگرچہ میں خود یہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں ہمارے ساتھ کیا حشر ہو گا لیکن وہاں بچ جانے کا پچاس فی صد امکان ضرور تھا جبکہ سلطنت بہرام میں ایک فی صد بھی نہیں تھا۔

اس فیصلے کے بعد "کہسار" کا ہر فرد کام میں مصروف ہو گیا۔ درخت کاٹ کر مستول بنائے گئے۔ مچھلیاں پکڑ کر خشک کر لی گئیں۔ پانی کا ذخیرہ کیا گیا اور بارود جو گیلا ہو گیا تھا، پھر سکھا لیا گیا۔

یہ سارے کام دس روز میں مکمل ہو گئے۔ گیارھویں روز ہم نے اُن لوگوں کی قبر پر سلامی دی جو اس لڑائی میں زخمی ہونے کے بعد جانبر نہیں ہو سکے تھے اور پھر ہم نے کشتی کا لنگر اٹھا دیا۔

میں چاہتا تھا کہ ہماری کشتی شاہی بحریے یا قزاقوں کی نگاہوں میں آئے بغیر ہی بحرِ سیمیں تک پہنچ جائے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ پہلے روز ہی سمندر میں طوفان آ گیا اور بہت تیز ہوائیں چلنے لگیں جو اگرچہ موافق تھیں مگر وہ اپنے ساتھ بارش اور بادل بھی لے آئی تھیں۔ کشتی چپو چلائے بغیر بہت تیزی سے جا رہی تھی مگر ملاح اور سارا عملہ کشتی سے پانی نکالنے میں مصروف رہا ورنہ اُس کا ڈوب جانا یقینی تھا۔ پانچویں روز جب طوفان تھما تو ہماری کشتی اندازے سے دو روز پہلے ہی بحرِ سیمیں پہنچ چکی تھی اور شاید طوفان ہی کے باعث ہم شاہی بحریے یا قزاقوں کی نگاہوں میں نہیں آ سکے تھے۔

چھٹی صبح ہمیں اُفق پر ایک جزیرہ دکھائی دیا۔ وہ ریش دراز اور پختہ کار ملاح جو اب میرا دستِ راست بن چکا تھا اور جس نے اپنا نام تُوما بتایا تھا، جزیرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ جزیرہ برنیال ہے کپتان۔ امارات خمسہ میں سے ایک ریاست نیلاب کی ملکیت!"

جب کشتی آگے بڑھی تو میں نے دیکھا کہ یہ جزیرہ یا جزیرہ نما ایک پہاڑی پر مشتمل تھا اور چونکہ پہاڑی سیدھی عمودی تھی، اس لیے اُس پر چڑھنا کوہ نوردی سے کم نہیں تھا۔ ابھی ہم یہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ ہمیں اس جزیرے پر رکنا یا آگے بڑھتے رہنا چاہیے کہ اچانک ہی میں چونک کر پہاڑ کی چوٹی کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ وہاں سے سُرخ سُرخ دھوئیں کا ایک مینار سا بلند ہو رہا تھا۔

دھوئیں کا مینار دیکھ کر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اپنے دستِ راست تُوما سے اس سلسلے میں بازپرس کی تو اُس نے بتایا کہ یہ نگہبانی کرنے والوں کی طرف سے ایک اشارہ ہے۔ معاً تین دھماکے ہوئے اور سفید دودھیا دھوئیں کے تین

مرغولے نظر آئے۔ مَیں نے ساحل سے تین میل دُور کشتی رُکوا لی، تاکہ وہ توپوں کی زد سے محفوظ رہ سکے۔۔۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کشتی کو روکے رکھنا بھی بیکار ہے۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ کشتی کو توپوں کی مار سے باہر رکھتے ہُوئے، جزیرے کے گِرد چکر لگاتے ہُوئے آگے بڑھا جائے۔ مَیں نے اپنے ساتھیوں کو اسی ترکیب پر عمل کرنے کے لیے کہہ دیا۔

اس وقت تک ماہی گیری کی چند کشتیوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا اور وہ تیزی سے ساحل کی طرف بھاگ نکلی تھیں۔ جزیرے کے گِرد چکر کاٹتے ہُوئے بالآخر ہم ایک بندرگاہ کے سامنے آ گئے جس پر ایک بہت بڑا مینارہ بنا ہُوا تھا اور اس کے عقب میں بُرج دار شہر پناہ دکھائی دے رہی تھی۔ مَیں نے تُوما سے کہا: "کشتی کو بندرگاہ میں لے چلو۔ ہم جزیرے کے بادشاہ سے ملیں گے"۔

"بادشاہ سے نہیں، ملکہ سے"۔

"بادشاہ سے کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ وہ مر چکا ہے اور شہزادہ بہت چھوٹا ہے چنانچہ سارے اُمورِ سلطنت ملکہ نے خود سنبھال رکھے ہیں۔ اُس کا نام ملکہ ترشینا ہے۔ وہ بڑی سُوجھ بُوجھ والی عورت ہے۔ اس لیے رعایا اُس کا بہت احترام کرتی ہے"۔

مَیں نے تُوما سے مزید معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ یہ سلطنت بہت زیادہ مال دار نہیں ہے کیونکہ اس کے وسائل محدود ہیں۔ جنگلوں کی کمی کے باعث ریاست کے پاس زیادہ جہاز اور کشتیاں نہیں ہیں۔ صدر مقام کے اردگرد شہر پناہ ہے جو کافی مضبوط ہے۔

جب "کہسار" بندرگاہ میں داخل ہونے لگی تو مَیں نے دیکھا کہ دونوں جانب عمودی چٹانیں ہیں جن پر قلعے بنے ہُوئے ہیں۔ بندرگاہ میں داخل ہوتے ہی تین جنگی کشتیوں نے ہمیں نرغے میں لے لیا۔ پھر دو کشتیاں پیچھے بھی آ گئیں۔ آگے والی کشتی پر کھڑے ہُوئے ایک افسر نے ہمیں حکم دیا۔ "چپّو چلانا بند کر دیے جائیں اور کشتی کا سارا عملہ اُوپر آ جائے۔ کوئی بھی نیچے نہ رہے۔ اگر اس حکم کی تعمیل نہ کی گئی تو ہم پانچ منٹ بعد گولہ باری شروع کر دیں گے"۔

مَیں کوئی جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا تھا اس لیے مَیں نے وہی کیا جو مجھ سے کہا گیا تھا۔ پھر ہماری کشتی آگے والی کشتی سے باندھ دی گئی۔ چار افسر ہماری کشتی پر آئے۔ اُن میں سے ایک نے مجھے حکم دیا: "اپنے ملّاحوں کو فوراً زنجیریں پہنا دو"۔

"نہیں جناب"۔ مَیں نے دو ٹوک جواب دیا۔ "اب یہ سب غلامی کی زنجیریں توڑ چکے ہیں اور اس کشتی پر انھیں زنجیریں نہیں پہنائی جائیں گی"۔

"کیا تم قزاق ہو؟" دُوسرے افسر نے سوال کیا۔

"قزاقوں سے ہمارا کوئی سروکار نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف دو ہفتے پہلے ہم نے قزاقوں کی تین کشتیاں اور ایک جہاز تباہ کر دیا تھا"۔

"غلط۔ ہم نے ایسی کوئی خبر نہیں سُنی"۔ تیسرا افسر بولا۔

"اگر امارتِ پرنیال کے افسر یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں دنیا کی ساری خبریں معلوم ہوتی ہیں تو یہ اُن کی خوش فہمی ہے"۔ ارغون بول اُٹھا۔

"اگر تم قزاق نہیں اور نہ ہی تمھاری کشتی پر کسی ملک کا پرچم ہے تو پھر تم کیا بلا ہو اور کہاں سے آئے ہو؟" پہلے افسر نے سوال کیا۔

چونکہ یہ سوال معقول تھا اس لیے مَیں نے نرمی سے جواب دیا۔ "دو ہفتے پہلے یہ کشتی سلطنت بہرام کے بحری بیڑے میں شامل تھی جس کا قزاقوں سے مقابلہ ہُوا۔ آپ کی مرضی ہے کہ یقین کریں یا نہ کریں مگر اب ہم آزاد ہیں۔ میرا نام سرفروش ہے اور مَیں کہستان منگول کے اُس پار کی ریاست آریانہ کا شہزادہ ہُوں۔ ہم یہاں خیرسگالی کے جذبات لے کر آئے ہیں مگر افسوس کہ ہمارا استقبال نہایت غیر دوستانہ طور پر کیا جا رہا ہے"۔

افسر نے قہقہہ لگایا اور کہا: "یہ ایک اور جھوٹ ہے کہ تم سلطنت آریانہ کے شہزادے ہو۔ ہم نے آج تک کسی ایسی سلطنت کا نام نہیں سُنا۔ اور ملکہ ترشینا جھوٹوں سے کوئی رُو رعایت برتتی ہے نہ اُس کے افسر۔۔۔"

"جو ایسی دانشمند ملکہ کے افسر بننے کے اہل ہی نہیں"۔ مَیں نے اُس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا: "میرا خیال تھا کہ آپ لوگوں کا رویّہ شہنشاہِ ظلم و غارت گری ضرغام سے مختلف ہو گا لیکن افسوس کہ مجھے مایوسی ہوئی اور مَیں نے ملکہ ترشینا کے فہم و ذکا کے جو قصّے سُنے تھے وہ صرف قصّے ہی نِکلے"۔

میری اور افسروں کی بات چیت نے کہسار کے افرادِ عملہ میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور اُن کی جبینوں پر شکنیں اُبھر آئیں۔ پرنیال کے افسروں نے بھی یہ بات محسوس کر لی اور فضا کے مزید مکدّر ہونے سے پہلے اپنا رویّہ تبدیل کر لیا۔ پہلا افسر بولا: "کپتان سرفروش، تم کون ہو اور تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے اس کا فیصلہ کرنا ملکۂ محترمہ کا کام ہے ہمارا نہیں۔ کیا تم اپنے ایک افسر کے ساتھ ملکۂ محترمہ کی خدمت میں چلنے کو تیار ہو؟"

یہ سُن کر تُوما اور بہت سے دُوسرے لوگ ہنس پڑے مگر مَیں نے اپنی سنجیدگی برقرار رکھی اور ارغون سے بولا: "کپتان ارغون، ملکۂ محترمہ سے شرفِ باریابی حاصل کرنے اور انھیں اپنے دوستانہ جذبات سے آگاہ کرنے کے لیے تم میرے ساتھ چلو گے"۔ ارغون نے اثبات میں سر خم کیا تو مَیں تُوما سے مخاطب ہُوا۔

"جب تک مَیں اور ارغون واپس نہیں آتے تم اس کشتی کی کمان سنبھالے رہو گے۔ اگر غروبِ آفتاب تک ہم دونوں میں سے کوئی بھی واپس نہ آئے تو سمجھ لینا کہ ہم لقمۂ اجل بن گئے ہیں یا ہمیں زنداں میں محبوس کر دیا گیا ہے۔ تب تم یہ کشتی لے کر یہاں سے چلے جانا"۔

"لیکن ہم آپ کو۔۔۔"

"ہماری فکر مت کرنا۔ کشتی کے عملے کا تحفظ تمھاری ذمّہ داری ہے"۔

"بہتر جناب"۔

اب مَیں افسروں کی طرف پلٹا اور بولا: "ہم تیار ہیں"۔

افسروں نے ہمارے پھٹے پُرانے لباسوں پر نظر ڈالی پھر پہلے افسر نے کہا: "ٹھیک ہے۔ آؤ"۔

اور ہم اُن کے ساتھ چل دیے۔

●

فصیل کے دروازے پر گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ ہم سب چھوٹے قد کے مضبوط گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور ایک افسر کی رہبری میں سنگی فرش والی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے گزرنے لگے۔ مَیں نے دیکھا کہ شہر پناہ بھی پیچ و خم کھاتی ہُوئی دُور تک چلی گئی تھی۔ کچھ دُور چلنے کے بعد بارہ گھُڑسواروں کے ایک دستے نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ہم ایک سُرنگ نما راستے سے گزر کر کھُلے میں آ گئے۔ مَیں نے پلٹ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ ہم شہر کی فصیل سے باہر آ چکے ہیں۔ فصیل میں تقریباً سو سو گز کے فاصلے پر بُرج بنے ہُوئے تھے اور جگہ جگہ توپوں کی نالیں بھی باہر جھانکتی نظر آ رہی تھیں۔ اگرچہ فصیل بہت پُرانی تھی لیکن اُسے سر کرنا آسان نہیں تھا۔

وہ راستہ جس پر ہم چل رہے تھے، پہاڑیوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ دونوں طرف زیتون اور انگوروں کے باغ تھے۔ اُن میں چھوٹے چھوٹے درخت بھی لگے ہُوئے تھے جن کے تنے سیاہ تھے اور شاخیں زرد پھُولوں سے لدی ہُوئی تھیں۔ کچھ لوگ یہ درخت کاٹ رہے تھے اور

کچھ اُنھیں چیر کر تختے بنانے میں مصروف تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ لکڑی بہت سخت ہے اسی لیے وہ لوگ پسینے سے شرابور تھے مگر میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ لکڑی کے یہ چھوٹے چھوٹے تختے کس کام آتے ہوں گے۔ ارغون نے اندازہ لگا لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ چنانچہ بولا:
"یہ لوگ ان تختوں سے ڈرم یا پیپے بناتے ہیں۔ یہ بہت مضبوط لکڑی ہے اس لیے اس سے بنائے ہوئے پیپے اگر سمندر کی گہرائی میں بھی پھینک دیے جائیں تو سالہا سال تک خراب نہیں ہوتے بلکہ ان میں بھری ہوئی شراب یا خوراک بالکل محفوظ رہتی ہے۔"
مجھے ان پیپوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اب راستہ دشوار گزار ہوتا جا رہا تھا اور بعض مقامات پر تو ہمیں گھوڑوں سے اُتر جانا پڑتا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم بائیں طرف مڑ کر ایک ڈھلان راستے پر آ گئے۔ یہاں بھی ہمیں متعدد درّوں اور سُرنگوں سے گزرنا پڑا۔ دفاعی اعتبار سے یہ بہت محفوظ علاقہ تھا اور گنتی کے چند آدمی پورے پورے فوجی دستوں کو آگے بڑھنے سے باآسانی روک سکتے تھے۔ اتنے میں رہبری کرنے والے افسر نے کہا: "ہم ملکۂ محترمہ کے محل میں پہنچنے ہی والے ہیں۔"
اگلا موڑ مڑتے ہی ملکہ کا محل دکھائی دینے لگا اور میں اُسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ ملکہ کا محل بھی قصرِ خونیں جیسا ہیبت ناک سنگی محل ہو گا جس میں سے جا بجا توپیں جھانک رہی ہوں گی لیکن وہ تو اس کے برعکس سنگِ مرمر کی ایک سادہ مگر ایک منزلہ خوبصورت سی عمارت تھی۔ عمارت کے احاطے میں سنگِ سفید سے متعدد تالاب بنائے گئے تھے جن میں رنگی برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں اور حوضوں کے اردگرد خوشبودار پھولوں کی کیاریاں پھیلی ہوئی تھیں جنھوں نے فضا کو معطر بنا دیا تھا۔ یہ سب دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس محل میں رہنے والی ملکہ کیسی ہو گی؟
ملکہ کو ہماری آمد سے پہلے ہی باخبر کر دیا گیا تھا اس لیے جب ہم محل کے دروازے پر پہنچے تو بارہ خدمت گار اور دو مسلح سپاہی وہاں ہماری پذیرائی کو موجود تھے۔
میرا خیال تھا کہ یہاں لانے سے پہلے ہمیں غسل کرنے کا موقع دینے کے ساتھ ساتھ نئے لباس بھی فراہم کیے جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا تھا اور اب میں اس خوبصورت ماحول میں سخت احساسِ کمتری محسوس کر رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے اپنے آپ کو سلطنتِ آریانہ کا شہزادہ متعارف کرایا تھا مگر اس لباس میں میں خود کو ایک غلیظ خدمت گار محسوس کر رہا تھا۔
دروازے پر کھڑے ہوئے مسلح سپاہی میری اور ارغون کی طرف

بڑھے تو میں چوکنا ہو گیا لیکن وہ ہمیں گھوڑوں سے اُترنے میں مدد دینے آئے تھے۔ پھر وہ خدمت گاروں کو ہدایات دینے لگے۔ جو باقی لوگوں کو ایک طرف لے گئے تو وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ اُن میں سے ایک بولا: "عزت مآب شہزادے۔ ملکہ عالیہ کا فرمان ہے کہ آپ دونوں کو فی الفور اُن کے حضور پہنچا دیا جائے لہٰذا تشریف لائیے۔"
میں نے یہ سن کر اپنی تلوار اُس کے حوالے کرنا چاہی تو وہ بولا۔
"اس کی ضرورت نہیں جنابِ والا۔ ملکۂ عالیہ آپ کو اس حال میں دیکھنا پسند فرمائیں گی تاکہ آپ کے متعلق صحیح اندازہ لگا سکیں۔ جہاں تک اُن کی حفاظت کا معاملہ ہے تو آپ مسلح ہونے کے باوجود اُن کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔" اُس کا لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔
محل کی مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے مجھے جہاں عود و عنبر کی خوشبو آئی وہاں کہیں دُور سے ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز بھی آتی سنائی دی۔ قلعوں اور فصیلوں کی آڑ میں آزادی برقرار رکھنے والی اس ملکہ کا انتظام بہت عمدہ تھا۔
بالآخر ہم ایک طویل و عریض کمرے میں پہنچ گئے۔ جہاں سامنے کی دیوار کے ساتھ چبوترے پر ایک سفید چوبی کرسی رکھی تھی اور اُس پر ایک کشیدہ قامت عورت پورے وقار کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر اُٹھی اور ہماری طرف بڑھنے لگی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہالی وڈ کی کوئی حسین ترین اداکارہ ملکہ کا روپ دھارے یہاں آ گئی ہو۔ وہ بناؤ سنگھار سے بے نیاز تھی اور اس کی اسی سادگی نے اُسے ایک پُرتقدس اور ملکوتی حسن عطا کر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُسے نہ زیوروں کی ضرورت تھی نہ ہتھیاروں کی۔ تاہم کہیں نہ کہیں بہت قریب ہی اُس کے محافظ ضرور موجود رہے ہوں گے۔ شاہ ضرغام اپنے ملاقاتیوں کو گرانڈیل محافظوں اور اپنے رعب و دبدبے سے مرعوب کرتا تھا تو ملکہ ترشینا اپنے حسن اور وقار سے۔ وہ ہم سے دس فٹ کے فاصلے پر رُک گئی اور مسکراتے ہوئے

یوں بولی جیسے اُس نے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔
"ہاں۔ میرے محافظ موجود ہیں مگر وہ میرے اشارے کے بغیر کچھ نہیں کریں گے۔ ہم پرنیال کے لوگ اجنبی لوگوں کو اُس وقت تک اپنا دشمن نہیں سمجھتے جب تک کہ ہمیں اُن سے کوئی گزند نہ پہنچے۔ آپ لوگوں نے بھی ایسی کوئی حرکت نہیں کی بلکہ اُس امتحان میں کامیاب ثابت ہوئے جو عہدے داروں نے لیا تھا۔"
"امتحان؟" ارغون بے ساختہ بول اُٹھا۔
"ہاں۔ میرے افسر یہ جاننا چاہتے تھے کہ آپ لوگ خود پر اور اپنے آدمیوں پر کس حد تک قابو پا سکتے ہیں اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ آپ لوگ دانشمند بھی ہیں اور طاقت ور بھی اور اس قسم کے لوگ دوست کم اور دشمن زیادہ ہوتے ہیں۔"
میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ملکۂ عالیہ۔ اگر ہمیں ایک دوسرے کی تعریف ہی کرنا ہے تو پھر مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کے افسروں کی اداکاری پر اُنھیں مبارک باد دوں۔"
"جہاں تک اداکاری پر داد دینے کا تعلق ہے تو اُس کے مستحق آپ بھی ہیں۔ میرے افسر آپ کی اس بات پر سچ مچ متعجب رہ گئے تھے کہ اگر آپ غروبِ آفتاب تک کشتی پر واپس نہ پہنچے تو آپ کا قائم مقام کشتی بندرگاہ سے باہر کیسے لے جائے گا؟ کیا آپ لوگوں کے پاس ایسے خفیہ ہتھیار ہیں جن کی مدد سے آپ کی کشتی ہمارا نرغہ توڑ کر باہر نکل سکتی ہے؟ وہ اب تک اس بات پر حیرت زدہ ہیں۔"
"میرا خیال ہے کہ آپ اپنے افسروں سے بہت زیادہ جانتی ہیں ملکۂ عالیہ۔"
"میرے پاس ایسے ملازمین بھی ہیں جو جہازوں اور کشتیوں کے متعلق وسیع معلومات اور تجربہ رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے 'کہسار' کا اچھی طرح سے جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آپ لوگوں کے پاس کوئی خفیہ ہتھیار نہیں ہے۔ دوسرے سامانِ رسد بھی اتنا کم ہے کہ اگر آپ ہماری جنگی کشتیوں کے نرغے سے بچ کر بندرگاہ سے باہر نکل بھی جائیں تو کسی دوسری بندرگاہ تک نہیں پہنچ پائیں گے۔"
"آپ کی اطلاعات درست ہیں ملکۂ عالیہ اور وہ اس بات کی بھی شاہد ہیں کہ ہم کسی بُری نیت سے نہیں آئے اور نہ ہی آپ کے دشمن ثابت ہو سکتے ہیں۔"
"مجھے تمھاری بات سے اتفاق ہے۔ اب مجھے مختصر طور پر اپنی اور اپنے جہاز کی رُوداد سناؤ۔ اس کے بعد میں کپتان ارغون کو کہسار پر بھیج دوں گی اور یہ حکم بھی جاری کر دوں گی کہ ضروری سامانِ رسد کے ساتھ کشتی کی مرمت بھی ہمارے خرچے پر کی جائے۔"
"میں آپ کی اس عنایت کا شکرگزار ہوں ملکۂ عالیہ۔" میں نے کہا۔ "اور میرے عملے کے بارے میں کیا حکم ہے؟"
"اُنھیں نہ صرف شہر میں آنے کی اجازت دی جائے گی بلکہ خرچ کے لیے مناسب بھتہ بھی دیا جائے گا بشرطیکہ وہ پرنیال کے قوانین کا احترام کریں اور جو ایسا نہیں کرے گا اُس کے خلاف قانونی اقدام کیا جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹی اور اپنی کرسی پر آرام سے بیٹھتے ہوئے بولی: "اب اپنی رُوداد سناؤ مگر مختصر انداز سے۔"
میں نے چند منٹوں میں اُسے سارے واقعات سنا دیے۔
"کیا یہ ساری باتیں سچی ہیں؟"
میرے جواب دینے سے پہلے ہی ارغون بول اُٹھا: "جنگل میں ہم سے ملنے کے بعد کی ساری باتوں کی میں تصدیق کرتا ہوں ملکۂ عالیہ۔ میرا یہ ناکارہ بازو بھی اس حقیقت کا گواہ ہے۔"
ملکہ ترشینا بے ساختہ ہنس پڑی اور بولی: "تم نے بڑی تیزی سے اپنے کپتان کی کچھ خصوصیات اپنا لی ہیں ارغون۔ بہرکیف تم واپس جا کر کشتی کو اپنی کمان میں لے لو اور مرمت کی دیکھ بھال کرو۔"
ارغون نے سر خم کیا، مجھ پر ایک نظر ڈالی اور دو خدمت گاروں کی رہبری میں باہر چلا گیا۔
اب ملکہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی: "تم یہیں رُکو شہزادے چند لمحوں میں میرے خدمت گار آئیں گے اور تمھیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اس وقت سے تم میرے مہمان ہو اس لیے اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔"
یہ کہہ کر وہ پلٹی اور عقبی دروازے سے نکل گئی۔
اُس کے جاتے ہی میں کمرے میں بالکل تنہا رہ گیا لیکن مجھے یقین تھا کہ ملکہ کے پوشیدہ محافظ اب بھی اپنی جگہ موجود ہیں اور چشم زدن میں مجھے ہلاک کر سکتے ہیں بشرطیکہ ملکہ یہ چاہتی ہو۔ میرے لیے یہ امر باعثِ اطمینان تھا کہ ملکہ نے ہمیں اپنا دشمن قرار نہیں دیا تھا۔ اگر وہ ہمیں اپنا دشمن سمجھتی تو اب تک ہماری لاشیں بھی ٹھکانے لگائی جا چکی ہوتیں اور کشتی کے عملے کا بھی یہی حشر ہوتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ملکہ ترشینا، شاہ ضرغام کی طرح اذیت پسند اور خونخوار نہیں تھی۔
ابھی میں یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ بغلی دروازے سے پانچ کنیزیں کمرے میں آ گئیں۔ اُن میں سے ایک اَدھیڑ عمر کی تھی اور باقی چاروں نے جیسے ابھی ابھی شباب کی دہلیز پر قدم رکھے تھے۔ اَدھیڑ عمر عورت جو اُن کنیزوں کی نگراں معلوم ہوتی تھی، بڑے ادب سے بولی: "ہمارے ساتھ تشریف لائیے شہزادۂ عالم۔"
میں اُن کے ساتھ چل پڑا۔ ہم مختلف راہداریوں سے گزر کر ایک بڑے حمام میں پہنچے۔ جس کی دیواریں اور فرش سفید اور سبز سنگِ مرمر

کا تھا۔ حمام میں جو دیئے جل رہے تھے' اُن کے ہلکے ہلکے دُھوئیں سے خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ ایک کونے میں بہت بڑا ٹب رکھا ہُوا تھا جس کے اُوپر سنہرے اور روپہلے رنگ کی بالٹیاں لٹک رہی تھیں۔ کنیزوں نے جلدی سے ٹب میں کچھ مسالے ڈالے' وہ بالٹیاں انڈیلیں اور باہر نکل گئیں۔ مَیں نے اپنا لباس ایک جانب لٹکا دیا اور ٹب میں لیٹ کر نیم گرم پانی سے غسل کا لُطف لینے لگا۔

جب مَیں جی بھر کر نہا چُکا تو وہ لمبا سا چغہ پہننے لگا جو ایک کھونٹی سے آویزاں تھا۔ عین اُسی وقت حمام کے دروازے پر دستک ہُوئی۔ مَیں نے باآواز بلند کہا: "آجاؤ۔"

میرا خیال تھا کہ آنے والی کنیز یا اُن کی نگراں ہو گی مگر مَیں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ملکہ ترشینا تھی اور اُس نے بھی ویسا ہی ایک لمبا ڈھیلا ڈھالا ریشمی چغہ پہن رکھا تھا۔ پہلے تو وہ چند لمحوں تک مجھے غور سے دیکھتی رہی' پھر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگی۔ مَیں نے اُس کی آنکھوں کی تحریر پڑھ لی تھی اس لیے مَیں نے اُس تحریر پر عمل کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیا۔

●

ترشینا تخلیے میں اگرچہ صرف ایک عورت تھی لیکن وقفے وقفے سے وہ ملکہ بھی بن جاتی تھی اور ایک چھوٹی سی مملکت کی ملکہ ہونے کے ناتے سلطنتِ بہرام اور شاہ ضرغام کے بارے میں سوالات کرنے لگتی تھی۔ ایک بار اُس نے کہا: "شاہ ضرغام کے بارے میں تم نے جو کچھ بتایا ہے' اُس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک جنونی آدمی ہے۔"

"وہ مکمل طور پر جنونی نہ سہی لیکن ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب وہ ہوش و خرد سے یکسر بے گانہ ہو جائے گا۔ وہ وقت کب آئے گا' یہ مَیں نہیں کہہ سکتا۔"

"کیا اُس کی یہ مجنونانہ کیفیت اُس کی حکمرانی پر اثر انداز ہوئی ہے؟"

"ہاں۔ اگر اُسے ذرا سا بھی شک ہو جائے کہ کوئی اُس کے وقار اور اقتدار کے لیے خطرہ ہو سکتا ہے تو وہ دیوانہ وار تشدد کرنے پر اُتر آتا ہے۔"

"پھر تو یہ صُورتِ حال زیادہ دیر تک برداشت نہیں کی جا سکے گی اور اُس کے خلاف بغاوت ہو جائے گی۔"

"لیکن اس بغاوت کے نتائج تباہ کُن ہوں گے۔ شاہ ضرغام اپنی مجنونانہ کیفیت کے باوجود سلطنتِ بہرام کی سالمیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اگر اُسے اقتدار سے محروم کر دیا گیا تو سلطنت کے ایک حصے پر منگول اور دُوسرے پر قزاق قابض ہو جائیں گے اور وہ عوام کے ساتھ ضرغام سے بھی زیادہ بُرا سلوک کریں گے۔ اس لیے جب تک ضرغام کا کوئی

ہتر نعم البدل نہ ملے' وہاں بغاوت نہ ہو تو اچھا ہے۔"

"تمھارے خیالات بھی شہزادہ آلپ کے خیالات سے ملتے ہیں۔"

"وہ کون ہے؟"

"وہ اماراتِ خمسہ کے مشترکہ بیڑے کا امیر البحر اور میرے شوہر کا ست ہے۔ مَیں امورِ سلطنت میں اکثر اُس سے مشورہ لیا کرتی ہُوں۔" رہنماؤ۔ یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔ فی الوقت مجھے آسُودگی کی ن گھڑیوں سے پُورا پُورا خراج وصُول کر لینے دو۔"

اور ہم ایک بار پھر آسُودگی کے ان لمحات سے خراج وصُول کرنے ں مصرُوف ہو گئے۔

● دُوسری صبح جب مَیں بیدار ہُوا تو مَیں نے دیکھا کہ ترشینا نرم تکیوں کے ایک ڈھیر پر جھکی ہوئی ایک خریطے پر کچھ لکھنے میں مصرُوف ہے۔ مَیں خاموشی سے لیٹا اُسے دیکھتا رہا۔ جب وہ لکھنے سے فارغ ہُوئی تو خریطہ لپیٹتے ہُوئے بولی: "مَیں شہزادہ آلپ کو خط لکھ رہی ہُوں۔"

"وہ کون ہے؟" ایک بار پھر میرے مُنہ سے یہ سوال نکل گیا۔

"مَیں نے بتایا تو تھا مگر وہ اُس کا اُدھورا تعارف تھا۔ دراصل لپ کے دادا سے شاہ ضرغام کے دادا نے سلطنتِ بہرام چھین لی تھی اور آلپ کے دادا کو اماراتِ خمسہ میں پناہ لینا پڑ گئی تھی۔ والیانِ اماراتِ خمسہ آلپ کے باپ دادا اور خُود آلپ کی مدد تو کرتے آ رہے ہیں اور اُنھوں نے آلپ کو ایک بڑا عہدہ بھی دے رکھا ہے لیکن سلطنتِ بہرام کی بازیابی کے لیے وہ اُس کی کوئی مدد کرنے کو تیار نہیں۔"

"کیا یہ زیادتی نہیں؟"

ترشینا نے جواب دیا تو بے حد سنجیدہ تھی۔ "اماراتِ خمسہ کی مجموعی طاقت سلطنتِ بہرام کی طاقت سے نِصف بھی نہیں لہٰذا وہ اپنے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اگر اس وقت ضرغام کے خلاف فوج کشی کی جائے تو کامیابی کا قوی امکان ہے کیونکہ اُس کے رویّے نے اُس کے اپنے آدمیوں کو اندرونی طور پر اُس کا دشمن بنا دیا ہے۔"

"تو کیا آپ کے خیال میں شہزادہ آلپ کو سلطنتِ بہرام پر حملہ کر دینا چاہیے؟"

"مَیں یہ تو نہیں جانتی لیکن یہ ضرور چاہتی ہُوں کہ سارے حالات اُس کے علم میں آ جائیں تو بہتر ہے۔"

"کیا تمھارے خیال میں وہ ضرغام سے بہتر ثابت ہو سکتا ہے؟"

"یقیناً... مَیں نے اُسے بُلایا ہے تاکہ وہ تم سے معلومات حاصل کر سکے۔"

"وہ کب آئے گا؟"

"معلوم نہیں۔ آج کل وہ اس کوشش میں ہے کہ اُس کی شادی اماراتِ نیلاب کے والی کی بیٹی شہزادی عنبر سے ہو جائے۔ اس لیے اُسے خفیہ طور پر تنہا آنا پڑے گا۔"

●

ملکہ ترشینا اپنی رعایا میں اس لیے قدر و احترام سے دیکھی جاتی تھی کہ وہ تقریباً روزانہ رفاعی کاموں میں مصرُوف رہتی تھی۔ وہ دُور دراز علاقوں میں جا کر عوام کے حالات معلوم کرتی' اُن کی ممکنہ آسائشوں کا خیال رکھتی' امورِ سلطنت کی انجام دہی کے لیے مجلسِ مشاورت کے اجلاس بُلاتی اور فوجی کیمپوں کا معائنہ کرتی رہتی تھی۔ وہ اس محل میں کبھی کبھی تعطیلات منانے آتی تھی ورنہ اُس کا بیشتر وقت اُسی قدیم سنگی قلعے کے درمیان سیل زدہ رہائش گاہ میں گزرتا تھا جو شہر میں واقع تھا۔

جب وہ اپنے کاموں میں مصرُوف ہوتی' مَیں چپکے سے بندرگاہ جا کر اپنے لوگوں سے مل آتا تھا۔ کشتی کی مرمت تسلی بخش طور پر جاری تھی اور ملاح سیر و تفریح میں اپنا وقت گزار رہے تھے۔ پرنیال کے لوگ انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

روزانہ میرے دو چار گھنٹے ملکہ ترشینا کے کمانڈر کے ساتھ بھی گزرتے تھے۔ یہ کمانڈر وہی تھا جو پہلے دن تین افسروں کے ساتھ ہماری کشتی پر آیا تھا۔ وہ خاصا سمجھ دار آدمی تھا اور پرنیال کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک روز اُس نے مجھے بتایا: "تین سو سال پہلے میرے آبا و اجداد اماراتِ پرنیال کے والی تھے لیکن ملکہ کے اجداد نے سازش کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ تاہم اب ہمیں اس بات کا کوئی دُکھ یا شکوہ نہیں ہے۔ ہم ملکہ اور امارات کو خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں۔"

●

کمانڈر سے اس ملاقات کے دو روز بعد ایک خبر نے پرنیال میں خوف و ہراس کی لہر دوڑا دی۔ قزاقوں کی ایک کشتی جزیرے کے شمالی ساحل کے قریب طوفان کا شکار ہو کر غرق ہو گئی تھی۔ اس کشتی کا آدھا عملہ تو ڈُوب گیا لیکن آدھے لوگ تیر کر ساحل پر پہنچے تو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں گرفتار کرنے والے دستے کی قیادت خود ملکہ ترشینا کر رہی تھی۔ گرفتار شدگان نے جو کچھ بتایا وہ اہلِ پرنیال بلکہ پُوری اماراتِ خمسہ کے لیے پریشان کُن تھا۔ اُنھوں نے بتایا کہ منگولوں کی ایک فوج خلیج الجزائر کے سامنے سمندر کے ساحل پر خیمہ زن ہے اور اُنھوں نے قزاقوں کے پاس ایک وفد بھیجا ہے کہ وہ اُن کے پاس آنا چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ اُنھوں نے یہ بتائی ہے کہ وہ قزاقوں کے ساتھ دوستانہ معاہدے کے بعد سلطنتِ بہرام پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اور انھیں سلطنت کی شمالی سرحد تک پہنچنے کے لیے قزاقوں کی مدد درکار ہے جس کے عوض

وہ قزاقوں کو سلطنت کے ساحل پر بندرگاہیں بنانے اور بستیاں بسانے کی اجازت دے دیں گے اور قزاق بڑی آسانی سے سلطنتِ بہرام کے مختلف علاقوں میں لوٹ مار کر سکیں گے۔

قزاقوں کے اس بیان سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ شمال کی طرف سے قزاق اور جنوب سے منگول حملہ کریں گے تو شاہ ضرغام کو بیک وقت دو دو محاذوں پر لڑنا پڑے گا جس سے اس کی فوجی طاقت دو حصوں میں بٹ کر کمزور ہو جائے گی اور جب قزاقوں کو ضرغام کے بحریے سے کوئی خطرہ نہیں رہے گا تو وہ اماراتِ خمسہ کی طرف بڑھیں گے۔ چنانچہ ملکہ ترشینا نے کہا: "اگر قزاق اماراتِ خمسہ کی طرف آئے تو برنیال سب سے پہلے اُن کے راستے میں پڑے گا۔ اس لیے منگولوں اور قزاقوں کا یہ گٹھ جوڑ میرے عوام کے لیے بے حد خطرناک ہے۔"

اب ہمیں شہزادہ آلپ کا انتظار تھا تاکہ اس سلسلے میں اس کی رائے بھی معلوم کی جا سکے۔ حسنِ اتفاق سے وہ دو روز بعد ہی برنیال پہنچ گیا جبکہ قزاقوں والی یہ خبر زوروں پر گرم تھی۔

شہزادہ آلپ تنہا نہیں آیا تھا بلکہ اُس کے ساتھ تیس توانا محافظ بھی آئے تھے۔ ملکہ نے اُس سے کہا: "کیا بات ہے شہزادے، تم نے محافظوں کی تعداد اتنی زیادہ کیوں بڑھا دی ہے؟"

"میں کسی کو یہ تاثر تو نہیں دینا چاہتا کہ اپنی جان کے خوف سے اتنے زیادہ محافظ اپنے ساتھ رکھتا ہوں لیکن ضرغام کے بارے میں جو اطلاعات ملی ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں پر دیوانہ وار حملے کر رہا ہے۔ اگر وہ قزاقوں کی سرکوبی کے لیے فوج اور بحریہ بھیج سکتا ہے تو مجھے ختم کرنے کے لیے چند قاتل بھیج دینا اُس کے ایک اشارۂ ابرو کا کام ہے مگر میں آسانی سے اُس کے آدمیوں کا شکار نہیں بننا چاہتا۔"

شہزادہ آلپ کی بات سے میں پوری طرح یہ اندازہ نہ کر سکا کہ فوج اور بحریہ بھیجنے سے اُس کی مراد وہ لڑائی ہے جس میں ہم بھی شامل تھے یا ضرغام قزاقوں کی سرکوبی کے لیے مزید فوج اور بحریہ بھیجنے والا ہے۔ اتنے میں وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ کہستان منگول اور صحرا کے پار سلطنت آریانہ جیسی کوئی سرزمین ہے تاہم مجھے تم جیسے جہاں گرد اور جنگجو سے مل کر خوشی ہوئی ہے جو ملکہ ترشینا جیسی ذی فہم ہستی کا دوست بھی ہے۔"

ترشینا اپنی تعریف پر قدرے شرما سی گئی اور بولی: "میرا خیال ہے کہ ہم ان مسائل پر علیحدگی میں بات چیت کریں جہاں ہمارے علاوہ اور کوئی نہ ہو۔"

چنانچہ ہم تینوں اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے جہاں کھانا چُنا ہوا تھا۔ کھانے کے دوران ہم باتیں کرتے رہے۔ جب خالی برتن اُٹھا لیے گئے تو میں نے آلپ سے کہا: "آپ نے بتایا تھا کہ شاہ ضرغام قزاقوں کی سرکوبی کے لیے فوج اور بحریہ بھیجنے والا ہے۔ ذرا اس کی تفصیل تو بتایئے۔"

"مجھ تک پہنچنے والی اطلاعات کے مطابق اُس نے دو سو سے زائد جنگی کشتیاں اور جہاز اکٹھے کیے ہیں۔ اُن پر کتنے فوجیوں کو بھیجا جا رہا ہے، یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ تاہم اندازاً وہ دس ہزار سے زیادہ ہوں گے۔"

"وہ قزاقوں کو پیس دینا چاہتا ہے لیکن اُس کے پاس اتنے ملاح کہاں سے آئے ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔

"جبری بھرتی کے ذریعے۔ میں نے سنا ہے کہ اُس نے فرار ہونے والی کشتی کے عملے کو بھی معاف کر دیا ہے تاکہ اُسے بھی دوبارہ اپنے بحریے میں شامل کر سکے۔"

"ضرغام اور معافی!... یہ ناممکن ہے جناب۔ یہ صرف ایک جھانسہ ہے تاکہ وہ اُن سب کو تڑپا تڑپا کر مارے جو فرار ہو گئے تھے۔ ویسے ضرغام کی تیاریوں پر قزاقوں کا ردِعمل کیا ہے؟"

"انھیں ابھی ضرغام کی تیاریوں کا علم ہی نہیں ہو سکا۔ منگولوں کے ساتھ اُن کا اتحاد صرف اسی طرح فائدہ مند ہو سکتا ہے کہ وہ سلطنتِ بہرام کی سرحدوں پر حملے کر دیں لیکن منگولوں کے پاس کشتیاں اور جہاز نہیں ہیں۔ اگر قزاقوں کو ضرغام کے ارادے کا علم ہو جائے تو وہ یقیناً اس سے خوف زدہ ہو جائیں گے اور منگولوں سے معاہدہ کر لیں گے۔"

میں شہزادہ آلپ کے اسی تجزیے کا منتظر تھا۔ چنانچہ میں نے کہا: "مجھے آپ سے پورا پورا اتفاق ہے جناب۔ اگر وہ ضرغام سے خوف زدہ ہو جائیں تو ہم قزاقوں سے بھرپور فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔"

میری اس بات پر ملکہ اور آلپ نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا: "وہ اس طرح کہ ہم اُن سے ملیں اور اُنھیں اپنے ساتھ ملا لیں۔"

"تم ہوش میں تو ہو سرفروش؟" آلپ بے ساختہ بولا۔

"ہاں جناب۔ میں نے یہ بات بہت سوچ سمجھ کر کی ہے۔ اگر ہم خاموشی سے بیٹھے منگولوں اور قزاقوں کے درمیان ہونے والے سمجھوتے کا تماشا دیکھتے رہے تو ہم سے بڑا احمق کوئی نہیں ہو گا۔"

"میں اس سلسلے میں تفصیل جاننا چاہوں گا۔"

"یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ضرغام کے ارادے کی خبر پا کر قزاق گھبرا جائیں گے اور کسی بھی ایسے فریق سے معاہدہ کرنے پر تیار ہو جائیں گے جو اُن کی مدد کر سکے۔ اب فرض کیجیے کہ اگر منگول اُن کی مدد نہیں کرتے تو اُن کی بجائے آپ یا اماراتِ خمسہ اُن کی مدد..."

"تم پاگل ہو گئے ہو سرفروش۔" آلپ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا: "والیانِ امارات کسی بھی ایسے منصوبے میں شریک نہیں ہوں گے

جس کے لیے اُنھیں ضرغام سے جنگ لڑنا پڑے۔ دُوسرے مجھے اپنے عہدے سے ہاتھ دھونے کے ساتھ ساتھ شہزادی عنبر سے شادی کا خیال بھی دِل سے نکال دینا پڑے گا۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ یہ تجویز پیش کرنے پر میری گردن اُڑا دی جائے۔"

"والیٔ نیلاب کے متعلق تو تمھارا یہ خیال ٹھیک ہو سکتا ہے الپ۔" ملکہ بولی۔ "کہ تمھارا ہونے والا سسر کمزور دل آدمی ہے لیکن کیا باقی والیانِ امارات بھی اُسی جیسے ہیں؟"

"نہیں۔"

"اگر اُن میں سے کوئی ایک تمھاری تجویز سے متفق ہو جائے تو کیا باقی اُس کی تقلید نہیں کریں گے؟"

"میرا خیال ہے کہ کریں گے۔"

"تو پھر تمھیں سرفرِش کی تجویز پر عمل کرنا چاہیے۔" ملکہ نے اُسے کہا۔ "اس سلسلے میں تم اور کیا کہنا چاہتے ہو سرفرش؟"

"اگر شہزادہ آلپ قزاقوں سے ملیں اور دوستی و تعاون کا یقین دلائیں تو وہ اُن کے ساتھ معاہدے پر تیار ہو جائیں گے اور اُنھیں منگولوں پر ترجیح دیں گے کیونکہ منگولوں کے پاس کشتیاں اور جہاز نہیں ہیں۔ وہ صرف خشکی پر اچھے جنگجو ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر شہزادہ آلپ کو ایک یا دو امارتوں کی تائید حاصل ہو گئی تو یہ خاصے طاقت ور ہو جائیں گے اور اگر پانچوں امارتیں ان کا ساتھ دینے پر راضی ہو جائیں تو یہ قزاقوں کی مدد سے ضرغام کو شکست دے کر اپنے اجداد کی کھوئی ہوئی سلطنت پھر سے حاصل کر لیں گے۔"

"سوچنے کی حد تک یہ باتیں ٹھیک ہیں۔" آلپ بولا۔ "لیکن عملی طور پر ان کے واقعی وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں یا نہیں جن کی تم توقع رکھتے ہو۔"

میں آدھی رات تک اسے اپنی دلیلوں سے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر وہ بولا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بڑے ذی فہم ہو شہزادے اور جب کوئی منصوبہ بناتے ہو تو اُس کی تمام تر جزئیات پر بھی نگاہ رکھتے ہو۔ تمھارا یہ منصوبہ اگرچہ میرے لیے خودکشی کے مترادف ہے لیکن میں اسے محض اس لیے قبول کر رہا ہوں کہ ان حالات میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش تماشائی کی مانند بیٹھے رہنا بھی حماقت ہو گی۔"

"تو کیا آپ مجھے اور کہساد کے عملے کو اپنے ساتھ لے جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" آلپ بولا۔ "بلکہ میں تم سے پوچھتا ہوں کیا تم مجھے اور میرے آدمیوں کو قزاقوں کے پاس خلیج الجزائر لے جا سکتے ہو؟"

"ضرور۔" میں نے جواب دیا۔ "حالانکہ میرے عملے کے کچھ لوگ وہاں جانا پسند نہیں کریں گے کیونکہ انھیں قزاقوں سے نفرت ہے۔"

"کیا تمھیں اپنے عملے کی وفاداری پر شک ہے؟"

"نہیں۔ وہ تو اسی اُمید پر زندہ ہیں کہ ضرغام ختم ہو تا کہ وہ دوبارہ اپنے گھروں کو جا سکیں۔"

"بس تو پھر اپنے عملے کی ذمّے داری تم پر ہے۔" آلپ نے فیصلہ کُن انداز سے کہا اور محفل برخاست ہو گئی۔

تیسرے روز کہسار نے خلیج الجزائر کی طرف اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ ملکہ ترشینا بھی ہمارے ساتھ آنا چاہتی تھی مگر میں نے یہ کہہ کر اُسے منع کر دیا کہ ہماری کشتی پر کسی خاتون کے سفر کرنے کی آسائشیں نہیں ہیں۔ اس لیے اُس نے اپنا کمانڈر، اُس کے دو ذاتی محافظ اور بارہ بہترین جنگجو ہمارے ساتھ بھیج دیے اور کہا۔ "تم نے مجھے اپنی دلیل سے قائل کر کے ساتھ چلنے پر تو مجبور کر دیا ہے مگر اب جلدی لوٹ آنا اور کامیاب لوٹنا۔"

سفر کے دُوسرے دن ملکہ ترشینا کے کمانڈر نے ایک ایسا شوشہ چھوڑا جس پر میرے علاوہ کشتی کے ہر فرد کے کان کھڑے ہو گئے اور اُنھیں کمانڈر کی بات میں بڑا وزن نظر آیا۔ اُس نے کہا تھا۔ "بہت ممکن ہے کہ قزاق ہمارے خلوصِ نیت پر یقین نہ کریں اور اگر اُنھیں یقین نہ آیا تو صلح و آشتی کے سفید پرچم کے باوجود جونہی ہماری کشتی اُن کی توپوں کی زد میں آئے گی، وہ گولہ باری کر کے ہمیں نیست و نابود کر دیں گے۔ اس لیے بہتر یہ ہو گا کہ ہم اپنے ساتھ کوئی ایسا ثبوت بھی لے جائیں جو اُنھیں ہماری باتوں اور خلوصِ نیت کا یقین دلا سکے۔"

"اس کی ضرورت نہیں کمانڈر۔" مجھ سے پہلے ارغون بول اُٹھا۔ "قزاق بھی صلح و آشتی کے پرچم کا احترام کرتے ہیں۔"

کمانڈر نے ارغون کی بات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ وہ کبھی کسی کم رُتبہ آدمی کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "میں سچ کہتا ہوں شہزادے کہ قزاق ہماری باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیں گے۔ ہاں اگر ہم شاہی بحریے کا کوئی جہاز پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائیں تو وہ فوراً یقین کر لیں گے کہ ہم ضرغام کے خلاف ہیں اور یہی بات اُنھیں ہم سے دوستی کے معاہدہ و تعاون کے لیے مجبور کر دے گی۔"

"خیال تو اچھا ہے کمانڈر مگر ہمیں شاہی بحریے کا جہاز کہاں سے ملے گا؟" میں نے پوچھا۔

"میری اطلاعات کے مطابق شاہ ضرغام نے اپنے کچھ جہاز امارات خمسہ کے ساحلوں پر نگاہ رکھنے کے لیے بھیج دیے ہیں۔" کمانڈر بولا۔

"وہ اماراتِ خمسہ کے ساحل پر اپنے جاسوس اور قاتل اُتارنا چاہتا ہو گا۔" شہزادہ آلپ نے خیال ظاہر کیا۔

"شاید۔" کمانڈر نے کہا۔ "لیکن اگر ہم اُن جہازوں میں سے ایک پر کسی طرح قبضہ کر لیں تو نہ صرف قزاقوں کو اپنی بات کا بہ آسانی یقین دلا سکیں گے بلکہ اماراتِ خمسہ کے والی بھی متفقہ طور پر آپ کی مدد کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

شہزادہ آلپ کمانڈر کی بات پر اثبات میں سر ہلا کر کچھ سوچنے لگا لیکن میرے نزدیک شاہی بحریے کے جہازوں پر حملہ کرنا حماقت تھی۔ دُوسرے اگر کمانڈر کو ضرغام کے جاسوس جہازوں کی آمد کا علم ہو چکا تھا تو اُس نے یہ بات وہاں پر نیال میں کیوں نہیں بتائی تھی۔ لیکن میں محض اس لیے کھُل کر کمانڈر کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کی بات شہزادہ آلپ کے دل کو لگی تھی۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ "کمانڈر بالکل ٹھیک کہتا ہے سرفرش۔ اگر شاہی بحریے کا جہاز ہمارے ہاتھ لگ گیا تو اماراتِ خمسہ کا مشترکہ بیڑا اور فوج بڑی آسانی سے مل جائے گی۔"

میں نے شہزادہ آلپ کی تائید یا تردید کرنے کی بجائے خاموش رہنا زیادہ مناسب سمجھا اور کیبن سے نکل کر عرشے پر آ گیا۔

دُوسری صبح طلوعِ آفتاب کے وقت دیدبان پر چڑھے ہوئے ملاح نے "جہاز... جہاز" چلا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تو میں بھی مستول پر چڑھ گیا۔ دُور افق پر کسی جہاز کے دو بڑے بڑے مستول دکھائی دے رہے تھے۔

ملاح کی آواز پر شہزادہ آلپ اور کمانڈر بھی عرشے پر آ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب جہاز قریب آ گیا تو کمانڈر چلایا۔ "یہ جہاز شاہی بحریے کا ہے۔"

"موقع اچھا ہے سرفرش۔ جیسے بھی ہو اس پر قبضہ کیا جائے۔" آلپ نے فیصلہ سُنا دیا۔ اب میرے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے چلا چلا کر احکامات دینا شروع کر دیے۔

میرے دو سو آدمی جو تلواروں، تیر کمانوں، کلہاڑوں اور توڑے دار بندوقوں کا استعمال بخوبی جانتے تھے، اپنے اپنے ہتھیار چپو چلانے والی بنچوں کے نیچے رکھ کر ہر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ باقی توپوں اور منجنیقوں کے ساتھ ساتھ عرشے پر صف آرا ہو گئے تاکہ موقع ملتے ہی جہاز پر جا سکیں۔ شہزادہ آلپ اپنے محافظوں اور کمانڈر اپنے سپاہیوں کے حلقے میں کشتی کے اگلے اور پچھلے حصوں میں مستعد تھے۔ میں نے دیکھا، آلپ کے چہرے پر جوش جھلک رہا تھا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

نقارچیوں نے کشتی کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے نئے تال بڑھا دیے لیکن میں نے اُنھیں تال مدھم کرنے کا حکم دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے آدمی تھک جائیں۔ انتظامات کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے دیکھا کہ شہزادہ آلپ زرہ بکتر پہنے ہوئے ہے اور خنکی کے باوجود پسینے میں شرابور ہو رہا ہے۔ اُس کے برعکس کمانڈر نے خود پہنا تھا نہ ہی زرہ بکتر۔ اُس کے پاس صرف ایک تلوار اور ایک خنجر تھا مگر وہ بھی پسینے سے شرابور تھا۔ وہ اسلحہ اور زرہ بکتر کی بجائے رفتارِ جنگ کا قائل معلوم ہوتا تھا لیکن شاید اپنی بیس سالہ ملازمت کے دوران اُسے جنگ لڑنے کا عملی تجربہ نہیں تھا ورنہ وہ اتنی بے پروائی نہ برتتا۔

میں نے شاہی جہاز کی طرف دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ بھی چوکنا ہو گیا ہے۔ اُس کے بادبان بھی لپیٹ لیے گئے ہیں اور عملہ اپنی اپنی جگہ مستعد ہے۔ میں نے کشتی کی رفتار بڑھانے کا حکم دیا تاکہ کاوا کاٹ کر جہاز کے درمیانی حصے کی سیدھ میں آ جائے۔ اتنے میں جہاز کے عرشے پر سفید رنگ کا دُھواں اُبھرا اور چند لمحوں بعد ہماری کشتی سے کوئی تین سو گز کے فاصلے پر توپ کے اُگلے ہوئے گولے نے پانی میں تلاطم برپا کر دیا۔ یہ دیکھ کر کمانڈر بولا۔ "اُن کا توپچی اناڑی معلوم ہوتا ہے۔"

"اتنا بھی نہیں کہ اُس کا تیسرا چوتھا گولا ہمیں نشانہ نہ بنا سکے۔" میں نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ کمانڈر کو شاید معلوم نہیں تھا کہ جہاز کے توپچی اندازہ لگانے کے لیے گولے داغ رہے ہیں۔ میں نے کشتی کی رفتار ایک دم تیز کروا دی تاکہ وہ آگے بڑھ کر توپوں کی زد سے نکل جائے اور یہی ہوا۔ اب کے گولے ہماری کشتی کے اُوپر سے سنسناتے ہوئے سو گز دُور جا گرے۔

میرے ملاح اگرچہ پسینے سے شرابور ہو گئے تھے مگر بیشتر کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ کچھ کی نگاہیں اپنے اسلحہ پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اُنھیں استعمال کرنے کے لیے مضطرب نظر آ رہے تھے۔ میں بڑی توپ کے پاس آیا اور تلوار لہراتے ہوئے دھاڑا۔ "کہسار کے جوانو... حملے کے لیے تیار رہو۔ نقارچیو۔ طبلِ جنگ بجاؤ۔"

کشتی کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ طبلِ جنگ نے جوانوں کے سینے جوش سے معمور کر دیے۔ جہاز قریب تر آنے لگا۔ توپچیوں نے فلیتے سُلگا لیے اور میرے اشارے کا انتظار کرنے لگے۔ کشتی کچھ اور آگے بڑھی تو میں نے توپیں داغنے کا اشارہ کیا۔ بیک وقت چار توپوں نے گولے اُگلے اور اُن میں سے دو نشانے پر بیٹھے تو میں بے ساختہ چلا اُٹھا۔

"شاباش جوانو۔"

توپچی مسکرائے اور دوبارہ توپوں میں گولے ڈالنے لگے۔ میں نے کمانڈر کی طرف دیکھا۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ میں نے عرشے پر کھڑے جوانوں کو لیٹ جانے اور جہاز پر کُودنے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا تو شہزادہ آلپ کے محافظ اسی طرح کھڑے رہے۔ میں غصّے سے دھاڑا۔ "لیٹ جاؤ۔"

شہزادہ آلپ نے میری آواز پر انھیں تعمیلِ حکم کا اشارہ کیا اور خود میرے
پاس آ گیا۔ اب دونوں طرف سے اندھا دھند گولہ باری جاری تھی مگر میں
اس تاک میں تھا کہ ہماری کشتی جہاز کے متوازی آ جائے تاکہ اُس کے پہلو میں
جا کر میں اپنے جوانوں کو جہاز پر بھیج سکوں اور پھر وہ لمحہ بھی آ گیا۔ کشتی
تیزی سے گھومی تو ایک جانب جھک کر جہاز کے پہلو میں آ گئی۔ میں اور
کمانڈر نے اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے ریلنگ تھام لی لیکن شہزادہ
آلپ اپنی جگہ مضبوطی سے کھڑا رہا۔ اُس کی یہ جرأت قابلِ داد تھی کیونکہ
دشمن آسانی سے اُسے اپنا نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں نے جہاز کی طرف
دیکھا تو مجھے بڑا تعجب ہُوا کیونکہ جہاز کا عرشہ خالی تھا۔ کچھ لوگ اگلے
اور کچھ پچھلے سرے پر کھڑے تھے۔ درمیانی حصے میں چند ملاح کلہاڑے
لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کمانڈر بولا "میرا خیال ہے کہ جہاز پر
توپچیوں کے سوا کوئی سپاہی وغیرہ نہیں ہیں۔"

"یہ اُن کا مسئلہ ہے کمانڈر" میں نے جواب دیا۔ "اور اگر ایسا ہے
تو ہمارے لیے جہاز پر قبضہ کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔"

یہ سُن کر کمانڈر کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔ شاید اُسے یہ توقع نہیں
تھی کہ ہم جہاز پر اتنی آسانی سے قابو پا لیں گے۔

ہماری توپیں مسلسل گولے برسا رہی تھیں اور جہاز کے تختے
اُن سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اُڑ رہے تھے۔ اتنے میں میرے ملاحوں
نے اپنے چپو اندر کر لیے کیونکہ کشتی اب جہاز سے ٹکرانے والی تھی عرشے
پر لیٹے ہوئے جوانوں نے تو جہاز پر رسّے پھینکنے بھی شروع کر دیے تھے
اور اُوپر چڑھنے والے تھے کہ جہاز کے درمیانی حصے میں ایک بھگدڑ سی
مچ گئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو انکشاف ہُوا کہ مسلح سپاہیوں کے
جتھے جہاز کے نچلے حصے سے عرشے پر آ رہے ہیں اور ان سپاہیوں کی وردیاں
مظہر تھیں کہ وہ عقابی فوج سے تعلق رکھتے ہیں۔ دشمن نے ہمیں یہ تاثر
دینے کے لیے کہ جہاز پر کوئی فوجی دستہ نہیں ہے انھیں جہاز کے نچلے
حصے میں چھپا رکھا تھا اور منتظر تھا کہ جونہی وہ ہماری کشتی کے نزدیک
پہنچیں عقابی فوج کے جنگجو جوان جہاز سے ہماری کشتی پر کود جائیں۔
اس صورتِ حال میں دشمن کی اسکیم کامیاب رہی تھی اور ہم خود ہی اپنی
کشتی جہاز کے نزدیک لا کر موت کے شکنجے میں پھنس گئے تھے۔ میں
اُس وقت جب میں یہ جائزہ لینے میں مصروف تھا کہ اب ہمیں کیا اقدام
کرنا چاہیے ملکہ ترشینا کا کمانڈر تلوار لہرا کر میری طرف لپکا اور اگر
لاشعوری طور پر جھکائی دے کر قلابازی نہ لگاتا تو اُس کا بھرپور وار میری
گردن اُڑا چکا ہوتا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اُس نے یہ حرکت کیوں کی ہے۔
ابھی میں دُوسری قلابازی لگا کر اُٹھ ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ کمانڈر
شاہی جہاز سے پھینکے ہوئے ایک رسّے سے لٹک چکا ہے اور اب
وہ رسّہ تیزی سے جہاز پر کھینچا جا رہا ہے۔ "اوہ" بے ساختہ میرے مُ
سے نکلا اور اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اس سے پہلے کہ
کچھ کرتا، جہاز سے تیر اور گولیاں برسنے لگیں اور عقابی فوج کے جوانو
نے میرے ساتھیوں کے پرخچے اڑانے شروع کر دیے۔

جہاز کی ایک توپ نے ہماری کشتی پر رکھی بڑی توپ کو نشا
بنایا تو توپ لڑھک کر کشتی کے نچلے حصے میں اٹک گئی اور توپچی اس کے
نیچے آ کر گوشت کے لوتھڑوں میں بدل گیا۔ میں نے شہزادہ آلپ کی طر
دیکھا۔ اُس کے چہرے پر خون کی لکیریں اُبھر رہی تھیں۔ شاید جہاز سے
چلائی جانے والی توڑے دار بندوقوں کے چھرّوں نے اسے زخمی کر دیا
تھا۔ اُوپر سے برسائے جانے والے پتھروں کے باعث اُس کی زرہ بکتر
کہیں کہیں پچک گئی تھی مگر وہ مردانہ وار ڈٹا ہُوا اپنے محافظوں کو احکا
دے رہا تھا۔ وہ بھی اپنی توڑے دار بندوقوں سے عقابی فوج کے جوانو
کو نشانہ بنا رہے تھے مگر ایک مرتا تو دو اُس کی جگہ آ جاتے۔

اس صورتِ حال میں ہمارے بچاؤ کی صرف یہی ایک ترکی
باقی رہ گئی تھی کہ کشتی جلد از جلد جہاز سے دُور ہو جائے تاکہ میر
ساتھی بندوقوں اور تیروں کا نشانہ نہ بن سکیں اور عقابی فوج کو
سے کشتی پر کُودنے کا موقع بھی نہ مِل سکے۔ اس لیے میں پھیپھڑوں کی
پوری قوت سے چلّایا۔

"ملاحو... چپو سنبھالو اور کشتی دُور ہٹاؤ۔"

ملاحوں نے فی الفور میرے حکم کی تعمیل کی جبکہ عرشے پر مو
ساتھی عقابی فوج کے تیروں اور بندوقوں کی فائرنگ کا جواب دے
رہے۔ کشتی پہلے جہاز کے پہلو سے ہٹی اور پھر تیزی سے آگے بڑھی۔
دیکھ کر شہزادہ آلپ بولا "یہ کیا کر رہے ہو سرفروش۔ ہم اس غدار کو
کو نہیں بخشیں گے۔ کشتی جہاز کے قریب رہنے دو۔"

"یہ ناممکن ہے شہزادے۔ جہاز پر ہم سے کہیں زیادہ عقابی
کے جوان موجود ہیں۔ اس طرح ہمارا ہر آدمی مارا جائے گا۔ کمانڈر
ہمیں دھوکا دے کر موت کے مُنہ میں پھنسوا دیا ہے لیکن ہمیں کـ
کسی طرح موت کی گرفت سے نکلنا ہے۔" یہ کہہ کر میں تیزی
آگے بڑھا اور توپچیوں کو ہدایات دینے لگا۔ چھوٹی توپوں کے
گولے اُگلنے لگے جنھوں نے جہاز کو اپنے بچاؤ کے لیے رُخ
پر مجبور کر دیا۔ اس طرح ہماری کشتی کو اُس کی توپوں کی مدد سے
جانے کا موقع مِل گیا۔ اب میں نے بادبان بھی کھلوا دیے جو جلد ہی
سے بھر گئے۔ اس طرح کشتی کی رفتار دُگنی ہو گئی اور ہم بہت جلد دُ
کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

اب میں نے اپنے نقصانات کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ شہر

گولوں نے ہماری کشتی میں چھ سوراخ کر دیے تھے مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ سوراخ کشتی کے اُوپری حصے میں ہوئے تھے جن سے پانی اندر نہیں آسکتا تھا۔ مَیں نے کچھ آدمی وہ سوراخ بند کرنے پر لگا دیے اور باقی لوگوں کو وہ بڑی توپ اُوپر کھینچنے پر مامور کر دیا جو پیچھے ہٹ کر نچلے حصے میں اٹک گئی تھی۔

اب مَیں نے اپنے جانی نقصان کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ میرے تیس آدمی مارے گئے ہیں اور پچاس سے زیادہ زخمی ہو گئے ہیں۔ مرنے اور زخمی ہونے والوں میں زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی جو میرے ساتھ عرشے پر تھے۔ شہزادہ آلپ بھی زخمیوں میں شامل تھا۔ اُس نے درد سے کم اور دُکھ سے زیادہ کراہتے ہوئے کہا "یہ سب میرا قصور ہے سرفروش۔ مَیں ہی اُس غدار کمانڈر کی باتوں میں آ گیا تھا۔ اس لیے مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں" یہ کہہ کر وہ کشتی سے پانی میں کودنا چاہتا تھا کہ مَیں نے اسے پکڑ لیا اور کہا۔

"بہادر ہو کر بُزدلوں والی حرکت مت کرو شہزادے۔ جنگ میں بہت کچھ ہوتا ہے تم شاہی بحریے کا جہاز پکڑ کر قزاقوں کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے ناکہ ہم ضرغام کے دشمن ہیں۔ اب ہماری کشتی کی حالت اور زخمی انھیں یہ یقین دلادیں گے"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن ... لیکن پتہ نہیں وہ غدار کمانڈر ضرغام کو کیا بتلائے گا اور وہ دیوانہ بادشاہ کیا اقدام کرے گا"

"کمانڈر اسے ہمارے منصوبے کی ایک ایک بات بتلائے گا شہزادے۔ لیکن وہ اُسے یہ یقین نہیں دلا سکے گا کہ امارات خمسہ بھی تمھاری مدد کرنے کو تیار ہیں۔ اس لیے شاید ضرغام امارات خمسہ پر حملہ نہ کرے"

"لیکن وہ پاگل ہے سرفروش۔ وہ کوئی بھی فیصلہ کر سکتا ہے"

"اس کے باوجود مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ اتنا پاگل اور احمق نہیں کہ خواہ مخواہ امارات پر حملہ کر دے جب کمانڈر خود یہ نہیں جانتا کہ امارات تمھاری مدد کریں گی تو وہ ضرغام سے کیسے یہ جھوٹ بول سکتا ہے"

"مگر وہ یہ تو بتا سکتا ہے کہ ملکہ ترشینا ہماری حامی و مددگار ہے"

"ہاں"

"اس صورت میں ضرغام پرنیال پر حملہ آور ہو سکتا ہے"

"اگر ضرغام پرنیال پر حملے کی غلطی کر بیٹھا تو اسے اپنے بیڑے کے بیشتر اور تقریباً آدھی فوج سے ہاتھ دھونا پڑے گا کیونکہ پرنیال دفاعی طور پر بہت مضبوط ہے"

اُس شب ہم نے تُوما اور دُوسرے مرنے والوں کی لاشیں اعزاز کے ساتھ سمندر کی نذر کر دیں اور شمال کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ وہاں قزاق ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے لیکن اب ان سے بات چیت ناگزیر ہو گئی تھی۔

مَیں نے توپیں اور بندوقیں کسی بھی وقت داغنے کے لیے تیار کروا دی تھیں مجھے یہ خدشہ تھا کہ اگر غدار کمانڈر نے ضرغام کو پیغام بھجوایا تو وہ ہماری سرکوبی کے لیے جنگی کشتیاں بھیج سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہی اقدام بحریے کا کوئی بڑا افسر کر بیٹھے۔ اسی باعث ہم ہر وقت کسی جھڑپ کے لیے تیار تھے۔ میرے ساتھ ساتھ شہزادہ کو بھی اب پُورا پُورا یقین تھا کہ میرے ساتھی اپنے آپ کو ضرغام کے حوالے کرنے کی بجائے مر جانا زیادہ پسند کریں گے۔

شاہی جہاز سے جنگ کے آٹھویں روز ہم خلیج الجزائر کے قریب پہنچ گئے اور ہم نے اپنی کشتی کا رُخ اُس پہاڑی علاقے کی طرف کر دیا جہاں قزاقوں کی نگہبان چوکیاں تھیں مگر اُس طرف جانے سے پہلے ہم نے مستولوں پر سفید پرچم نصب کر دیے تھے۔

اگرچہ ارغون اب بھی پُورے یقین کے ساتھ کہتا تھا کہ قزاق سفید پرچم کا احترام کرتے ہوئے ہم پر حملہ نہیں کریں گے مگر اس کے باوجود مَیں نے اپنے عملے کو جوابی حملے کے لیے تیار رکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قزاق نفسیاتی طور پر خوفزدہ ہو چکے ہیں اور خوفزدہ لوگ اکثر بوکھلا کر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں جن کی توقع نہیں ہوتی۔

ہم نے ساحل سے چار میل دُور لنگر ڈال دیے تاکہ دُور مار توپوں کی زد سے باہر رہیں۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ ہمیں ساحل سے کوئی اشارہ ملے گا مگر نہ ہمیں کوئی اشارہ ملا اور نہ قزاقوں نے ایک دُوسرے کو کوئی اشارہ دیا یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا تب مَیں نے آدھے آدمیوں کو سونے اور آدھے کو جاگنے اور چوکنا رہنے کی ہدایات دے دیں۔

رات بخیر و خوبی گزر گئی۔ دُوسرے دن اور دُوسری رات بھی جب نہ کوئی اشارہ ملا اور نہ کوئی کشتی کی طرف آیا تو شہزادہ آلپ گھبرا گیا۔ "وہ لوگ آتے کیوں نہیں؟ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہماری خوراک اور سامانِ رسد یہیں کھڑے کھڑے ختم ہو جائے؟"

"میرا خیال ہے وہ ابھی یہی نہیں سمجھ پائے کہ ہم کون ہیں اور یہ سوچ رہے ہوں گے کہ انھیں ہمارے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ جب وہ کسی فیصلے پر پہنچ جائیں گے تو ہم سے رابطہ قائم کریں گے۔"

دوسری صبح یہ انتظار ختم ہو گیا اور ہمیں ماہی گیری کی ایک کشتی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ پھر اس کے پیچھے چار جنگی کشتیاں نظر آئیں جو توپوں کی زد سے باہر ہی رُک گئیں مگر ماہی گیری والی قریب آ گئی اور اس پر کھڑے ہوئے ایک آدمی نے زور سے چلا کر کہا "اے ہو ... کیا تم لوگ شاہی بحریے سے تعلق رکھتے ہو؟"

مَیں نے ہاتھوں کا بھونپو بنا کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے

بلند جواب دیا "ہمارا ضرغام کے شاہی بحریے سے کوئی تعلق نہیں ہماری یہ کشتی سلطنت آریانہ کے شہزادے سرفروش کی کمان میں ہے اور امارات خمسہ کے شہزادے آلپ کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ ہم خلیج الجزائر کی قزاق برادری کے لیے ایک پیغام لائے ہیں اور اُن کے سربراہوں سے مِلنا چاہتے ہیں"

"تم کیا پیغام لائے ہو؟" اُس آدمی نے پُوچھا۔

چونکہ مَیں پہلے بھی بحری قزاقوں کے ساتھ وقت گزار چکا تھا اور اُن کے دستور جانتا تھا" اس لیے مَیں نے کہا "یہ پیغام صرف برادری کے سات کپتانوں کے گوش گزار کیا جا سکتا ہے دوست"

ماہی گیری والی کشتی سے کوئی جواب نہ مِلا جو ہماری کشتی سے تیس گز دُور کھڑی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ لوگ آپس میں کچھ مشورہ کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد اس کشتی کے مسکان پر بیٹھے ہوئے دو آدمی اُٹھے اور ایک ڈنڈے سے بندھے ہوئے سبز پرچم ہلانے لگے مگر یہ اشارہ ہمارے لیے نہیں چار جنگی کشتیوں کے لیے تھا جو چار میل دُور رُک گئی تھیں۔ یہ کشتیاں آہستہ آہستہ دائیں بائیں سے ہماری طرف بڑھنے لگیں۔ پھر وہی آدمی جس نے سُرخ پگڑی باندھ رکھی تھی ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھاری خواہش کے مطابق تمھیں برادری کے کپتانوں سے مِلا دیں کیونکہ تم امن دا آشتی کے سفید پرچم تلے آئے ہو۔ ہماری چار دل کشتیاں تمھاری کشتی کو اپنے گھیرے میں ساحل تک لے جائیں گی۔ اگر تم لوگوں نے ذرا بھی غلط حرکت کی تو اپنی موت کے ذمے دار تم خود ہو گے"

یہ سُن کر مَیں نے اطمینان کی سانس لی اور ارغون سے کہا "کپتان ارغون۔ اپنے ساتھیوں سے کہو کہ وہ چپو سنبھال لیں اور قزاقوں کی کشتیوں کی رفتار کے ساتھ ساتھ اُن کے درمیان چلتے رہیں"

ہمارا یہ سفر دو روز جاری رہا۔ تیسری صبح پانچوں کشتیاں ایک بندرگاہ میں داخل ہوئیں جہاں تقریباً تیس کشتیاں پہلے سے لنگر انداز تھیں۔ بندرگاہ پر شہتیروں سے بنی ہوئی ایک عمارت پر قزاق برادری کے سات کپتانوں کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس عمارت کے آگے بہت سے نیم پختہ مکانات بنے ہوئے تھے جبکہ عمارت کے سامنے لاتعداد خیمے نصب تھے جن کے درمیان کہیں گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور کہیں چھوٹے چھوٹے الاؤ جلا کر اُن پر کھانا پکایا جا رہا تھا۔ شہزادہ آلپ نے قزاقوں کی کشتیوں کو دیکھتے ہوئے کہا "کیا اسکندر سے لڑائی کے بعد ان کے پاس یہی کشتیاں باقی رہ گئی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ان سے اتحاد کا معاہدہ بھی بے فائدہ ہو گا"

"میرا خیال ہے کہ یہ اُن کے بیڑے کا ایک حصہ ہیں" مَیں نے آلپ کو جواب دیا اور خیموں کی گنتی کرنے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت وہاں تین ہزار منگول شہسوار خیمہ زن تھے اور اتنی بڑی تعداد کو سفارت کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ تو اچھی خاصی فوج تھی جو ایک لمحے کے نوٹس پر جنگ کے لیے تیار ہو سکتی تھی۔ مجھے یہ سوچ پریشان کر رہی تھی کہ قزاقوں کو دعوتِ اتحاد دیتے ہی یہ سب شہسوار ہمارے دشمن بن جائیں گے۔ یہ بات مَیں شہزادہ آلپ کو بھی نہیں بتانا چاہتا تھا کیونکہ وہ ذرا ذرا سی بات پر بھی گھبرا اُٹھتا تھا جبکہ یہ بہت بڑی بات تھی۔

"کہسار" کا عملہ ناشتے میں مصروف تھا کہ ہمیں بندرگاہ سے ایک چھوٹی کشتی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ اس پر آگے وہی سُرخ پگڑی والا آدمی کھڑا تھا جس نے تین روز پہلے ہم سے بات کی تھی لیکن اب اُس کے سر پر پگڑی کی بجائے خود تھا اور اُس نے سینہ بند اور جوشن بھی پہن رکھا تھا اُسے یُوں لوہے میں ڈُوبے دیکھ کر شہزادہ آلپ نے کہا۔ "انھیں ہم لوگوں پر اعتماد نہیں ہے یا منگولوں پر؟ بہرکیف آج رات سوتے وقت مَیں اپنی تلوار دسترس میں رکھنا نہیں بُھولوں گا"

شہزادہ آلپ کی یہ خیال آرائی اس بات کی مظہر تھی کہ وہ اندر سے خوفزدہ ہے۔

چھوٹی کشتی کہسار کے پہلو میں آ کر رُک گئی۔ مَیں، شہزادہ آلپ اور ارغون آنے والوں کے استقبال کو موجود تھے۔ اُس آدمی نے کہا "میرا نام الماس ہے اور مَیں برادری کے سات سرداروں کا نمائندہ ہوں"

"خوش آمدید الماس" مَیں نے جواب دیا اور اپنے ساتھیوں کو اُس سے متعارف کرایا۔ پھر اُسے ہم اپنے کیبن میں لے آئے جہاں ہم نے مشروب اور نمکین سوکھی مچھلی سے اُس کی تواضع کی۔ مَیں نے پوچھا "ہم جلد از جلد سات سرداروں سے مِلنا چاہتے ہیں، کیا وہ بلا تاخیر ہمیں تھوڑا سا وقت دے سکتے ہیں؟"

"مَیں تمھیں اُن کے پاس لے جانے کے لیے آیا ہوں کپتان سرفروش"

الماس کی اس بات پر مَیں نے آلپ اور آلپ نے میری طرف دیکھا اور ہم دونوں نے بیک وقت اثبات میں سر ہلا دیے۔ مَیں نے ارغون سے کہا "کپتان ارغون۔ اب کہسار تمھاری کمان میں ہے خبردار کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس سے اس کا وقار مجروح ہو" مَیں اس بات سے الماس کو یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ یہی وہ کشتی اور یہی وہ عملہ ہے جس نے لڑائی میں اُن کی کشتیاں اور ایک جہاز ڈبو دیا تھا اور اب بھی وقت پڑنے پر کہسار اور اُس کا عملہ مردانہ وار اپنے دشمنوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

ارغون نے اپنا صحیح بازو اُٹھا کر سیلوٹ کیا اور بولا "آپ

کے حکم کی تعمیل ہوگی شہزادے۔"

میں اور شہزادہ آلپ، الماس کے ساتھ اُس کی کشتی میں ساحل کی طرف چل دیے۔

●

قزاق برادری کے سات سرداروں سے ہماری بات چیت تین روز تک جاری رہی مگر اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ اس بات چیت کے دوران تینوں دن چار منگول بھی اس مجلس میں شریک ہوتے رہے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار منگولوں کو دیکھا۔ وہ قدرے پستہ قد مگر چوڑے چکلے آدمی تھے اور مسلسل گھڑ سواری سے اُن کی ٹانگیں کمانوں کی طرح خمیدہ ہوگئی تھیں۔ اُنھوں نے اپنے سروں کے بال دو چوٹیوں میں گوندھ رکھے تھے، اُن کی داڑھیاں تراشیدہ اور مونچھیں سرنگوں تھیں جن کو اُنھوں نے چربی مل کر گویا "کلف" لگا دیا تھا۔

قزاقوں کے سات سردار اور الماس ایک لمبی میز پر اکٹھے بیٹھے رہے۔ اُنھوں نے کمرہ گرم ہونے کے باوجود اپنے فرغلوں پر پوستین کے جیکٹ پہن رکھے تھے اور ہمہ وقت سر سے پاؤں تک مسلح رہے۔ اُن کے حلیے میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی لیکن وہ سب اس بات سے خوفزدہ تھے کہ شاہ ضرغام اُن پر حملے کرنے کی تیاریوں میں مصروف رہے۔

وہ آپس میں تبادلہ خیال کرتے رہے جس پر منگول بظاہر کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے لیکن میں اور آلپ بغور اُن کی باتیں سنتے رہے۔ اُن کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایسے حلیفوں کو ترجیح دیتے ہیں جن کے پاس گھوڑوں کی بجائے کشتیاں ہوں۔ وہ صرف اتنا یقین چاہتے تھے کہ کیا شہزادہ آلپ امارتِ خمسہ کا بحری بیڑا لا بھی سکتا ہے یا نہیں اور یہی وہ سب سے مشکل مسئلہ تھا جس کے بارے میں ہم یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں۔

منگول اپنے نکتۂ نظر کی وضاحت ایک مترجم کے ذریعے کرتے تھے کیونکہ ہم ہی نہیں بلکہ قزاق سردار بھی اُن کے کرخت لب ولہجے سے اُن کی پوری بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔

ہمارے اور منگولوں کے دلائل سننے کے بعد قزاقوں کی طرف سے الماس بولا۔ "ہم نے آپ دونوں فریقوں کے دلائل سن لیے ہیں۔ اب ہم اپنی برادری سے مشورہ کریں گے اور اس کے بعد بتا سکیں گے کہ ہم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔"

اس فیصلے کے بعد اُنھوں نے دو روز کی مہلت مانگی تھی اور ہم نے یہ دو روز بڑے اضطراب میں گزارے۔ تیسرے روز اُنھوں نے جو فیصلہ سنایا، وہ بڑا تعجب خیز تھا۔ الماس نے ہمیں اور منگولوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ فی الوقت کوئی فیصلہ نہ کریں۔ اس لیے کہ ہم نے جو دیکھا اور سنا ہے، وہ ہماری برادری کے تحفظ کے لیے ناکافی ہے۔ یہ فیصلہ اب کسی اور بنیاد پر ہوگا۔" پھر وہ مجھ سے بولا۔ "کیا تمھارے پاس کوئی ایسا سورما ہے سردار سرفروش جو تم لوگوں کی طرف سے مبارزت میں نمائندگی کر سکے؟"

مجھ سے پہلے شہزادہ آلپ بول اُٹھا۔ "ہاں ہمارے ہاں ایسا سورما ہے اور وہ ہے شہزادہ سرفروش۔"

"بہت خوب۔" الماس بولا اور اُس نے یہی سوال منگولوں سے بھی کیا۔ اُن کا نمائندہ بولا۔

"ہمارے پاس جنگجو بہادروں کی کوئی کمی نہیں۔ ہم ایک کیا دس دس سورما منتخب کر سکتے ہیں۔"

"تو پھر فوراً ایک سورما منتخب کر لو۔" الماس نے جواب دیا۔ "ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ شہزادہ آلپ اور تمھارے سورماؤں کے درمیان فیصلہ کرایا جائے۔ جس فریق کا سورما دوسرے فریق کے سورما کو قتل کر دے گا، وہی فریق ہمارا حلیف بننے کا اہل تصور کیا جائے گا اور یہ مقابلہ کل صبح ہوگا۔"

اس فیصلے نے میرے اندر چنگاریاں سی بھر دیں اور میرا جی چاہا کہ میں اپنی تلوار سے قزاق سرداروں کے سر اُڑا دوں، چاہے اس کوشش میں خود بھی کیوں نہ مارا جاؤں۔ یہ احمق اتنا بڑا فیصلہ حقائق کو مدِنظر رکھ کر نہیں بلکہ دو افراد کی مبارزت کے نتیجے سے کرنا چاہتے تھے۔

جب ہم اپنی کشتی میں واپس آئے تو میں آلپ سے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ قزاقوں اور ضرغام کے فیصلوں میں کوئی فرق نہیں۔ آلپ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"اس فیصلے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی سرفروش۔"

"وہ وجہ کیا ہو سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سیدھی سی بات ہے کہ وہ خوفزدہ ہیں۔ اس صورتِ حال میں وہ ہمیں یا منگولوں میں سے اپنی خواہش کے مطابق کسی ایک کو منتخب کرکے دوسرے فریق کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔ جب مبارزت کے ذریعے کوئی ایک فریق منتخب ہو جائے گا تو دوسرا فریق اعتراض نہیں کر سکے گا اور وہ اُس کی مخالفت سے بچ جائیں گے۔"

شہزادہ آلپ کی یہ دلیل واقعی اپنے اندر وزن رکھتی تھی لیکن قزاقوں کی یہ مصلحت میری موت بھی بن سکتی تھی۔

●

اس شب سونے سے پہلے میں شہزادہ آلپ کے ساتھ کل کے مقابلے کے متعلق بات چیت کرتا رہا۔ آلپ نے کہا۔ "تم اپنے مدِمقابل کے

گھوڑے کی بجائے اُس پر حملہ کرنا۔ ہاں اگر خود تمھارا گھوڑا کارآمد نہ رہے تو مدِمقابل کے گھوڑے کو بھی ناکارہ بنا دینا۔ اگر تمھیں اس کی مہلت مل سکے تو۔"

"میں تو سرے سے گھوڑے پر سوار ہو کر مقابلہ کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ تمھیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ اگر وہ نہیں مانیں گے تو گھڑ سواری بھی کر لوں گا۔ تلواریں بھی اپنی ساخت کے اعتبار سے ایسے مقابلوں کے لیے موزوں ہیں، یہ میرے لیے کوئی نیا تجربہ نہیں ہوگا۔" میں گھڑ سواری سے اس لیے گریز کرنا چاہتا تھا کہ مجھے منگولوں ہی کا کوئی گھوڑا دیا جاتا۔ یہ گھوڑے پستہ قد ہوتے ہیں۔ دوسرے منگول اُن سے اور اُن کے گھوڑے منگولوں کی حرکات سے آشنا ہوتے ہیں جبکہ میں گھوڑے کے لیے اور گھوڑا میرے لیے ناآشنا ہوں گے۔ اس لیے میں شاید گھوڑے سے بھرپور فائدہ نہ اُٹھا سکوں۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ وہ یہ کہ میں پستہ قد منگولوں سے قدآور اور زیادہ وزنی ہوں۔ میری یہ خصوصیات گھوڑے کو جلد تھکا سکتی ہیں اور تھکے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر مقابلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

●

صبح ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑے اُڑتے پھر رہے تھے۔ جب میں کشتی سے ساحل پر آیا تو قزاقوں، سات سرداروں اور منگولوں کے گھوڑوں کی دموں والے پرچم کے ساتھ ساتھ کہسار کا صلح و آشتی والا سفید جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔

قزاقوں کے رہائشی علاقے اور منگولوں کے خیموں کے درمیان تین سو مربع گز کے ایک قطعہ اراضی پر جگہ جگہ نشانات نصب کر کے میدانِ مبارزت کی حد بندی کر دی گئی تھی اور میرے گھوڑے پر زین کسی جا رہی تھی۔ میں نے میدان میں جا کر زمین کا جائزہ لیا جو کافی سخت تھی اور اس پر اُگی ہوئی گھاس کا صرف اتنا فائدہ تھا کہ گھوڑوں کے دوڑنے سے دھول نہ اُڑے۔ میں میدان کے اُس کنارے آ گیا جہاں میرا گھوڑا لایا گیا تھا۔ دوسرے کنارے پر میرا مدِمقابل اپنے گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔

میں نے سب سے پہلے اپنے گھوڑے کا جائزہ لیا، زین اور لگاموں کو جانچا اور جب سوار ہونے لگا تو الماس بولا۔ "یہ مقابلہ ضروری ہے نا سرفروش؟"

"میں نہیں جانتا کہ یہ ضروری ہے یا نہیں لیکن میں اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔" یہ کہہ کر میں گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

شہزادہ آلپ میرے قریب آیا اور اُس نے منگول ساخت کی ایک تلوار مجھے دی۔ میں نے تلوار تولی تو نفیریاں اور نقارے بجنے لگے۔ منگولوں کے ساز بھی اُن کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدان کے چاروں طرف ایک ہجوم غفیر جمع ہو گیا جن میں کہسار کا عملہ بھی شامل تھا۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور میدان کے وسط میں آ گیا تاکہ جب میرا مدِمقابل میری طرف بڑھے تو میں اُس کے گھوڑے کی چال دیکھ سکوں۔

دوسرے کنارے کھڑے ہوئے منگولوں کا مجمع پھٹا اور میرا مدِمقابل گھوڑے کو دُلکی چلاتا ہوا میرے سامنے آ گیا۔ میرے گھوڑے کی طرح اُس کا گھوڑا بھی پوری طرح ساز و سامان سے لیس تھا البتہ اُس کی زین کے ساتھ کئی تھیلے اور دو مشکیزے بھی لٹک رہے تھے۔

منگولوں کی طرف سے دو سوار بھی میدان میں آ گئے جبکہ قزاقوں میں سے دو کپتان آگے بڑھے۔ وہ پیدل تھے۔ شاید وہ گھوڑوں سے گر کر تماشہ نہیں بننا چاہتے تھے، اس لیے اُنھوں نے پیدل چلنے کو ترجیح دی تھی۔

میں اور میرا مدِمقابل ایک دوسرے سے دس گز کے فاصلے پر کھڑے ہو گئے اور ان چار منصفین سے مقابلے کے اصول و ضوابط سننے لگے جو کچھ اس قسم کے تھے۔

- مقابلہ اُسی وقت ختم ہوگا جب تم دونوں میں سے ایک مر جائے گا۔
- کوئی فریق اُس وقت تک ایک دوسرے کے گھوڑے کو نشانہ نہیں بنائے گا جب تک کہ ایک فریق گھوڑے سے گر نہ پڑے یا خود اُتر نہ جائے۔
- کوئی فریق تلوار کے علاوہ کوئی دوسرا ہتھیار استعمال نہیں کرے گا۔ تلوار گر جانے یا ٹوٹ جانے کے بعد وہ صرف اپنے ہاتھ استعمال کر سکتا ہے۔
- ہر آدھ گھنٹے کے بعد دونوں مقابلہ کرنے والوں کو دوسرے تازہ دم گھوڑے فراہم کیے جائیں گے اور مقابلے کے اختتام تک کیے جاتے رہیں گے۔

اس اعلان کے بعد نفیریاں اور نقارے پھر بجنے شروع ہو گئے اور مقابلے کے یہ چاروں منصف ایک کنارے کو چل دیے۔ اُنھوں نے ہمیں بھی ایک دوسرے سے دور کرا دیا تاکہ اُن کا اشارہ ملنے پر گھوڑے دوڑا کر مقابلے کا آغاز کر سکیں۔

اب ہم مختلف کناروں پر کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمیں مقابلے کے لیے جو تلواریں دی گئی تھیں وہ کافی بھاری تھیں اور انھیں دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر استعمال کیا جاتا تھا چنانچہ اپنے مدِمقابل کی طرح میں نے بھی تلوار دونوں ہاتھوں میں تھام کر سر پر گھمائی۔ میرے مقابل نے مجھے تلوار گھماتا دیکھ کر اپنا چہرہ آسمان کی طرف اُٹھایا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے عجیب سا نعرہ لگایا۔

میں نے بھی جوابی نعرہ لگایا۔

میرے مدِمقابل منگول نے گھوڑا میری طرف دوڑا دیا۔

میں نے بھی گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اب ہمارے گھوڑے تیزی سے ایک دُوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہم نے لگامیں ڈھیلی چھوڑ رکھی تھیں اور دونوں ہاتھوں سے تلواریں بلند کی ہوئی تھیں مگر میں نے اچانک تلوار کی گرفت بدل دی اور اُسے ضرب لگانے والی پوزیشن سے وار روکنے والی پوزیشن میں لے آیا۔ یہ دیکھتے ہی منگول نے اپنے گھوڑے کی رفتار بڑھا دی۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ تلوار کے دستے سے ہٹا کر باگ تھام لی۔ میں نے یہ حرکت اُس وقت کی تھی جب وہ میرے بالکل نزدیک پہنچ گیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں دونوں ہاتھوں سے تلوار تھامے رہوں گا اور وہ مجھے دے کر پہلے ہی وار میں میرا سر اُڑا دے گا چنانچہ جونہی وہ قریب پہنچا۔ میں نے باگ کھینچ کر گھوڑا ایک دم روک دیا۔ منگول نے اُوپر سے ضرب لگانے کی بجائے دائیں بائیں گھمائی تو میری تلوار . . . اس کا وار روکنے کو موجود تھی۔ دونوں تلواریں بڑے زور سے ایک دُوسرے کے ساتھ ٹکرائیں اور تصادم کی خوفناک آواز کے ساتھ ہی چنگاریاں نکلیں تو دیکھنے والے بے ساختہ واہ واہ چلا اُٹھے۔ منگول کا وار اتنا زوردار تھا کہ اُس کی تلوار میری تلوار سے ٹکرانے کے باوجود فرشِ زمین کو بھی ہل کی طرح چیرتی چلی گئی۔ اُسی لمحے میں نے پلٹ کر تلوار گھمائی جو سنسناتی ہوئی منگول کی گردن سے صرف ایک دو انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔ گھوڑے کی تیز رفتاری نے منگول کی گردن کو تو اُڑنے سے بچا لیا تھا لیکن اُس کے بالوں کی دو چوٹیوں میں سے ایک کٹ کر دُور جا گری۔ تماشائیوں میں ایک غلغلہ اُٹھا اور منگول بُری طرح حیرت زدہ رہ گیا۔ میرا خیال ہے کہ اُس کے ساتھی بھی متعجب رہ گئے ہوں گے کیونکہ اُس کنارے سے جہاں منگول کھڑے تھے کوئی صدا نہ اُبھری۔ شاید اُنھوں نے زندگی میں پہلی بار ایسا تماشہ دیکھا تھا جس میں اُن کے سُورما کی چوٹی کٹ کر دُور جا گری تھی اور وہ خود موت کے مُنہ سے بال بال بچ گیا تھا۔

ہو سکتا ہے کہ میرے مدِمقابل کی حیرت میں خوف بھی شامل ہو لیکن حیرت و خوف کی یہ کیفیت اُس پر سے فوراً گزر گئی۔ اُس نے گھٹنوں سے دباؤ ڈال کر گھوڑے کو موڑا اور میں یہ دیکھ کر متعجب رہ گیا کہ اُس کا گھوڑا تیز رفتاری کے باوجود اپنی پچھلی ٹانگوں پر یُوں گھوم گیا جیسے کوئی رقاصہ پنجوں کے بل گھومتی ہے۔ گھوڑا اُسی رفتار کے ساتھ میری طرف بڑھا تو منگول نے تلوار اُوپر اُٹھانے کی بجائے نیزے کی طرح سیدھی کر لی۔ میں گھوڑے کو وہیں روکے رہا اور جب منگول قریب آنے لگا تو میں نے دُوسرا ہاتھ بھی دستۂ شمشیر پر جما کر حملے میں پہل کر دی۔ میں نے یہ ضرب اپنی پُوری قوت کے ساتھ لگائی تھی۔ اگر منگول ماہر شمشیر زن نہ ہوتا تو تلوار کے دو ٹکڑے ہو جاتے۔ اگر دستۂ شمشیر پر اُس کی گرفت ذرا بھی ڈھیلی ہوتی تو وہ دُور جا گرتی اور اگر وہ شہسوار نہ ہوتا تو خاک میں لوٹتا نظر آتا لیکن وہ میرا وار روکنے کے بعد بھی زین پر موجود تھا اور اُس کی تلوار اُس کے ہاتھوں میں تھی۔

اب مجھے بخوبی یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ میرا مقابلہ کسی معمولی جنگجو سے نہیں بلکہ ایسے ماہر شمشیر زن سے ہے جس کی زندگی گھوڑے کی پیٹھ پر گزری ہے اور جو طاقت کے اعتبار سے بھی مجھ سے کسی طرح کم نہیں۔ اُس کی پھرتی بھی لاجواب تھی کہ اُس نے وار روکنے کے ساتھ ساتھ اپنا گھوڑا موڑ لیا تھا اور اب میرے اردگرد کا دے کاٹ رہا تھا۔ اُسے صرف اسی صُورت ہی مغلوب کیا جا سکتا تھا کہ مقدر ساتھ دے اور فرشتۂ اجل ہم دونوں میں سے اُسے منتخب کر لے۔ مجھے اپنی خوش بختی کا تو یقین نہیں تھا لیکن اس اندازے پر پُورا پُورا یقین تھا کہ یہ مقابلہ کافی طویل ہو گا اور ہماری موت و حیات کے فیصلے میں تھکن اہم کردار ادا کرے گی۔ چنانچہ ہم پینترے بدل بدل کر ایک دُوسرے پر وار کرتے اور بچاتے رہے۔ لوہے سے لوہا ٹکراتا اور چنگاریاں اُڑتی رہیں۔ کبھی تماشائی یُوں خاموش ہو جاتے جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو اور کبھی میدان نعرہ ہائے تحسین سے گونج اُٹھتا اور منگولوں کے فلک شگاف نعرے ہر بار میرے مدِمقابل میں نیا جوش، نیا ولولہ پیدا کر دیتے تھے کیونکہ اُن کی تعداد زیادہ تھی۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ ہر بار جب میں منگول کی ضرب سے بچ جاتا، مجھے یہ خیال ضرور آتا کہ شاید دُوسری ضرب سے نہ بچ سکوں۔ شاید دُوسرا وار کاری ثابت ہو۔

منگول کبھی اپنے گھوڑے کو میرے چاروں طرف گھماتا، کبھی اُلف کر دیتا اور کبھی سرپٹ دوڑاتے ہُوئے ایک دم روک کر پلٹتا مگر میں نے اپنے لیے یہی بہتر سمجھا تھا کہ اپنے گھوڑے کو ایک مختصر سے دائرے میں محدود رکھوں تاکہ وہ تھک نہ جائے۔ اسی طرح میں نے حملے کرنے کی بجائے دفاع کو زیادہ اہمیت دی تاکہ خود بھی نہ تھک جاؤں لیکن میرے ساتھ ایک گڑبڑ یہ بھی تھی کہ میں منگولوں کی طرح مسلسل دونوں ہاتھوں سے تلوار نہیں تھام سکتا تھا اور ایک ہاتھ سے ایسی زوردار ضرب نہیں لگائی جا سکتی جسے منگول روک نہ سکے۔

پہلے راؤنڈ میں اگرچہ میں نے منگول کی ایک چوٹی کاٹ دی تھی جس نے وقتی طور پر میرے مقابل اور اُس کے ساتھیوں کو ہراساں کر دیا تھا لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ اگر چوٹی کٹنے کی بجائے اُسے کوئی زخم کوئی چرکا آ جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا لیکن منگول اتنا چوکنا ہو چکا تھا کہ میری بھرپور کوشش کے باوجود اُسے ایک معمولی سا چیرا بھی نہ آیا اور آدھا

گھنٹہ گزر گیا۔ نفیریاں اور نقارے بجنے بند ہو گئے۔ منگول نے ہاتھ اُٹھا کر مقابلہ روکنے کا اشارہ کیا اور گھوڑا دوڑاتا اپنے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔

مَیں بھی میدان کے کنارے آ گیا۔

میرا جی چاہا، منصفین مقابلہ سے کہوں کہ گھوڑے نہ بدلے جائیں اور مقابلہ مسلسل جاری رکھا جائے لیکن مَیں نے اپنی اس سوچ کو خود ہی رد کر دیا۔ یہ صورتِ حال خود میرے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

مَیں نے دُوسرے گھوڑے کی زین، رکابوں اور لگام کا معائنہ کیا اور اُس پر سوار ہو کر اسے چلایا پھرایا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد مَیں میدان میں آ گیا اور اپنے مدِمقابل کی راہ دیکھنے لگا۔ وہ بھی دُوسرے گھوڑے پر سوار میری طرف آنے لگا۔ مَیں نے غور سے جائزہ لیا۔ اب کے بھی اُس کے گھوڑے پر ویسا ہی ساز و سامان تھا جو مَیں پہلے راؤنڈ میں دیکھ چکا تھا۔

دُوسرا راؤنڈ بھی پہلے راؤنڈ کی طرح نتیجہ خیز ثابت نہ ہُوا البتہ تماشائیوں کا جوش و خروش بڑھ گیا اور بعض اوقات تو اُن کے نعرہ ہائے تحسین میں نقاروں کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔

تیسرے اور چوتھے راؤنڈ کی بھی یہی صورتِ حال رہی۔ ہمیں ایک دُوسرے سے موت کا کھیل کھیلتے ہُوئے پُورے دو گھنٹے گزر چکے تھے اور ان دو گھنٹوں میں کوئی ایک لمحہ، ایک سیکنڈ بھی ایسا نہیں گزرا تھا جب مَیں نے یا میرے مدِمقابل نے ذرا سا بھی تغافل برتا ہو۔ اس لیے کہ وہی ایک سیکنڈ کا تغافل ہی موت کا رُوپ دھار سکتا تھا۔ وہی گھڑی موت کی گھڑی بن سکتی تھی۔

پانچواں راؤنڈ شروع ہُوا تو آفتاب کی تمازت بڑھ گئی اور ہَوا کا زور تھم گیا۔ اب کے جب مَیں میدان میں آیا تو مَیں نے دیکھا کہ منگول کی زین سے لٹکنے والا مشکیزہ خالی نہیں ہے۔ شاید وہ مشکیزے میں پانی بھر لایا تھا تاکہ جب وہ میری زد میں نہ ہو تو دو گھونٹ پی لیا کرے۔ مَیں نے سوچا کہ اگلے راؤنڈ میں مَیں خود بھی پانی کا مشکیزہ لے آؤں گا کیونکہ جسم میں موجود پانی تو پسینے کی صورت بہہ چکا تھا۔

موت و حیات کی جنگ ایک بار پھر شروع ہو گئی۔ مَیں نے اس بار صرف خطرے یاد رکھے اور باقی ہر بات اپنے ذہن سے نکال دی۔ حملے ہوتے رہے، وار روکے جاتے رہے اور ہم پسینے میں ڈُوب گئے۔ مَیں نے دیکھا کہ منگول کا گھوڑا تھک گیا ہے اور اُس کی رفتار میں کمی آنے لگی ہے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ مَیں اپنے گھوڑے کو ایک محدُود دائرے کے اندر گھماتا پھراتا رہتا تھا جبکہ منگول اپنی شہسواری کے زعم میں گھوڑا گھماتا، بھگاتا، کاوے کاٹتا اور میرے چاروں طرف گھومتا رہتا تھا۔ دُھوپ اور گرمی نے بھی اس راؤنڈ میں خاصا پریشان کر دیا تھا۔ منگول بار بار اپنے مشکیزے کی طرف ہاتھ بڑھاتا مگر شاید یہ سوچ کر رُک جاتا کہ اس طرح پانی پینے سے اُس کا وقار مجروح نہ ہو جائے۔

اس راؤنڈ میں مجھے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہے اور یہ مقابلہ کبھی ختم نہیں ہو گا۔ گرمی سے حلق میں کانٹے سے اُگنے لگے تھے اور گھوڑے بھی بُری طرح ہانپ رہے تھے۔ پھر مَیں نے دیکھا کہ منگول کا گھوڑا تھکے تھکے قدموں سے میری طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کی رفتار دیکھ کر میرے دل میں اُمید کی ایک کرن پھُوٹی کہ شاید آخری حملے کا وقت آ گیا ہے اور اس خیال کے ساتھ ہی مَیں اپنی ساری توانائی سمیٹتے ہُوئے بھرپور وار کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

منگول قریب آیا تو اُس نے اچانک اپنا ایک ہاتھ تلوار کے دستے سے اُٹھا لیا اور مشکیزے کے مُنہ سے بندھی رسّی کو جھٹکے سے کھول کر مشکیزے کو اس طرح اُچھالا کہ اُس کے کُھلے مُنہ سے ایک سیاہ مگر چمکدار لمبی سی چیز اُڑتی ہُوئی میرے گھوڑے کے قدموں میں آ گری۔ میرا گھوڑا بُری طرح بِدکا اور الف ہو گیا۔ اب مجھے احساس ہُوا کہ وہ سانپ تھا۔ گھوڑے کے ایک دم الف ہونے سے مَیں پیچھے کو نیچے گرنے لگا اور اُسی لمحے مجھے خیال آیا کہ گرتے ہُوئے نہ صرف گھوڑے کی دولتی سے بلکہ سانپ سے بھی بچنا ہے اور تلوار پر بھی گرفت قائم رکھنی ہے اور اس کے ساتھ ہی مَیں زمین پر آ گِرا لیکن اس سے پہلے کہ گھوڑے کے سُم یا سانپ کا پھن نیچے آتا، مَیں نے پیٹھ کے بل تیزی سے قلابازی لگائی اور کھڑا ہو گیا لیکن قلابازی کھاتے ہُوئے تلوار میرے ہاتھ سے چھُوٹ گئی اور اس سے پہلے کہ مَیں اسے اُٹھاتا گھوڑا سانپ کے ڈر سے پیچھے ہٹا تو مجھے بھی اپنے بچاؤ کے لیے برق رفتاری سے پیچھے ہٹنا پڑ گیا۔ اسی دوران منگول پلٹا اور اُس نے تلوار سے مجھ پر ضرب لگانا چاہی۔ مَیں ایک دم اُچھل کر ایک جانب ہو گیا ورنہ تلوار میرا پیٹ چاک کر دیتی۔ اب منگول نے پولو کے کھلاڑی کی طرح اپنی تلوار کی نوک سے میری تلوار اُچھال دی جو کافی دُور جا گری۔

مجھے گھوڑے سے گرتے اور پھر منگول کو میری تلوار پچاس فٹ دُور اُچھالتے دیکھ کر تماشائیوں میں جوش اور زبردست غلغلہ پیدا ہو گیا۔ منگولوں کے نعرہ ہائے تحسین سے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی خود مجھے اپنی موت اپنی آنکھوں کے سامنے رقصاں نظر آ رہی تھی کیونکہ اب مَیں نہتا ہی نہیں پیدل بھی تھا جب کہ میرا دُشمن گھوڑے پر سوار تھا اور اُس کے ہاتھ میں تیغِ براں چمچما رہی تھی لیکن مَیں اَب بھی مایوس نہیں تھا۔

مَیں نے منگولوں اور قزاقوں کے نعرے ذہن سے نکال دیے اور اپنے ساتھیوں کی مایوسی کا خیال بھی جھٹک دیا۔ اب میری ساری توجہ اپنے دشمن پر تھی جس نے دھوکے اور دغا سے مجھے موت کے دہانے پر کھڑا کر دیا تھا۔ اُس نے اپنا گھوڑا موڑا اور اس یقین و اعتماد کے ساتھ میری طرف بڑھنے لگا جیسے وہ فرشتۂ اجل ہو۔ اُس نے گھوڑے کی رفتار مدھم کر دی۔ شاید وہ اپنے اس کارنامے کو زیادہ سے زیادہ بہادرانہ رنگ دینا چاہتا تھا، ایک ہی وار میں میرا سر بھٹے کی طرح اُڑانے پر تیار تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سوچتا ہو، مَیں موت کو اپنی طرف لپکتا دیکھ کر بھاگ اُٹھوں گا اور وہ میرا تعاقب کر کے میرا ایک ایک عضو زخمی کر دے اور مجھے تڑپا تڑپا کر مارے مگر مَیں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اگر مجھے مرنا ہی تھا تو مَیں مردانہ وار موت کو ترجیح دیتا تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے تلوار سونتے میرے قریب تر آنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی وحشت و بربریت نے مجھے بتا دیا کہ وہ میری موت کے کھیل کو طوالت نہیں دینا چاہتا۔ اس لیے وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس طرح جھپٹے گا جیسے عقاب کبوتر پر جھپٹتا ہے اور اُسی طرح میری گردن اُڑاتا چلا جائے گا جیسے اُس نے میری تلوار اُڑا کر دُور پھینک دی تھی۔

مَیں اُسی لمحے کا انتظار کرنے لگا جب وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر مجھ پر جھپٹے۔ یہی لمحہ تقدیر کا رُخ پلٹ سکتا تھا، موت کا مُنہ موڑ سکتا تھا اور ہاری ہوئی بازی جیت سکتا تھا۔ اس لیے میری نگاہیں اُس پر مرکوز تھیں اور وہ بڑے اعتماد سے دھیرے دھیرے آگے آ رہا تھا۔ پھر جونہی اُس نے اپنے گھٹنے دبائے، وہ گھڑی آ گئی جس کا مجھے انتظار تھا۔ اُس کی تلوار اُٹھی اور میری گردن اُڑانے کے لیے لپکی لیکن اس وقت تک مَیں حرکت میں آ کر جھکائی دے چکا تھا۔ تلوار زن سے میرے سر پر سے گزر گئی۔ اُسی لمحے مَیں نے سر اُٹھایا اور گھوڑے کی دُم پکڑ کر پیچھے کو جھُول گیا۔ گھوڑا اس ناگہانی افتاد سے الف ہُوا تو منگول نے تلوار کے دستے سے ہاتھ ہٹا کر اُسے قابُو میں کرنا چاہا اور یہی اُس کی غلطی تھی۔ مَیں نے گھوڑے کی دُم چھوڑ دی اور جُونہی اُس کے اگلے پاؤں زمین پر ٹکے، مَیں اُچھل کر منگول کے پیچھے سوار ہو گیا اور مَیں نے اپنے بازُو اس کی گردن میں ڈال کر شکنجے کی طرح کس لیے۔ منگول نے تلوار چھوڑ دی اور دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ گھوڑا جو پہلے ہی بدکا ہُوا تھا، مزید بدکا تو ہم دونوں دھڑام سے نیچے آ رہے مگر منگول کی گردن اب بھی میرے بازوؤں کے حلقے میں تھی جو ہر لمحے تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی منگول کی مدافعت بھی گھٹتی جا رہی تھی۔ جلد ہی اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے اور پھر وہ بے حس و بے حرکت ہو گیا۔

مَیں چند لمحے انتظار کرنے کے بعد اُٹھا تو وہ میرے قدموں میں آٹے کی بوری کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں اُبل کر باہر آ گئی تھیں۔

اب پہلی بار مجھے احساس ہُوا کہ ماحول پر سناٹا چھا گیا ہے۔ جیسے تماشائیوں کی زبانیں گُنگ ہو گئی ہوں۔ میدان کے چاروں اطراف کھڑے ہوئے تقریباً دس ہزار افراد یہ تماشا دیکھ کر دم بخود سے ہو گئے تھے۔ پھر اچانک اس خاموشی کو شہزادہ آلپ کی آواز نے توڑ دیا۔

"زندہ باد سرفروش"! اور اس کے ساتھ ہی خاموشی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ گُنگ زبانیں پھر سے نعرے لگانے لگیں۔ نقاروں پر پھر چوٹ پڑنے لگی اور فضا نفیریوں کی آواز سے گنگنا اُٹھی۔

مَیں اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔

اتنے میں الماس ناچتا ہُوا میدان میں آیا اور میری طرف بڑھنے لگا۔ اُس کی دیکھا دیکھی شہزادہ آلپ اور کہسار کے لوگ بھی ناچتے ہوئے میدان میں آ گئے۔

"تم نے کمال کر دیا ہے شہزادہ سرفروش"! الماس باآوازِ بلند بولا۔ "قزاق برادری تمھارا اور شہزادہ آلپ کا ساتھ دے گی اور ہمیشہ تم لوگوں کی حلیف رہے گی"۔

مَیں نے سوچا کہ اُسے منگول کی دغابازی سے آگاہ کر دُوں مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ اب اس انکشاف کا کیا فائدہ؟ ہو سکتا ہے کہ قزاق برادری اُلٹا مجھ پر ہی سانپ پھینکنے کا الزام لگا دیں اور کیے کرائے پر پانی پھر جائے۔ اس شکست سے اُن کے دلوں پر ویسے بھی سانپ لوٹ رہے ہوں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس وقت قزاقوں اور ہم پر حملہ کر دیں اور اگر ہم اُن پر غالب بھی آ جائیں تب بھی اس جنگ سے ہماری طاقت کم ہو جائے گی۔

اتنے میں میرے ساتھیوں نے مجھے اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا اور نعرے لگاتے ہوئے لے جانے لگے۔ مَیں نے دیکھا کہ قزاقوں کی بہت بڑی تعداد بھی اُن کے ساتھ نعرے لگا رہی تھی۔

⧉

رات کا کھانا کھاتے ہُوئے مَیں نے ساحل کی طرف دیکھا۔ منگولوں کے خیموں کے درمیان الاؤ جل رہے تھے۔ سات سرداروں کی عمارت میں لالٹین روشن تھے اور قزاقوں کے گھروں کے سامنے میدان میں مشعلیں جل رہی تھیں جہاں وہ میری جیت اور معاہدے کا جشن منا رہے تھے اور یہ جشن منانے میں وہ حق بجانب تھے۔ شہزادہ آلپ کے ساتھ قزاقوں کے معاہدے کا یہ مطلب تھا کہ اب وہ تنہا نہیں ہیں اور شاہ ضرغام کا مقابلہ انھیں صرف اپنے آپ نہیں کرنا پڑے گا۔ اس معاہدے کے ساتھ ہی قزاقوں نے سمندر اور ساحل کی نگرانی اور نگہبانی ترک کر دی تھی جسے مَیں نے اور آلپ نے اچھا نہیں سمجھا تھا اور حتی الوسع احتجاج بھی کیا تھا مگر قزاقوں کے نزدیک اب نگہبانی کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ان کے حوصلے بہت بلند ہو گئے تھے

قزاقوں کی تیس کشتیاں نیم دائرے کی صورت لنگر انداز تھیں اور وہ سمندر کی طرف سے آنے والے دشمن کا منہ توڑ جواب دے سکتے تھے لیکن ان کشتیوں کا آدھے سے زیادہ عملہ آج جشن میں شرکت کے لیے ساحل پر گیا ہوا تھا جہاں وہ کھانے پینے اور ناچنے گانے میں مشغول تھے مجھے خیال آیا کہ گڑبڑ کی صورت میں وہ اپنی کشتیوں تک کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے؟

آج ہماری کشتی کو وہاں لاکر لنگر انداز کیا گیا تھا جہاں سات سرداروں کی کشتیاں لنگر انداز ہوتی تھیں اور یہ گویا ایک قسم کا اعزاز تھا۔ اس کے علاوہ کوئی دشمن قزاقوں کی کشتیوں کے حلقے کو توڑے بغیر کہسار تک نہیں پہنچ سکتا تھا جو ساحل سے دو سو گز دور تھی اور بڑی اہم بات تھی کیونکہ مجھے اور شہزادہ آلپ کو خدشہ تھا کہ آج رات منگول کوئی گڑبڑ ضرور کریں گے۔ آج کی شکست نے اُن کے سارے خواب اور سارے منصوبے مٹی میں ملا دیے تھے۔ وہ اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے قزاقوں کی کشتیوں کو نذرِ آتش کر سکتے تھے تاکہ اُن میں کوئی دم خم باقی نہ رہے اور اُنھیں یہ احساس بھی کچھ کے دیتا ہے کہ اُنھوں نے منگولوں کی بجائے شہزادہ آلپ کے ساتھ معاہدہ کرکے بدترین غلطی کی تھی۔ وہ یہ اقدام ضرغام کی خوشنودی کے لیے نہیں بلکہ انتقاماً کر سکتے تھے کیونکہ قزاقوں نے اُن کا حلیف نہ بن کر اُن کی سخت توہین کی تھی۔ اس طرح وہ صرف قزاقوں کو ہی نہیں بلکہ شہزادہ آلپ کو بھی سزا دینا چاہیں گے۔

یہی وہ خدشے تھے جن کے تحت ہم نے قزاقوں سے کہا تھا کہ وہ نگرانی اور نگہبانی جاری رکھیں لیکن اُنھوں نے ہماری بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہم کھل کر اپنے خدشات کا اظہار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ہم اپنی کشتی پر لوٹ آئے تھے اور اس سلسلے میں اپنے آدمیوں کے ذریعے جو کچھ کر سکتے تھے، کر چکے تھے۔

۞

میں گزشتہ چار گھنٹوں سے اندھیرے میں بیٹھا ساحل کی طرف دیکھ رہا تھا اتنے میں مجھے دُور سے ایک آواز سنائی دی "اوہوئے !!!!!!" میں ہمہ تن گوش ہو کر ساحل کی طرف متوجہ ہو گیا مگر مجھے کوئی غیر معمولی بات محسوس ہوئی اور نہ کوئی دوسری آواز سنائی دی۔ شاید یہ عجیب سا نعرہ کسی بدمست ملاح نے لگایا تھا مگر پھر میں ایک سائے کو ساحل کے قریب لنگر انداز کشتیوں کی طرف بڑھتے دیکھ کر چونک اُٹھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر اور آگے کو جھک کر غور سے دیکھا تو مجھے اُس سائے کے پیچھے مزید چار سائے چوروں کی طرح بڑھتے نظر آئے۔ چند لمحوں بعد کسی کشتی سے "کون ہے؟" کی آواز بلند ہوئی اس کے جواب میں ساحل پر ایک مشعل جل اُٹھی۔ یہ مشعل اُس

پہلے آدمی نے جلائی تھی۔ پھر اُس نے وہ مشعل سر سے بلند کر لی اور اس کے ساتھ ہی منگولوں کے جنگی نعرے سنائی دینے لگے۔ وہ ہماری توقعات کے عین مطابق قزاقوں کی کشتیاں جلانے آگئے تھے۔

میں اپنے آدمیوں کو مطلع کرنے کے لیے پلٹ گیا کیونکہ میں اُنھیں باآوازِ بلند ہدایات دے کر منگولوں کو ہوشیار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے آدمیوں کو کیا کرنا تھا، یہ میں اُنھیں شام کو سمجھا چکا تھا۔ منگولوں کی آمد کے متعلق سنتے ہی بیس ملاح کہسار کے ساتھ بندھی ہوئی چھوٹی کشتی پر سوار ہو گئے۔ ہر ملاح کے پاس تیر کمان اور تلوار تھی۔

چھوٹی کشتی اندھیرے میں ساحل کی طرف چل پڑی۔

اتنے میں ارغون اور شہزادہ آلپ بھی ہتھیار بند ہو کر آگئے۔ اُن کے پاس تلواریں اور خنجر تھے۔ آلپ کے پاس گرز نما ایک اور ہتھیار بھی تھا جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ارغون اپنا کلہاڑا لانا بھی نہیں بھولا تھا۔ اُس نے کلہاڑے کی ایک ہی ضرب سے لنگر کی رسّی کاٹ دی۔ اب کہسار کسی بھی لمحے خاموشی کے ساتھ حرکت میں آسکتی تھی۔

عرشے پر شہزادہ آلپ کے محافظوں کے علاوہ غدار کمانڈر کے آٹھ سپاہی بھی اپنے ہتھیار لیے موجود تھے۔ وہ کمانڈر کی غداری سے شرمسار تھے اور اُنھوں نے ہم سے التجا کی تھی کہ ان کو لڑائی میں حصہ لینے دیا جائے تاکہ اُنھیں اپنی بدنامی کا داغ دھونے کا موقع مل سکے۔ یہ سب قریب کھڑی ماہی گیری کی ایک اور کشتی میں اُتر گئے۔

اس اثنا میں قزاقوں کی کئی کشتیوں سے شعلے اُٹھنے شروع ہو گئے تھے۔ منگولوں کی مشعلوں سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اب وہ کہاں ہیں۔ سات سرداروں کی عمارت کے قریب سے بندوقوں کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں اور کشتیوں میں سوئے ہوئے بچے کھچے قزاق بھی جاگنے لگے تھے چونکہ منگول جانتے تھے کہ قزاقوں کی بیشتر تعداد جشن میں شرکت کے لیے ساحل پر گئی ہوئی ہے، اس لیے وہ اس مہم پر زیادہ تعداد میں نہیں آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ چند ہی سو سے زیادہ نہیں ہوں گے جو بچے کھچے قزاقوں سے نمٹنے کے لیے کافی تھے جب وہ کشتیوں میں آگ لگا کر قزاقوں کا راستہ روک لیتے تو باقی ماندہ منگول ساحل پر موجود قزاقوں پر حملہ کر دیتے۔ اس حملے کا مطلب قزاقوں کا قتلِ عام تھا۔ اُن کا یہ منصوبہ صرف اسی صورت میں ناکام بنایا جا سکتا تھا کہ میرے آدمی اندھیرے میں اُن پر ٹوٹ پڑیں اور انھیں واپسی کا موقع ہی نہ دیں۔ یہ تاخیر منگولوں کو تذبذب میں ڈال دے گی اور اس دوران میں قزاقوں کو صورتِ حال سے مطلع کر دیا جائے گا۔ میں اسی منصوبے کے تحت کام کر رہا تھا۔

دوسری کشتی بھی ساحل کی طرف چل دی جہاں پہلی کشتی

کے آدمی اندھیرے میں چھپ کر منگولوں پر تیروں اور بندوقوں سے حملے کر رہے تھے۔

میں نے ملاحوں کو اشارہ کیا کہ وہ بھی کہسار کو ساحل کی طرف لے چلیں۔ دوسرے لمحے کہسار بھی ساحل کی طرف بڑھنے لگی۔

بندوقوں کے دھماکوں اور مرنے والے منگولوں کی چیخ و پکار نے ساحل پر ہلچل مچا دی تھی اور لوگ گھروں سے باہر آنے لگے تھے۔ اس لیے منگول اُن پر حملے بھی کرنے لگے تھے اور اُنھوں نے کچھ عمارتوں کو بھی آگ لگا دی تھی لیکن ان جلتی ہوئی عمارتوں کی روشنی ابھی پانی تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ اتنے میں بندوقوں کے مزید تڑاخوں نے مجھے بتا دیا کہ کہسار سے پہلے روانہ ہونے والی دوسری کشتی بھی ساحل پر پہنچ چکی ہے۔ چند منٹوں بعد کہسار بھی ساحل پر پہنچ چکی اور اس کا عملہ بھی منگولوں کو اپنا شکار بنانے لگا۔ پھر کہیں سے ایک جلتی ہوئی مشعل آئی اور میرے ایک آدمی پر گری تو اس کے کپڑوں نے فی الفور آگ پکڑ لی۔ میرا آدمی کشتی پر لوٹنے کی بجائے سمندر میں کود گیا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو خطرے میں ڈالنے کی بجائے ڈوب مرنے کو ترجیح دی تھی۔ اُس کا یہ ایثار دیکھ کر میرے آدمیوں کی کارکردگی میں شدت آگئی۔ وہ منگولوں کو بھوننے لگے لیکن اب منگول بھی ہماری کشتی کو دیکھ چکے تھے۔ اُن کے تیراندازوں نے ہمارے لیے ساحل پر اُترنا مشکل بنا دیا۔

اس دوران ساحل پر جلتی ہوئی عمارتوں کی روشنی نے اندھیرے کا سینہ چاک کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پہلی کشتیوں کے جوان کشتیوں سے کود کر آگے بڑھ رہے تھے اور شہزادہ آلپ اپنا عجیب و غریب گرز گھماتے ہوئے محافظوں اور سپاہیوں کی رہبری کر رہا تھا۔

میں نے پلٹ کر سمندر کی جانب دیکھا تو پتہ چلا کہ قزاقوں کی متعدد کشتیوں میں لالٹین جل اُٹھے ہیں اور کسی کسی کشتی پر نقارے بھی بجائے جا رہے ہیں۔ کچھ کشتیاں جلتی ہوئی کشتیوں سے ہٹائی بھی جا رہی تھیں لیکن جشن میں شرکت کرنے والے قزاقوں میں سے اب تک کوئی بھی ساحل پر نہیں پہنچا تھا۔

اتنے میں مجھے ساحل سے شور سنائی دیا۔ یہ شور قزاقوں کا نہیں بلکہ منگولوں کا تھا کیونکہ اس میں گھوڑوں کی ہنہناہٹ نمایاں تھی۔ اب شاید منگولوں نے عام حملے کا آغاز کر دیا تھا اور اس حملے میں میری دونوں پارٹیوں کا بچنا محال تھا اس لیے منگولوں کے اس حملے کو روکنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے ہر قیمت پر اُن کے حملے کو پسپا کرنے کی ٹھان لی۔ اب میرا خاموش رہنا اور اشاروں سے ہدایات دینا بے معنی تھا۔ اس لیے میں دھاڑ دھاڑ کر اپنے عملے کو ہدایات دینے لگا۔ توپچی اپنی اپنی جگہ مستعد ہو گئے۔ ملاحوں نے کشتی کا رُخ موڑنا شروع کیا اور

جب وہ گھوم کر کنارے کے قریب آئی تو منگولوں کا ہراول گھڑ سوار دستہ بھی اندھیروں سے نکل کر سامنے آگیا۔ وہ تلواریں لیے گھوڑے دوڑاتے ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ منگولوں نے جوشِ انتقام میں یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ سمندر کی جانب سے جوابی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ اُنھیں پورا پورا یقین تھا کہ کشتیوں پر موجود گنتی کے چند قزاق ہیں جو اُن کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے اس لیے وہ پیش از وقت فتح کے نشے میں سرشار کھلم کھلا آگے بڑھتے آ رہے تھے کہ اچانک ہماری توپوں نے گولے اُگلے، خوفناک دھماکے ہوئے اور منگولوں کی ایک بڑی تعداد کے پرخچے اُڑ گئے۔ میرا خیال تھا کہ اس پہلی گولہ باری نے اُن کے کم از کم دو سو افراد ہلاک کر دیے ہوں گے۔

توپچی ایک بار پھر توپوں میں سیسے کے ٹکڑے، پتھر، کیلیں اور جو بھی الا بلا سکتی تھی بھرنے لگے۔ اُدھر مرنے اور زخمی ہونے والے منگولوں اور اُن کے گھوڑوں کے شور میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور منگولوں کے دوسرے دستے آگے بڑھتے آ رہے تھے۔ شاید وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ یہ چیخ و پکار قزاقوں کی ہے مگر جب وہ قریب آئے اور اُنھوں نے ہماری کشتی کو دیکھا تو اُن کی سمجھ میں آیا کہ یہ دھماکے قزاقوں کی کشتیوں پر رکھے بارود کے ذخیروں سے نہیں بلکہ ہماری توپوں کی گولہ باری سے ہو رہے تھے۔ یہ صورتِ حال سمجھنے کے بعد اُنھوں نے تلواریں نیام میں ڈال دیں اور تیر کمان سنبھال لیں۔ انھوں نے جلتی ہوئی عمارتوں کی روشنی میں مجھے بھی پہچان لیا تھا اور ہر قیمت پر مجھے ہلاک کرنے کے لیے تُل گئے تھے۔ اتنے میں توپوں نے ایک بار پھر گولے اگلے اور ہر طرف موت کی چیخیں گونج اُٹھیں مگر منگولوں کے جوشِ انتقام میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ اندھیرے سے نکل نکل کر تیر اندازی کرتے رہے سنسناتے ہوئے تیر کہسار کے تختوں میں بھی گڑتے رہے اور میرے ساتھیوں کے سینوں میں بھی لیکن اب ہم نہ پیچھے ہٹ سکتے تھے اور نہ کشتی سے اُتر سکتے تھے۔ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ اس وقت تک قزاق بھی منگولوں سے برسرِ پیکار ہو چکے ہوں گے لہٰذا اُن کی طرف سے ہمیں کوئی مدد ملنے کی توقع نہیں تھی۔ جو کرنا تھا، ہمیں خود ہی کرنا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا کہ پہلی کشتی والے اور شہزادہ آلپ کے محافظ اس وقت کہاں ہیں اور اُن کے ساتھ کیا بیت رہی ہے۔ ہر شخص جنگی جنون میں مبتلا تھا۔ میرے ساتھی بندوقیں بھی چلا رہے تھے، تیر بھی پھینک رہے تھے اور توپیں بھی داغ رہے تھے۔ عین اُس وقت مجھے اپنے پیچھے ارغون کی چیخیں سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ارغون کے پیٹ میں ایک تیر پیوست ہو گیا تھا۔ اُس نے تیر نکال پھینکا مگر اتنے میں دو تیر اور آئے۔ ایک اُس کی بائیں آنکھ اور دوسرا

اُس کی گردن میں گڑ گیا۔ وہ مُنہ کے بل گرا تو پھر جنبش نہ کرسکا۔ مَیں جانتا تھا کہ یہ تیر مجھے نشانہ بنانے کے لیے چلائے گئے تھے مگر اُن کا شکار ارغون ہوگیا۔

ارغون کی موت نے میرے دل میں انگارے بھر دیے۔ مَیں بے ساختہ چلایا "کہسار کے جواں مردو۔ ہمیں اپنی کشتی کے عقار اور اپنے کپتان ارغون کی موت کا بدلہ لینے، قزاقوں سے دوستی کا حق ادا کرنے اور شہزادہ آلپ کو اس کا حق دلانے کے لیے فتح یاب ہونا ہے یا مردانہ وار مر جانا ہے۔ میرے ساتھ آؤ اور ثابت کردو کہ جب تک ہم میں سے ایک فرد بھی زندہ ہے، منگولوں کی آرزو کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔" یہ کہہ کر مَیں کشتی سے کود پڑا۔ عین اُسی وقت توپ چلنے سے کشتی پیچھے ہٹ گئی اور مَیں ساحل کی بجائے پانی میں جا گرا لیکن جونہی مَیں نے پانی سے سر نکالا۔ مجھے تیروں کی سنسناہٹ کے ساتھ ساتھ اپنے پیچھے پانی کے چھپاکوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ میرے ساتھی بھی دھڑا دھڑ کشتی سے پانی میں کود رہے تھے اور یہ پانی صرف کمر کمر گہرا تھا۔ مَیں نے تلوار سونتی اور آگے بڑھنے لگا۔ اب مجھ پر خون سوار ہوگیا تھا۔ وہی دو ہاتھوں سے پکڑنے والی تلوار جو دو دن کے وقت بھاری محسوس ہوئی تھی اب بہت ہلکی پھلکی لگ رہی تھی۔ مَیں دہاڑتا ہوا آگے بڑھا اور منگولوں پر ٹوٹ پڑا۔

مَیں نہیں جانتا کہ میری تلوار کس پر اور کہاں پڑ رہی ہے مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ خون کے چھینٹے میرے چہرے اور لباس پر پڑ رہے تھے۔ مَیں ایک بگولے کی طرح گردش کر رہا تھا اور میرے ساتھ ساتھ میری تلوار بھی اُوپر نیچے، دائیں بائیں مسلسل حرکت میں تھی۔ میرے کان مرنے اور زخمی ہونے والوں کی چیخ و پکار سے سُن ہوگئے تھے تاہم میری آنکھیں ہر طرف دیکھ رہی تھیں۔

منگول مجھے تیروں کا نشانہ اس لیے نہیں بنا سکتے تھے کہ گھمسان کا رن پڑ رہا تھا جس نے چلہ کھینچنا محال کردیا تھا۔ دُوسرے وہ میرے بجائے اپنے ساتھیوں کو شکار نہیں کرنا چاہتے تھے۔

مجھے معلوم نہیں کہ مَیں کب تک اس جنونی انداز میں تلوار چلاتا اور دشمنوں کا خون بہاتا رہا۔ وقت کا احساس ہی ختم ہوگیا تھا۔

اچانک مجھے شہزادہ آلپ ایک ہاتھ سے تلوار اور دُوسرے سے اپنا عجیب و غریب گرز چلاتا نظر آیا۔ اُس کے ہمراہ بندوق بردار محافظ بھی تھے جنھیں بندوقیں بھرنے کا موقع نہیں ملا تھا اس لیے وہ بندوقوں کے بٹ سے منگولوں کے سر توڑ رہے تھے۔

پھر مجھے غدار کمانڈر کے سپاہی بھی نظر آگئے جو اپنی چھوٹی تلواروں سے شمشیر زنی کے جوہر دکھا رہے تھے۔ اُن میں سے شاید تین مر چکے تھے اور باقی کے پانچوں اپنی بدنامی کے داغ دھونے میں مصرُوف تھے۔

منگولوں کے اس دستے کی اکثریت موت کے گھاٹ اُتر چکی تھی کہ اتنے میں پھر اُن کا جنگی نعرہ سُنائی دیا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ ایک اور تازہ دم دستہ پہنچ گیا ہے۔ جونہی وہ اندھیرے سے نکل کر ہماری طرف بڑھنے لگا، کہسار کی توپیں جو اَب تک خاموش تھیں ایک بار پھر گرجیں اور اُنھوں نے آدھے سے زیادہ دستے کا صفایا کردیا۔ میرے توپچی اب تک اس لیے خاموش تھے کہ اس گھمسان کے رن میں جب ہم دشمن سے گتھم گتھا ہو رہے تھے، وہ توپ چلا کر کہیں ہمیں بھی ختم نہ کردیں۔

اس کے ساتھ ہی مجھے یہ دیکھ کر بھی تعجب ہوا کہ سمندر سے قزاقوں کی دو کشتیاں بھی کہسار کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ پھر اُن کشتیوں کی توپوں نے بھی گولے اُگلے اور قزاقوں کے باقی ماندہ دستے کو بھی خاک و خون میں غلطاں کردیا۔ ان کشتیوں کی آمد سے ثابت ہوگیا تھا کہ قزاق بھی جنگ میں شامل ہوچکے ہیں۔

ساحل کی طرف آنے والے منگولوں کے دستے پہلے توپوں کا شکار بنتے اور پھر ہم سے کٹتے مرتے رہے۔ یہ سلسلہ بہت جلد ختم ہوگیا اور بچے کھچے منگولوں نے راہِ فرار اختیار کرلی۔ صبح جب قزاقوں نے مرنے والے منگولوں کو شمار کیا تو پتہ چلا کہ تقریباً دو ہزار منگول موت سے ہمکنار ہوچکے تھے۔ اس کے برعکس قزاقوں کے تین سو آدمی مرے اور چھ سو سے زیادہ زخمی ہوئے تھے۔

کہسار نے اس جنگ میں چھبیس آدمیوں کی قربانی دی تھی جس میں ارغون بھی شامل تھا۔ تقریباً پچاس آدمی زخمی ہوئے تھے اور باقی سب تھک کر چُور ہوچکے تھے اور گولہ بارُود کا ذخیرہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ قزاق ہمارے شکر گزار تھے کہ ہم نے منگولوں کا پہلا حملہ روک کر نہ صرف اُن کی کشتیوں کو تباہی سے بچایا تھا بلکہ منگولوں کو الجھا کر اُنھیں اتنا وقت دے دیا تھا کہ وہ منگولوں کے خلاف صف آرا ہو سکیں۔ اگر ہم یہ اقدام نہ کرتے تو اس وقت منگولوں کی بجائے تین ہزار قزاق مر چکے ہوتے۔

الماس نے جو خود بھی اس جنگ میں شدید زخمی ہوگیا تھا، قزاق کے سات سرداروں کی طرف سے ہمارا شکریہ ادا کیا۔ یہ شکریہ ادا کرنے کے لیے اسے چارپائی پر اُٹھا کر لایا گیا تھا۔ وہ بولا۔

"شہزادہ آلپ اور شہزادہ سرفروش۔ قزاق برادری آپ لوگوں کی تہ دل سے شکر گزار ہے اور اپنا مستقبل آپ کے ہاتھوں میں دیتی ہے۔ ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس معاہدے سے ہمیں

اتنی جلدی اتنا بڑا فائدہ پہنچے گا۔ اب میں آپ لوگوں سے صرف ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں اور وہ سوال یہ ہے کہ ہم آپ کی بہتر خدمت کس طرح کر سکتے ہیں؟"

"اپنے سارے جنگجو اور جہاز جمع کرو۔ زیادہ سے زیادہ توپیں گولہ بارود اور سامانِ رسد تیار کرو اور پھر یہ سب لے کر جتنی جلدی پرنیال آسکتے ہو آجاؤ۔" یہ شہزادہ آلپ کا جواب تھا۔ "لیکن تمھارے جہاز اور کشتیاں مضبوط ہونی چاہئیں۔ شاہی بحریے پر حملہ کرتے وقت اور بارود برباد نہ کرنا۔ اگر اماراتِ خمسہ کے کسی جہاز یا کشتی کو مدد کی ضرورت ہو تو اُسے ضرور مدد دینا۔ اب ہمارا مشترکہ ہدف صرف ایک ہے ضرغام کا بیڑا۔"

"ایک اور مقصد بھی ہے دوستو!" میں نے کہا۔ "وہ ہے ضرغام کا سر اُڑانا اور سلطنت بہرام کا عقابی تاج شہزادہ آلپ کے سر پر رکھنا۔"

"ایسا ہی ہوگا محسنو۔" الماس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے بعد یہ مجلس برخاست ہوگئی۔

منگولوں کے ساتھ لڑائی میں کہسار کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ملاحوں کی کمی پوری کرنے کے لیے پچاس قزاق میرے عملے میں شامل کردیے گئے۔ گولہ بارود اور سامانِ رسد بھی فراہم کردیا گیا۔ میرے لیے یہ بات باعثِ مسرت تھی کہ کم از کم پانچ سو قزاق میری کمان میں آنا چاہتے تھے مگر میں نے صرف پچاس قزاقوں کو اپنے عملے میں جگہ دی تھی۔

دوسرے دن غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی ہم نے لنگر اُٹھائے اور قزاقوں کے الوداعی نعروں کے شور میں پرنیال کی طرف روانہ ہوگئے۔

◘

جب پرنیال سے صرف ایک روز کی مسافت باقی رہ گئی تو ہمیں یہ پتہ چل گیا کہ ہماری غیر موجودگی میں پرنیال پر کیا گزری ہوگی چنانچہ ہم نے اپنا راستہ بدل دیا اور جنوب کی طرف بڑھنے لگے۔ اس راستے میں ضرغام کے بحریے سے مڈبھیڑ کا امکان نہیں تھا اور یہ اُمید بھی تھی کہ شاید اماراتِ خمسہ کا کوئی جہاز مل جائے جو قزاقوں کے ساتھ معاہدے کی خبر الیانِ امارات کو پہنچا دے۔

ہمیں اس راستے پر کوئی جہاز تو نہ ملا البتہ پرنیال کی ایک ماہی گیر کشتی ضرور نظر آگئی جس میں چار افراد سوار تھے۔ اُن میں سے تین تو مر چکے تھے اور چوتھا دم توڑ رہا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا لیکن چاروں افراد کے جسموں پر لگے ہوئے زخم یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ وہ ضرغام کے پسندیدہ طریقِ ایذا رسانی کا شکار ہوئے ہیں۔

دو گھنٹے بعد مغرب سے آنے والی ہوا اپنے ساتھ دھواں اور جلنے کی بو بھی لے آئی۔ غروبِ آفتاب سے پہلے ہمیں جہازوں اور کشتیوں کے بہت سے ادھ جلے تختے بھی نظر آگئے۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی ہم نے کشتی کی رفتار بڑھا دی۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جارہے تھے۔ تباہ شدہ کشتیوں کے تختوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

پو پھٹتے ہی ہم ساحلِ پرنیال سے جا لگے۔ جہاں جگہ جگہ دھوئیں کے بادل اُٹھ رہے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہنستا بستا پرنیال کھنڈروں میں تبدیل ہوچکا ہے۔ ہر طرف موت اور بربادی نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور زندگی نہ جانے کن اندھیروں میں ڈوب گئی تھی۔

ہم چھپتے چھپاتے بندرگاہ کی طرف بڑھے مگر اب وہاں کشتیوں کی جگہ راکھ اور کوئلوں کے ڈھیر تھے۔ فصیل اور بچے کھچے بُرج دھوئیں سے سیاہ پڑ چکے تھے۔ جگہ جگہ لاشوں کے انبار تھے جن میں بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد اور ملکہ ترشینا کے گھریلو ملازم بھی شامل تھے لیکن پرنیال کے لوگوں سے کہیں زیادہ لاشیں ضرغام کے فوجیوں کی تھیں۔

"ہمارے دوستوں نے موت کے جام پینے سے پہلے اُنھیں بھی پلائے ہیں سرفرزش!" شہزادہ آلپ بولا۔

"ملکہ...!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"یہ تو تلاش کے بعد ہی معلوم ہوسکے گا کہ اس محترم خاتون پر کیا بیتی!"

ہم نے زمینی راستے کی بجائے آبی راستے سے جانے کو ترجیح دی اور کہسار کو وہاں لے آئے جہاں سے ملکہ ترشینا کے سفید محل تک پہنچ سکتے تھے۔ وادی سے گزرتے ہوئے ہم نے جابجا لاشوں کے ڈھیر دیکھے۔ ان لاشوں میں بھی اکثریت ضرغام کے فوجیوں کی تھی۔ ملکہ کے سپاہیوں نے زندگی کے آخری لمحوں تک اُن کا مقابلہ کیا تھا۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ضرغام نے پرنیال کو تباہ کرنے کے لیے کتنا بڑا جانی نقصان برداشت کیا ہے۔ اس نقصان سے اُس کی عسکری قوت کو یقیناً دھچکا پہنچا ہوگا اور وہ خاصی کمزور ہوگئی ہوگی۔

جب ہم ملکہ ترشینا کے سنگِ سفید سے بنے محل کے قریب پہنچے تو وہ ایک کھنڈر میں تبدیل ہوچکا تھا۔ اینٹ سے اینٹ بجا دینے والا محاورہ اُس پر صد فی صد صادق آتا تھا۔ سنگِ سفید کی سلیں دھوئیں سے سیاہ پڑ چکی تھیں اور ہر جگہ ملبے کے نیچے دبی ہوئی لاشوں سے سڑاند اُٹھ رہی تھیں۔ ہم نے بمشکل تمام ملکہ کی خواب گاہ کے ملبے سے اُس کی لاش ڈھونڈ نکالی۔ اُس کا چہرہ بُری طرح متورم نظر آتا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُسے بڑی کرب ناک

موت سے ہمکنار کیا گیا ہے۔

ہم اپنے ساتھ چالیس آدمی لے گئے تھے جو ہر طرح کیل کانٹے سے لیس تھے۔ اُن کی مدد سے ہم نے لاش نکال کر احترام سے ملکہ کو دفن کردیا۔ میں بڑے آہنی اعصاب اور مضبوط دل گردے کا آدمی ہوں لیکن اس موقعے پر میری آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی دھند پھیل گئی۔

جب ہم ملکہ کو دفن کرچکے تو شہزادہ آلپ نے کہا۔ "میں تم سے شرمندہ ہوں سرفرزش کہ اب مجھے الیانِ اماراتِ خمسہ سے کچھ بھی نہیں کہنا پڑے گا۔ وہ از خود ہر قسم کی عسکری امداد دیں گے مگر دیکھنا یہ ہے کہ کونسی امارت کا جہاز سب سے پہلے آتا ہے!"

◘

دوسری شام ہی امارتِ برمک کے تین جہاز ساحلِ پرنیال پر آگئے۔ اُن سے پتہ چلا کہ پرنیال کی تباہی کی خبر ساری امارات تک پہنچ گئی ہے اور اُن کے جہاز بھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔

میں نے جہازوں کے انتظار کے دوران قزاقوں کی ایک جماعت پرنیال کے ساحل پر بھیج دی تاکہ وہ ان لوگوں کو تلاش کریں جو اس تباہی سے بچ گئے ہوں۔ میرا خیال تھا کہ شاید ہمیں ضرغام کے کچھ فوجی بھی مل جائیں گے جن سے ہمیں اُس کے آئندہ منصوبے کا علم ہوسکے گا۔ دو روز بعد جب قزاقوں کی یہ جماعت واپس آئی تو اپنے ساتھ دو اہم خوشخبریاں لے آئی۔ پہلی خوشخبری یہ تھی کہ ملکہ ترشینا کا پانچ سالہ بیٹا ضرغام کے ظلم کا شکار ہونے سے بچ گیا تھا۔ محل پر ضرغام کا قبضہ ہونے سے پہلے ملکہ کے دو وفادار ملازم اُسے وہاں سے نکال کر ایک کھوہ میں چھپ گئے تھے۔ قزاق پانچ سالہ شہزادے اور ملازموں کو ساتھ لے آئے تھے۔

دوسری خوشخبری یہ تھی کہ پرنیال کے مشہور مضبوط پیپوں کی ایک بہت بڑی کھیپ تباہ ہونے سے بچ گئی تھی۔ یہ کھیپ تقریباً ایک ہزار پیپوں پر مشتمل تھی جنھیں ہم سامانِ رسد اور پانی کا ذخیرہ کرنے کے لیے استعمال کرسکتے تھے۔

"ضرغام کے فوجیوں نے انھیں یہ سوچ کر تباہ نہیں کیا ہوگا کہ وہ قیمتی اور کارآمد نہیں ہیں!" شہزادہ آلپ نے کہا اور میری طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ "تم مسکرا کیوں رہے ہو سرفرزش؟"

جب پرنیال میں آنے کے بعد مجھے ملکہ ترشینا کے محل کی طرف لے جایا جارہا تھا تو راستے میں ارغون نے مجھے ان پیپوں کے بارے میں بتایا تھا کہ ان میں رکھی ہوئی چیز سمندر کی تہہ میں بھی صحیح سلامت رہتی ہے۔ اس بات سے مجھے ایک انوکھا خیال سوجھا تھا جس نے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ میں نے آلپ سے کہا۔ "میری مسکراہٹ کا باعث وہ خفیہ اور تباہ کن اسلحہ ہے جو میں ان پیپوں سے تیار کرنا چاہتا ہوں!"

"کیا مطلب؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"اگر ان پیپوں میں بارود بھر دیا جائے اور بارود میں لوہے کے ایک ٹکڑے کے ساتھ چقماق کو رگڑا جائے تو یہ پیپا بڑے سے بڑے جہاز کو اُڑا کر غرق کرسکتا ہے!"

"مگر پیپا جہاز سے کیسے ٹکرائے گا اور پھر لوہے کو چقماق سے کس طرح رگڑا جائے گا؟"

"بارود، چقماق اور لوہے کا ٹکڑا پیپے کے اندر ہوگا مگر پیپے کے منہ پر ایک چمڑا اس طرح باندھ دیا جائے گا کہ اس کے اندر سے ایک تار لوہے کے ٹکڑے تک پہنچ جائے۔ پھر پیپے کو پچاس ساٹھ فٹ لمبے مستول نما ڈنڈے کے ساتھ باندھ دیا جائے گا اور لوہے سے مربوط تار اپنی کشتی تک لایا جائے گا تاکہ بوقتِ ضرورت اسے کھینچا جائے تو لوہا چقماق سے ٹکرائے جس سے چنگاریاں پیدا ہوں اور بارود کو بھک سے اُڑا دیں۔ ہمیں کرنا یہ ہوگا کہ اپنی کشتی کے ساتھ پیپے والا زیرِ آب مستول دشمن کے جہاز تک لے جائیں اور پھر تار کھینچ کر بارود میں آگ لگا دیں۔ اس کے بعد دشمن کے جہاز کی تباہی یقینی ہے!"

"اوہ سرفرزش، تم بلا کے دانشمند ہو دوست!" آلپ بولا۔ "لیکن یہ اسی صورت ممکن ہے کہ ہماری کشتی دشمن کی توپوں کا نشانہ بننے سے محفوظ رہے!"

"یہ خطرہ تو ہر صورت رہے گا... چاہے ہم پیپے کو استعمال کریں یا نہ کریں!"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ بولو اس سلسلے میں کیا کرنا ہے!"

"پیپوں میں بارود بھروا دیا جائے، لوہے کے ٹکڑے، چقماق اور تار اکٹھے کیے جائیں اور مستول نما ڈنڈے تیار کروائے جائیں۔ میں اپنی ہر کشتی اور ہر جہاز پر زیرِ آب تباہ کرنے والے ایسے متعدد "تارپیڈو" تیار رکھنا چاہتا ہوں لیکن یاد رہے کہ اس کی کارکردگی کے بارے میں ابھی کسی کو بھی کچھ نہ بتایا جائے!"

"کیا تمھیں خدشہ ہے کہ ہمارے آدمیوں میں کوئی غدار نہ ہو؟"

"ہاں۔ ملکہ کے ایک غدار کمانڈر کی وجہ سے پرنیال تباہ ہو گیا ہے۔ اس لیے میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ اگر ضرغام کے کپتانوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ پیپے بطور اسلحہ استعمال کیے جارہے ہیں تو وہ اُن کا توڑ ڈھونڈ نکالیں گے۔"

***

قزاقوں کی جاسوس جماعت کی واپسی پر یہ یقین ہو گیا تھا کہ جزیرے پر ضرغام کے فوجیوں کا کوئی وجود نہیں ہے چنانچہ ہمارے آدمی جاکر وہ پیپے لے آئے اور اُن میں بارود بھرنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ روزانہ دوسری امارات کی طرف سے جنگی کشتیاں اور جہاز بھی آنے لگے۔ اُن میں سے کچھ کشتیوں کو مزید بارود اور دیگر سازو سامان لینے کے لیے واپس بھی جانا پڑا۔

ایک ہفتے کے اندر اندر قزاق بھی پچاس کشتیاں اور جہاز لے کر ساحل پر نیال پر پہنچ گئے۔ امارات خمسہ کے جہازیوں اور افسروں نے پہلے تو انھیں شک و شبہے کی نگاہوں سے دیکھا اور ان سے دُور دُور رہے۔۔ پھر بہت جلد اُن سے مانوس ہو گئے کہ وہ بھی میری اور شہزادہ آلپ کی زیرِ کمان فوجیوں کے سے نظم و ضبط سے کام کرتے تھے اور دونوں کا مقصد ایک تھا یعنی ضرغام اور اُس کے مظالم کا خاتمہ۔

قزاقوں کے بعد امارتِ نیلاب کا پُورا جنگی بیڑہ وہاں پہنچ گیا جس میں اٹھائیس کشتیاں اور جہاز شامل تھے۔ امارات خمسہ میں نیلاب ہی سب سے بڑی امارت تھی۔ شہزادہ آلپ یہ دیکھ کر متعجب رہ گیا اور اس نے نیلاب کے امیر البحر سے پوچھا: "مجھ میں نہیں آتا کہ شاہِ نیلاب نے اپنا پُورا بیڑا کیسے بھیج دیا ہے؟"

"آپ کی ہونے والی ملکہ نے انھیں پُورا بیڑہ بھیجنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دُوسرے وہ خود بھی نیلاب کا حشر پر نیال جیسا نہیں چاہتے۔"

تیسرے روز ایک نیا حیران کُن لیکن خوش آئند واقعہ رُونما ہُوا۔ وہ یہ کہ سردار نوروز کا بیٹا سردار مہروز شاہی بحریے کے دو جہاز اور اپنے قبیلے کے جنگجو لے آیا۔ اُس نے بتایا کہ ضرغام نے کلدانی سردار نوروز کو قتل کرا دیا تھا۔ اس لیے اُن کے قبیلے نے چپکے سے ان دو جہازوں پر چھاپے مارے جو ساحل پر لنگر انداز تھے۔ جہازوں کا عملہ بھی ضرغام سے برگشتہ تھا لہٰذا اُنھوں نے کوئی مدافعت نہ کی اور ہم یہاں آ گئے۔

"میرا خیال ہے کہ ضرغام کی ساری فوج میں برگشتگی پھیل چکی ہو گی۔" شہزادہ آلپ نے کہا۔

"نہیں جناب۔ عقابی فوج آخری دم تک اُس کا ساتھ دے گی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اگر ضرغام کو شکست ہو گئی تو عقابی فوج کے کسی جوان کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔"

●

جب ہم نے ساری تیاریاں کر لیں تو اپنی مجموعی طاقت کا اندازہ لگایا۔ ہمارے پاس ایک سو چالیس کشتیاں اور جہاز جمع ہو چکے تھے۔ اب میں جلد از جلد ضرغام کے بحریے پر حملہ کرنا چاہتا تھا تاکہ اُسے اپنے بیڑے کو مزید وسعت دینے کی مہلت نہ مل سکے۔ شہزادہ آلپ بھی میرا ہم خیال تھا مگر روانگی سے ایک روز پہلے اُس نے کہا: "اگر تم مجھے اس بیڑے کا امیر البحر سمجھتے ہو تو تمھیں میری ایک بات ماننا پڑے گی۔"

"وہ کیا؟"

"کہسار کا نام بدل دو۔"

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی معرکے سے پہلے اس میں حصّہ لینے والے جہاز یا کشتی کا نام بدل دیا جائے تو شکست مقدر بن جاتی ہے اس لیے مَیں ہچکچا گیا حالانکہ مَیں توہم پرست نہیں ہوں۔ مَیں نے پُوچھا: "تم اس کا کیا نام رکھنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا: "شعلۂ انتقام۔"

یہ سُنتے ہی میرے سینے میں انتقام کے شعلے سے بھڑکنے لگے۔ مجھے کہسار کے پہلے کپتان، مغل، سردار نوروز اور ملکہ ترشینا کے علاوہ ان گنت اجنبی مظلوم یاد آ گئے جو ضرغام کے جَور و استبداد کا شکار ہو چکے تھے۔ ہمیں ضرغام سے ان سب مظلوموں کا انتقام لینا تھا۔ مَیں نے کہا: "ٹھیک ہے۔ کہسار کا نام آج سے شعلۂ انتقام ہے اور یہی کشتی ہمارے بیڑے کی رہنمائی کرے گی۔ لنگر اُٹھانے کا حکم دیجیے امیر البحر آلپ۔"

●

بیڑے کے لنگر اُٹھانے سے پہلے ہم نے مہروز کلدانی کی اطلاع پر مبنی منصوبہ بنایا تھا۔ مہروز نے بتایا تھا کہ ضرغام کے گولہ بارود کا بیشتر ذخیرہ پر نیال پر فوج کشی کے دوران خرچ ہو چکا ہے۔ چنانچہ مَیں نے آلپ کو مشورہ دیا تھا کہ ہمیں سلطنت بہرام کی راجدھانی تک جانے اور اُس پر حملہ کرنے کی بجائے گندھک کے جزیروں پر حملہ کرنا چاہیے جہاں سے ضرغام کو بارود کے لیے گندھک فراہم کی جاتی ہے۔ اس طرح ہمارے بیڑے کو لمبا سفر طے نہیں کرنا پڑے گا اور ہمارے کارکن بھی تازہ دم رہیں گے مگر ضرغام یہ خبر سُنتے ہی وہاں اپنا بیڑا لانے پر مجبور ہو جائے گا طویل سفر کی وجہ سے اُس کے جہازوں اور جہازیوں دونوں کی حالت خراب ہو گی اور ہم اس صُورتِ حال سے بھرپور فائدہ اُٹھا سکیں گے چنانچہ ہم سیدھے اُن جزیروں پر پہنچ گئے جہاں گندھک کی کانیں تھیں۔

اس وقت ان جزیروں کی حفاظت کے لیے صرف چار جہاز موجود تھے جو ہمیں دیکھتے ہی بھاگ نکلے بلکہ ہم نے خود ہی انھیں بھاگنے کا موقع دیا تاکہ وہ ضرغام کو ہماری آمد کی اطلاع دے سکیں۔

جزیرے پر ضرغام کے صرف ایک ہزار غلام اور فوجی موجود تھے انھوں نے ہمارے ایک سو چالیس جہاز اور کشتیاں دیکھتے ہی ہتھیار ڈال دیے۔ وہ ہمارے پچیس ہزار جوانوں کا مقابلہ کسی بھی صُورت نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے جزیرے کے ساحل پر موجود ساری توپوں پر قبضہ کر

مَیں نے اپنے جہازوں اور کشتیوں کے مستریوں کو منجنیقیں تیار کرنے پر لگا دیا تاکہ ضرغام کے بیڑے پر جلتی ہُوئی گندھک برسائی جا سکے۔ اس کے بعد مَیں نے تمام کپتانوں کو بُلوایا اور اُن پر اپنے خفیہ ہتھیار یعنی پیپوں والے "تارپیڈو" کا راز منکشف کر دیا۔ کپتان بہت خوش ہُوئے اور اُنھوں نے پیپے بنانے والے اُن کاریگروں کی یاد میں ایک لمحہ خاموش رہ کر سلامی دی جنھیں ضرغام کے فوجیوں نے قتل کر دیا تھا۔

●

ہمیں ضرغام کے شاہی بیڑے کے لیے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ چوتھے روز شام کو ہماری ایک جاسوس کشتی نے اطلاع دی کہ بیڑا آنے والا ہے۔ ہم تو اُس کے "استقبال" کی ساری تیاریاں مکمل کر ہی چکے تھے چنانچہ بیڑے کی راہ تکنے لگے۔

پو پھٹتے ہمیں اُفق پر شاہی بیڑے کے جہاز آتے دکھائی دے گئے۔ مَیں نے آخری بار کپتانوں کے ساتھ ملاقات کی اور اُنھیں بتایا کہ ہمیں ہر قیمت پر اور جلد از جلد ضرغام کے جہاز کو اپنا ہدف بنانا ہے۔

کچھ دیر بعد ضرغام کا بیڑا ہلالی شکل کے نیم دائرے کی صُورت ہمارے بیڑے کو گھیرنے کے لیے آگے بڑھنے لگا لیکن ابھی وہ ہماری توپوں کی مار سے باہر تھا۔ مَیں نے اپنے بیڑے کی ترتیب ضرغام سے مختلف رکھی تھی۔ میری کشتیاں اور جہاز تین قطاروں میں نعل کی صُورت تیار کھڑے تھے۔ ہر کشتی کے ساتھ وہی پیپوں والے "تارپیڈو" باندھ دیے گئے تھے جو پانی میں چھ فٹ ڈُوبے ہوئے تھے اور دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بڑے جہازوں پر گندھک کی ہانڈیاں اور بالٹیاں پھینکنے والی منجنیقیں بھی تیار تھیں۔ اتنے میں شاہی بحریے کے جہازوں سے سفید دُھویں کے مرغولے اُڑتے اور دھماکے ہوتے سنائی دینے لگے لیکن وہ ہم تک نہ پہنچ پائے۔

مَیں نے طبلِ جنگ بجوا دیا۔ میری کشتیوں سے نعروں کی آواز سُنائی دینے لگی، ہر فرد چوکنا ہو گیا۔ مَیں نے سامنے والی قطار میں چھوٹی مگر بہت تیز رفتار کشتیاں رکھی تھیں۔ یہ دشمن کے لیے ایک قسم کا چارہ تھیں۔ جب شاہی بحریہ قریب آیا تو ہماری طرف سے بھی گولہ باری شروع ہو گئی۔ اُسی وقت چھوٹی کشتیاں تیزی سے آگے بڑھیں۔ دشمن کے جہاز اُنھیں "ترنوالہ" سمجھتے ہُوئے اُن کی طرف لپکے کہ ٹکر مار کر اُن کے پرخچے اُڑا دیں لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ ہمارے پیپوں والے "تارپیڈو" خود اُنھی کے پرخچے اُڑا دیں گے۔ چنانچہ یہی ہُوا۔ بیشتر جہاز قریب آنے سے پہلے "تارپیڈو" سے ٹکرائے اور اُن کے پرخچے اُڑ گئے۔ اگرچہ اس پہلے ریلے میں ہماری تین کشتیاں تباہ ہو گئیں مگر دشمن کے آٹھ بڑے جہاز بھی منٹوں میں غرق ہو گئے اور اُن کی تباہی نے شاہی بیڑے کے جہازیوں کو ششدر کر دیا لیکن وہ ضرغام کے خوف سے پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتے تھے۔ انھیں اور کچھ نہ سُوجھا تو وہ اندھا دُھند چاروں طرف سے بڑھنے اور گولہ باری کرنے لگے۔

ہماری جوابی گولہ باری اور گندھک کی بالٹیوں نے بہت سی کشتیوں میں آگ لگا دی اور متعدد جہازوں کو بھی نقصان پہنچایا۔ ہماری کشتیاں بھی اگرچہ تباہ ہو رہی تھیں لیکن پُرجوش جوان خود مرنے اور کشتی ڈُوبنے سے پہلے "تارپیڈو" استعمال کرنا نہ بھُولتے اور اُن کی یہی قربانیاں ضرغام کے بہت سے جہازوں اور کشتیوں کی غرقابی کا سبب بن گئیں۔ اس صُورتِ حال سے گھبرا کر شاہی بحریہ دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک حصّہ سامنے رہ گیا اور دُوسرا ایک جانب ہٹ کر ہمارے بیڑے کے عقب میں آنے کی کوشش کرنے لگا لیکن ہمارے جوانوں کے حوصلے بہت بلند تھے اُنھوں نے اپنے نقصان کے مقابلے میں شاہی بحریے کا کم از کم چھ گُنا زیادہ نقصان کیا تھا۔

جب ضرغام کا بحریہ دو حصّوں میں بٹ گیا تو اُن کے پیچھے سے جہازوں کی ایک اور قطار نمودار ہوئی۔ یہ دیکھ کر میری رگ رگ میں چنگاریاں بھر گئیں کہ اُن کی رہبری کرنے والے جہاز پر ضرغام کا شاہی پرچم لہرا رہا ہے۔ جونہی آلپ کی نظر ضرغام کے جہاز پر پڑی، وہ دیوانہ وار تلوار لہراتے ہوئے چلّایا: "شعلۂ انتقام کو شاہی جہاز کی طرف بڑھاؤ۔"

"خبردار۔ ایسا مت کرنا۔" مَیں دہاڑا۔

آلپ یہ سُن کر غصّے کے مارے پاگل سا ہو گیا۔ اُس نے تلوار یُوں بلند کر لی جیسے میرے دو ٹکڑے کر دے گا۔ پہلے تو میرا جی چاہا کہ مَیں اسے کراٹے کی ایک ضرب سے دو تین گھنٹوں کے لیے بے ہوش کر دُوں۔۔۔ مگر اُس نے خود ہی اپنے غصّے پر قابو پا لیا اور پیچھے ہٹ گیا تو مَیں نے ملاحوں کو حکم دیا: "کشتی کو پیچھے ہٹاؤ۔ باقی سب بھی پیچھے ہٹ کر نیم دائرے میں پھیل جائیں۔"

شعلۂ انتقام تیزی سے پیچھے ہٹی تو دُوسری کشتیوں اور جہازوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ مَیں دراصل ضرغام کی جنگی حکمتِ عملی خود اُس پر آزمانا چاہتا تھا اور اُس کے لیے یہ بہترین موقع تھا کیونکہ اُس کا بیڑا دو حصّوں میں بٹ چکا تھا اور اُس کی وہ ترتیب ختم ہو گئی تھی جبکہ مَیں نیم دائرے کی شکل میں ضرغام کے جہاز کو اس طرح گھیر لینا چاہتا تھا کہ وہ ہمارے نرغے سے نہ نکل پائے۔

ہماری کشتیاں پیچھے ہٹیں تو ضرغام اور اُس کے ساتھ آنے والے جہاز آگے بڑھ آئے۔ اب دونوں طرف سے گولہ باری ہونے لگی۔ ضرغام اور اُس کے کپتانوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ ہم پسپا ہو

رہے ہیں اور وہ تین اطراف سے گھیر کر ہمیں تباہ کر دیں گے مگر میں نے ایک دم اپنی کشتیوں کو آگے بڑھنے اور پھیلنے کا حکم دیا تو دائیں بائیں سے آنے والے ضرغام کے بیڑے کو اپنی گولہ باری ختم کر دینا پڑی کیونکہ اس طرح وہ ایک دوسرے کو نشانہ بنا سکتے تھے اب اُن کے لیے صرف یہی اقدام باقی رہ گیا تھا کہ وہ اپنی طرف بڑھتی ہوئی ہماری کشتیوں سے ٹکرا جائیں لیکن وہ اُن کے ٹکرانے سے پہلے "تارپیڈو" سے ٹکراتے اور بھک سے اُڑ جاتے تھے۔

یہی صورتِ حال سامنے سے آنے والے جہازوں کی تھی جب ضرغام کے کپتانوں نے اپنی کشتیوں اور جہازوں کی تباہی کا یہ منظر دیکھا تو وہ دہشت زدہ ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ جہاز جو ضرغام کے جہاز کو گھیرے میں لیے آگے بڑھ رہے تھے اس صورتِ حال سے بُری طرح بوکھلا گئے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چار جہازوں کے رُخ مُڑ گئے۔ وہ راہِ فرار اختیار کر رہے تھے۔ میں نے جوشِ مسرت سے اپنا خود اُتار کر پھینک دیا۔ اُن چار جہازوں کو مُڑتا دیکھ کر ضرغام کے بیڑے میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی اور گندھک سے جلتے ہوئے جہازوں نے ہر طرف دھوئیں کے بادل پھیلا دیے۔

ہمارے جہازیوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے۔ وہ اندھا دھند گولہ باری کر رہے تھے، گندھک کی ہانڈیاں پھینک رہے تھے اور "تارپیڈو" ٹکرا رہے تھے۔ شعلۂ انتقام دھوئیں کے بادلوں کو چیرتی ہوئی ضرغام کے جہاز کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب وہ دھوئیں کے بادل سے نکلی تو میں بے ساختہ چلّایا "عرشے پر لیٹ جاؤ"۔

ابھی میرے حکم کی پوری طرح تعمیل بھی نہیں ہو پائی تھی کہ ضرغام کے جہاز سے چلائی ہوئی توپ نے شعلۂ انتقام کا ایک مستول اُڑا دیا اور میرے کئی ساتھی لقمۂ اجل بن گئے۔ دراصل ہماری کشتی ضرغام کے جہاز کے بہت قریب آ گئی تھی جسے ہم دھوئیں کی وجہ سے نہیں دیکھ سکے تھے۔ اُس سے داغی جانے والی توپ نے ہمارا مستول تو اُڑا دیا تھا لیکن یہ مستول خود ضرغام کے جہاز پر گر کر رسّوں میں اُلجھ گیا تھا اور اس طرح کشتی سے جہاز تک ایک پُل بن گیا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں نے چلّا کر حکم دیا "جوانو... جہاز پر چڑھ جاؤ۔ میرے پیچھے آؤ"۔

اور میں اندھا دھند مستول پر چڑھنے لگا۔ شہزادہ آلپ اور بہت سے دوسرے بھی میرے پیچھے آنے لگے۔ ضرغام کی عقابی فوج کے جوانوں کو ہماری آمد کا علم اُس وقت ہوا جب ہم تقریباً چالیس آدمی اُوپر پہنچ چکے تھے۔ وہ جان توڑ کر لڑنے لگے کیونکہ یہ خود اُن کی زندگی اور موت کا سوال تھا لیکن اُن کے حوصلے پست ہو چکے تھے جبکہ ہمارے جوان بہت پُرجوش تھے۔ آلپ کے بند وقچیوں نے

انھیں بڑی تیزی سے نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اُن میں سے ایک افسر بھاگ کر سمندر میں کودنے ہی والا تھا کہ اُس کی پُشت پر ایک ایسا بھالا لگا جو آر پار ہو گیا۔ میں اس قیمتی بھالے کو پہچانتا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے ضرغام کیبن کے دروازے میں کھڑا نظر آ گیا۔ وہ دوسرا بھالا تول رہا تھا اور اب اس کا نشانہ کوئی بھگوڑا بزدل افسر نہیں بلکہ شہزادہ آلپ تھا۔

ضرغام نے آلپ کے چہرے کو نشانہ بنایا تھا مگر آلپ بجلی کی پھرتی سے ہٹا تو بھالا اُس کی زرہ کے دائیں شانے میں پیوست ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں تلوار تو تھی ہی مگر میں اپنا شکاری چاقو نکالتے ہوئے ضرغام کی طرف لپکا تاکہ اُسے تلوار نیام سے برآمد کرنے کا موقع نہ مل سکے مگر میرے قریب پہنچنے سے پہلے اُس نے تلوار نکال لی اور مجھ پر وار بھی کر دیا جسے میں نے اپنی تلوار پر روکا۔ مگر چونکہ ضرغام کی تلوار میری تلوار سے زیادہ لمبی تھی اور وہ بے حد پھرتیلا جنگجو تھا اس لیے اُس نے یکے بعد دیگرے مجھ پر تین وار کیے۔ تیسرے وار کو میں نے تلوار پر روک کر اُس کی تلوار اُٹکا دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دائیں پاؤں سے اُس کے چہرے پر ضرب لگائی۔ اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو کراٹے کے اس داؤ سے ڈھیر ہو جاتا مگر ضرغام سنبھل گیا اور غیظ و غضب سے میری طرف بڑھا تو میں نے اُس کے ہاتھ پر پاؤں سے ضرب لگانے کے ساتھ ساتھ اپنا شکاری چاقو اُس کے جبڑے میں بھونک دیا جو اُس کے تالو کو چیرتا ہوا اُس کے دماغ تک جا پہنچا اور وہ ڈھیر ہو گیا۔

اتنے میں آلپ جو زرہ میں اٹکا ہوا بھالا نکال چکا تھا، لپکا اور اُس نے ایک ہی وار میں ضرغام کا سر قلم کر دیا۔

جب ضرغام کا پرچم اُتار کر اُس کا بریدہ سر مستول سے لٹکایا گیا تو بچے کھچے جہازوں اور کشتیوں نے سفید جھنڈے لہرا دیے۔ عقابی فوج کے گرفتار ہونے والے افسروں میں ملکہ ترشینا کا غدار کمانڈر بھی شامل تھا۔ الماس نے اسے دیکھتے ہی کہا "اسے میرے حوالے کر دیجیے۔ میں اسے پرنیال لے جاؤں گا اور اسی طرح موت کے گھاٹ اُتاروں گا جس طرح ملکہ ترشینا کو کرب انگیز موت سے ہمکنار کیا گیا تھا"۔

"نہیں الماس"۔ میں نے جواب دیا۔ "شہنشاہ آلپ کے دور میں کسی کو کرب ناک موت نہیں ملے گی"۔

●

شہزادہ آلپ کی شادی اور تاجپوشی کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ اُسے اپنے آبا و اجداد کی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ مل گئی تھی اور رعایا کو لُٹا ہوا امن و سکون۔ عقابی فوج کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اُس کی جگہ قزاقوں کے دستے کہستانِ منگول کی سرحد پر متعین کر

دیے گئے تھے۔ میرے لیے سیر و تفریح کے علاوہ کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ چنانچہ ایک روز میں کہستان منگول کے اُس جنگل میں شکار کھیل رہا تھا جہاں میری ملاقات کلدانی سردار نوروز سے ہوئی تھی اور مجھے ارغون اور طغرل سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ جنگل میں مجھے ایک چھوٹی سی جھیل دکھائی دی جس کے دوسرے کنارے پر کچھ ہرن پانی پی رہے تھے۔ میرے اور ہرنوں کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ میں انھیں تیر سے شکار نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میں آہستہ آہستہ جھیل کے کنارے کنارے اُن کی طرف بڑھنے لگا تاکہ وہ میرے تیر کی زد میں آ جائیں۔ اچانک ایک جگہ میرے پاؤں کیچڑ میں دھنس گئے اور ایسے دھنسے کہ میں جتنا انھیں باہر نکالنے کی کوشش کرتا تھا وہ اتنے ہی اور دھنستے چلے جاتے تھے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں ایک ایسی دلدل میں پھنس چکا ہوں جس سے زندہ سلامت نکل جانا معجزے سے کم نہیں ہوگا۔

میرے پاس شکاری چاقو اور تیر کمان تو ضرور تھے لیکن کوئی رسّی وغیرہ نہیں تھی جسے میں کسی درخت پر پھینک کر باہر نکل سکوں۔ ہر چند کہ میں نے باہر نکلنے کی کوشش ترک کر دی تھی کہ اس طرح زور لگانے سے میں اور دھنس جاتا تھا لیکن اب بغیر حرکت کیے بھی میں آہستہ آہستہ دھنستا جا رہا تھا۔ اپنی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی موت نے میرے وجود میں دہشت کی سرد لہر دوڑا دی اور میں بے ساختہ اپنی مدد کے لیے چیخنے پکارنے لگا لیکن وہاں کوئی ہوتا تو میری مدد کو آتا...

جُوں جُوں وقت گزر رہا تھا، دلدل مجھے نگلتی جا رہی تھی یہاں تک کہ میں کمر تک دلدل میں دھنس گیا۔ اب مجھے خوف سے پسینہ بھی آ رہا تھا اور سر میں درد بھی ہونے لگا تھا جو ہر لمحے بڑھتا جا رہا تھا مجھے خیال آیا کہ شاید کمپیوٹر میری تلاش میں ہے اور اس خیال کے ساتھ ہی دل میں آس کا دیا جل اُٹھا لیکن اس سوچ نے زندگی کی آس کا دیا جلد ہی بجھا دیا کہ پہلے جب کبھی کمپیوٹر مجھے تلاش کرتا تھا، وقفے وقفے سے سر درد کے جھٹکے محسوس ہوتے تھے جبکہ آج سر درد آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔

موت تو ہر ذی حیات کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے لیکن میں ماضی کے اس اندھیرے دور میں یُوں بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میں جنگ میں لڑتا ہوا مارا جاتا لیکن تقدیر نے میرے ساتھ کیسا بھیانک کھیل کھیلا تھا۔ میرے حصّے میں کیسی بھیانک موت لکھ دی تھی۔ میں ابھی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اتنے میں میری نگاہ اُس طرف اُٹھ گئی جہاں میں نے ہرنوں کو پانی پیتے دیکھا تھا لیکن اب وہاں ہرن نہیں تھے بلکہ اُن کی جگہ ایک خوفناک مگرمچھ منہ کھولے میری طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا بلکہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ بھی رہا تھا۔

مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے وہ مگرمچھ نہیں بلکہ میری موت ہے جو قدم بہ قدم میری طرف رینگتی آ رہی ہے۔ اُس کی بجائے اگر وہ کوئی درندہ ہوتا تو شاید میری حالت اتنی خراب نہ ہوتی کیونکہ وہ درندہ مجھے شکار کرنے کے لیے دلدل میں اُترتا تو خود بھی اس میں دھنس کر رہ جاتا لیکن یہ مگرمچھ تو کنارے پر رہ کر میری گردن اپنے لمبے جبڑے سے دبوچ سکتا تھا۔ اس کے آرا نما جبڑے سے چبائے جانے کے تصور سے مجھے جھرجھری آ گئی اور سر میں درد کی ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔

مگرمچھ لحظہ بہ لحظہ میرے قریب تر آتا جا رہا تھا اور دلدل آہستہ آہستہ مجھے نگل رہی تھی۔ اچانک مجھے تیر کمان کا خیال آ گیا۔ میرے ہاتھ دلدل کی گرفت سے آزاد تھے۔ میں نے ترکش کا جائزہ لیا۔ اس میں چار تیر باقی تھے۔ میں نے ایک تیر چلّے میں چڑھایا اور اپنی طرف بڑھنے والے مگرمچھ پر چلا دیا۔ وہ اُس کی گردن میں لگا لیکن مگرمچھ کو آگے بڑھنے سے نہ روک سکا۔ میں نے دوسرا تیر چلایا جو اُس کی اگلی ٹانگ میں پیوست ہو گیا لیکن مگرمچھ پھر بھی آگے بڑھتا رہا۔ اب میرے پاس صرف دو تیر باقی رہ گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر تیسرا تیر مگرمچھ کی آنکھ میں ترازو ہو جائے تو شاید میری طرف بڑھتی ہوئی موت کے قدم رُک جائیں۔ میں نے اللہ کا نام لے کر تیسرا تیر چلّے میں چڑھایا اور مگرمچھ کے مزید قریب آنے کا انتظار کرنے لگا تاکہ نشانہ خطا ہونے کا احتمال نہ رہے اور جب مگرمچھ قریب تر آ گیا تو میں نے خوف اور سر درد کے مارے کانپتے ہاتھوں سے تیر چلا دیا جو اُس کی آنکھ میں پیوست ہو گیا۔

مگرمچھ ایک لمحے کے لیے رُکا، اُس نے بڑے زور سے اپنی دُم زمین پر پٹخی اور ایک طرف گھومنے لگا۔ میں سمجھا کہ بلا ٹل گئی لیکن وہ بدبخت مجھے اپنی دوسری آنکھ سے دیکھنے لگا اور پھر حالتِ غیظ میں میری طرف بڑھا تو مجھے چلّے میں تیر چڑھانے کا موقع بھی نہ مل سکا اور وہ میرے ہاتھوں ہی میں رہ گیا۔ اب اُس کا جبڑا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ موت میری آنکھوں میں رقص کرنے لگی۔ جبڑا میرے قریب تر آنے لگا اور جونہی اُس نے مجھے دبوچنا چاہا، میں نے لاشعوری طور پر تیر اُس کے کھلے جبڑے میں سیدھا اڑا دیا۔ مگرمچھ نے جبڑا بند کرنا چاہا تو تیر کی نوک اُس کے تالو میں گڑ گئی اور تیر بیچ سے ٹوٹ گیا لیکن اب اُس کا اُوپری حصّہ بھی اسے چبھنے لگا جس سے بے تاب ہو کر وہ مچلنے تڑپنے لگا اور اسی طرح پیچھے ہٹ گیا مگر اس وقت تک خوف و دہشت اور سر درد نے میرے ہوش و حواس مختل کر دیے۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا اور پھر مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میں لامتناہی خلا میں ڈوبتا جا رہا ہوں

● جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو ایک آرام دہ بستر پر پایا۔ ساتھ ہی مجھے آفندی کی آواز آئی: "کیسے ہو بیٹے"

میں نے چہرہ گھما کر دیکھا۔ میرے بائیں جانب آقائے آفندی کرسی پر بیٹھے تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "ٹھیک ہوں جناب!"

"خدا کا شکر ہے کہ کمپیوٹر تباہ ہونے سے پہلے تم واپس آ گئے۔"

"کیا؟... کیا کمپیوٹر تباہ ہو گیا؟" میں نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیٹے۔ مگر تم لیٹے رہو۔"

"مگر... مگر وہ کیسے تباہ ہو گیا؟"

"اس کے سرکٹ میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ پروردگار کا احسان ہے کہ تمھاری واپسی کے بعد اس میں آگ لگی ورنہ شاید میں ڈاکٹر فریدل کو قتل کر دیتا۔"

"ڈاکٹر فریدل کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کمپیوٹر کی تباہی کے صدمے سے بیمار ہو گیا ہے۔" آفندی نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اب میں کچھ عرصے تک ماضی کے سفر پر نہیں جا سکوں گا۔"

"کچھ عرصے تک نہیں ہمیشہ کے لیے بیٹے، اب تم ہمیشہ یہیں رہو گے جو چاہو گے کر سکو گے۔ محکمے کی طرف سے تمھیں اتنی رقم مل جائے گی کہ ساری زندگی عیش و آرام سے بسر کر سکتے ہو۔"

"لیکن اب زندگی میں رہ ہی کیا گیا ہے آقائے آفندی۔"

"تمھیں یہ معلوم نہیں کہ قتل کے جس مقدمے میں تمھیں سزائے موت دی گئی تھی وہ ختم ہو چکا ہے۔ تمھیں باعزت بری کر دیا گیا ہے اور اصلی قاتل کو سُولی پر لٹکے بھی مدت گزر گئی ہے۔"

"اوہ... یہ کب ہوا، کیسے ہوا؟"

"تمھاری داستان سننے کے بعد ہمارے محکمے نے پولیس کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اس کیس کی ازسرِنو تفتیش کرے۔ تمھیں اس سلسلے میں جان بوجھ کر بے خبر رکھا گیا تھا مگر اب جب تمھیں ریٹائر کیا جا رہا ہے تو تمھیں اس حقیقت سے آگاہ کرنا ضروری ہے تاکہ تم بلاخوف و خطر آزادانہ زندگی بسر کر سکو، اپنا گھر بساؤ اور وہ ساری باتیں بھول جاؤ جنھوں نے تمھاری زندگی میں تلخیوں کا زہر گھول دیا تھا۔"

"کاش ایسا ہو سکتا۔" میں نے جواب دیا اور آنکھیں موند کر سوچنے لگا کہ میں نے لالہ رُخ کے ساتھ گھر بسانے کے کتنے خوبصورت خواب دیکھے تھے۔ آرزوؤں کے کتنے تاج محل تعمیر کیے تھے مگر ہر خواب لُٹ گیا۔ ہر تمنا برباد ہو گئی۔ تقدیر بھی کتنی ظالم ہے کہ پہلے تو دل میں چاہتوں کے گلاب کھلاتی ہے پھر جُدائی کی آندھیوں سے ان کی ایک ایک پنکھڑی بکھیر دیتی ہے۔

● ہسپتال سے نکلنے کے بعد میں سیدھا اپنے مدرسے میں آیا

اسکول آیا جو مدتوں سے بند پڑا تھا۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو گزرے وقت کی ایک ایک یاد ذہن کے دریچوں سے جھانکنے لگی۔ وہی در و دیوار، وہی ساز و سامان تھا لیکن وقت بدل گیا تھا، ساتھی بچھڑ گئے تھے، خواب بکھر گئے تھے۔ صرف یادیں باقی رہ گئی تھیں۔ میں ایک گرد آلود کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ خدا قادرِ مطلق ہونے کے باوجود گزرا ہوا وقت نہیں لوٹاتا۔ کیوں، کیا وقت پر اس کا حکم نہیں چلتا؟ ابھی میں اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ سامنے لالہ رُخ کھڑی تھی۔

"لالہ رُخ تم؟... تم یہاں کیسے آ گئیں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"تمھارے پاس آئی ہوں سرفروش۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "کیا تم مجھے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہو گے؟"

"ہاں ہاں بیٹھو۔" میں کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "لیکن... لیکن..."

"میں جانتی ہوں، تم کیا پوچھنا چاہتے ہو اور اس کا جواب یہ ہے کہ میری شادی نہیں ہوئی تھی۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میں نے عین وقت پر شادی سے انکار کر دیا تھا۔"

"مگر کیوں؟"

"اس سوال کا جواب اپنے دل سے پوچھو۔ اگر وہ جواب نہ دے سکے تو میں چپ چاپ چلی جاؤں گی۔"

"وہ جواب میں جانتا ہوں لالہ رُخ۔ یہ بتاؤ کہ ہم شادی کب کر رہے ہیں؟"

"اس کا جواب بھی اپنے دل سے پوچھو۔"

"وہ تو کہتا ہے کہ آج بلکہ ابھی۔"

"تو تم اپنے دل کا کہنا کیوں نہیں مانتے؟"

"ضرور مانوں گا۔ اب اتنا اور بتا دو کہ تم یہاں کیسے آ گئیں؟ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ آج، اس وقت میں یہاں ہوں؟"

لالہ رُخ کچھ دیر سوچتی اور مسکراتی رہی پھر بولی: "انھوں نے تو منع کیا تھا مگر میں تمھاری بات بھی نہیں ٹال سکتی۔ مجھے انکل آفندی نے بتایا تھا۔"

"اوہ... تو آؤ... وہی ہمارا نکاح پڑھوائیں گے۔" یہ کہہ کر میں نے لالہ رُخ کا ہاتھ تھاما اور جاتے ہوئے رُک کر بولا: "ایک بات اور بھی سُن لو لالہ۔ خدا گزرا ہوا وقت تو نہیں لوٹاتا مگر وہ گزرے وقت کی رُوٹھی ہوئی خوشیاں ضرور لوٹا دیتا ہے۔"

۵ ۵

۵ ۵